ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
جولائی 1993ء
Scanned By

جاسوسی ڈائجسٹ، جولائی 1993ء

پبلشر: معراج رسول ○ مقام اشاعت: سیدہ مینشن ہیبویا اسٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی ○ پرنٹر: ابن حسن ○ مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی۔ تار کا پتا: جاسوسی، کراچی

جاسوسی ڈائجسٹ، جولائی 1993ء

جلد: 23 ○ شمارہ: 7 ○ جولائی 1993ء ○ قیمت فی پرچہ: 20 روپے ○ قیمت سعودی عرب 10 ریال ○ زر سالانہ: 300 روپے ○ خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس: 229 کراچی 1

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جاسوسی ڈائجسٹ، جولائی 1993ء

عزیزانِ من! السلام علیکم!

اسلامی سال کے پہلے ماہ کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہ ماہ اپنی جلالت و بزرگی کے اعتبار سے تاریخ عالم میں ایک منفرد مقام کا حامل ہے۔ پہلے انسان اور زمین پر خدا کے نائب حضرت آدمؑ کی دعا اسی ماہ کی دس تاریخ کو قبول ہوئی۔ کہتے ہیں طوفانِ نوحؑ کے بعد حضرت نوحؑ کی کشتی کوہِ جودی پر یومِ عاشور ہی کو ٹھہری اور قوم بنی اسرائیل کی فرعونِ مصر سے نجات کے لیے بھی یہی دن مقرر ہوا اور سب سے آخر میں یہی دن اس دین کی بقا اور سربلندی کے لیے مخصوص ہوا جو بنی نوعِ انسانی کے لیے آخری اور مکمل ضابطۂ حیات تھا اسی ضابطۂ حیات میں تصرف و تبدیل ہو رہا تھا۔ اس مرحلے پر آوازِ حق بلند کرنا اپنی زندگیوں کو داؤ پر لگا دینے کے مترادف تھا، سو زندگیاں داؤ پر لگا دی گئیں اور قیامت تک کے لیے بتا دیا گیا کہ حق کیا ہے، باطل کسے کہتے ہیں۔ ایمان کے اعلیٰ ترین درجات کا تعین ہو گیا۔ رضائے الٰہی کے لیے تن من دھن غرض ہر متاعِ عزیز کی قربانی ناگزیر ہو گئی اور قیامت تک کے لیے یہ اصول طے پا گیا کہ علمِ کاملہ پر علومِ ناقصہ کو فوقیت نہیں دی جا سکتی۔ برتری ہر صورت میں علمِ کاملہ ہی کو حاصل رہے گی جو اللہ اپنے رسولؐ کے ذریعے بندوں تک پہنچاتا ہے۔ انسانی عقل کا تراشا ہوا فلسفہ اور منطق بالآخر کسی نہ کسی مرحلے میں وقت کی کسوٹی پر غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ اس تمہیدی گفتگو کے بعد آیئے بزمِ چینی، نکتہ چینی میں قدم رکھتے ہیں۔ مگر اس سے قبل ایک وضاحت ضروری ہے۔ جناب احمد اقبال اس ماہ اپنی شدید علالت کے سبب شکاری کے صفحات زیادہ نہ لکھ سکے اور آخر وقت میں ہمیں ایک اور کہانی 'جوشِ بے ہوش' کا اضافہ کرنا پڑا۔ یہ کہانی فہرست میں شامل نہیں ہے۔

○☆○

اس ماہ پہلے انعام کا حقدار تبصرہ یا پر فیرا امریکا سے **طارق احمد خان** کا ہے، ملاحظہ فرمائیں "انکل بہت بہت شکریہ، جون کے مہینے میں اتنا اچھا رسالہ نکالنے پر۔ میرے خیال میں اس سے اچھا تحفہ میری سالگرہ پر نہ ہوتا۔ میں جب چینی نکتہ چینی پڑھنے لگا تو جون کی گرمی بہت یاد آئی۔ وہ کراچی کی دھوپ، جس میں سخت حدت، لو اور پسینہ، قدم چلنا دوبھر ہوتا ہے۔ آزادی کے حوالے 'کشمیر جو کہ پاکستان کی شہ رگ ہے، کشمیر جو کہ جنت نظیر ہے، کشمیر جس کے لیے پاکستان نے دو جنگیں لڑیں، ہزارہا پاکستانیوں نے اپنی جانیں قربان کیں۔ آزادی کے حوالے ان جاں بازوں کی کہانی ہے جو کہ آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ انکل، یہ ایک بہترین کہانی ہے۔ ایک مناسب وقت پر اتنی اچھی کہانی، اتنا اچھا پس منظر اور اتنے اچھے پیرائے میں لکھنا کہ لگتا ہے کہ میں اس جگہ پر ہوں اور یہ سب مجھ پر بیت رہا ہے۔ میں اس کہانی کی اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار کروں گا۔ اس قسط میں طارق کی بہادری، جیل سے فرار، اس کے ساتھی کی شہادت، ہندوؤں کی ایک تنظیم کا اس فرار میں ساتھ دینا۔ یہ بتاتا ہے کہ اچھے لوگ ہر جگہ ہیں جو کہ ظلم کو ظلم سمجھتے ہیں۔ پھر طارق کے رابطے اور فوجی تربیتی کیمپ پر حملہ، جہاز کی تباہی، یہ سب کچھ اس طرح سے لکھا گیا ہے کہ پڑھنے والا اپنی نظر ہٹانا بھی گوارا نہیں کرتا۔ بہرحال اس کہانی کے متعلق کم از کم میں اپنا تبصرہ نہیں لکھ سکتا۔ یہ ایک بہترین، اچھی، صاف ستھری، شجاعت، بہادری، آزادی، ہمت، لمحہ بہ لمحہ کی

کشمکش، تباہی اور صبر و تشکر سب کی کہانی ہے۔ میری اور دوستوں کی جانب سے اقبال کاظمی کو مبارک باد قبول ہو کہ انہوں نے اپنے قلم کا صحیح استعمال کیا۔ دشمنِ جاں، غالباً ہر کسی کے ساتھ بچپن میں ایسے واقعات ہوتے ہیں کہ کوئی ایک ساتھی آپ پر بچپن میں حاوی ہو جاتا ہے جو کہ تمام عمر رہتا ہے اور کبھی جب اس کا سامنا ہو تو آپ کو وہ تمام باتیں یاد آجاتی ہیں۔ ایک اچھی کہانی جس میں حماقت بھی شامل تھی۔ دو دفعہ قاتلانہ حملہ اور دونوں دفعہ ناکام۔ پڑھ کر آخر میں مسکراہٹ چہرے پر آجاتی ہے، ایک ایسی کہانی ہے کہ جس سے بوریت دور ہو سکتی ہے۔ خدمتِ انسانیت، آخر وقت تک اس کا انجام پتا نہیں چلا۔ سسپنس شروع سے برقرار رکھنا بلاشک و شبہ مصنف کی اعلیٰ کارکردگی ہے۔ یہ ان کہانیوں سے ہٹ کر ہے جن میں شروع ہی سے انجام معلوم ہو جاتا ہے۔ ایک فارمولے کے حصول کی کہانی، انسانیت اور دنیا کو بھوک سے نجات دلانے کی کہانی جس میں بائز کو آخری لمحوں میں پتا چلا کہ یہ سب چکر غربت کو قریب سے دیکھنے کے لیے نہیں بلکہ موت کو گلے لگانے کے لیے ہے۔ ترجمے کے لیے عائشہ جمال مبارک باد کی مستحق ہیں۔ سرکش، میری پسندیدہ کہانی، کاش مجھے اس کی کوئی پوری کتاب لادے۔ انتہائی دلچسپ، بے شمار واقعات، جگہ جگہ اس میں گھومنا، اپنے معاشرے کے اندر، معاشرے کے لوگوں کے چہرے سے نقاب اُتارنا، معاشرے کی بے حسی، یہ سب واقعات، میں مصنف محمود احمد مودی کو سلام پیش کرنا چاہتا ہوں کہ کہانی پر گرفت ان کی بے حد مضبوط ہے۔ اس دفعہ افضل چوہدری ڈاکوؤں کے گروہ میں پھنس گیا ہے اور جاگیرداروں، نوابوں، وڈیروں کے لیے جان کی قربانی دیتے ہوئے لوگوں کے درمیان جو پہلے تو کسی سے جرم کرواتے ہیں پھر اپنی پناہ دیتے ہیں — پیسے اور ایموشن کے زور پر اپنا وفادار بناتے ہیں۔ چھیماں اس کہانی کا خاص کردار تھا۔ ہمارا معاشرہ جس میں تنہا عورت کا کوئی مقام نہیں، جہاں عورت کو اس مقام تک لانے میں ہم سب اپنا حصہ بخوبی ادا کرتے ہیں اور بالآخر اسے چھیماں بنا دیتے ہیں، وہاں ہم یہ نہیں دیکھتے کہ اس کو چھیماں بنانے میں ہمارا کیا رول تھا اور کیا اس کی مرضی تھی یا نہیں۔ طنز کے گہرے تیر بالخصوص چھیماں کا یہ پوچھنا کہ آیا کہ وہ ان بچّوں کو ہاتھ لگالے۔ ہمارے لیے ایک زبردست تھپڑ ہے۔ قدرت کے نظام کی برتری ہے۔ اسی طرح کہانی میں کروڑپتی نواب زادہ کا ایک سنسان جگہ آپریشن جہاں کوئی طبی سہولت نہیں۔ جو امرا نزلہ و زکام کا علاج بھی باہر کرواتے ہوں، وہ ایسی بے بسی میں مرجائیں، یہ سب اس نظام کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو کہ یہ بتاتا ہے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ایسی دولت کس کام کی جو کسی کام نہ آسکے۔ ایک اچھی کہانی تھی جسے پڑھنے میں لطف آیا۔ مقدر کا کھیل، تحفظِ گواہان کے تحت ایک ایسا شخص جو کہ تمام کالے دھندوں کا شریک تھا۔ سارے راز بتانے کے بعد حکومت نے اسے تحفظ فراہم کیا اور سلطانی گواہ کی حیثیت سے وہ ایک آزاد شہری بنا۔ مقدر نے اور اتفاقات نے اسے وہاں پہنچا تو دیا لیکن آگے وہ لالچ کا شکار ہوا اور پھر اسی لالچ کی وجہ سے وہ وہاں پر پہنچا جہاں پر تحفظ گواہان کے تحت پہلا شخص کسی علاقے میں رہائش پذیر تھا۔ بہرحال مصنف نے یہاں پر جیک کو پہلے لالچ کا شکار بنایا پھر جیک کے دل میں اپنے فیلو کے لیے اور اس کے بچّوں کے لیے رحم آیا۔ دُہری چال، اثر نعمانی ایک اپنا مقام رکھتے ہیں۔ جبران کی کہانی کافی عرصے بعد پڑھی۔ مزہ آیا۔ کہانی میں دلچسپی رکھنا یقیناً مصنف کا کمال ہے۔ ہمارے معاشرے میں جرائم کون کرتا ہے اور اس کے رکھوالے کون ہیں؟ یہ ہر کوئی جانتا ہے۔ چھوٹی مچھلی تو ہر کوئی پکڑ سکتا ہے لیکن بڑی مچھلی جو کہ نظر کے سامنے ہے اس پر گرفت کرنا مشکل ہے۔ آج کل ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے معاشرے کی ان کالی بھیڑوں کو باہر سزا دیں لیکن غالباً یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ لیکن جبران صاحب نے یہ سب کچھ اس طرح کیا کہ ان سب کرداروں کو سزا بھی مل گئی۔ کچھ جھول کے باوجود یہ کہانی اچھی ہے کیونکہ بڑے مہرے کبھی بھی سامنے نہیں آتے لیکن پھر بھی حالات کچھ اس طرح پیدا ہوئے کہ ان مہروں کو سامنے آنا پڑا۔ کنگھے کی چوری، نک ویلوٹ کا ایک اور کارنامہ۔ آج کل نک ویلوٹ باقاعدگی سے آرہا ہے۔ بے قیمت اشیا کو چوری کرنا بذاتِ خود ایک کہانی ہے لیکن جب اس کی اصلیت پتا چلتی ہے تو پھر اس شے کی قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بس یہ ہی نک ویلوٹ کا کارنامہ ہے کہ وہ اس شے کی قیمت بتا دیتا ہے کہ آخر اس میں کیا خاص بات تھی۔ اختتام اچھا رہا۔ ایک کنگھے کی چوری سے شروع ہونے والی کہانی قتل کے انجام تک گئی اور آخر میں اختتام میں بے وفائی کا شبہ صحیح نکلا۔ تجدیدِ تعلق، انتقام کی کہانی، یہ صرف مشرق میں ہی ہے کہ معاف کر دیا جائے جبکہ یہاں اس قسم کی کوئی چیز نہیں۔ اس قسم کی بے شمار کہانیاں پڑھی ہیں جن میں انتقام سالوں بعد لیا ۔۔۔ لیکن آج کل جدیدیت کا زمانہ ہے اور اس میں قتل جیسا جرم کچھ اس طرح سے کیا جاتا ہے کہ میڈیکل سائنس اسے قتل قرار نہیں دیتی بلکہ وہ ایک حادثہ قرار پاتا ہے۔ پس یہ کہانی بھی اسی ایک واقعے کو ظاہر کرتی ہے۔ شکاری، بہترین اور اچھی کہانیوں میں سے ایک کہانی۔ اگر میں کہوں کہ جاسوسی میں صرف سرکش اور شکاری کے لیے پڑھتا ہوں تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے جو کہ تاریخ کے ان کرداروں کو بتاتی گئی جو کہ مشرقی پاکستان کے المیے میں ملوث تھے، جو کہ اپنے منافع کی خاطر ملک کو دو ٹکڑے کروانے میں کوئی عار نہ محسوس کرتے۔ آج کل شہر پشاور میں یہ کہانی گھوم رہی ہے۔ چوہدری دلاور ایک بار پھر ان کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ قاتلانہ حملے ہو رہے ہیں۔ علاقہ غیر کی سیر، وہاں کے رسم و رواج، آصف کی پریشانی کا حل جو کہ اس کے کرموں کا پھل تھا۔ شکاری میں ایک بات نوٹ کرنے میں آئی ہے کہ سکندر، رابعہ، محسن۔ ان سب کے ساتھ کوئی کام بھی پہلی دفعہ میں نہیں ہوتا۔ راہ میں اتنی رکاوٹیں آتی ہیں کہ پڑھنے والے کو اگر اگلا کام فوراً ہی ہوتا ہوا نظر آئے تو بڑا عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔ آخر میں جس طرح سب خواتین گھر سے غائب ہوتی ہیں اور پولیس سکندر کو اُٹھا کر لے جاتی ہے اور جس طرح پولیس افسر انگریزی میں معذرت کرتا ہے اور قدموں کی چاپ کے ساتھ سکندر کا سر اُٹھا کر دیکھنا اور حیرت میں ایک دم مبتلا ہو جانا، کسی اچھے انجام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کہ آنے والا اپنا ہی بندہ ہے۔ خیر یہ تو اگلی قسط میں پتا چلے گا اور اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ بلاواسطہ، جرم کے خلاف چپ رہنا آج کل کے معاشرے کی ریت ہے لیکن معصوم بچّے نے ان سب باتوں کے برعکس کیا اور اپنی جان قربان کر کے قاتل کو انجام تک پہنچایا۔ یہ ایک قابلِ توصیف کہانی ہے۔ ایک بچّہ جو کہ اپنے جسم کو ساکت رکھ کر اس سے اپنی روزی کماتا ہے، اس نے ایک ایسے جرم کو ہوتے دیکھ لیا جس میں نہ تو مجرم اس کا کچھ لگتا ہے، نہ مقتول سے اس کی کوئی رشتے داری ہے۔ چور کی داڑھی میں تنکا والی مثال تھی۔ بعد از مرگ، ایک اور کہانی جس میں انتقام لینے کا طریقہ بالکل جدا تھا، ایک نئی بات تھی جو کہ ایک اشتہار سے شروع ہوئی اور وصیت نامے پر جا کر ختم ہوئی۔ بہت کم ایسا سننے میں آیا ہے لیکن مغرب کے ماحول میں ایسی کہانی بلاشبہ ایک دلچسپ، بہترین اور اعلیٰ پائے کی کہانی تھی لیکن اس میں ایک بات حیرت میں ڈالتی ہے کہ یہاں امریکا میں ڈاکٹر اتنا کماتے ہیں کہ شاید ہی کوئی اور کماتا ہو لہٰذا بس یہ بات ذرا.... سا ان نیچرل سی

لگتی تھی۔ مسروقہ کار' بات گاڑی کی خریداری سے نکل کر چوری ڈکیتی اور قتل تک جا پہنچی اور یوں کہانی میں مزید دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اور ایک جگہ تو والٹر کو بھی اپنی بیوی پر شک ہونے لگا تھا۔ اس طرح کہانی دلچسپی اختیار کرتی گئی۔ ایک اچھی کہانی تھی جس کو پڑھنے میں مزہ آیا۔ اور لوگوں کے لیے نصیحت کہ مسروقہ کار مت خریدیں' بھلے وہ آپ کی کتنی بھی پسندیدہ ہو۔ ناخلف' عبدالقیوم شاد ایک اعلیٰ لکھنے والوں میں ہیں' کہانی کا موضوع اگرچہ نیا نہیں ہے لیکن انداز نیا ضرور ہے۔ جس طرح بیٹوں نے اپنے والد کو آخری عمر میں چھوڑا' یہ ہمارے معاشرے کا المیہ بنتا جا رہا ہے۔ لیکن عبدالقیوم شاد نے کہانی میں جس طرح دلچسپ موڑ پیدا کیے ہیں' وہ کہانی کو پڑھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ احمد حسن سے کہانی شروع ہوئی جہاں پر دو لٹیروں باقر علی اور شاکر علی نے اس کی رقم کو لوٹا لیکن لالچ کے اندھے پن میں انہوں نے ایک قتل کردیا۔ جبکہ مقتول بھی لالچ کا شکار ہوا اور بلیک میل کرتا ہوا مارا گیا۔ یہاں پر اندھیرے میں روشنی کی کرن کی طرح نسرین نے اپنا کردار ادا کیا اور ایک حوصلہ افزا قدم اُٹھایا۔ یہاں پر احمد حسن نے بھی اس کا اس مشکل وقت میں ساتھ دیا اور اس کو اپنے گھر میں بیٹی کی طرح رکھا۔ آخر میں احمد حسن نے ایک اچھا فیصلہ کرتے ہوئے ساری انعامی بانڈ کی جیتی ہوئی رقم سے ایک فلاحی ادارہ قائم کردیا اور نسرین کو بھی اس کا حق دیا۔ یہ ایک اچھی' فلاحی اور عبرت کی کہانی تھی جو کہ ناخلف اولاد کے لیے طمانچہ' اچھے لوگوں کے لیے مثال اور لالچی لوگوں کے لیے عبرت رکھتی ہے۔ اعمال نامہ' ہمارے معاشرے کی کہانی ہے جس میں سیاست دانوں کا کردار واضح ہے اور ایک اچھوتا خیال ہے۔ غالباً میں اس طرح کی ایک دو اور کہانیاں پڑھ چکا ہوں۔ مصنف نے آخر میں بتادیا کہ صرف بات قوتِ ارادی کی ہے۔ سو یہ کہانی شروع ہوئی جس میں بے روزگار فرد' ایک بیوی' ایک سیاست داں اور معاشرے کو سُدھارنے والا حکیم ہے۔ یہ کہانی ان سب لوگوں کے گرد گھومتی ہے' آخر میں سیاست داں کی تقریر اور سب سے آخر میں دُکان کے گرد لوگوں کا ہجوم ہے جہاں پر جھوٹ' رشوت اور فراڈ کے کیپسول خوب بک رہے ہیں جو کہ ہمارے ماحول کی بہت اچھی عکاسی کررہی ہے۔ ایک اچھی کہانی جو کہ دلوں کو چیرا لگانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔' حسابِ دوستاں اگرچہ ان لوگوں کی کہانی ہے جن کا نہ تو کوئی دین ہے اور نہ مذہب ہے' نہ کوئی ملک ہے' جو کہ صرف اور صرف پیسے کے لیے کام کرتے ہیں۔ یہ کہانی ان دو دوستوں کی ہے جو کہ وقت کے ساتھ ساتھ دشمن ہوگئے۔ اگرچہ اس کہانی میں کافی زیادہ پوائنٹ ایسے ہیں جو کہ حقائق سے دور ہیں۔ سب سے پہلے تو کسی بھی ایسی تنظیم کا فرد اس طرح احمقانہ حرکت نہیں کرتا کہ خط ملا اور چل دیے۔ جب تک آپ کو اس کی فیملی کے متعلق کچھ پتا نہ ہو جس کے ممبر آپ بن کے جارہے ہیں۔ دوسرے ٹائیگر کا باپ جو کہ انٹرنیشنل سطح پر مقام رکھتا ہے' وہ اپنے معمولی کارکن کی بات پر اس طرح یقین نہیں کرتا۔ ایسے لوگ خود کبھی بھی ایسی جگہوں پر نہیں جاتے۔ خیر اس کے باوجود یہ کہانی ایک اچھی کہانی ہے۔ بد کا انجام بُرا' والی کہانی تھی جسے پڑھ کر انسان صرف یہ ہی کہہ سکتا تھا جو میں نے لکھا۔" (برادرم' ایک سال کے لیے اعزازی طور پر سرگزشت حاصل کرنے کی مبارک باد قبول کریں۔ آپ چونکہ دیارِ غیر میں بہت دور ہیں لہٰذا اعزازی پرچے کے ڈاک خرچ کی ذمے داری آپ کو برداشت کرنا ہوگی۔ اس سلسلے میں سرکولیشن منیجر سے رابطہ کریں)

انیلا خانم کی گُل افشانیاں' اولڈ ایریا کراچی سے "اُمید ہے کہ خدا کے فضل و کرم سے خیریت سے ہوں گے۔ ایک خوش گوار احساس کے ساتھ ٹائٹل پر سب سے پہلے خالص فلمی اسٹائل کے ساتھ موجود نوجوان پر نظر پڑی لیکن پرانی فلموں کے کیونکہ تصویر بلیک اینڈ وائٹ ہے نا۔ موصوف شکل و صورت کے ٹھیک ٹھاک ہی لگ رہے ہیں مگر ان کے گلاسز پر خون کہاں سے... ارے یہ کیا! نیچے موجود لڑکی شاید بے ہوش ہے یا پھر اسے احساس نہیں ہے۔ اگر خون اس کے چہرے پر گر گیا تو ذاکر صاحب کا اتنی محنت سے کیا گیا سارا میک اپ غارت ہوجائے گا۔ ویسے ذاکر صاحب کی ایک بات کی میں معترف ہوں' شکل چاہے جیسی بھی ہو' میک اپ بہت اچھا کرتے ہیں (بڑھاپے میں بیوٹی پارلر ہی کھول کر بیٹھیں گے) سرورق کے بعد چینی نکتہ چینی کی محفل میں قدم رکھا تو دیکھا' مقصود صاحب انعام یافتہ کرسی پر براجمان تھے۔ تبصرہ بس ٹھیک ٹھاک تھا' مبارک باد قبول کریں۔ مس جاسوسی کی طرف سے کیپٹن مشتاق کو دیے گئے جوابات نے تو روح تک سرشار کردی۔ ہمیں ان سے ایسے ہی کسی زبردست جواب کی توقع تھی۔ ویسے کیپٹن صاحب کو بھی اب ہوشیار ہوجانا چاہیے۔ مس جاسوسی کے ووٹ بڑھتے جارہے ہیں اور اس میں آپ کی برادری کے لوگ بھی شامل ہیں (ہمیں تو مس جاسوسی بھی اپنی ہی برادری کی لگتی ہیں) چینی نکتہ چینی کے بعد سوچنے لگی کہ شکاری پڑھوں کہ سرکش۔ آخر پرانی ہونے کی بنا پر شکاری کھولی مگر صرف ایک صفحہ پڑھ کر سرکش کی طرف لوٹنا پڑا۔ یہ مودی صاحب بھی کمال کی چیز ہیں۔ کبھی تو کہانی ایک دم بور کردیتے ہیں اور کبھی ایک دم زبردست۔ پچھلی دو اقساط سے ایکشن کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا ہے۔ اس دفعہ تو پوری قسط نے اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ ہماری سیاست کا حال تو سب نے ہی دیکھ لیا ہے۔ یہ سیاست داں ہی طالب علموں کو ڈاکو بننے پر مجبور کرتے ہیں۔ افضل چوہدری بے چارے تو پوری قسط میں بندھے رہے۔ کہانی پڑھنے کے دوران تو بالکل یوں محسوس ہوتا رہا جیسے نگاہوں کے سامنے کوئی فلم چل رہی ہو۔ سرکش کے بعد پھر شکاری کو شروع کیا۔ کلیم اللہ کی اس کے باپ کی منگیتر سے شادی کچھ اتنی زیادہ تعجب خیز بات نہیں رہی کیونکہ ہم پٹھانوں میں اور ہمارے علاقوں میں اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے۔ چوہدری دلاور کا دوسرا روپ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی اور یقین نہیں آیا کہ یہ وہی بددیانت' ملک دشمن چوہدری دلاور ہے۔ واقعات تیزی سے آگے بڑھے ہیں۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ اب باری آتی ہے اقبال کاظمی کی۔ آزادی کے متوالے انہوں نے جس خوب صورت انداز میں تحریر کی ہے' وہ صحیح معنوں میں لوگوں کے دلوں کو چھُو لیتی ہے۔ کشمیر میں آج جو کچھ ہو رہا ہے وہ پوری دنیا کے سامنے ہے مگر سب تماشا دیکھ رہے ہیں اور بھارت ان کی اس خاموشی کا مزید فائدہ اُٹھا رہا ہے۔ سرورق کے رنگوں میں حسبِ معمول شاد صاحب پہلے رنگ کے ساتھ موجود تھے جو کہ ناخلف کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ ماں باپ کے ساتھ ایسا سلوک کرنے والی اولاد زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ کہانی سرورق سے بالکل میچ نہیں کررہی تھی۔ دوسرا رنگ سرور اکرام کا اعمال نامہ سرورق سے میچ نہیں کرتا تھا مگر یہ واقعی ہمارے معاشرے کی سچّی تصویر ہے جسے سرور صاحب نے قلم کے ذریعے کاغذ کے کینوس پر اُتار دیا ہے جس کا ہر کردار سچا لگتا ہے۔ ہمارا معاشرہ آج ان منفی جذبات سے ہی اٹا پڑا ہے اور شاید یہی ہماری گمراہی کی وجہ بھی ہے۔ تیسرا رنگ ساجد امجد کا حسابِ دوستاں خالص فلمی اسٹوری تھی۔ اس دفعہ نک ویلوٹ کنگھا چوری کرتے ہوئے نظر آئے۔ یہ مسلسل چار ماہ سے جاسوسی میں حاضری دے رہے ہیں۔ اس دفعہ تو چورنی صاحبہ بھی موجود تھیں۔ ابوالمنصور کی مسروقہ کار ایک دلچسپ تحریر تھی۔ دشمنِ جاں' خدمتِ انسانیت' مقدر کا کھیل بے حد خوب صورت تحریریں تھیں۔ دُہری

چال' جیران کے نئے کارنامے پر مشتمل تھی جسے اثر نعمانی نے بہت خوب صورت انداز میں تحریر کیا تھا۔ بالواسطہ سیمین معراج کی ایک مختصر مگر اثر انگیز کہانی تھی۔ ویسے سیمین معراج کا آپ سے کوئی تعلق ہے (ہمارا نہیں پوچھ رہے ..... دلی نہیں ہے) تمام لطائف بھی اچھے تھے مگر ناول کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔"

محمد نواز رضوی' ملتان سے رقم طراز ہیں "میں کافی عرصے سے جاسوسی ڈائجسٹ کا قاری ہوں لیکن خط لکھنے کی جسارت پہلی دفعہ کر رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ اسے ردی کی ٹوکری کی نذر نہیں کریں گے۔ شکاری کافی عرصے سے میں اور میرے دوست پڑھ رہے ہیں۔ لیکن اب کہانی کچھ بور ہوتی جارہی ہے۔ سکندر بخت صاحب کو احمد اقبال صاحب بلی چوہے والا کھیل کھلا رہے ہیں۔ کہیں محسن کو غائب کر دیتے ہیں تو کہیں غالب کو اور جبران کو ڈھونڈنے نکل جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر ہم کچھ پڑھتے ہیں تو وہ ہے بھنوں کی محفل یعنی چینی نکتہ چینی جہاں معرکہ آرائی کا بازار گرم ہے۔ کہیں فریدہ رمضان کیپٹن کو ہری مرچیں کھلا رہی ہیں تو کہیں مشتاق صاحب کسی کو کوتے اور گلریاں کھلا رہے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کسی کو کیا کھلائیں۔" (یہ آپ کی سمجھ میں آئے گا بھی نہیں.....)

محبوب احمد' کراچی سے دھمکی کے ساتھ "آپ کی محفل چینی نکتہ چینی میں پہلی بار دستک دے رہے ہیں۔ امید ہے کہ آپ کبھی بھی پہلی دستک پر میرے لیے اپنی محفل کے دروازے نہیں کھولیں گے مگر ہم بھی دوسری یا تیسری دستک نہیں دیں گے یہ میرا پہلا اور آخری خط ہے۔ (اب کیا خیال ہے؟) آپ اس محفل کا نام بدل کر مرچیں ہی مرچیں رکھ دیں کیونکہ اس محفل میں سب مرچیں چباتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جاسوسی آپا اور دیگر باجیاں ہروقت کیپٹن بھائی جان اور دیگر بڑے بھائیوں سے لڑتی ہی نظر آتی ہیں۔ ویسے ہماری دعا ہے کہ آپ کی لفظوں کی جنگ اسی طرح جاری و ساری رہے اور ہمیں دونوں طرف کی راز کی باتیں معلوم ہوتی رہیں۔ جاسوسی ایک مکمل ڈائجسٹ ہے۔ تمام کہانیاں معیاری ہوتی ہیں۔ مستقل سلسلے سرکش' شکاری اور آزادی کے حوالے لاجواب ہیں۔ میرا ان سلسلوں کے بارے میں کچھ لکھنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ سرورق کے رنگ ہر دفعہ لاجواب ہوتے ہیں۔"

عبدالستار راجپوت' مخدوم آدم سے پہلی دفعہ اپنی آراء کے ساتھ "آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ یہ کون صاحب ہیں جو اس طرح مخاطب ہیں' تو جناب ہمیں بھی آپ کی بزم میں شرکت کی سوجھی تو ہم نے بھی کاغذ قلم اٹھالیا۔ میں تقریباً عرصہ ۳ سال سے اپنے ڈائجسٹ کا مطالعہ کر رہا ہوں لیکن بالکل خاموشی سے۔ چینی نکتہ چینی میں اپنے ساتھیوں کی دلچسپ نوک جھونک سے لطف اندوز ہوتا اور دل کرتا کہ میں بھی ان میں شامل ہو جاؤں لیکن پھر سوچتا کہ پتا نہیں مجھے یہ گھاس بھی ڈالیں گے یا نہیں (اب آپ کی کیا رائے ہے؟) ڈائجسٹ کے بارے میں کیا لکھوں کہ اپنی مثال آپ ہے' اس کا ہر رنگ اپنی جگہ ایسے ہی ہے جیسے کسی جڑاؤ ہار میں جڑے ہوئے ہیرے۔ کچھ عرصہ پہلے تک ہم پرچے کا آغاز شکاری سے کرتے تھے لیکن اب شاید شکاری کچھ تھک گئے ہیں' اب ان میں وہ پہلے والی تیزی نہیں رہی۔ احمد اقبال صاحب سے گزارش ہے کہ وہ کہانی میں غالب اور نازو کو فوراً انٹر کریں۔ سرکش اپنے مزاج کے مطابق تیزی سے مقبولیت حاصل کر رہی ہے جس کے لیے مودی صاحب مبارک باد کے حقدار ہیں۔ آزادی کے حوالے اقبال کاظمی صاحب کی ایک بہترین کاوش ہے۔ کہانی پڑھ کر اپنے کشمیری بھائیوں پر ہونے والے مظالم کی صحیح عکاسی ہو رہی ہے۔ جمہوریت پسندوں کے تشدد کے طریقے پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کے بعد نگ ولیوث سے ملاقات کو دل چاہا۔ وہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ہمیں ایک نئی اور انوکھی کہانی دے گئے۔ عبدالقیوم شاد صاحب کے بارے میں کیا لکھوں کہ کہاں میں اور کہاں وہ' بس جی چاہتا ہے کہ ان کی کہانیوں کو بار بار پڑھا جائے۔ سرور اکرام کی اعمال نامہ بھی بہترین تحریر تھی۔"

محمد شفیق نیئر' گاؤں سگیام کوٹلی آزاد کشمیر سے جھٹکوں کے ساتھ وارد ہوئے ہیں "انکل جی' اس مرتبہ جاسوسی خریدا اور جاسوسی خریدتے ہی مجھے زوردار جھٹکا لگا کیونکہ سرورق پر جو حسینہ تھی اس کے کان میں گھڑی نما ٹاپس تھے۔ پہلے تو میں حیران رہ گیا کہ یہ کیا' کانوں میں گھڑی! لیکن پھر سوچا کہ زمانہ ترقی کر گیا ہے۔ بہرحال مجموعی طور پر سرورق عمدہ تھا۔ سرورق دیکھنے کے بعد دوستوں کی اس محفل میں جسے آپ نے چینی نکتہ چینی کا نام دے رکھا ہے' آدھمکا۔ مقصود احمد بھٹی کو بہترین تبصرہ تحریر کرنے پر مبارک باد۔ انکل جی' یہ مس جاسوسی تو ہمارے کیپٹن مشتاق کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑ گئی ہیں۔ مس جاسوسی کے ساتھ ساتھ مس رُخ خان جو کہ چینی نکتہ چینی کے اس اکھاڑے میں پہلی بار کودی ہیں۔ محترمہ' آپ ہی بتائیں کہ کیا مس جاسوسی کم تھیں جو آپ بھی آدھمکیں۔ سب سے پہلے میں نے اپنی دل پسند کہانی سرکش پڑھی۔ سرکش کے بعد شکاری کو شکار کیا۔ شکاری نے اس مرتبہ کافی بور کیا۔ آزادی کے حوالے مقبوضہ کشمیر کے حوالے سے ایک بہترین کہانی ہے جو کشمیر کے مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کو کافی تفصیل کے ساتھ بیان کرتی ہے۔"

لیاقت علی زاہد' اختر آباد سے نہایت تیزی سے لکھتے ہیں "انکل میں نے پچھلی مرتبہ بھی خط لکھا تھا لیکن اس میں صرف نکتہ چینی تھی۔ اس لیے ٹوکری کی خوراک بن گیا۔ (تو کچھ چینی بھی ساتھ بھیجا کریں نا) شکاری اب بوریت کی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ آج کل سرکش نے اپنے تیز ٹیمپو کی وجہ سے قارئین کو اپنا گرویدہ بنایا ہوا ہے۔ اصل میں کہانی کا ٹمپریچر اس سے کم مزہ ہی نہیں دیتا۔ اور آزادی کے حوالے اقبال کاظمی کی لازوال قلم کشائی ہے جس سے ہر مسلم کا جذبۂ ایمان تازہ ہوتا ہے اور جذبۂ حریت کو جلا ملتی ہے۔ سرورق کا تیسرا رنگ ساجد امجد کی حساب دوستاں نئے موضوع اور نئے پلاٹ کے ساتھ بہترین کہانی تھی۔ بس ذرا طوالت کی کمی محسوس ہوئی۔ دوستوں کی محفل میں دوستوں کی صلح کروادیں' روز روز کی لڑائی اچھی نہیں ہوتی۔ باقی چٹکلے اچھے تھے۔"

کیپٹن مشتاق' لاہور سے توپوں کا رُخ گوجرانوالہ کی طرف کیے ہوئے لکھتے ہیں "جون کا شمارہ جو عید نمبر ہونا چاہیے تھا' خلافِ توقع عید سے قبل ہی مل گیا۔ سرورق پر محترم و محترمہ دونوں ہی قابلِ تھے۔ برابر کی نمائندگی دینے پر میں شاہد حسین کا مشکور ہوں۔ آپ آیئے اس محفل کی طرف جہاں توپ کی نوک پر کوئی پھول سجائے ہمارا منتظر ہے۔ گوجرانوالہ کی نمائندگی بغض معاویہ کے تاثر کے ساتھ بڑھتی جارہی ہے۔ مقصود بھٹی کے لیے مبارک

باد۔ احمد رضا بھائی' ہم مس جاسوسی کو حرام نہیں ہونے دیں گے اور ویسے بھی آپ نے ان کو کیا مرغی سمجھ رکھا ہے۔ اور مس جاسوسی جی' ہم اپنی بات پر قائم ہیں کہ آپ بڑی توپ قسم کی چیز ہیں اور آپ کی گولہ باری سے تو یوں لگتا ہے کہ آپ کی توپ ۲۵ ملی میٹر والی ہے جس کا گولہ گوجرانوالہ سے سیدھا لاہور آکر گرتا ہے۔ آپ نے اچھا کیا کہ لگے ہاتھوں اپنا مختصر سا فیملی تعارف بھی کروادیا۔ آخر تھوڑی بہت جان پہچان تو ہونی چاہیے نا۔ اگر اسی طرح آپ کا تعاون شامل حال رہا تو ایک دن گوجرانوالہ اور لاہور کا درمیانی فاصلہ ختم ہوجائے گا۔ مس رُخ خاں' پلیز اپنا رخ ذرا دوسری طرف کرلیں ورنہ پھر ہمیں بھی کراچی کا رُخ کرنا پڑے گا۔ کہانیوں میں اس دفعہ آزادی کے متوالے نمبرون رہی۔ سرکش اور شکاری کی دوڑ برابر جاری ہے۔ حساب دوستاں اچھی تحریر تھی۔ اس کے علاوہ دشمنِ جاں' خدمتِ انسانیت اور کنگھے کی چوری بھی خوب تھیں۔ تفصیلی تبصرے سے اس لیے گریز کرتے ہیں کہ نئے آنے والے دوستوں کو جاسوسی میں جگہ نہ دینا بھی زیادتی ہے۔"

روبینہ کوثر اوکاڑہ کی پہلی کاوش "میں پہلی مرتبہ اوکاڑہ سے چٹپٹی نکتہ چینی کی محفل میں براجمان ہونے کی کوشش کررہی ہوں اور یقین ہے کہ میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوجاؤں گی۔ سب سے پہلے ہماری طرف سے اقبال کاظمی صاحب کو زبردست مبارک باد کہ انہوں نے آزادی کے متوالے لکھ کر ہماری تشنہ آرزو کی تکمیل کی۔ اس دفعہ تو لگتا تھا محمود احمد مودی صاحب کامیابی کے سارے ریکارڈ توڑنے پر آگئے ہیں۔ سرورق کی پہلی کہانی ناخلف نے بہت متاثر کیا۔ حسابِ دوستاں بھی بہترین رہی۔ اعمال نامہ کچھ زیادہ متاثر نہ کرسکی۔ مقصود احمد بھٹی صاحب کو انعام یافتہ تبصرہ لکھنے پر مبارک باد۔"

غلام قادر شورو کورٹی سے لکھتے ہیں "انکل' عرض یہ ہے کہ کچھ ماہ کی غیر حاضری کے بعد پھر محفل میں آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ رسالہ ہاتھ میں آتے ہی سرورق کو سمجھنے کی کوشش کی جو کہ خاصا جاسوسانہ قسم کا تھا۔ پہلے تو یہ سمجھ ہی نہ آیا کہ لڑکے کے چہرے پر یہ کیا چیز رکھی ہوئی ہے۔ بعد میں یہ ہاتھ نکلا۔ لڑکی کی تصویر غیر معمولی طور پر حسین تھی۔ ویسے ٹائٹل شاندار رہا۔ تبصروں میں صنفِ نازک کے تبصرے خاصے دلچسپ ہوتے ہیں۔ اقبال کاظمی صاحب کی آزادی کے متوالے ایک بہترین کاوش ہے۔ ہیرو صاحب کو طلسماتی قسم کا ہیرو بنانے سے گریز کیا ہے جو کہ کہانی کی اصل جان ہے۔ سلسلے وار کہانیوں میں اب سرکش پہلے کی نسبت بہت ہی دلچسپ و سنسنی خیز ثابت ہورہی ہے۔ سرورق کے رنگوں میں سب سے دلچسپ اور سبق آموز رنگ محترم عبدالقیوم شاد صاحب کا رہا۔ ان کا قلم جب لکھنے پر آتا ہے تو معاشرے کے ناسوروں کو سربازار ننگا کرتا ہے۔ اعمال نامہ سرور اکرام صاحب کی اچھی کاوش تھی۔ حسابِ دوستاں ساجد صاحب کا رنگ کچھ اتفاقات پر مبنی محسوس ہوا۔ دیگر چھوٹی کہانیوں میں کنگھے کی چوری پسند آئی۔"

شمائلہ شاہین الجھنوں کے ساتھ سی ایم ایچ ملتان سے "اس دفعہ جاسوسی ۵ تاریخ کو ملا۔ سرورق وہی عام سا تھا۔ سب سے پہلے شکاری کے پاس پہنچے۔ شکاری عجیب ہی طریقے سے الجھتی جارہی ہے۔ اس کے بعد میں سرکش میں جاکر اُلجھ گئی۔ بے چارے چوہدری صاحب کو کہاں اتنے خطرناک لوگوں میں پھنسادیا ہے۔ اور ہاں' اس میں خانزادی کا حوصلہ واقعی چٹانوں جیسا تھا' میں داد دیتی ہوں اس کے حوصلے کی۔ اس کے بعد میں ناخلف کے پاس پہنچی' واقعی ناخلف اولاد کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیے۔ شاد صاحب نے بہت اہم موضوع پر قلم اُٹھایا ہے۔ ویسے کہانی سرورق سے میل نہ کھاتی تھی۔ سرور اکرام کا اعمال نامہ بھی اچھا تھا۔ اب میں جاسوسی کے جگر کی طرف آتی ہوں جو آزادی کے متوالے ہیں' دوسری قسط بھی خوب تھی۔ سلیم کی موت کا بہت دکھ ہوا۔ اس دفعہ نک ویلوٹ کی کنگھے کی چوری تھی تو مشکل لیکن کچھ زیادہ متاثر نہ کرسکی۔ اس دفعہ انعام مقصود احمد بھٹی نے لیا۔ بھئی مبارک ہو۔ اس دفعہ پرنس اے بی کشمیری خوب چمک رہے ہیں۔ خیر میں تو انہیں کچھ نہیں کہتی انہیں تو میری دوسری بہنیں سنبھال لیں گی۔ مجھے تو ترس آرہا ہے ان پر۔ مسز ادریس ہم آپ کے غم میں پوری طرح شریک ہیں اور مرحوم کے لیے دعا گو ہیں کہ خدا انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔ کیپٹن مشتاق' اب آپ اپنی خیر منائیے' بہت سارے لوگ آپ کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں جن میں آپ کی صنف کے بھی ہیں۔ اب آپ مس جاسوسی سے سوری کرکے سائڈ پر کھڑے ہوجائیں تاکہ دوسرے بھی سوری کرسکیں۔ انکل' آج میں بہت خوش ہوں کیونکہ میرا رزلٹ آگیا ہے اور میں پاس ہوگئی ہوں۔ اب انشاء اللہ بہت جلد کمیشن لے لینا ہے۔" (ہماری طرف سے مبارک باد قبول کریں)

آصفہ کا جواب آپ غزل' فیصل آباد سے "تین چار مہینے کی غیر حاضری کے بعد حاضر ہوں اور اس غیر حاضری کے دوران میرے متعلق بہت افواہیں اُڑائی گئیں جنہیں اُڑانے میں عاجز صاحب پیش پیش تھے۔ انکل' پہلے میں آپ کو اپنی غیر حاضری کی وجہ بتادوں' اگر آپ کو دلچسپی ہو۔ پہلے تو میں بیمار رہی کافی عرصہ پھر میرے تھرڈ ائر کے فائنل امتحان ہورہے تھے جن کی وجہ سے مصروفیت رہی۔ اب مجھے مبارک باد دیں کہ میں فورتھ ایئر میں پہنچ گئی ہوں (بہت بہت مبارک) اب میں ذرا عاجز صاحب سے دو دو ہاتھ کرلوں جن کی وجہ سے میں پچھلے دو ماہ سے شدید غصے کی کیفیت میں ہوں (بیماری کا سبب یہ غصہ ہی تو نہیں تھا؟) عاجز صاحب! پہلے تو یہ بتائیں کہ مس جاسوسی نے آپ کو کتنی رشوت دی ہے جو یوں ان کے ہم نوا بنے بیٹھے ہیں۔ ویسے آپ نے اپنا پولیس والا ہونا ثابت کردیا ہے لیکن افسوس کہ میں آپ کو رشوت نہیں دے سکتی۔ یہ تو گناہ ہے۔ میں نے تو پہلے بھی عرض کیا تھا کہ میں ہمیشہ ٹھیک بات کا ساتھ دیتی ہوں۔ مس جاسوسی اور راحیلہ اور کچھ اور لڑکیوں نے غلط بات کی تو میں نے انہیں ٹوکا۔ آپ بھی حوصلہ پیدا کریں درست بات کہنے اور کہنے کا۔ یہ سب بلاوجہ کیپٹن مشتاق کی برائیاں کررہی تھیں' میں نے منع کردیا تو آپ کو کیا ہوگیا اور آپ ایک دفعہ چھوڑ کر سو دفعہ ایف آئی آر درج کروائیں اور یہ جو آپ نے وارننگ دی ہے' اس کی میرے آگے کوئی حیثیت نہیں ہے۔ کیپٹن مشتاق آپ نے میری حمایت کی' بہت بہت شکریہ۔ شکر ہے کوئی تو ٹھیک بات سمجھا۔ ویسے آپ نے جو مشورہ مس جاسوسی کو چار نمبر والی بس کا دیا ہے وہ بہت اچھا ہے۔ پرنس آف جاسوسی صاحب! آپ نے لکھا ہے کہ امید ہے کہ آصفہ اب مس جاسوسی سے پنگا نہیں لیں گی تو اب میں آپ کی امیدوں پر پانی پھیرنے واپس آگئی ہوں۔ لیں جی مس رُخ خان کی کی رہ گئی تھی شرارت کرنے کی' وہ بھی پوری ہوگئی۔ موصوفہ فرمارہی ہیں کہ معصوم سی مس جاسوسی.... ہنسی آرہی ہے پڑھ کے' محترمہ کچھ تو ہوش کریں۔ ان کی تحریریں پڑھ کے وہ آپ کو معصوم لگتی ہیں؟ توبہ کریں۔ اوپر سے ان کا نام کس قسم کی معصومیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ کیپٹن مشتاق لڑکیوں کو چھیڑتے ہیں' یہ آپ نے کس وجہ سے کہا؟ اور یہ جو چھیڑخانی آپ کررہی ہیں' یہ کیا ہے؟ انکل جی! سارے حساب کتاب

صاف کر دیے ہیں۔ امید ہے کہ آپ کچھ کاٹیں گے نہیں (ہم بھلا کہاں اتنی ہمت رکھتے ہیں کہ کچھ کاٹیں' آپ کے بجائے حرف بہ حرف 'نقطہ بہ نقطہ نقل سجا دیے ہیں) شکاری اور سرکش بہت اچھے موڑ میں داخل ہو گئی ہیں۔ کشمیر کے موضوع پر کہانی لکھ کے آپ نے سب کی خواہش پوری کر دی اور دو کشمیری مجاہدین کے خط پڑھ کے بہت خوشی ہوئی۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اس کے علاوہ جاسوسی اس دفعہ ۳۱ مئی کو مل گیا۔ حیرت کا بہت شدید جھٹکا لگا تھا۔ کاش ہمیشہ ہی ایسا ہو۔"

آصف اقبال' ٹنڈوالہ یار سے رقم طراز ہیں "جون کے تازہ شمارے میں آپ نے واقعی ہمارے لیے عید کا مزہ دوبالا کر دیا۔ اس دفعہ ڈائجسٹ حیرت انگیز طور پر عید سے دو دن پہلے مل گیا جس میں آپ کی طرف سے عید مبارک تھی۔ آپ کو بھی ہماری طرف سے دلی عید مبارک قبول ہو۔ اس دفعہ سرورق جاسوسی کی روایت کے مطابق شاندار تھا۔ اس کے بعد اشتہاروں اور فہرست پر سے چھلانگ مارتے ہوئے چنی نکتہ چینی میں پہنچے۔ انعام یافتہ تبصرہ واقعی اچھا تھا۔ دیگر تبصرے بھی خوب رہے۔ اس کے بعد کاظمی صاحب کی شاہکار کہانی آزادی کے متوالے پڑھی۔ آپ نے لکھا ہے کہ اس کی صرف چار قسطیں ہیں مگر ہماری خواہش ہے کہ یہ اچھی خاصی طویل ہو۔ سرورق کے رنگ سرورق سے مطابقت نہیں رکھ پائے مگر عبدالقیوم شاد کی ناخلف واقعی زبردست رہی اور سرورق کے رنگوں میں نمبر ون رہی۔ سرور اکرام کی اعمال نامہ اچھوتی اور منفرد تحریر تھی مگر انجام اس کا اتنا اچھا نہیں ہو سکا۔ تیسرا رنگ تیسرے نمبر پر ہی رہا۔ جبران صاحب کافی دنوں بعد ایکشن میں نظر آئے اور واقعی عید کا خاص تحفہ ہی رہا۔ دیگر مختصر کہانیوں میں بگ ویلوٹ کا تازہ کارنامہ کنگھے کی چوری حسبِ روایت کامیاب رہی۔ پیچ در پیچ اتفاقات پر مبنی خالدہ شاد کی مقدر کا کھیل واقعی خوب رہی کیونکہ بعض اوقات اتفاقات ہی انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔ ابوالمنصور کی مسروقہ کار اور نسیم جاوید سید کی تجدیدِ تعلق بھی اچھی رہیں۔ بالواسطہ واقعی ایک عجیب انجام کی کہانی تھی۔ واقعی اس دفعہ جاسوسی ڈائجسٹ عید نمبر ہی رہا۔"

شیخ عبداللہ پاشا کا طرزِ تحریر' بہاول نگر سے "اس مرتبہ جاسوسی ڈائجسٹ اردو زبان کے سبھی قارئین سے مخاطب ہو کر کہتا ہے "شمارہ جون میں میرا دلکش سرورق تھا' مجھے خوبصورت کرنے کے لیے سرورق پر حسینہ کی تصویر تھی بلکہ فلمی ہیرو کی سی شکل و شباہت والا مرد بھی عینک لگا کر سرورق پر آدھمکا اور اپنے بوڑھے بابا جانی کو بھی لے آیا۔ اس طرح عجیب پچویشن پیدا ہو گئی۔ میرا دیدار کر کے قارئین کو چین نصیب ہوتا ہے۔ وہ ایک ماہ تک میرا انتظار کرتے ہیں۔ ان کے یہ لمحے کانٹوں پر بسر ہوتے ہیں' وہ مجھے بے وفا کہتے ہیں لیکن میں نے کبھی اپنی روش نہیں بدلی' ہمیشہ وقت پر وارد ہوا۔ کچھ میرے عشاق تعریف کرتے ہیں' کچھ تنقید اور کچھ عشاق دونوں۔ کبھی کبھی میرے پرستار آپس میں لڑ پڑتے ہیں۔ کبھی کیپٹن مشتاق اور مس جاسوسی ایک دوسرے پر فقرہ بازی کرتے ہیں لیکن میری حکمتِ عملی دیکھیے کہ کبھی نوبت اس سے نہیں بڑھی۔ مجھے شاہد حسین اور ذاکر صاحب جیسے شہرت یافتہ کہنہ مشق مصوروں کا تعاون حاصل ہے۔ رسائل کی دنیا میں کوئی میرا ثانی نہیں۔ میں پہلی اشاعت سے لے کر آج تک اوّل نمبر ہوں۔ میری دلی آواز ہے "آؤ اور مجھ میں کھو جاؤ.... اور اپنا دل بہلاؤ" میرا دعویٰ ہے کہ میں تمہاری تنہائیوں کا بہترین دوست ہوں۔ آپ آیئے مجھ میں شائع ہونے والی شاہکار کہانیوں کی طرف' جنہیں پڑھ کر آپ جاسوسی ادب سے محظوظ ہوتے ہیں۔ اقبال کاظمی کی منفرد تحریر آزادی کے متوالے آپ کو پسند آئی۔ یہ سنسنی خیز تحریر تھی۔ اسے پڑھ کر قوتِ ایمانی کو تقویت ملتی ہے۔ سرکش کو میرے صفحات پر شائع ہوتے ہوئے تین سال کا عرصہ پلک جھپکتے بیت گیا۔ آپ خواتین و حضرات سرکش کی رعنائیوں میں گم ہو چکے ہیں۔ کہانی انتہائی سنسنی خیز اور پراسرار موڑ پر پہنچ چکی ہے۔ فضول اشیاء چرانے والے چور بگ ویلوٹ کے کارنامے' کنگھے کی چوری کو آپ سب قارئین نے پسند کیا۔ اس بار چور اور چورنی کے مابین کاروباری معاملات طے پائے۔ کہانی بہت اعلیٰ پائے کی تھی۔ شکاری میرے قارئین کی جان جس کا وہ بہت انتظار کرتے ہیں' عروج پر پہنچ چکی ہے۔ اسے پڑھ کر کئی حضرات کے حواس معطل ہو جاتے ہیں۔ تجدیدِ تعلق بہترین ترجمہ شدہ کہانی تھی۔ ڈیرل سے لوسی بریڈن نے بڑا خوف ناک انتقام لیا۔ سرورق کے تینوں رنگ پھیکے تھے' کوئی بھی کہانی سرورق سے مطابقت نہ رکھتی تھی لیکن ویسے تینوں کہانیاں اچھی تھیں۔ اعمال نامہ میں میاں بیوی کے درمیان عجیب باتیں کروا کے زندگی کا نیا پہلو دکھلایا۔ کس انداز سے میاں بیوی نے اپنی اپنی محبت کا تذکرہ کیا۔ دشمنِ جاں' خدمتِ انسانیت' دہری چال اور مسروقہ کار شاہکار کاوشیں ہیں۔ مصنفین کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔"

ابن ناز کا تبصرہ' کراچی سے "اس وقت میرا بہترین دوست اور ساتھی یعنی جاسوسی میرے ہاتھ میں ہے۔ آج ۳۰ تاریخ ہے۔ اتنی جلدی اور وہ بھی جاسوسی ملے اور ہماری ملاقات ہو۔ یہ ناممکن بات آج ممکن ہو گئی۔ مجھے تو اب بھی بالکل خواب سا لگ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ سب سے پہلے نظر ٹائٹل ہی پر پڑتی ہے اور جب ٹائٹل پر نظر پڑی تو اف خدایا! خیر کرنا۔ اتنا خوب صورت ٹائٹل! واہ بھئی ذاکر انکل واہ' کمال کر دیا آپ نے۔ ویسے عرصہ دراز سے آپ نے مردوں سے جو دشمنی رکھی ہوئی اب تو توڑ ہی دی۔ پہلے تو آپ اتنے ڈراؤنے ڈراؤنے مرد بناتے تھے کہ رات کو ٹائٹل دیکھتے ہوئے بھی خوف آتا تھا۔ اس بار آپ نے جو نوجوان بنایا ہے' پتا نہیں کیوں اس کو دیکھتے ہی سرکش کے ہیرو افضل کا نقشہ ذہن میں آ گیا۔ ماہنامہ سرگزشت کے اشتہار کے بعد چنی نکتہ چینی پر نظر دوڑائی تو انعامی تبصرے پر مقصود احمد بھٹی صاحب کو براجمان پایا۔ مسز ادریس خان کا تبصرہ پڑھا۔ ان کے والد کے انتقال کی خبر پڑھ کر افسوس ہوا۔ ہماری دعا ہے کہ باری تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ اقبال کاظمی کی تحریر آزادی کے متوالے دیکھی۔ اس کی پہلی قسط کسی وجہ سے پڑھ نہ سکی' اس لیے دوسری قسط آرام سے پہلی قسط پڑھنے کے بعد ہی پڑھوں گی۔ اس کے بعد اپنی دل پسند کہانی پڑھی جس نے اب پھر ہمیں شکار کر لیا۔ ویسے اقبال صاحب! شکاری میں آپ نے پہلے کی قسطوں میں کلیم اللہ کی جس طرح کی باتیں لکھی ہیں اس سے تو موصوف آٹھ یا نو برس کے معصوم سے بچے لگ رہے تھے مگر اب کی قسط میں آپ نے اس کی عمر دو برس لکھی ہے۔ اس کے بعد شاد صاحب کا خوب صورت شاہکار ناخلف پڑھا۔ بہت پسند آیا۔ سرور اکرام کی اعمال نامہ پڑھی' کچھ عجیب سی کہانی تھی۔ پھر ساجد امجد کی حساب دوستاں پڑھی' یہ تو بالکل فلمی اسٹوری تھی۔"

مس جاسوسی ہمو کو جرنوالہ کی آمد اچھے موڈ میں "اس بار بھی ہمارا خط دیکھ کر منہ مت بنایئے گا۔ اصل میں انکل' میرا بہت دل چاہ رہا تھا کسی سے

باتیں کرنے کو۔ امی ہماری گھر میں نہیں ہیں۔ سارا دن مصروف رہنے کے بعد اور خاموش رہ کر ہم اکتا گئے تھے کہ بیٹھے بیٹھے ہمیں خیال آیا کہ۔ انکل پہلے تو دوسرے دن کا سلام قبول کریں۔ اب آپ حیران ہوں گے کہ یہ کیا طریقہ ہے خط لکھنے کا۔ وجہ یہ ہے کہ اوپر کی ساڑھے تین لائنیں رات کو لکھی تھیں اور دس بج گئے تھے لہٰذا خط اتنا ہی لکھ کر سو گئے تھے۔ اب صبح کے گیارہ بجے ہیں تو سوچا' اپنے اچھے سے انکل اور سوئٹ سے جاسوسی سے باتیں کرلی جائیں۔ جی' تو اس بار آپ نے شاید ہمیں حیران کرنے کا ارادہ کیا ہوگا جس میں آپ مکمل کامیاب رہے۔ ۲۹ مئی کو ہم گھر نہیں تھے' جب واپس آئے تو بے ہوش ہوتے ہوتے بچے۔ ہم تصور بھی نہیں کرسکتے تھے کہ جاسوسی صاحب اتنی جلدی آجائیں گے۔ سرورق کی حسینہ کی تعریف کرنا تو صرف مردوں کا کام ہے۔ ہاں بلیک گلاسز والے ہیرو' انڈین اداکار سلمان خان سے مل رہے تھے۔ چینی نکتہ چینی تک پہنچے تو کرسی اسٹینڈ پر مقصود صاحب بڑے ٹھاٹ سے براجمان تھے۔ پرنس اے بی سی ڈی' آج کل بے چارے واقعی بہت مصروف لگ رہے ہیں۔ ان کی سرگرمیاں تو ہمیں پہلے بھی کچھ مشکوک سی لگا کرتی تھیں' اس بار انہوں نے خود ہی تصدیق بھی کردی۔ انکل! اب ذرا اپنے دفتر کی کھڑکیوں کا خاص خیال رکھیں ورنہ سخت گڑبڑ ہونے کا اندیشہ ہے۔ احمد رضا! آپ نے ہمیں جون جولائی کی دوپہر سے تشبیہ دی ہے' آپ کا اندازہ بہت غلط ہے' ہم تو ان مہینوں میں بھی ٹھنڈے رہتے ہیں' یہ تو بس چند شرپسند عناصر نے ہمیں گرم کردیا ہے۔ اور ہاں کیپٹن صاحب! بھاگیں گے ہرگز نہیں بلکہ اسی ماہ دیکھیے گا اپنے تمام ہتھیاروں سے لیس ہو کر تشریف لائیں گے۔ فراز احمد رازی' ہم سے ہمدردی کرنے کا شکریہ لیکن کیا اس بات کی اجازت اپنے پارٹی لیڈر سے لی آپ نے؟ کیونکہ پہلے ہی ہمارے چند ہمدردوں کو اپنے غریب خانے میں انوائٹ کرچکے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم سے ہمدردی مہنگی پڑے اور آپ وہیں جا پہنچیں۔ اور اب ابتدائی صفحات کے ناول آزادی کے حوالے پر بات ہو جائے۔ ارادہ تو تھا کہ چاروں اقساط اکٹھی پڑھیں گے لیکن تمام خطوط میں اس کی اتنی تعریفیں پڑھ کر رہ نہ سکے۔ بہت خوب صورت' بہت عمدہ تحریر ہے۔ بھارت جس نے پوری دنیا میں سیکولرازم کا ڈھنڈورا پیٹا ہوا ہے اور ہمیشہ پاکستان کو زک لگانے کی کوشش کرتا ہے' وہ دن دور نہیں جب یہ اپنے ہی بچھائے ہوئے جال میں پھنس جائے گا۔ سرکش افضل چوہدری اتنے سارے حفاظتی انتظامات کرنے کے باوجود چوہے کی طرح جال میں پھنس ہی گئے۔ شکاری آہستہ آہستہ قدم بہ قدم اپنی منزل کی طرف گامزن ہے۔ سکندر کو بھی بڑی بری عادت ہے اپنے کیپٹن صاحب کی طرح اِدھر اُدھر ٹانگ اڑانے کی۔ آخر ضرورت کیا تھی عامر کو سبق سکھانے کی' اب ایک بار پھر خالی ہاتھ مکھیاں اُڑاتے رہیں۔ نک ویلوٹ اس بار ذرا بھی متاثر نہ کرسکے۔ سرورق کے رنگوں میں تیسرا رنگ حساب دوستاں بے حد اچھی بلکہ نمبرون رہی۔ اعمال نامہ دوسرے نمبر پر رہی اور بہت خوب صورت تحریر تھی۔ ناخلف کی تعریف نہ کرنا زیادتی کے مترادف ہوگا۔ دنیا میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ والدین اولاد کے لیے کیا کیا جتن کرتے ہیں' زمانے کے سرد و گرم سے بچاتے ہیں اور اولاد' والدین کو کیا صلہ دیتی ہے کہ والدین کے ذہن و گمان میں بھی یہ بات نہیں ہوتی کہ ان کی اولاد یہ صلہ دے گی۔ خاص طور پر شادی کے بعد تو نہ جانے اولاد کو بوڑھے ماں باپ کیوں کھٹکنے لگتے ہیں۔"

محمد شکیل طاہر' چوک ظاہر پیر' رحیم یار خاں سے "میں آپ کے جاسوسی ڈائجسٹ کا پرانا قاری ہوں اور نکتہ چینی میں بھی پہلی دفعہ حاضر ہو رہا ہوں۔ اس دفعہ آزادی کے حوالے پہلے نمبر پر رہی اور باقی شکاری اور سرکش گزارے لائق تھیں۔ نک ویلوٹ کی چوری بھی بہتر ثابت ہوئی۔"

محمد زبیر شامی' پاک بحریہ' کراچی سے رقم طراز ہیں "اس دفعہ کا جاسوسی بڑی مشکلوں سے ختم کیا ہے۔ ٹائٹل پر نظر پڑی تو منہ کا ذائقہ ہی خراب ہوگیا۔ وہی پرانی بات۔ رنگین حسینہ بلیک اینڈ وائٹ مرد۔ میرا خیال ہے کہ اس موضوع کو تبدیل کردینا چاہیے بلکہ الٹ دینا ہی بہتر ہوگا کیونکہ سچائی مٹ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے۔ ٹائٹل کے بعد ہنستی مسکراتی اور منہ بسورتی قارئین کی خصوصی محفل چٹپٹی نکتہ چینی تو اب ختم ہوگئی ہے۔ مس جاسوسی ابھی تک عید کا گوشت بانٹتی پھر رہی ہوں گی۔ کہانیوں میں آزادی کے حوالے بہت اچھی جا رہی ہے۔ جیسا کہ ڈائجسٹ کا نام جاسوسی ہے تو اس میں عالمی جنگوں اور پاک بھارت جنگوں کی جاسوسی کی کہانیاں زیادہ سے زیادہ شائع کریں اور پاکستان کے جیالوں کے جنگی کارناموں کی کہانیاں بھی ہونی چاہئیں تاکہ نوجوان نسل کو پتا چلے کہ اس وطنِ عزیز کی قدر و منزلت کیا ہے۔"

ایم رمضان ساجن' فیصل آباد سے لکھتے ہیں "آپ کی محفل میں پہلی بار شرکت کر رہا ہوں۔ اقبال کاظمی کی تحریر آزادی کے حوالے نے خط لکھنے پر مجبور کردیا جس طرح آپ شکاری یا سرکش چلا رہے ہیں' اگر اسی طرح آزادی کے حوالے جیسی کہانیاں آپ شائع کرنا شروع کردیں تو جاسوسی ڈائجسٹ ایک منفرد اور اعلیٰ ڈائجسٹ ہوگا۔ مئی ۹۳ء میں آزادی کے حوالے شائع ہوئی تو اس نے سبھی کاوشوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔"

شفقات تبسم' پلاک آزاد کشمیر سے نہایت خفگی کے ساتھ "میں جاسوسی ڈائجسٹ کا مستقل قاری ہوں۔ چینی نکتہ چینی پر نظر پڑی تو بہت سے قابلِ احترام دوست براجمان تھے۔ اب میں بھی بن بلائے چینی نکتہ چینی کی محفل میں آگیا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ مجھے قارئین اور مدیرِ اعلیٰ خوش آمدید کہتے ہیں یا کہ نہیں۔ میں بڑے پر زور الفاظ میں عرض کر رہا ہوں کہ آپ میرا یہ خط ضرور اپنے اگلے شمارے میں شامل کریں۔ ہم کشمیری لوگوں کے ساتھ پہلے بھی بڑی زیادتیاں ہوئیں۔ محترم انکل' اکثر کشمیری نوجوان آپ کا پرچہ پڑھتے ہیں مگر بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ تقریباً سال گزر چکے ہیں مگر کسی بھی کشمیری نوجوان کو آپ نے اپنی محفل میں شامل نہیں کیا۔ ایک طرف تو آپ یہ نعرہ لگا رہے ہیں کہ کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے اور دوسری طرف یہ زیادتیاں آخر کب تک؟ (آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ کشمیر سے اکثر و بیشتر قارئین شریکِ محفل ہوتے ہیں) چینی نکتہ چینی میں آپ کا مستقل قاری بننے کے لیے مجھے جس کہانی نے سب سے زیادہ مجبور کیا وہ آزادی کے حوالے ہے۔ اس سے پچھلے شمارے میں مجھے ٹریڈ دہشت گرد' محافظ فرشتہ سب سے زیادہ پسند آئیں۔ اس ماہ کی قسط میں شاید آزادی کے حوالے کہانی ختم ہو جائے مگر آئندہ ہر ماہ کے شمارے میں میرے پیارے کشمیر کی ایک نہ ایک کہانی ضرور ہونی چاہیے۔ میں اقبال کاظمی صاحب کو عظیم سلام پیش کرتا ہوں جنہوں نے ہم کشمیری لوگوں کے لیے اتنی اچھی کہانی کا انتخاب کیا۔"

راجا محمد تسرور انور خاں' ملیاں بالا آزاد کشمیر سے محبتوں کے ساتھ "۱۹۸۴ء سے میں ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کا قاری ہوں اور شاذ ہی کوئی شمارہ مجھ سے رہ گیا ہو تو کہہ نہیں سکتا ورنہ آج تک کوئی شمارہ رہنے نہیں دیا اور یقین کریں کہ میرے ڈرائنگ روم کی ۱۲ الماریاں جاسوسی ڈائجسٹوں سے بھری پڑی ہیں۔ میرے یار کہتے ہیں کہ راجے تم تو ہاتھ دھو کر جاسوسی کے پیچھے پڑ گئے ہو' میں انہیں کہتا ہوں کہ بے شک میں سرگزشت' سسپنس بھی پڑھتا

ہوں تو ساتھ جاسوسی بھی ضرور پڑھتا ہوں۔ سب سے پہلے عبدالقیوم شاد کی ناخلف پڑھی' واقعی نافرمان اولاد کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہونا چاہیے۔ سرکش اور شکاری بڑے پیارے انداز میں اپنی مسافت طے کر رہی ہیں۔ آزادی کے حوالے بڑے غضب کی بیانی ہے۔ اقبال صاحب نے مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں پر ہونے والے ظلم و ستم کے بارے میں اپنی کتھا لکھ کر نوجوانوں کے دلوں میں جوش و خروش کی ایک نئی لہر پیدا کر دی ہے۔"

شبنم کوکب' اکال گڑھ سے مخاطب ہیں "ماہ جون کا رنگ بکھیرتا ہوا شمارہ ہاتھ میں تھا اور مجھ پر زلزلے کی طرح کپکپی طاری تھی۔ پتا نہیں اب رسالے کی حاضری کی وجہ سے میری یہ کیفیت تھی یا ایک سو چار بخار اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ چینی نکتہ چینی میں حاضری کا چانس امتحانوں نے جھپٹ لیا سر اُٹھانے کی فرصت ملی ہے تو آپ کی خدمت میں نمک مرچ سمیت حاضر ہیں۔ (ہماری یہ محفل کچن میں برپا نہیں ہوتی) سب سے پہلے لاہور والے مقصود احمد صاحب کا تبصرہ پڑھا' خاصا چٹخارے دار تھا۔ مس جاسوسی تو تمہیں ہی 'مسٹر جاسوسی کوئی نئی پیداوار ہیں۔ فراز احمد صاحب کو لگتا ہے خوب سُنائی ہیں جو غصے سے مس جاسوسی کو کوّے کھانے پر مجبور کر رہے ہیں۔ فراز صاحب 'انجام اچھا نہیں ہوگا۔ دیکھیں انکل جی' یہ اپنے شہسواروں کو سمجھالیں ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ ہاں! یہ مفت کا رعب جھاڑتے ہیں ہم پر۔ وہ کیا کہتے ہیں مجنوں کو خواہش تھی لیلیٰ کی تو ہمیں آرزو ہے ایک عدد موٹی ہنڈیا میں چلانے والی ڈوئی کی سوئے چینی چاٹنے والے چوہوں کے لیے۔ انکل جی' میرے بھائی دبئی میں رہتے ہیں' وہ دس ریال کا ڈائجسٹ خریدتے ہیں۔ مجھے لکھتے ہیں کہ ۲۴ گھنٹے ڈیوٹی دینے کے بعد میں رات کے ایک دو بجے رسالہ پڑھنا شروع کرتا ہوں۔ قسط وار کہانیاں سرکش اور شکاری بڑے شوق سے پڑھتے ہیں ہمیشہ۔ وہ تبصرہ لکھنے کی تلقین کرتے ہیں اور نکتہ چینی میں میرا خط ڈھونڈتے ہیں۔ پلیز انکل جی' بھائی کو سلام اور میرا تبصرہ ضرور شائع کریں میرے پیارے بھائی کی خواہش کا احترام کریں جو پردیس میں ہیں (وطن سے دور رہنے والوں کے لیے تو ہماری محفل میں خاص جگہ ہے) اقبال کاظمی صاحب کی آزادی کے حوالے کی دوسری قسط خاصی پُراثر تھی۔ مودی صاحب کی سرکش کچھ بہتر ہے۔ بہت سے کردار جو اس کہانی کی پہچان تھے ستارہ جیسے کردار' وہ تو مودی صاحب کے قلم نے امر کر دیے۔ سرورق کے تینوں رنگوں میں آخری رنگ مجھے بے حد پسند آیا۔ نک ویلوٹ کی درآمد شدہ تحریر معیاری تھی۔ عائشہ جمال کی خدمت انسانیت حوصلہ افزا ثابت ہوئی۔"

روبینہ عطا' فیصل آباد سے لکھتی ہیں "آپ کی محفل میں پہلی بار شریک ہو رہی ہوں' اُمید ہے میزبانی کا ثبوت دیں گے۔ میں جاسوسی ڈائجسٹ تقریباً چار سال سے پڑھ رہی ہوں۔ جس کہانی نے خط لکھنے پر مجبور کر دیا وہ اقبال کاظمی کی آزادی کے حوالے ہے۔ کشمیر جیسے نازک مسئلے پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ سرکش کا تو جواب ہی نہیں' میں صرف اسی کے لیے جاسوسی خریدتی ہوں۔ باقی کہانیوں میں کنگھے کی چوری اور مسروقہ کار بے حد پسند آئیں۔ سرورق کے رنگوں میں عبدالقیوم شاد کی ناخلف بہت ہی متاثر کن تحریر تھی۔ آج کل چینی نکتہ چینی میں جو چپقلش جاری ہے اس کو کم کرنے کی ترکیب کرنی چاہیے اور امن و امان کی فضا قائم کرنی چاہیے۔"

شبیر احمد' المرتضیٰ اسپتال' صادق آباد سے مختصر تبصرے کے ساتھ "خلافِ توقع اس مرتبہ جاسوسی عید سے پہلے مل گیا۔ عید کی خوشیاں دوبالا ہو گئیں۔ سرکش بہت آہستہ آہستہ ہو گئی ہے۔ شکاری زبردست جا رہی ہے۔ اقبال کاظمی کی آزادی کے حوالے ایک ایسی کہانی ہے جس کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سرورق کا دوسرا رنگ بہت خوب صورت علامتی کہانی ہے۔ خلیل جبران کا کارنامہ پسند آیا۔"

شاہد علی' بانویں سندھ سے اپنے تبصرے کے ساتھ "جاسوسی ڈائجسٹ کا جون کا شمارہ عید سے ایک روز پہلے مل گیا۔ حسبِ معمول سب سے پہلے محمود احمد مودی کی لہو رنگ سرگزشت سرکش پڑھی جس میں ہمیشہ کی طرح بہت زیادہ ہنگامے تھے۔ اقبال کاظمی کی خوب صورت تحریر آزادی کے حوالے نے بہت متاثر کیا۔ سر سے کفن باندھ کر نکلنے والے مجاہدوں کی خون سے لکھی گئی کہانی بڑی دیر تک ذہن و دل میں گونجتی رہی۔ ناخلف۔ عبدالقیوم شاد کی خود غرض بیٹوں کے عجیب انجام کی دل پسند تحریر تھی۔ اعمال نامہ سرور اکرام کی کہانی حد درجہ خوب صورت اور انسانی جذبات کی عکاس تھی۔ جرم و سزا کے موضوع پر ساجد امجد کی حساب دوستاں ایک لالچی شخص کے گرد گھومتی ہے جس کو دنیا میں دولت اور شہرت کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا اور ان کے انجام نے رگ و پے میں سنسنی کی لہر دوڑا دی۔ مہتاب جلیل کی کنگھے کی چوری پڑھی' نک ویلوٹ نے کوئی خاص رنگ نہیں چھوڑا۔ عائشہ جمال کی خدمتِ انسانیت' کامل ظہیر کی دشمنِ جاں' پاکیزہ خان کی بعد از مرگ بھی ٹھیک تھیں۔"

رانا افتخار' چلاس سے پہلی دفعہ لکھتے ہیں "میں جاسوسی ڈائجسٹ کا مستقل قاری ہوں لیکن خط نہیں لکھ سکا۔ جون کا شمارہ لیا تو پہلے میری نگاہ چینی نکتہ چینی پر پڑی جہاں پر میرے بہت سے قارئین دوست براجمان تھے۔ سب سے پہلے میں نے اپنی محبوب کہانی محمود احمد مودی کی سرکش پڑھی' بہت اچھی کہانی تھی۔ اس کے بعد تمام کہانیاں پڑھیں سرورق کے ۲ رنگ اچھے تھے' اقبال کاظمی کی آزادی کے حوالے نے بہت متاثر کیا۔"

سردار عتیق الرحمان' الخبر السعودیہ سے شکووں کے ساتھ "چینی نکتہ چینی کے در پہ کھڑے مسلسل چند مہینوں سے دستک دے رہے ہیں مگر ہمارے لیے دروازہ نہیں کھولا گیا۔ شاید یہ آپ کے ظلم کی انتہا ہے۔ ہم جیسوں کے خطوط ہمیشہ ردّی کی ٹوکری کی نذر ہوئے۔ کیا یہ ناانصافی نہیں ہے' سراسر زیادتی نہیں ہے؟ آپ کو یہ اندازہ نہیں' میں جاسوسی ڈائجسٹ کو کتنا چاہتا ہوں۔ شاید اتنا آپ نے ہیر کو نہیں چاہا ہوگا (ہمیں اندازہ ہے) آزادی کے حوالے کے عنوان سے جو کہانی شروع کی ہے یہ ایک منفرد و نایاب پیش کش ہے۔ سرکش کی یہ قسط ہیرو کی بے بسی پر مبنی رہی۔ چوہدری افضل کی سرکشی' دھری کی دھری رہ گئی۔ شکاری' نازو اور غالب کے بغیر تو ادھوری ہے۔ احمد اقبال صاحب سے گزارش ہے پلیز اب غالب اور نازو کو سامنے لائیں۔"

محمد رضا شاد' گلشن اقبال سے رقم طراز ہیں "پہلی بار اس بزم میں ہزاروں اُمیدوں کے ساتھ شامل ہو رہا ہوں لیکن اگر اس بار بھی اپنا نام نہیں پایا تو تیسرے خط میں بھی یہی لکھوں گا کہ پہلی بار اس بزم میں شریک ہو رہا ہوں۔ سب سے پہلے سرورق پر نظر پڑی۔ ذاکر صاحب نے زبردست بنایا ہے۔ آزادی کے حوالے کی دوسری قسط ختم کی۔ کہانی اچھی جا رہی ہے۔ پھر اپنی پسندیدہ سیریل سرکش پڑھی۔ اس ماہ ایکشن کم اور باتیں زیادہ تھیں۔ شکاری پھر سے سرگرمِ عمل ہو گئے ہیں اور ایم آر ایس پھر نئے سرے سے تعمیر ہو رہی ہے۔ سرورق کے رنگوں کی طرف باقی تمام کہانیوں کو چھوڑ کر لپکے کیونکہ سرورق نے کچھ زیادہ ہی بے چینی پیدا کر دی تھی۔ عبدالقیوم شاد صاحب پھر پہلے نمبر پر براجمان تھے۔"

کلرک غلام رسول، سرگودھا چھاؤنی سے نہایت صدمے سے لکھتے ہیں "ہم آپ سے اس حد تک ناراض ہو چکے ہیں کہ اس سے آگے کوئی راستہ باقی نہیں رہا۔ غضب خدا کا، اکٹھے تین ماہ کے لگاتار تین تبصرے کھا گئے... اتنا افسوس ہوا کہ اب آپ کو آخری بار لکھ رہا ہوں، اس کے بعد خاموش تماشائی رہوں گا اور قطعاً زندگی میں تبصرہ کرنے کی جرأت نہیں کروں گا۔ جاسوسی سے جو ہمیں محبت ہے، وہ تو ہے اور رہے گی مگر آپ سے تادمِ زندگی یہ شکایت ضرور رہے گی۔"

سیپ، راولپنڈی سے فرماتی ہیں "انکل جی! ہم پہلی بار آپ کی چینی نکتہ چینی میں شریک ہونے کی جسارت کر رہے ہیں۔ دیکھیں آپ کوئی دُہری چال چل کر ہمارے خط کو سروقہ کار کی طرح اِدھر اُدھر مت کر دیجیے گا ورنہ ہم آزادی کے متوالے، ناخلف اولاد کی طرح سرکش ہو جائیں گے اور آپ سے تجدیدِ تعلق کی کوئی صورت نہیں رہے گی۔ ہمارا خط بالواسطہ طور پر کسی شکاری کے حوالے کر دیا تو ہم تو اسے مقدر کا کھیل سمجھ کر خاموش ہو رہیں گے۔ بالوں میں بار بار انگلیاں پھیرنے کی وجہ سے ہیئر اسٹائل کا بیڑہ غرق ہو گیا ہے۔ اب اپنے پیارے بالوں کو اصلی حالت پہ لانے کے لیے کسی کزن کے عمدہ سے کنگھے کی چوری کرنا پڑے گی۔"

ملک مسرت جبیں کھوکھر عرف گڑیا، ظاہر پیر ضلع رحیم یار خان سے "انکل! میں آپ کا ڈائجسٹ پڑھنے والی سب سے چھوٹی قاری ہوں۔ کیونکہ جب میں پانچویں جماعت میں پڑھتی تھی تو ہمارے گھر میں سب جاسوسی ڈائجسٹ کو پڑھتے تھے۔ میرے گھر والوں نے مجھے یہ پڑھنے سے نہ روکا اور اب میں نویں میں ہوں اور باقاعدگی سے جاسوسی ڈائجسٹ کا مطالعہ کرتی ہوں۔ جہاں تک میرا خیال ہے اسی ڈائجسٹ ہی کی وجہ سے میں اسکول میں بہت ذہین ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ کم عمری کی وجہ سے بات لکھنے کا سلیقہ نہ آتا ہو۔ اس مرتبہ شکاری کا ٹیمپو بہت سست تھا۔ نازو اور غالب کے نہ ہونے کی وجہ سے کہانی میں زیادہ مزاح نہیں رہا۔ سرکش بہت تیز چل رہی تھی مگر اب اس کا ٹیمپو بہت سست ہو گیا ہے۔"

اشرف خان بنگش، قیدی C.P، جوڈیشل لاک اپ ساہیوال سے لکھتے ہیں "آپ کی اس پھولوں بھری محفل میں پہلی بار شرکت کر رہا ہوں، اُمید ہے آپ ویلکم کہیں گے۔ کبھی کبھار آپ کا جاسوسی پڑھ لیا کرتا تھا لیکن مجبور ہو کر مجھے بھی منگوانا پڑا۔ میرے سامنے جون کا شمارہ رکھا ہوا ہے۔ اگر سرورق کی تعریف نہ کروں تو یہ کفرانِ نعمت میں شمار ہوگا۔ شاہ صاحب کا رنگ پڑھ کر ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے آخری لمحوں میں جاوید میانداد نے چھکا لگا دیا ہو۔ شکاری سے دامن بچانا چاہا لیکن اب تو اس کا شکار ہو چکا ہوں۔ جس طرح تک ویلوٹ بڑی عمدگی سے چیزیں چرا لیتا ہے اسی طرح جاسوسی نے میرا دل چرا لیا ہے۔ سرکش واقعی نام کی طرح سرکش ہوتی جا رہی ہے۔ ایک حیرت والی بات یہ کہ جاسوسی کی صرف جاسوسی نہیں بلکہ دیدہ دلیری دیکھیے کہ یہاں لاک اپ میں بھی ہمارے دلوں پر جلترنگ بجانے آگیا ہے۔"

ظفر اقبال ظفری، بھکر سے رقم طراز ہیں "اس اُمید پر خط لکھ رہا ہوں کہ شاید آپ کے معیار پر پورا اُتر سکوں۔ اگر اس بار بھی خط شاملِ اشاعت نہ ہو سکا تو خط لکھنا تو دور کی بات، آپ کی محفل بھی نہیں پڑھوں گا۔ سرورق پر اتنی خوف ناک تصویر اور وہ بھی اس انداز میں۔ شاید یہ حسینہ کو دیکھ دیکھ کر آنکھوں کی بینائی کھو چکا ہے اس لیے تو حسینہ بھی مقتل میں بیٹھی بڑی مخمور نظر آرہی ہے۔ ویسے اپنے کیپٹن صاحب کی تو بات ہی نرالی ہے۔ جو ہم سب کا تنہا ہی دفاع کر رہے ہیں۔ ویسے یہ مس جاسوسی صاحبہ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی چہکنے لگی ہیں۔ سرکش حسبِ معمول اس بار بھی ٹاپ پر رہی اور متاثر کن آزادی کے متوالے بے حد شاندار اور دل موہ لینے والی ایک بہترین کاوش ہے جسے مدتوں یاد رکھا جائے گا۔ کنگھے کی چوری تک ویلوٹ کا بہترین کارنامہ تھی جو بے حد پسند آئی۔"

بشریٰ ارشد، گلگشت کالونی ملتان سے خوشی اور حیرت کے ساتھ "جاسوسی ڈائجسٹ ہم تک یکم کو پہنچا تو خوشی اور حیرت سے عجب حال ہوا۔ جیسے ہی جاسوسی صاحب نے گھر میں قدم رکھا تو حسبِ معمول وہی جھگڑا کہ پہلے کون پڑھے؟ حتیٰ کہ نوبت قرعہ اندازی تک جا پہنچی۔ قرعہ ہمارے نام ہی نکلا۔ میں فرضی کالر جھاڑتی، شور مچاتی رسالہ پکڑے بیٹھی تو سب کے منہ پر بارہ بج چکے تھے۔ سب سے پہلے سرورق پر نگاہ دوڑائی تو یہ دیکھ کر حیرت کا جھٹکا لگا کہ ایک حسین دوشیزہ اپنی ٹھوڑی کے نیچے خون کی ایک ندی کے باوجود نہایت اطمینان سے آنکھیں بند کیے خدا جانے کس سوچ میں غوطہ زن تھی اور ندی بھی وہ جس میں ایک شخص بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور شخص بھی سرورق پر براجمان تھے، گلاسز سمیت اور غضب یہ کہ ان کے گلاسز میں سے بھی خون ٹپک رہا تھا۔ سرورق سے سفر کرتے ہوئے چینی نکتہ چینی تک پہنچے۔ مقصود احمد بھٹی کا تبصرہ واقعی انعام کے قابل تھا۔ اقبال کاظمی کی اس کاوش کے بارے میں کیا کہیں کہ انہوں نے ہم سب کی ایک دیرینہ خواہش پوری کر دی۔ کامل ظہیر کی دشمنِ جاں اور عائشہ جمال کی خدمتِ انسانیت خوب رہیں۔ افضل چوہدری کے بارے میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ آسمان سے گرا تو کھجور میں اٹکا۔ دُہری چال میں جبران سے ملاقات نے لطف دوبالا کر دیا۔ تک ویلوٹ کنگھے کی چوری میں کوئی خاص رنگ نہ دکھا سکے۔ شکاری شروع میں ڈھیلی رہی مگر آخر میں اپنے مخصوص رنگ میں نظر آئی اور احمد اقبال نے کہانی کو ایسے دلچسپ موڑ پر ختم کیا کہ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ ابوالمنصور کی سروقہ کار خوب رہی۔ سرورق کے تینوں رنگ خوب رہے مگر سرور اکرام کی اعمال نامہ سب پر سبقت لے گئی۔"

مس رُخ خان، گرین ٹاؤن کراچی سے کچھ ہوش اور بے ہوشی کے عالم میں "اپنا خط جاسوسی میں دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ ہم خوشی سے دیوانے اور خود سے بے گانے ہو گئے۔ اس مرتبہ جاسوسی انتیس کو ملا تو ہم حیرت کے مارے بے ہوش ہو گئے۔ جانے کب ہوش آیا، شاید صدیوں کے بعد۔ ہمیں تو یہی محسوس ہو رہا تھا۔ انکل جی! یہ ہماری تصویر آپ کو کہاں سے مل گئی اور آپ نے ہماری تصویر کو سرورق کی زینت بنا دیا۔ کہیں ذاکر صاحب نے ہم کو خواب میں تو نہیں دیکھا۔ ارے یہ کیا! کیپٹن مشتاق کی بھی تصویر سرورق پر شائع ہوئی ہے مگر یہ ان کا رنگ کیوں اتنا سُرخ ہو رہا ہے۔ لگتا ہے بہت غصے میں ہیں۔ کہیں اپنے سے بڑے افسر سے ڈانٹ تو نہیں پڑ گئی۔ ویسے پڑنی بھی چاہیے۔ اپنا کام چھوڑ کر لڑکیوں کو چھیڑنے آجاتے ہیں۔ اور انکل جی! ہمیں نواب صاحب سے بہت زیادہ شکایت ہے، وہ اس لیے کہ وہ اپنی کہانیاں صرف اور صرف سسپنس میں شائع کرواتے ہیں۔ کیا جاسوسی ان کا کچھ نہیں لگتا؟ صرف سسپنس ہی ان کا ہوتا سوتا ہے۔ بس ہم کچھ نہیں جانتے" نواب صاحب سے کہہ دیں کہ وہ جاسوسی میں بھی اپنی کہانی شائع کروائیں ورنہ ہم

آپ کے دفتر سو روپے خرچ کرکے پہنچ جائیں گے اور بھوک ہڑتال شروع کردیں گے (یہ غضب مت کریے گا) ہم مس جاسوسی سے دوستی کرنا چاہتے ہیں' کیا وہ ہم سے دوستی کرنا پسند کریں گی؟ سرورق بہت خوب صورت تھا' کہانیاں کچھ پسند آئیں' کچھ نہیں۔ آزادی کے متوالے کہانی بہت پسند آئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہم خود ہی وہ مجاہد ہیں۔ کاش کشمیر آزاد ہوجائے! اس بار بھی شکاری بہت اچھی رہی۔"

لیڈی سب انسپکٹر گل ریز حسن ملک' دھمکیوں کے ساتھ اعوان پور سے "بہت عرصہ ہوا' یہ جی میں ہے کہ دوبارہ حاضری لگوائی جاہیے مگر پھر یہ سوچ کر قلم نہیں اٹھا پاتی کہ پہلے کی طرح یہ سعی بھی سعیٔ لاحاصل ہی ثابت نہ ہو کیونکہ ۹۲ء کے آٹھویں ماہ پوسٹ کردہ میرا لیٹر آپ اپنی ردی کی ٹوکری کی ملی بھگت سے ہضم کرچکے ہیں۔ خدا جانے کیسا زود ہضم معدہ پایا ہے۔ چینی نکتہ چینی میں ایسے ایسے پُر مغز اور نستعلیق قسم کے تبصرہ جات ہمارے محترم قاری بہن بھائیوں کے ہوتے ہیں کہ پڑھ کر اپنی کم مائیگی کا احساس فزوں تر ہوجاتا ہے کیونکہ میں تو ویسے ہی کم تعلیم یافتہ ہوں پھر لکھنے کا فن... تو بالکل نہیں آتا۔ بہرحال اس خط کو شاملِ اشاعت کرلیں ورنہ ممکن ہے کہ آپ کو شاملِ تفتیش کرلیا جائے۔ عبدالقیوم شاد صاحب نے اپنی روایت برقرار رکھتے ہوئے ناخلف نامی کہانی تخلیق کی ہے گویا بے بس معاشرے کے منہ پر طمانچہ مارتے ہوئے آئینہ دکھایا۔ شاد صاحب کو ان الفاظ کے ساتھ مبارک باد کہ ان کی کوشش اور محنت رائیگاں نہیں ہوئی۔ نک ویلوٹ نے کچھ خاص مزہ نہیں دیا۔ خلیل جبران کی واپسی فیلڈ میں اچھی لگی۔"

غلام عباس نازش' چیلیانوالہ سے لکھتے ہیں "مجھے تصویر کھنچوانے کا بہت شوق ہے۔ عید سے ایک دن قبل بازار میں ہر طرف ہر دُکان پر میری تصویریں تھیں اور لکھا تھا "نیا جاسوسی آگیا" ذاکر صاحب نے میرے جیسا قدرے سانولا' کلین شیو' عمر لگ بھگ بیس بائیس کے درمیان ایک لڑکا پینٹ کیا ہے۔ کاش کہ میرے آگے مس جاسوسی ٹھنڈی آہیں نہ بھر رہی ہوتیں! تو تمام قارئین مجھے دیکھ لیتے' پہچان لیتے۔ چلیں جی' مس جاسوسی کا دل بھی تو بہلانا تھا ذاکر صاحب نے۔ پیچھے کون جل رہا ہے' لگتا ہے کیپٹن مشتاق ہیں۔ دیکھیے اب چمن سے کون سا پرندہ کون سا گیت الاپتا ہے۔ سب سے پہلے سرگزشت پڑھی۔ شکر ہے چوہدری افضل صاحب اپنے بل سے باہر تو آگئے۔ دیکھیے کیا بنتے ہے قطرے پر گہر ہونے تک۔ آزادی کے متوالے کھلنا شروع ہوگئی ہے۔ کہانی جرأت' بہادری' محبت جنگ' ہر چیز پر مشتمل ہے۔ اقبال کاظمی صاحب خوب صورت لو رنگ تحریر پیش کر رہے ہیں۔ عبدالقیوم شاد کی ناخلف پڑھی' اولاد کی نافرمانی اور سفید خون ہونا اسی کو کہتے ہیں۔ سرور اکرام کی اعمال نامہ بھی اچھی تھی۔ حساب دوستاں بھی اچھی تحریر تھی۔"

طاہر الدین بیگ' میرپور خاص سندھ سے آہوں اور چیخوں کے ساتھ "جون کے خوب صورت ٹائٹل اور دل کش کہانیوں سے آراستہ جاسوسی ڈائجسٹ کا مطالعہ کیا۔ ہر رنگ اپنی جگہ خوب صورت تھا۔ منفرد پلاٹ پر دل کش انداز سے کہانیاں پھیلائی گئی تھیں اور خوب تھیں۔ ناخلف کا کوئی جواب نہیں بہت شاندار کہانی جس کے لیے مصنف کو مبارک باد۔ اقبال کاظمی آزادی کے متوالے خوب لکھ رہے ہیں' ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنے لہو سے یہ کہانی لکھی ہے۔ نک ویلوٹ کی کہانیوں کا اپنا ایک انداز ہے اور یہ انداز کنگھے کی چوری میں بھی سرفہرست رہا۔ مقدر کا کھیل بھی خوب رہا مگر خدمتِ انسانیت کا بھی اپنا رنگ رہا۔ ایک طرف خالدہ شاہدہ اور دوسری طرف عائشہ جمال' اب دیکھنا یہ ہے کہ آئندہ یہ دونوں خواتین کیا لاتی ہیں۔"

بدر الدین میمن' گمبٹ ضلع خیرپور سندھ سے یوں گویا ہیں "جس طرح آج کل ہماری سیاست میں گرما گرمی ہے اسی طرح جاسوسی کے صفحات میں مس جاسوسی اور کیپٹن مشتاق صاحب کی نوک جھونک چل رہی ہے۔ میرا کیپٹن صاحب آپ کو اور مس جاسوسی آپ کو مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ دونوں صلح کرلیں کیونکہ ہم پاکستانی امن پسند قوم ہیں۔ ڈائجسٹ کی روح کہانی احمد اقبال صاحب کی شکاری ہے جس کو پڑھ کر وقت کٹنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ اقبال صاحب سے گزارش ہے کہ اب غالب اور نازو کو بھی کہانی میں شامل کرلیں کیونکہ ان کے بغیر کہانی پھیکی پھیکی سی لگتی ہے۔ سرگزشت میں افضل چوہدری اس مرتبہ بڑی بُری طرح پھنسا ہے۔ کہانی کا ٹیمپو بہت تیز تھا۔ سرورق کے رنگوں میں شاد صاحب کی ناخلف پڑھی' شاد صاحب کی یہ ایک اچھی تحریر تھی۔ دوسرا رنگ اعمال نامہ پڑھا' سرور اکرام نے اسے لکھا تو اچھے انداز میں ہے لیکن یہ کہانی مجھے اچھی نہیں لگی۔"

محمد قیصر چوہان' شیخوپورہ سے فرماتے ہیں "یاد نہیں کہ میں کتنے عرصے سے جاسوسی ڈائجسٹ کا قاری ہوں لیکن محتاط اندازہ ہے کہ تقریباً اپنی نصف عمر سے اس کے مطالعے سے فیض یاب ہو رہا ہوں۔ کافی عرصے سے یہ خواہش تھی کہ چینی نکتہ چینی میں شرکت کروں لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ آپ کی محفل میں کیپٹن حضرات سے لے کر مسز اور مس جاسوسی وغیرہ کیل کانٹے سے لیس ہوکر آتی ہیں۔ ہم نازک مزاج تو نہیں کہ ان کے ہتھیاروں سے ڈر جائیں' بس ذرا ہوا کا رُخ دیکھ رہے ہیں۔ سب سے پہلے سرورق پر نظر پڑی اور بے اختیار ڈائجسٹ ہی دانتوں میں دبالیا۔ خون کے آنسو آنکھوں سے بہنے کا تو پڑھا تھا لیکن اب علم ہوا ہے کہ عینک بھی خون کے آنسو روک سکتی ہے۔ محمود احمد مودی کی سرگزشت پڑھی۔ خدا کا شکر ہے کہ مودی صاحب سائنس فکشن سے افضل صاحب کو نکال لائے۔ احمد اقبال کی شکاری پڑھی۔ لگتا ہے احمد اقبال صاحب کسی زمانے میں ایتھلیٹ رہے ہیں جہاں انہیں اپنی صلاحیتیں منوانے کا موقع نہیں ملا۔ اب تحریر کے ذریعے سکندر میاں اور ان کی ٹیم کو خوب دوڑا کر حسرت کے غنچے کھلا رہے ہیں۔ اس دفعہ سرور اکرام کی اعمال نامہ پہلے نمبر پر اور عبدالقیوم شاد کی ناخلف دوسرے اور ساجد امجد کی حساب دوستاں تیسرے نمبر پر رہی۔"

آصف سجاد لغاری' تحصیل کوٹ ادّو ضلع مظفرگڑھ سے کپکپاہٹ کے ساتھ "میں عرصہ ۳ سال سے جاسوسی پڑھ رہا ہوں مگر خط لکھتے ہوئے ہاتھ کانپتے ہیں۔ آج پہلی دفعہ چینی نکتہ چینی میں حاضر ہو رہا ہوں۔ میں نے ایک کہانی لکھی ہے' کہانی کس پتے پر بھیجوں؟ کیا آپ اس کو شائع کریں گے یا نہیں؟" (کہانی پڑھ کر ہی فیصلہ کیا جائے گا)

قارئین' چینی نکتہ چینی کے لئے مخصوص صفحات کا کوٹہ تمام ہوا۔ آئندہ ماہ تک کے لئے اجازت دیجئے۔ بہ شرطِ زندگی پھر ملاقات ہوگی' محبتوں' شکایتوں اور عنایتوں کے اسی صدرا ہے پر ۔۔۔ خدا حافظ۔

اقبال کاظمی

آزادی کے متوالے

جاسوسی ڈائجسٹ، جولائی 1993ء

کشمیر جنت نظیر آج ساری دُنیا کی نگاہوں کا مرکز ہے۔ اس وادی آہ و فغاں سے بلند ہونے والے شعلے بھارتی جبر و تشدد کی ان گنت داستانیں دُنیا کو سُنا رہے ہیں۔ دہلی کی تہاڑ جیل سے شروع ہونے والی یہ بھی ایک ایسی ہی داستان ہے جس میں بھارتی حکومت کی ان ظالمانہ کارروائیوں کی عکاسی بھی ہے جو وہ کشمیر پر اپنا غاصبانہ قبضہ برقرار رکھنے کے لیے کر رہا ہے اور شمعِ حُریت کے پروانوں کی اس جدوجہد کا احوال بھی ہے جو وہ اپنے وطن کی آزادی اور اہلِ وطن کی عزت و ناموس کے لیے جاں نثار کر رہے ہیں۔

آزادی کی راہ میں سربکف مصروفِ عمل رہنے والوں کی داستان

گلی سے نکلتے ہوئے سلمان نے ان دو پولیس والوں کو گلی میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ پولیس والے اسی کے گھر جا رہے تھے۔ اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ بروقت طارق کو لے کر گھر سے نکل آیا تھا لیکن اس کے خیال میں ابھی خطرہ موجود تھا۔ اس نے تانگے کو بائیں طرف موڑتے ہی چابک رسید کر دیا۔ بڑی سڑک پر تقریباً بیس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے تانگہ دائیں طرف کی گلی میں موڑ دیا لیکن اچانک ہی ایک پولیس والے نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ سلمان کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ سلمان کو اس پولیس والے کی صورت میں اپنی موت نظر آنے لگی۔ اپنی تو اسے پروا نہیں تھی لیکن اس کے خیال میں طارق کی جان قیمتی تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ طارق کو ہر قیمت پر بچانے کی کوشش کرے گا، اس کے لیے اسے خواہ اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑے۔

"کیا بات ہے سرکار! اگر تمہیں کہیں جانا ہے تو کوئی اور سواری دیکھ لو، میں گھر جا رہا ہوں۔ گھوڑا تھک گیا ہے، صبح سے جتا ہوا ہے۔" سلمان نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ہمیں تھانے چھوڑ آؤ پھر جا کے گھوڑا کھول دینا۔ ایک ملزم کو لے کر جانا ہے۔" پولیس والے نے کہا۔ وہ اس وقت ایک مکان کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے دروازے کی طرف رخ کر کے کسی کو آواز دی۔ دو اور پولیس والے مکان سے باہر آگئے، ان کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر آدمی اور ایک جوان لڑکی بھی تھی۔ ایک پولیس والا اس آدمی کو دھکے دیتا ہوا لا رہا تھا، لڑکی کا ہاتھ دوسرے کانسٹیبل نے پکڑا ہوا تھا۔ ان کے ساتھ مکان سے کچھ اور لوگ بھی نکلے تھے اور پولیس کو دیکھ کر چند راہ گیر بھی جمع ہو گئے تھے۔ دو پولیس والے لڑکی کو لے کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے لڑکی کو اپنے درمیان اس طرح دبا لیا تھا کہ وہ سینڈوچ بن کر رہ گئی تھی۔ تیسرا کانسٹیبل ادھیڑ عمر آدمی کو لے کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

جاسوسی ڈائجسٹ، جولائی 1993ء

"یہ کون ہیں سرکار! کیا کیا ہے انہوں نے؟" سلمان نے تانگہ ہانکتے ہوئے پوچھا۔ اس کی اپنی حالت بڑی غیر ہو رہی تھی۔

"پیار کے پنچھی ہیں یہ دونوں۔" آگے بیٹھے ہوئے ایک کانسٹیبل نے جواب دیا "اس کے گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے۔ یہ لوگ اندر عشق کی پینگیں بڑھانے لگے۔ اوپر سے گھر والے آگئے اور یہ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔ ان کے عشق کی کہانی اب تھانے میں پوری ہوگی۔"

"میں بے قصور ہوں حوالدار جی! یہ آدمی مجھے ذرا دھمکا کر اس مکان میں لے گیا تھا۔" لڑکی نے کہا۔

"چپکی بیٹھی رہ۔" کانسٹیبل نے اسے ڈانٹ دیا۔

سلمان خاموشی سے تانگہ ہانکتا رہا۔ اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر ان پولیس والوں کو یہ پتا چل جائے کہ جن سیٹوں پر وہ بیٹھے ہوئے ہیں ان کے نیچے وہ شخص موجود ہے جس کی تلاش میں پورے دہلی کی پولیس پاگل ہو رہی ہے تو وہ پیار کے ان پنچھیوں کو بھول جائیں گے۔

سیٹ کے نیچے چھپا ہوا طارق بڑی اذیت میں تھا۔ وہ گٹھڑی کی طرح دُہرا تہرا ہو کر دبکا ہوا تھا۔ اس کے زخموں کی تکلیف بڑھ گئی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے پورا جسم زخم بن گیا ہو جس میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ تانگے پر پولیس والے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کی ذرا سی غلطی اسے موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے نہ تو کوئی حرکت کر سکتا تھا اور نہ ہی منہ سے کوئی آواز نکال سکتا تھا۔ تانگے کو لگنے والے دھچکوں سے اس کی تکلیف میں اور اضافہ ہو رہا تھا۔ تکلیف اور خوف سے اس کا جسم پسینے میں تر ہو رہا تھا۔

آخر کار تانگہ ایک جگہ رک گیا' مسافر اتر گئے اور تانگہ پھر حرکت میں آگیا۔ سیٹ کے نیچے دبکا ہوا طارق ہولے ہولے کراہتا رہا' اس کی تکلیف اب ناقابل برداشت ہوتی جارہی تھی۔ تانگہ ایک بار پھر رک گیا۔ سلمان نیچے اتر کر پچھلی طرف آگیا اور سیٹ کے نیچے اس طرح ہاتھ مارنے لگا جیسے گھاس کے گٹھے درست کر رہا ہو۔

"مکان تو یہی ہے لیکن اس وقت گلی میں کچھ لوگ آرہے ہیں۔ وہ گزر جائیں تو میں دستک دوں۔" اس نے جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

"جو بھی دروازہ کھولے' اسے کہنا رحمان بابا کا مہمان آیا ہے۔" طارق نے کراہتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز بھی سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی۔

سلمان سیٹ کے نیچے گھاس کے گٹھوں کو درست کرتا رہا۔ گلی میں سامنے سے دو عورتیں اور تین آدمی آرہے تھے۔ ان کے پیچھے دو آدمی اور بھی تھے۔

"کیوں بھئی تانگے والے! دلی دروازے چلنا ہے۔" قریب پہنچنے پر ایک آدمی نے کہا۔

"تانگہ خالی نہیں ہے سرکار۔ میں تو سواریوں کا انتظار کر رہا ہوں۔ وہ سامنے والے گھر میں گئے ہیں۔" سلمان نے جواب دیا۔

وہ لوگ جیسے ہی آگے بڑھے' سلمان نے مکان کے دروازے پر دستک دی۔ چند سیکنڈ بعد ہی دروازہ تھوڑا سا کھلا اور ایک عورت کا چہرہ جھانکتا ہوا نظر آیا۔

"رحمان بابا کا مہمان آیا ہے۔" سلمان نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

"کہاں ہے' اسے جلدی سے اندر لے آؤ۔" عورت نے جواب دیا۔

سلمان نے محتاط نگاہوں سے گلی میں دونوں طرف دیکھا اور پھر طارق کو سیٹ کے نیچے سے نکال کر کندھے پر لاد لیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ مکان میں داخل ہو چکا تھا۔ طارق کو ایک کمرے میں بستر پر لٹانے کے بعد سلمان وہاں رکا نہیں۔ اسے اپنی بیٹی سکینہ کی فکر تھی۔ اس نے دو پولیس والوں کو اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اب وہ جلد سے جلد گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔

مکان کا دروازہ کھولنے والی وہ عورت غالباً اس مکان کی مالکہ تھی۔ اسے یقیناً پہلے ہی سے اطلاع مل چکی تھی کہ طارق کسی بھی وقت یا کسی بھی روز یہاں آسکتا ہے۔ مکان کے دروازے کے سامنے ایک مختصری ڈیوڑھی تھی جس کے اوپر دو چھتی سی بنی ہوئی تھی۔ اس دو چھتی میں عام طور پر گھر کا فالتو سامان رکھ دیا جاتا تھا۔ اس دو چھتی پر جانے کے لیے دو راستے تھے۔ ایک ڈیوڑھی کی طرف سے اور دوسرا اندرونی کمرے سے۔ کوئی بھی راستہ ایک درمیانے سائز کی کھڑکی سے زیادہ کشادہ نہیں تھا۔

سلمان' طارق کو چارپائی پر لٹا کر جا چکا تھا اور وہ ادھیڑ عمر عورت بھی دروازہ بند کر کے واپس آگئی تھی۔ طارق اس سے کچھ پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ اس کی نظر عین سامنے دو چھتی کے کھڑکی نما راستے پر جم گئی جہاں سے آٹومیٹک رائفل کی ایک نال جھانکتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ طارق کے چہرے پر زردی سی پھیل گئی۔ دوسرے ہی لمحے کھڑکی میں ایک چہرہ نظر آیا۔ اس کے ساتھ ہی طارق کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ وہ دل شیر تھا جس نے کھڑکی نما راستے سے کمرے میں چھلانگ لگا دی۔ اس کے فوراً ہی بعد حنا بھی اس راستے سے نیچے کود گئی۔

"میں تو رائفل کی نال دیکھ کر ڈر ہی گیا تھا۔" طارق نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"دروازے پر جب تانگہ رکا تھا تو حنا نے دروازے کی جھری سے جھانک کر دیکھا تھا۔ تانگے والے نے اس وقت سیٹوں کے نیچے جھک کر کوئی سرگوشی کی تھی جس پر حنا کو شبہ ہو گیا اور ہم دونوں رائفلیں سنبھال کر دو چھتی پر پہنچ گئے۔ ڈیوڑھی والا راستہ اور یہ کمرا ہماری رائفلوں کی زد میں تھا۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوتی تو اندر آنے

والوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکتا تھا۔" دل شیر نے کہا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پھر بولا "ویسے یہ تانگے والا کون تھا؟"

"میرا محسن" طارق نے جواب دیا "اس رات اگر یہ نہ ملتا تو میں پولیس کے ہاتھ لگ چکا ہوتا۔ اس کی بیٹی نرس ہے۔ انہوں نے نہ صرف میری جان بچائی بلکہ تین دن تک مجھے اپنے گھر میں چھپائے رکھا۔ آج شام سے کچھ پہلے اطلاع ملی تھی کہ پولیس میری تلاش میں سرکاری اسپتالوں کی ان مسلمان نرسوں کو چیک کر رہی ہے جو ہوسٹلوں کے بجائے اپنے گھروں میں رہتی ہیں۔ اس گھر میں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں مجھے دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھا جا سکتا' اس لیے مجھے یہاں منتقل ہونا پڑا۔ ویسے یہ ایک لمبی داستان ہے' کبھی فرصت میں سناؤں گا۔ تم کہو' دوستوں کا کیا حال ہے؟" طارق نے کہا۔

"دوست تو سب خیریت سے ہیں البتہ دشمنوں کو بدہضمی ہو گئی ہے۔" دل شیر نے جواب دیا "دہلی پولیس شکاری کتوں کی طرح شہر کے گلی کوچوں میں ہماری بُو سونگھتی پھر رہی ہے۔ ٹریننگ کیمپ میں ہونے والے جانی نقصان نے حکومت کے ایوان ہلا کر رکھ دیے ہیں۔ پورے شہر پر خوف ہراس کی فضا طاری ہے۔ اب دبے لفظوں میں عوامی حلقوں کی طرف سے یہ بھی مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ اس فوجی کیمپ کو ختم کیا جائے۔ اپوزیشن سے تعلق رکھنے والے بعض لیڈروں کو یہ علم ہو چکا ہے کہ یہ فوجی کیمپ کس مقصد کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ اب تو اپوزیشن بھی یہ آواز اٹھا رہی ہے کہ اسرائیل سے اس قسم کے معاہدے کے سلسلے میں اپوزیشن کو اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا جس کی وجہ سے یہ نقصان اٹھانا پڑا۔"

"کیا خیال ہے' یہ ٹریننگ کیمپ ختم کر دیا جائے گا یا جاری رہے گا؟" طارق نے پوچھا۔

"اگر جاری بھی رکھا گیا تو اس میں تعطل پیدا ہو جائے گا اور ہم چاہتے بھی یہی تھے کہ ان سرگرمیوں کو کم از کم فی الحال روک دیا جائے۔" دل شیر نے جواب دیا۔

"لیکن ــ یہ اپنے آدمیوں کو ٹریننگ کے لیے اسرائیل بھیجتے رہیں گے۔" طارق بولا۔

"اس سلسلے میں تو ظاہر ہے کہ ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔ لیکن بہرحال کچھ نہ کچھ تو سوچنا ہی پڑے گا۔ تم سناؤ' تمہاری تکلیف کیسی ہے؟"

"زخموں کو مندمل ہونے کے لیے آرام کی ضرورت ہے۔" طارق نے جواب دیا "لیکن سلمان کے گھر میں بھی ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا جس کی وجہ سے مجھے آرام کا موقع نہ مل سکا۔" طارق چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر پنڈت رگھول والے واقعے کی تفصیل بتانے لگا۔

"اس کا مطلب ہے کہ سلمان اور اس کی بیٹی سکینہ کے سر پر بھی خطرہ منڈلانے لگا ہے۔ بہرحال ہم انہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتے۔ میں کل ہی شاہ رخ سے اس سلسلے میں بات کروں گا۔" دل شیر نے کہا اور ادھیڑ عمر عورت کی طرف دیکھنے لگا "آج کھانے کا پروگرام نہیں ہے کیا؟"

"کھانا تو تیار ہے۔ یہیں دری پر دسترخوان بچھا دوں۔" عورت نے کہا۔

"ہاں' یہیں لے آؤ۔ کھانے کے دوران باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔" دل شیر نے کہا۔

دری پر ہی دسترخوان بچھا کر کھانا لگا دیا گیا۔ طارق کو ٹرے میں رکھ کر کھانا چارپائی پر ہی دے دیا گیا تھا۔ ابھی انہوں نے کھانے کے چند لقمے ہی لیے تھے کہ گلی میں یکے بعد دیگرے دو گاڑیوں کے رکنے کی آواز سنائی دی اور اس کے بعد بہت سارے بھاری قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ طارق اور دل شیر نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دل شیر کھانا چھوڑ کر دروازے کی طرف لپکا۔ اس نے ڈیوڑھی کے دروازے کی جھری سے جھانک کر باہر دیکھا تو سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ گلی میں بجلی کے کھمبے پر جلنے والے بلب کی روشنی میں اسے تین پولیس والے نظر آئے تھے۔ ان تینوں کے ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔ دروازے کے بالکل سامنے پولیس کی ایک جیپ کھڑی تھی۔ دائیں بائیں بھی کچھ پولیس والے موجود تھے۔ وہ اگرچہ نظر نہیں آ رہے تھے لیکن ان کے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ایک پولیس والا عین سامنے والے مکان کے دروازے پر کھڑا کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ جس شخص سے باتیں کر رہا تھا وہ دروازے کے اندر کی طرف تھا اس لیے نظر نہیں آ رہا تھا۔ دل شیر کمرے کی طرف بھاگا۔

"ہری اپ' پولیس اس مکان کو گھیرے میں لے رہی ہے۔ میرا خیال ہے پولیس والوں کی تعداد بارہ سے کم نہیں ہو گی۔ حنا' ایک رائفل طارق کو نکال کر دے دو اور تم اوپر کی سیڑھیوں پر چلی جاؤ۔ مریم' تم طارق کے ساتھ بیٹھک کے دروازے کا خیال رکھو گی۔" دل شیر نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔

طارق تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی گود میں کمبل پر کھانے کی ٹرے رکھی ہوئی تھی جو بدحواسی میں الٹ گئی۔ حنا اسی وقت کمرے میں دوڑ گئی تھی۔ اس کی واپسی میں چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اس نے ایک آٹومیٹک رائفل طارق کے ہاتھوں میں تھما دی' دوسری مریم کی طرف اچھال دی اور خود اپنی رائفل لے کر سیڑھیوں کی طرف دوڑ گئی۔ دل شیر اپنی رائفل سنبھالے دوبارہ ڈیوڑھی والے دروازے پر آ گیا اور جھری میں سے باہر جھانکنے لگا۔ دروازے کے سامنے جیپ کے دوسری طرف ایک پولیس والے کے ساتھ سفید کرتے اور دھوتی میں ملبوس ایک اور آدمی کھڑا تھا۔ اب دل شیر نے اسے پہچان لیا۔ وہ سامنے والے مکان میں رہتا تھا۔ پولیس والا اس سے کہہ رہا تھا۔

"تمہاری اطلاع غلط تو نہیں ٹھاکر!"

"نہیں سرکار" ٹھاکر نے سرگوشیانہ لہجے میں جواب دیا "میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا' تانگے والے نے سیٹ کے نیچے سے اس زخمی آدمی کو نکال کر کندھے پر لادا تھا اور اندر لے گیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ وہی زخمی ہے جس کی پولیس کو تلاش ہے۔ اس مکان میں اس کے دوسرے ساتھی بھی موجود ہیں۔"

"ٹھیک ہے' اب تم اپنے مکان میں چلے جاؤ۔" پولیس والے نے کہا۔ وہ غالباً اس پارٹی کا انچارج تھا۔

دل شیر دروازے سے ہٹ کر دو چھتی پر چڑھ گیا اور مورچہ لگا کر بیٹھ گیا۔ بیرونی دروازہ اس کے عین سامنے تھا۔ کوئی بھی بچ کر اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ چند منٹ گزر گئے۔ گلی میں بھاری قدموں کی آوازیں گونجتی رہیں پھر ایک گونجدار آواز سنائی دی۔

"ہم موتی منزل میں رہنے والوں سے مخاطب ہیں۔" پولیس والے نے وہ نام دُہرایا جو مکان کی پیشانی پر لکھا ہوا تھا "ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ تم لوگ یہاں چھپے ہوئے ہو۔ اس مکان کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا گیا ہے۔ اگر کسی نے فرار ہونے کی کوشش کی تو گولیوں سے بھون دیا جائے گا۔ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو۔ میں صرف پانچ تک گنوں گا' اس کے بعد فائر کھول دیا جائے گا۔" اس کے بعد چند سیکنڈ تک خاموشی رہی پھر گنتی شروع ہو گئی۔

پانچ کہنے کے ساتھ ہی فضا فائرنگ کی آوازوں سے گونج اٹھی۔ مکان کی کھڑکیوں اور دروازوں پر فائرنگ کی جا رہی تھی۔ اندر سے اس فائرنگ کا جواب نہیں دیا گیا۔ دل شیر دو چھتی پر تیار بیٹھا تھا۔ اس کی انگلی ٹریگر پر تھی اور نظریں دروازے پر۔ فائرنگ رک گئی۔ پولیس پارٹی کے انچارج نے چیخ کر کچھ کہا اور پھر دروازے کو توڑا جانے لگا۔ غالباً رائفل کے دستے سے ضربیں لگائی جا رہی تھیں۔ دو منٹ میں دروازہ ٹوٹ گیا اور بیک وقت دو پولیس والوں نے اندر داخل ہونے کی کوشش کی۔ ان کے پیچھے دو پولیس والے اور بھی تھے۔

دل شیر اسی موقع کا منتظر تھا۔ اس نے رائفل کا ٹریگر دبا دیا۔ ڈیوڑھی فائرنگ اور چیخوں کی ملی جلی آوازوں سے گونج اٹھی۔ تین پولیس والے ڈھیر ہو گئے تھے جبکہ چوتھا دروازے کے باہر جا گرا تھا۔

باہر سے بھی فائرنگ شروع ہو گئی لیکن پولیس والوں کی گولیاں سامنے والی دیوار میں لگ رہی تھی۔ اس لیے اوپر دو چھتی میں بیٹھا ہوا دل شیر بالکل محفوظ تھا۔ بیٹھک کی طرف سے طارق اور مریم نے بھی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ گلی سے دو پولیس والوں کی چیخیں سنائی دیں' وہ یا تو زخمی ہوئے تھے یا ختم ہو گئے تھے۔

"شنکر! تم دو آدمیوں کو لے کر دائیں طرف والے مکان سے چھت پر پہنچو اور کرمو' تم ایک آدمی کے ساتھ بائیں طرف والے مکان کی چھت پر جاؤ۔ وہ لوگ چھت کے راستے فرار ہونے کی کوشش کریں گے۔ میں وشوا ناتھ اور گردھاری کے ساتھ گلی میں موجود ہوں۔" پولیس آفیسر کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

دل شیر کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ اسے پولیس والوں کی تعداد کا پتا چل گیا تھا۔ تین آدمی اس کے سامنے مرے پڑے تھے۔ پانچ کو چھتوں پر پہنچنے کا حکم مل چکا تھا اور گلی میں آفیسر سمیت تین آدمی تھے۔

گلی میں فائرنگ بند ہو چکی تھی۔ دل شیر آہستگی سے دو چھتی سے اُتر آیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر اس مکان کو گھیرے میں لے لیا گیا تو وہ چوہے کی طرح پکڑے جائیں گے اور پکڑے جانے کا مطلب اذیت ناک موت کے سوا کچھ نہیں تھا اس لیے وہ گھیرے میں آنے سے پہلے ہر صورت میں اپنے ساتھیوں سمیت یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔

دل شیر سینے کے بل رینگتا ہوا بیرونی دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ اگر دروازے کے سامنے گلی میں کوئی پولیس والا ہوتا تو اسے یہاں تک پہنچنے کا موقع بھی نہ ملتا لیکن پولیس والے مختلف سمتوں سے آڑ میں کھڑے فائرنگ کر رہے تھے۔ دل شیر نے دروازے میں پڑی ہوئی ایک پولیس والے کی لاش کی آڑ لیتے ہوئے سر اٹھا کر باہر دیکھا۔ بائیں طرف کار کے پیچھے ایک پولیس والا کھڑا مکان کی بیٹھک کے دروازے کی طرف فائرنگ کر رہا تھا۔ اس کی صرف کھوپڑی نظر آ رہی تھی۔ دل شیر نے نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ اس کی گولی ٹھیک نشانے پر لگی۔ کھوپڑی کے پرخچے اُڑ گئے اور پولیس والا کار کے پیچھے ڈھیر ہو گیا۔ اس کے منہ سے کوئی آواز تک نہیں نکل سکی تھی۔ پولیس پارٹی کے انچارج اور اس کے دوسرے ساتھی نے دروازے پر فائرنگ شروع کر دی لیکن آڑ میں ہونے کی وجہ سے دل شیر محفوظ ہی رہا۔

اب اوپر سے بھی فائرنگ کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ دونوں طرف کے مکانوں کی چھتوں پر پولیس والے پہنچ چکے تھے اور حنا مکان کی سیڑھیوں والے دروازے میں کھڑی فائرنگ کر کے انہیں روکے ہوئے تھی۔

دل شیر گھات لگائے بیٹھا رہا۔ چند منٹ بعد ایک اور پولیس والا ایک طرف سے دوڑ کر دوسری طرف جاتا ہوا نظر آیا۔ وہ غالباً بہتر پوزیشن حاصل کرنے کے لیے سامنے والے ایک مکان کی طرف دوڑ رہا تھا لیکن دل شیر کی گولی نے اسے وہاں تک پہنچنے کی مہلت نہیں دی۔ گولی اس کی گردن میں لگی اور وہ مکان کے تھڑے پر ڈھیر ہو گیا۔ یہ پولیس پارٹی کا انچارج تھا۔ اب گلی میں صرف ایک ہی پولیس والا رہ گیا تھا۔ باقی پولیس والے مکانوں کی چھتوں پر پہنچ چکے تھے۔

دل شیر کی نظریں اپنے مکان کے سامنے کھڑی پولیس جیپ پر جمی ہوئی تھیں۔ اگر وہ لوگ جیپ تک پہنچ جاتے تو آسانی سے فرار

ہوسکتے تھے۔ گلی میں صرف ایک پولیس والا رہ گیا تھا اور دل شیر کے خیال میں جیپ تک پہنچنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ وہ دروازے سے ہٹ کر رینگتا ہوا اندر آگیا۔ طارق اور مریم بیٹھک کے دروازے پر جمے ہوئے تھے۔ دل شیر نے ان دونوں کو ڈیوڑھی والے دروازے پر پہنچنے کو کہا اور خود اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف دوڑا۔

اوپر' پولیس والے دونوں طرف والے مکانوں کی چھتوں پر تھے۔ حنا نے کسی کو بھی اپنے مکان کی چھت پر کودنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ وقفے وقفے سے فائرنگ کرتے ہوئے انہیں روکے ہوئے تھی۔

"گلی میں صرف ایک پولیس والا رہ گیا ہے۔ ہم دروازے کے سامنے کھڑی ہوئی جیپ تک پہنچنے کی کوشش کررہے ہیں۔ سیٹی کی آواز سنتے ہی تم نیچے آجانا۔ اگر پولیس پارٹی کی کمک پہنچ گئی تو ہم میں سے کوئی بھی نہیں بچ سکے گا۔" دل شیر نے سرگوشیانہ لہجے میں حنا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اور دوبارہ نیچے آگیا۔

مریم اور طارق ڈیوڑھی میں پہنچ چکے تھے۔ طارق دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ زخموں کی تکلیف سے اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

"طارق! کیا تم اس جیپ تک پہنچ سکو گے؟" دل شیر نے سرگوشی کی "گلی میں صرف ایک پولیس والا ہے۔ میں فائرنگ کرکے اسے سامنے آنے سے روکے رکھوں گا' تم لوگ جیپ تک پہنچ جانا۔"

"ٹھیک ہے' میں تیار ہوں۔" طارق نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

دل شیر بیرونی دروازے پر پہنچ گیا۔ اس نے باہر جھانکا ہی تھا کہ ایک گولی زن کی آواز سے اس کے سر کے اوپر صرف دو انچ کے فاصلے سے گزر گئی۔ وہ ایک دم نیچے گر گیا اور اس طرف فائرنگ شروع کردی جس طرف سے گولی چلائی گئی تھی۔

"طارق' ریڈی۔" دل شیر چیخا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سیٹی بجادی۔

طارق' مریم کا سہارا لے کر لنگڑاتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف دوڑا۔ اس دوران حنا بھی اوپر سے دوڑتی ہوئی آگئی۔ اس نے سیڑھیوں والا اوپر کا دروازہ بند کردیا تھا تاکہ اوپر سے پولیس والوں کو نیچے آنے سے کچھ دیر کے لیے روکا جاسکے۔

"جلدی کرو۔ طارق کو سہارا دے کر جیپ پر چڑھاؤ۔" دل شیر بولا۔

طارق جیپ پر چڑھنے کی کوشش کررہا تھا لیکن ٹانگ زخمی ہونے کی وجہ سے اسے خاصی دشواری پیش آرہی تھی۔ اس نے اچک کر جیپ پر چڑھنا چاہا تو گر پڑا۔ اتنی دیر میں حنا وہاں پہنچ گئی۔ اس نے مریم کی مدد سے طارق کو اٹھا کر جیپ میں ڈالا اور خود بھی

ایک خوب صورت لڑکی کا ہاتھ دیکھتے ہوئے نجومی نے کہا "تمہیں ایک ایسے لڑکے سے محبت ہے جس کا نام ایم سے شروع ہوتا ہے' جس کے پاس ایک سرخ اسپورٹس کار ہے' جس کی عمر بائیس سال ہے' رنگ گورا ہے اور....."

"کیا یہ تمام باتیں آپ کو میرے ہاتھ سے معلوم ہوئی ہیں؟" لڑکی نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں" نجومی نے کہا "تمہاری اس انگوٹھی سے جو گزشتہ ماہ ہی میں نے اپنے بیٹے کو دی تھی۔"

اُچک کر اوپر چڑھ گئی۔ مریم جیپ پر چڑھنے کی کوشش کررہی تھی کہ بھیانک انداز میں چیختی ہوئی نیچے گر گئی۔ دوسری طرف سے چلائی جانے والی' پولیس کی گولی اس کی پشت سے داخل ہوکر دل کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔

دل شیر نے اس سمت میں پے درپے کئی فائر کردیے۔ پولیس والا غالباً کسی آڑ میں دبک گیا تھا۔ اس دوران سیڑھیوں والا دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ پولیس والے دروازہ توڑنے کی کوشش کررہے تھے۔ دل شیر سوچ رہا تھا کہ اگر وہ پولیس والے نیچے آگئے تو ان کے زندہ بھاگ نکلنے کا امکان ختم ہوجائے گا۔

طارق جیپ کی پچھلی سیٹ پر ڈھیر ہوگیا تھا۔ تکلیف کی شدت سے اس کے دانت بھنچے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ دوسری سیٹ پر بیٹھی ہوئی حنا نے اس طرف فائرنگ شروع کردی جس طرف پولیس والا چھپا ہوا تھا۔ اس دوران دل شیر بھی مکان سے باہر آگیا۔ جیپ کے اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھتے ہی اس نے انجن اسٹارٹ کردیا۔ حنا بدستور فائرنگ کررہی تھی۔ اس کی ایک گولی تقریباً بیس گز پیچھے کھڑی ہوئی ٹھیک کار کی ٹینکی پر لگی' دوسرے ہی لمحے ایک زوردار دھماکا ہوا اور کار کے پرخچے اُڑ گئے۔

جیپ تیزی سے حرکت میں آکر کئی گز دور نکل چکی تھی۔ کار کے دھماکے سے آگ کا ایک گولہ سا اوپر کو اٹھا اور پھیلتا چلا گیا۔ کار کے جلتے ہوئے کچھ ٹکڑے آس پاس کے مکانوں پر بھی گرے تھے۔ جیپ تیزی سے دوڑ رہی تھی اور پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی حنا مسلسل فائرنگ کررہی تھی۔

"گولیاں ضائع مت کرو حنا' ابھی ان کی ضرورت پڑے گی۔" دل شیر نے چیخ کر کہا۔ حنا نے فائرنگ بند کردی۔

"طارق کی حالت بگڑ رہی ہے دل شیر۔" حنا' طارق پر جھکتے ہوئے بولی۔ اس کا لباس خون سے تر ہو رہا تھا۔

جیپ مختلف گلیوں میں دوڑتی ہوئی مہاتما گاندھی روڈ پر نکل آئی۔ یہاں سے ایک گلی سے نکل کر وہ ستھرا روڈ پر آگئے۔ یہ

سڑک اسٹیڈیم کے پچھلی طرف سے ہوتی ہوئی ڈاکٹر ذاکر حسین مارگ کی طرف چلی گئی تھی۔ ایک موڑ سے ذرا آگے ایک ریسٹورنٹ کے سامنے دل شیر نے جیپ روک لی۔ ریسٹورنٹ کے سامنے ایک کار کھڑی تھی۔ ایک مرد اور ایک عورت اس کار میں بیٹھ رہے تھے۔ دونوں ادھیڑ عمر تھے۔ مرد کے لباس اور سر پر رکھی ہوئی مخصوص طرز کی ٹوپی سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ پارسی تھے۔ دل شیر جیپ سے چھلانگ لگا کر ان کے سامنے آگیا۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔

"کار سے پیچھے ہٹ جاؤ ورنہ اُڑا دوں گا۔" دل شیر کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔

"ماں..." پارسی کے حلق سے کراہ سی نکلی۔ رائفل دیکھ کر اس کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا تھا "ایسا کائے کو بولتا رے۔ پیسو چاہیے لے لو۔ لے لو۔ پر اپنے کو کچھ نا کیں بولو۔"

"پیسو نہیں "کار کی چابی چاہیے۔" دل شیر غرایا۔

"چابی کار میں لگے لے ہے۔ بیٹھو بیٹھو... یہ تمہارے باپ کا کار..." پارسی کہتے کہتے ایک دم خاموش ہو گیا۔

"بکومت" دل شیر نے اسے ڈانٹ دیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے حنا کو بھی اشارہ کر دیا۔

حنا' طارق کو لے کر جیپ سے اتر آئی۔ اس نے پہلے طارق کو کار کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا اور پھر خود بھی اندر گھس گئی۔

"ماں..." پارسی ایک بار پھر کراہا۔ اس کی ساتھی عورت ہٹ سے سڑک پر گر کر بے ہوش ہو چکی تھی۔

ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے لوگ یہ منظر دیکھ کر اپنی اپنی سیٹیں چھوڑ کر کونوں کھدروں میں دبک گئے تھے۔ دل شیر نے اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کیا اور کار ایک زبردست جھٹکے سے حرکت میں آگئی۔ پارسی وہیں کھڑا تھر تھر کانپتے ہوئے ماں... ماں کی گردان کر رہا تھا۔

کئی سمتوں سے پولیس سائرن کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ نیشنل آرٹ گیلری والی سڑک پر گھومتے ہوئے دل شیر چونک گیا۔ سامنے سے پولیس کی ایک جیپ سائرن بجاتی ہوئی آرہی تھی۔ دل شیر نے کار سائیڈ میں کر لی لیکن اس کی رفتار ہلکی نہیں کی۔ پولیس کی جیپ انتہائی تیز رفتاری سے ان کے قریب سے گزر گئی۔ دل شیر نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ کار اب شاہجہاں روڈ کراس کرتی ہوئی مولانا آزاد روڈ پر پہنچ چکی تھی۔ دل شیر نے کار کی رفتار کم کر دی اور اسے مختلف گلیوں میں گھماتا ہوا شاہ رخ کے بنگلے والی گلی میں لے آیا اور پھر چند ہی منٹ بعد کار شاہ رخ کے بنگلے میں داخل ہو رہی تھی۔

"حنا!" وہ پورچ میں کار روکتے ہوئے بولا "تم طارق کو اندر لے جاؤ میں کار کو گیراج میں چھوڑ کر آتا ہوں۔"

حنا' طارق کو سہارا دے کر اتار رہی تھی کہ شاہ رخ برآمدے والے دروازے سے نکل کر سامنے آگیا۔ اس نے دوڑ کر طارق کو سہارا دیا اور اسے کمرے میں لے آیا۔

"اس کی حالت بہت خراب ہو رہی ہے' اسے فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔" حنا بولی۔

"وہ میں دیکھ رہا ہوں لیکن تم لوگ...."

"پوائنٹ ون پر پولیس نے ریڈ کر دیا تھا۔" حنا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "ہم لوگ بڑی مشکل سے نکلنے میں کامیاب ہوئے ہیں لیکن مریم پولیس کی گولی کا نشانہ بن گئی۔"

"اوہ! لیکن طارق تم لوگوں کو کہاں ملا؟ یہ تو سکینہ نامی کسی نرس کے گھر میں تھا۔" شاہ رخ نے کہا۔

"شام کا اندھیرا پھیلنے کے تھوڑی دیر بعد طارق بھی پوائنٹ ون پر آگیا تھا۔ سکینہ کو اطلاع ملی تھی کہ پولیس اس کے گھر پر ریڈ کرنے والی ہے۔ اس لیے اس نے طارق کو اپنے باپ کے ساتھ پوائنٹ ون پر پہنچا دیا تھا۔"

"لیکن پولیس کو پوائنٹ ون کے بارے میں کیسے پتا چلا؟ وہ تو ہماری محفوظ ترین پناہ گاہ ہے۔" شاہ رخ نے کہا "کہیں ایسا تو نہیں کہ سکینہ اور اس کا باپ پکڑا گیا ہو اور انہوں نے پوائنٹ ون کے بارے میں پولیس کو بتا دیا ہو۔"

"نہیں" یہ دل شیر کی آواز تھی جو کمرے میں داخل ہو رہا تھا "سکینہ کا باپ سلمان' طارق کو تانگے کی سیٹوں کے نیچے چھپا کر لایا تھا۔ پوائنٹ ون کے سامنے جب وہ طارق کو سیٹوں کے نیچے سے نکال کر اندر لا رہا تھا تو سامنے کے مکان میں رہنے والے ایک ہندو ٹھاکر نے اسے دیکھ لیا۔ اسے غالباً شبہ ہو گیا تھا۔ اس نے پولیس کو اطلاع کر دی اور پولیس نے ریڈ کر دیا۔ پولیس نے یہ چھاپا غالباً کسی پلاننگ کے بغیر مارا تھا جس کا نتیجہ انہیں بھگتنا پڑا۔ ان کے غالباً چھ آدمی جہنم واصل ہوئے ہیں۔ مریم بھی اس وقت گولی کا نشانہ بن گئی جب ہم پولیس کی جیپ پر فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔"

"پہلے سلیم پھر مراد علی اور اب مریم۔" شاہ رخ کے چہرے پر افسردگی سی چھا گئی "لیکن ان کا لہو رائیگاں نہیں جائے گا۔ یہ لوگ اپنے خون سے آزادی کی تاریخ رقم کر رہے ہیں۔ ان کے نام قیامت تک زندہ رہیں گے۔" وہ چند لمحے خاموش رہا پھر طارق کی طرف متوجہ ہو گیا "آفرین ہے تم پر طارق۔ پے در پے تکالیف اٹھانے کے باوجود تم نے ہمت نہیں ہاری۔ تم واقعی ایک بہادر انسان ہو۔"

"ہمت تو وہ لوگ ہارتے ہیں جن میں کوئی جذبہ نہ ہو' کوئی لگن نہ ہو۔ اور میرے دل میں تو ایک ایسی لگن اور ایک ایسا جذبہ ہے جو کبھی سرد نہیں پڑ سکتا۔" طارق نے کہا۔

"دل شیر' اسے پیچھے لے چلو۔ میں میڈیکل کٹ لے کر آتا ہوں۔ ڈاکٹر احمد سے بھی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" شاہ رخ نے کہا اور فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔

دل شیر اور حنا' طارق کو تہ خانے والے کمرے میں لے آئے تھے۔ چند منٹ بعد شاہ رخ بھی میڈیکل کٹ لے کر آگیا۔

"ڈاکٹر احمد گیارہ بجے تک پہنچے گا۔ اس وقت ہم یہی کر سکتے ہیں کہ اس کی پٹی تبدیل کر دیں۔" شاہ رخ نے کہا اور طارق کے کندھے پر لپٹی ہوئی خون آلود پٹی کھولنے لگا۔

لیکن اتفاق سے ڈاکٹر احمد جلدی پہنچ گیا' وہ شاہ رخ کا دوست تھا اور نئی دہلی ریلوے اسٹیشن کے قریب اس کا کلینک تھا۔ اس نے پٹی کھول کر زخموں کا جائزہ لیا اور دوبارہ ڈریسنگ کر دی۔

"انفیکشن ہو گیا ہے' بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اسے کم ازکم ... ایک ہفتے تک بستر سے ہلنے نہ دیا جائے۔ اگر زخم زیادہ بگڑ گیا تو زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ کچھ دوائیں میرے پاس ہیں جو میں فوری طور پر دے رہا ہوں' کچھ دوائیں بازار سے منگوانی پڑیں گی۔ میں نے راستے میں آتے ہوئے ایک میڈیکل اسٹور کھلا دیکھا تھا لیکن میرے خیال میں وہاں سے کوئی دوا لینا مناسب نہ ہوگا۔ کناٹ پیلس پر بھی بعض اسٹور رات بھر کھلے رہتے ہیں' وہاں سے منگوالو۔ میں نے انجکشن دے دیا ہے۔ اگر ٹمپریچر ہو جائے تو یہ دوا دے دینا۔ صرف دو گولیاں' زیادہ نہیں۔ میں صبح آکر اسے دیکھ لوں گا۔"

"ٹھیک ہے ڈاکٹر' شکریہ۔" شاہ رخ نے اس سے دواؤں والا پرچہ لے لیا۔

ڈاکٹر احمد کے جانے کے بعد شاہ رخ نے ڈلوزی ہاؤس فون کیا اور اپنے ایک خاص آدمی کو دواؤں کے نام لکھوا کر اسے ہدایت کی کہ وہ کسی میڈیکل اسٹور سے یہ دوائیں لے کر راج پاتھ کے چوراہے پر پہنچ جائے۔

فون کرنے کے پانچ منٹ بعد شاہ رخ اپنی کار پر کوٹھی سے نکل گیا۔ جب وہ راج پاتھ کے چوراہے پر پہنچا تو اس کا آدمی وہاں منتظر تھا۔ وہ موٹر بائیک پر آیا تھا۔ شاہ رخ نے اس سے دوائیں لے لیں اور واپس آگیا۔ شہر میں بڑی سخت چیکنگ ہو رہی تھی۔ راج پاتھ روڈ تک آتے جاتے دونوں مرتبہ اسے چیک کیا گیا تھا۔

اسی رات طارق کو بخار ہو گیا۔ اس کا جسم رات بھر انگاروں کی طرح تپتا رہا۔ ڈاکٹر احمد کی دی ہوئی گولیاں بھی زیادہ مؤثر ثابت نہ ہوئیں۔ حنا اس کے پلنگ کے قریب بیٹھی وقفے وقفے سے اس کی پیشانی پر برف کی پٹیاں رکھتی رہی۔ جب دن کی روشنی طلوع ہوئی تو طارق کا بخار بھی کم ہونے لگا۔

طارق تقریباً ایک ہفتے تک بخار میں جلتا رہا۔ اس دوران حنا کسی ماہر نرس کی طرح اس کی تیمارداری کرتی رہی۔ یوں تو گھر میں جنت بی بی' دل شیر اور شاہ رخ بھی موجود تھے مگر طارق کی دیکھ بھال حنا نے اپنے ذمے لے لی تھی۔ اسے طارق سے کچھ عجیب سا لگاؤ ہو گیا تھا' ایک عجیب سا جذبہ تھا جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔

ڈاکٹر احمد بھی طارق کو دیکھنے کے لیے باقاعدگی سے آ رہا تھا۔

پندرہ دن کی دیکھ بھال کے بعد طارق کے زخم مندمل ہونے لگے اور پھر ایک مہینہ گزر گیا۔ اس دوران ہر قسم کی سرگرمیاں معطل رہیں۔ دل شیر اور حنا نے اس دوران کوٹھی سے قدم تک باہر نہیں نکالا تھا۔ پولیس کی سرگرمیاں بھی ماند پڑ چکی تھیں۔ اخبارات نے دہلی کی پولیس کو دنیا کی سب سے زیادہ ناکارہ پولیس قرار دیا تھا جو ایک مہینہ گزرنے کے بعد بھی دھماکے کرنے والوں کا سراغ نہیں لگا سکی تھی۔ طارق اور اس کے ساتھیوں کے حساب سے سب سے اچھی بات یہ ہوئی تھی کہ اسرائیلی فوجی ماہرین واپس چلے گئے تھے اور یہ طارق اور اس کے ساتھیوں کی بہت بڑی کامیابی تھی۔

طارق اب مکمل طور پر صحت یاب ہو چکا تھا۔ کوٹھی میں بند پڑے پڑے ایک ماہ سے بھی زیادہ کا عرصہ بیت چکا تھا۔ طارق سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اسی طرح کوٹھی میں بند رہا تو اس کی ہڈیوں کو زنگ لگ جائے گا۔ دل شیر اور حنا کا بھی یہی خیال تھا۔ انہوں نے اس سلسلے میں شاہ رخ سے بات کی تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"میرا خیال ہے کہ گزشتہ کارروائیوں کے دوران ہم کسی کی نظروں میں نہیں آئے تھے لہٰذا اب باہر نکلنے میں ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن احتیاط کی بہرحال ضرورت ہے۔"

"ہم محتاط رہیں گے۔" دل شیر بولا۔

"پروگرام کیا ہے؟" شاہ رخ نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے باری باری ان تینوں کی طرف دیکھا۔

"سنا ہے اوبیرائے ہوٹل میں ایک اسرائیلی رقاصہ آج رات

اپنے فن کا مظاہرہ کرنے والی ہے۔ ہم اس یہودی رقاصہ کی یاترا کرنا چاہتے ہیں۔" دل شیر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" شاہ رخ نے اسے گھورا۔

"آج کے اخبار میں اس کی تصویریں چھپی ہے۔" دل شیر نے جواب دیا "بھارتی ثقافت کے وزیر آج کے اس پروگرام کے مہمان خصوصی ہوں گے۔ شہر کی بعض اہم شخصیات کو بھی ہوٹل کی طرف سے مدعو کیا گیا ہے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس رقاصہ میں ایسی کیا بات ہے۔"

"بہت ہی احمق آدمی ہو۔" شاہ رخ نے کہا "خاص بات کیا ہوگی۔ ہوٹل کی انتظامیہ نے ثقافت کے وزیر اور چند اہم اور معزز شخصیات کو مدعو کرلیا۔ ایسی باتوں کے دو ہی مقاصد ہوا کرتے ہیں۔ وزیر کی آمد سے مفت کی پبلسٹی ملے گی اور دوسرا مقصد یہ کہ ہوٹل کی انتظامیہ حکومت سے اپنا کوئی کام نکلوانا چاہتی ہوگی۔ کاروباری لوگ اس قسم کے ہتھکنڈے تو استعمال کیا ہی کرتے ہیں۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔ بہرحال تم لوگ اوبیرائے جانا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ طارق کا حلیہ بھی کچھ بدلا ہوا ہی لگ رہا ہے۔ اسے تہاڑ جیل کے مفرور قیدی کی حیثیت سے بھی نہیں پہچانا جاسکتا۔ واپسی کب تک ہوگی تم لوگوں کی؟"

"یہ تو پروگرام پر منحصر ہے۔ پروگرام اچھا ہوا تو آخر تک دیکھیں گے' بصورت دیگر جلدی آجائیں گے۔" دل شیر نے جواب دیا۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "ہم تمہاری سفید والی گاڑی لے جارہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے' لے جاؤ۔" شاہ رخ نے جواب دیا۔

دل شیر نے میز پر سے چابی اٹھائی اور وہ تینوں باہر نکل آئے۔

حنا نے نیلے رنگ کی ساری پہن رکھی تھی۔ بلاؤز سلیولیس تھا۔ اس لباس میں وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ بیماری کے دوران طارق نے داڑھی مونچھیں رکھ لی تھیں۔ چھوٹی گول داڑھی اور بھاری مونچھیں اس کے چہرے پر بہت اچھی لگ رہی تھی۔

جب وہ ہوٹل اوبیرائے پہنچے تو پروگرام شروع ہوچکا تھا۔ اسٹیج پر اسرائیلی رقاصہ اپنی عریانیت کا مظاہرہ کررہی تھی۔ اسٹیج کے سامنے والی سیٹوں پر بھارتی ثقافت کا وزیر اور دیگر مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں بھی ہال کے آخر میں ایک ٹیبل مل گئی جسے انہوں نے غنیمت جانا۔ لوگ رقاصہ کی ہر ادا پر تالیاں بجا کر داد دے رہے تھے لیکن طارق کے خیال میں یہ داد اس کے فن کو نہیں' اس کی عریانیت اور جسم کے خوب صورت زاویوں کو دی جارہی تھی۔ دل شیر اپنی کرسی پر بیٹھا بڑے غور سے رقاصہ کو دیکھ رہا تھا۔ چند منٹ بعد وہ کرسی سے اٹھ گیا۔

"چلو بال روم میں چل کر بیٹھتے ہیں۔" وہ بولا۔

"کیوں' رقاصہ پسند نہیں آئی کیا؟" طارق مسکرایا۔

"یہی سمجھ لو۔" دل شیر نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

وہ لوگ بال روم میں آگئے۔ اس خوب صورت ہال میں ایک طرف بہت بڑا بار کاؤنٹر بنا ہوا تھا۔ مختلف میزوں پر لوگ بیٹھے ہوئے اپنے پسندیدہ مشروبات سے دل بہلا رہے تھے۔ یہ لوگ بھی ایک میز پر بیٹھ گئے۔ دل شیر نے ویٹر کو کافی کے لیے کہہ دیا۔ حنا دلچسپ نظروں سے ہال کا جائزہ لے رہی تھی۔ ایسے ہوٹلوں میں صرف وہی لوگ آسکتے تھے جن کے پاس دولت کی ریل پیل ہو۔ اس قسم کے ہوٹل دراصل بڑے لوگوں کے لیے عیاشی کے اڈے تھے۔ یہاں شکار اور شکاری ایک دوسرے کی گھات میں رہتے تھے۔ کوئی شکار کرتا اور کوئی شکار ہوجاتا۔ حنا دیکھ رہی تھی کہ ہر میز پر کوئی نہ کوئی خوب صورت لڑکی موجود تھی۔ ایک میز پر ایک نہایت بدصورت' کالے کلوٹے اور بھاری بھرکم آدمی کے ساتھ بہت ہی دھان پان اور حسین لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ انہیں دیکھ کر لنگور کے پہلو میں حور' والا محاورہ ذہن میں ابھرتا تھا۔ یہ تو سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ وہ حسین لڑکی اس لنگور سے محبت کرتی ہوگی۔ اسے محبت تو ان کڑکڑاتے کرنسی نوٹوں سے تھی جو اس لنگور کی جیبوں میں بھرے ہوئے تھے۔

حنا نے بہت جلد محسوس کرلیا کہ بہت سی نظریں اس کا بھی طواف کررہی تھیں۔ یہ ان عیاش مردوں کی ہوس بھری نظریں تھیں جو کبھی ایک عورت پر اکتفا نہیں کرتے۔

اسی لمحے ویٹر نے ان کی میز پر کافی لگادی۔ کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے بھی حنا متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ دائیں طرف تیسرے نمبر کی میز پر ایک جوان عورت اور ایک بھاری بھرکم' ادھیڑ عمر مرد بیٹھا ہوا تھا۔ حنا نے محسوس کیا کہ وہ عورت باربار طارق کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"طارق!" حنا نے طارق کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی "وہ عورت تم میں خاص دلچسپی لے رہی ہے' اس کی نظریں باربار تمہاری طرف اٹھ رہی ہیں۔ دائیں طرف' تیسری میز پر اورنج ساری والی۔"

طارق نے غیر محسوس انداز میں گردن گھما کر اس طرف دیکھا۔ اس عورت کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا کافی کا مگ چھلک پڑا۔ وہ عورت مادھوری تھی۔

"اپنے حواس ٹھکانے رکھو۔" دل شیر نے سرگوشی کی "یہ عورت کون ہے' جانتے ہو اسے؟"

"مادھوری ہے۔" طارق نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں جواب دیا "تہاڑ جیل سے فرار ہونے کے بعد میں نے اور پشکر نے اس کے فلیٹ میں پناہ لی تھی۔ میں تم لوگوں کو بتا چکا ہوں کہ مادھوری کس طرح ہمارے ہاتھ لگی تھی لیکن یہ تو گرفتار ہوگئی تھی اور اس نے میرے اور پشکر کے بارے میں پولیس کو سب کچھ بتادیا تھا۔ اس سے چند روز پہلے

اس کا شوہر اپنے مالک کو قتل کر کے فرار ہو گیا تھا لیکن۔۔ لیکن۔۔۔ یہ یہاں۔۔"

"تمہیں کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟ ہو سکتا ہے یہ مادھوری کی شکل سے ملتی جلتی کوئی اور عورت ہو۔" اس مرتبہ حنا نے سرگوشی کی۔

"نہیں" طارق نے نفی میں سر ہلایا "وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی جس کا مطلب ہے کہ وہ مجھے پہچان چکی ہے۔"

"خیر۔۔۔۔۔۔۔ آرام سے بیٹھے رہو' دیکھ لیں گے۔" دل شیر نے کہا۔

وہ مادھوری ہی تھی اور اس نے طارق کو پہچان لیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی کی طرف جھکتے ہوئے کوئی سرگوشی بھی کی تھی۔ چند منٹ بعد مادھوری نے طارق کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھ کا گوشہ دبا کر مخصوص اشارہ کیا اور میز سے اٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ جیسے ہی دروازے سے باہر نکلی' طارق نے بھی اپنی سیٹ چھوڑ دی۔ وہ جب باہر نکلا تو مادھوری اسے بائیں طرف کھڑی نظر آ گئی۔ طارق تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔

"یہاں بات کرنا مناسب نہیں ہے' آؤ سوئمنگ پول کی طرف چلتے ہیں۔" مادھوری نے کہا۔

وہ دونوں ہوٹل کی وسیع و عریض عمارت کے پچھلی طرف آ گئے۔ یہاں سوئمنگ پول کے علاوہ ایک وسیع اور خوب صورت لان بھی تھا۔ وہ لان میں ایک کینوپی کے نیچے آ کر رک گئے۔ سوئمنگ پول بند تھا اس لیے آس پاس کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ کینوپی کے نیچے بینچ پر بیٹھ گئے۔

"تم اس طرح پبلک مقامات پر آ کر غلطی نہیں کر رہے؟ تم جانتے ہو کہ پولیس تمہاری تلاش میں ہے اور تمہاری تصویر صرف دلّی ہی نہیں' پورے بھارت کے تھانوں میں لگی ہوئی ہے۔" مادھوری نے کہا۔

"میری بات چھوڑو لیکن تم۔۔۔ یہ کایا پلٹ کیسی؟ میں نے تو اخبار میں تمہاری گرفتاری کی خبر پڑھی تھی۔" طارق نے کہا۔

"ہاں' میں گرفتار ہو گئی تھی اور اب پولیس کی مہربانی سے ہی یہ شاندار زندگی گزار رہی ہوں۔" مادھوری نے جواب دیا۔

"میں سمجھا نہیں!" طارق نے اسے گھورا۔

"گرفتاری کے بعد میں نے پولیس کو سچ بتا دیا تھا کہ تم لوگ مجھے جان سے مار دینے کی دھمکی دے کر میرے گھر میں چھپے ہوئے تھے۔ میرا تم لوگوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مجھے بے گناہ سمجھ کر چھوڑ دیا گیا۔ اس دوران ایک پولیس آفیسر مجھ پر خاصا مہربان ہو چکا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ میرا پتی قتل کے الزام میں مفرور ہے اور میں بالکل اکیلی ہوں۔ اس پولیس آفیسر کی بیوی مر چکی ہے۔ اس کی ایک بیٹی ہے جو شملہ کے ایک انگریزی اسکول میں پڑھتی ہے اور وہیں رہتی ہے۔ وہ پولیس آفیسر پہلے میرے فلیٹ پر آتا رہا

خوش خبری / بد خبری

ایک آرٹسٹ نے گیلری اونر سے دریافت کیا۔ "گیری بھائی! میری تصاویر میں کسی نے دلچسپی لی؟"

جواب میں گیلری والے نے کہا۔" میرے پاس تمہارے لیے اچھی خبر بھی ہے اور بُری خبر بھی۔ اچھی خبر یہ ہے کہ ایک شخص نے تمہاری تصاویر میں گہری دلچسپی لیتے ہوئے مجھ سے پوچھا تھا ' اگر آرٹسٹ فوت ہو جائے تو اس کی ان تصاویر کے دام اور اوپر چلے جائیں گے؟ جواباً میں نے کہا تھا بالکل اس بات کے سو فیصد امکان ہیں۔ بس اس نے تمہاری پندرہ کی پندرہ تصویریں فوراً ہی خرید لی تھیں۔"

"واہ۔۔۔ واقعی یہ تم نے اچھی خبر سنائی۔ مگر وہ بُری خبر کیا ہے؟" آرٹسٹ نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

" وہ بری خبر یہ ہے۔" گیلری اونر نے کہا۔ "کہ تمہاری تصویروں کا خریدار کوئی اور نہیں بلکہ وہی ڈاکٹر ہے جس سے تم اپنا علاج کرا رہے ہو۔"

پھر اپنے گھر لے آیا۔ اب میں اس کی رکھیل ہوں۔"

"اور تمہارے ساتھ یہ آدمی کون ہے؟" طارق نے پوچھا۔

"وہی پولیس آفیسر۔" مادھوری نے جواب دیا "ہے تو معمولی سا انسپکٹر لیکن بہت دولت مند ہے۔ بڑی عیش کراتا ہے مجھے۔ اسے تم پر شبہ ہو گیا ہے۔ تمہاری طرف میری توجہ اسی نے مبذول کرائی تھی۔ اس نے تمہاری طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا تھا کہ تم جیل سے بھاگے ہوئے وہی قیدی تو نہیں جس نے میرے گھر میں پناہ لی تھی۔ میں نے اسے ٹال دیا کہ تم وہ نہیں ہو۔"

"تمہیں مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟" طارق نے کہا۔

"تمہارے کردار نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔" مادھوری نے جواب دیا "تم تقریباً چوبیس گھنٹے میرے فلیٹ پر رہے۔ میں نے تمہیں پیشکش بھی کی تھی لیکن تم نے الٹا مجھے ڈانٹ دیا۔ اب میں نے تمہیں اسی لیے باہر بلایا تھا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ ورنہ ممکن ہے وہ پولیس آفیسر تم سے کچھ باز پُرس کرے اور تم پھنس جاؤ۔"

"شکریہ مادھوری" طارق بولا "میں تمہیں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔"

ٹھیک اسی لمحے طارق کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی ٹھنڈی چیز اس کی گردن سے آ لگی ہو۔ اس کے ساتھ ہی ایک ہلکی سی غراہٹ

سنائی دی۔

"تم اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرو گے مسٹر۔ مجھے تم پر شبہ تو پہلے ہی ہو گیا تھا' اب تم لوگوں کی باتوں سے اس کی تصدیق ہو گئی۔ ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ' کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش کی تو کھوپڑی اُڑا دوں گا۔"

طارق کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے کن انکھیوں سے مادھوری کی طرف دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ مادھوری نے اسے پھنسانے کے لیے یہ سارا ڈراما رچایا تھا لیکن مادھوری کا چہرہ بھی خوف سے پیلا پڑ گیا تھا اور اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس صورت حال نے اسے بھی خوف زدہ کر دیا تھا۔

طارق بینچ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھا لیے۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے مسٹر۔ میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہے ہو۔" طارق بولا۔

"بند کرو بکواس۔ میں تم دونوں کی باتیں سن چکا ہوں۔" وہ غرایا "اور یہ کتیا! یہ تو مارِ آستین ثابت ہوئی ہے۔ اس کا تو وہ حشر کروں گا کہ ساری زندگی یاد کرے گی۔"

"یاد تو تم کرو گے مسٹر۔ پستول پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا لو۔ زیادہ بہادری دکھانے کی کوشش کی تو جسم میں اتنی گولیاں پیوست ہوں گی کہ کوئی انہیں شمار بھی نہیں کر سکے گا۔"

یہ آواز پولیس آفیسر کی پشت سے سنائی دی تھی اور ظاہر ہے وہ دل شیر کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ پولیس آفیسر کو اپنی پشت پر کوئی سخت سی چیز چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا چہرہ دُھواں ہو گیا اور اس نے پستول طارق کی گردن سے ہٹا کر آگے پھینک دیا۔

"پستول اٹھا لو طارق۔" دل شیر نے کہا۔

طارق نے جلدی سے آگے بڑھ کر پستول اٹھا لیا۔ اس دوران دل شیر سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبی سی لکڑی تھی۔ یہ لکڑی ہی اس نے پولیس آفیسر کی پشت سے لگا کر اسے پستول پھینکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"تم تو بڑے بزدل نکلے۔" دل شیر لکڑی کو حرکت دیتے ہوئے بولا۔

"تت... تم لوگ بچ کر نہیں جا سکو گے۔" پولیس آفیسر ہکلایا "ہوٹل میں اس وقت سادہ لباس میں درجنوں پولیس والے موجود ہیں۔ تم لوگ بھاگ نہیں سکو گے۔"

"میں جانتا ہوں۔" دل شیر مسکرایا "لیکن وہ تمام پولیس والے تمہارے منسٹر کے ساتھ اس یہودی رقاصہ کے حسن کے سحر میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس وقت اگر کوئی تمہارے منسٹر کو بھی گولی مار دے تو انہیں پتا نہیں چلے گا۔"

پولیس آفیسر خوف زدہ سی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ دل شیر نے جو کچھ کہا تھا وہ درست تھا۔ ہوٹل میں اگرچہ سادہ لباس میں بھی کئی پولیس والے موجود تھے لیکن وہ سب کے سب ہال میں یا مین گیٹ کی طرف تھے۔ سوئمنگ پول پر کیا ہو رہا تھا' یہ تو کسی نے سوچا بھی نہ ہو گا۔

پولیس آفیسر نے اچانک ہی طارق پر چھلانگ لگا دی۔ اس نے ایک ہاتھ طارق کے پستول والے ہاتھ پر ڈال دیا۔ طارق کے لیے یہ صورت حال قطعی غیر متوقع تھی۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گرا۔ اس کے ساتھ ہی پولیس آفیسر نے پستول پر چھلانگ لگائی۔ ٹھیک اسی وقت مادھوری نے بھی پستول پر چھلانگ لگا دی۔ خوف زدہ ہونے کے باوجود اسے احساس تھا کہ پستول اس پولیس آفیسر کے ہاتھ نہیں لگنا چاہیے۔ پستول مادھوری کے جسم کے نیچے دب گیا۔ پولیس آفیسر پستول کو گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

پولیس آفیسر کا ہاتھ پستول پر پہنچ چکا تھا۔ مادھوری نے دانت اس کے بازو پر گاڑ دیے۔ پولیس آفیسر کی انگلی ٹریگر پر تھی۔ ٹریگر دب گیا اور گولی مادھوری کے سینے میں ٹھیک دل کے مقام پر پیوست ہو گئی۔ پستول چونکہ اس کے جسم کے نیچے دبا ہوا تھا اس لیے فائر کی آواز بھی دب کر رہ گئی تھی۔

طارق نے اگرچہ فوراً ہی پولیس آفیسر پر چھلانگ لگائی تھی لیکن اسے دیر ہو چکی تھی۔ اس نے ایک گھٹنا پولیس آفیسر کے کندھے پر رکھ دیا اور اپنا ایک بازو اس کے گلے میں ڈال کر دبانے لگا۔ پولیس آفیسر کا سانس گھٹنے لگا۔ پستول پر اس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ طارق اس کی گردن پر دباؤ بڑھاتا رہا پھر اس نے اپنے بازو کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔ کڑک کی ہلکی سی آواز ابھری۔ پولیس آفیسر کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اس کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکلی لیکن طارق نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

پولیس آفیسر کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ وہ ختم ہو چکا تھا۔ طارق اس کے اوپر سے اٹھ گیا اور پھر اس کی لاش گھسیٹ کر سوئمنگ پول میں پھینک دی۔ پھر اس نے مادھوری کو سیدھا کیا۔ اس کے سینے سے بہنے والا خون جمتا جا رہا تھا' وہ بھی ختم ہو چکی تھی۔ طارق نے پولیس آفیسر کا پستول اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔

"حنا کہاں ہے؟ اب نکل چلو یہاں سے۔" طارق نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"حنا گاڑی لے کر پچھلی سڑک پر پہنچ چکی ہو گی۔ میرے ساتھ آؤ۔ ایک چھوٹا دروازہ پچھلی دیوار میں بھی ہے' ہم اس طرف سے نکل جائیں گے۔" دل شیر نے کہا۔

وہ لان میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ہوٹل کی عمارت کے عقبی سمت میں چلنے لگے۔ پچھلی طرف ہوٹل کی لانڈری اور ملازمین کے کوارٹرز وغیرہ تھے۔ وہ ان کوارٹروں کے پچھلی طرف سے ہوتے ہوئے عقبی دیوار کے قریب آ گئے۔ یہاں ملازمین کی آمدورفت کے

لیے ایک چھوٹا گیٹ تھا۔ اس وقت دو آدمی گیٹ کے قریب کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ وہ دونوں ادھیڑ عمر تھے اور انہوں نے سردی سے بچنے کے لیے چادریں اوڑھ رکھی تھیں۔ طارق اور دل شیر ان کی طرف دیکھے بغیر گیٹ سے نکل گئے۔ گیٹ پر کھڑے ہوئے آدمیوں نے بھی ان کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔

وہ دونوں پچھلی سڑک پر آکر دائیں بائیں دیکھنے لگے۔ چند سیکنڈ بعد ہی دائیں طرف سے ایک گاڑی آتی ہوئی دکھائی دی۔ کار کی رفتار خاصی تیز تھی۔ وہ بریکوں کی تیز چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ ان کے قریب رک گئی۔ وہ انہی کی کار تھی۔ اسٹیئرنگ کے سامنے حنا بیٹھی ہوئی تھی۔

"جلدی بیٹھو، انٹیلی جنس کے ایک آدمی کو مجھ پر شبہ ہوگیا ہے۔ وہ مجھے کار میں بیٹھتے دیکھ کر اپنی موٹر سائیکل کی طرف بھاگا تھا۔" حنا نے کہا۔

وہ دونوں جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ دل شیر اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا اور طارق پچھلی سیٹ پر۔ کار ایک جھٹکے سے حرکت میں آگئی۔ ٹھیک اسی لمحے ایک موٹر سائیکل موڑ گھوم کر اس طرف آگئی۔ حنا نے کار کا رخ لودھی روڈ کی طرف کردیا۔ موٹر سائیکل بھی ان کے پیچھے اسی طرف گھومی تھی۔

یہ رات کا ابتدائی حصہ تھا۔ سڑک پر آمد و رفت خاصی تھی۔ حنا کار چلانے میں بڑی مہارت کا ثبوت دے رہی تھی۔ ایک موقع پر اسے کار کی رفتار کم کرنا پڑی۔ اس دوران موٹر سائیکل قریب آگئی۔ موٹر سائیکل سوار کے ایک ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ پستول حنا کی طرف اٹھاتے ہوئے چیخا۔

"کار روک لو لڑکی! ورنہ گولی مار دوں گا۔"

حنا نے کار کی رفتار کم کردی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے طارق نے غیر محسوس انداز میں پستول والا ہاتھ کھڑکی سے باہر نکالا اور موٹر سائیکل سوار کے سر پر فائر کردیا۔ دھماکے کے ساتھ ہی موٹر سائیکل سوار کی کھوپڑی کے پرخچے اڑ گئے۔ موٹر سائیکل لہراتی ہوئی سامنے سے آنے والی ایک کار سے ٹکرا گئی۔ طارق چاہتا تو اسے محض زخمی کرکے اپنے تعاقب سے نجات حاصل کرسکتا تھا لیکن اس نے ان تینوں کو دیکھ لیا تھا۔ وہ بعد میں انہیں شناخت بھی کرسکتا تھا۔ اس لیے اس نے موٹر سائیکل سوار کو ختم کردینا ہی مناسب سمجھا تھا۔

حنا نے کار کی رفتار ایک دم بڑھادی۔ کچھ ہی دیر بعد کار پرتھوی راج روڈ پر گھوم کر شاہجہاں روڈ سے ہوتی ہوئی مولانا آزاد روڈ پر مڑ گئی۔ اس واقعے کے بعد وہ لوگ ایک بار پھر گھر میں دبک کر بیٹھ گئے۔ اگرچہ انہیں شناخت کرنے والے ختم ہوچکے تھے لیکن احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ وہ چند روز روپوش رہیں۔

تقریباً ایک ہفتہ گزر گیا۔ طارق اکثر سوچا کرتا تھا کہ چار سال پہلے وہ جس مشن پر یہاں آیا تھا وہ کیا تھا؟ آخر کار ایک روز اس نے جب اس موضوع پر شاہ رخ سے بات کی تو اس نے بتایا کہ وہ مشن تو ان کے پکڑے جانے کی وجہ سے ختم کردیا گیا تھا۔ اس دوران یہ جو چھوٹی چھوٹی کارروائیاں انہوں نے کی تھیں، ان سے لبریشن فرنٹ کو بے حد سہارا ملا تھا۔ ان کارروائیوں سے دہلی کی حکومت بوکھلا گئی تھی۔ دہلی پولیس "تخریب کاروں" کی تلاش میں شکاری کتوں کی طرح پھر رہی تھی۔ اصل "مجرم" تو ان کے ہاتھ نہ آسکے البتہ سیکڑوں بے گناہوں کو پکڑ کر سلاخوں کے پیچھے پہنچادیا گیا۔ دوسری طرف کشمیر میں بھی کشمیری مجاہدین کے خلاف فوجی کارروائیوں میں اضافہ کردیا گیا۔ ہزاروں بے گناہ کشمیری، پولیس اور فوج کے ہاتھوں مارے جارہے تھے۔ ان کے گھروں کو آگ لگائی جارہی تھی۔ انہی دنوں یہ خبر بھی آئی کہ سری نگر کے قریب سوپور میں کشمیری مسلمانوں کی ایک بستی کو جلا کر راکھ کردیا گیا تھا۔ بھارتی فوجیوں نے سترہ مسلمانوں کو ان کے گھروں میں زندہ جلا دیا تھا۔ بھارتی اخبارات تو اس قسم کی خبریں شائع نہیں کر رہے تھے لیکن ریڈیو پاکستان اور بی بی سی سے طارق کو صورت حال کا کچھ علم ہو رہا تھا۔ یہ خبریں سن سن کر اس کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ آخر کار ایک روز اس نے واپس جانے کا فیصلہ کرلیا اور شاہ رخ کو بھی اپنا فیصلہ سنادیا۔

"ممکن ہے تمہارا فیصلہ درست ہو لیکن ہم یہاں جو کچھ بھی کر رہے ہیں وہ اپنی سرزمین کی آزادی کے لیے ہی کر رہے ہیں۔ آزادی کے اس جہاد میں تمہارا بھی اتنا ہی حصہ ہے جتنا وادی میں بھیڑیا صفت، بھارتی فوجیوں سے لڑنے والے مجاہدین کا ہے۔ ہماری ان کارروائیوں نے بھارتی حکومت کی ساکھ کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ یہ کارروائیاں دراصل ہمارے اس مشن کا حصہ ہیں جس کا مقصد ہندوستان میں کشمیریوں کے حق میں رائے عامہ کو ہموار کرنا ہے۔ ٹریننگ کیمپ کی تباہی کے بعد تم نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ عوام نے حکومت کی پالیسی کے

خلاف کس ردِ عمل کا اظہار کیا تھا۔ یہی ہماری کامیابی ہے۔ اگر ہم رائے عامہ کو اپنے حق میں کر سکیں تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہوگی۔ اس سے نہ صرف ہمیں اخلاقی امداد حاصل ہوگی بلکہ یہ حکومت کی پالیسی پر کسی نہ کسی حد تک اثر انداز ہوگی۔" شاہ رخ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "بھارت کی حکومت یوم جمہوریہ منانے کی تیاری کر رہی ہے۔ سری نگر اور پوری وادی میں کشمیری مسلمانوں نے بھارتی حکومت کے خلاف مظاہروں کا پروگرام بنایا ہے۔ ہمیں بھی اس قسم کی ہدایات دی گئی ہیں۔ دہلی میں کشمیری مسلمان مظاہرے کریں گے اور ہماری ٹیم اپنی کارروائی کرے گی۔ اس کارروائی میں ہمارے کچھ اور ساتھی بھی ہوں گے جن سے تم پہلی مرتبہ ملو گے۔ بھارت کے یوم جمہوریہ میں اب صرف ایک ہفتہ رہ گیا ہے۔ اس وقت تک اگر تم یہاں رکنا پسند کرو تو ٹھیک ہے ورنہ مجھے تمہارے جانے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"ٹھیک ہے' میں تمہارے ساتھ ہوں۔" طارق نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

"گڈ' مجھے تم سے یہی امید تھی۔" شاہ رخ نے کہا "کل رات میں نے ڈلہوزی ہاؤس میں ایک میٹنگ بلوائی ہے۔ اس میٹنگ میں وہ سب لوگ شریک ہوں گے جو اس مشن میں حصہ لے رہے ہیں۔ دو مجاہدین حال ہی میں سری نگر سے آئے ہیں۔ وہ بھی اپنی تجاویز پیش کریں گے۔ میں تو کل دوپہر کے بعد گھر سے چلا جاؤں گا' دل شیر بھی صبح ہی چلا جائے گا۔ تم حنا کو ساتھ لے کر آجانا۔ میٹنگ کا وقت رات دس بجے رکھا گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے' میں حنا کے ساتھ پہنچ جاؤں گا۔" طارق نے جواب دیا۔

اس رات طارق دیر تک نہیں سو سکا تھا۔ پچھلے پہر اس کی آنکھ لگی تو صبح دیر تک سوتا رہا۔ جب بیدار ہوا تو پتا چلا کہ حنا کے سوا گھر پر کوئی نہیں ہے۔ طارق نے تیار ہو کر ناشتا کیا اور ڈرائنگ روم میں آگیا جہاں حنا بھی موجود تھی۔ وہ دونوں باتوں میں وقت گزارتے رہے۔

آٹھ بجے رات کا کھانا کھا کر وہ کوٹھی سے نکل گئے۔ کوٹھی میں کوئی گاڑی نہیں تھی۔ کچھ دور تک وہ پیدل چلتے رہے پھر انہیں ایک ٹیکسی مل گئی جس سے وہ کناٹ پلیس پہنچ گئے۔ ڈلہوزی ہاؤس میں میٹنگ کا وقت دس بجے کا تھا۔ ساڑھے نو بجے تک وہ دونوں شاپنگ سینٹر میں گھومتے رہے اور ساڑھے نو بجے ڈلہوزی ہاؤس میں داخل ہو گئے۔ آج یہاں ایک مصری رقاصہ کا پروگرام تھا۔ لوگوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ حنا اور طارق کونے کی ایک میز پر بیٹھ گئے۔ ان سے دوسری میز پر ایک ایسا آدمی بیٹھا ہوا تھا جسے دیکھ کر طارق چونکے بغیر نہیں رہا تھا۔ اس کا چہرہ اسے کچھ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا لیکن یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس شخص کو کب اور کہاں دیکھا تھا۔ وہ شخص بھی اس کی طرف دیکھ کر خفیف سے انداز میں مسکرا دیا تھا۔ چند منٹ بعد وہ شخص اپنی میز سے اٹھ کر اس طرف چلا گیا جہاں باتھ رومز کی طرف جانے والا راستہ تھا۔

نو بج کر پچاس منٹ پر حنا میز سے اٹھ گئی۔ وہ لیڈیز روم کی طرف گئی تھی۔ اس کے ٹھیک پانچ منٹ بعد طارق نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ باتھ رومز والی راہداری میں داخل ہو کر وہ بائیں طرف مڑ گیا اور پھر مختلف راہداریوں اور خفیہ راستوں سے ہوتا ہوا جب وہ تہ خانے والے کمرے میں پہنچا تو وہاں اس شخص کو دیکھ کر وہ ایک بار پھر چونک گیا جسے ہال میں ساتھ والی میز پر بیٹھے دیکھا تھا۔

اس کمرے میں دیواروں کے ساتھ صوفے بچھے ہوئے تھے جن پر آٹھ آدمی اور دو عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان میں ایک تو حنا تھی اور دوسری طارق کے لیے اجنبی تھی۔ اس کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان رہی ہوگی۔ خاصی حسین تھی وہ بھی۔ مردوں میں گلاب دین بھی موجود تھا۔ اس کی یہاں موجودگی ثابت کر رہی تھی کہ شاہ رخ سے اس کا مستقل رابطہ رہا تھا۔ ٹھیک دس بجے ایک اور آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر سب لوگ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اس شخص نے سب سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے کچھ دیر بعد شاہ رخ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے سب کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا تب طارق کو پتا چلا کہ ہال میں دوسری میز پر بیٹھے ہوئے جس شخص کا چہرہ اسے جانا پہچانا لگا تھا وہ لبریشن فرنٹ کا ایک مجاہد تھا اور صرف ایک دن پہلے فرنٹ کی طرف سے کچھ تجاویز لے کر سری نگر سے آیا تھا۔ اس کا نام مبارک علی تھا۔ اب طارق کو سب کچھ یاد آگیا کہ اسے کب اور کہاں دیکھا تھا۔ طارق نے کئی سال پہلے جس کیمپ میں ٹریننگ حاصل کی تھی' مبارک علی اس کیمپ کا انچارج تھا اور وہ شخص جسے دیکھ کر سب لوگ کھڑے ہو گئے تھے' اس کا تعلق بھی فرنٹ سے تھا اور وہ بھی ایک روز پہلے ہی سری نگر سے آیا تھا۔

تعارف کے بعد باقاعدہ میٹنگ شروع ہو گئی اور سب لوگ بھارت کا یوم جمہوریہ شایانِ شان طریقے سے منانے کے لیے تجاویز پیش کرنے لگے۔

○☆○

۲۵ اور ۲۶ جنوری کی درمیانی شب گیارہ بجے' طارق مندر مارگ پر لکشمی نارائن مندر سے چند گز دور ایک مکان میں داخل ہو رہا تھا۔ یہ نیلم نامی اس خوب صورت عورت کا مکان تھا جو اس رات میٹنگ میں شریک تھی۔ اس رات میٹنگ میں یہ طے کر لیا گیا تھا کہ کس کو کس کے ساتھ مل کر کیا کام کرنا ہے۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق طارق کو آج کی رات نیلم کے ساتھ گزارنی تھی اور صبح اسے نیلم کے ساتھ اپنی کارروائی عمل کرنی تھی۔ پروگرام کے مطابق طارق کو رات بارہ بجے کے بعد نیلم کے مکان پر پہنچنا تھا لیکن وہ ایک گھنٹا پہلے ہی آگیا تھا۔ دستک کے

جواب میں دروازہ ایک نو عمر لڑکی نے کھولا تھا۔ لباس اور حلیئے سے وہ کوئی ملازمہ ہی لگتی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی طارق اندر آگیا۔ لڑکی نے اسے روکنے یا کچھ پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی یا پھر طارق نے اسے موقع ہی نہیں دیا تھا۔

"نیلم کہاں ہے؟" طارق نے سوالیہ نگاہوں سے لڑکی کی طرف دیکھا۔

لڑکی نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کر دیا۔ طارق آگے بڑھ گیا۔ کمرے کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ اس نے دھکا دے کر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس طرح رک گیا جیسے زمین نے اس کے پیر پکڑ لیے ہوں۔ دروازے کے بالکل سامنے پلنگ پر ایک مرد اور ایک لڑکی ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔ دروازے کی آواز سن کر وہ دونوں اچھل پڑے۔ طارق کو دیکھ کر لڑکی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس نے مرد کو دھکا دے کر ایک طرف ہٹایا اور خود کو چھپانے کے لیے بستر کی چادر کھینچ کر جسم پر لپیٹنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں شرم و حیا نام کی تو کوئی چیز نہیں تھی لیکن چہرے پر خوف کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ ماتھے پر سرخ بندیا اسے ہندو ثابت کرنے کے لیے کافی تھی۔

یہ منظر دیکھ کر طارق کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ گھوم کر تیزی سے کمرے سے باہر آگیا۔ وہ کمسن لڑکی اب بھی ڈیوڑھی میں کھڑی تھی۔

"میں نے پوچھا تھا، نیلم کہاں ہے؟" اس مرتبہ طارق نے قدرے سخت لہجے میں لڑکی سے دریافت کیا اور لڑکی نے اس مرتبہ اوپر کی طرف انگلی اٹھا دی۔

طارق نے گھور کر لڑکی کی طرف دیکھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا زینے کی طرف بڑھ گیا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر ایک مختصر سا لاؤنج تھا اور اس سے آگے دو کمرے تھے۔ ایک کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا مگر اندر تاریکی تھی۔ دوسرے کمرے میں روشنی تھی مگر دروازہ بند تھا۔ طارق نے پیر کی ٹھوکر سے دروازہ کھول دیا۔

یہ کمرا بہت شاندار طریقے سے آراستہ تھا۔ قیمتی صوفے، خوب صورت دبیز قالین۔ کمرے کی ہر چیز خوب صورت اور قیمتی تھی۔ دائیں طرف والے صوفے پر ایک مرد اور ایک عورت بیٹھے ہوئے تھے۔ آدمی ہندو لگتا تھا۔ عمر پچاس سے کچھ اوپر ہی رہی ہوگی۔ اس نے دھوتی کرتا اور سیاہ کوٹ پہن رکھا تھا۔ کلین شیو اور سر کے بال سفید تھے۔ وہ نیم مدہوش تھا۔ اس نے اگرچہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگا رکھی تھی لیکن اس کا سر عورت کے کندھے پر جھکا ہوا تھا۔ اور وہ عورت نیلم تھی۔ اس کے جسم سے ساڑی کا پلو ہٹا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا جسے وہ مرد کے ہونٹوں کی طرف لے جا رہی تھی لیکن دروازے پر پیر کی ٹھوکر پڑنے سے وہ اس طرح اچھلی کہ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس اس کے ساتھی مرد پر گر گیا۔ شراب نے اس کا کرتا اور کوٹ تر کر دیا۔ وہ بھی

> "ہمارے جاتے ہی اس نے دوبارہ عینک اور بتیسی نکال کر رکھ دی ہوگی۔"
> "وہ کیوں؟"
> "بہت کنجوس ہے۔ اس کا بس چلے تو سانس بھی نہ لے۔"

ایک جھٹکے سے سیدھا ہو گیا۔

"یہ.... یہ کون بدتمیز ہے!" وہ آنکھیں ملتے ہوئے ہکلایا۔

"لالہ جی یہ..." نیلم نے جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔

نیلم نے اس بوڑھے ہندو کے کان میں نجانے کیا کہا تھا کہ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس سرگوشی سے اس کا سارا نشہ بھی ہرن ہو گیا تھا۔ اس نے دروازے کے قریب پڑے ہوئے اپنے جوتے پہننے کی کوشش کی مگر پیر الٹے سیدھے پڑ رہے تھے۔ آخرکار اس نے جھک کر جوتے ہاتھوں میں اٹھا لیے اور پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر باہر بھاگ گیا۔

طارق دروازے کے قریب کھڑا خونخوار نگاہوں سے نیلم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نیلم اپنی جگہ سے اٹھ کر ساڑی درست کرنے لگی۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہارا کردار اتنا مکروہ اور گھناؤنا ہے۔" طارق سلگتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "کل رات کی میٹنگ میں تو تم دخترانِ کشمیر کی عزت و ناموس کی قسمیں کھا کر ہندو بھیڑیوں سے خوف ناک انتقام کی باتیں کر رہی تھیں لیکن اس وقت تمہارا یہ روپ دیکھ کر گھن آرہی ہے مجھے۔ اور شاید یہی تمہارا اصل روپ ہے۔"

"بعض اوقات آنکھوں دیکھا بھی قابل یقین نہیں ہوتا۔" نیلم نے مدھم لہجے میں کہا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی "ضروری نہیں کہ حقیقت وہی ہو جو تم نے دیکھی ہو۔"

"میری نظروں کو جھٹلانا چاہتی ہو۔" طارق نے اسے گھورا "اگر یہ سب کچھ فریب نظر تھا تو پھر حقیقت کیا ہے؟"

"حقیقت وہی ہے جو تمہارے دل میں ہے۔" نیلم نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے جواب دیا "میں کشمیر کی بیٹی ہوں اور کشمیر کی کوئی بیٹی اپنی جان تو دے سکتی ہے' کسی کو اپنی عزت سے اس طرح کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ آج وادی میں میری سیکڑوں بہنوں اور بیٹیوں کو رسوا کیا جا رہا ہے۔ میں ان کے بارے میں سنتی ہوں تو میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ میں ان کا انتقام لے رہی ہوں۔ یہ دکانداری میں حصولِ زر، عیاشی یا جنسی تسکین کے لیے نہیں کر رہی۔ یہ تو وہ جال ہے جو میں ان خونخوار بھیڑیوں کو پھنسانے کے لیے پھیلائے بیٹھی ہوں۔ لوگوں کو میرا دامن داغدار نظر آتا ہے مگر میں جانتی ہوں کہ میرا دامن بالکل صاف اور بے داغ ہے۔

میں یہ سب کچھ اپنے وطن کی آزادی کے لیے کر رہی ہوں۔ میں نے آج تک کسی کو مقررہ حد سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ تم نے جو کچھ دیکھا وہ حقیقت میں وہ نہیں تھا جو تم سمجھ رہے ہو۔"

"لیکن نیچے ایک کمرے میں، میں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ کیا ہے؟" طارق بولا۔

"ہاں، وہ حقیقت ہے۔" نیلم نے جواب دیا "لیکن تمہیں شاید علم نہیں کہ وہ ہندو لڑکی ہے اور اس کا چاہنے والا بھی ہندو ہے۔ میں انہی کے جوتے انہی کے سر پر مار رہی ہوں۔ انہی کی بیٹیوں اور بہنوں کو انہی کے سامنے ننگا کر رہی ہوں۔ یہ بھیڑیے نما انسان بڑی خوشی سے اپنی ہی بہنوں اور بیٹیوں کی عزت سے کھیلتے ہیں اور مجھے وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو میں چاہتی ہوں، جس کے لیے میں نے یہ دُکانداری سجا رکھی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں!" طارق کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔

"یہ کوٹھا عام تماش بینوں کے لیے نہیں ہے۔" نیلم نے جواب دیا "یہاں آنے والوں کا تعلق یا تو حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں سے ہوتا ہے یا ایسی شخصیات سے جن سے ہم اپنے مطلب کی کوئی بات معلوم کر سکیں یا اس سے کوئی فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ بڈھا جو ابھی یہاں سے بھاگا ہے، جانتے ہو کون ہے؟"

"میں کیا بتا سکتا ہوں۔" طارق نے نفی میں سر ہلایا۔

"یہ لالہ پریم ناتھ ہے۔ کشمیری ہندو۔" نیلم نے جواب دیا "اس کی زندگی کا بیشتر حصہ کشمیر میں گزرا ہے۔ آج کل حکومت کے اس شعبے سے وابستہ ہے جسے امورِ کشمیر کا نام دیا جاتا ہے۔ لالہ پریم ناتھ اس شعبے میں کلیدی عہدے پر فائز ہے۔ اس کے توسط سے کچھ کار آمد باتیں معلوم ہو چکی ہیں اور کچھ کے لیے کوشش جاری ہے۔"

"لیکن تم نے اس کے کان میں کیا کہا تھا کہ وہ اس طرح بدحواس ہو کر بھاگ نکلا؟" طارق نے کہا۔

"میں نے اسے بتایا تھا کہ تم ایک منسٹر کے پرائیویٹ سیکریٹری ہو اور کچھ دیر بعد وہ منسٹر بھی یہاں آنے والا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ اس قدر بدحواس ہوا کہ اسے جوتے ہاتھ میں اٹھا کر بھاگنا پڑا۔" نیلم نے کہتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی "اور نیچے تم نے جس شخص کو دیکھا تھا وہ بھی حکومت کے ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہے لیکن اب وہ بھی بھاگ گیا ہوگا۔"

"مجھے افسوس ہے نیلم، میں نے تمہارے کردار پر شک کیا۔ تم واقعی عظیم ہو کہ تم نے اپنے وطن کی آزادی اور اپنی ہم وطن بہنوں اور بیٹیوں کی ناموس کی خاطر رُسوائی کا داغ اپنی پیشانی پر سجا رکھا ہے۔" طارق نے کہا "یہ رُسوائی کا داغ نہیں، درحقیقت تمہارے ماتھے پر چمکتا ہوا وہ روشن ستارہ ہے جو دوسروں کو راہ دکھا رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔"

"وطن کی آزادی کے لیے ہمیں جان کی قربانی بھی دینا پڑے تو ہم دریغ نہیں کریں گے۔" نیلم نے کہا۔

"میں شاید جلدی آ گیا ہوں۔"

"اسی لیے میں نے تمہیں بارہ بجے آنے کو کہا تھا۔" نیلم مسکرائی "بہرحال آؤ، دوسرے کمرے میں چلتے ہیں۔"

وہ اس کمرے میں آ گئے جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن بتی بُجھی ہوئی تھی۔ نیلم نے اندر داخل ہو کر بتی جلا دی۔ یہ بیڈ روم تھا۔ یہاں کی ہر چیز خاصی قیمتی تھی۔

"یہ میرا ذاتی بیڈ روم ہے۔ اس میں میرے سوا اور کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ تم بیٹھو، میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔" نیلم کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

اس کی واپسی آدھے گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹرے سائڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

"یہ لو گرم گرم کافی، میرا خیال ہے تم اس کی طلب محسوس کر رہے ہو گے۔" نیلم نے کہتے ہوئے ایک کپ اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

طارق پلنگ کے سامنے والی دیوار کے ساتھ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ نیلم اپنا کپ لے کر قالین پر بیٹھ گئی۔ طارق بھی کرسی سے اٹھ کر قالین پر آ گیا۔ اس نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ نیلم لباس بھی تبدیل کر آئی تھی، اب وہ شلوار قمیص پہنے ہوئے تھی۔

"کیا پروگرام ہے؟" طارق نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔

نیلم کوئی جواب دینا ہی چاہتی تھی کہ نیچے کہیں سے کال بیل کی آواز سنائی دی۔ نیلم کمرے سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف چلی گئی۔ اس کی واپسی میں تقریباً دس منٹ لگے تھے۔ اس کے ہاتھ میں پیلے رنگ کا ایک شولڈر بیگ تھا۔ اس نے بیگ بڑی احتیاط سے ایک طرف رکھ دیا اور وہ ایک بار پھر صبح کا پروگرام بتانے لگی۔

وہ دونوں صبح ٹھیک چھ بجے گھر سے نکل گئے۔ تقریباً اسی وقت ان کے دوسرے ساتھی بھی اپنے اپنے ٹھکانوں سے نکل کر شہر کے مختلف حصوں میں پھیل رہے تھے۔

صبح نو بجے یومِ جمہوریہ کی تقریبات کا آغاز ہوا۔ اور ٹھیک اس وقت جب بھارتی وزیرِ اعظم اپنا بھاشن دے رہا تھا، شہر دھماکوں سے گونجنے لگا۔ پہلا دھماکا دہلی کے مین ریلوے اسٹیشن پر ہوا تھا۔ اس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفے سے شہر کے مختلف علاقوں میں دھماکے ہونے لگے۔ یہ دھماکے دہلی میں کشمیری مسلمانوں کی طرف سے بھارت کے یومِ جمہوریہ کو سلامی تھی۔

O☆O

دہلی کے پولیس حکام بُری طرح بوکھلا گئے تھے۔ گزشتہ ڈیڑھ مہینے کے دوران یہاں جو کچھ بھی ہوا تھا وہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جسے نظرانداز کر دیا جاتا۔ پہلے تہاڑ جیل سے دو خطرناک کشمیری مجاہدین کا فرار جن میں ایک پولیس کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور دوسرا مفرور روپوش ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کے بعد صفدر

جنگ ائرپورٹ پر لینڈ کرتے ہوئے جہاز کی تباہی اور اس کے صرف تین دن بعد جمنا کے کنارے ٹریننگ کیمپ کی تباہی' پھر کوٹلہ فیروز شاہ میں نامعلوم لوگوں کے ہاتھوں آٹھ پولیس والوں کی ہلاکت اور پھر ہوٹل اوبیرائے کے سوئمنگ پول میں ایک پولیس آفیسر کی لاش اور پول کے قریب ہی ایک ایسی عورت کی لاش کا پایا جانا جو چند روز پہلے جیل سے بھاگے ہوئے کشمیری مجاہد اور اس کے ایک ساتھی کو پناہ دینے کے الزام میں گرفتار کی گئی تھی لیکن بعد میں اسے چھوڑ دیا گیا تھا اور یہ عورت اکثر ویشتر اس پولیس آفیسر کے ساتھ دیکھی گئی تھی جس کی لاش اوبیرائے کے سوئمنگ پول میں پائی گئی تھی۔ آخر میں بھارت کے یوم جمہوریہ کے موقع پر پورے دہلی میں بموں کے دھماکے جن میں مجموعی طور پر گیارہ افراد کی ہلاکت کے علاوہ کروڑوں روپے کی املاک کا نقصان بھی ہوا تھا۔

ایک انگریزی اخبار نے گزرے ہوئے ان واقعات کا تفصیلی تجزیہ شائع کرتے ہوئے اس شبے کا اظہار کیا تھا کہ ان تمام سرگرمیوں کے پیچھے تہاڑ جیل سے بھاگے ہوئے طارق سعید نامی اس کشمیری مجاہد کا ہاتھ ہے جس کا پولیس ابھی تک سراغ نہیں لگا سکی۔ اخبار نے اس یقین کا اظہار بھی کیا تھا کہ طارق سعید کو دہلی میں رہنے والے کچھ اور لوگوں کی امداد بھی حاصل ہے اور یہ لوگ ایک منظم گروہ کی طرح ان کارروائیوں میں مصروف ہیں لیکن پولیس ابھی تک طارق سعید یا اس کے کسی ساتھی کا سراغ نہیں لگا سکی۔ اس کے برعکس بے گناہوں کو پکڑ کر نہ صرف جیلوں میں ٹھونس دیا گیا ہے بلکہ انہیں تشدد کا نشانہ بھی بنایا جا رہا ہے۔ اخبار نے پولیس کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ان بے گناہوں پر تشدد کرنے کے بجائے ان لوگوں کو تلاش کرنے کی کوشش کرے جن کی وجہ سے شہر میں خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے۔ اخبار نے طارق سعید کی تصویر بھی شائع کی تھی۔ یہ تصویر سوا چار سال پرانی تھی اور جیل کے ریکارڈ سے حاصل کی گئی تھی۔ یہ تصویر آج کے طارق سعید سے اس قدر مختلف تھی کہ اس کی مدد سے طارق کو شناخت کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

یوم جمہوریہ پر دھماکوں کے بعد طارق اور اس کے ساتھی ایک بار پھر اپنی سرگرمیاں معطل کر کے زیر زمین چلے گئے تھے۔ گلاب دین ان کے لیے بہت ہی کارآمد آدمی ثابت ہوا تھا۔ یہ لوگ اس کی بدولت ٹریننگ کیمپ کے بارے میں معلومات حاصل کر سکے تھے اور پھر یوم جمہوریہ کے موقع پر بھی اس نے ان کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ شاہ رخ اس سے ابھی اور کام بھی لینا چاہتا تھا۔ یہ اطلاع بھی گلاب دین ہی نے دی تھی کہ پولیس نے خفیہ طور پر چند ایسے سرکاری افسروں کی خفیہ نگرانی شروع کر دی ہے جنہیں ماضی میں مشکوک افراد سے ملتے جلتے دیکھا گیا تھا یا اب بھی ان کے ایسے لوگوں سے روابط قائم تھے جن کا کردار پولیس کے لیے مشکوک تھا۔ ان میں بعض نام تو ایسے تھے جو شاہ رخ کے لیے اجنبی تھے لیکن

کفایت

ایک بچے نے اپنے باپ سے کہا۔ "آپ تو اکثر کہتے تھے کہ امی نہایت فضول خرچ ہیں اور بالکل کفایت نہیں کرتیں۔"

باپ نے بیٹے سے کہا۔ "اس میں کیا شک ہے؟"

"ایسی بات تو نہیں۔" بیٹے نے کہا۔

"کیوں' وہ کہاں کی کفایت شعار ہیں؟" باپ نے حیرت سے کہا۔

"دیکھیے۔" لڑکے نے کہا۔ "ابھی کل کی بات ہے' امی نے سالگرہ منائی تھی۔ یہ ان کی چالیسویں سالگرہ تھی۔ انہیں کیک پر قاعدے سے چالیس موم بتیاں جلانی چاہیے تھیں مگر آپ نے دیکھا ہو گا کہ انہوں نے کفایت کے خیال سے صرف اکیس موم بتیاں ہی جلائی تھیں۔"

ایک دو نام اس کے جانے پہچانے تھے۔ ان میں ایک نام لالہ پریم ناتھ کا بھی تھا۔ لالہ پریم ناتھ حکومت کے شعبۂ امور کشمیر میں ایک اہم عہدے پر فائز تھا۔ یہ بڈھا نیلم کے حسن کا اسیر تھا اور نیلم کے ذریعے اس سے حکومتِ ہند کی کشمیر کی پالیسی کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلوم ہوتا رہتا تھا۔ لالہ پریم ناتھ ان کے لیے نہایت اہم آدمی تھا اور وہ لوگ اسے کھونا نہیں چاہتے تھے۔

نیلم کو اس سلسلے میں خبردار کر دینا ضروری تھا۔ نیلم کے ہاں اگرچہ ٹیلی فون موجود تھا لیکن شاہ رخ نے فون پر بات کرنے کے بجائے طارق کو نیلم کے پاس بھیج دیا کہ اسے اس صورت حال سے آگاہ کر دیا جائے۔

طارق' شاہ رخ کی گاڑی لے گیا تھا۔ وہ رات تقریباً دس بجے مندر روڈ پر پہنچ گیا۔ گاڑی اس نے لکشمی نارائن مندر کے قریب ایک تنگ سی گلی کے موڑ پر چھوڑ دی اور ٹہلنے والے انداز میں نیلم کے مکان کی طرف چلنے لگا۔

دستک کے جواب میں دروازہ آج بھی اسی لڑکی نے کھولا تھا۔ طارق اس سے کچھ کہے بغیر اندر داخل ہو گیا۔ اس مکان کے گراؤنڈ فلور پر دو تین کمرے تھے جن کے دروازے بند تھے البتہ روشنی تمام کمروں میں نظر آ رہی تھی۔

"نیلم کہاں ہے؟" طارق نے اندر داخل ہونے کے بعد لڑکی سے پوچھا "اچھی طرح کان کھول کر سنو۔ میں نیلم کے بارے میں پوچھ رہا ہوں' کسی اور کے بارے میں نہیں۔"

نجانے کیوں لڑکی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے اوپر کی طرف اشارہ کر دیا۔ طارق سیڑھیوں کی طرف بڑھ

گیا۔ نیلم اوپر والے لاؤنج میں ہی مل گئی۔
"اوہ تم!" وہ طارق کو دیکھ کر چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔
"ہاں میں۔ ایک بہت ہی اہم معاملہ درپیش تھا۔ شاہ رخ نے فون پر بات کرنا مناسب نہیں سمجھا اس لیے مجھے بھیج دیا گیا۔" طارق نے کہا۔
"تم کمرے میں چل کر بیٹھو' میں دس منٹ میں آتی ہوں۔" نیلم نے اپنے کمرے کی طرف اشارہ کیا اور سیڑھیاں اترنے لگی۔
طارق کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جا بیٹھا۔ اس نے کمرے کی بتی جلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔
تقریباً پندرہ منٹ گزر گئے۔ طارق کچھ عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکلنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ سیڑھیوں پر قدموں کی آواز سنائی دی۔ طارق نے دروازے کی آڑ سے جھانک کر دیکھا۔ وہ نیلم تھی اور اس کے ساتھ لالہ پریم ناتھ بھی تھا جو بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ نیلم نے اسے سہارا دے رکھا تھا۔ وہ دونوں اس کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ مزید دس منٹ انتظار میں گزر گئے' جب نیلم کمرے میں آئی تو اس کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔
"تم نے بتی نہیں جلائی؟" اس نے پوچھا۔
"کوئی خاص بات نہیں' اندھیرے میں بیٹھنا اچھا لگ رہا ہے۔" طارق نے جواب دیا "یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟"
"یہی وہ کاغذات ہیں جن کے حصول کے لیے میں تڑپ رہی تھی اور لالہ پریم ناتھ میرے لیے۔" نیلم نے ہاتھ میں پکڑا ہوا کاغذات کا پلندہ اس کی طرف بڑھا دیا۔
"میں سمجھا نہیں۔" طارق بولا۔
"یہ کشمیر کے بارے میں حکومت کی اگلی ایک سال کی پالیسی ہے۔ میں بہت دنوں سے اس کے حصول کے لیے لالہ پریم ناتھ پر دباؤ ڈال رہی تھی۔" نیلم نے بتایا۔
"اوہ!" طارق چونک گیا "میں لالہ پریم ناتھ ہی کے سلسلے میں یہاں آیا تھا۔ لالہ پریم ناتھ انٹیلی جنس کی نظروں میں آگیا ہے اور اس کی باقاعدہ نگرانی ہو رہی ہے۔ میں یہی کہنے آیا تھا کہ فی الحال اس سے دور ہی رہو۔"
"تم یہ کاغذات سنبھالو' میں لالہ جی سے نمٹ کر ابھی آتی ہوں۔" نیلم کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔
دس منٹ گزر گئے۔ اچانک نیچے سے نسوانی چیخوں اور شور کی ملی جلی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ طارق بدحواس سا ہو کر کمرے سے نکل آیا۔ نیلم بھی دوڑی دوڑی وہاں پہنچ گئی۔
"کیا ہوا؟ یہ شور کیسا ہے؟" طارق نے پوچھا۔
"میرا خیال ہے پولیس نے ریڈ کیا ہے۔ تم میرے کمرے میں جاؤ اور یہ کاغذات چھپالو۔ میں دیکھتی ہوں۔" نیلم کہتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف دوڑ گئی۔
طارق' نیلم کے کمرے میں گھس کر دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ اس نے کاغذات کا پلندہ بڑی احتیاط سے اپنے لباس میں چھپالیا تھا۔
نیلم جب نیچے پہنچی تو صورت حال خاصی تشویش ناک تھی۔ چار پولیس والے جن میں ایک سب انسپکٹر تھا اور تین کانسٹیبل' تینوں کمروں سے پیار کے پنچھیوں کو باہر لا چکے تھے۔ تینوں لڑکیاں ہندو تھیں اور مرد بھی ان کے ہم مذہب ہی تھے۔ لڑکیوں نے جسموں پر بستروں کی چادریں لپیٹ رکھی تھیں اور مردوں نے اُلٹے سیدھے لباس پہن کر اپنی عریانیت چھپانے کی کوشش کی تھی۔ وہ تینوں تھر تھر کانپ رہے تھے۔
"انسپکٹر وجے!" نیلم نے انسپکٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "تمہیں تھانے میں بیٹھے اپنا حصہ مل جاتا ہے تو تم میرے مہمانوں کو اس طرح پریشان کرنے کیوں آئے ہو؟"
"آج بات ذرا مختلف ہے نیلم بائی۔" انسپکٹر وجے نے کہا۔ وہ ایک جوان آدمی تھا اور اس کے چہرے پر چھوٹی سی داڑھی بڑی بھلی لگ رہی تھی "مجھے اطلاع ملی تھی کہ لالہ پریم ناتھ یہاں آیا ہوا ہے۔ انٹیلی جنس والے' لالہ پریم ناتھ کو تمہارے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ ان سے پہلے ریڈ کر کے کیوں نہ یہ کریڈٹ میں حاصل کرلوں۔ کہاں ہے لالہ پریم ناتھ؟"
"لالہ پریم ناتھ!" نیلم بری طرح چونک گئی۔ پھر سنبھلتے ہوئے بولی "تم میرے ساتھ آؤ انسپکٹر اور اپنے آدمیوں سے کہو' میرے مہمانوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچائیں۔ انہیں بھی تو یہاں سب کچھ مل جاتا ہے۔"
"اے' تم لوگ یہیں رُکو' میں آرہا ہوں۔" انسپکٹر وجے نے اپنے آدمیوں سے کہا اور نیلم کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔
طارق دروازے کے پیچھے چھپا سیڑھیوں پر نیلم اور انسپکٹر وجے کی آوازیں سن رہا تھا۔ نیلم کی باتوں سے طارق کو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ اس نے کیا منصوبہ بنایا تھا اور انسپکٹر کو اوپر کیوں لا رہی تھی۔
"اندر چلو انسپکٹر! لالہ پریم ناتھ اندھیرے میں دبکا بیٹھا ہے۔" نیلم نے کہا۔
انسپکٹر وجے جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا' دروازے کے پیچھے چھپے ہوئے طارق نے اس پر چھلانگ لگادی۔ اس نے اپنا ایک بازو انسپکٹر کی گردن پر لپیٹ دیا۔ یہ صورت حال انسپکٹر وجے کے لیے قطعی غیر متوقع تھی۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن اس کی گردن شکنجے میں جکڑی جا چکی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے گرفت چھڑانے کی کوشش کرنے لگا لیکن طارق کی گرفت سخت سے سخت تر ہوتی چلی گئی۔ ایسے موقعوں پر اس کے چہرے پر عجیب سی درندگی ابھر آتی تھی۔ اس وقت بھی اس کے چہرے کے تاثرات بہت ہی

خوفناک تھے۔

انسپکٹر وجے کے حلق سے خرخراہٹ کی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ طارق نے اس کی گردن کو دو تین زوردار جھٹکے دیے۔ آخر کار کڑک کی ہلکی سی آواز ابھری اور انسپکٹر کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ کو طارق نے دوسرے ہاتھ سے دبا لیا تھا۔

"تم جلدی سے اس کی یونیفارم پہن لو۔ میں لالہ کو لے کر آتی ہوں۔" نیلم کہتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گئی۔

اس کے جاتے ہی طارق نے انسپکٹر کی لاش کو دروازے کی آڑ میں گھسیٹ لیا اور اس کی یونیفارم اتارنے لگا۔ تقریباً دو منٹ بعد نیلم جب لالہ پریم ناتھ کو لے کر اس تاریک کمرے میں داخل ہوئی تو طارق، انسپکٹر کی وردی پہن چکا تھا۔ کاغذات بھی اس نے احتیاط سے قمیص کے اندر چھپا لیے تھے۔ اس نے انسپکٹر کی ٹوپی سر پر اس طرح جھکالی تھی کہ اس کا اوپر کا نصف چہرہ چھپ کر رہ گیا تھا۔ اس نے ہولسٹر سے ریوالور نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور لالہ پریم ناتھ کی طرف دیکھا جو تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"چل بے شیطان!" طارق اسے ٹھوکر رسید کرتے ہوئے بولا "آج تجھے پتا چلے گا کہ عشق کیسے لڑایا جاتا ہے۔"

"مم۔ میں بے قصور ہوں انسپکٹر۔ اس بیسوا نے...."

"پتا ہے یا نہیں بیسوا کے بچے۔" طارق نے اسے دیکھا اور ٹھوکر رسید کر دی۔ وہ کمرے سے نکل کر سیڑھیاں اترنے لگے۔ آخری سیڑھی پر طارق رک گیا۔ یہاں نیم تاریکی تھی۔ وہ کانسٹیبلوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم لوگ یہیں رکو اور ان سب کے ہاتھ پیر باندھ کر ڈال دو، میں ابھی آتا ہوں۔" طارق نے مصنوعی طور پر کھانستے ہوئے کہا اور لالہ پریم ناتھ اور نیلم کو دھکے دیتا ہوا مکان سے باہر نکل گیا۔ دروازے کے سامنے بھی دو کانسٹیبل موجود تھے۔ انہوں نے کھٹ سے سلیوٹ جھاڑ دیا۔ طارق نے ان کی طرف دیکھے بغیر کھانستے ہوئے کہا۔

"تم لوگ اندر جاؤ اور ملزموں کو باندھنے میں اپنے ساتھیوں کی مدد کرو، میں ان دونوں کو ٹھکانے لگا کر آتا ہوں۔"

ایک کانسٹیبل نے عجیب سی نظروں سے طارق کی طرف دیکھا، وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر طارق، نیلم اور لالہ پریم ناتھ کو دھکے دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

گلی میں ایک آدمی اور دو تین عورتیں جارہی تھیں۔ پولیس کو دیکھ کر وہ ایک طرف ہٹ کر اور بھی تیز تیز قدم اٹھا کر چلنے لگے۔ گلی کے موڑ پر طارق گاڑی کے قریب رک گیا۔

"اس بڈھے کو لے کر پیچھے بیٹھ جاؤ۔ جلدی کرو۔" طارق نے کہا اور اگلا دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ گیا۔

گاڑی ایک زبردست جھٹکے سے آگے بڑھی تھی۔ وہ گلی سے

ایک ماہر نفسیات کے کلینک میں ایک خاتون آئیں۔ ڈاکٹر نے شناسا چہرہ دیکھ کے یاد کرتے ہوئے پوچھا۔ "محترمہ! میں نے آپ کو پہلے کہاں دیکھا ہے؟"

محترمہ نے جواب دیا "پہلی بار آپ نے مجھے اس وقت دیکھا تھا جس دن میری آپ سے شادی ہوئی تھی۔"

نکل کر جیسے ہی مین روڈ پر آئے، پولیس کی ایک جیپ تیزی سے گلی میں مڑتی ہوئی نظر آئی۔ سڑک پر آتے ہی طارق نے کار کی رفتار تیز کر دی۔ اسے یقین تھا کہ یہ پولیس پارٹی نیلم کے مکان کی طرف ہی جارہی تھی۔ انسپکٹر وجے کے آدمیوں کو تو وہ بے وقوف بنا کر نکل آئے تھے لیکن جب یہ نئے پولیس والے وہاں پہنچیں گے تو ان کا راز فاش ہوجائے گا اور فوراً ہی ان کی تلاش شروع ہوجائے گی۔ پولیس جیپ میں ریڈیو ٹرانسمیٹر بھی ہوگا، اس کے ذریعے وہ پورے شہر کی پولیس کو الرٹ کرسکتے تھے۔ اگرچہ ان کی کار نہیں دیکھی گئی تھی لیکن چیکنگ کے دوران دھر لیے جانے کا امکان تھا۔

"ڈرائیونگ کر سکتی ہو نیلم؟" طارق نے پوچھا۔

"ہاں" نیلم نے جواب دیا۔

"تو پھر جلدی سے آگے آجاؤ، میں اس بڈھے سے نمٹتا ہوں۔" طارق نے گاڑی روک لی۔

نیلم اگلی سیٹ کی پشت کے اوپر سے آگے آئی اور طارق پیچھے پہنچ گیا۔

"کہاں چلنا ہے؟" نیلم نے گاڑی کو حرکت میں لاتے ہوئے پوچھا۔

"اس وقت زیرو پوائنٹ قریب ترین ہے۔ اسی طرف چلو۔" طارق نے جواب دیا اور لالہ پریم ناتھ کی طرف متوجہ ہوگیا۔

لالہ پریم ناتھ خوف سے نیم مُردہ ہورہا تھا۔ طارق نے اچانک ہی لپک کر اس کا نرخرہ دبا لیا۔ بڈھے نے مزاحمت تو کی لیکن یہ مزاحمت زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکی۔ روح نے جلد ہی اس کے ناتواں جسم کا ساتھ چھوڑ دیا۔ یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ لالہ پریم ناتھ ختم ہوچکا ہے، طارق نے کار کا دروازہ کھول کر اس کی لاش باہر دھکیل دی اور ہاتھ جھاڑتا ہوا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

مختلف سمتوں سے پولیس سائرنوں کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں جس کا مطلب یہ تھا کہ شہر میں ان کی تلاش شروع ہوچکی تھی۔ ٹھیک اسی وقت نیلم نے کار کناٹ پیلس پر ڈلہوزی ہاؤس کی پچھلی گلی میں موڑ دی۔

یہ گلی سنسان تھی۔ چند کاریں کھڑی تھیں۔ اس نے کار ایک جگہ روک دی اور وہ دونوں اُتر کر تقریباً دوڑتے ہوئے ایک تنگ

سے دروازے میں داخل ہو گئے۔ اندر تاریکی تھی۔ وہ دونوں ایک لمحے کو رکے اور پھر اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ یہ تنگ سی ڈیوڑھی تھی جس کا ایک موڑ گھوم کر وہ روشنی میں آ گئے۔
پولیس کی یونیفارم میں ہونے کی وجہ سے طارق کو اچانک ہی ایک آدمی نے سامنے آ کر روک لیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ طارق نے اطمینان سے ٹوپی سر سے اتار دی اور اسی لمحے نیلم بھی سامنے آ گئی۔ پہچان لیے جانے کے بعد انہیں مخصوص کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اس کمرے میں شاہ رخ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ایک پولیس والے کو نیلم کے ساتھ دیکھ کر ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ پھر طارق کو پہچان کر اس کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔
"تم لوگ!" وہ باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے بولا "میں سمجھا نہیں' یہ سب کیا ہے؟"
"نیلم کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔" طارق نے جواب دیا اور پھر اسے تفصیل سے سب کچھ بتانے لگا "یہ کشمیر کے بارے میں بھارتی حکومت کی اگلے ایک سال کی پالیسی ہے۔ ان کاغذات کا حصول نیلم کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔" طارق نے شرٹ کے نیچے سے کاغذات کا پلندہ نکال کر شاہ رخ کے سامنے میز پر ڈال دیا۔
شاہ رخ کاغذات کھول کر دیکھنے لگا۔ وہ اگرچہ سرسری سے انداز میں ان کاغذات کو دیکھ رہا تھا لیکن ہر کاغذ پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی۔
"نیلم!" وہ کاغذات میز پر رکھتے ہوئے بولا "تم نے واقعی ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس سے ہمیں پتا چل رہا ہے کہ بھارتی حکومت اگلے ایک سال کے دوران وادی میں کیا کچھ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ لیکن اب یہ لوگ کچھ نہیں کر سکیں گے۔ ہم وادی میں ہر جگہ ان کا مقابلہ کریں گے۔ اور طارق تم..." وہ طارق کی طرف دیکھنے لگا "دو چار روز میں تم بھی روانگی کی تیاری کرو' یہاں صرف ایک ایسا کام رہ گیا ہے۔ جس میں مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑے گی۔ اس کے بعد تم کشمیر روانہ ہو جاؤ گے۔ نیلم بھی تمہارے ساتھ جائے گی۔"
"اور وہ کام کیا ہے؟" طارق نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
"یہ تمہیں کل بتایا جائے گا۔ اب تم اوپر جا کر لباس تبدیل کرو۔ اوپر میرے کمرے میں تمہیں ضرورت کی ہر چیز مل جائے گی۔ اور نیلم' تم بھی اوپر چلی جاؤ۔ تمہارا باہر نکلنا درست نہیں ہے۔ اب تم دو تین دن یہیں رہو گی لیکن...."
"لیکن کیا؟" اس کے خاموش ہونے پر طارق نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
"یہ کاغذات لالہ پریم ناتھ کے ذریعے حاصل کیے گئے ہیں اور لالہ پریم ناتھ انٹیلی جنس کی نظروں میں آ چکا ہے۔ آج پولیس کے ریڈ اور نیلم کے فرار کے بعد پولیس' لالہ پریم ناتھ سے پوچھ گچھ ضرور کرے گی اور جب وہ ان کاغذات کے بارے میں بتا دے گا تو حکومت' کشمیر کے بارے میں اپنا یہ منصوبہ تبدیل کر دے گی۔ اس طرح یہ کاغذات ہمارے لیے بے کار ہو جائیں گے۔" شاہ رخ نے کہا۔
"لیکن لالہ پریم ناتھ اپنی زبان نہیں کھولے گا۔" طارق نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
"تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو؟" شاہ رخ نے اسے گھورا "وہ پولیس کی مار برداشت نہیں کر سکے گا۔ یہاں کی پولیس کو تم جانتے ہو' وہ لوگ زبان کھلوانے کے لیے کیسے کیسے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔"
"لیکن پولیس اب لالہ پریم ناتھ کی زبان نہیں کھلوا سکے گی۔" طارق بولا "میں تمہیں یہ بتانا بھول گیا تھا کہ نیلم کے کوٹھے سے فرار ہوتے وقت ہم لالہ پریم ناتھ کو بھی اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ میں نے اس کی گردن مروڑ کر اسے راستے میں پھینک دیا تھا۔ اس کی لاش پولیس کو سڑک پر سے مل گئی ہو گی لیکن تم جانتے ہو کہ کوئی لاش کسی کو کچھ نہیں بتا سکتی۔ اور جہاں تک ان کاغذات کا سوال ہے تو کسی کو ان کے بارے میں پتا نہیں چل سکے گا۔ یہ فوٹو اسٹیٹ کاپیاں ہیں جبکہ اصل کاغذات فائل میں موجود ہیں۔ اس طرح کسی کو شبہ نہیں ہو سکے گا۔"
"اب میں مطمئن ہوں۔" شاہ رخ نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "اب جاؤ' تم لوگ آرام کرو۔ مجھے کچھ اور ضروری کام نمٹانے ہیں۔"
طارق اور نیلم اس کمرے سے نکل کر اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ طارق کو وہ کمرا معلوم تھا جو شاہ رخ کے زیر استعمال تھا۔ یہاں دو تین اور کمرے بھی تھے جنہیں کسی ایمرجنسی میں پناہ گاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ نیلم دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ طارق نے پولیس کی وردی اتار کر الماری میں رکھا ہوا ایک لباس پہن لیا اور نیلم والے کمرے میں آ گیا۔ وہ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔
انہیں ڈلہوزی ہاؤس میں بند ہوئے تین دن گزر گئے۔ شاہ رخ نے انہیں بڑی سختی سے منع کر رکھا تھا کہ وہ اپنے کمروں سے نکل کر ڈلہوزی ہاؤس کے ریسٹورنٹ یا کلب والے حصے کی طرف آنے کی کوشش نہ کریں کیونکہ پچھلے دو دن سے ریسٹورنٹ اور نائٹ کلب میں کچھ مشکوک قسم کے لوگ دیکھے جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے بارے میں شاہ رخ کو یقین تھا کہ اس کا تعلق انٹیلی جنس سے ہے۔ دوسروں کا تعلق بھی غالباً پولیس ہی سے تھا۔ ان لوگوں کی یہاں موجودگی یہ ظاہر کر رہی تھی کہ انہیں ڈلہوزی ہاؤس پر کسی قسم کا شبہ ہو گیا ہے۔ شاہ رخ نے اپنے تمام ساتھیوں کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ فی الحال ڈلہوزی ہاؤس کا رخ نہ کریں۔ وہ کسی قسم کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ طارق اب کچھ بیزاری سی محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ تقریباً قید ہو کر رہ گیا تھا۔ لیکن آخر کار اس کا انتظار ختم ہو گیا۔ اس روز پانچ بجے کے قریب شاہ رخ پلاسٹک کا ایک تھیلا اٹھائے اس کے کمرے میں داخل ہوا۔

"یہ لباس تبدیل کرلو۔ تمہیں ٹھیک سات بجے ہنومان مندر پہنچنا ہے۔" شاہ رخ نے تھیلا اس کے پلنگ پر پھینکتے ہوئے کہا۔

"ہنومان مندر!" طارق نے حیرت سے کہا "مجھے کوئی پنڈت سمجھا ہے کیا؟"

"تمہیں تھوڑی دیر کے لیے پنڈت ہی بننا پڑے گا۔" طارق مسکرایا "تم یہ لباس تبدیل کرلو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

شاہ رخ کے جانے کے بعد طارق نے تھیلا کھولا۔ گیروے رنگ کا لمبا سا چغہ، لکڑی کی کھڑاؤں اور چند مالاؤں کے علاوہ اس تھیلے میں لمبے بالوں والی وگ اور داڑھی مونچھیں وغیرہ بھی تھیں۔ طارق نے پہلے لباس پہنا اور پھر آئینے کے سامنے بیٹھ کر لمبے بالوں والی وگ سر پر سیٹ کرنے لگا۔ وگ کے بعد اس نے داڑھی مونچھیں اٹھا کر دیکھیں، دونوں چیزیں ملی ہوئی تھیں۔ اس نے بڑی احتیاط سے داڑھی اور مونچھیں چہرے پر چپکا لیں اور آئینے میں دیکھنے لگا۔ اپنی شکل دیکھ کر اسے خود ہی ہنسی آگئی۔ گھنی مونچھیں داڑھی سے اس طرح ملی ہوئی تھیں کہ اس کے ہونٹ چھپ کر رہ گئے تھے۔ سر کے بال بھی بکھرے ہوئے سے تھے۔ تھیلے سے پیلے رنگ کا ایک چاک بھی برآمد ہوا تھا جس سے اس نے پیشانی پر ایک موٹی سی لکیر کھینچ لی۔ اب وہ دیکھنے میں ایک ہندو مہنت ہی لگتا تھا۔ وہ آئینے کے سامنے سے ہٹا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور نیلم اندر داخل ہوئی۔ ایک ہندو مہنت کو کمرے میں دیکھ کر اس کے منہ سے خوفزدہ سی چیخ نکل گئی۔

"ارے پاگل تو نہیں ہو گئیں! یہ میں ہوں طارق۔" طارق نے آگے بڑھ کر اسے بانہوں سے پکڑ لیا۔

نیلم کے منہ سے ایک گہرا سانس نکل گیا۔ اگر وہ طارق کی آواز نہ پہچان لیتی تو اس کی بات کا کبھی یقین نہ کرتی۔ طارق نے تھیلے میں سے رنگ برنگی موتیوں کی مالائیں نکال کر گلے میں ڈال لیں۔

"کہیں جا رہے ہو؟" نیلم نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں" طارق نے اثبات میں سر ہلایا "ہنومان مندر جانے کا حکم ملا ہے لیکن ابھی تک یہ نہیں بتایا گیا کہ وہاں مجھے کیا کرنا ہوگا۔"

"ہنومان مندر" نیلم بولی "یہ تو زیادہ دور نہیں ہے۔"

اس دوران شاہ رخ بھی کمرے میں آگیا۔ وہ طارق کو سمجھانے لگا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

"تم مندر کے مرکزی دروازے میں داخل ہو کر دائیں طرف تیسرے ستون کے پاس کھڑے رہو گے۔ ٹھیک سات بجے پرکاش تم سے رابطہ قائم کرے گا، وہ تمہیں کچھ کاغذات دے گا۔ تم وہ کاغذات لے کر مندر سے نکل جاؤ گے۔ واپس آتے ہوئے اس بات کا خیال رکھو گے کہ تمہاری نگرانی تو نہیں کی جارہی۔"

"لیکن پرکاش سے وہ کاغذات تو گلاب دین بھی وصول کر سکتا تھا۔" طارق بولا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔" شاہ رخ نے اسے گھورا "وہ گلاب دین کو اب بھی اپنا دوست سمجھتا ہے۔ وہ کاغذات حنا کے حوالے سے بلیک میل کرکے پرکاش سے حاصل کیے جا رہے ہیں۔ اسے گلاب دین پر ابھی تک کسی قسم کا شبہ نہیں ہوسکا۔ اس لیے ہم گلاب دین کو اس طرح اس کے سامنے نہیں لاسکتے۔" شاہ رخ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "ہنومان مندر اسی چوراہے کے دوسری طرف پارلیمنٹ اسٹریٹ کے کنارے پر ہے۔ مندر سے پچاس گز کے فاصلے پر پیلے رنگ کی ایک کار کھڑی ہوگی جس کا انجن اسٹارٹ ہوگا۔ اگر کسی قسم کا خطرہ محسوس کرو تو اس کار میں بیٹھ جانا۔ اگر کوئی خطرہ نہ ہو یا تمہاری نگرانی نہ کی جارہی ہو تو کار کی طرف جانے کی ضرورت نہیں۔ مندر یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے، تم ساڑھے چھ بجے یہاں سے نکل جانا۔"

"ٹھیک ہے۔" طارق نے اثبات میں گردن ہلادی۔

"یہ اپنے پاس رکھ لو۔ کسی ہنگامی صورت حال میں اس کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔" شاہ رخ نے کہتے ہوئے ایک پستول اس کی طرف بڑھا دیا۔

طارق نے پستول لے کر اسے چیک کیا اور چغے کے اندر چھپا لیا۔ شاہ رخ جا چکا تھا۔ طارق، نیلم سے باتیں کرنے لگا۔ پھر ٹھیک ساڑھے چھ بجے وہ عقبی دروازے سے ڈلوزی ہاؤس سے نکل گیا۔ عقبی گلی سے نکل کر وہ چوراہے پر آگیا۔ یہ دراصل

دائرے کی شکل میں ایک بہت بڑا پارک تھا جس کے چاروں طرف شاپنگ سینٹر بنے ہوئے تھے۔ طارق پارک میں داخل ہوگیا اور ایک ہندو جوگی ہی کی طرح چلتا ہوا دوسری طرف بڑھنے لگا۔ پارک میں بہت سے لوگ موجود تھے۔ بچے بھی کھیل رہے تھے۔

پارک سے نکل کر وہ پارلیمنٹ اسٹریٹ پر آگیا۔ جب وہ ہنومان مندر میں داخل ہوا تو چھ بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے۔ وہ دائیں طرف تیسرے ستون سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر آنکھیں بند کر رکھی تھیں جیسے بڑے انہماک سے پوجا کررہا ہو۔ بظاہر اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن آنکھوں میں بہت ہلکی سی جھری سے وہ اپنے آس پاس آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔

ٹھیک سات بجے اس نے ایک نوجوان کو مندر کے اندرونی حصے سے اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ پرکاش تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی سی تھی۔ وہ طارق کے پاس آکر رک گیا۔ اس کا چہرہ پیلا ہورہا تھا جیسے ٹی بی کا مریض ہو۔

طارق نے آنکھیں کھول دیں، پہلے لوگوں کو دیکھتا رہا پھر پرکاش کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"بھگوان کے چرنوں میں آکر بھی تمہیں سکھ نہیں ملا مورکھ۔ اس کی وجہ وہ بوجھ ہے جو تم نے اٹھا رکھا ہے۔ لاؤ اپنا بوجھ مجھے دے دو، تمہیں شانتی مل جائے گی۔" طارق نے کہا۔

پرکاش واقعی خوف سے مرا جارہا تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے ادھر اُدھر دیکھا اور پوٹلی طارق کی طرف بڑھا دی۔ طارق نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پوٹلی لبادے میں چھپالی لیکن وہ یہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ ہال میں تقریباً دس گز دور ایک ستون کی آڑ میں کھڑا ہوا ایک اور شخص بھی ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

پرکاش نے دونوں ہاتھ جوڑ کر جوگی کو پرنام کیا اور وہاں سے ہٹ گیا۔ طارق بھی دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ ٹھیک اسی وقت ستون کے پیچھے چھپا ہوا وہ آدمی تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے پرکاش کا ہاتھ پکڑلیا۔ دوسری طرف سے ایک اور آدمی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا طارق کے قریب پہنچ گیا اور طارق کا ہاتھ پکڑ کر ہولے سے غرایا۔

"میرے ساتھ ساتھ چلتے رہو سوامی! اگر بھاگنے کی کوشش کی تو گولی ماردوں گا۔"

طارق کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس نے کن انکھیوں سے دوسری طرف دیکھا، پرکاش بھی ایک آدمی کی گرفت میں تھا۔ طارق کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ان دونوں کا تعلق انٹیلی جنس سے تھا اور یقیناً باہر بھی ان کے آدمی موجود ہوں گے۔ وہ مزاحمت کیے بغیر سادہ لباس والے کے ساتھ چلتا رہا۔ اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

مرکزی دروازے کے سامنے کشادہ سیڑھیوں پر پہنچ کر طارق نے کن انکھیوں سے دائیں بائیں دیکھا۔ بائیں طرف ایک آدمی کھڑا تھا۔ وہ انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی یقیناً انٹیلی جنس کا آدمی تھا۔ اس نے کچھ دور کھڑے ہوئے ایک اور آدمی کو اشارہ کردیا اور وہ دونوں آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھنے لگے۔ مندر کے مرکزی دروازے کے دائیں طرف پچاس گز کے فاصلے پر پیلے رنگ کی کار کھڑی تھی لیکن طارق کے خیال میں اس کا کار تک پہنچنا مشکل ہی تھا۔ پھر بھی اس نے کوشش کرلینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔

مندر میں لوگوں کی آمدورفت جاری تھی۔ طارق نے اچانک ہی زوردار جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور کار کی طرف دوڑ لگادی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے لباس میں چھپا ہوا پستول نکال کر اس آدمی پر گولی چلادی تھی جس نے چند لمحے پہلے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ گولی اس شخص کی ٹانگ پر لگی اور وہ سیڑھیوں پر لڑھکتا چلا گیا۔

اس وقت وہاں انٹیلی جنس کے چار آدمی تھے۔ ایک زخمی ہوگیا تھا، دوسرے نے آکاش کو گرفت میں لے رکھا تھا اور باقی دو آدمیوں نے طارق کے پیچھے دوڑتے ہوئے فائرنگ شروع کردی۔

بھگدڑ سی مچ گئی۔ مندر میں آنے اور جانے والے لوگ چیختے ہوئے ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ طارق کار کی طرف دوڑ رہا تھا جو اَب بیس گز کے فاصلے پر رہ گئی تھی۔ انٹیلی جنس کے دونوں آدمی اس کے پیچھے تھے۔ اچانک کار سے آٹومیٹک رائفل سے فائرنگ کی جانے لگی۔ ایک گولی طارق کے پیچھے دوڑنے والے آدمیوں میں سے ایک کے سینے میں لگی۔ وہ چیختا ہوا ڈھیر ہوگیا۔ دوسرے آدمی نے ایک طرف چھلانگ لگا کر اپنی جان بچائی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پرکاش نے بھی اپنا ہاتھ ایک جھٹکے سے چھڑا کر ایک طرف دوڑ لگادی لیکن اسے زیادہ دور جانے کا موقع نہ مل سکا۔ کار سے چلائی جانے والی ایک گولی نے اس کا بھیجا اڑا دیا۔

طارق کار کے قریب پہنچ چکا تھا۔ پچھلا دروازہ کھل گیا۔ طارق کے بیٹھتے ہی کار ایک زبردست جھٹکے سے حرکت میں آگئی۔ کار میں تین آدمی تھے۔ ایک اسٹیئرنگ سنبھالے ہوئے تھا اور دو فائرنگ کررہے تھے۔

کار ایک چکر کاٹ کر ڈلہوزی ہاؤس کی عقبی گلی میں پہنچ گئی۔ طارق نے کار سے چھلانگ لگادی اور کار تیز رفتاری سے آگے نکل گئی۔ گلی میں تاریکی تھی۔ طارق دوڑتا ہوا ڈلہوزی ہاؤس کے عقبی دروازے میں داخل ہوگیا۔

پولیس کی گاڑیاں کناٹ پلیس کے آس پاس دندناتی پھررہی تھیں۔ انہیں اس پیلی گاڑی کی تلاش تھی جس میں ہندو سادھو فرار ہوا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد پولیس کو پیلے رنگ کی وہ گاڑی ایک ایسی سڑک پر مل گئی جہاں ہر قسم کی اشیاء فروخت کرنے والی چھوٹی چھوٹی دکانوں کی بھرمار تھی۔ دکاندار زیادہ تر ہندو تھے۔ سڑک کے کنارے اور دونوں طرف فٹ پاتھوں پر بھی خوانچے والوں کا قبضہ

تھا۔ ابھی تو آٹھ بھی نہیں بجے تھے پھر بھی سڑک پر راہ گیروں کی اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ دکانوں میں گاہکوں کی آمدورفت تھی اور چھوٹے چھوٹے ریستوران بھی آباد تھے۔

پولیس نے پیلے رنگ کی اس گاڑی کو فوراً ہی گھیرے میں لے لیا تھا اور آس پاس ہندو سادھو اور اس کے ساتھیوں کی تلاش شروع ہو گئی تھی۔ پولیس نے آس پاس کے دکانداروں سے بھی پوچھ گچھ کی مگر کسی نے کسی سادھو کو اس گاڑی سے اترتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ایک خوانچے والے نے صرف اتنا بتایا کہ دو آدمی پیلے رنگ کی اس کار سے اُتر کر دائیں طرف کی گلی میں جاتے ہوئے دیکھے گئے تھے لیکن ان دونوں میں سے کسی کا حلیہ کوئی بھی نہیں بتاسکا تھا۔ تلاشی لینے پر اس گاڑی میں سے دو آٹومیٹک رائفلیں اور چار بھرے ہوئے میگزین مل گئے تھے لیکن گاڑی میں کسی قسم کے کاغذات یا کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے گاڑی کے مالک کے بارے میں فوری طور پر کچھ معلوم ہو سکتا۔

پولیس نے پورے علاقے کو گھیرے میں لے لیا۔ تمام سڑکوں کی ناکا بندی کر دی گئی اور وسیع پیمانے پر ہندو سادھو اور اس کے ساتھیوں کی تلاش شروع کر دی گئی۔ علاقے میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ لوگ خوف زدہ ہو کر وہاں سے نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہوٹلوں اور ریستورانوں میں بھی پولیس دندنانے لگی۔ مشکوک افراد کو حراست میں لیا جانے لگا۔

تین پولیس والے ڈلہوزی ہاؤس میں بھی گھس آئے۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگ خوف زدہ سے ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک ویٹرس نے منیجر کو اطلاع کر دی۔ منیجر فوراً ہی ہال میں پہنچ گیا۔ ڈلہوزی ہاؤس ہوٹل کم نائٹ کلب تھا۔ اس کا شمار دہلی کے اے کلاس نائٹ کلبوں میں ہوتا تھا۔ کوئی عام پولیس والا انتظامیہ کی اجازت کے بغیر اندر گھسنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن آج ایک نہیں، تین تین پولیس والے اندر گھس آئے تھے اور وہ تینوں کانسٹیبل تھے جو ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے بڑی بدتمیزی سے سوال جواب کر رہے تھے۔

ڈلہوزی ہاؤس کا منیجر مسلمان اور شاہ رخ کا خاص آدمی تھا۔ وہ تینوں کانسٹیبلوں پر چڑھ دوڑا۔

"تم لوگوں کو اندر داخل ہونے کی جرأت کیسے ہوئی۔" وہ دہاڑا "جانتے ہو یہ کسی ملباری یا مارواڑی کا چائے خانہ نہیں۔ یہ اے کلاس کلب ہے، یہاں شہر کے معززین اور شرفاء آتے ہیں۔ میں پولیس کمشنر سے تمہاری شکایت کروں گا۔ تم لوگ فوراً نکل جاؤ یہاں سے۔"

"ہمیں ایک ہندو سادھو اور اس کے دو ساتھیوں کی تلاش ہے جو کچھ دیر پہلے ہنومان مندر کے سامنے دو تین آدمیوں کو قتل کر کے فرار ہوئے ہیں۔" ایک کانسٹیبل نے جواب دیا۔

"تو تمہارا خیال ہے کہ وہ قاتل اطمینان سے یہاں بیٹھے چائے یا شراب پی رہے ہوں گے جنہیں تم پکڑ لو گے۔" منیجر دہاڑا۔

"انسپکٹر کا حکم ہے کہ انہیں تمام جگہوں پر تلاش کیا جائے۔" کانسٹیبل نے کہا۔

"اپنے انسپکٹر کو بلاؤ۔" منیجر نے کہا۔

ٹھیک اسی لمحے انسپکٹر ہال میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ بھی دو مسلح پولیس کانسٹیبل تھے۔

"یہ سب کیا ہے انسپکٹر؟" منیجر اسے دیکھتے ہی بولا "میرے کلب کی ریپوٹیشن کو اس طرح برباد کیوں کیا جارہا ہے! میرے معزز گاہکوں سے نہایت گھٹیا سلوک کیا جارہا ہے۔ لوگ یہاں آنا چھوڑ دیں گے۔"

"سوری مسٹر قادر۔" انسپکٹر نے جواب دیا "تم حالات کی سنگینی کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ایک ہندو سادھو اور اس کے دو ساتھی مندر کے سامنے کم از کم تین افراد کو قتل کر کے فرار ہوئے ہیں۔ وہ ہندو سادھو درحقیقت ایک غیر ملکی ایجنٹ ہے جسے ایک مقامی آدمی سے کچھ کاغذات لیتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا تھا لیکن وہ کم بخت بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔"

"اور وہ آدمی کون تھا جو کاغذات دے رہا تھا؟" منیجر نے پوچھا۔

"بھارت کے ایک بہت قریبی دوست سفارت خانے کا ایک ملازم۔" انسپکٹر نے جواب دیا۔

"تو پھر اسی سے کیوں نہیں پوچھ لیا جاتا کہ ہندو سادھو کون ہے۔"

"یہی تو افسوس کی بات ہے۔ وہ بھی ختم ہو چکا ہے۔" انسپکٹر نے جواب دیا "چند روز پہلے بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ شعبۂ امور کشمیر کے ایک کلیدی آفیسر کو ایک طوائف کے ذریعے بلیک میل کر کے اس سے بھی شاید کسی قسم کے کاغذات وصول کیے گئے تھے لیکن عین وقت پر وہ طوائف نہ صرف اپنے ساتھی کے ساتھ فرار ہو گئی بلکہ اس آفیسر کو بھی قتل کر دیا گیا تاکہ یہ معلوم نہ ہو سکے کہ اس سے کس قسم کے کاغذات وصول کیے گئے تھے۔"

"ویسے آج کل تمہارا قانون کچھ بے بس نہیں ہو گیا؟" منیجر نے مسکراتے ہوئے کہا "پچھلے کئی روز سے یہاں قتل و غارت ہو رہی ہے۔ شہر میں خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے اور ابھی تک ایک آدمی بھی نہیں پکڑا گیا۔"

"یہی تو ہماری بے بسی ہے۔" انسپکٹر نے جواب دیا "میں جانتا ہوں کہ قتل جیسی واردات کرنے کے بعد کوئی شخص کسی ہوٹل میں بیٹھ کر اطمینان سے چائے نہیں پی سکتا لیکن محض خانہ پُری کے لیے آپ مجھے اجازت دے دیں۔"

"ضرور لیکن اس شرط پر کہ میرے معزز مہمانوں کو ہراساں نہ کیا جائے۔" منیجر نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں ایک نظر کرسٹل روم پر ڈال لوں پھر آپ

کے دفتر میں آتا ہوں۔" انسپکٹر نے صرف ایک کانسٹیبل کو اپنے ساتھ رکھا اور دوسروں کو باہر جانے کی ہدایت کردی۔

منیجر قادر اپنے دفتر میں آگیا۔ اس نے دروازہ بند کرتے ہی انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر ایک نمبر دبایا۔ دوسری طرف سے فوراً ہی کال ریسیو کرلی گئی۔ منیجر ریسیور کان سے لگائے سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔

"شاہ رخ! پولیس، ہندو سادھو اور اس کے ساتھیوں کی تلاش میں ڈلہوزی ہاؤس میں داخل ہوچکی ہے۔ انسپکٹر ماتھر ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو چیک کررہا ہے۔ ممکن ہے وہ کلب میں رہائش پذیر مہمانوں کو بھی چیک کرنا چاہے۔"

"انسپکٹر ماتھر جو کہتا ہے ویسا ہی کرو، گھبرانے کی ضرورت نہیں۔" دوسری طرف سے شاہ رخ نے جواب دیا۔

منیجر نے ریسیور رکھ دیا۔ اس کے ٹھیک ایک منٹ بعد انسپکٹر ماتھر دفتر میں داخل ہوا۔

"کوئی مشتبہ آدمی نظر آیا؟" منیجر نے جھجکتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں" انسپکٹر ماتھر نے نفی میں سر ہلایا "کیا میں کلب میں رہائش پذیر مہمانوں کو چیک کرسکتا ہوں؟"

"ضرور" منیجر نے ایک رجسٹر اس کے سامنے رکھ دیا "لیکن اس وقت گورکھ پور سے آئے ہوئے ایک بوڑھے اور اس کی بیوی کے سوا کوئی مہمان ہوٹل میں موجود نہیں ہے۔ کوئی صبح سے باہر گیا ہے، کوئی دوپہر سے اور کوئی شام سے۔ اگر تم چاہو تو اس بوڑھے جوڑے کو چیک کرسکتے ہو۔ وہ تیسری منزل پر کمرا نمبر ۳۰۷ میں قیام پذیر ہیں۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" انسپکٹر نے رجسٹر کو دیکھے بغیر کہا "اگر کلب میں کوئی مشکوک آدمی دیکھو تو فوراً پولیس اسٹیشن اطلاع کردینا۔"

"ضرور" منیجر نے اثبات میں سر ہلادیا۔ وہ انسپکٹر کو باہر کے دروازے تک چھوڑنے بھی گیا تھا۔ واپس آکر اس نے ایک بار پھر انٹرکام پر شاہ رخ کو رپورٹ دی اور پھر ہال میں آکر ان لوگوں سے معذرت کرنے لگا جن سے پولیس والوں نے پوچھ گچھ کی تھی۔ اس نے یہ بھی اناؤنس کروادیا کہ پولیس کی مداخلت سے پیدا ہونے والی بدمزگی دور کرنے کے لیے تھوڑی دیر بعد ایک خصوصی پروگرام پیش کیا جائے گا اور وہ پروگرام ایک نئی رقاصہ کا نیم عریاں رقص تھا۔

طارق ڈلہوزی ہاؤس کے عقبی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ ایک منٹ کے اندر اندر اس نے لباس تبدیل کیا اور سادھو والا چغہ، داڑھی مونچھ، وگ اور مالائیں وغیرہ پلاسٹک کے تھیلے میں ڈال کر وہ پوٹلی ہاتھ میں لے لی اور شاہ رخ والے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس نے لباس والا تھیلا اور پوٹلی شاہ رخ کے سامنے ڈال دی "ان چیزوں کو فوراً ہی ٹھکانے لگادو۔" اس نے تھیلے کی طرف اشارہ کیا "اور یہ وہ کاغذات ہیں جن کے لیے کم از کم تین آدمیوں کو اپنی زندگی سے محروم ہونا پڑا ہے۔"

"کیا مطلب؟" شاہ رخ نے پوٹلی کھولتے ہوئے کہا۔

"آج تو میں رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔" طارق نے کہا اور پھر پورے واقعے کی تفصیل بتانے لگا۔ آخر میں بولا "پرکاش بھی ختم ہوچکا ہے۔"

"ٹھیک ہے، تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں تھوڑی دیر میں وہیں آتا ہوں۔" شاہ رخ نے کہا اور طارق اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا۔

آکاش سے ملنے والے کاغذات نہایت اہم ثابت ہوئے تھے۔ یہ دراصل اس منصوبے کا ابتدائی خاکہ تھا جو کشمیر کے حوالے سے بھارتی حکومت اور اسرائیل نے مشترکہ طور پر تیار کیا تھا۔ اس منصوبے سے دونوں ملکوں کا مفاد وابستہ تھا۔ ہنود و یہود کی یہ مشترکہ سازش ایک طرف کشمیری مسلمانوں کے لیے تباہ کن تھی تو دوسری طرف پاکستان کو بھی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانے کی پلاننگ کی گئی تھی۔

یہ منصوبے کا ابتدائی خاکہ تھا۔ اس میں اگرچہ تفصیلات موجود نہیں تھیں لیکن اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی را اور اسرائیلی انٹیلی جنس ایجنسی موساد کے ایجنٹ مل کر کیا کرنا چاہتے تھے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ طاقت کے بل بوتے پر کسی قوم کو غلام بنا کر نہیں رکھا جاسکتا۔ ویتنام نے تین نسلوں تک امریکی استعمار کا مقابلہ کیا تھا اور آخرکار امریکا کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا تھا۔ کیوبا نے امریکا کو ناکوں چنے چبوادیے تھے۔ افغانستان کے غیور باشندے گیارہ سال تک سوویت یونین کی طاقت کا مقابلہ کرتے رہے تھے۔ افغانستان کی پچانوے فیصد آبادیاں کھنڈر بن گئیں، لاکھوں افراد شہید ہوگئے، لاکھوں افراد ملک چھوڑنے پر مجبور ہوگئے لیکن انہوں نے سوویت یونین کی غلامی قبول نہیں کی اور آخرکار سوویت یونین کو افغانستان سے بے آبرو ہو کر نکلنا پڑا۔ سوویت یونین کا اپنا شیرازہ بکھر گیا۔ جو مسلمان ریاستیں ستر اسی سال سے کمیونزم کے ظلم و ستم کی چکی میں پس رہی تھیں، انہوں نے بھی آخرکار آزادی کا نعرہ بلند کردیا اور اس طرح یونین کا وجود ہی ختم ہوگیا۔ یوگوسلاویہ بھی بکھر گیا۔

آزادی کی اس لہر نے پوری دنیا کے مظلوموں میں ایک نیا ولولہ پیدا کردیا تھا۔ کشمیر کے مسلمان بھی جو گزشتہ ۴۵ سال سے بھارتی استعمار کی چکی میں پس رہے تھے، ایک نئے جذبے اور ولولے کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے غاصب بھارت کے خلاف اپنی سرگرمیاں تیز کردیں۔

کشمیر میں اٹھنے والی آزادی کی اس نئی لہر نے بھارتی حکمرانوں کی نیندیں اُڑا دیں۔ انہوں نے اس لہر کو دبانے کے لیے اسرائیل کے ساتھ مل کر ایک نئی سازش تیار کی جسے طارق اور اس کے ساتھیوں نے ابتدائی مرحلے ہی میں ختم کردیا۔ اب ان کاغذات سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہود و ہنود برِ صغیر کے مسلمانوں کے خلاف ایک نئی سازش کے تانے بانے بُن رہے تھے۔

بھارت اگر کشمیری مسلمانوں میں پیدا ہونے والی آزادی کی اس نئی لہر سے خائف تھا تو پاکستان میں کہوٹہ کے ایٹمی پلانٹ نے اسرائیلی حکمرانوں کی نیندیں اُڑا رکھی تھیں۔ پاکستان اگرچہ کئی مرتبہ یہ وضاحت کرچکا تھا کہ اس کی ایٹمی سرگرمیاں پُرامن اور ترقیاتی مقاصد کے لیے ہیں لیکن بھارت اور اسرائیل پاکستان کے اس مؤقف کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ انہیں پاکستان کی پُرامن ایٹمی سرگرمیوں کے پیچھے اسلامی بم دکھائی دے رہا تھا جس سے وہ خوف زدہ تھے۔ کہوٹہ کا ایٹمی پلانٹ ان کے لیے ہوّا بنا ہوا تھا۔ چند سال پہلے اسرائیل اور بھارت نے کہوٹہ کے ایٹمی پلانٹ کو تباہ کرنے کی سازش کی تھی۔ بھارت کے جیگوار طیارے سرینگر کے ہوائی اڈے پر تیار کھڑے تھے۔ ان طیاروں کے پائلٹ اسرائیلی تھے جو طیاروں کے کاک پٹس میں بیٹھے گرین سگنل کے منتظر تھے۔ منصوبے کے مطابق یہ جیگوار طیارے سری نگر سے پرواز کرکے کہوٹہ پر بموں کی بارش کرتے ہوئے نکل جاتے لیکن آخری لمحوں پر انہیں اطلاع ملی کہ پاکستان یہود و ہنود کی اس سازش سے آگاہ ہوچکا ہے اور پاک فضائیہ کے طیارے بھارتی جیگوار طیاروں کا استقبال کرنے کو تیار ہیں۔ اس طرح عین آخری وقت میں یہ منصوبہ ختم کردیا گیا۔ اس کے بعد بھی کہوٹہ کے خلاف کئی چھوٹی چھوٹی سازشوں کے انکشافات ہوئے تھے لیکن یہود و ہنود کو ہر مرتبہ منہ کی کھانی پڑی تھی۔ وہ یہ بھی سمجھ گئے تھے کہ پاکستان کی انٹیلی جنس خوابِ غفلت کی نیند نہیں سو رہی ہے۔

کچھ ہی عرصے بعد اسرائیل نے بھارت کے ساتھ مل کر ایک نئی سازش تیار کی۔ اس مرتبہ اسرائیلی انٹیلی جنس موساد کے ایجنٹوں کو سیاحوں کے روپ میں سری نگر پہنچادیا گیا۔ ان سیاحوں کی تعداد ڈیڑھ سو کے لگ بھگ تھی اور یہ دو دو چار چار کی ٹولیوں میں سری نگر پہنچے تھے۔ یہ اسرائیلی ایجنٹ سیاحوں کے روپ میں آزاد کشمیر میں داخل ہوکر کہوٹہ کی طرف آتے اور تخریبی کارروائیاں شروع کردیتے لیکن پاکستان کو اس سازش کا بھی بروقت پتا چل گیا۔ بھانڈہ پھوٹ جانے پر اسرائیل نے اپنی اس سازش کا اعتراف کرلیا لیکن بھارتی حکمران بڑی ڈھٹائی سے اس کی تردید کرتے رہے۔

پے در پے ناکامیوں کے بعد اسرائیل اور بھارت نے ایک نئی سازش تیار کی تھی جس کا یہ ایک خاکہ تھا۔ تفصیلات نہ ہونے کے باوجود اس خاکے سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اب یہود و ہنود کشمیری مسلمانوں اور پاکستان کے خلاف کیا کرنا چاہتے تھے۔

نیلم کے ذریعے لالہ پریم ناتھ سے جو کاغذات ملے تھے وہ بھی خاصے اہم تھے۔ یہ نہ صرف اگلے ایک سال کے دوران کشمیر میں مجاہدین سے نمٹنے کی حکمتِ عملی تھی بلکہ پاکستان کے خلاف بھارت کے گھناؤنے عزائم کا بھی پتا چلتا تھا۔ اس منصوبے کے مطابق بھارت، پاکستان کی سرحد سے ملحق صوبے راجستھان کے علاقے رن کچھ میں ایسے کیمپ قائم کررہا تھا جہاں را کے ایجنٹ منتخب نوجوانوں کو تخریب کاری کی تربیت دیں گے۔ ان میں زیادہ تر مسلمان ہوں گے۔ تربیت کے بعد انہیں سرحد پار پاکستانی علاقے میں بھیج دیا جائے گا۔ یہ لوگ نہ صرف پاکستان میں تخریبی سرگرمیاں جاری رکھیں گے بلکہ آزاد کشمیر پہنچ کر میرپور، پونچھ اور مظفر آباد وغیرہ میں بھی تخریبی کارروائیاں جاری رکھیں گے۔ ان علاقوں میں انہیں بعض مقامی لوگوں کی بھی مدد حاصل ہوگی۔

کشمیر اور پاکستان کے خلاف بھارت کے یہ منصوبے انتہائی خطرناک تھے۔ غدار کس ملک اور قوم میں نہیں ہوتے۔ اور ہمیشہ غداروں نے ہی اپنی قوم کو نقصان پہنچایا ہے۔ بیرونی دشمن سے نمٹنا آسان ہوتا ہے لیکن گھر کے بھیدی ہمیشہ تباہ کن ثابت ہوتے ہیں کیونکہ ان کی شناخت مشکل ہوتی ہے۔

لالہ پریم ناتھ سے حاصل ہونے والے کاغذات میں کچھ نام ایسے بھی تھے جو کشمیر اور پاکستان میں بھارت کے آلۂ کار ہوسکتے تھے۔ ان ناموں کے بارے میں اگرچہ کوئی وضاحت موجود نہیں تھی لیکن طارق کو یقین تھا کہ یہ نام بھارت کے حکمرانوں کے لیے بہت اہمیت رکھتے تھے۔

ان سازشوں کا انکشاف ہونے کے بعد طارق کی بے چینی
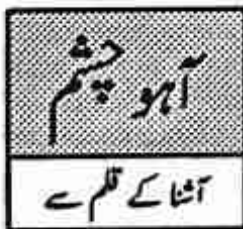
بڑھتی گئی۔ وہ اب جلد سے جلد دہلی چھوڑ دینا چاہتا تھا تاکہ کشمیر پہنچ کر اپنی تنظیم کو بھارت کے ان گھناؤنے منصوبوں سے آگاہ کر سکے۔

شاہ رخ کے خیال میں بھی اب طارق کا واپس چلے جانا ہی بہتر تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ طارق کے لیے کشمیر پہنچنا اب اتنا آسان نہیں ہوگا۔ جیل سے فرار کے بعد طارق کی تصویریں نہ صرف ہندوستان کے تمام پولیس اسٹیشنوں کو پہنچادی گئی تھیں بلکہ جموں اور سرینگر کے اہم مقامات پر بھی اس کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ وہ اس وقت بھارت کی حکومت کو سب سے زیادہ مطلوب آدمی تھا۔

"ٹھیک ہے" اس نے طارق کی باتیں سننے کے بعد کہا "آج سے ٹھیک ایک ہفتے بعد تم سری نگر کے لیے روانہ ہو جاؤ گے۔ نیلم بھی تمہارے ساتھ جائے گی' اس کے لیے بھی یہاں رہنا اب خطرے سے خالی نہیں ہے۔"

وہ دونوں کچھ دیر تک پلاننگ کرتے رہے اور پھر گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ پھر اس کے ٹھیک ایک ہفتے بعد طارق اور نیلم دہلی سے سرینگر جانے والے طیارے پر سوار ہو رہے تھے۔ نیلم کے جسم پر ائرہوسٹس کی یونیفارم تھی اور طارق پر سرکی وردی میں تھا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان کے چہرے بدلے ہوئے تھے۔ ان کے لیے یہ سارا بندوبست شاہ رخ ہی نے کیا تھا۔ انڈین ائرلائن کی ائرہوسٹس بلا اور اسٹیورڈ اشوک' شاہ رخ کی قید میں تھے۔

جہاز نے صبح آٹھ بجے دہلی کے ائرپورٹ سے ٹیک آف کیا۔ پرواز کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد طیارہ امرتسر ائرپورٹ پر لینڈ کر رہا تھا۔ نیلم نے کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھا اسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ طیارہ ٹرمینل بلڈنگ سے بہت دور رن وے کے آخری سرے پر رکا تھا اور اسے چاروں طرف سے سیکیورٹی کے مسلح آدمیوں نے گھیرے میں لے لیا تھا۔

یہ صورت حال دیکھ کر نیلم بدحواس سی ہوگئی۔ اس نے کاک پٹ سے آنے والی دوسری ائرہوسٹس کو روک لیا۔ اس کے چہرے پر بھی ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔

"کیا بات ہے نشی! جہاز کو آج یہاں کیوں ٹھہرایا گیا ہے اور اسے فوج نے گھیرے میں کیوں لے لیا ہے؟" نیلم نے پوچھا۔

"کیپٹن کو کنٹرول ٹاور سے بتایا گیا ہے کہ دو انتہائی خطرناک غیر ملکی جاسوس ہمارے جہاز میں سفر کر رہے ہیں۔ ان میں ایک عورت ہے اور ایک مرد۔ جہاز کو اس وقت تک پرواز کی اجازت نہیں دی جائے گی جب تک تمام مسافروں کو چیک نہیں کرلیا جاتا۔" دوسری ائرہوسٹس نشی نے جواب دیا۔

نیلم کو سینے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ بڑی مشکل سے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے میں کامیاب ہو سکی تھی۔ طارق بھی اس وقت قریب ہی کھڑا تھا۔ اس نے بھی نشی کی بات سن لی تھی۔ اس کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی تھی۔ وہ خاموش کھڑا سوچ رہا تھا کہ انڈین ائرلائن کے اسٹاف اور اس طیارے کے کریو کو تو وہ دھوکا دینے میں اب تک کامیاب رہے تھے لیکن کیا وہ سیکیورٹی والوں کی آنکھوں میں بھی دھول جھونکنے میں کامیاب ہو سکیں گے یا پکڑے جائیں گے۔

کچھ دیر بعد سیڑھی جہاز سے لگ گئی۔ کیپٹن کی ہدایت پر نشی نے دروازہ کھول دیا۔ ایک سیکیورٹی آفیسر اور اس کے پیچھے دو جوان اندر داخل ہوئے۔ آفیسر کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور جوانوں نے سب مشین گنیں سنبھال رکھی تھیں۔ آفیسر دروازے میں داخل ہوتے ہی رک گیا۔ سامنے ہی طارق کھڑا تھا۔ سیکیورٹی آفیسر کی چبھتی ہوئی نظریں طارق کے چہرے پر مرکوز تھیں اور طارق کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بھیانک موت اس کی آنکھوں میں جھانک رہی ہو۔

○☆○

طارق کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ سیکیورٹی آفیسر اس سے صرف ایک فٹ کے فاصلے پر کھڑا اسے گھور رہا تھا۔ طارق کے دل میں یہ خیال پیدا ہونا فطری بات تھی کہ کہیں اس سیکیورٹی آفیسر کو اس پر شبہ تو نہیں ہو گیا۔ یا ایسا تو نہیں کہ اصلی اسٹیورڈ اشوک' شاہ رخ کی قید سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہو اور ائرلائن کو یہ اطلاع مل گئی ہو کہ اس طیارے میں اشوک نامی اسٹیورڈ نقلی ہے لیکن نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا۔ شاہ رخ کی قید سے فرار ہونا آسان نہیں تھا اور پھر بالفرض وہ اسٹیورڈ' شاہ رخ کی قید سے فرار ہو بھی گیا تھا اور ائرلائن کو حقیقت کا پتا چل گیا تھا تو یہ سیکیورٹی آفیسر اس کے سامنے اس طرح کھڑے ہونے کے بجائے اب تک اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا چکا ہوتا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" سیکیورٹی آفیسر نے طارق سے سوال کیا۔

"اشوک... اشوک مہتہ سر۔" طارق نے جواب دیا۔

"تمہارا شناختی کارڈ؟" سیکیورٹی آفیسر نے اس کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا۔

طارق نے جیب سے شناختی کارڈ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ یہ شناختی کارڈ اصلی تھا اور اس پر تصویر بھی اشوک مہتہ ہی کی تھی۔ اس تصویر کو دیکھ کر ہی طارق کے چہرے میں اس کے مطابق تبدیلیاں کی گئی تھیں۔ ویسے طارق کو دل ہی دل میں شاہ رخ کی ذہانت کی داد دینی پڑی تھی۔ اس نے ائرلائن کے دو ایسے افراد کا انتخاب کیا تھا جو قد و قامت اور جسمانی لحاظ سے نیلم اور طارق سے بڑی حد تک مشابہت رکھتے تھے۔ اشوک مہتہ کے چہرے پر طارق ہی کی طرح چھوٹی گول داڑھی اور مونچھیں تھیں۔ آنکھیں نیلی تھیں۔ طارق کو آنکھوں میں نیلی رنگت کے کونٹیکٹ لینس لگانے کے علاوہ چہرے پر بہت تھوڑی سی تبدیلی کرنی پڑی تھی۔

سیکیورٹی آفیسر نے اس کے کارڈ کا بغور جائزہ لینے کے بعد کارڈ پر چسپاں تصویر اور طارق کے چہرے کا موازنہ کیا اور پھر کارڈ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”جہاز کے کیپٹن سے کہو کہ یہ اعلان کردے کہ کوئی مسافر اپنی سیٹ سے نہ اٹھے۔ ہم ایک ایک مسافر کو چیک کریں گے۔“

”یس سر“ طارق نے سرہلادیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کاک پٹ میں داخل ہوگیا۔ اس نے سیکیورٹی آفیسر کا حکم کیپٹن تک پہنچادیا اور کیپٹن طیارے کے مسافروں کو سیکیورٹی آفیسر کے احکامات سے آگاہ کرنے لگا۔

سیکیورٹی کے چار اور آدمی جہاز پر آگئے تھے۔ ان میں سے دو تو جہاز کے پچھلے حصے میں چلے گئے اور دو نے فرسٹ اور اکانومی کلاس کے درمیان پوزیشن سنبھال لی جبکہ پہلے سے موجود دو سیکیورٹی والے دروازے کے قریب ہی سب مشین گنیں سنبھالے کھڑے رہے۔ سیکیورٹی آفیسر نے دروازے کے قریب سیڑھی کے پلیٹ فارم پر آکر نیچے کھڑے ہوئے دو اور آدمیوں کو اوپر آنے کا اشارہ کیا۔ ان میں سے ایک کا تعلق تو سیکیورٹی ہی سے تھا جبکہ دوسرا ائرپورٹ منیجر تھا۔ وہ سکھ تھا جس نے سر پر پگڑی باندھ رکھی تھی۔

”کیپٹن اور فرسٹ انجینئر کے علاوہ کریو کے صرف دو آدمی جہاز میں رہیں گے۔ کریو کے باقی افراد کو اور خصوصاً لیڈیز کو ٹرمینل میں بھیج دیا جائے۔ آپ کریو ممبرز کے کارڈز چیک کریں۔ جس کارڈ پر شبہ ہو اسے روک لیں۔“ سیکیورٹی آفیسر نے سکھ ائرپورٹ منیجر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”یس سر“ ائرپورٹ منیجر نے اثبات میں سرہلادیا۔

سب سے آگے طارق ہی تھا۔ ائرپورٹ منیجر نے اس کا کارڈ چیک کیا۔ اس کے اصلی ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ منیجر نے کارڈ اس کے حوالے کرتے ہوئے اسے دروازے کی طرف جانے کا اشارہ کردیا۔ طارق نے دروازے کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ سیکیورٹی آفیسر نے اسے روک لیا۔

”اے تم نہیں، تم جہاز پر ہی رہو گے۔“

طارق کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ پیٹ میں گرہیں پڑنے کے ساتھ متلی سی ہونے لگی۔ اس نے ضبط کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکا اور حلق سے عجیب سی آواز نکالتے ہوئے قے کردی۔ اگر سیکیورٹی آفیسر ایک دم پیچھے نہ ہٹ جاتا تو اس کی یونیفارم کا ستیاناس ہوجاتا۔ نیلم قریب ہی کھڑی تھی، اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر طارق کو سہارا دیا اور اس کی پیٹھ سہلانے لگی۔

”اس کی طبیعت خراب ہورہی ہے سر۔“ نیلم نے کہا ”جہاز کا سارا کریو خوف زدہ ہے۔ پہلے کبھی اس قسم کی صورت حال کا سامنا نہیں ہوا۔“

”ٹھیک ہے“ سیکیورٹی آفیسر نے نیلم کو گھورتے ہوئے جواب

یونیورسٹی میں لیکچر کے دوران ایک پروفیسر نے طلباد طالبات سے کہا ”اب اگر کسی نے شور کیا تو میں اسے سزا کے طور پر باہر لان میں بھیج دوں گا۔“

تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک خوب صورت لڑکی کے منہ سے زوردار قہقہہ نکل گیا۔ پروفیسر نے اسے کلاس سے باہر نکال دیا۔

اتنے میں ایک لڑکا پروفیسر کے قریب آیا اور کہنے لگا ”سر، میں بھی ہنسا تھا۔ مجھے بھی کلاس سے باہر لان میں بھیج دیجیے۔“

دیا ”اسے دفتر میں بھیج دو۔“

اس طیارے پر عملے کے آٹھ افراد تھے۔ کیپٹن، فرسٹ انجینئر، چار اسٹیورڈ اور دو ائرہوسٹس۔ طارق کے ساتھ ایک اور اسٹیورڈ کو نیچے اتار دیا گیا اور نیلم کے ساتھ دوسری ائرہوسٹس نشی کو بھی اتار دیا گیا۔ نیلم کا کارڈ بھی چیک کیا گیا تھا۔ ان سب کو ایک جیپ پر ٹرمینل بلڈنگ کی طرف روانہ کردیا گیا اور اس کے بعد طیارے کے مسافروں کی چیکنگ شروع ہوگئی۔

جیپ انہیں ٹرمینل بلڈنگ کے گیٹ کے سامنے چھوڑ کر واپس چلی گئی تھی۔ اس گیٹ پر ائرپورٹ سیکیورٹی کے دو آدمی اور ایک گراؤنڈ ہوسٹس کھڑی تھی۔ نیلم، طارق کو سہارا دے کر لارہی تھی۔ گراؤنڈ ہوسٹس بھی تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اس کے قریب آگئی۔

”کیا ہوا؟“ اس نے دوسری طرف سے طارق کو سہارا دیتے ہوئے کہا۔

”طبیعت بگڑ گئی ہے۔ اسے اسٹاف روم میں لے چلو۔“ نیلم نے جواب دیا۔

”لیکن معاملہ کیا ہے، فلائٹ کیوں روکی گئی ہے؟“ گراؤنڈ ہوسٹس نے پوچھا۔

”کیا تمہیں ابھی تک پتا نہیں چلا؟“ نیلم نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں، ہمیں کچھ پتا نہیں ہے۔“ گراؤنڈ ہوسٹس نے نفی میں سرہلادیا۔

”کیپٹن کو اطلاع دی گئی تھی کہ طیارے میں دو ہائی جیکر موجود ہیں جو کسی بھی وقت کارروائی شروع کرسکتے ہیں۔ بروقت پتا چل جانے پر طیارے کو روک لیا گیا ہے اور اب سیکیورٹی والے مسافروں کو چیک کرکے ہائی جیکروں کو تلاش کررہے ہیں۔“ نیلم نے جواب دیا۔

وہ لوگ لاؤنج سے ہوتے ہوئے اسٹاف روم میں آگئے۔ وہاں کچھ اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے جو نیلم وغیرہ سے مختلف سوال کرنے لگے۔ طارق نے ایک بار پھر ابکائی لی اور دونوں ہاتھ پیٹ پر

رکھ کر دوہرا ہو گیا۔ نیلم اس پر جھک گئی۔
"ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے نیلم۔" طارق نے اس کے کان میں سرگوشی کی "اگر اشوک مہتہ اور ببلا کا راز کھل گیا تو ہم بچ نہیں سکیں گے۔ مجھے شبہ ہے کہ..." ایک آدمی کو قریب آتے دیکھ کر طارق خاموش ہو گیا۔
"اگر طبیعت زیادہ خراب ہے تو ڈاکٹر کو بلاؤں؟" قریب آنے والے شخص نے کہا۔ وہ بھی سکھ تھا اور اس کا تعلق ائرپورٹ کے گراؤنڈ اسٹاف سے تھا۔
"میرا خیال ہے' میں اسے باہر لے جاتی ہوں۔ تازہ ہوا میں طبیعت سنبھل جائے گی۔" نیلم نے کہتے ہوئے طارق کو سہارا دے کر اٹھایا۔
وہ دونوں اسٹاف روم سے باہر آگئے۔ چند سیکنڈ بعد وہ بیرونی لاؤنج میں آگئے جہاں اچھی خاصی افراتفری سی مچی ہوئی تھی۔ سیکیورٹی کے مسلح آدمی کئی جگہوں پر پوزیشن سنبھالے کھڑے تھے' بہت سے سیکیورٹی والے تیزی سے ادھر اُدھر آجا رہے تھے۔
نیلم' طارق کو سہارا دیے لاؤنج سے باہر آگئی۔ اس کا رخ لاؤنج کے سامنے والی سڑک کے دوسری طرف لان کی طرف تھا۔ وہ لاؤنج میں پہنچ کر بھی نہیں رُکے بلکہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے دوسری طرف سڑک پر آگئے۔ اسی وقت انہیں ایک کار نظر آئی۔ اسٹیئرنگ کے سامنے ایک بوڑھا سکھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ نیلم نے ہاتھ کے اشارے سے گاڑی رُکوالی۔
"ان کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔ اگر آپ ہمیں شہر کے کسی ڈاکٹر تک پہنچا دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔" نیلم نے کہا۔
"بیٹھو" بوڑھے سکھ نے فوراً ہی کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔
وہ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ طارق بدستور اُبکائیاں لیتا رہا۔ وہ کار چلانے والے بوڑھے سکھ کو یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کی طبیعت بگڑ رہی ہے۔
"کی گل ہے سنجو!" بوڑھے سکھ نے مُڑ کر نیلم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس کی طبیعت زیادہ خراب ہے کیا؟"
"جی سردار جی" نیلم نے جواب دیا "آپ گاڑی ذرا تیز چلائیے۔"
سردار جی سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور گاڑی کی رفتار بڑھادی۔
"آپ ائرہوسٹس ہیں اور یہ آپ کے ساتھی۔ آپ یہ تو بتاؤ کہ جہاز روکا کیوں گیا ہے جی؟" سردار جی نے پوچھا۔
"جہاز میں کوئی فنی خرابی پیدا ہو گئی ہے سردار جی۔" نیلم نے جواب دیا۔
"لیکن میں نے تو سنا ہے کہ اس میں دو ہائی جیکر سوار ہیں جنہیں پکڑنے کے لیے جہاز کو گھیرے میں لیا گیا ہے۔" سردار جی نے کہا۔
"افواہوں پر کان نہیں دھرنا چاہیے سردار جی۔ حقیقت وہی ہے جو میں بتا رہی ہوں۔" نیلم نے کہا۔
"ٹھیک ہے بادشاہو۔ تسی ٹھیک کہندے ہو۔" سردار جی نے کہا اور سامنے دیکھنے لگے۔ طارق نے اسی وقت ایک اور زوردار قسم کی ابکائی لی۔ سردار جی نے پیچھے مُڑ کر دیکھا اور پھر سیدھے ہوتے ہوئے گاڑی کی رفتار کچھ اور بڑھادی۔ انہیں شاید یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر بندے نے قے کردی تو گاڑی کا ستیاناس ہو جائے گا۔
شہر کے پہلے چوراہے پر سردار جی نے گاڑی دائیں طرف موڑ دی اور تقریباً دو سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے ایک جگہ روک لیا۔ سامنے ہی ایک دُکان پر "رنجن کلینک" کا بورڈ لگا ہوا تھا۔
"یہ ڈاکٹر کی کلینک ہے۔ اگر کہو تو میں آپ کے ساتھ چلوں؟" سردار جی نے کہا۔
"نہیں سردار جی۔" نیلم جلدی سے بولی "آپ نے یہاں تک پہنچا کر ہمیں بہت بڑی مصیبت سے بچالیا ہے۔ میں اسے خود ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہوں۔"
"جیسی تمہاڈی مرضی سجنو!" سردار جی نے کندھے اچکا دیے۔
نیلم' طارق کو سہارا دے کر کلینک میں داخل ہو گئی۔ یہ کسی لیڈی ڈاکٹر کا کلینک تھا۔ پرانے سے بورڈ پر اس کا نام بھی لکھا ہوا تھا۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی نیلم نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ سردار جی کی گاڑی وہاں سے روانہ ہو چکی تھی۔ ٹھیک اسی وقت کلینک کے اندرونی دروازے سے ایک بوڑھی عورت باہر نکلی۔ اس کے جسم پر سفید سوتی ساری تھی اور سر کے بال بھی ساری کی طرح سفید تھے۔ وہی ڈاکٹر رنجن تھی۔
"آئیے' اندر آجائیے۔" اس نے باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"سوری ڈاکٹر۔" طارق نے سپاٹ لہجے میں کہا "ہم غلطی سے یہاں آگئے ہیں' ہمیں جانا دراصل کہیں اور تھا۔"
"اوہ' کوئی بات نہیں۔ انسان تو بندہ بشر ہے' اکثر بھول جاتا ہے۔" ڈاکٹر رنجن نے کہا۔
وہ دونوں ایک بار پھر معذرت کرتے ہوئے کلینک سے باہر آگئے۔ نیلم نے گھوم کر دیکھا' بوڑھے سکھ کی کار کوئی موڑ گھوم کر نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ ٹھیک اسی لمحے ایک ٹیکسی کلینک کے سامنے آکر رکی۔ اس میں تین افراد تھے۔ اگلی سیٹ پر ایک نوجوان سکھ بیٹھا ہوا تھا اور پچھلی سیٹ پر دو عورتیں تھیں' ایک ادھیڑ عمر اور دوسری نوجوان۔ اس کی عمر سولہ سترہ سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ زرد رنگت اور چہرے پر تکلیف کے تاثرات نمایاں تھے۔ اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے نوجوان نے سکھ ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا اور پھر پچھلا دروازہ کھول کر نوجوان لڑکی کو سہارا دے کر کلینک میں لے گیا۔ نیلم اور طارق فوراً ہی ٹیکسی کی پچھلی

سیٹ پر بیٹھ گئے۔

"کدھر جانا ہے باؤ جی؟" سکھ ٹیکسی ڈرائیور نے پیچھے مُڑ کر طارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جلیانوالہ باغ" طارق نے جواب دیا۔

ڈرائیور نے سیدھا ہوتے ہوئے ٹیکسی اسٹارٹ کردی۔ نیلم کو کچھ پتا نہیں تھا کہ اب وہ کہاں جائیں گے لیکن طارق مطمئن تھا۔ امرتسر میں ایک ایسی جگہ اس کے ذہن میں تھی جہاں اس کے خیال میں انہیں پناہ مل سکتی تھی۔ اور وہ جگہ تھی گورو نانک اسٹریٹ پر گوربخش سنگھ کا مکان۔ یہ وہی سکھ نوجوان تھا جسے تقریباً ساڑھے چار سال پہلے طارق اور سعید نے شہر میں ہونے والے بلوے کے دوران زخمی حالت میں اٹھایا تھا اور گرونانک اسٹریٹ کے ایک مکان پر پہنچایا تھا۔ وہ خود بھی دو تین دن اس مکان میں رہا تھا۔ طارق کو یقین تھا کہ اگر گوربخش سنگھ سے ملاقات ہوگئی تو انہیں دو چار دن کے لیے پناہ ضرور مل جائے گی لیکن وہ براہِ راست اس مکان پر نہیں جانا چاہتے تھے۔

طارق سوچ رہا تھا کہ جہاز کے کیپٹن کو دہلی سے یہ اطلاع دی گئی تھی کہ جہاز میں دو غیر ملکی جاسوس سوار ہیں جن میں ایک مرد اور ایک عورت ہے۔ اس حد تک یہ اطلاع بالکل درست تھی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ راز کیسے فاش ہوا کہ وہ دونوں اس طیارے سے سرینگر جارہے ہیں۔ ابھی تک انٹیلی جنس کو یہی اطلاع ملی تھی کہ ایک مرد اور ایک عورت اس طیارے پر سوار ہیں۔ ممکن ہے اب تک یہ اطلاع بھی مل گئی ہو کہ وہ دونوں کس بھیس میں ہیں۔ طارق کو شبہ تھا کہ ان کی روانگی کے بعد ان کے گروپ کا کوئی آدمی پکڑا گیا ہوگا جس نے ان کے بارے میں بتادیا۔ ویسے وہ اسے اپنی خوش قسمتی ہی سمجھتے تھے کہ سیکیورٹی نے انہیں کلیئرنس دے کر جہاز سے اترنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی طارق کی اداکاری بھی کام آئی تھی۔ اس نے دوسروں کی نظروں سے چھپا کر حلق میں انگلی ٹھونس لی تھی جس سے اسے قے ہوگئی۔ اس طرح انہیں جہاز سے اترنے اور پھر ٹرمینل بلڈنگ سے بھی نکلنے کا موقع مل گیا تھا لیکن طارق کے خیال میں وہ ابھی خطرے کی حدود سے باہر نہیں نکلے تھے۔ سڑکوں پر پھرتے ہوئے وہ اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اگر ان کی پول کھل گئی اور ان کی تلاش شروع ہوگئی تو وہ کسی بھی لمحے پکڑے جاسکتے تھے۔

طارق اور نیلم ٹیکسی میں بیٹھے ایسا ظاہر کررہے تھے جیسے محض سیروتفریح کے لیے نکلے ہوں۔ ساڑھے چار سال پہلے گوربخش سنگھ کے چاچا کے مکان میں رہتے ہوئے طارق نے کچھ کتابوں کا مطالعہ کیا تھا جن میں ایک کتاب امرتسر کی تاریخ کے بارے میں بھی تھی اور اب وہ نیلم کو امرتسر کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اس شہر کی بنیاد چار سو سال پہلے سکھوں کے روحانی سلسلے کے چوتھے گرو رام داس نے رکھی تھی۔ اس کے بیٹے گرو ارجن نے ایک تالاب کے وسط میں ایک گرُدوارہ تعمیر کروایا جس میں مذہبی کتاب گرنتھ صاحب رکھی گئی۔ گورمکھی زبان میں 'امرت' شہد کو اور 'سر' تالاب کو کہتے ہیں۔ یعنی شہد کا تالاب۔ تب سے اس شہر کا نام (امرتسر) پڑگیا۔ ۱۸۰۳ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس گرُدوارے کو از سرِنو تعمیر کروایا اور اس کے گنبد پر چار سو کلوگرام وزنی سونے کا پترچڑھایا گیا۔ اس گرُدوارے کی تعمیر میں ایسا ماربل استعمال کیا گیا تھا جس میں سنہری رنگت کی جھلک تھی۔ اسی لیے اسے گولڈن ٹمپل کا نام دیا گیا۔ سکھ اسے ہری مندر یا دربار صاحب بھی کہتے ہیں۔

ٹیکسی جلیانوالہ باغ کے گیٹ کے سامنے رک گئی۔ طارق نے ڈرائیور کو پیسے دیے اور اُتر کر گیٹ میں داخل ہوگئے۔ بڑا خوب صورت باغ تھا۔ اس وقت باغ میں کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ طارق اب نیلم کو اس جلیانوالہ باغ کا تاریخی پس منظر بتا رہا تھا۔ ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو یہاں ایک پُرامن جلسے پر ایک انگریز جنرل ڈائر نے گولی چلوادی تھی جس کے نتیجے میں تین سو سے زائد لوگ مارے گئے تھے۔ جلیانوالہ باغ میں اس واقعے کی ایک یادگار بھی قائم ہے۔

وہ دونوں اس یادگار کے قریب پہنچے تو وہاں بہت سے لوگ موجود تھے۔ کچھ لوگ اس یادگار کے ساتھ اپنی تصویریں کھنچوا رہے تھے۔ وہ دونوں اس یادگار کے قریب سے گزرتے ہوئے دوسری طرف نکل گئے۔ چند منٹ بعد وہ ایک بار پھر سڑک پر پہنچ گئے۔ ایک تانگے والا دربار صاحب کی آواز لگا رہا تھا۔ اس نے انہیں تانگے میں بٹھانے کی کوشش بھی کی لیکن طارق نے تانگے کے بجائے قریب کھڑے ہوئے رکشے کو ترجیح دی۔

گولڈن ٹمپل کے سامنے رکشہ چھوڑ کر وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ٹیکسی نے چند ہی منٹ میں انہیں گرونانک اسٹریٹ پر پہنچادیا اور وہ اتر کر پیدل ہی ایک طرف چلنے لگے۔

ساڑھے چار سال پہلے طارق جب یہاں آیا تھا تو رات کا

وقت تھا اور اب دن کی روشنی میں اسے مکان تلاش کرنے میں کچھ دشواری پیش آرہی تھی۔ لیکن بہرحال وہ اندازے کی بنا پر ایک مکان کے سامنے رک گیا اور دروازے پر ہلکی سی دستک دے ڈالی۔ اس وقت گلی میں دو عورتیں آرہی تھیں۔ دونوں عورتیں ادھیڑ عمر تھیں اور دونوں کے ہاتھوں میں ٹوکریاں تھیں جن سے سبزیوں کے پتے جھانک رہے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ بازار سے سودا سلف خرید کر آرہی تھیں۔ ایک عورت تو آگے نکل گئی اور دوسری ساتھ والے مکان کے سامنے رک گئی۔ اسے دیکھ کر طارق کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ یہ عورت وہی لیڈی ڈاکٹر تھی جس نے اس رات گوربخش سنگھ کا علاج کیا تھا۔ وہ عورت بھی الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے پہچاننے کی کوشش کررہی ہو۔ اسی لمحے مکان کا دروازہ کھلا اور وہ عورت اندر چلی گئی۔

طارق کا اندازہ درست نکلا تھا۔ وہ صحیح مکان تک پہنچا تھا۔ اس نے دروازے پر ایک بار پھر دستک دی۔ اس کے چند منٹ بعد دروازہ کھل گیا اور ایک نوجوان باہر نکل آیا جس کی عمر بائیس تیئس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔

"کس سے ملنا ہے جی آپ کو؟" اس نے باری باری دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"گوربخش سنگھ سے۔ چار سال پہلے یہاں...."

"گوربخش سنگھ یہاں نہیں رہتا۔ وہ تو ترن تارن میں ہے۔" نوجوان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ شاید اس کے دوست کا مکان ہے۔ میں اس کا نام بھول رہا ہوں۔" طارق کنپٹی پر انگلی مارتے ہوئے بولا "ہاں یاد آیا' کرتار سنگھ! کیا اس سے ملاقات ہوسکتی ہے؟"

"کرتار سنگھ تو میرا ہی نام ہے۔ تم لوگ کون ہو؟" نوجوان نے کہا۔ نیلم اس وقت اپنے آپ میں عجیب سی بے چینی محسوس کررہی تھی۔ وہ بار بار گلی میں دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔

"یہاں گلی میں بات کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ کیا تم ہمیں بیٹھک میں بٹھا سکتے ہو؟ اطمینان سے بات کریں گے۔" طارق نے کہا۔

نوجوان نے ایک بار پھر باری باری دونوں کی طرف دیکھا پھر اندر چلا گیا۔ چند سیکنڈ بعد مکان سے ملحق بیٹھک کا دروازہ کھل گیا اور وہ دونوں اندر داخل ہوگئے۔ طارق نے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بھیڑ دیا تھا۔

"آپ لوگوں کا تعلق شاید انڈین ائرلائن سے ہے؟" کرتار سنگھ نے سوالیہ نگاہوں سے طارق کی طرف دیکھا۔

"کسی حد تک تم ٹھیک سمجھ رہے ہو۔" طارق نے جواب دیا۔ پھر اصل موضوع پر آگیا "تمہیں شاید یاد ہو کہ تقریباً ساڑھے چار سال پہلے یہاں زبردست ہنگامہ ہوا تھا۔ بھارتی سیناؤں نے گولڈن ٹمپل کے ایک حصے کو آگ لگادی تھی۔ ان ہنگاموں میں تمہارا دوست گوربخش سنگھ زخمی ہوگیا تھا۔ اسے دو گولیاں لگی تھیں۔ تم ان دنوں اپنے ماما کے پاس ہوشیار پور گئے ہوئے تھے۔"

"آہو جی' مجھے سب کچھ یاد ہے۔ مجھے ابا جی نے بتایا تھا۔ میرے دوست کو دو کشمیری مسلمانوں نے بچایا تھا۔ وہی اسے زخمی حالت میں اٹھا کر یہاں لائے تھے۔ پھر شہر میں کرفیو لگ گیا تھا اور وہ بھی تین چار دن ہمارے گھر میں ہی رہے تھے۔" کرتار سنگھ نے کہا۔

"ہاں' میں ان دونوں میں سے ایک ہوں۔" طارق نے جواب دیا "تمہارا باپ کہاں ہے؟ وہ مجھے پہچان لے گا۔"

"ابا تو تین چار دن سے ترن تارن گیا ہوا ہے۔ کوئی کام ہو تو آپ مجھے بتایئے۔" کرتار سنگھ نے کہا۔

"کیا ہم تم پر اعتماد کرسکتے ہیں؟" طارق نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

"آپ نے میرے دوست کی جان بچائی تھی۔ مجھے تو افسوس ہوا تھا کہ میں اس وقت آپ کا شکریہ ادا نہیں کرسکا تھا۔ میری گردن تو آپ کے احسان کے بوجھ سے جھکی ہوئی ہے۔ آپ کو جو کچھ بھی کہنا ہے' بلا جھجک کہیے۔" کرتار سنگھ ایک لمحہ کو خاموش ہوا پھر نیلم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "کیا آپ اس ائرہوسٹس کو بھگا کر لائے ہیں؟" نیلم کے ماتھے پر بندیا کی وجہ سے شاید وہ اسے ہندو سمجھ رہا تھا۔

"تم غلط سمجھے۔" طارق نے مسکراتے ہوئے کہا "پہلی بات تو یہ کہ یہ ائرہوسٹس ہندو نہیں ہے۔ میری طرح مسلمان ہے اور میں اسے بھگا کر نہیں لایا۔ ہم دونوں دراصل مفرور ہیں۔ پولیس ہماری تلاش میں ہے اور ہمیں پناہ کی تلاش ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" کرتار سنگھ نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

طارق نے نیلم کی طرف دیکھا اور پھر کرتار سنگھ کو اپنی کتھا سنانے لگا۔ آخر میں وہ بولا "ہمارا پروگرام سرینگر جانے کا تھا لیکن ہمارا راز کھل گیا اور ہم بڑی مشکل سے اپنے آپ کو بچانے میں کامیاب ہوسکے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اب تک شہر میں ہماری تلاش شروع ہوچکی ہوگی۔"

"فکر ہی نہ کرو جی۔" کرتار سنگھ نے کہا "اب تو مجھے آپ کا احسان اتارنے کا موقع مل گیا ہے۔ آرام سے اس گھر میں رہو۔ واہ گرو کی قسم' اگر کسی نے تمہاری طرف ہاتھ بڑھایا تو کرتار سنگھ وہ ہاتھ کاٹ ڈالے گا۔ میں آج ہی ایک آدمی کو ترن تارن بھیج دیتا ہوں۔ شام تک ابا بھی آجائے گا۔"

ترن تارن زیادہ دور نہیں تھا۔ کرتار سنگھ کا باپ اوتار سنگھ شام سے پہلے پہلے آگیا۔ اس کے ساتھ گوربخش سنگھ بھی تھا۔ وہ طارق کو پہچانتے ہی واہ گرو کا نعرہ لگاتے ہوئے اس سے لپٹ گیا۔ طارق جب گوربخش سنگھ سے فارغ ہوا تو اوتار سنگھ نے اسے لپٹالیا۔

"میں نے تمہیں پہچان لیا ہے پُتر۔" وہ طارق کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے بولا "پر تمہارا دوسرا بیلی کہاں ہے؟"
"وہ فوت ہوگیا ہے سردار جی۔" طارق نے افسردہ سے لہجے میں بتایا۔
بوڑھا اوتار سنگھ اداس ہوگیا۔ چند لمحے فضا پر سوگواری سی طاری رہی پھر وہ بتدریج معمول پر آتے چلے گئے۔
"اور سناؤ پُتر، کیسے آنا ہوا؟ اتنا عرصہ کہاں رہے اور کیا کرتے رہے؟" اوتار سنگھ نے پوچھا۔
"میں بتاتا ہوں ابا جی۔" طارق سے پہلے کرتار سنگھ بول پڑا۔ اور پھر اس نے طارق سے سنی ہوئی پوری کہانی سنا ڈالی۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا "میں آج دن بھر شہر کی خبریں لیتا رہا ہوں۔ یہ جس جہاز پر آئے تھے، وہ تو دو گھنٹے بعد سرینگر چلا گیا لیکن پولیس ان دونوں کو پورے شہر میں تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ سنا ہے دلی سے بھی انٹیلی جنس کے کچھ آدمی منگوائے گئے ہیں۔ امرتسر سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکا بندی کردی گئی ہے۔ پاکستانی سرحد کی طرف جانے والے راستوں پر تو بڑی سختی سے چیکنگ ہو رہی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ لوگ سرحد پار کرنے کی کوشش کریں گے۔"
"سردار جی!" طارق نے کرتار سنگھ کے خاموش ہونے پر اوتار سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں اس خیال سے یہاں آگیا تھا کہ ہمیں اس گھر میں ایک دو دن پناہ مل جائے گی۔"
"اچھا کیا جو تم لوگ یہاں آگئے۔" اوتار سنگھ نے جواب دیا "یہ تمہارا اپنا گھر ہے، یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ذرا تمہاری تلاش کا شور شرابہ ٹھنڈا ہو جائے تو ہم خود تمہیں چھوڑ کر آئیں گے جہاں کہو گے۔"
"شکریہ سردار جی۔" طارق نے کہا۔
"پر یہ تو بتاؤ پُتر کہ یہ تمہاری گھر والی ہے؟" اوتار سنگھ نے نیلم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"نہیں سردار جی۔" طارق نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "یہ بھی ایک مجاہدہ ہے۔ اپنے وطن کی آزادی کے لیے اس نے بھی سردھڑ کی بازی لگا رکھی ہے۔"
"سلام ہے تیری ہمت کو کُڑیے۔" سردار اوتار سنگھ نے توصیفی نظروں سے نیلم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کاکے!" اس نے کرتار سنگھ کی طرف دیکھا "جا اپنی ماں سے کہہ کہ پروہنی کا منجا اپنے کمرے میں بچھا دے۔ طارق پُتر کوٹھے پر سوئے گا میرے ساتھ۔"
سردار جی نے گویا ابھی سے ان کے سونے کا بھی بندوبست کردیا۔ رات کے کھانے کے بعد نیلم سردارنی کے کمرے میں ہی رہ گئی اور طارق مردوں کے ساتھ اوپر آگیا۔ اوپر دو کمرے تھے۔ ایک میں اوتار سنگھ کے ساتھ طارق کے لیے بھی چارپائی ڈال دی گئی تھی جس پر صاف ستھرا بستر بچھا ہوا تھا۔ وہ لوگ رات دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کرتار سنگھ اور گوربخش سنگھ نیچے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد طارق، اوتار سنگھ سے مزید کچھ دیر باتیں کرتا رہا پھر اس پر غنودگی طاری ہونے لگی اور کچھ ہی دیر میں وہ سو گیا۔
صبح اس کی آنکھ جلد ہی کھل گئی۔ کرتار سنگھ اس کے لیے فوراً ہی چائے کا کپ اور پانی کا گلاس لے آیا۔ اس نے اٹھ کر کلی کی اور چائے پینے لگا۔ کرتار سنگھ اس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ طارق نے چائے کے ابھی چند ہی گھونٹ پیے تھے کہ نیلم آگئی۔ اس کے ہاتھ میں انگریزی کا اخبار تھا اور چہرے پر پیلاہٹ نمایاں طور پر نظر آرہی تھی۔
"خیریت؟" طارق نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
"سب کچھ ... ختم ہوگیا طارق ...." نیلم نے بمشکل کہا اور اخبار اس کی طرف بڑھا دیا۔
یہ ایک مقامی روزنامہ تھا۔ اس کی ہیڈلائن ہی طارق پر لرزہ طاری کردینے کے لیے کافی تھی۔ اس نے چائے کا کپ چھوٹی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور خبر پڑھنے لگا۔
اخبار کی اطلاع کے مطابق کل صبح جب یہ دونوں جہاز پر سوار ہوگئے تھے، اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ان کے گروہ کا ایک آدمی پولیس کے ہاتھ لگ گیا تھا جس نے پولیس کو بتا دیا تھا کہ نیلم اور طارق سرینگر جانے والے جہاز پر سوار ہیں۔ اس اطلاع پر جہاز کو امرتسر ائرپورٹ پر اتار کر گھیرے میں لے لیا گیا تھا اور مسافروں کو چیک کیا گیا تھا لیکن سیکیورٹی والوں کو جہاز پر نیلم یا طارق نام کا کوئی مسافر نہیں ملا تھا اور نہ ہی کوئی مشتبہ شخص نظر آیا تھا۔
اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد دہلی پولیس نے پکڑے جانے والے شخص سے مزید بہت کچھ اگلوا لیا۔ اس نے پولیس کو یہ تک بتا دیا کہ کناٹ پلیس پر ڈلہوزی ہاؤس دہلی میں موجود کشمیری مجاہدین کی خفیہ سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ پولیس کی بھاری جمعیت نے ڈلہوزی ہاؤس کو گھیرے میں لے لیا۔ اس طرح پولیس اور ڈلہوزی ہاؤس میں موجود کشمیری مجاہدین میں زبردست مقابلہ ہوا۔ اس مقابلے میں دہلی میں کشمیری مجاہدین کی خفیہ تنظیم کا لیڈر شاہ رخ اور اس کے چند آدمی پولیس کے ہاتھوں مارے گئے۔ دوپہر کے وقت پولیس، مولانا آزاد روڈ پر واقع شاہ رخ کی کوٹھی پر بھی پہنچ گئی۔ کوٹھی کے تہ خانے سے انڈین ائرلائن کی ائرہوسٹس بیلا اور اسٹیورڈ اشوک مہتہ بندھے ہوئے مل گئے۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں کل رات اغوا کرکے یہاں قید کیا گیا تھا اور ان سے ان کی ڈیوٹی اور جہاز کے دوسرے کریو کے بارے میں سوالات کیے گئے تھے۔
یہ راز فاش ہوتے ہی امرتسر ائرپورٹ اور پولیس کو اطلاع دے دی گئی۔ امرتسر ائرپورٹ کے حکام اور سیکیورٹی والے ائرپورٹ سے بیلا اور اشوک مہتہ کی گمشدگی سے پریشان تھے۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ اشوک مہتہ کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی ہوگی

اور وہ کسی اسپتال یا پرائیویٹ کلینک میں ہوگا۔ دہلی سے ان کے بارے میں یہ سنسنی خیز اطلاع ملنے پر پہلے سے زیادہ شدومد سے ان کی تلاش شروع ہو گئی تھی لیکن آخری اطلاعات آنے تک ان کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔

طارق نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ اسے شاہ رخ اور اپنے دوسرے دوستوں کی موت پر گہرا صدمہ پہنچا تھا لیکن یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ پولیس کو ان دونوں کے اور شاہ رخ وغیرہ کے بارے میں اطلاع دینے والا کون تھا۔ پولیس نے اس شخص کا نام صیغۂ راز میں رکھا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ سب لوگ اکٹھے ہی بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔

"پریشان کیوں ہو رہے ہو پتر؟" سردار اوتار سنگھ نے طارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آزادی کے راستے میں بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں اور یہ قربانیاں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں سردار جی۔" طارق نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "لیکن اس سے ہمارا منصوبہ بری طرح متاثر ہوگا۔ ہمیں جلد سے جلد سری نگر پہنچنا چاہیے۔"

"ایک دو دن رک جاؤ' میں سارا بندوبست کردوں گا۔ رب خیر کرے گا۔" اوتار سنگھ نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

ناشتے میں اگرچہ بڑا اہتمام کیا گیا تھا لیکن طارق کا کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے صرف ایک کپ چائے پر ہی اکتفا کیا۔ یہی کیفیت نیلم کی بھی تھی۔ سردار اوتار سنگھ اور اس کی بیوی نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔ وہ بھی شاید ان کی کیفیت کو سمجھ چکے تھے۔

کرتار سنگھ اور گوربخش سنگھ دن بھر انہیں معلومات فراہم کرتے رہے۔ پورے شہر میں وسیع پیمانے پر ان کی تلاش ہو رہی تھی۔ کئی مسلمانوں اور سکھوں کو محض اس شبے میں حراست میں لے لیا گیا تھا کہ انہوں نے ان دونوں کو پناہ نہ دی ہو یا انہیں شہر سے فرار ہونے میں مدد نہ دی ہو لیکن ظاہر ہے کوئی ان کے بارے میں کیا بتا سکتا تھا۔

دو دن گزر گئے۔ تیسرے دن اوتار سنگھ کی بیوی کلدیپ کور' نیلم کو اپنے ساتھ بازار لے گئی۔ ائرہوسٹس ببلا والا میک اپ ختم کردینے کے بعد نیلم کا حلیہ کافی حد تک بدل گیا تھا اور پھر کلدیپ کور نے بھی کچھ کمال دکھایا تھا۔ کلدیپ کور کی عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ اب بھی بہت حسین تھی۔ وہ بڑی پُرخلوص اور دل میں چاہت رکھنے والی عورت تھی۔ وہ نیلم کو لے کر شہر کے مختلف بارونق بازاروں میں پھرتی رہی۔ اندرون لاہوری دروازے پر واقع ایک دُکان سے اس نے نیلم کے لیے چند ریڈی میڈ جوڑے بھی خریدے۔ اس دُکان میں کلدیپ کور کی ایک جاننے والی بھی مل گئی۔

"یہ میری نند کی دیورانی ہے۔ کل شام کو بٹالے سے آئی ہے۔" کلدیپ کور نے اس سے نیلم کا تعارف کرایا "اور لاڈو' یہ میری سہیلی بسنت کور ہے۔ ہم کالج میں دو سال اکٹھی پڑھ چکی ہیں۔ ان کے شوہر رنجیت سنیما کے مالک ہیں۔"

نیلم نے بالکل سکھوں کے انداز میں اسے پرنام کیا۔ وہ کچھ دیر تک دُکان ہی میں کھڑی باتیں کرتی رہیں پھر ایک دوسرے سے رخصت ہو گئیں۔

شہر میں گھومتے ہوئے نیلم نے اندازہ لگایا تھا کہ پولیس اور سادہ لباس والے اب بھی ان کی تلاش میں تھے۔ اس نے کئی مقامات پر چیکنگ ہوتے بھی دیکھی تھی۔

دو دن مزید گزر گئے اور پھر ان کے جانے کا پروگرام بن گیا۔ طے یہ ہوا تھا کہ نیلم صبح سویرے بس کے ذریعے ترن تارن کے لیے روانہ ہو جائے گی اور اس کے تقریباً دو گھنٹے بعد طارق اور اوتار سنگھ وغیرہ نکلیں گے۔ لیکن پھر پروگرام میں یہ تبدیلی کردی گئی کہ کرتار سنگھ کو کلدیپ کور اور نیلم کے ساتھ شامل کردیا گیا۔

یہ لوگ چھ بجے گھر سے نکل گئے۔ گلی سے نکلتے ہی تانگہ مل گیا اور یہ لوگ پندرہ بیس منٹ میں بسوں کے اڈے پر پہنچ گئے۔ انہیں سات بجے کھیم کرن جانے والی بس پر جگہ مل گئی۔ کلدیپ کور کسی دوسری عورت کے ساتھ بیٹھ گئی تھی جبکہ نیلم' کرتار سنگھ کے ساتھ بیٹھی تھی۔

یہ بس ترن تارن اور مختلف علاقوں سے ہوتی ہوئی کھیم کرن تک جاتی تھی۔ کھیم کرن سرحدی قصبہ تھا جہاں سرحد کے اس پار چند میل کے فاصلے پر پاکستان کا شہر قصور تھا۔

بس اڈے سے روانہ ہونے کے بعد دو جگہوں پر رکی تھی اور پھر شہر سے نکل کر جیسے ہی ترن تارن کی طرف جانے والی سڑک پر مُڑی' اسے روک لیا گیا۔ یہاں سڑک پر ایک عارضی پولیس چوکی بنی ہوئی تھی۔ بس رُکتے ہی دو پولیس والے اندر گھس آئے اور مسافروں سے پوچھ گچھ کرنے لگے۔ اس بس میں تقریباً سارے ہی مسافر سکھ تھے۔ دو بوڑھے مسلمان تھے۔ ہندو کوئی نہیں تھا۔ سکھوں نے جب سے خالصتان کا نعرہ بلند کیا تھا' ہندوؤں کی اکثریت امرتسر اور سکھوں کی اکثریت والے شہر چھوڑ کر ان شہروں میں منتقل ہو گئی تھی جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ چار سال پہلے جب سکھوں کے دربار صاحب "گولڈن ٹمپل" کو آگ لگائی گئی تھی' ان دنوں مشرقی پنجاب میں ہندوؤں کی شامت ہی آگئی تھی۔ جو ہندو یہاں رہ بھی گئے تھے وہ سفر کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔

بڑی سخت چیکنگ تھی۔ پولیس والوں کا رویّہ بھی بڑا سخت تھا۔ وہ ہر شخص سے اس طرح سوالات کر رہے تھے جیسے وہ جیل سے بھاگا ہوا قیدی ہو۔ ایک پولیس والے نے عورتوں سے بھی سوال جواب شروع کردیے لیکن نیلم کے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی ایک بڑھیا نے اس پولیس والے کو اس طرح آڑے ہاتھوں لیا کہ وہ مزید کسی عورت سے کوئی سوال کیے بغیر بس سے اتر گیا۔ سڑک پر

لگا ہوا آہنی بیریر ہٹا دیا گیا اور بس آگے روانہ ہو گئی۔ نیلم نے اطمینان کا سانس لیا اور وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس نے آنکھیں موند لی تھیں۔

طارق' اوتار سنگھ اور گوربخش سنگھ کے ساتھ آٹھ بجے صبح گھر سے نکلا۔ وہ بھی گلی سے نکل کر ایک تانگے میں سوار ہو کر پندرہ بیس منٹ بعد گھاس منڈی پہنچے۔ طارق جس حلئے میں گھر سے نکلا تھا اس پر اسے خود بھی ہنسی آ رہی تھی۔ کھدر کا لمبا کرتا' سیاہ لاچہ جس کا ایک بالشت چوڑا بارڈر سنہری تھا۔ سر پر مخصوص انداز میں بندھی ہوئی پگڑی' گلے میں سیاہ رنگ کا دھاگا لپٹا ہوا تھا اور کمر پر کرپان بندھی ہوئی تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ اس حلئے میں بہت ہی بھلا لگ رہا تھا۔ وہ مکمل طور پر ایک نوجوان سکھ ہی لگ رہا تھا۔ گوربخش سنگھ اور اوتار سنگھ بھی اپنے مخصوص لباس میں تھے۔

گھاس منڈی میں داخل ہوتے ہی اوتار سنگھ نے انہیں ایک جگہ روک دیا اور خود آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہ وہ منڈی تھی جہاں سے پورے شہر کے لوگ اپنے مویشیوں اور پالتو جانوروں کے لئے چارہ اور بھٹے خریدتے تھے۔ جگہ جگہ پٹھوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ کئی ٹریکٹر ٹرالیاں بھی پٹھوں سے لدی ہوئی کھڑی تھیں۔ بعض جگہوں پر نیلامی ہو رہی تھی اور بعض جگہوں پر ویسے ہی سودے ہو رہے تھے۔

اوتار سنگھ ایک ٹرالی کے پاس رک گیا۔ یہ ٹرالی پٹھوں سے لدی ہوئی تھی اور ایک ادھیڑ عمر سکھ پٹھوں کے انبار پر بیٹھا ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اوتار سنگھ کو دیکھ کر وہ چھلانگ لگا کر نیچے آ گیا۔

"اوئے گیان سنگھ!" اوتار سنگھ نے اسے دیکھتے ہی کہا "کیا ہوا' تمہارے بھٹے نہیں بکے ابھی تک؟"

"سودا ہو گیا ہے بھاجی۔ بیوپاری بیعانہ دے گیا ہے۔ ابھی رقم لے کر آتا ہی ہو گا۔ پر وہ اپنے پروہنے کہاں ہیں؟" گیان سنگھ کہتے ہوئے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"وہ گوربخش سنگھ کے ساتھ پرلی طرف کھڑا ہے۔ میں اسے لے کر آتا ہوں۔ تو بیوپاری کو تلاش کر کے بھٹے اتروا۔" اوتار سنگھ کہتا ہوا اس طرف چل دیا جہاں طارق اور گوربخش سنگھ کھڑے تھے۔ وہ انہیں لے کر ٹرالی کے قریب آ گیا۔

گیان سنگھ' اوتار سنگھ کا چھوٹا بھائی تھا۔ ترن تارن میں ان کی زمین تھی۔ پہلے ہمیشہ ان کا منشی مال لے کر منڈی آیا کرتا تھا لیکن آج خاص طور پر گیان سنگھ بھٹے لے کر آیا تھا۔ چند منٹ بعد بیوپاری بھی رقم لے کر آ گیا اور ٹرالی سے بھٹے اتارے جانے لگے۔ پانچ منٹ میں ٹرالی خالی ہو گئی۔

"بیٹھو بھاجی' چلیں۔ راستے میں لاٹو پہلوان کو بھی لینا ہے۔ وہ ناکے پر بیٹھا ہمارا انتظار کر رہا ہو گا۔" گیان سنگھ کہتا ہوا ٹریکٹر پر بیٹھ گیا جبکہ طارق وغیرہ ٹرالی پر سوار ہو گئے۔

ٹریکٹر گھاس منڈی سے نکل کر ترن تارن کی طرف جانے والی سڑک پر ہو لیا۔ شہری حدود پر واقع چونگی ناکے پر ایک دُبلا پتلا سا آدمی ان کا منتظر تھا۔ ٹریکٹر رُکتے ہی اس نے اپنے قریب زمین پر پڑی ہوئی ایک بڑی سی گٹھڑی اٹھا کر ٹرالی پر ڈالی اور پھر خود بھی سوار ہو گیا۔ وہ بھی سکھ ہی تھا۔

"یہ لاٹو پہلوان ہے۔" اوتار سنگھ نے طارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "جسم میں جان ہے نہیں پر پہلوانی کرتا ہے۔ اسے اکھاڑے سے ہمیشہ اسٹریچر پر ڈال کر ہی لے جایا گیا ہے۔ کئی مرتبہ سمجھایا ہے باز آ جا پہلوانی سے' پر مانتا ہی نہیں۔"

"چاچا! تمہیں کیا پتا پہلوانی کیا ہوتی ہے۔" لاٹو پہلوان نے جواب دیا "امرتسر کا تو نام ہی پہلوانوں کی وجہ سے مشہور ہوا ہے۔"

"آہو جی۔ تم نے ہی تو امرتسر کا نام دنیا میں روشن کیا ہے۔ او باز آ جا لاٹو! ورنہ کسی روز اکھاڑے سے تمہارا جنازہ ہی اٹھے گا۔" اوتار سنگھ نے کہا۔

لاٹو پہلوان کا نام تو کچھ اور تھا مگر وہ لاٹو کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ وہ گیان سنگھ کا مزارع تھا۔ اوتار سنگھ کے باپ نے ہی اسے پالا تھا اس لیے یہ گھر والوں سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف تھا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اسے گھر کا ایک فرد ہی سمجھا جاتا تھا۔

چیک پوسٹ پر انہیں روک لیا گیا۔

"کی گل ہے سنتری بادشاہو؟" گیان سنگھ نے پولیس والے کو اپنی طرف آتے دیکھ کر کہا "ابھی تمہارا گمشدہ بندہ نہیں ملا۔"

"یہ کون لوگ ہیں؟" سپاہی نے قدرے رعب دار لہجے میں پوچھا۔

"یہ میرا بھاجی ہے اوتار سنگھ اور یہ اس کا بیٹا بچن سنگھ اور یہ میرا پُتّر ہے کرتار سنگھ۔ اور کچھ سنتری بادشاہ؟" گیان سنگھ نے جواب دیا۔

"اور یہ؟" کانسٹیبل نے لاٹو پہلوان کی طرف اشارہ کیا۔

"کیوں اوئے لاٹو پہلوان۔" اوتار سنگھ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم تو کہتے تھے کہ سارا زمانہ تمہیں جانتا ہے۔ پر اس سنتری نے تو تمہیں پہچانا ہی نہیں۔"

"میں پہلوان ہوں بابا اوتار سنگھ جی' کوئی جیل سے بھاگا ہوا مجرم نہیں جو پولیس مجھے پہچانتی ہو۔ میں پولیس والوں سے یاری رکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ یہ وقت آنے پر یاروں کو بھی پکڑ کر لے جاتے ہیں۔"

"چپ اوئے ورنہ ابھی لے جا کر بند کر دوں گا۔" سپاہی نے اسے ڈانٹ دیا۔ اس نے باری باری ان سب کے چہروں کا جائزہ لیا اور پھر بیریر پر بیٹھے ہوئے سپاہی کو اشارہ کر دیا۔

بیریر کی زنجیر ہٹ گئی اور گیان سنگھ نے ٹریکٹر آگے بڑھا دیا۔

"اوئے تو اس سنتری کو جانتا ہے گیان سنگھ؟" اوتار سنگھ نے پوچھا۔

"سب انسپکٹر واقف ہے۔ وہ درخت کے نیچے کرسی پر بیٹھا ہوا

تھا۔ صبح جب میں ترن تارن سے آیا تھا تو اس نے پٹھوں کا ایک گٹھا اپنی بھینس کے لیے اتروا لیا تھا۔" گیان سنگھ نے جواب دیا۔

طارق نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ وہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ترن تارن پہنچ گئے۔ یہ ایک بہت بڑا قصبہ تھا بلکہ شہر کے زمرے میں آچکا تھا۔ ان کا گاؤں شہر سے دوسری طرف تقریباً چار میل کے فاصلے پر تھا۔

گاؤں میں طارق اور نیلم پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ آزادی سے گھومتے رہے۔ ایک رات اس گاؤں میں گزارنے کے بعد وہ صبح سویرے ٹریکٹر ٹرالی پر رخصت ہو گئے۔ گیان سنگھ اور گوربخش سنگھ ان کے ساتھ تھے۔ نیلم اور طارق کے حلیے اب بھی سکھوں والے ہی تھے۔

ان کے چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ تھا لہلہاتی فصلیں اور کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کسان بہت بھلے لگ رہے تھے۔ انہی کھیتوں میں کچھ چھوٹی چھوٹی سڑکیں بھی تھیں جو دیہاتوں کو ملاتی تھیں۔ ان کا رخ واہگہ کی طرف تھا۔ واہگہ تک جانے کے لیے اگرچہ ایک پختہ سڑک بھی موجود تھی لیکن گیان سنگھ کھیتوں کے درمیان کچے راستے اختیار کیے ہوئے تھا جس سے ٹرالی کو بری طرح جھٹکے لگ رہے تھے۔ طارق اور نیلم کا انجر پنجر ڈھیلا ہو گیا تھا۔ تیس پینتیس میل کا فاصلہ دو گھنٹوں میں طے ہوا۔ آخرکار وہ گرانڈ ٹرنک روڈ پر پہنچ گئے۔ یہ سڑک دائیں سمت میں امرتسر کی طرف اور بائیں سمت میں پاکستان کی سرحدی چوکی واہگہ کی طرف چلی گئی تھی۔ جس جگہ وہ جی ٹی روڈ پر پہنچے تھے وہاں سے واہگہ صرف دو میل کے فاصلے پر تھا لیکن گیان سنگھ سڑک کو عبور کر کے ٹریکٹر کو دوسری طرف ایک چھوٹی سی بستی میں لیتا چلا گیا۔

یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اس کی آبادی بھی سکھوں پر مشتمل تھی۔ بستی سے نکل کر وہ ایک بار پھر کھیتوں میں کچے راستے پر پہنچ گئے۔ بستی میں سے گزرتے ہوئے کسی نے ان کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔

وہ سرحد کے تقریباً متوازی دو گھنٹے تک سفر کرتے رہے اور آخرکار ایک بستی میں پہنچ کر رک گئے۔ یہ چھوٹا سا گاؤں بیس بائیس گھروں پر مشتمل تھا۔ تمام کی تمام آبادی سکھوں پر مشتمل تھی۔ بستی کے شروع میں ایک بہت بڑا جوہڑ تھا۔ کنارے پر کچھ عورتیں بیٹھی کپڑے دھو رہی تھیں۔ ان کے قریب ہی ننگ دھڑنگ بچے پانی میں گھسے ایک دوسرے پر چھینٹے اچھال رہے تھے۔ قریب ہی دو تین خارش زدہ کتے پانی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جوہڑ کے وسط میں چند بھینسیں بیٹھی ہوئی تھیں۔

گیان سنگھ نے اس جوہڑ سے ملحق بستی کے پہلے مکان کے سامنے ٹریکٹر روک لیا اور انجن بند کرتے ہوئے طارق اور نیلم کو اترنے کا اشارہ کیا۔ گوربخش سنگھ ان سے پہلے ہی دوڑتا ہوا مکان میں داخل ہو چکا تھا۔

یہ گیان سنگھ کے ہم زُلف چرن سنگھ کا مکان تھا جو اس علاقے کا سب سے بڑا زمیندار تھا۔ پاکستان کی سرحد یہاں سے صرف ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر تھی اور چرن سنگھ کی اراضی سرحد تک پھیلی ہوئی تھی۔

چرن سنگھ اس وقت گھر پر ہی موجود تھا۔ اس نے بڑی گرمجوشی سے ان کا استقبال کیا۔ چند منٹ وہ لوگ ایک دوسرے کی خیروعافیت دریافت کرتے رہے پھر چرن سنگھ نے کہا۔

"تم لوگ منہ ہاتھ دھو لو' کھانا بالکل تیار ہے۔ کھانے کے بعد آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

کھانے میں خاصا اہتمام کیا گیا تھا۔ کھانا دیکھ کر طارق کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ چرن سنگھ کو ان کے آنے کی اطلاع پہلے سے تھی۔ وہ لوگ ساڑھے سات بجے ترن تارن سے روانہ ہوئے تھے اور اب دو بجنے والے تھے۔ کھانے کے بعد نیلم کو تو گھر کی خواتین کے پاس بھیج دیا گیا اور طارق ان کے ساتھ بیٹھک والے کمرے میں آگیا۔

"کل شام کو مجھے تمہارا پیغام مل گیا تھا۔" چرن سنگھ نے گیان سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں نے سارا انتظام مکمل کر لیا ہے لیکن...."

"لیکن کیا؟" طارق نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"پچھلے تین چار روز سے رینجرز کے آدمی بار بار ہمارے گاؤں میں چکر لگا رہے ہیں۔ انہیں دلی سے بھاگے ہوئے دو افراد کی تلاش ہے۔ ان میں ایک مرد اور ایک عورت ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق وہ دونوں بھیس بدل کر جہاز کے عملے کے ساتھ امرتسر پہنچ گئے تھے اور ہوائی اڈے سے غائب ہو گئے تھے۔ حکام کا خیال ہے کہ وہ دونوں سرحد پار کر کے پاکستان میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔ میلوں دور تک سرحد کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ رینجرز والے کئی مرتبہ یہاں آچکے ہیں اور کہہ گئے ہیں کہ اگر اس علاقے میں کسی مشتبہ شخص کو دیکھا جائے تو فوراً ہی قریبی چوکی پر اطلاع دی جائے لیکن بہرحال میں نے تمام انتظامات مکمل کر لیے ہیں۔ انہیں آج رات ہی سرحد پار کروا دی جائے گی۔ سرحد کے اس طرف تو انہیں کوئی مسئلہ پیش نہیں آئے گا' دوسری طرف ان کا مقدر۔" چرن سنگھ نے کہا۔

"سرحد پار پاکستان کا کون سا علاقہ لگتا ہے؟" طارق نے پوچھا۔

"بھینی" گیان سنگھ نے جواب دیا "بہت بڑا گاؤں ہے اور بالکل سرحد پر واقع ہے۔ اس گاؤں کا زمیندار چوہدری برکت میرا بہت اچھا دوست ہے۔ ہمارے کھیت سرحد پر ملے ہوئے ہیں۔ اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ میں نے اس سے بھی بات کر رکھی ہے۔ سرحد کے دوسری طرف چوہدری برکت کے آدمی منتظر ہوں گے۔ وہ

انھیں گاؤں پہنچادیں گے۔"

"یہاں سے کس وقت نکلنا ہوگا؟" طارق نے پوچھا۔

"رات ٹھیک دو بجے رینجرز کی گشتی پارٹی یہاں سے گزرتی ہے۔ ہم لوگ دو بجے سے پہلے سرحد کے قریب پہنچ جائیں گے۔ وہاں میرا مویشیوں کا باڑہ ہے۔ رینجرز کی گشتی پارٹی جیسے ہی گزر جائے گی، تم لوگوں کو وہاں سے نکال دیا جائے گا۔" چرن سنگھ نے جواب دیا "اب تم لوگ کچھ آرام کرلو۔ مجھے اس سلسلے میں ایک دو آدمیوں سے ملنا ہے۔ شام کو ملاقات ہوگی۔"

چرن سنگھ چلا گیا۔ گیان سنگھ بھی اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ طارق کرسی سے اٹھ کر دیوان پر لیٹ گیا۔ ٹریکٹر ٹرالی پر چار پانچ گھنٹوں کے سفر نے ان کا انجر پنجر ڈھیلا کردیا تھا اور وہ بری طرح تھکن محسوس کررہا تھا۔ دیوان پر لیٹتے ہی وہ گہری نیند سوگیا۔

اس کی آنکھ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ہی کھلی تھی۔ گاؤں دیہاتوں میں رات کا کھانا جلد ہی کھالیا جاتا ہے۔ یہ لوگ بھی کھانے وغیرہ سے جلد ہی فارغ ہوگئے اور پھر باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔

ایک بجے کے قریب دو آدمی کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ دونوں نوجوان سکھ تھے۔ چرن سنگھ نے سوالیہ نگاہوں سے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا۔

"رینجرز کی گشتی پارٹی نکل چکی ہے۔ وہ لوگ ٹھیک ایک گھنٹے بعد واپس آئیں گے۔ ہمیں اس سے پہلے پہلے ہی ڈیرے پر پہنچ جانا چاہیے۔" آنے والے دونوں نوجوانوں میں سے ایک نے کہا۔

"ٹھیک ہے، ہم لوگ تیار ہی بیٹھے ہیں۔ چلو اٹھو بھئی۔" چرن سنگھ نے طارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

طارق اور نیلم نے شام ہی کو اپنے حلیے بدل لیے تھے۔ اب وہ اپنے لباس سے سکھ نہیں مسلمان نظر آرہے تھے۔ طارق نے گوربخش سنگھ سے ہاتھ ملایا اور ان لوگوں کے ساتھ کمرے سے نکل آیا۔

رات تاریک تھی۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ خنکی کچھ بڑھ گئی تھی۔ وہ لوگ بستی سے نکل کر کھیتوں کی طرف جانے والے راستے پر ہولیے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ کھیتوں میں ایک تنگ سی پگڈنڈی پر پہنچ گئے اور تاریکی میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلنے لگے۔ سب سے آگے وہ دونوں نوجوان سکھ تھے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں چینی ساخت کی آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔ ان کے پیچھے چرن سنگھ تھا۔ اس کے بعد نیلم پھر طارق اور آخر میں گیان سنگھ تھا۔ چرن سنگھ اور گیان سنگھ کے ہاتھوں میں بھی آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔

تقریباً بیس منٹ بعد وہ ڈیرے پر پہنچ گئے۔ یہاں درختوں کا ایک جھنڈ سا تھا اور مویشیوں کا باڑہ سا بنا ہوا تھا۔ کھولیوں کے قریب ہی ایک چھوٹا سا کمرا بنا ہوا تھا جس میں زراعت کے متعلق چند چھوٹے موٹے آلات اور مویشیوں کا سامان پڑا ہوا تھا۔ وہ لوگ درختوں کے جھنڈ میں رک گئے۔ چاروں طرف ہُو کا عالم تھا۔ تاریکی میں حشرت الارض کے سوا کسی قسم کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ عجیب وحشت ناک ماحول تھا اور نیلم پر واقعی وحشت سی طاری ہورہی تھی۔ وہ طارق کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی اور اس نے طارق کا ایک ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

چند منٹ بعد دونوں نوجوان سکھ پیپل کے درختوں کے جھنڈ سے نکل کر کھیتوں کے درمیان پگڈنڈی پر چلتے ہوئے تاریکی میں غائب ہوگئے۔ ان کے جانے کے بعد وہ لوگ خاموشی سے بیٹھے رہے۔ درختوں کے اس جھنڈ سے تقریباً سو گز آگے سرحد تھی۔ کھیتوں کے درمیان خاردار تاروں کی ایک باڑ تھی جس کے دوسری طرف پاکستانی علاقہ شروع ہوجاتا تھا۔ یہ خاردار تار بھی چند سال پہلے بھارتی حکومت نے لگائے تھے۔ اس سے پہلے یہاں سرحد کی نشاندہی کے لیے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر صرف بُرجیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان بُرجیوں کے دونوں طرف چند فٹ کی جگہ نومینز لینڈ تھی۔

جب وہ پیپل کے درختوں کے اس جھنڈ میں پہنچے تو دو بجنے میں اٹھارہ منٹ تھے۔ ٹھیک دو بجے تاریکی میں ایسی آواز سنائی دی جیسے کچھ لوگ باتیں کرتے ہوئے آرہے ہوں۔ یہ آواز پہلے دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی پھر رفتہ رفتہ قریب آتی چلی گئی اور پھر اچانک

افسوس

شادی کی پچاسویں سالگرہ پر بیوی نے محسوس کیا کہ اس کے شوہر کی آنکھیں نمناک ہو رہی ہیں۔ "ارے مجھے پتا نہ تھا کہ تم اس قدر جذباتی آدمی ہو" بیوی نے بڑے پیار سے شوہر کو تھپکتے ہوئے کہا۔

"یہ بات نہیں ہے۔" شوہر نے مغموم لہجے میں بیوی کی تصحیح کی۔ "تمھیں یاد ہے، شادی سے قبل ہم دونوں کو تمھارے باپ نے باڑے کے ایک گوشے میں پکڑ لیا تھا اور پھر انھوں نے کہا تھا کہ اگر میں نے تم سے شادی نہیں کی تو وہ مجھے پچاس سال کے لیے جیل بھجوا دیں گے؟"

"ہاں، مجھے یاد ہے۔ پھر؟" بیوی نے حیرت سے پوچھا۔

"پھر یہ کہ اگر مجھے جیل ہو گئی ہوتی تو آج کے دن میں یقیناً رہا ہو گیا ہوتا۔"

ہی ایک جگہ روشنی چمکتی ہوئی دکھائی دی۔

وہ رینجرز کے گشتی سپاہی تھے۔ ان کی تعداد چار تھی اور وہ درختوں کے جھنڈ سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر سرحد کے متوازی ایک پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ ڈیرے کے سامنے پہنچ کر ان میں سے ایک نے ٹارچ روشن کر لی تھی۔ ٹارچ کی لہراتی ہوئی روشنی ڈیرے کی طرف اٹھ رہی تھی۔ گیان سنگھ اور اس کے ساتھی مویشیوں کی کھرلیوں کے پیچھے دبک گئے۔ چرن سنگھ اور گیان سنگھ کی گرفت رائفلوں پر سخت ہو گئی تھی۔ ٹارچ کی لہراتی ہوئی روشنی کھرلیوں کے قریب سے گزرتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔

رینجرز کے گشتی پارٹی آگے نکل چکی تھی۔ اچانک ہی فضا میں ٹیٹرے کی آواز ابھری۔ بگلے سے ملتا جلتا یہ پرندہ عام طور پر رات کو فضا میں منڈلاتا رہتا ہے لیکن اس وقت ٹیٹرے کی یہ آواز کھیتوں میں سے سنائی دی تھی۔

"طارق!" چرن سنگھ نے سرگوشی کی "تم اپنی ساتھی کو لے کر اس پگڈنڈی پر چلے جاؤ۔ تقریباً پچاس گز آگے میرے آدمی تم لوگوں کو مل جائیں گے۔ وہ تمہیں تاروں کی باڑ کے دوسری طرف پہنچا دیں گے۔ جاؤ، دیر نہ کرو۔"

نیلم اور طارق اپنی جگہوں سے اٹھ گئے۔ طارق کو ان دونوں نے بغلگیر ہو کر رخصت کیا۔ نیلم کے سر پر بھی ہاتھ پھیر کر اس کو رب راکھا کہا اور وہ دونوں درختوں کے جھنڈ سے نکل کر کھیتوں کی پگڈنڈی پر ہو لیے۔

طارق نے نیلم کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ وہ دونوں تیز تیز چلنے کی کوشش کر رہے تھے مگر ناہموار پگڈنڈی پر وہ بار بار لڑکھڑا رہے تھے۔ نیلم کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ خوف کی وجہ سے وہ کچھ زیادہ ہی سردی محسوس کر رہی تھی۔ اچانک ایک جگہ اس کا پیر رپٹا۔ طارق نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی مگر اس کے ساتھ خود بھی کھیت میں جا گرا۔ نیلم کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ طارق نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلنے لگے۔ چند گز آگے انہیں چرن سنگھ کے آدمی مل گئے۔

"جلدی کرو۔ اس عورت کے چیخنے کی آواز سناٹے میں دور تک پھیلی ہو گی۔ اگر گشتی پارٹی میں سے کسی نے سن لی ہو گی تو وہ لوگ واپس بھی آ سکتے ہیں۔" ان دونوں سکھوں میں سے ایک نے کہا۔

وہ چاروں، کھیتوں میں پگڈنڈی پر دوڑنے لگے۔ ایک جگہ نیلم کا پیر پھر رپٹ گیا۔ اس مرتبہ اس کے ایک پیر میں سے سینڈل اتر گیا۔ وہ تاریکی میں سینڈل تلاش کرنے لگی لیکن سینڈل نہیں ملا اور وہ اس کی تلاش کا ارادہ ترک کر کے طارق کے ساتھ دوڑنے لگی۔ عین اسی وقت تاریک فضا میں ایک گونجتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ہولڈ اپ! کون ہے وہاں، رک جاؤ! ورنہ گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے۔"

یہ آواز انڈین رینجرز کے ایک سپاہی کی تھی جو خاصی دور سے آئی تھی۔ وہ لوگ غالباً نیلم کی چیخ سن کر واپس مڑے تھے۔

"سامنے تقریباً دس گز کے فاصلے پر تاریں کٹی ہوئی ہیں۔ تم لوگ جلدی سے نکل جاؤ، ہم انہیں روکتے ہیں۔" چرن سنگھ کے ایک آدمی نے سرگوشی کی۔

طارق نے نیلم کا ہاتھ پکڑ کر دوڑ لگا دی۔ باڑ میں کٹی ہوئی تاروں والا حصہ تلاش کرنے میں انہیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ طارق نے پہلے نیلم کو تاروں میں سے دوسری طرف دھکیلا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے دوسرے پیر میں سے بھی سینڈل اتر گیا تھا۔ طارق اسے دھکیل کر خود تاروں میں سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ رینجرز نے شاید انہیں دیکھ لیا تھا۔ گولیاں ان دونوں کے آس پاس سے گزر گئیں۔ طارق کٹی ہوئی تاروں میں سے نکل آیا۔ اس نے نیلم کا ہاتھ پکڑا اور اندھا دھند کھیتوں میں دوڑ لگا دی۔

فائرنگ سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا جیسے دو پارٹیوں میں ٹھن گئی ہو۔ اس کا مطلب تھا کہ چرن سنگھ کے آدمیوں نے رینجرز کو اپنے ساتھ فائرنگ میں الجھا لیا تھا۔

وہ دونوں کھیتوں میں تیزی سے دوڑتے رہے پھر اچانک انہیں یوں محسوس ہوا جیسے ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔ دوسرے ہی لمحے وہ شڑاپ کی آواز کے ساتھ پانی میں گرے۔ دراصل یہ ایک کھال (چھوٹی ندی) تھی جسے وہ تاریکی میں نہیں دیکھ سکے تھے۔ وہ دونوں پانی میں تر ہو گئے۔ طارق اٹھ کر ندی سے نکلنا ہی چاہتا تھا کہ تاروں کی باڑ کی طرف سے زبردست فائرنگ ہوئی۔ وہ ایک دم نیچے گر گیا۔ نیلم کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ طارق نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ نیلم اس سے لپٹ گئی۔

وہ لوگ پاکستانی سرحد میں تقریباً بیس گز اندر آ چکے تھے لیکن بھارتی سپاہیوں کا کوئی بھروسا نہیں تھا کہ وہ انہیں دیکھ کر گولی مار دیتے۔ طارق کے ذہن میں کچھ اور خدشات بھی سر ابھار رہے تھے۔ بھینی کے زمیندار چوہدری برکت کے آدمی انہی کھیتوں میں کسی جگہ ان کے منتظر تھے۔ اندیشہ تھا کہ فائرنگ کی آواز سن کر وہ واپس نہ چلے جائیں۔ دوسرا اندیشہ یہ تھا کہ فائرنگ کی آواز سن کر پاکستانی رینجرز کے جوان اس طرف نہ پہنچ جائیں۔ ایسی صورت میں بھی ان کا بچنا مشکل تھا۔

وہ دو تین منٹ ندی کے اندر پانی میں بیٹھے رہے۔ پھر طارق پہلے خود باہر نکلا پھر نیلم کو پکڑ کر نکالا اور کھیتوں میں ایک طرف چلنے لگا۔ ان کے کپڑوں سے پانی نچڑ رہا تھا جس سے چلنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔

چند گز آگے دو تین درخت نظر آ رہے تھے۔ ان کا رخ انہی درختوں کی طرف تھا۔ اچانک ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی بھینس

ڈکرائی ہو۔ آواز دو مرتبہ سنائی دی۔ وہ دونوں اس آواز کی سمت بڑھنے لگے۔ یہ دراصل سگنل تھا جس کے بارے میں انہیں چرن سنگھ نے بتایا تھا۔ وہ جلد ہی اس جگہ پہنچ گئے جہاں بھینی کے زمیندار چوہدری برکت کے دو آدمی ان کے منتظر تھے۔ وہ بھی کلاشنکوف رائفلوں سے مسلح تھے۔

طارق اور نیلم ان کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ایک طرف چلنے لگے۔ سرحد پر فائرنگ کی آوازوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ شاید پاکستانی رینجرز کی گشتی پارٹی بھی وہاں پہنچ گئی تھی اور اب دونوں طرف کی رینجرز میں فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا تھا۔

○☆○

رات کا باقی حصہ انہوں نے بھینی میں چوہدری برکت کے گھر پر ہی گزارا۔ صبح ناشتے پر چوہدری برکت انہیں بتا رہا تھا کہ ۶۵ء میں جب بھارت کی فوج نے چوروں کی طرح پاکستان پر حملہ کیا تھا تو بھینی اور اس کے آس پاس کے دیہاتوں میں رہنے والوں نے پاک رینجرز کی مدد سے حملہ آور بھارتی فوج کو اس وقت تک روکے رکھا تھا جب تک پاک فوج کے جوان نہیں پہنچ گئے تھے۔ سرحد پر رہنے والے پاکستانی جیالوں نے بھارتی فوجیوں کے ناپاک قدم اپنی سرزمین پر نہیں پڑنے دیے تھے اور پاک فوج کے آنے پر تو انہوں نے بھارتی فوجیوں کو انہی کی دھرتی پر کئی میل پیچھے دھکیل دیا تھا۔

بھینی سے متصل چند میل کے فاصلے پر جلو کا واقعہ دنیا بھر کی عسکری تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔ رات کی تاریکی میں چوروں کی طرح حملہ آور ہونے والی بھارتی فوج کسی نہ کسی طرح سرحد عبور کر کے جلو موڑ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ بھارتی فوجیوں کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ صبح کی روشنی طلوع ہونے سے پہلے پہلے لاہور پر قابض ہو جائیں گے اور لاہور کے جم خانہ میں فتح کا جشن منائیں گے۔ یہ منصوبہ بھارتی فوج کے کمانڈر انچیف نے بنایا تھا اور اس کی طرف سے بھارتی وزیراعظم لال بہادر شاستری، دیگر وزراء اور ہندوستان کی چیدہ چیدہ شخصیات کو لاہور جم خانہ میں جشن فتح کے دعوت نامے بھی جاری کر دیے گئے تھے لیکن جلو میں بی آر بی نہر کا کنارہ بھارتی فوجیوں کا قبرستان بن گیا۔ انہیں نہر عبور کرنا نصیب نہ ہو سکا۔ پاک فوج کے آنے تک جلو کے شیر دل عوام نے بھارتی حملہ آوروں کو روکے رکھا اور جب پاک فوج کے دستے محاذ پر پہنچے تو جرأت اور بہادری کے ایسے ایسے کارنامے دیکھنے میں آئے کہ ایک نئی عسکری تاریخ رقم ہوتی چلی گئی۔ جلو سے چند میل آگے اسی بی آر بی نہر کے کنارے میجر عزیز بھٹی نے اپنے مٹھی بھر فوجی جوانوں کے ساتھ بھارت کی کئی ڈویژن فوج کو روکے رکھا۔ میجر عزیز بھٹی نے وطن کی آن پر اپنی جان قربان کر دی لیکن دشمن کے ناپاک قدموں کو اپنے وطن کی سرزمین پر نہیں پڑنے دیا۔

چوہدری برکت انہیں پاکستانی جیالوں کے جرأت مندانہ کارناموں کے واقعات سناتا رہا۔ نیلم اور طارق ان باتوں سے بے حد متاثر ہو رہے تھے۔ چوہدری برکت کا خیال تھا کہ وہ انہیں دو تین دن اپنے گاؤں میں روکے گا لیکن طارق جلد سے جلد سری نگر پہنچنا چاہتا تھا۔

بھینی سے لاہور ریلوے اسٹیشن تک اگرچہ روٹ نمبر ۳۳ کی ایک بس بھی چلتی تھی۔ چوہدری برکت اگر چاہتا تو انہیں بس پر بٹھا دیتا لیکن اس نے خود ان کے ساتھ لاہور تک جانے کا فیصلہ کر لیا۔ چوہدری برکت کے پاس سوزوکی کار کے علاوہ ایک اسٹیشن ویگن بھی تھی جو دیکھنے میں اگرچہ پرانی سی نظر آتی تھی لیکن اس کا انجن بڑا زوردار تھا۔ ناشتے کے بعد وہ اس ویگن پر ہی لاہور کی طرف روانہ ہو گئے۔

بھینی سے لکھوڈیر تک سڑک کے دائیں بائیں تاحدِ نگاہ لہلہاتی ہوئی فصلیں نظر آ رہی تھیں۔ چاروں طرف دیکھتا ہوا طارق بڑا مطمئن نظر آ رہا تھا۔ وہ آزاد فضا میں سانس لے رہا تھا، یہاں اس کے لیے کوئی خوف نہیں تھا۔

سری نگر تک پہنچنے کے لیے ان کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ راولپنڈی سے ہوتے ہوئے آزاد کشمیر میں مظفر آباد پہنچتے اور وہاں سے شاہ کوٹ اور دولر بیراج کی طرف سے ہو کر سری نگر کا رخ کرتے لیکن اس طرح بہت طویل چکر کاٹنا پڑتا اور اس میں کئی دن لگ جاتے۔ دوسرا راستہ سیالکوٹ کا تھا۔ وہاں سے وہ جموں کی

طرف نکل سکتے تھے۔ اور طارق نے اسی راستے کو ترجیح دی تھی۔

ریلوے اسٹیشن پہنچ کر معلوم ہوا کہ تین بجے سے پہلے سیالکوٹ کے لیے کوئی ٹرین نہیں تھی۔ وہ لوگ ریلوے اسٹیشن کے عین سامنے گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کے اڈے پر پہنچ گئے جہاں سے پندرہ منٹ بعد انہیں سیالکوٹ کے لیے بس مل گئی۔ چوہدری برکت نے انہیں بڑی گرمجوشی سے رخصت کیا تھا۔

سیالکوٹ میں وہ ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں رکے۔ اسی شام وہ ایک سرحدی گاؤں میں پہنچ گئے۔ رات کے پچھلے پہر وہ سرحد عبور کر کے مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو گئے۔ سرحد سے چند میل کے فاصلے پر رن بیر پورا نامی قصبہ تھا۔ انہوں نے قصبے میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی۔ آبادی سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر کسی پرانے مندر کے کھنڈر تھے۔ وہ رات بھر اسی کھنڈر میں بیٹھے رہے۔ آخری پہر سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ نیلم بری طرح کانپ رہی تھی۔ طارق نے اگرچہ اپنا کوٹ بھی اسے پہنا دیا تھا مگر اس کے باوجود وہ ٹھٹھرتی رہی۔ صبح جب دھوپ پھیلنا شروع ہوئی تو ان کی جان میں جان آئی۔

یہ سارا علاقہ سطح مرتفع پر مشتمل تھا جو دوسری طرف ہمالیہ کے سب سے چھوٹے سلسلۂ کوہ "شیوالیک رینج" سے جا ملتا تھا۔ دھوپ اچھی طرح پھیلنے کے بعد وہ کھنڈر سے نکلے اور اونچے نیچے راستوں سے ہوتے ہوئے قصبے میں داخل ہو گئے۔ ایک حلوائی کی چھوٹی سی دکان سے انہوں نے کچوری وغیرہ سے ناشتا کیا اور بسوں کے اڈے پر پہنچ گئے۔ یہاں آدھے گھنٹے بعد انہیں جموں جانے والی بس مل گئی۔

جموں کی زیادہ آبادی ڈوگروں اور ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ سکھ اور مسلمان بھی آباد تھے لیکن ان کی تعداد کم تھی۔ انیسویں صدی کے اوائل میں یہاں ڈوگرا مہاراجہ گلاب سنگھ حکمران تھا۔ اس نے چند ہزار روپوں کے عوض کشمیر کا سودا کیا تھا۔ اس سودے کے ساتھ ہی وادی میں بسنے والے مسلمانوں کی قسمت پر بدقسمتی کی مُہر لگ گئی تھی۔

کشمیر کی تاریخ میں گلاب سنگھ کے بعد جو نام نمایاں طور پر نظر آتا ہے وہ مہاراجہ ہری سنگھ کا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب برِصغیر کی تقسیم عمل میں آئی تو اس کا بنیادی فارمولا یہ تھا کہ مسلمان اکثریت والے علاقے پاکستان میں شامل کر دیے جائیں۔ اس بنیادی فارمولے کے تحت کشمیر کو بھی پاکستان کا حصہ بننا تھا کیونکہ کشمیر مذہبی، لسانی اور ثقافتی لحاظ سے پاکستان ہی کا حصہ ہے لیکن اس وقت کے کشمیر حکمران مہاراجہ ہری سنگھ نے تقسیم ہند کے فارمولے اور ریاست کے مسلمانوں کی خواہشات کے برعکس کشمیر کا بھارت کے ساتھ الحاق کر لیا لیکن اس الحاق کو کشمیری مسلمانوں نے تسلیم نہیں کیا اور مہاراجہ ہری سنگھ کے خلاف بغاوت کر کے ۳۲ ہزار مربع میل کا علاقہ آزاد کرا لیا۔ کشمیری مسلمانوں کی جدوجہدِ آزادی جاری رہی۔ کشمیری مسلمانوں کی مسلسل کامیابیوں سے گھبرا کر بھارت ہی مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ میں لے گیا تھا۔ اقوام متحدہ نے ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء اور پھر ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کو دو قرار دادیں منظور کیں جن میں کشمیر کو متنازعہ علاقہ قرار دیا گیا اور دونوں قرار دادوں میں کشمیریوں کے حقِ خود ارادیت کو تسلیم کیا گیا۔ ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کی قرار داد کے جزو الف میں کہا گیا کہ ریاست جموں و کشمیر کے بھارت یا پاکستان سے الحاق کا مسئلہ آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری کے جمہوری طریقے سے طے پائے گا۔

اقوام متحدہ کی قرار دادیں ہمیشہ سے مسئلۂ کشمیر کی بنیاد رہی ہیں کیونکہ بھارت پوری دنیا کے سامنے ان قرار دادوں کو تسلیم کر چکا ہے۔ ان قرار دادوں کی وجہ سے کشمیریوں کی سیاسی اور عسکری جدوجہد کو کوئی بھی ملک دہشت گردی قرار نہیں دے سکتا کیونکہ کشمیری مسلمان اپنے بین الاقوامی، تسلیم شدہ حق کے حصول کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں مگر بھارت کے لیے سب سے زیادہ تشویش ناک بات یہ ہے کہ کشمیری مسلمان بھارت کے ساتھ برسرِپیکار ہیں اور ہزاروں مجاہدین مسلح جدوجہد میں مصروف ہیں۔ کشمیری مسلمانوں میں ایک فیصد افراد بھی ایسے نہیں ہیں جو بھارت کے حامی ہوں اس لیے بھارت اچھی طرح جانتا ہے کہ اگر کشمیر میں رائے شماری ہوئی تو کشمیر پاکستان کا حصہ بن جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت کشمیری مسلمانوں کو حقِ خود ارادیت دینے کو تیار نہیں اور طاقت کو بل بوتے پر اس خطے پر قابض ہے۔ کشمیر کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ کشمیر ان کا ہے اور وہ ایک نہ ایک دن بھارت کے چنگل سے آزادی حاصل کر کے رہیں گے۔

بھارت کی ایک پالیسی یہ بھی تھی کہ کشمیر کے مسلمانوں پر اس قدر ظلم توڑے جائیں کہ وہ اپنے گھربار چھوڑ کر ریاست سے بھاگ جائیں اور ان کی جگہ ہندوؤں کو لا کر آباد کیا جائے تاکہ اگر کبھی رائے شماری کرائی بھی جائے تو ہندوؤں کی اکثریت ثابت ہو جائے۔ یہاں آباد ہونے والے ہندوؤں کے لیے اگرچہ بہت سی مراعات کا اعلان کیا گیا تھا لیکن بہت کم ہندو خاندان یہاں آباد ہونے کو تیار ہوتے تھے۔ ان ہندوؤں کو بھارتی حکومت کی طرف سے دیگر مراعات کے علاوہ اسلحے سے بھی مکمل طور پر لیس کیا گیا تھا۔

یوں تو پوری وادی میں مسلمانوں کو بربریت کا نشانہ بنایا جا رہا تھا لیکن جموں میں رہنے والے مسلمان، بھارتی ستم ریزیوں کا کچھ زیادہ ہی شکار ہو رہے تھے۔

طارق ساڑھے چار سال پہلے جموں ہی کے راستے سلیم کے ساتھ بھارت گیا تھا لیکن آج صورت حال پہلے سے کہیں بدتر ہو چکی تھی۔ مسلمانوں کے کئی گھر اُجڑ چکے تھے۔ ان لوگوں کو یا تو ختم کر دیا گیا تھا یا اپنے گھربار چھوڑ کر پاکستانی سرحد کی طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

طارق کو شیراز بابا اور روشا یاد آگئی۔ وہ رات انہوں نے جموں کی نواحی بستی میں واقع ایک مسلمان گھر میں گزاری۔ یہاں انہوں نے اپنے آپ کو میاں بیوی ظاہر کیا تھا اور یہ بتایا تھا کہ وہ آج ہی بس کے ذریعے کٹھور سے آئے تھے۔ ان کا ٹرنک بس کی چھت پر رکھا ہوا تھا لیکن جب وہ جموں کے لاری اڈے پر بس سے اُترے تو ٹرنک غائب تھا۔ راستے میں اُترنے والا کوئی مسافر غلطی سے یا جان بوجھ کر ان کا ٹرنک لے گیا جس میں ان کے صرف کپڑے وغیرہ تھے۔

جموں میں مسلمان گھروں کی عام طور پر تلاشی ہوتی رہتی تھی۔ پولیس یا بھارتی فوجی کسی نہ کسی بہانے زبردستی مسلمانوں کے گھروں میں گھس جاتے لیکن غنیمت تھا کہ ان کی رات خیریت سے گزر گئی۔ دوسرے دن صبح سویرے ہی وہ اودھم پور جانے والی بس پر سوار ہو گئے۔ طارق نے ٹکٹ تو اودھم پور کے لیے تھے لیکن جموں شہر سے گیارہ میل کا فاصلہ طے ہوتے ہی جب بس ایک چھوٹے سے اسٹاپ پر رکی تو طارق' نیلم کو ساتھ لے کر بس سے اُتر گیا۔ اس اسٹاپ سے اودھم پور جانے والا ایک گورکھا کسان بس میں سوار ہوا تھا۔

سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا جہاں سائبان کے نیچے بان کی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ یہ ایک ہندو کا ہوٹل تھا جہاں صرف دو تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف انجیروں کے باغ تھے۔ دائیں طرف ایک کچا راستہ نظر آرہا تھا جو باغ میں سے ہوتا ہوا پہاڑوں کی طرف چلا گیا تھا۔ دور پہاڑوں پر چنار کے اونچے درختوں کی ایک قطار نظر آرہی تھی۔

بس چلے جانے کے بعد طارق اور نیلم چند منٹ وہاں کھڑے رہے پھر طارق نے نیلم کا ہاتھ پکڑا اور سڑک عبور کرکے انجیروں کے باغ میں کچے راستے پر ہولیا۔

"کہاں جارہے ہو؟ تم نے ٹکٹ تو اودھم پور کے لیے تھے۔" نیلم نے پوچھا۔

"شاید تم بھول گئی ہو کہ میں نے تمہیں شیراز بابا کے بارے میں بتایا تھا۔" طارق نے جواب دیا "دہلی سے ہماری روانگی سے ایک دن پہلے شیراز بابا کو یہ اطلاع بھجوادی گئی تھی کہ ہم روانہ ہورہے ہیں۔ پروگرام کے مطابق ہمیں اگرچہ سیدھا سرینگر جانا تھا مگر گڑبڑ کی وجہ سے ہمیں راستہ تبدیل کرنا پڑا۔ شیراز بابا کو بھی ہمارے بارے میں اطلاع مل چکی ہوگی۔ ہمیں اس سے پروگرام کا پتا چل جائے گا۔"

"تم نے شیراز بابا کی پوتی کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ کیا نام تھا اس کا.....؟"

"روشا" طارق نے کہا "بہت بہادر لڑکی ہے۔ میں اس کی جرات و بیباکی سے بے حد متاثر ہوا تھا۔"

"چلو اس بہانے میں بھی اس سے مل لوں گی۔" نیلم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ انجیروں کے باغ سے نکل کر کھلی جگہ پر آگئے۔ آگے اونچے نیچے ٹیلے اور چٹانیں تھیں۔ تیز دھوپ میں چٹانیں تپ رہی تھیں۔ وہ پسینے میں شرابور ہو رہے تھے۔ اونچے نیچے راستوں پر چلتے ہوئے نیلم بُری طرح ہانپ رہی تھی۔ ان سنگلاخ چٹانوں پر کوئی ایسا درخت بھی نظر نہیں آرہا تھا جس کے سائے میں وہ کچھ دیر کے لیے رک جاتے۔

"کتنی دور جانا ہے طارق! مجھ سے تو اب بالکل نہیں چلا جارہا۔" نیلم نے ایک جگہ رک کر ہانپتے ہوئے کہا۔

"تقریباً ڈیڑھ کوس۔ اس چٹان کے پیچھے ہے شیراز بابا کی بستی۔" طارق نے ایک چٹان کی طرف اشارہ کیا۔ چٹان کے نیلے پتھر دھوپ میں چمک رہے تھے۔

وہ کچھ دیر رکنے کے بعد پھر چلنے لگے۔ ایک ٹیلے پر سے گھوم کر طارق رک گیا۔ اس جگہ راستے کے بائیں جانب ایک بہت گہرا کھڈ نظر آرہا تھا۔ طارق اس کھڈ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہی وہ کھڈ تھا جہاں اس نے بھارتی فوجیوں کو جیپ سمیت جہنم واصل کیا تھا اور پھر وہ منظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا جب جیپ پر سوار بھارتی فوجی اس کی تلاش میں شیراز بابا کی بستی میں آئے تھے۔ طارق مویشیوں والے کمرے میں بھوسے کے ڈھیر میں چھپ گیا تھا اور جب روشا کی چیخ سن کر وہ کمرے سے باہر نکلا تو اس کا خون کھول اٹھا تھا۔ ایک بھارتی فوجی روشا کو کھینچ کر اپنے ساتھ لپٹانے کی کوشش کررہا تھا اور روشا چیختے ہوئے اس کے سینے پر گھونسے برسا رہی تھی۔ طارق نے نہ صرف روشا کو بھارتی فوجیوں کی دست درازی سے بچایا تھا بلکہ انہی کے ہتھیاروں سے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور پھر ان کی لاشیں جیپ میں ڈال کر جیپ کو اس گہرے کھڈ میں لڑھکا دیا تھا۔

روشا کا معصوم' صبیح و ملیح چہرہ طارق کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ روشا کے تصور سے وہ اپنے آپ میں عجیب سی کیفیت محسوس کرنے لگا۔ اس کے سینے میں گُدگُدی کا احساس پھیلتا چلا گیا۔

وہ اس چٹان کے قریب پہنچ گئے جس کے دوسری طرف نشیب میں شیراز بابا کی چھوٹی سی بستی تھی۔ چٹان کے اوپر سے گھوم کر وہ ایک بار پھر رک گیا۔ دوسری طرف تاحدِ نگاہ سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ وادی کے نشیب میں درختوں کے جھنڈ کے قریب وہ چھوٹی سی بستی تھی لیکن اس بستی پر نگاہ پڑتے ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ یہ بستی صرف چند گھروں پر مشتمل تھی اور بیشتر مکان جلے ہوئے نظر آرہے تھے۔ جبکہ بعض مکانوں کی جگہ ملبے کے ڈھیر دکھائی دے رہے تھے۔

"نیلم! جلدی چلو۔ وہ بستی....." وہ جملہ مکمل کیے بغیر نیلم کا ہاتھ پکڑ کر نشیب کی طرف جانے والی پگڈنڈی کی طرف دوڑا۔

نیلم بھی بستی کے مکانوں کو دیکھ چکی تھی' اس لیے اسے طارق

سے مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہ طارق کے ساتھ دوڑتی رہی۔ کئی مرتبہ وہ گرتے گرتے بچی۔ اس نے کئی مرتبہ طارق سے ہاتھ چھڑانا چاہا تھا مگر کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ طارق اسے ڈھلان پر گھسیٹتا لیے جا رہا تھا۔

چند منٹ بعد ہی وہ بستی کے سامنے پہنچ گئے۔ طارق اس طرح بستی کے جلے ہوئے مکانوں اور ملبے کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آرہا ہو۔ وہ پلکیں جھپکنا بھی بھول گیا تھا۔ نظریں جیسے پتھرا گئی تھیں۔ نیلم اس کا بازو پکڑے اس کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔

"یہ... یہ سب کیا ہوا طارق؟" نیلم کے ہونٹوں سے سرگوشی سی نکلی۔

طارق جیسے ہوش میں آگیا۔ وہ نیلم سے اپنا ہاتھ چھڑا کر شیراز بابا کے مکان کی طرف دوڑا۔ مکان جلا ہوا تھا۔ تینوں کمروں کی چھتیں گر گئی تھیں۔ ایک ایک چیز جل کر راکھ ہو گئی تھی۔ کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ اس کے ساتھ تین مکان اور جلے ہوئے تھے جبکہ باقی دو مکان اس طرح ملبے کا ڈھیر بنے ہوئے تھے جیسے ان پر بلڈوزر چلا دیا گیا ہو۔ جلے ہوئے مکانوں کو دیکھ کر طارق کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہ افسوس ناک واقعہ چند روز پہلے ہی پیش آیا تھا۔ جلی ہوئی لکڑی کی بُو ابھی تک محسوس ہو رہی تھی۔

طارق بستی کے تمام مکانوں میں گھومتا رہا۔ اسے جلے ہوئے مکانوں میں کچھ سوختہ ڈھانچے بھی نظر آئے۔ طارق کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ بھارتی بھیڑیوں نے ان سب کو زندہ جلا دیا تھا۔ طارق کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔

"مجھے افسوس ہے طارق!" نیلم اسے بازو سے پکڑ کر درختوں کے جھنڈ میں لے گئی۔

"افسوس کے سوا اور کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔" طارق نے جواب دیا "پوری وادی میں ظلم و بربریت کی یہ داستانیں دُہرائی جا رہی ہیں اور ہم صرف افسوس ہی کر سکتے ہیں۔"

درختوں کے جھنڈ میں ایک جھلنگا سی چارپائی پڑی ہوئی تھی۔ وہ دونوں اس پر بیٹھ گئے۔ طارق جلے ہوئے مکانوں کی طرف دیکھتے ہوئے بار بار یہ سوچ رہا تھا کہ اس بستی پر حملہ کرنے والے ہندو بھیڑیوں نے روشا کا کیا حشر کیا ہوگا۔

انہیں وہاں بیٹھے ہوئے تقریباً ایک گھنٹا گزر چکا تھا۔ نیلم نے واپس چلنے کے لیے کہا تھا لیکن طارق اس طرح بیٹھا رہا تھا جیسے اس نے بات سنی ہی نہ ہو۔ آدھا گھنٹا مزید گزر گیا اور پھر اچانک نیلم ایک آدمی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر چونک گئی۔ وہ بوڑھا آدمی تھا۔ سفید داڑھی اور لباس سے وہ کوئی مسلمان ہی لگتا تھا۔ سر پر گرم ٹوپی تھی۔ نیلم نے طارق کے کندھے کو جھنجوڑ کر اس آدمی کی طرف متوجہ کیا تو طارق ایک جھٹکے سے چارپائی سے اٹھ گیا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس بوڑھے کے پاس پہنچ گیا۔ وہ بوڑھا بھی شیراز بابا کی اس بستی کا رہنے والا تھا۔ ساڑھے چار سال قبل دہلی جانے سے پہلے طارق جب ایک دو دن اس بستی میں رہا تھا تو اس بوڑھے سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔

"شمس بابا! یہ کیا ہو گیا؟ سب کچھ کیسے ہوا؟ شیراز بابا اور روشا...!"

"میرے ساتھ آؤ۔ میرے جھونپڑے میں، آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔" بوڑھے نے کہا "میں نے تم لوگوں کو چٹان پر سے آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ تم لوگوں نے شاید کچھ کھایا بھی نہیں۔ آؤ، میرے جھونپڑے میں چلو۔ آؤ بیٹی۔" اس نے نیلم کو اشارہ کیا۔

وہ لوگ ندی کی طرف چل پڑے۔ ندی کے قریب ہی ایک ٹیلے کے پیچھے گھاس پھونس کا ایک جھونپڑا تھا۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر عورت اور سات آٹھ سال کی عمر کا ایک بچہ بھی تھا۔ اس عورت کو بھی طارق نے پہچان لیا۔ یہ شمس بابا کی بیوی تھی۔ جھونپڑے سے کچھ آگے بھیڑیں چر رہی تھیں۔

"بھاگ بھری، ان کو کچھ کھانے کو دے۔ بھوکے بیٹھے تھے وہاں۔" شمس بابا نے اپنی بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

بھیڑ کے بھنے ہوئے گوشت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بھاگ بھری نے وہی ان کے سامنے رکھ دیا۔ طارق کا کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا مگر بوڑھے کے اصرار پر اس نے گوشت کے چند ٹکڑے کھا لیے۔

"یہ سب کچھ کیسے ہوا شمس بابا؟" طارق نے پوچھا۔

"یہ آج سے پندرہ دن پہلے کی بات ہے۔" شمس بابا نے کہا "لبریشن فرنٹ کے چار مجاہدین یہاں آئے تھے۔ وہ دوسرے دن ڈوڈا جانے والے تھے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ مختلف علاقوں سے مجاہدین ڈوڈا کے قریب کسی جگہ جمع ہو رہے تھے جہاں وہ بھارتی فوج کے خلاف ایک بڑی کارروائی کرنے والے تھے۔ وہ مجاہدین دوپہر کے بعد یہاں پہنچے تھے۔ اس وقت میں اپنی بیوی اور اس پوتے کے ساتھ جموں جانے والا تھا۔

"دوسرے دن جب میں واپس پہنچا تو یہ بستی اس حالت میں تھی۔ جلے ہوئے مکانوں سے دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ مجھے کئی لاشیں جلی ہوئی نظر آئیں۔ وہ رات ہم نے یہیں بیٹھ کر روتے ہوئے گزاری۔ میرا خیال تھا کہ بستی کا کوئی آدمی اگر جان بچا کر بھاگ گیا تھا تو شاید واپس آجائے لیکن کوئی بھی واپس نہیں آیا۔ سب کو ختم کر دیا گیا تھا۔ تین لاشیں مجھے یہاں پڑی ہوئی ملی تھیں۔ ان کے جسم گولیوں سے چھلنی تھے۔ میں نے اپنی بیوی کی مدد سے انہیں دفن کر دیا۔ اس جگہ ان کی قبریں ہیں۔" شمس بابا نے ندی کی طرف اشارہ کیا۔

"دوسرے دن سڑک کے ساتھ بنے ہوئے ہوٹل والا ہندو، بسنت رام یہاں آیا۔ اس نے بتایا کہ فوجی، روشا اور بستی کی دو اور لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ انہوں نے فرنٹ کے ایک مجاہد

کو بھی پکڑ لیا تھا جبکہ ایک مارا گیا تھا اور دو فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ مجاہدین کو پناہ دینے کے جرم میں اس بستی کو جلا کر راکھ کردیا گیا تھا اور اس کے باسیوں کو گولیوں سے بھون ڈالا گیا یا زندہ جلا دیا گیا۔"

"وہ فوجی اس مجاہد اور روشا وغیرہ کو کہاں لے گئے تھے؟" طارق نے پوچھا۔

"کچھ پتا نہیں" بوڑھے نے روتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

طارق کی رگوں میں خون کھول رہا تھا۔ وہ خاموشی سے آنسو بہاتا رہا۔

سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ اچانک فضا میں گرر گرر کی آواز سنائی دینے لگی۔ یہ آواز بھی بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوتی اور بھی قریب سے۔ طارق کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ کسی گاڑی کی آواز تھی۔ گاڑی کی وہ آواز سن کر بوڑھے کی پیشانی پر بھی سلوٹیں ابھر آئیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دوڑتا ہوا ٹیلے پر چڑھ گیا اور پھر بڑی تیزی سے واپس بھی آگیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اُڑ رہی تھیں۔

"فوجی جیپ ہے' اسی طرف آرہی ہے۔ تم لوگ چھپ جاؤ۔ میرے ساتھ آؤ' جلدی کرو۔" بوڑھے نے کہا۔

وہ دونوں اٹھ کر بوڑھے کے ساتھ دوڑ پڑے۔ ندی کے کنارے چٹان میں ایک غار سا نظر آرہا تھا۔ غار کے اندر پانی بھرا ہوا تھا۔ اس غار کی طوالت کا کچھ اندازہ نہیں تھا لیکن اس میں پانی کی سطح سے تقریباً دو فٹ اوپر ایک چٹانی شیلف سا بنا ہوا تھا جو اندر دور تک چلا گیا تھا۔ طارق پانی میں داخل ہو کر اس شیلف پر چڑھ گیا اور پھر اس نے نیلم کو بھی اوپر کھینچ لیا۔ بوڑھا اپنے جھونپڑے کی طرف واپس چلا گیا۔

پندرہ منٹ گزر گئے۔ جیپ کے انجن کی گرر گرر کی آواز سنائی دیتی رہی۔ پھر یہ آواز بند ہوگئی۔ جیپ غالباً جھونپڑے کے قریب آکر رکی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد پہلے چیخوں کی آواز ابھری پھر فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ چیخوں کی آواز فائرنگ کی آواز میں دب کر رہ گئی۔

طارق نے نیلم کو شیلف پر قدرے پیچھے دھکیل دیا اور خود کنارے پر سینے کے بل لیٹ گیا۔ اس کے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک تیز ہوگئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد بھاری قدموں کی آواز سنائی دی جو چٹان کے دہانے پر آکر رک گئی۔

"پران! تم اس غار کے اندر جا کر دیکھو۔ یہاں اس غار کے سوا چھپنے کی اور کوئی جگہ نہیں ہے۔" ایک بھاری آواز سنائی دی۔

"لیکن اس غار میں تو پانی بھرا ہوا ہے۔" دوسری آواز سنائی دی۔ وہ غالباً پران تھا۔

"پانی زیادہ گہرا نہیں ہے' دس قدم اندر تک جا کر دیکھ لو۔ اگر وہ قابو آگئے تو تمہارے وارے نیارے ہوجائیں گے۔ تم جانتے ہو تا کہ ہر کشمیری دہشت گرد کی گرفتاری پر حکومتِ ہند کی طرف سے انعام مقرر ہے۔ یہ انعام تم ہی کو ملے گا۔ اندر جاؤ۔ یہ ٹارچ لے لو۔" پہلی آواز نے کہا۔

چند سیکنڈ خاموشی رہی اور پھر شڑپ شڑپ کی آواز سنائی دینے لگی۔ طارق کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ پران غار میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ شیلف کے کنارے سے کھسک کر نیلم کے قریب پہنچ گیا۔ نیلم خوف کے باعث ہولے ہولے کپکپا رہی تھی۔ اچانک غار فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھا۔ طارق نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نیلم کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پران نے غالباً حفظِ ماتقدم کے طور پر غار میں سب مشین گن کا برسٹ مارا تھا۔ اس کے ساتھ ہی غار میں مدھم سی روشنی پھیل گئی اور شڑپ شڑپ کی آواز دوبارہ سنائی دینے لگی۔ پران آگے بڑھ رہا تھا۔

طارق ایک بار پھر بڑی احتیاط سے سینے کے بل رینگتا ہوا شیلف کے کنارے پر پہنچ گیا۔ پران اس سے دو قدم آگے نکل چکا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سب مشین گن تان رکھی تھی اور ٹارچ بغل میں دبی ہوئی تھی۔ اس جگہ پانی پنڈلیوں سے زیادہ گہرا نہیں تھا۔

طارق اپنی جگہ سے آگے سرک گیا۔ پران اس کے عین سامنے کھڑا تھا اور پھر طارق نے اچانک ہی پران پر چھلانگ لگا دی۔ اس کا ایک ہاتھ پران کے منہ پر اور دوسرا سب مشین گن پر پڑا تھا۔ پران کے لیے یہ حملہ قطعی غیر متوقع تھا۔ وہ بری طرح بدحواس ہوگیا۔ طارق نے اس کے ہاتھ سے سب مشین گن چھین کر چٹانی شیلف پر ڈال دی اور پران کی گردن دبوچ کر اسے نیچے گرا لیا۔ پران کا سر پانی میں ڈوب گیا۔ وہ بری طرح ہاتھ پیر مار رہا تھا مگر طارق نے اسے اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک اس کی مزاحمت ختم نہیں ہوگئی۔

پران کو پانی میں چھوڑ کر طارق نے شیلف پر سے سب مشین گن اٹھائی اور غار کے دہانے کی طرف بڑھنے لگا۔ غار میں تاریکی تھی مگر باہر ہلکی سی روشنی تھی۔ باہر والے اسے نہیں دیکھ سکتے تھے مگر وہ باہر والوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ تین آدمی تھے جو غار سے چند گز دور کھڑے تھے۔ دو فوجی تھے جنہوں نے سب مشین گنیں سنبھال رکھی تھیں اور تیسرا دھوتی کرتے میں تھا۔ کرتے پر اس نے نیلے رنگ کا لمبا سا کوٹ پہن رکھا تھا۔ طارق نے اسے پہچان لیا۔ وہ سڑک کے کنارے پر واقع اس چھوٹے سے ہوٹل کا ہندو مالک تھا جہاں صبح طارق اور نیلم بس سے اترے تھے۔ طارق کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ فوجیوں کو یہاں لانے والا وہی تھا۔ طارق چند قدم اور آگے آگیا۔ اب وہ تینوں اس کی زد میں تھے۔ اس نے سب مشین گن سیدھی کی اور ٹریگر کھینچ لیا۔

دونوں فوجیوں اور دھوتی والے ہندو کی کھوپڑیاں اُڑ گئیں۔ وہ کوئی آواز نکالے بغیر ڈھیر ہوگئے۔ طارق تیزی سے غار سے باہر

آگیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے نیلم کو آواز دے کر بلالیا۔

جب وہ جھونپڑے کے قریب پہنچے تو نیلم کے حلق سے بے اختیار خوف ناک چیخ نکل گئی۔ جھونپڑے کے سامنے بوڑھے شمس بابا' اس کی بیوی بھاگ بھری اور پوتے کی خون میں لت پت لاشیں پڑی تھیں۔ طارق پر بھی سکتہ سا طاری ہوگیا۔ ان تینوں نے اپنی جانیں قربان کردی تھیں لیکن بھارتی فوجیوں کو ان کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔

طارق کو جھونپڑے کے پچھلی طرف ایک کُدال مل گئی۔ اس نے ندی کے کنارے قدرے نرم جگہ پر زمین کھودنا شروع کردی۔ تقریباً ایک گھنٹے میں وہ خاصا گہرا گڑھا کھود چکا تھا۔ اس نے نیلم کی مدد سے شمس بابا' بھاگ بھری اور ان کے پوتے کی لاش گڑھے میں ڈال کر دفن کردی۔ وہ ان کے لیے یہی کرسکتے تھے۔

انہیں دفنانے کے بعد طارق غار کے سامنے بھارتی فوجیوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس نے دونوں فوجیوں کی وردیاں اتار لیں اور ان کی برہنہ لاشیں وہیں چھوڑ کر جھونپڑے کے پاس آگیا۔ حیرت انگیز طور پر وردیوں پر خون کا کوئی دھبّہ نہیں تھا۔ اس نے ایک وردی نیلم کی طرف بڑھادی۔

"جھونپڑے میں جاکر یہ وردی پہن لو۔ ہم تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس فوجی جیپ پر زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کرنے کی کوشش کریں گے۔"

نیلم اس کا مطلب سمجھ گئی۔ اس نے جھونپڑے میں گھس کر اپنے لباس کے اوپر ہی وہ فوجی وردی اس طرح پہنی کہ اس کا لباس تقریباً چھپ کر رہ گیا۔ یونیفارم پر فوجی جیکٹ کی وجہ سے اس کے سینے کے ابھار بھی کسی حد تک دب گئے تھے۔ بالوں کو سمیٹ کر اس نے ٹوپی میں چھپالیا۔ طارق بھی اس دوران آڑ میں ہوکر دوسرے فوجی کی وردی پہن چکا تھا۔ اس نے بھی وردی اپنے لباس کے اوپر ہی پہنی تھی۔ وہ تیار ہوکر جیپ میں سوار ہوگئے۔

"کیا یہ لاشیں یہیں پڑی رہیں گی؟" نیلم نے پوچھا۔

"ہاں' انہیں کتوں اور بھیڑیوں کی خوراک بننے دو۔" طارق نے اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے ڈیش بورڈ کے خانے میں ہاتھ ڈال کر کچھ کاغذات نکال لئے اور ہیڈ لیمپ روشن کرکے نیچے اتر آیا۔ ہیڈ لیمپس کی روشنی میں اس نے کاغذات کا جائزہ لیا۔ ایک لاگ بک تھی جس سے پتا چلا کہ یہ پیٹرولنگ جیپ تھی جو جموں سے اودھم پور کے درمیان گشت کرتی رہتی تھی۔ اس جیپ کا تعلق جموں کے ایک فوجی یونٹ سے تھا۔

جن فوجیوں کی وردیاں انہوں نے پہنی تھیں ان کی جیبوں میں ان کی پاس بکس بھی موجود تھیں۔ اس نے دونوں پاس بکس کا جائزہ بھی لے لیا تھا۔ پھر اس نے اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کردیا۔ نیلم نے دونوں فوجیوں کی سب مشین گنیں بھی اٹھا کر جیپ میں رکھ لی تھیں۔

پہاڑیوں سے نکل کر وہ پکی سڑک کی طرف روانہ ہوگئے لیکن طارق نے سڑک پر پہنچنے کے لیے انجیوں کے باغ والا راستہ اختیار کرنے کے بجائے جیپ کو ایک اور کچے راستے پر موڑ دیا۔ اس طرح چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور ٹیلوں میں ایک طویل چکر کاٹنے کے بعد جب وہ پختہ سڑک پر پہنچے تو ہندو کے اس ہوٹل سے کئی میل دور نکل چکے تھے۔ سڑک پر پہنچتے ہی طارق نے جیپ کا رخ اودھم پور کی طرف موڑ دیا۔

اودھم پور تک راستے میں انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ شہر سے تقریباً دو میل پہلے طارق نے جیپ روک لی۔ آگے ایک چیک پوسٹ تھی اور طارق جانتا تھا کہ اس چیک پوسٹ پر بڑی سخت چیکنگ ہوتی تھی۔ وہ اگرچہ فوجی جیپ میں تھے اور فوجی وردی میں تھے لیکن کوئی معمولی سی بات انہیں موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی۔ طارق دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر رکھے خاموش بیٹھا سوچ رہا تھا کہ یکایک اس کے دماغ میں جھماکا سا ہوا اور وہ گہری نظروں سے نیلم کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" نیلم نے پوچھا۔

"کپڑے اُتارو۔" طارق بولا۔

"کک۔ کیا بک رہے ہو؟" نیلم بدحواس ہوگئی۔

"ہم... میرا مطلب ہے' یہ فوجی وردی اُتار دو۔ چیک پوسٹ سے گزرنے کی ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔" طارق نے کہا۔

نیلم پوری طرح اس کا مطلب نہیں سمجھ سکی تھی لیکن اس نے بہرحال طارق کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے فوجی وردی اُتار دی۔ وردی کے نیچے اس کا اپنا لباس موجود تھا۔ طارق نے فوجی وردی جیپ کی سیٹ کے نیچے چھپادی اور ایک بار پھر نیلم کی طرف دیکھنے لگا۔

"اب کیا دیکھ رہے ہو' کیا میرے یہ کپڑے بھی اُتروانا چاہتے ہو؟" نیلم نے اسے گھورا۔

"ایسی ہی بات ہے۔ اگر تم خود کپڑے نہیں اتاروگی تو یہ کام مجبوراً مجھے خود کرنا پڑے گا۔" طارق بولا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا؟" نیلم غرائی۔

"یہی سمجھ لو" طارق کہتے ہوئے اچانک ہی نیلم پر جھپٹ پڑا۔

نیلم کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کررہی تھی مگر طارق پر جیسے جنون سا طاری ہوچکا تھا۔ وہ نیلم کا لباس نوچ رہا تھا۔ نیلم نے اسے پیچھے دھکا دینے کی کوشش کی۔ طارق کا ہاتھ اس کے گریبان پر تھا۔ ایک زوردار جھٹکا لگنے سے نیلم کی قمیص سامنے سے پھٹ گئی۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے نیلم کا ایک کندھا بھی برہنہ ہوگیا۔ نیلم اپنے آپ کو بچانے کی جدوجہد کررہی تھی۔ اس نے طارق کا منہ نوچ لیا۔ اس کے تیز ناخنوں نے

طارق کے چہرے پر کئی خراشیں ڈال دیں جن سے خون رِسنے لگا تھا۔ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش میں نیلم کے منہ سے ہلکی ہلکی چیخیں بھی نکل رہی تھیں۔ اس وقت اس کے ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی کہ شاید طارق کا دماغ خراب ہوگیا تھا۔ دہلی سے روانہ ہونے کے بعد سے ایسے کئی مواقع آئے تھے جب طارق اگر چاہتا تو نہایت آسانی سے اپنی ہوس کی پیاس بجھا سکتا تھا۔ دو تین مواقع تو ایسے بھی آئے تھے کہ وہ ایک ہی کمرے میں سوئے تھے لیکن طارق نے کبھی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس وقت تو شاید طارق کا دماغ ہی خراب ہوگیا تھا۔

اور پھر یکایک طارق نے اسے چھوڑ دیا۔ نیلم نے جیپ سے چھلانگ لگانے کی کوشش کی لیکن طارق نے اسے پکڑ لیا۔

"آرام سے بیٹھی رہو۔ ہم آگے چل رہے ہیں۔" طارق کا لہجہ بالکل نارمل تھا۔

نیلم نے ایک بار پھر چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ طارق کا انداز ایسا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

"یہ کیا حرکت تھی؟ میں تمہیں ایسا نہیں سمجھتی تھی۔" نیلم نے اسے گھورا اور پھٹی ہوئی قمیص سمیٹ کر اپنی برہنگی چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔

"یہ بہت ضروری تھا۔" طارق چہرے پر خراشوں سے رِستا ہوا خون پونچھتے ہوئے بولا "میں نے جو اسکیم سوچی ہے اس کے لیے یہ بہت ضروری تھا۔ میرے کہنے پر تم اپنے کپڑے تو پھاڑ دیتیں مگر یہ سب کچھ نہ ہوتا۔" اس نے اپنے چہرے کی طرف اشارہ کیا۔

"سکیم! کیسی اسکیم؟" نیلم نے اسے گھورا۔

طارق چند لمحے خاموش رہا پھر اسے اپنی اسکیم سمجھانے لگا۔ نیلم کے ہونٹوں پر بے اختیار ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ جیپ کے پچھلے حصے میں ایک رسّی پڑی ہوئی تھی۔ طارق نے وہ رسّی اٹھائی اور نیلم کے دونوں ہاتھ ڈیش بورڈ کے ساتھ لگے ہوئے ایک پائپ کے ساتھ باندھ دیے۔ ایک انچ قطر کا یہ پائپ نجانے کس مقصد سے لگایا گیا تھا لیکن اس وقت طارق کے کام آگیا تھا۔ نیلم سیٹ پر اُکڑوں سی بیٹھی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ پائپ سے بندھے ہوئے تھے۔ اس کا سینہ اور کندھا برہنہ ہو رہا تھا لیکن طارق نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں اور سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے انجن اسٹارٹ کردیا۔

چیک پوسٹ کی روشنیاں دور ہی سے نظر آرہی تھیں۔ طارق نے جیپ کی رفتار کم کردی۔ یہ عارضی چیک پوسٹ تھی۔ سڑک کے کنارے دو خیمے لگے ہوئے تھے۔ ایک آہنی زنجیر لگا کر سڑک بند کردی گئی تھی۔ دو بھارتی فوجی سب مشین گنیں سنبھالے بیریر کے قریب کھڑے تھے۔ بیریر سے ذرا ہٹ کر ایک مشین گن نصب تھی۔ اس پر بھی ایک چاق و چوبند فوجی بیٹھا ہوا تھا۔ اس چیک پوسٹ پر روشنی کے لیے ایک پورٹیبل جنریٹر استعمال کیا جا رہا تھا جس کے چلنے کی آواز خاموش فضا میں گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ طارق نے بیریر کے قریب جیپ روک لی۔ ایک فوجی جیپ کے قریب آگیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں سب مشین گن تھی۔ وہ جیپ کی سیٹ پر بندھی ہوئی نیلم کو دیکھ کر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ پھر اس نے طارق کی طرف دیکھا۔ اس کے جسم پر سیکنڈ لیفٹیننٹ کی وردی دیکھ کر اس کا ایک ہاتھ بے اختیار سیلوٹ کے لیے اٹھ گیا۔

"اس چیک پوسٹ کا انچارج کون ہے؟" طارق نے رعب دار لہجے میں پوچھا۔

"سیکنڈ لیفٹیننٹ بھوج کمار۔ وہ اس وقت اپنے خیمے میں ہیں سر۔ لیکن آپ کے چہرے پر خون..... کیا آپ زخمی ہیں سر؟" فوجی نے کہا۔

"چہرے پر معمولی سی خراشیں ہیں۔" طارق نے جیپ سے اُترتے ہوئے جواب دیا "مجھے اپنے آفیسر کے پاس لے چلو۔" اس نے نیلم کو بھی کھول کر نیچے اتار لیا تھا۔

بلبوں کی تیز روشنی میں نیلم کے جسم کے برہنہ حصے کُندن کی طرح چمک رہے تھے۔ آس پاس کھڑے ہوئے فوجیوں کی بھوکی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ طارق، نیلم کو دھکے دیتا ہوا اس خیمے کی طرف لے گیا جس کی طرف فوجی نے اشارہ کیا تھا۔

اس وقت رات کے دس بج چکے تھے۔ چیک پوسٹ پر متعین فوجی اس جیپ کو دیکھ کر مطمئن ہوگئے تھے۔ مورچے میں مشین گن پر بیٹھا ہوا فوجی بھی اٹھ کر کسی طرف چلا گیا تھا جبکہ دوسرے فوجیوں نے بھی اپنی رائفلیں کندھوں سے لٹکالی تھیں یا ایک طرف رکھ دی تھیں۔ خیمے تک پہنچتے ہوئے طارق صورت حال کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا۔ جب وہ خیمے میں داخل ہوا تو اس چیک پوسٹ کا انچارج اپنے دو جونیئر ماتحتوں کے ساتھ بیٹھا شراب کی چسکیاں لیتے ہوئے اپنی بہادری کے قصے سُنا رہا تھا۔ طارق اور اس کے ساتھ ایک نیم برہنہ عورت کو دیکھ کر وہ چونک گیا۔

"میں سیکنڈ لیفٹیننٹ کرن سنگھ ہوں۔" طارق اسے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر بول پڑا "میرا تعلق جموں کی ڈوگرہ یونٹ سے ہے۔ میں اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ پیٹرولنگ پر تھا۔ ہم راستہ بھٹک گئے۔ یہاں سے چند میل دور اچانک ہی کشمیری دہشت گردوں کے ایک گروہ نے ہم پر حملہ کردیا جس سے میرے دونوں ماتحت ہلاک ہوگئے۔ حملہ آور دہشت گرد اگرچہ بھاگنے میں کامیاب ہوگئے مگر ان کی یہ ساتھی میرے ہاتھ لگ گئی۔ بڑی مشکل سے اسے قابو کیا تھا۔ میرے لیے جموں واپس پہنچنا خطرناک ثابت ہوسکتا تھا اس لیے میں قیدی کو لے کر یہاں آگیا ہوں۔"

"بہت اچھا کیا تم نے لیفٹیننٹ کرن سنگھ۔" بھوج کمار نے کہا۔ نیلم کو نیم برہنہ حالت میں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ہوس کی چمک ابھر آئی تھی "اس جیسے قیدی کی تو ہمیں شدید ضرورت تھی۔" اس

نے آگے بڑھ کر نیلم کو دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا۔ اس کی ہوس بھری نظریں نیلم کے جسم کے برہنہ حصوں پر رینگ رہی تھیں "بہت جاندار چیز لائے ہو کرن سنگھ۔ آج رات ہم جشن منائیں گے اور اس جشن میں تم بھی شریک ہو گے۔"

"اس چیک پوسٹ پر کتنے آدمی ہیں بھوج کمار؟" طارق نے پوچھا۔

"دس" بھوج کمار نے جواب دیا "وہ سب کے سب کئی روز سے پیاسے ہیں۔ آج ان کی بھی پیاس بجھ جائے گی لیکن پہلے۔ میں۔"

"ہم دونوں" طارق نے مسکراتے ہوئے کہا "مزہ آجائے گا۔"

"ٹھیک ہے، ہم دونوں۔" بھوج کمار نے کہا پھر اپنے دونوں ماتحتوں سے مخاطب ہوا "تم دونوں باہر جاؤ اور اپنی باری کا انتظار کرو۔"

بھوج کمار کے دونوں ماتحت خیمے سے نکل گئے۔ طارق نے خیمے کے دروازے کا پردہ برابر کر دیا۔ بھوج کمار، نیلم کے جسم کو اس طرح ٹٹول رہا تھا جیسے قصائی بکری کو ٹٹولتا ہے۔ خیمے میں ایک طرف پائپ کا اسپرنگوں والا سنگل بیڈ بچھا ہوا تھا۔ بھوج کمار نے نیلم کو پکڑ کر پلنگ پر پھینک دیا۔ نیلم کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ بھوج کمار قہقہہ لگاتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔ اس دوران نیلم پلنگ سے اُٹھ گئی تھی۔ بھوج کمار نے اسے دبوچ لیا۔

"چھوڑ دو۔ چھوڑ دو مجھے کمینے ... ذلیل۔" نیلم چیخ رہی تھی۔

طارق چند لمحے اپنی جگہ پر کھڑا رہا پھر آہستہ آہستہ بھوج کمار کی طرف بڑھنے لگا۔ نیلم کی اب تک کی چیخ و پکار یہ تاثر دینے کے لیے کافی تھی کہ اس کے ساتھ زیادتی ہو رہی تھی۔ طارق نے آگے بڑھ کر اچانک ہی بھوج کمار کو گردن سے دبوچ لیا۔ بھوج کمار اس صورت حال سے گڑبڑا گیا۔ اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی مگر طارق کی گرفت سخت سے سخت تر ہوتی چلی گئی۔ نیلم ایک طرف کھڑی دیکھ رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد ہی بھوج کمار کی زبان لٹک گئی، آنکھیں حلقوں سے اُبل پڑیں۔ طارق نے ایک زوردار جھٹکا دیا۔ کڑک کی ہلکی سی آواز ابھری۔ بھوج کمار کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ طارق نے اسے مزید کچھ دیر تک دبوچے رکھا پھر پلنگ پر پھینک دیا۔

خیمے میں بھوج کمار کے ذاتی سامان کے علاوہ چند مشین گنیں اور ایمونیشن کی تین پیٹیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ دو پیٹیوں میں سب مشین گنوں کے میگزین تھے اور ایک میں ہینڈ گرنیڈ بھرے ہوئے تھے۔ طارق نے جیکٹ کی دونوں جیبوں میں دو دو ہینڈ گرنیڈ ٹھونس لیے اور ایک سب مشین گن اٹھالی۔ اس دوران نیلم بھی ایک سب مشین گن اٹھا چکی تھی۔ طارق نے خیمے کے پردے سے جھانک کر دیکھا، کچھ فوجی ایک جگہ پر بیٹھے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ دو سڑک پر بیریر کے قریب کھڑے تھے۔

طارق نے نیلم کو اشارہ کیا۔ وہ خیمے سے نکل کر رینگتے ہوئے پچھلی طرف چلے گئے۔ دوسرے خیمے کے اوپر سے گھوم کر طارق اس طرف پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا جہاں ریت کی بوریوں سے بنے ہوئے مورچے میں بھاری مشین گن نصب تھی۔ نیلم بھی سب مشین گن سنبھالے اس کے ساتھ ساتھ رینگ رہی تھی۔ وہ ابھی مورچے سے پانچ گز دور تھے کہ ایک فوجی نے نیلم کو دیکھ لیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ چیخ اٹھا۔

"ارے وہ بھاگ رہی ہے، پکڑو اسے۔"

اس سے پہلے کہ دوسرے فوجی کچھ سمجھ سکتے، طارق اور نیلم نے فائر کھول دیا۔ خاموش فضا فائرنگ کی خوف ناک آواز سے گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی چند چیخیں بھی سنائی دی تھیں۔ دو تین فوجیوں کو سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے بھی فائرنگ شروع کر دی۔ طارق نے ہیوی مشین گن کی طرف چھلانگ لگا دی اور پھر دوسرے ہی لمحے مشین گن بجلی کی طرح کڑکنے لگی۔ طارق مشین گن کو دائیں بائیں حرکت دیتے ہوئے فائر کر رہا تھا۔ مشین گن کا بیلٹ بڑی تیزی سے چل رہا تھا۔ اس دوران نیلم بھی اس کے قریب پہنچ گئی۔ نیلم نے طارق کی جیکٹ کی جیب سے ایک ہینڈ گرنیڈ نکالا، دانتوں سے اس کی پن کھینچی اور ہینڈ گرنیڈ پوری قوت سے اس طرف اچھال دیا جہاں سے ان پر فائرنگ ہو رہی تھی۔ کان پھاڑ دینے والا ایک زوردار دھماکا ہوا اور فائرنگ کرنے والوں کے پرخچے اُڑ گئے۔ طارق نے ایک ہینڈ گرنیڈ خیموں کی طرف اچھال دیا۔ دوسرے خیمے میں غالباً اسلحہ بارود بھرا ہوا تھا۔ پے در پے دھماکے ہونے لگے۔ طارق اور نیلم ریت کی بوریوں کے پیچھے دبکے رہے۔ آخر کار دھماکے بتدریج کم ہونے لگے۔

"نیلم! بھاگو، جیپ کی طرف۔ وہ ابھی تک محفوظ ہے۔" طارق نے کہا اور پھر وہ دونوں مورچے سے نکل کر جیپ کی طرف دوڑے۔ جیپ سڑک کے کنارے پر کھڑی تھی۔ اس سے ذرا آگے چٹان نما ایک بہت بڑا پتھر تھا۔ جیپ اور خیموں کے درمیان اگر وہ پتھر نہ ہوتا تو جیپ بھی تباہ ہو چکی ہوتی۔ طارق نے اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھتے ہی انجن اسٹارٹ کر دیا۔ نیلم بھی اچھل کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور جیپ ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ بیریر سے کئی گز آگے نکل جانے کے بعد نیلم نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ کیمپ میں آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے اور اِکّا دُکّا دھماکے اب بھی ہو رہے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ ان میں سے کوئی بھی نہیں بچا۔ سب کے سب ختم ہو گئے۔" نیلم نے کیمپ سے اٹھتے ہوئے شعلوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ان خون آشام بھیڑیوں کو ختم ہونا ہی چاہیے تھا۔" طارق نے کہتے ہوئے نیلم کی طرف دیکھا۔ خیمے میں لیفٹیننٹ بھوج کمار

سے دھینگا مشتی میں نیلم کی قمیص کچھ اور پھٹ گئی تھی۔ وہ اوپن شرٹ کی طرح سامنے سے بالکل کھلی ہوئی تھی اور اس کا سینہ اور پیٹ بالکل برہنہ ہو رہا تھا مگر نیلم کو شاید ابھی تک اس کا احساس نہیں ہوا تھا۔ ڈیش بورڈ کی مدھم سی روشنی میں طارق چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر ایک دم سنبھل گیا "تم پچھلی سیٹ پر جا کر یونیفارم پہن لو۔ تمہاری قمیص تو بالکل پھٹ چکی ہے۔ میرا خیال ہے اسے اب اُتار ہی دو۔" اس نے کہا۔

نیلم کو یکایک اپنی برہنگی کا احساس ہوا۔ اس نے پھٹی ہوئی قمیص کے دونوں پلوؤں کو سمیٹ لیا اور پچھلی سیٹ پر آگئی۔ بھارتی فوج کی وردی سیٹ کے نیچے موجود تھی۔ اس نے وردی نکالی اور سیٹ پر بیٹھے بیٹھے پہننے لگی۔ چند سیکنڈ بعد وہ دوبارہ اگلی سیٹ پر آگئی۔

"یہ دھماکے آس پاس بھی سُنے گئے ہوں گے۔ عین ممکن ہے کہ فوج کا کوئی دستہ صورت حال معلوم کرنے کے لیے روانہ ہو چکا ہو۔ ایسی صورت میں شہر کی طرف سفر جاری رکھنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں شہر سے پہلو بچا کر نکل جانا چاہیے۔" طارق نے کہا۔

"اگر ان پہاڑوں میں راستہ بھٹک گئے تو؟" نیلم نے خدشہ ظاہر کیا۔

"یہ رسک تو لینا ہی پڑے گا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کوئی راستہ کہیں نہ کہیں ضرور جاتا ہے۔ ہر راستے کی ایک منزل ضرور ہوتی ہے۔" طارق بولا۔

"اور وہ منزل خواہ موت کا بھیانک جبڑا ہی کیوں نہ ہو۔" نیلم نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "لیکن میرے خیال میں ہمارے لیے سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ مجاہدین ہمیں بھارتی فوجی سمجھ کر ہم پر حملہ نہ کر دیں۔ اگر بھارتی فوجیوں نے بھی اس جیپ کی تلاش شروع کر دی تو ہمارے لیے دونوں طرف سے خطرہ ہو گا۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ ہم جلد سے جلد اس جیپ سے نجات حاصل کر لیں۔"

"اس جیپ سے تو ہم اس وقت تک فائدہ اٹھائیں گے جب تک اس کی ٹنکی میں تیل کا ایک بھی قطرہ موجود ہے اور میرے خیال میں اس میں ابھی اتنا تیل موجود ہے کہ ہم ساٹھ ستر میل کا فاصلہ طے کر سکیں۔" طارق نے جواب دیا۔

"وہ دیکھو' نشیب میں دائیں طرف۔" نیلم نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

طارق نے گردن گھما کر اس طرف دیکھا۔ وہ دو گاڑیوں کے ہیڈ لیمپس کی روشنیاں تھیں۔ طارق کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ فوجی ٹرک تھے جو چٹانوں میں بل کھاتی ہوئی سڑک پر اسی طرف آ رہے تھے۔ اس نے فوراً ہی جیپ کے ہیڈ لیمپس بجھا دیے اور رفتار کم کر کے متجسس نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ بائیں طرف چٹانوں میں اسے ایک تنگ سا راستہ نظر آگیا۔ اس نے جیپ کو اس راستے پر موڑ دیا اور تقریباً بیس گز آگے جا کر ایک بہت بڑے پتھر کے پیچھے جیپ روک دی اور نیلم کو اشارہ کرتے ہوئے اپنی سب مشین گن سنبھالے نیچے کود گیا۔ نیلم نے بھی گن اٹھا کر جیپ سے چھلانگ لگا دی۔

"اس طرف میرے ساتھ آؤ۔" طارق نے کہا۔

وہ دونوں تاریکی میں بڑے بڑے پتھروں میں چکراتے ہوئے جیپ سے تقریباً بیس گز دور ایک چٹان پر ایسی جگہ بیٹھ گئے جہاں سے جیپ بھی ان کی نظروں میں تھی اور سڑک سے آنے والا وہ تنگ سا راستہ بھی۔ ویسے طارق کو یقین تھا کہ سڑک پر سے گزرتے ہوئے جیپ کو نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

وہ دونوں ان متحرک روشنیوں کو دیکھنے لگے جو لمحہ بہ لمحہ قریب پہنچ رہی تھیں۔ فضا میں گرر گرر کی آواز بدستور سنائی دے رہی تھی۔ آواز خاصی بھاری تھی جس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ ٹرک ہی تھے۔

تقریباً دس منٹ بعد دو فوجی ٹرک ان کے سامنے سڑک پر سے گزر گئے۔ دونوں ٹرکوں پر آگے بھاری مشین گنیں نصب تھیں۔ فوجیوں کی تعداد کا اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا۔

دونوں ٹرک جب تقریباً سو گز آگے نکل کر ایک موڑ پر نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو وہ دونوں چٹان سے اُتر کر جیپ پر آ گئے اور چند سیکنڈ بعد جیپ ایک بار پھر سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

اب نشیب میں شہر کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں لیکن اس طرف جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ آخر کار طارق نے جیپ کا رخ دائیں طرف ایک کچے راستے کی طرف گھما دیا۔ یہ راستہ اودھم پور کے اوپر سے گھومتا ہوا دوبارہ چنینی کی طرف جانے والی سڑک سے مل گیا تھا۔ اس طرح اگرچہ کئی میل کا چکر پڑ گیا تھا لیکن وہ خطرے سے محفوظ رہے۔

چنینی نامی چھوٹے سے اس شہر کو بھی انہوں نے اسی طرح پیچھے چھوڑ دیا۔ اب ان کا رخ دریائے چناب کی طرف تھا۔ ابھی انہوں نے چنینی سے چند ہی میل کا فاصلہ طے کیا تھا کہ جیپ کا انجن کھانسنے لگا۔ طارق گیئر بدل بدل کر انجن کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن جیسے ہی اس کی نظر ڈیش بورڈ پر پڑی اس کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ فیول بتانے والی سوئی زیرو پر ساکت ہو چکی تھی۔ جیپ کی رفتار خود بخود کم ہوتی چلی گئی اور آخر کار رک گئی۔

"کیا ہوا؟" نیلم نے پوچھا۔

"پیٹرول ختم ہو گیا۔" طارق نے جواب دیا۔

"اب کیا ہو گا؟" نیلم کے لہجے میں تشویش تھی۔

"پیدل مارچ۔ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔" طارق نے کہا۔

"میرا خیال ہے دریائے چناب کا پُل چند میل سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اگر ہم دریا تک پہنچ جائیں تو ڈوڈا تک پہنچنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی لیکن سب سے بڑا مسئلہ راستے کا تعین ہے۔" طارق نے کہا۔

"کیوں نہ اسی راستے پر چلتے رہیں۔" نیلم نے مشورہ دیا۔

"ٹھیک ہے' چلو۔" طارق نے جواب دیا۔ ان دونوں نے اپنی اپنی سب مشین گنیں اٹھا کر کندھوں پر لٹکائیں اور جیپ سے اُتر کر آگے چلنے لگے۔ طارق کی جیب میں دو عدد ہینڈ گرنیڈ بھی تھے جنہیں اس نے بڑی احتیاط سے سنبھال رکھا تھا۔ تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد نیلم ہانپ گئی۔ اونچے نیچے راستوں پر چلنا اس کے لیے خاصا تکلیف دہ ہو رہا تھا۔ کندھے پر لٹکی ہوئی سب مشین گن بھی اب اسے بوجھ محسوس ہو رہی تھی۔ طارق نے گن لے کر اپنے دوسرے کندھے پر لٹکالی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر چلنے لگا۔ تقریباً دو فرلانگ کا فاصلہ اور طے ہو گیا۔ نیلم کے لیے اب ایک قدم اٹھانا بھی محال ہو رہا تھا۔ وہ بری طرح لڑکھڑا رہی تھی۔ آخر کار ایک جگہ ڈھیر ہو گئی۔ طارق بھی اس کے قریب بیٹھ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پھر اچانک اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ وہ کوئی بہت ہی مدھم سی روشنی تھی جو نشیب میں نظر آ رہی تھی۔

"نیلم! وہ دیکھو' نشیب میں روشنی نظر آ رہی ہے۔ میرا خیال ہے وہ کسی کاشتکار کا مکان ہے۔ ہمت سے کام لو' وہاں پہنچ کر ہمیں محفوظ جگہ مل سکتی ہے۔" طارق نے کہا۔

نیلم نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ ٹمٹماتی ہوئی روشنی خاصی دور نظر آ رہی تھی۔

"اب مجھ سے ایک قدم بھی نہیں اٹھایا جائے گا۔" نیلم نے کراہتے ہوئے جواب دیا "ذرا رک جاؤ' مجھے دم لینے دو۔"

"اگر کہو تو میں تمہیں کندھے پر اٹھالوں۔" طارق بولا۔

"نہیں۔ بس چند منٹ رک جاؤ۔" نیلم نے کہا۔

دس منٹ گزر گئے۔ نیلم کا سانس اب قدرے معمول پر آ چکا تھا۔ طارق نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور وہ آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ فضا میں ایک مخصوص بھینی بھینی سی مہک رچی ہوئی تھی۔ یہ دھان کے پودوں کی خوشبو تھی۔ ریاست میں کہیں کہیں دھان بھی کاشت ہوتا تھا۔ اس موسم میں آس پاس کی فضا میں مسحور کن مہک رچی رہتی تھی۔

وہ نشیب میں پہنچ گئے۔ روشنی اب تقریباً سو گز کے فاصلے پر رہ گئی تھی۔ نیلم ایک بار پھر لڑکھڑانے لگی۔ طارق اسے سہارا دے کر تقریباً گھسیٹتا ہوا لے جا رہا تھا۔

"ہمت کرو نیلم! اب زیادہ فاصلہ نہیں رہ گیا۔ وہ دیکھو' روشنی بالکل قریب نظر آ رہی ہے۔" طارق نے اسے حوصلہ دلایا۔

"تم چلے جاؤ۔ مجھے یہیں چھوڑ دو' پلیز!" نیلم کراہی۔

طارق رک گیا۔ چند منٹ بعد وہ پھر نیلم کو گھسیٹنے لگا۔ روشنی اب صرف بیس گز کے فاصلے پر رہ گئی تھی۔ طارق رک گیا۔ نیلم نیچے گر کر ہانپنے لگی۔ اس کے منہ سے کف بہہ رہا تھا۔ طارق سیدھا ہو کر روشنی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ کسی مکان کی کھڑکی تھی جس میں سے روشنی نظر آ رہی تھی۔ اس نے غور سے دیکھا تو تاریکی میں دو مکانوں کے ہیولے نظر آئے۔ ایک مکان تو وہی تھا جس کی کھڑکی میں روشنی نظر آ رہی تھی اور دوسرا مکان اس سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر تھا۔

طارق' نیلم کے قریب بیٹھ گیا۔ دس منٹ گزر گئے۔ نیلم اب چلنے کے قابل ہو گئی تھی۔ طارق نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور اس کا ہاتھ پکڑے آہستہ آہستہ مکان کی طرف چلنے لگا۔ اس طرح آگے بڑھنا اگرچہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا لیکن نیلم کی حالت دیکھتے ہوئے اس نے ساری احتیاطوں کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔

ابھی انہوں نے چند ہی قدم کا فاصلہ طے کیا تھا کہ بیک وقت دائیں اور بائیں طرف سے آہٹ سنائی دی۔ طارق نے دائیں طرف دیکھا۔ اسی لمحے ایک خوف ناک غراہٹ اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"اپنے ہاتھ اوپر اٹھالو۔ اور اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا ورنہ چھلنی کر دیئے جاؤ گے۔ تم چاروں طرف سے گھیرے میں ہو۔"

نیلم کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی جبکہ طارق کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا تھا۔ اس نے گردن گھما کر دائیں بائیں اور پیچھے دیکھا۔ تین آدمی دائیں طرف تھے' تین بائیں طرف اور دو پیچھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفلیں تھیں جن کے رخ انہی کی طرف تھے۔ سب کے چہروں پر ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے۔ پیچھے کھڑے ہوئے دو آدمیوں میں سے ایک نے ٹارچ روشن کر لی اور پھر ان کے جسموں پر بھارتی فوج کی وردیاں دیکھ کر سب کے ہونٹوں سے سیٹیاں نکل گئیں۔

"اوہ! تو تم لوگوں کو اطلاع مل چکی ہے۔ لیکن فکر مت کرو ہم نمٹ لیں گے۔" دائیں طرف سے ایک آدمی نے کہا پھر اپنے کسی ساتھی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا "شہروز! ان کے کندھوں سے رائفلیں اتار لو اور انہیں اندر لے چلو' ان سے یہ پوچھنا ہے کہ ان کے دوسرے ساتھی کہاں ہیں اور کتنی دیر میں یہاں پہنچنے والے ہیں۔"

پیچھے کھڑے ہوئے شہروز نے ان کے کندھوں سے سب مشین گنیں اتار لیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے طارق کے کولہے پر زور دار ٹھوکر رسید کر دی۔ طارق بری طرح لڑکھڑا گیا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔

وہ لوگ انہیں رائفلوں کی زد پر لیے مکان کے ایک کمرے میں آ گئے۔ یہ وہی کمرا تھا جس کی کھڑکی سے روشنی دیکھ کر وہ اس طرف آئے تھے۔ کھڑکی میں ایک لالٹین لٹکی ہوئی تھی۔ روشنی میں نیلم کو دیکھتے ہی وہ لوگ بری طرح چونک گئے۔ نیلم کی ٹوپی راستے میں کہیں

گر گئی تھی اور اس کے سیاہ ریشمی بال پُشت پر بکھرے ہوئے تھے۔
"اوہ!" ایک آدمی نے کہا "تو تم لوگ عورتوں کو بھی میدانِ جنگ میں لے آئے ہو۔"
"ہم وہ نہیں ہیں جو تم لوگ سمجھ رہے ہو۔" طارق نے کہا۔
"ابھی دس منٹ میں پتا چل جائے گا کہ تم لوگ کون ہو۔ شمروز! انہیں دوسرے کمرے میں لے چلو۔" اس آدمی نے کہا۔ وہ غالباً ان کا لیڈر تھا اور طارق کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ مجاہدین تھے۔
وہ لوگ انہیں دھکیلتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے آئے۔ اب تک جو لوگ طارق کے سامنے آئے تھے ان کی تعداد دس تھی اور ان میں سے کسی نے بھی ابھی تک اپنا چہرہ بے نقاب نہیں کیا تھا۔ سب کے چہروں پر مفلر یا رومال بندھے ہوئے تھے۔ صرف آنکھیں برہنہ تھیں۔
سات آدمی پہلے کمرے میں رہ گئے تھے جبکہ تین ان کے ساتھ دوسرے کمرے میں آ گئے تھے۔ ان میں ایک تو وہی تھا جسے شمروز کے نام سے پکارا گیا تھا۔ دوسرا وہ جو اب تک احکامات جاری کرتا رہا تھا۔ وہی مجاہدین کی اس پارٹی کا لیڈر تھا۔ اسے اب تک صرف ایک مرتبہ گوہر علی کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا۔ وہ تینوں انہیں آٹومیٹک رائفلوں کی زد پر لیے ہوئے تھے۔ یہ کمرا دس فٹ چوڑا اور بارہ فٹ لمبا تھا۔ اس میں صرف ایک روشندان کے علاوہ کوئی کھڑکی یا دروازہ وغیرہ نہیں تھا۔ صرف وہی ایک دروازہ تھا جو ساتھ والے کمرے میں کھلتا تھا۔
یہ مکان مکمل طور پر لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ اس کا فرش بھی لکڑی کا تھا۔ فرش پر ایک ایک فٹ چوڑے اور تین تین فٹ لمبے تختے جڑے ہوئے تھے۔ بعض تختے ٹوٹ چکے تھے لیکن اس کے باوجود وہ اپنی جگہ پر جمے ہوئے تھے۔
"کیا تم لوگ شرافت سے بتانا پسند کرو گے یا اس کے لیے ہمیں کچھ کوشش کرنا پڑے گی؟" پارٹی کے لیڈر گوہر نے باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ آخر میں اس کی نظریں طارق کے چہرے پر جم گئی تھیں۔
"میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ ہم وہ نہیں ہیں جو تم لوگ سمجھ رہے ہو۔" طارق نے جواب دیا۔
"تو پھر بتاؤ تم لوگ کون ہو؟" گوہر نے اسے گھورا۔
"میرا نام طارق سعید ہے۔ میں باغ کا رہنے والا ہوں اور میرا تعلق لبریشن فرنٹ سے ہے۔ اگر تمہاری پارٹی کا تعلق بھی لبریشن فرنٹ سے ہے تو تم رحمان بابا سے اس کی تصدیق کر سکتے ہو۔ اگر لبریشن فرنٹ کے علاوہ کسی اور تنظیم سے تعلق رکھتے ہو تو بھی میرے بیان کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ تمام تنظیموں کا مقصد ایک ہی ہے 'کشمیر کی آزادی۔" طارق نے کہا۔
"کیا نام بتایا تم نے؟" گوہر نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔
"طارق سعید۔" طارق نے جواب دیا۔
"میرا تعلق حزب المجاہدین سے ہے لیکن دوسری تنظیموں سے بھی ہمارا رابطہ ہے اور ہم ایک دوسرے کے بارے میں معلومات بھی رکھتے ہیں۔ مگر جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' طارق نامی ایک نوجوان کو لبریشن فرنٹ نے ایک اہم مشن پر دہلی بھیجا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور نوجوان بھی تھا۔ میں اس وقت اس کا نام بھول رہا ہوں۔ اس بات کو تقریباً ساڑھے چار سال ہو چکے ہیں۔ وہ دونوں دہلی پہنچنے کے چند روز بعد گرفتار ہو گئے تھے۔"
"اس کا نام سلیم تھا۔" طارق نے جواب دیا "ہم چار سال تک دہلی کی تہاڑ جیل میں رہے۔ پھر فرار کی کوشش میں میرا دوست سلیم شہید ہو گیا اور میں دہلی میں موجود لبریشن فرنٹ کے ساتھیوں کے ساتھ مل کر مختلف سرگرمیوں میں حصہ لیتا رہا۔ پھر مجھے سرینگر پہنچنے کے لیے کہا گیا۔ جس روز ہم دہلی سے فرار ہوئے اس روز فرنٹ کے دہلی کے خفیہ اڈے پر چھاپا پڑا اور ہمارے بہت سے ساتھی شہید ہو گئے۔ میں کچھ ہمدردوں کی مدد سے امرتسر کے راستے پاکستان کی سرحد عبور کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تین چار روز پہلے ہم جموں پہنچے تھے۔ جموں سے چند میل دور ایک چھوٹی سی بستی......"
"ٹھیک ہے۔ چلو مان لیا کہ تم طارق سعید ہو لیکن یہ عورت کون ہے اور بھارتی فوج کی یہ وردی!" گوہر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
"وہی بتانے جا رہا ہوں۔" طارق نے کہا اور جموں سے روانگی سے لے کر اب تک کے واقعات کی تفصیل بتا دی۔
"اوہ! تو وہ چوکی تم دونوں نے اُڑائی ہے؟" گوہر چونک گیا۔
"ہاں" طارق نے مختصر سا جواب دیا۔
"ہمارے چند ساتھی یہاں آنے والے ہیں۔ ہمیں دراصل انہی کا انتظار تھا۔ آنے والی پارٹی میں دو نوجوان ایسے بھی ہیں جو پانچ سال پہلے لبریشن فرنٹ میں تھے۔ اگر انہوں نے تمہیں شناخت کر لیا تو ہم تم سے اپنے رویّے کی معافی مانگ لیں گے۔ بصورتِ دیگر تم اپنے انجام کا تصور بھی نہیں کر سکو گے۔ اس وقت تک تم دونوں کو اس کمرے میں رہنا ہو گا۔ اگر کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو زندہ نہیں بچو گے۔"
"ٹھیک ہے" طارق نے کہا "لیکن کیا ہمیں کچھ کھانے کو مل سکتا ہے؟ ہم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ بھوک اور تھکن سے میری ساتھی کی حالت بہت بگڑی ہو رہی ہے۔"
"اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا ہے۔" گوہر نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "بہرحال دیکھتا ہوں' اس سلسلے میں کیا ہو سکتا ہے۔"
وہ تینوں کمرے سے نکل گئے اور دروازہ بند کر دیا گیا۔ نیلم

دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ بھوک اور تھکن سے واقعی اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ تھکن کا غلبہ زیادہ تھا۔ چند سیکنڈ بعد ہی اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ طارق بھی اس کے قریب ہی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد دروازہ کھلا اور دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ ان میں ایک تو شہروز تھا جس نے رائفل سنبھال رکھی تھی اور دوسرے نے اُبلے ہوئے چاولوں سے بھرا ہوا ایک طشت اٹھا رکھا تھا۔ اس کے ساتھ دو پلیٹیں اور ایک پیالے میں شوربہ سا تھا۔

"جلدی میں یہ چاول اُبال دیے ہیں اور یہ رات کے کھانے سے بچا ہوا تھوڑا سا شوربہ تھا۔ اس سے گزارا کرلو۔" شہروز نے کہا۔

طارق نے نیلم کو جھنجوڑ کر اٹھا دیا۔ شہروز کا ساتھی پانی کا جگ بھی دے گیا تھا۔ ان دونوں کے باہر جانے کے بعد طارق اور نیلم نے چاول کھائے۔ شوربہ اگرچہ بہت ہی بدمزہ تھا لیکن انہوں نے کل صبح ناشتے کے بعد سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا' اس وقت اُبلے ہوئے چاول اور بدمزہ شوربہ بھی بہت اچھا لگ رہا تھا۔

مزید آدھا گھنٹا گزر گیا اور پھر دوسرے کمرے میں باتوں اور قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور تین چار آدمی اندر داخل ہوئے۔ ان میں ایک شہروز تھا' دوسرا گوہر اور باقی دو کی آنکھوں سے طارق نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اجنبی تھے۔ ان سب کے چہرے اب بھی نقابوں میں چھپے ہوئے تھے۔

"اسے پہچانتے ہو گلریز؟" گوہر نے اپنے ساتھ آنے والے ایک نقاب پوش سے کہا۔ اس کا اشارہ طارق کی طرف تھا۔

"ارے طارق!" گلریز اسے دیکھتے ہی اچھل پڑا "تم نے اگرچہ داڑھی رکھ لی ہے لیکن میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ لیکن تمہارے بارے میں تو سنا تھا کہ تم دہلی میں پکڑے گئے تھے اور تمہیں تہاڑ جیل میں بند کر دیا گیا تھا۔"

"کسی جیل کی دیواریں مجاہدین کو محصور نہیں رکھ سکتیں۔" طارق نے جواب دیا۔ اس کے منہ سے اطمینان کا سانس نکل گیا تھا۔ گلریز کا نام اگرچہ اس کے لیے جانا پہچانا تھا مگر وہ اس کا چہرہ ابھی تک نہیں دیکھ سکا تھا۔

گلریز نے چہرے پر لپٹا ہوا رومال ہٹا دیا۔ طارق نے اسے فوراً ہی پہچان لیا۔ وہ لبریشن فرنٹ میں اس کے ساتھ رہ چکا تھا اور دونوں بھارتی فوجیوں کے خلاف کئی کارروائیوں میں حصہ لے چکے تھے۔ گلریز دونوں بانہیں پھیلا کر آگے بڑھا اور طارق اس سے لپٹ گیا۔ گوہر اور اس کے ساتھیوں نے بھی اب چہروں سے نقاب اتار دیے اور وہ سب باری باری طارق سے معانقہ کرنے لگے۔

گوہر اس پارٹی کا انچارج تھا۔ اس کی عمر بیس اکیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ پارٹی کے دوسرے لڑکے بھی اسی کمرے میں آ گئے۔ اب ان کی مجموعی تعداد اٹھارہ تھی اور ان میں کوئی بھی بیس اکیس سال سے زیادہ عمر کا نہیں تھا۔ یہ سب کشمیری مجاہدین تھے جو اپنے وطن کی آزادی کے لیے سروں سے کفن باندھ کر میدان میں نکل آئے تھے۔ یہ ان کے کھیلنے اور پڑھنے کے دن تھے لیکن انہوں نے کندھوں پر رائفلوں اور مشین گنوں کا بوجھ اٹھا رکھا تھا۔ انہوں نے کسی ملٹری اکیڈمی سے تربیت حاصل نہیں کی تھی' کسی جنرل نے انہیں ٹریننگ نہیں دی تھی لیکن انہوں نے وادیٔ کشمیر میں بھارتی فوجیوں کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ یہ سرپھرے' نوعمر لڑکے بھارتی فوجی قافلوں یا چوکیوں پر بجلی بن کر گرتے اور قہر بن کر انہیں تباہ و برباد کرتے ہوئے نکل جاتے۔

وہ لوگ کچھ دیر تک طارق سے اس کے بارے میں پوچھتے رہے۔ طارق نے ان سے کوئی بات نہیں چھپائی۔ اب کچھ چھپانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ جب طارق نے بتایا کہ ادھم پور کے قریب فوجی چوکی اس نے اور نیلم نے تباہ کی تھی تو گلریز اچھل پڑا۔

"حیرت انگیز!" وہ بولا "یہ ایک یا دو آدمیوں کا کام نہیں تھا۔ اس چوکی پر دس بارہ فوجی تھے جو سب کے سب ختم ہو گئے اور گولہ بارود کا بہت بڑا ذخیرہ تباہ ہو گیا۔ بھارتی فوجیوں کا خیال ہے کہ مجاہدین کی کسی بہت بڑی پارٹی نے اس چوکی پر چھاپا مارا تھا۔ وہ آس پاس کے علاقوں میں مجاہدین کو تلاش کر رہے ہیں لیکن تم لوگ اتنی جلدی یہاں تک کیسے پہنچ گئے؟"

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ہم نے جموں کی ایک نواحی بستی میں چند بھارتی فوجیوں کو ہلاک کر کے یہ وردیاں اور جیپ حاصل کی تھی۔" طارق نے بتایا۔

"اوہ! تو وہ جیپ تمہاری تھی۔" گلریز بولا۔

"کون سی جیپ؟" گوہر نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہاں سے چند میل دور ہمیں ایک جیپ کھڑی ہوئی ملی تھی۔ ہم یہ سمجھے تھے کہ بھارتی فوجی آس پاس کہیں موجود ہیں۔ ہم پہلے تو گھات لگائے بیٹھے رہے پھر جیپ پر قبضہ کر لیا لیکن جیپ کسی طرح اسٹارٹ ہی نہیں ہو رہی تھی۔ آخر کار ہم نے اسے ایک گہرے کھڈ میں دھکیل دیا تاکہ بھارتی فوجی بھی اسے استعمال نہ کر سکیں۔" گلریز نے کہا۔

"جیپ میں پیٹرول ختم ہو گیا تھا جس کی وجہ سے ہم نے اسے چھوڑ دیا تھا۔" طارق نے جواب دیا پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "تم لوگوں کا کیا پروگرام ہے۔ کوئی خاص مہم؟"

گلریز اور گوہر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر گوہر نے کہا۔ "ڈوڈا میں بھارتی فوج نے ایک نئی چوکی قائم کی ہے جہاں گولہ بارود کی بہت بڑی مقدار جمع کی گئی ہے۔ اسے علاقے کا مرکزی اسلحہ ڈپو بنایا گیا ہے جہاں سے قرب و جوار کی چوکیوں اور فوج کی گشتی پارٹیوں کو اسلحہ سپلائی کیا جاتا ہے۔ آج ہم اس اسلحہ ڈپو پر

ریڈ کرنے والے ہیں۔"

"کس وقت؟" طارق نے پوچھا۔

"صبح چار بجے۔" گوہر نے بتایا "ہمیں گلریز اور اس کے ساتھیوں کا انتظار تھا۔ کچھ دیر بعد ہم یہاں سے روانہ ہونے والے ہیں۔"

"کیا مجھے اس مُہم میں شریک ہونے کی اجازت دی جا سکتی ہے؟" طارق نے کہا۔

"ہمیں خوشی ہوگی لیکن تمہاری یہ ساتھی....." گوہر نے نیلم کی طرف دیکھا۔

"اسے عورت جان کر کمزور مت سمجھو۔" طارق نے کہا "اودھم پور والی چوکی تباہ کرنے میں نیلم نے بڑی ذہانت اور دلیری کا مظاہرہ کیا تھا۔ ویسے بھی میں اسے یہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ اسے میرے ساتھ ہی سرینگر پہنچنا ہے۔"

"ٹھیک ہے، تم اپنی ذمے داری پر اسے ساتھ لے سکتے ہو۔" گوہر نے جواب دیا۔

"شکریہ لیکن ہمارے لیے کپڑے..."

"کپڑوں کا بندوبست ہو جائے گا۔" گوہر نے اس کی بات کاٹ دی۔

چند منٹ بعد ان کے لیے کپڑوں کا انتظام کر دیا گیا۔ نیلم کے لیے بھی مردانہ جوڑا فراہم کیا گیا تھا۔ پھر گوہر اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ اس کمرے میں ایک جگہ فرش کے تختے اُدھیڑنے لگا۔ تین تختے اُدھیڑے گئے۔ اس طرح تین مربع فٹ کا خلا سا بن گیا۔ تختوں کے نیچے زمین پر اتنی ہی لمبی چوڑی سیمنٹ کی ایک سل تھی جسے بڑی احتیاط سے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا گیا۔ اس کے نیچے تہ خانہ تھا۔ گوہر کے اشارے پر دو آدمی تہ خانے میں اتر گئے۔

کچھ ہی دیر بعد کمرے میں اسلحے کا ڈھیر لگ گیا۔ یہ اسلحہ اس تہ خانے سے نکالا گیا تھا۔ ان میں چار راکٹ لانچر، متعدد راکٹ، ہینڈ گرنیڈ اور آٹومیٹک رائفلوں اور سب مشین گنوں کے کئی میگزین تھے جنہیں پارٹی کے آدمیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ طارق اور نیلم کو بھی ایک ایک سب مشین گن، فاضل میگزین اور دو دو ہینڈ گرنیڈ دے دیے گئے۔ نیلم اب پہلے کی طرح چاق و چوبند نظر آ رہی تھی۔ پیٹ بھر کر کھانے اور دو ڈھائی گھنٹوں کے آرام سے اسے بہت سہارا ملا تھا۔

گوہر ہی اس چھاپا مار پارٹی کا لیڈر تھا۔ اس نے سب کو حملے کا منصوبہ سمجھایا اور پھر سب لوگ دو دو تین تین کی ٹولیوں میں مکان سے نکلنے لگے۔ اس وقت رات کے تین بجے تھے اور ان کا رخ دریائے چناب کی طرف تھا۔

تقریباً نصف میل کا فاصلہ طے کر کے وہ دریا کے کنارے پر پہنچ گئے۔ پُل وہاں سے بائیں طرف تقریباً ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر تھا۔ ظاہر ہے وہ پُل کی طرف جانے کی حماقت نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں یہیں سے دریا پار کرنا تھا۔ دریا کے دوسرے کنارے پر ڈوڈا شہر آباد تھا۔

دریا کا کنارہ خاصا ڈھلوان تھا۔ وہ بڑی احتیاط سے ایک ایک کر کے ڈھلان پر اترتے رہے۔ پہاڑوں پر برف جمی ہوئی ہونے کی وجہ سے دریا میں پانی زیادہ نہیں تھا۔ وہ پتھروں پر سے ہوتے ہوئے چلتے رہے۔ کہیں کہیں انہیں پنڈلی تک پانی میں چلنا پڑا۔ وسط میں ایک جگہ پانی کمر تک گہرا تھا اور یہاں بہاؤ بھی تیز تھا۔ وہ سب ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر قطار میں چلتے رہے۔ قطار میں شہروز سب سے آگے تھا۔

دوسرے کنارے کی ڈھلان پر وہ رک گئے۔ یہاں بڑے بڑے پتھر تھے۔ گوہر نے ایک پتھر کی آڑ میں کھڑے ہو کر پنسل ٹارچ روشن کی اور دریا کی بالائی سمت رخ کر کے روشنی کے سگنل دینے لگا۔ چند سیکنڈ بعد دوسری طرف سے بھی روشنی کے سگنل دیے جانے لگے۔

"آؤ" گوہر نے ٹارچ بُجھا کر جیب میں ڈال لی۔ وہ سب گوہر کے پیچھے اس طرف چلنے لگے جہاں سے روشنی کے سگنل دیے گئے تھے۔ پانچ منٹ میں وہ اس جگہ پہنچ گئے۔ ایک بڑے پتھر کی آڑ میں ایک نقاب پوش مجاہد ان کا منتظر تھا۔

"کیا پوزیشن ہے ایوب؟" گوہر نے سرگوشیانہ لہجے میں پوچھا۔

"شہر میں داخلے کے تمام راستوں کی ناکا بندی ہے۔ اسلحہ ڈپو اور کیمپ، شہر کے بائیں طرف پہاڑی کے دامن میں ہے۔ ہم دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پچھلی طرف سے پہاڑی پر چڑھ سکتے ہیں لیکن اس طرف بھی پیٹرولنگ ہوتی رہتی ہے۔ ہمیں محتاط رہنا پڑے گا۔" ایوب نے جواب دیا۔

وہ لوگ دریا سے نکل کر کنارے پر آ گئے اور ایوب کی رہنمائی میں چلنے لگے۔ انہیں تقریباً ڈیڑھ میل کا فاصلہ طے کرنا پڑا۔ آخر کار وہ اس پہاڑی کے قریب پہنچ گئے جس کے دامن میں فوجی کیمپ تھا۔ اس سے آگے شہر پھیلا ہوا تھا۔ پہاڑی پر بھی کہیں کہیں روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ یہ کشمیریوں کے مکانات تھے جنہیں فوج نے خالی کروا کے اپنے قبضے میں لے رکھا تھا۔ پہاڑی زیادہ بلند نہیں تھی۔ ایوب کی اطلاع کے مطابق اس پہاڑی کے پچھلی طرف بھی گشت ہوتا تھا لیکن گوہر کو یقین تھا کہ پہاڑی کے اوپر بھی کوئی نہ کوئی چوکی ضرور ہوگی۔

وہ لوگ پہاڑی کی پشت پر پہنچ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد پتھریلے راستے پر بھاری بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ لوگ تاریکی میں دبکے آوازوں کی سمت دیکھتے رہے۔ چند منٹ بعد چار فوجی باتیں کرتے ہوئے ان کے سامنے تقریباً دس گز کے فاصلے سے گزر گئے۔ ان میں سے دو سگریٹ کے کش لگا رہے تھے۔

"چلو" گوہر نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

وہ سب پہاڑی کی بلندی کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ یہ پہاڑی پانچ سو فٹ سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ گوہر کا یہ اندازہ درست نکلا کہ پہاڑی کی چوٹی پر بھی ایک نگران چوکی موجود تھی۔ چوٹی پر بہت بڑی ہموار جگہ تھی جہاں یہ چوکی قائم کی گئی تھی۔ ایک طرف لکڑی کے دو چھوٹے کمرے بھی بنے ہوئے تھے جبکہ ایک جگہ ریت کی بوریاں رکھ کر مورچہ سا بنا دیا گیا تھا اور وہاں دو بھاری مشین گنیں نصب تھیں۔ دونوں مشین گنوں پر گن مین بیٹھے ہوئے تھے۔ دو محافظ کندھوں پر سب مشین گنیں لٹکائے ٹہل رہے تھے۔

پہاڑی پر چڑھتے ہوئے گوہر کے ایک ساتھی کے پیر کے نیچے سے پتھر نکل گیا اور پُرشور آواز سے ڈھلان پر لڑھکنے لگا۔

"کون ہے وہاں؟ کون ہے، رک جاؤ!" فضا میں ایک محافظ کی آواز گونجی۔

گوہر کے دو آدمی محافظوں کی نظر میں آگئے تھے۔ محافظوں نے فائرنگ شروع کردی۔ گوہر کے دونوں ساتھی فائرنگ کی زد میں آگئے۔ دونوں کے جسم گولیوں سے چھلنی ہوگئے اور وہ ڈھلان پر لڑھکتے چلے گئے۔

"فائر" گوہر چیخا۔

مختلف پتھروں کے پیچھے چھپے ہوئے مجاہدین نے فائرنگ شروع کردی۔ بھارتیوں کی دونوں بھاری مشین گنیں بھی بیک وقت دہاڑنے لگیں۔ طارق جس پتھر کے پیچھے چھپا ہوا تھا اس پر گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ نیلم بھی طارق کے ساتھ تھی۔

"تم فائرنگ جاری رکھو، میں اس طرف سے اوپر جانے کی کوشش کرتا ہوں۔" طارق نے نیلم سے کہا اور پتھروں کی آڑ میں رینگتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

ایک جگہ طارق رک گیا۔ وہ جس پتھر کے پیچھے چھپا تھا، مشین گنوں والا مورچہ وہاں سے تقریباً پندرہ گز اوپر تھا۔ اس نے جیب سے ہینڈ گرنیڈ نکالا، اس کی پن کھینچی اور کھڑے ہو کر اسے پوری قوت سے مورچے کی طرف اچھال دیا۔ ہینڈ گرنیڈ پھینکتے ہی وہ نیچے لیٹ گیا تھا۔ اسی لمحے کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا۔ گرنیڈ مورچے کے باہر گرا تھا۔ طارق نے ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر دوسرا ہینڈ گرنیڈ اچھال دیا۔ یہ گرنیڈ مورچے کے اندر گرا۔ ایک اور دھماکا ہوا اور مورچہ کسی پرندے کے گھونسلے کی طرح بکھر گیا۔ مشین گنوں اور گن مینوں کی لاشوں کے ٹکڑے چاروں طرف بکھر گئے۔

مجاہدین اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتے ہوئے چوکی پر پہنچ گئے۔ چوکی کے ایک دو محافظ زندہ بچ گئے تھے اور اپنی جان بچانے کے لیے بڑی تیزی سے دوسری طرف کی ڈھلان پر دوڑ رہے تھے۔ مجاہدین نے ان پر فائرنگ جاری رکھی۔

پہاڑی کے دامن میں فوجی کیمپ میں کھلبلی سی مچ گئی۔ کیمپ سے اوپر والی چوکی تک آنے کے لیے پہاڑی پر بل کھاتا ایک کشادہ راستہ موجود تھا جس پر بھاری ٹرک چل سکتے تھے۔ کئی گاڑیوں کے ہیڈ لیمپس کی روشنیاں اس وقت بھی پہاڑی کی بل کھاتی ہوئی سڑک پر نظر آرہی تھیں جس کا مطلب تھا کہ بھارتی فوجی اوپر آرہے تھے۔

"شہروز!" فضا میں گوہر کی آواز گونجی "راکٹ فائر کرو۔"

وہ مجاہدین جن کے پاس راکٹ لانچر تھے، پوزیشن لے کر بیٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد جب بیک وقت چار راکٹ فائر ہوئے تو فوجی کیمپ پر گویا قیامت ٹوٹ پڑی۔

ٹھیک اسی وقت پہاڑی پر دائیں اور بائیں سمت سے فائرنگ شروع ہوگئی۔ کچھ بھارتی فوجی ان اطراف سے پہاڑی پر پہنچنے میں کامیاب ہوگئے تھے اور انہوں نے مجاہدین کو گھیرے میں لینے کی کوشش کرتے ہوئے فائر کھول دیے تھے۔

کیمپ میں مسلسل کان پھاڑ دینے والے، خوف ناک دھماکے گونج رہے تھے۔ گوہر نے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو واپسی کا حکم دے دیا۔ ان کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ مجاہدین گھیرا توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے مختلف سمتوں سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ طارق اور نیلم، گوہر کے ساتھ تھے۔ وہ پہاڑی کے دوسری طرف جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسی دوران گوہر کے ایک اور ساتھی کی خوف ناک چیخ گونجی اور وہ ڈھلان پر لڑھکتا چلا گیا۔ اس معرکے میں یہ تیسرا مجاہد شہید ہوا تھا۔

طارق، نیلم کا ہاتھ پکڑے ڈھلان پر کھینچتا ہوا جا رہا تھا۔ نیلم نے اب تک مردوں ہی کی طرح بہادری کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس نے ثابت کردیا تھا کہ وہ ایک عورت ہی نہیں، ایک دلیر اور باہمت مجاہدہ بھی ہے۔

ڈھلان پر دوڑتے ہوئے اچانک طارق کا پیر رپٹ گیا۔ نیلم نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی لیکن وہ خود بھی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور دونوں ڈھلان پر لڑھکنے لگے اور آخر کار ایک پتھر کے ساتھ ٹکرا کر رک گئے۔ طارق اور نیلم ایک دوسرے کے نیچے اوپر تھے۔ طارق نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن اسی وقت ایک خوف ناک غراہٹ اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔"

طارق اور نیلم نے بیک وقت اوپر دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں یوں محسوس ہوا جیسے دل ڈوب رہے ہوں۔ ان کے سامنے تین بھارتی فوجی سب مشین گنیں تانے کھڑے تھے۔

"ہم اگر چاہیں تو تم دونوں کے جسموں میں اتنی گولیاں اتار دیں کہ زخموں کا شمار مشکل ہو جائے لیکن ہم تمہیں زندہ رکھیں گے تاکہ تمہارے ساتھیوں کے ٹھکانے معلوم ہو سکیں۔" ایک فوجی نے غراتے ہوئے کہا۔

(جاری ہے)

جاسوسی ڈائجسٹ، جولائی 1993ء

قوم کے خادم

نجمہ مودی

ہمارے ملک کی سیاست میں جو کچھ ہو رہا ہے اور سیاست دانوں کی باہمی چپقلش روز بہ روز جو نئے رنگ ڈھنگ دکھاتی ہے وہ کسی آنکھ سے پوشیدہ نہیں۔ آیئے دُنیا کی سب سے مضبوط جمہوریت کے سیاست دانوں کا حال دیکھیں۔ وہ کیا گل کھلا رہے ہیں۔ امریکا میں کانگریس کے ایک معزز رُکن کے قتل کا احوال۔ اُنھیں اپنے دفتر واقع ایوانِ نمائندگان میں ہلاک کیا گیا اور قتل کا الزام ایک بے قصور پر ڈال دیا گیا۔

امریکی سیاست دانوں کے کالے کرتوتوں کی دلچسپ روداد

اُنیسویں صدی میں ہمارے لیڈر ڈوئل میں ایک دوسرے کو گولی مار دیا کرتے تھے۔ مسٹر برا اور ہملٹن اس کی مثالیں ہیں۔ اس زمانے میں اجلاس کے دوران کانگریس کے ممبروں کا ایک دوسرے پر چاقو نکال لینا یا پورے پارلیمنٹ ہاؤس میں توڑ پھوڑ مچا کر رکھ دینا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔

لیکن اب ہم مہذب و متمدن ہو چکے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صدر ٹرومین کے زمانے میں ہسپانوی نسل کے کچھ حریت پسندوں نے ایوانِ نمائندگان میں گولی چلا دی تھی اور ساٹھ کی دہائی میں تاریخ کی تین بڑی سیاسی شخصیتوں کو قتل کر دیا گیا تھا لیکن یہ سب ان لوگوں کا کام تھا جن کے ذہن دیوانگی کی سرحدوں کو چھو رہے تھے۔

اب سیاسی اور دفتری طور پر ایک دوسرے کو ہلاک کرنے کا

زمانہ ہے۔ سیاسی تجزیہ نگار غالباً ہاتھ ملتے ہوئے اکثر لکھتے ہیں کہ واشنگٹن ڈی سی قومی قتل گاہ ہے اور بعض تو اسے بین الاقوامی قتل گاہ قرار دیتے ہیں جہاں نہ جانے کتنی قوموں کی زندگی اور موت کے فیصلے ہوتے ہیں۔

میں یہاں کا پرانا رہنے والا ہوں۔ مجھے تو یہ دوسرے عام شہروں ہی کی طرح کا ایک شہر لگتا ہے جہاں زندگی اور موت کے اتنے ہی مواقع موجود ہیں جتنے دوسرے شہروں میں۔ یہاں بھی اسی طرح ہر قبیل کے انسانوں کی کھچڑی پکی ہوئی ہے جس طرح دوسرے بڑے شہروں میں ہوتی ہے۔ گروہوں سے تعلق رکھنے والے سازشی، نشے باز، قاتل، کرائے کے قاتل یہاں بھی موجود ہیں جن کی زندگیاں مختصر ہوتی ہیں۔ شریف آدمی کے لیے یہاں بھی اتنی ہی مشکلات ہیں جتنی دوسرے شہروں میں۔

لیکن کم از کم ایوانِ نمائندگان، کیپٹل بلڈنگ یا اس قسم کی دوسری عمارتوں میں اب قتل کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ حتیٰ کہ بیس سال قبل جب جنگ کے خلاف غم و غصے کے عالم میں مظاہرے کرتے تھے اور مال پر کیمپ لگا کر یا دھرنا دے کر بیٹھے رہتے تھے، وہائٹ ہاؤس کے سامنے سبزہ زار میں آگ لگا کر دھواں پھیلاتے یا بینرز وغیرہ لہراتے رہتے تھے تب بھی وہائٹ ہاؤس، ایوانِ نمائندگان یا کیپٹل بلڈنگ میں کسی کے قتل کا تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔

چنانچہ جب مئی ۷۰ء کی ایک صبح ہمیں خبر ملی کہ کانگریس کے معزز رکن اینڈل روکسن مین کیپٹل بلڈنگ میں مردہ پائے گئے ہیں تو ہمیں حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ روکسن کی پیشانی پر عین دونوں آنکھوں کے درمیان گولی ماری گئی تھی اور آلۂ قتل آس پاس کہیں دریافت نہیں کیا جاسکا تھا اس لیے اسے خودکشی قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔

اس کی لاش اس کے اپنے چھوٹے سے آفس میں پائی گئی تھی جو عمارت کے تہ خانے میں واقع تھا۔ یہ آفس اسے کیوں ملا ہوا تھا، یہ بھی کسی کو صحیح طور پر معلوم نہیں تھا۔ وہ تقریباً بیس سال سے کانگریس میں تھا۔ کبھی آتا کبھی جاتا رہا تھا لیکن وہ کبھی کسی سب کمیٹی تک کا چیئرمین نہیں بن سکا تھا۔ اس کے باوجود اسے کیپٹل بلڈنگ میں آفس ملا ہوا تھا، یہ گویا اعزاز کی بات تھی۔

کیپٹل بلڈنگ اپنی جگہ خود ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ ۷۰ء میں آج کل کے مقابلے میں یہ شہر کچھ اور چھوٹا تھا۔ خبر یہاں تیزی سے سفر کرتی تھی۔ جونہی روکسن کی لاش دریافت ہوئی، گپ بازوں اور افواہ سازوں نے کہانیاں گھڑنا شروع کردیں۔ اس دن کام برائے نام ہوسکا۔

ہلچل بلڈنگ کے اس حصے میں زیادہ تھی جس کا تعلق ایوانِ نمائندگان سے تھا۔ وہاں کام کرنے والوں کے کلب نے تین روزہ سوگ کا اعلان کردیا تھا۔ وہ لوگ ویسے بھی سوگ منانے کا بہانہ ڈھونڈتے رہتے ہیں۔

میں بلڈنگ کے اس حصے میں کام کرتا تھا جس کا تعلق سینیٹ سے ہے۔ میں سینیٹر برگ مین کا پی اے تھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ اس طرف روکسن کی موت کا کوئی براہِ راست اثر دیکھنے میں آئے گا۔ میں روکسن سے واقف تھا لیکن کافی عرصے سے اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اور مجھے اس سے ملنے کی کوئی خواہش بھی نہیں تھی۔ سینیٹر نیا منتخب ہوکر آیا تھا جبکہ میں بیس سال سے کیپٹل بلڈنگ میں مختلف حیثیتوں میں کام کررہا تھا۔

اس وقت میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا جب میں آفس پہنچا اور میں نے دو سراغرسانوں کو اپنا منتظر پایا۔ تعارف کرانے اور اپنا کارڈ وغیرہ دکھانے کے بعد ان میں سے ایک سراغرساں جو دراز قد تھا، بولا۔ ”مسٹر وارڈ! ہم کانگریس مین روکسن کے قتل کی تفتیش کررہے ہیں۔ ہمیں آپ سے کچھ سوالات کرنے ہیں۔“

میں انہیں اپنے شیشے کے ڈربے میں لے آیا۔ میرا یہ آفس سینیٹر کے کمرے اور استقبالیے کے درمیان واقع تھا۔ یہاں میز اور فرش تک پر فائلوں اور کاغذات کے انبار تھے۔ اس بلڈنگ میں کام کرنے والوں کو انچوں کے حساب سے جگہ الاٹ ہوتی تھی۔

دراز قد سراغرساں نے اپنا نام رابرٹ بتایا تھا۔ وہی زیادہ مستعد نظر آرہا تھا۔ پہلا سوال اسی نے کیا۔ ”کانگریس مین روکسن سے آپ کی ملاقات کب ہوئی تھی؟“

”مجھے صحیح یاد نہیں۔ تین سال سے تو زیادہ ہی عرصہ گزر چکا ہوگا۔“ میں نے جواب دیا۔

”کہاں ہوئی تھی؟“ رابرٹ نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ اس کا پستہ قد ساتھی جس کا نام رالف تھا، دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈالے کھڑا تھا۔ اچانک مجھے یاد آگیا کہ روکسن سے میری آخری ملاقات کہاں ہوئی تھی اور تب یہ بھی میری سمجھ میں آگیا کہ سراغرساں ایسے پیچھتے ہوئے لہجے میں مجھ سے یہ سوال کیوں کررہا تھا۔

”مشورہیم کے مقام پر۔ یہ ۶۹ء کے الیکشن سے غالباً ایک ماہ پہلے کی بات ہے۔ وہ انتخابی مہم کے لیے فنڈ جمع کرنے کی کوئی تقریب تھی۔“ میں نے جواب دیا۔

”آپ کو اس تقریب کی کوئی خاص بات یاد ہے؟“

”مجھے اس تقریب کی ہر ”خاص“ بات یاد ہے۔“ میں نے انہی کی طرح زور دے کر کہا۔ ”لیکن آنجہانی روکسن کو شاید یاد نہ رہی ہو کیونکہ وہ اس وقت نشے میں دھت تھا، گرا جارہا تھا۔“

”کیا واقعی؟ ہم نے سنا ہے گرنے میں کسی نے اس کی مدد کی تھی۔“ رالف بولا۔

”تمہارا مطلب ہے میں نے اسے گھونسا مار کر گرایا تھا؟ ایسی کوئی بات نہیں ہے حالانکہ مشہور یہی ہوگیا تھا۔ روکسن زبردست ڈرنکر تھا۔ اس روز بھی وہ نشے میں دُھت تھا۔ میری کسی بات پر

اسے غصہ آگیا۔ اس نے مجھے مارنے کے لیے گھونسا گھمایا' میں بچ گیا لیکن وہ برتنوں پر گر پڑا۔ ظاہر ہے کانگریس کے ایک معزز رکن کے لیے یہ کوئی معززانہ پوزیشن نہیں تھی۔ مجھے یقین تو نہیں ہے کہ اس کا کوئی دوست بھی تھا لیکن اگر کوئی تھا تو شاید اسی نے یہ خبر اڑا دی ہو کہ میں نے گھونسا مار کر رو کسن کو گرایا تھا۔ بہرحال.... ایسی کوئی بات نہیں تھی اور میں تو اس قصے کو بھول بھال چکا تھا۔"

"تمہیں یقین ہے کہ حال ہی میں تمہاری اس سے ملاقات یا بات نہیں ہوئی؟"

"ہاں۔ مجھے یقین ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"گزشتہ شب سات بجے سے لے کر آدھی رات تک کے درمیان تم کہاں تھے؟"

"مختلف جگہوں پر۔" میں نے جواب دیا۔ "ساڑھے آٹھ تک تو میں یہیں تھا۔ اس کے بعد ساڑھے دس بجے تک کارٹر کے بار میں رہا۔ آدھی رات تک میں گھر پہنچ چکا تھا۔"

"کوئی شخص جس نے تمہیں اس دوران دیکھا ہو اور یہ بات اسے یاد بھی ہو....؟"

"کارٹر کے بار میں جو بارٹینڈر ہے.... فریڈ اس کا نام ہے.... اسے یقیناً یاد ہوگا کہ میں تقریباً دو گھنٹے بار میں موجود رہا تھا۔ اس سے میری گپ شپ رہی تھی۔"

"اس کے بعد تم اتنی دیر سے گھر کیوں پہنچے؟"

"میں ٹہلتا ہوا آگیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"تم نے اگر کانگریس مین رو کسن سے گزشتہ رات ملنے کا وقت لیا تھا تو پھر ملنے کیوں نہیں پہنچے؟"

"کیا....؟" میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

☆ ...... ○ ...... ☆

اگر آدمی زیادہ عرصے واشنگٹن میں رہے تو اس پر کسی نہ کسی چیز کا شبہ کیا جاسکتا ہے۔ کم بدعنوانی' زیادہ بدعنوانی اور کبھی کبھی اس پر بدعنوانی میں ملوث نہ ہونے کا شبہ بھی ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ جھوٹ بولنے' رشوت لینے اور ہیرا پھیری کے شبہات بھی اس کے حصے میں آسکتے ہیں لیکن مجھے کم از کم یہ امید نہیں تھی کہ مجھ پر قتل کا شبہ کیا جائے گا۔

میں نے رو کسن سے ملاقات کا وقت ہرگز نہیں لیا تھا لیکن یہ بات میرے سوا کسی کو معلوم نہیں تھی۔ ممکن ہے خود رو کسن بھی اس حقیقت سے آگاہ رہا ہو لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ اب بول نہیں سکتا تھا۔ اس کے ڈیسک کیلنڈر پر پنسل سے میرا نام اور ساڑھے سات بجے کا وقت لکھا ہوا پایا گیا تھا۔ میں چونکہ ساڑھے آٹھ بجے تک اپنے آفس میں ہی رہا تھا اور تنہا تھا اس لیے جائے واردات سے میری غیر حاضری کا گویا کوئی گواہ موجود نہیں تھا۔

لیکن مجھے اس کو قتل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ یوں تو بہت سے لوگوں کی رائے میں وہ پکا سور تھا اور وہ یقیناً اسے قتل

مقدر کا کھیل

دو بوڑھی عورتیں ایک جگہ بیٹھی باتیں کررہی تھیں۔ ایک بولی "نجمہ کل اپنے شوہر کے چالیسویں سے فارغ ہوئی ہے۔"

"آج کل عورتوں کے ساتھ یہی المیہ ہے۔" دوسری نے آہ بھر کر کہا "ہم میں سے بعض کو شوہر نہیں ملتا اور جنہیں ملتا ہے وہ چلم کرکے چھوڑتی ہیں۔"

کرنے کی خواہش رکھتے ہوں گے لیکن کم از کم میری یہ خواہش ابھی اتنی بے قابو نہیں ہوئی تھی کہ میں آنکھیں بند کرکے اس پر عمل کر ڈالتا۔ میرے لیے اصل میں اس سوال کا جواب حاصل کرنا بہت ضروری تھا کہ میرا نام اس کے ٹیبل کیلنڈر پر کیونکر لکھا گیا؟

سراغرسانوں کے جانے کے بعد میں اسی سوال پر غور و خوض کررہا تھا جب سینیٹر نے مجھے اندر اپنے کمرے میں بلایا۔ سینیٹر برگ مین مجھ سے بھی پہلے آفس آجاتا تھا۔ سراغرسانوں سے یقیناً اس کی ملاقات ہوچکی تھی۔

"وارڈ!" سینیٹر نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے رائے لینا چاہتا ہوں کیونکہ ہر مسئلے پر میں تمہاری رائے کی قدر کرتا ہوں۔ اگر میرے اسٹاف کا ایک سینئر رکن' میرا اپنا پی اے ایک قتل کے سلسلے میں مشتبہ افراد میں سرفہرست ہو تو میری کیا پوزیشن ہوگی؟"

"بہت بری سر!" میں نے خلوص سے رائے دی۔

"میں نہیں چاہتا کہ آئندہ الیکشن پر مخالفین اس بات کو اچھالیں۔"

"سر! آئندہ الیکشن میں ابھی تقریباً پانچ سال پڑے ہیں۔ تب تک حقیقت سامنے آچکی ہوگی اور بھلائی جاچکی ہوگی۔ اس دوران آپ کم از کم مذکورہ پی اے سے یہ تو پوچھ لیں کہ قتل واقعی اس نے کیا ہے یا نہیں۔"

"چلو بتادو۔" سینیٹر نے کوئی خاص دلچسپی ظاہر کیے بغیر کہا۔

"نہیں۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ ملک و قوم کے لیے یہ خدمت میں نے انجام دی ہے۔" میں نے ندامت سے کہا۔

رو کسن کے اس جہانِ فانی سے کوچ پر میں جن جذبات کا اظہار کررہا تھا اس پر سینیٹر کو کچھ زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ تاہم ہمارے درمیان یہ طے پایا کہ میں کچھ دنوں کے لیے نامنظور شدہ چھٹیوں پر چلا جاؤں تاکہ سینیٹر کو پریس سے گول مول باتیں کرنے کا موقع مل سکے۔

وہ ایک طرح کی جبری رخصت تھی اور مجھے ایسی رخصت پر جانا اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن میرے لیے اس حکم پر عملدر آمد کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اب میں سینیٹر کا کوئی سیاسی ساتھی تو تھا نہیں کہ وہ میرے تمام کردہ اور ناکردہ گناہوں اور سازشوں کو نظر انداز کردیتا۔ وہ تو مجھے اچھی طرح جانتا تک نہیں تھا۔ میں تو چند ماہ قبل ہی اس سیٹ پر آیا تھا جہاں مجھ سے پہلے کوئی اور کام کررہا تھا۔

چھٹی ملنا ایک لحاظ سے میرے حق میں اچھا بھی تھا۔ میں ذرا اطمینان سے یہ جاننے کی کوشش کرسکتا تھا کہ میں اس چکر میں کیسے پھنسا تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں کہاں سے اپنی کوششوں کا آغاز کروں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے مجھے کارٹر کے بار میں جا کر دیکھنا چاہیے تھا کہ فریڈ آگیا تھا یا نہیں۔ جائے واردات سے میری تھوڑی بہت غیر حاضری کی تھوڑی بہت گواہی وہی دے سکتا تھا۔

کارٹر کا بار سابق کیپٹل ہل ہوٹل کی بلڈنگ میں، سینیٹ آفس بلڈنگ کے عین مقابل واقع تھا۔ بوبی بیکر کے اسکینڈل کے بعد اس ہوٹل کی بڑی رسوائی ہوئی تھی اور وہ بند ہوگیا تھا لیکن کیا ستم ظریفی تھی کہ بعد میں اسی عمارت میں سینیٹ کی "کمیٹی برائے اخلاقیات" کا دفتر قائم ہوا۔ انقلابات ہیں زمانے کے!

کارٹر کے ریستوران اور بار کی ویٹرس ریگی اور بار ٹینڈر فریڈ دونوں اپنی اپنی جگہ سخی ہیں۔ سخاوت کے انداز مختلف ہیں۔ ظاہر ہے ہونے بھی چاہئیں کیونکہ ریگی بہرحال عورت ہے اور فریڈ مرد۔ بہرحال شاید یہ ان دونوں کی سخاوت اور حُسنِ انتظام کا نتیجہ تھا کہ سینیٹ سے لوگ یہاں یوں کھنچے آتے تھے جیسے شہد پر مکھیاں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا.... جیسے شمع پر پروانے۔

یہاں ہر طرح کے اور ہر مرتبے کے لوگ آتے تھے اور ہر طرح کے تماشے ہوتے تھے۔ میں ریگی سے کہہ چکا تھا کہ اگر وہ اپنی یادداشتیں قلمبند کرے تو بڑی دولت کما سکتی ہے۔ اس پر اس ستم ظریف عورت نے جواب دیا تھا کہ وہ اپنی یادداشتیں قلمبند "نہ" کرنے کا وعدہ کرکے زیادہ دولت کما سکتی تھی۔

ابھی چونکہ صبح کے صرف ساڑھے دس بجے تھے اس لیے ریستوران اور بار میں ویرانی تھی۔ بار کے کاؤنٹر پر بھی کوئی نہیں تھا۔ میں نے ریگی سے پوچھا۔ "فریڈ کتنے بجے آتا ہے؟"

"تقریباً پانچ بجے تمہیں ڈرنک چاہیے تو میں بنا دیتی ہوں۔" وہ کاؤنٹر کے پیچھے چلی گئی۔ "صبح دو سراغرساں بھی فریڈ کا ایڈریس پوچھنے آئے تھے۔"

"بڑے کمینے لوگ ہیں۔ اتنی جلدی جلدی ہر جگہ کو کھنگالنے پہنچ جاتے ہیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"لگتا ہے تمہاری آمد کا بھی ان کی آمد سے کوئی تعلق ہے۔ چکر کیا ہے؟"

"کانگریس مین رو کسن کو قتل کردیا گیا ہے۔" میں نے بتایا۔

"وہ.... وہ خبیث....! میرا خیال ہے پولیس والے قاتل کو اس لیے ڈھونڈ رہے ہوں گے کہ اس کارنامے پر اسے تمغا دے سکیں۔ یہ نیک کام تم نے انجام نہیں دیا؟"

"پولیس والوں کو مجھ پر شبہ ہے۔" میں نے بتایا۔

"برگ مین نے تمہیں نوکری سے نکال دیا ہوگا، اسی لیے تم صبح ہی صبح یہاں نظر آرہے ہو۔" ریگی بولی۔

"نکالا تو نہیں، چند دن کے لیے اِدھر اُدھر ہوجانے کی ہدایت کی ہے۔" میں نے کہا۔

ڈرنک ختم کرکے میں وہاں سے نکلا اور سب وے کے ذریعے کیپٹل بلڈنگ واپس آیا۔ میں اس حصے میں پہنچا جس کا تعلق پارلیمنٹ ہاؤس سے تھا۔ میں وہ آفس دیکھنا چاہتا تھا جہاں رو کسن کو قتل کیا گیا تھا۔ اس کا آفس بھی کہیں تہ خانے میں تھا۔ ڈبا نما دفتروں کے اس لامتناہی سلسلے میں رو کسن کا آفس تلاش کرنا ایسا ہی تھا جیسے گھاس کے گٹھڑ میں سوئی تلاش کرنا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں وہاں کیا تلاش کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یہ اندازہ البتہ ضرور تھا کہ آفس مقفل ہوگا اور اس کے ارد گرد نہ جانے کتنے پولیس والے تعینات ہوں گے۔

لیکن میرا اندازہ غلط نکلا۔ صرف ایک پولیس والا اس آفس کے دروازے پر تعینات تھا اور درحقیقت اس کی وجہ سے میں نے پہچانا کہ وہ رو کسن کا آفس ہوگا ورنہ شاید میں ڈھونڈتا ڈھونڈتا مرجاتا۔ شاید میں اس دروازے کو جھاڑوؤں کی الماری یا کسی اسٹور روم کا دروازہ سمجھتا۔

میں نے پولیس والے کو دیکھ کر خواہ مخواہ دوستانہ انداز میں سر ہلایا۔ اس نے بھی تھوڑی سی باچھیں پھیلائیں اور میں گزرتا چلا گیا۔ قریب ہی کمرے کے کونے سے میں مڑا تو دیوار میں مجھے ایک اور دروازہ نظر آیا۔ اسے یا تو رو کسن کے آفس کا بغلی دروازہ ہونا چاہیے تھا یا پھر یہ کسی الماری کا دروازہ ہوسکتا تھا۔

اس کا تالا آسانی سے کھل گیا۔ وہ شیلفوں والی الماری تھی جس میں رول کیے ہوئے نقشوں کے انبار لگے تھے۔ غالباً یہ بلڈنگ کے آرکیٹیکٹ نے بلڈنگ کی تعمیر کے وقت اپنے نقشے وغیرہ رکھنے کے لیے جگہ نکالی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ شیلفوں کے عقب میں ایک دروازہ موجود تھا۔ میں نے اس کی ناب تلاش کرنے کے لیے چند نقشے ہٹانا چاہے تو شیلف کا تختہ ہی گر گیا اور کئی گرد آلود نقشے مجھ پر لڑھک پڑے۔

پولیس والا دوڑا دوڑا آیا اور چلّایا۔ "یہ کیا ہورہا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے متانت سے جواب دیا۔ "بلڈنگ کے شمالی حصے کی مرمت ہونی ہے۔ میں ذرا نقشے تلاش کررہا ہوں۔"

وہ بڑبڑاتا ہوا واپس چلا گیا۔ میں نے الماری میں گھس کر دروازہ ہی اپنے عقب میں بند کرلیا۔ گھپ اندھیرے میں نقشوں کو سمیٹ کر ایک طرف کرنا، شیلفوں کے تختے ہٹانا، پھر پچھلے دروازے

کی ناب تلاش کرنا' تالا کھولنا اور اندر جانا' یہ سب بڑا طویل اور صبر آزما کام تھا۔ آخر کار میں جب اندر پہنچنے میں کامیاب ہوا تو میرے کپڑے پسینے میں تر اور گرد میں لتھڑے ہوئے تھے۔

ایک راہداری سے گزر کر میں اس کمرے میں پہنچا جس کے دروازے پر باہر پولیس والا تعینات تھا۔ وہ ایک چھوٹا سا دفتری کمرا تھا جس کا بیشتر حصہ ایک بڑی سی میز اور ریوالونگ چیئر نے گھیرا ہوا تھا۔ ایک طرف فائلنگ کیبنٹ موجود تھی۔

میں نے اس میز پر نظر ڈالی تو وہ کیلنڈر نظر نہ آیا جس پر میرا نام اور متوقع ملاقات کا وقت درج ہونا چاہیے تھا۔ پولیس یقیناً وہ کیلنڈر لے گئی تھی۔ میں نے درازوں کی تلاشی لی۔ ان میں وہی کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا جو دفتروں میں ہوتا ہے۔ فائلوں کی آہنی الماری مقفل تھی۔

میں اس کی چابی تلاش کر رہا تھا جب میری نظر ایک فیڈرل رجسٹر پر پڑی۔ میں اس کے ورق الٹ کر دیکھنے لگا۔ اس میں قانون سازی سے متعلق دوسری میٹنگز کی رپورٹیں وغیرہ درج تھیں۔ ورق گردانی کے دوران ٹیلی فون کا پیغام نوٹ کرنے والی ایک مخصوص سلپ رجسٹر سے نکل کر گر پڑی۔

میں نے اس سلپ کا جائزہ لیا۔ اس کے اندراجات سے ظاہر ہوتا تھا کہ گزشتہ روز ساڑھے تین بجے جب کانگریس مین رو کسن اپنے آفس میں نہیں تھا تو میں نے اسے فون کیا تھا اور پیغام چھوڑا تھا کہ وہ مجھے سینیٹر برگ مین کے آفس میں فون کر لے۔ پیغام نوٹ کرنے والے نے اپنے دستخط کی جگہ "ایس ایچ" لکھا تھا۔

ظاہر ہے میں نے اسے فون نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس کا جوابی فون میرے لیے آیا تھا۔ بلکہ گزشتہ روز تو سہ پہر کے بعد میں کافی دیر کے لیے آفس سے غیر حاضر رہا تھا کیونکہ سینیٹر نے مجھے ایک سیمینار میں اپنی نمائندگی کے لیے جارج واشنگٹن یونیورسٹی بھیج دیا تھا لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا تھا کہ میں نے رو کسن کو فون نہیں کیا تھا کیونکہ ٹیلی فون تو یونیورسٹی میں بھی بہت تھے۔

اگر میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کس نے میرا نام استعمال کیا تھا تو میرے لیے اس شخصیت سے بات کرنا ضروری تھا جس نے سلپ پر پیغام نوٹ کیا تھا اور اپنے نام کا مخفف "ایس ایچ" لکھا تھا لیکن اس سے پہلے میں نے ان صفحات پر نظر ڈالی جن کے درمیان سے وہ سلپ برآمد ہوئی تھی۔

ان صفحات پر ایک کمیٹی کی رپورٹ درج تھی۔ وہ دس سال پرانی رپورٹ تھی جس میں لیبر قوانین کے شعبے میں بہت بڑی بدعنوانیوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔ دس سال قبل میں اس کمیٹی میں نہایت معمولی سی حیثیت میں شامل تھا اور وہ رپورٹ درحقیقت میں نے ہی مرتب کی تھی لیکن چند بڑے بڑے جغادری سیاست داں اس کا کریڈٹ لے گئے تھے۔

رپورٹ میں جن بدعنوانیوں اور رشوت خوریوں کی نشاندہی کی گئی تھی ان کا تعلق رو کسن سے تھا۔ اس رپورٹ کی وجہ سے رو کسن ۶۰ء کے الیکشن ہار گیا تھا اور اسے دوبارہ کانگریس میں آنے کے لیے چار سال محنت کرنا پڑی تھی۔

میں نے رجسٹر بند کر کے دراز میں رکھا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک چہکتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ "دوبارہ آکر جائے واردات کا معائنہ کیا جا رہا ہے؟"

یہ پستہ قد سراغرساں رالف کی آواز تھی۔ دراز قد رابرٹ بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر چلا آ رہا تھا۔

وہ سہ پہر مجھے حوالات میں گزارنا پڑی جہاں مجھے تنہائی میں غور و فکر کا موقع ملا اور اندازہ ہوا کہ بطور سراغرساں میں کتنا احمق اور اناڑی تھا۔ درحقیقت مجھے یہ جاننے کی ضرورت تھی کہ رو کسن کو کس نے قتل کیا تھا اور کیوں؟ اس کے لیے مجھے یہ جائزہ بھی لینا چاہیے تھا کہ میں رو کسن کے بارے میں کیا جانتا تھا۔

صرف یہی کہ وہ ایک خبیث اور گھٹیا آدمی تھا۔ لیبر کمیٹی نے اس کے بارے میں جو تحقیقات کی تھیں ان سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ اس کا تعلق سینڈیکیٹ وغیرہ سے تھا۔ وہ بیس سال سے کانگریس میں تھا۔ بیچ میں صرف ایک بار منتخب نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے باوجود وہ کسی چھوٹی سے چھوٹی کمیٹی کا بھی چیئرمین نہیں تھا۔

شاید اس کی ایک وجہ یہ رہی ہو کہ آج کے مقابلے میں اس زمانے میں کمیٹیاں کم تھیں اور ان کے چیئرمین بننے کے مواقع بھی کم تھے۔ آج کل تو ہر ایک کو خوش کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی کمیٹی بنا دی گئی ہے۔ جس کی چیئرمین شپ اسے سونپ دی جاتی ہے لیکن مجھے زیادہ امکان اس بات کا نظر آ رہا تھا کہ رو کسن نے اس لیے کسی کمیٹی کا چیئرمین بننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ اس جیسے آدمی سیاسی طور پر ذرا غیر نمایاں رہ کر زیادہ دولت کما سکتے تھے۔ نمایاں ہو کر آدمی پریس اور دیگر ذرائع ابلاغ کی نظر میں زیادہ رہتا ہے اور اس کی خفیہ سرگرمیوں کے بے نقاب ہونے کا زیادہ امکان رہتا ہے۔ بڑے اخبارات کے اہم کالموں میں صرف اہم سیاسی شخصیات ہی کے اسکینڈل چھپتے ہیں۔ واشنگٹن کے سیاسی سرکس میں جو لوگ خاموشی سے پس پردہ اپنا کام کرتے رہتے ہیں ان کی طرف کسی کی توجہ نہیں جاتی۔

شام پانچ بجے کے قریب میرا وکیل آیا اور میری ضمانت ہو گئی۔ گھر آکر تازہ دم ہونے کے بعد میں نے کانگریشنل اسٹاف ڈائریکٹری نکالی۔ اس میں صرف ایک ہی نام رو کسن کے اسٹاف میں ایسا تھا جس کے ابتدائی حروف "ایس ایچ" تھے۔ وہ نام شیرون ہولین تھا اور وہ رو کسن کی پرسنل سیکریٹری تھی۔

پھر میں نے ٹیلی فون ڈائریکٹری میں اس کا فون نمبر اور ایڈریس تلاش کیا۔ اتفاق سے ایڈریس میرے گھر سے زیادہ دور کا نہیں تھا۔ میں نے فون کرنے کی کوشش کی لیکن دوسری طرف سے کسی نے فون نہ اٹھایا۔ سات بجے کے قریب میں پیدل ہی گھر سے نکل کھڑا

ہوا۔ ابھی دن کی روشنی باقی تھی اور فضا میں کچھ حبس تھا۔

مجھے شیرون کے گھر پہنچنے کی کوئی ایسی جلدی نہیں تھی کیونکہ مجھے اب پھر معلوم نہیں تھا کہ وہاں پہنچ کر میں کیا کروں گا۔ ویسے بھی مجھے اندیشہ تھا کہ وہاں جا کر کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ آج ہر کام ہی خراب ہو رہا تھا۔

شیرون کا اپارٹمنٹ ایک صرف تین منزلہ عمارت کے تہ خانے میں تھا۔ میں اس کی سڑک کے لیول کی کھڑکی سے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا جب عقب سے آواز آئی۔ "لگتا ہے اس مرتبہ تمہیں تاک جھانک کے الزام میں حوالات کی سیر کرنا پڑے گی۔" یہ اسی پستہ قد سراغرساں رالف کی آواز تھی۔

لیکن دراز قد رابرٹ نے اسے ڈانٹا۔ "شٹ اپ رالف!" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "وارڈ! ہم تمہیں ہی تلاش کر رہے تھے۔ ہم تم سے مزید سوالات کرنا چاہتے ہیں۔"

"میں بھی تم سے کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"طریقہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ پولیس سوالات کرتی ہے اور مشتبہ افراد جواب دیتے ہیں۔" رالف ناک سکیڑ کر بولا۔

رابرٹ بولا۔ "ہم مس شیرون ہولین سے بات کر چکے ہیں۔ اس نے ہمیں بتایا تھا کہ شورہیم کے مقام پر تقریب میں تمہارے اور روکسن کے درمیان کوئی بدمزگی ہوگئی تھی۔ اب ہم روکسن سے تمہارے تعلقات کی نوعیت پر روشنی ڈالنے کے لیے ایک اور چیز کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں۔"

"غالباً تمہارا اشارہ لیبر کمیٹی کی رپورٹ کی طرف ہے۔ تم نے یقیناً اسے پڑھ لیا ہوگا۔ اس میں جو مواد موجود ہے وہ تو اس قابل ہے کہ اس کی بنیاد پر روکسن مجھے قتل کر دیتا۔ الٹا تم مجھے اس کے قتل کا ذمے دار سمجھ رہے ہو۔"

"اکثر اوقات جو چیزیں کسی کو قاتل بنا دیتی ہیں وہی اسے مقتول بھی بنا سکتی ہیں۔ مثلاً تمہارے پاس کوئی چیز ہو اور میں اسے حاصل کرنا چاہوں تو میں اس کے لیے تمہیں قتل کر سکتا ہوں اور تم بھی اس چیز کو بدستور اپنے قبضے میں رکھنے کے لیے مجھے قتل کر سکتے ہو۔ تمہارے معاملے میں چونکہ روکسن تمہارا دشمن ہو چکا تھا اس لیے تم نے اسے ٹھکانے لگانا بہتر سمجھا ہوگا۔"

"اور میں نے فون کر کے اس سے ملاقات کے لیے وقت لینا بھی بہتر سمجھا ہوگا، اپنے پیغام کا واضح سراغ چھوڑنا بھی بہتر سمجھا ہوگا، یہ یقین کر لینا بھی بہتر سمجھا ہوگا کہ وہ اپنے ٹیبل کیلنڈر پر میرا نام اور ملاقات کا وقت نوٹ کر لے تاکہ تم لوگوں کو مجھ تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے..... میں اس ہفتے کے دوران بہت بے وقوف نظر آ رہا ہوں لیکن درحقیقت میں اتنا احمق ہوں نہیں۔ کمال کی بات تو یہ تھی کہ جس سلپ پر میرا پیغام نوٹ کیا گیا تھا وہ بھی رجسٹر میں عین ان صفحات کے درمیان رکھی تھی جن پر لیبر کمیٹی کی رپورٹ درج تھی۔"

"ضروری نہیں ہے کہ یہ قتل تم نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا ہو۔" رالف بولا۔ "ممکن ہے تم اس سے کوئی بات کرنے گئے ہو اور ملاقات کے دوران پرانی رنجش نکل آئی ہو اور تمہارا صبر و ضبط جواب دے گیا ہو۔"

"رالف!" میں نے تحمل سے کہا۔ "جب تمہارے پاس "ممکن ہے" سے بہتر کوئی بات ہو تو میرے پاس آنا۔"

"ہم اس سے بہتر بات ہی تمہیں بتانے لگے ہیں۔" رالف بولا۔ "شیرون سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ کل ساڑھے تین بجے جب تم نے روکسن کو فون کیا تو وہ دفتر میں نہیں تھا لیکن جب وہ واپس آیا تو اس کی ہدایت پر شیرون نے تمہیں فون کیا اور تم سے اس کی بات ہوئی۔ تب ہی ملاقات کا وقت طے پایا۔"

"وہ جھوٹ بول رہی ہے۔" میں اس کے سوا کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

اس بار سراغرساں مجھے پولیس ہیڈ کوارٹرز نہیں لے گئے، صرف ہدایات دے کر چھوڑ گئے۔ مجھے بھوک ستا رہی تھی۔ میں ایک ریستوران میں جا بیٹھا۔ کھانے کے دوران میں سوچ رہا تھا کہ شیرون ہولین اگر فون پر مجھ سے بات ہونے کے بارے میں جھوٹ بول رہی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ وہ مجھے قتل کے الزام میں پھنسانا چاہتی تھی لیکن کیوں؟

کیا اس لیے اس کی نگاہِ انتخاب مجھ پر پڑی تھی کہ میرے پاس روکسن کو قتل کرنے کا معقول جواز موجود تھا؟ کیا درحقیقت اس نے خود روکسن کو قتل کیا تھا؟ بہت سی سیکریٹریوں کے پاس اپنے باس کو قتل کرنے کے لیے معقول جواز موجود ہوتے ہیں۔ بلکہ روکسن تو ایسا باس تھا جو اپنی سیکریٹری کو روزانہ اپنے قتل کے لیے ایک نیا اور زوردار جواز فراہم کر سکتا تھا۔

میرے خیال میں مجھے ذرا جائزہ لینا چاہیے تھا کہ قتل کے وقت کا جو تعین کیا گیا تھا اس دوران میں شیرون ہولین کی مصروفیات کیا رہی تھیں؟ میرے اندازے کے مطابق کم از کم بار ٹینڈر فریڈ نے تو سراغرسانوں کے سامنے تصدیق کر دی تھی کہ میں ساڑھے آٹھ بجے سے ساڑھے دس بجے تک بار میں موجود رہا تھا۔ اسی وجہ سے ان کا رویّہ میرے ساتھ کچھ نرم تھا لیکن یہ مس شیرون ہولین جسے میں جانتا تک نہیں تھا، کیوں مجھے پھنسوانے پر تلی ہوئی تھی؟

میں دوبارہ شیرون کے اپارٹمنٹ پر پہنچا تو اندھیرا پھیل چکا تھا لیکن اس کے اپارٹمنٹ میں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے ہلکی سی دستک دی۔

"کون؟" اندر سے پوچھا گیا۔

"راس وارڈ۔" میں نے اپنا نام بتایا۔

"چلے جاؤ یہاں سے ورنہ میں پولیس کو بلا لوں گی۔"

"شیروں! مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔" میں نے معذبانہ اور التجائیہ لہجے میں کہا۔ "مجھے معلوم ہے، تم مجھے قاتل سمجھ کر ملنے سے کترا رہی ہو لیکن یقین کرو، میں نے کوئی قتل وغیرہ نہیں کیا۔ تمہیں مجھ سے ڈرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔"

اس نے حفاظتی چین ہٹائے بغیر تھوڑا سا دروازہ کھول کر ہچکچاہٹ آمیز انداز میں باہر جھانکا اور مجھے خاصا زوردار جھٹکا لگا۔ وہ بلا کی خوبصورت تھی!

"اپنا کوئی شناختی کارڈ وغیرہ دکھاؤ۔" اس نے فرمائش کی اور میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ کیا وہ تصدیق کرنا چاہتی تھی کہ میں واقعی وہی شخص ہوں جس پر اس کے باس کے قتل کا شبہ کیا جا رہا تھا؟

میں نے اسے اپنا سینیٹ اسٹاف والا کارڈ دکھایا اور اس نے گویا میرے لیے مزید حیرت کا سامان کردیا۔ یعنی دروازہ کھول دیا۔ شاید اسے کسی وجہ سے یقین آگیا تھا کہ میں قاتل نہیں ہوسکتا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔ اس نے نہ تو پستول نکال کر مجھ پر تانا اور نہ ہی عقب سے کسی نے میرے سر پر کچھ مار کر مجھے بے ہوش کیا۔ کسی نے گوشت کاٹنے والی چھری سے میری چیر پھاڑ بھی نہیں کی۔ حالانکہ اس وقت میرے ساتھ ان میں سے کوئی بھی حرکت ہوتی تو مجھے قطعاً حیرت نہ ہوتی۔

حتیٰ کہ اس نے مجھے کافی پیش کی۔ اس میں بھی زہر ملا ہوا نہیں تھا کیونکہ اسے ختم کرنے کے بعد بھی میں بہ قائمی ہوش و حواس اس سے باتیں کرتا رہا۔ وہ تقریباً تیس کی عمر کی تھی۔ پہلے اسکول ٹیچر تھی۔ تقریباً ڈیڑھ سال سے روکسن کی سیکریٹری کے طور پر کام کررہی تھی اور اس سے بیزار ہوچکی تھی۔ روکسن کو جان لینے کے بعد ہر ایک ہی اس سے بیزار ہوجاتا تھا۔ المیہ یہ تھا کہ ووٹرز اسے نہیں جانتے تھے اور جان بھی نہیں سکتے تھے۔ ووٹر بے چارے تو ہر کس و ناکس کو دنیا کا عظیم انسان سمجھ کر اپنی نمائندگی کے لیے بھیج دیتے ہیں۔

"سوال یہ ہے...." میں نے کہا۔ "کہ اگر تم نے اسے قتل نہیں کیا تو تم نے مجھے اس الزام میں پھنسوانے کی کوشش کیوں کی؟"

"میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔" وہ تحمل سے بولی۔

"تو پھر پولیس والوں کو کس نے بتایا کہ میں نے فون کرکے روکسن سے ملاقات کا وقت لیا تھا اور کس نے روکسن سے شورہیم میں میری معمولی سی تلخ کلامی کا تذکرہ کیا؟" میں جاننا چاہا۔

"یہ سب کچھ تو انہیں میں نے ہی بتایا ہے۔" اس نے تسلیم کیا۔ "لیکن یہ سارا چکر خود میری سمجھ میں بھی نہیں آرہا۔ میں نے جب روکسن کو بتایا کہ تمہارا فون آیا تھا تو اس نے ہی مجھے شورہیم والے واقعے کے بارے میں بتایا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی پولیس سے اس کا ذکر کردیا لیکن اب مجھ پر ایک عجیب بات کا انکشاف ہوا ہے کہ فون پر میں نے جو آواز سنی تھی وہ تمہاری نہیں تھی۔ یہ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں۔"

"شاید میں نے ماؤتھ پیس پر رومال رکھ کر یا آواز بدل کر بات کی ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ آواز صاف اور واضح تھی اور وہ تمہاری آواز نہیں تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ تم کہہ رہے ہو، ساڑھے آٹھ بجے سے ساڑھے دس بجے تک تم بار میں موجود تھے۔ ساڑھے آٹھ بجے تک تو کانگریس مین زندہ تھا۔ تقریباً پونے نو بجے میں دوبارہ ایک کام سے اس کے آفس کی طرف گئی تھی۔ تب تک "تم" اس سے ملاقات کے لیے نہیں آئے تھے اور وہ منتظر بیٹھا تھا۔ "تم" ایک گھنٹے سے بھی زیادہ لیٹ ہوچکے تھے اور اس کا غصے سے بُرا حال تھا۔ ہوسکتا ہے اس کا حال اس لیے بھی زیادہ بُرا نظر آرہا ہو کہ وہ پی رہا تھا۔"

"یہ بات تم نے سراغرسانوں کو بھی بتائی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے جواب دیا اور تب میری سمجھ میں آگیا کہ سراغرسانوں نے ابھی تک مجھے لے جا کر بجلی کی کرسی پر کیوں نہیں پھینکا تھا۔ یکدم ہی میری سمجھ میں یہ بھی آگیا تھا کہ قتل کس نے کیا تھا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیوں کیا تھا۔

"شیروں! تم مجھے اپنے آنجہانی باس کے بارے میں کیا بتا سکتی

ہو؟"

"یہی کہ بڑا خبیث آدمی تھا۔ اس کا کوئی اصول نہیں تھا۔ مشکوک قسم کے لوگوں سے اس کے روابط تھے۔ پیتا بہت زیادہ تھا..."

"میرا مطلب ہے کوئی ایسی بات بتاؤ جو مجھے معلوم نہ ہو۔"

"مجھے کیا معلوم کہ تمہیں اس کے بارے میں کیا کچھ معلوم ہے۔ وہ زبردست رشوت خور آدمی تھا۔ دولت کمانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ اسٹاف تک کو تو زیادہ تنخواہیں سرکاری خزانے سے دلوا دیتا تھا اور ان کے جعلی بل پاس کروا دیتا تھا تاکہ ان میں سے اپنا حصہ وصول کر سکے۔ معلوم نہیں وہ کیا کچھ کرتا تھا لیکن یہ باتیں ثابت نہیں کی جا سکتیں۔ اس کے پاس شام کے بعد آفس میں دوسری سیاسی شخصیات وغیرہ بھی آتی رہتی تھیں۔"

"اس کی فائلنگ کیبنٹ بہت بڑی ہے۔ اس میں کس قسم کی فائلیں ہیں؟"

"معلوم نہیں۔ میری ان تک رسائی نہیں۔ میں نے کبھی اس کیبنٹ کو غیر مقفل نہیں دیکھا اور نہ ہی مجھے معلوم ہے کہ چابی کہاں ہوتی ہے۔" شیرون نے جواب دیا۔ تب مجھے یقین ہو گیا کہ کیبنٹ میں اگر کوئی ایسی فائل موجود بھی تھی جو اس قتل کی وجوہات پر روشنی ڈال سکتی تھی تو اب وہ وہاں نہیں رہی ہو گی۔ قاتل اسے ساتھ لے گیا ہو گا۔

شیرون کے ہاں سے رخصت ہو کر میں واپس سینیٹ آفس آیا۔ کیپٹل بلڈنگ میں ان دنوں سیکیورٹی اتنی سخت نہیں تھی جتنی آج کل ہے۔ دروازے پر صرف ایک ہی گارڈ تھا اور وہ مجھے پہچانتا تھا۔ میں اندر اپنے آفس کے استقبالیہ پر پہنچا تو سینیٹر برگ مین کے کمرے سے اس کی آواز سنائی دی۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں سینیٹر!" میں نے جواب دیا۔

"اوہ... ہیلو وارڈ!" وہ اپنے کمرے سے نکل کر استقبالیہ میں آ گیا۔ "تم غالباً اپنے کمرے سے اپنی ذاتی چیزیں لینے آئے ہو؟"

"نہیں۔ میں تم سے ایک سوال پوچھنے آیا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "کیا تم بتانا پسند کرو گے کہ تم نے رو کسن کو کیوں قتل کیا؟"

اس کے چہرے پر کرب کے جو تاثرات ابھرے ان پر مجھے اس کی اداکارانہ صلاحیتوں کی داد دینا پڑی۔ ایک لمحے کے لیے تو میں بھی سوچ میں پڑ گیا کہ کہیں میں غلط تو نہیں سمجھ رہا؟ سیاستداں واقعی بڑے باصلاحیت لوگ ہوتے ہیں!

"میرے کمرے میں آ جاؤ، وہیں بات کریں گے۔" اس نے کہا اور وہ چونکہ میرا اپنے آپ کو مسلسل احمق ثابت کرنے کا دن تھا اس لیے میں اس کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔

"میں تمہیں ایک چیز دکھانا چاہتا ہوں۔" وہ اپنی میز کے عقب میں جھکتے ہوئے بولا۔

"وہ فائل جس کے لیے تم نے رو کسن کو قتل کیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ اس کا تو میں نے بندوبست کر دیا ہے۔" وہ اطمینان سے بولا۔

دوسرے ہی لمحے وہ میری طرف مڑا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ میں نے بے یقینی سے کہا۔ "تم مجھے عین اپنے آفس کے اندر قتل نہیں کر سکتے۔"

"کیوں نہیں۔" وہ بدستور اطمینان سے بولا۔ "یہ وہی ریوالور ہے جس سے رو کسن کو قتل کیا گیا ہے۔ یہ کہیں رجسٹرڈ نہیں ہے اور اس کے بارے میں کوئی سراغ نہیں لگایا جا سکتا۔ میں کہہ دوں گا کہ اس ریوالور سے تم مجھے قتل کرنے آئے تھے۔ میں اسے چھیننے کے لیے تم پر جھپٹا۔ چھینا جھپٹی میں گولی چل گئی جو تمہیں لگ گئی۔ قصہ ختم۔"

"بات تو تمہاری معقول ہے۔" میں نے سرہلایا۔

"لیکن ایک سینیٹر کے شایانِ شان نہیں ہے۔" دروازے کی طرف سے آواز آئی۔ اب میں اس آواز کو بہ آسانی پہچاننے لگا تھا۔ یہ سراغرساں رالف کی آواز تھی جو ہاتھ میں ریوالور لیے دروازے پر کھڑا تھا۔ رابرٹ اس کے کندھے پر سے جھانک رہا تھا۔

☆ ...... ○ ...... ☆

مجھے بعد میں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ پولیس کبھی کبھی صحیح خطوط پر بھی تفتیش کر لیتی ہے۔ رالف اور رابرٹ نے جب جائے واردات سے میری عدم موجودگی کی تصدیق کر لی تھی تو میری طرح انہیں بھی یقین ہو گیا تھا کہ قاتل یا تو شیرون تھی یا پھر کوئی ایسا شخص تھا جو میرے آفس سے میری طرف سے فون کر بھی سکتا تھا اور ریسیو بھی کر سکتا تھا۔

انہیں چونکہ اختیارات حاصل تھے اس لیے وہ رو کسن کے آفس میں مقفل الماری میں موجود فائلیں بھی کھنگال چکے تھے۔ آنجہانی کانگریس مین نے آدھی کانگریس اور سینیٹروں کی بھی معقول تعداد کو بلیک میل کرنے کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ سینیٹر برگ مین پر بھی ہاتھ ڈال بیٹھا تھا۔

میری خوش قسمتی صرف یہ تھی کہ سینیٹر صحیح وقت پر رو کسن کے ہاں نہیں پہنچا تھا اور شیرون نے اتفاق سے ساڑھے آٹھ بجے کے بعد بھی اسے زندہ دیکھ لیا تھا۔ ورنہ پھندا میری گردن کے گرد بالکل صحیح طرح فٹ ہو جاتا۔

ALWAYS SOMETHING
PAUL G. REEVE

ایک تنہا عورت کے ذہنِ نارسا کی رسائیاں۔ امریکا سے تازہ درآمد

وہ دو چیزوں کے سہارے زندگی گزار رہی تھی۔ ایک ٹی وی اور دوسرا نارنجی رنگ کا بلا۔ بلا اُس کا رفیق تھا تو ٹی وی مشیر۔ ٹی وی کے کرداروں کے مکالموں سے وہ زندگی کے تمام مسائل سلجھانے کی کوشش کرتی۔ مکالمے اس کے لیے ایک اشارہ ہوتے۔ اچانک اُس کا چہیتا بلا قتل ہوگیا اور قاتل کی تلاش میں ٹی وی اُس کا رہنما بن گیا۔

ذہنِ نارسا

سبین طاہر

جاسوسی ڈائجسٹ، جولائی 1993ء

مسز مارٹن اپنے مختصر سے اپارٹمنٹ میں چھوٹے سے بلیک اینڈ وہائٹ ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر پروگرام "لاکھوں میں ایک" بڑے شوق سے دیکھتی تھیں۔ یوں تو انہیں ٹی وی کے بیشتر پروگرام ہی بہت پسند تھے لیکن سوال وجواب پر مبنی انعامی پروگرام "لاکھوں میں ایک" کا تو ہر صبح انہیں بہت ہی بے چینی سے انتظار رہتا تھا۔

بہت سے بوڑھے اور تنہا لوگوں کی طرح ٹی وی ہی ان کے لیے وقت گزاری کا سب سے بڑا ذریعہ تھا لیکن وہ تو اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی آگے چلی گئی تھیں۔ پروگرام دیکھتے وقت ان کا تخیل انہیں کہیں سے کہیں لے جاتا۔ پروگرام "لاکھوں میں ایک" کا میزبان کیمرے کی طرف دیکھ مسکراتا تو انہیں لگتا کہ وہ بطورِ خاص ان کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔ وہ پروگرام کے شرکاء میں سے کسی کے ساتھ کوئی خاص بات کرتا تو انہیں یوں لگتا کہ اس نے وہ بات ان سے کی تھی۔

کسی فلم یا ٹیلی پلے کا کوئی کردار بہت اچھا، پُردرد یا پُرسوز مکالمہ بولتا تو انہیں گمان گزرتا کہ وہ ان ہی کے ساتھ بولا گیا تھا اور ان کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگتی۔ کبھی کبھی ان کا تخیل ان کے ساتھ اور

ہی شرارت کرتا۔ وہ حقیقی زندگی کی کسی بات، کسی واقعے کے بارے میں سوچ رہی ہوتیں اور اسی دوران ٹی وی کا کوئی کمپیئر یا ٹی وی ڈرامے کا کوئی کردار مکالمہ بول دیتا اور انہیں یہ محسوس ہوتا کہ اس نے ان سے ان کی حقیقی زندگی کے بارے میں کوئی بات کی ہے، انہیں کوئی اشارہ دیا ہے، ان کی زندگی کا کوئی بھید کھولا ہے۔

غرضیکہ ٹی وی ان کا شریکِ مسرت، رفیقِ غم، ان کا دوست، ان کا ساتھی، ان کا مشیر اور دنیا کی بہت سی پوشیدہ باتیں جاننے والا نہایت قابلِ اعتماد عزیز یا رشتے دار تھا جو گھر میں ان کے ساتھ رہ رہا تھا، انہیں مشورے دیتا تھا۔ ان کی زندگی میں دو ہی چیزوں کا سب سے زیادہ عمل دخل تھا بلکہ یہ کہنا غلط نہیں تھا کہ وہ صرف دو چیزوں کے سہارے زندگی کے باقی دن گزار رہی تھیں۔ ایک ٹی وی اور دوسرا ان کا خوب پلا ہوا، موٹا تازہ نارنجی رنگ کا بلا...... جس کا نام ونگی تھا۔

اس روز بھی وہ صبح ہی صبح اپنا ناشتا جو صرف چائے اور توس پر مشتمل تھا، لے کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئی تھیں۔ پروگرام "لاکھوں میں ایک" شروع ہو چکا تھا۔ میزبان راڈ رونی مقابلے کے شرکاء کا تعارف حاضرین سے کرا رہا تھا اور مسز مارٹن قدرے تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ سوچ رہی تھیں۔ "آج وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے گا یا نہیں؟"

انہیں جلد ہی اس سوال کا جواب مل گیا۔ راڈ رونی کا کلوز اپ آیا۔ وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکرا رہا تھا۔ مسز مارٹن کے خزاں رسیدہ وجود میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ رگ و پے میں حرارت سی پھیل گئی۔

"تم نے دیکھا ونگی....؟" انہوں نے مرتعش لہجے میں اپنے بلّے کو مخاطب کیا۔ "وہ صرف میرے لیے مسکرایا تھا۔ آج کا دن اچھا گزرے گا۔"

صوفے پر لیٹے ہوئے جسیم بلّے نے اپنا نام سن کر ایک کان ہلایا لیکن آنکھیں نہیں کھولیں۔ مسز مارٹن پیار سے اس کا سر سہلانے لگیں۔ انہیں خوشی تھی کہ ان کے دن کا آغاز خوشگوار انداز میں ہو رہا تھا۔

مسز مارٹن ایک مدت سے تنہا رہ رہی تھیں۔ اب تو انہیں ماہ و سال کا حساب بھی یاد نہیں رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ کب کی بات تھی کہ وہ اپنے شوہر لیونارڈ مارٹن کے ساتھ رہتی تھیں لیکن اتنا انہیں یاد تھا کہ زندگی اس وقت بھی کچھ ایسی خوشگوار نہ تھی۔ شادی کے ابتدائی برسوں سے بھی کوئی حسین یاد وابستہ نہ تھی۔

اس کی بڑی وجہ غربت تھی۔ انہوں نے تو یہی دیکھا تھا کہ زندگی کا ہر نیا دن نئے مالی مسائل لے کر آیا تھا۔ ان دنوں انہوں نے جلدی جلدی نہ جانے کتنے اپارٹمنٹ تبدیل کیے۔ ہر اپارٹمنٹ ڈربے سے مشابہ تھا اور اس میں پھیلی ہوئی بُو مسز مارٹن کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی تھی۔ وہ بُو گھٹیا بیئر کی ہوتی تھی۔ مارٹن کی زندگی کی واحد دلچسپی بیئر تھی۔ دن رات وہ کچھ اس طرح بیئر پیتا تھا جیسے اس کا دنیا میں آنے کا مقصد ہی بیئر پینا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد بھی ایک طویل عرصے تک مسز مارٹن اپارٹمنٹ کو بیئر کی بُو سے پاک نہیں کر سکی تھیں۔

جتنا عرصہ شوہر زندہ رہا، مسز مارٹن اسے راہِ راست پر لانے کی کوششیں کرتی رہیں۔ ان کے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی تھی جس کا نام انہوں نے کیرول رکھا تھا۔ اس کے جوان ہونے تک وہ اسے اس رسوائی اور بُری شہرت سے بچانے کی کوشش کرتی رہیں جو ان کے شوہر کی وجہ سے اس کنبے کے حصے میں آئی تھی۔ انہوں نے کیرول کو غربت کے اثرات سے بچانے کی بھی اپنی سی کوشش کی۔

لیکن اس ساری جدوجہد کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ سترہ سال کی ہوتے ہی وہ اپنی پسند کے لڑکے سے شادی کرنے کے لیے گھر سے بھاگ گئی۔ اب وہ کیلیفورنیا میں رہ رہی تھی اور بیس سال سے اس نے پلٹ کر ماں کی خبر نہیں لی تھی، اسے کبھی اپنے ہاں مدعو نہیں کیا تھا۔ وہ تو خط بھی شاذ و نادر ہی لکھتی تھی۔ اسے شاید یاد بھی نہیں تھا کہ ماں نے اس کے لیے کیا کیا قربانیاں دی تھیں۔ کبھی کبھی تو مسز مارٹن تعجب سے سوچا کرتیں کہ اگر اب کیرول ان کے سامنے آئے تو وہ اسے پہچان بھی سکیں گی یا نہیں؟

ان کی زندگی کو مارٹن ہی نے قابلِ رحم بنائے رکھا اور پچاس برس کی عمر کو پہنچ کر وہ بستر پر گر گیا۔ تین سال وہ بستر پر رہا۔ مسز مارٹن نے دن رات اس کی خدمت کی۔ ان کے پاس جو تھوڑی بہت جمع پونجی تھی، وہ جلد ہی اس کی دواؤں، آپریشن اور علاج معالجے کے دیگر سلسلوں میں خرچ ہو گئی۔

تاہم اس مرد کے باحوصلہ ہونے میں کوئی شک نہیں تھا۔ بسترِ علالت پر بھی وہ یہ فرمائش کیے بغیر نہیں رہ سکا کہ اس کی بیوی صرف ایک بار کہہ دے کہ وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ وہی بیوی جسے اس نے غربت، فاقہ کشی، رسوائی اور دکھوں کے سوا کچھ نہیں دیا تھا۔ اس کی فرمائش پر مسز مارٹن اپنی سسکیاں روکنے کی کوشش کرتے ہوئے، منہ پھیر کر کچن میں چلی گئیں۔

اب بڑھاپا وہ شکاگو کے اس عسرت زدہ علاقے میں چھوٹے چھوٹے دو کمروں کے اس غریبانہ سے اپارٹمنٹ میں گزار رہی تھیں جو ایک پرانی عمارت میں واقع تھا۔ وہ صرف سودا سلف لینے کے لیے گھر سے نکلتی تھیں۔ پڑوسیوں سے ملنا جلنا وہ پسند نہیں کرتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ نئے زمانے کے ان لوگوں کو دوسروں کے آرام اور خوشی کا ذرا بھی خیال نہیں تھا اور وہ ہمیشہ دوسروں کو ستانے کی فکر میں رہتے تھے۔ انہوں نے تو کئی بار عمارت کے نگراں سے شکایت بھی کی تھی کہ ان کے فلاں فلاں پڑوسی یا پڑوسن نے انہیں ستانے کے لیے کیا کیا حرکتیں کیں لیکن نگراں نے ہمیشہ انہیں یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ ان کا وہم تھا۔ وہ سوچتی بہت زیادہ تھیں اس لیے بہت سی باتیں فرض کر لیتی تھیں۔ نگراں کی اس

رائے پر مسز مارٹن تلملا کر چپ ہو کر بیٹھ گئی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے کسی کی بھی شکایت کرنا چھوڑ دی تھی۔

اب ان کا ٹی وی، اس پر نظر آنے والے لوگ اور ان کا ونگی۔ یہی ان کا کنبہ تھا جس کے ساتھ وہ زندگی کے یکسانیت زدہ روز و شب گزار رہی تھیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ محبت انہیں اپنے ونگی سے تھی۔ چھ سال قبل وہ چوہے جتنا تھا اور ایک عقبی گلی میں بھوک پیاس سے بدحال میاؤں میاؤں کرتا انہیں ملا تھا۔ اب وہ خوب فربہ اندام تھا اور مسز مارٹن کو جتنا عزیز تھا اتنا شاید بعض لوگوں کو اپنی اولاد بھی عزیز نہیں تھی۔

ٹی وی پر اس وقت پروگرام ”ہمیں جینے دو“ چل رہا تھا۔ اس موضوع پر ہر بار ایک مختلف فلم دکھائی جاتی تھی۔ اس وقت وہ فلم میں کھوئی ہوئی تھیں جب دروازے پر دستک ہوئی۔ مسز مارٹن نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ وہ اس وقت اٹھ کر دروازہ کھولنا نہیں چاہتی تھیں۔ ان کی کوشش تھی کہ دستک دینے والا واپس چلا جائے۔

لیکن وہ بھی واپس جانے پر آمادہ نہیں تھا۔ کئی بار دستک دینے کے بعد بہ آوازِ بلند بولا۔ ”مسز مارٹن! میں بوب ہوں۔ دروازہ کھولیے۔“

بوب عمارت کے نگراں کا نام تھا۔ مسز مارٹن ٹی وی اسکرین سے نظر ہٹائے بغیر باول نخواستہ الٹے قدموں دروازے کی طرف بڑھیں اور زنجیر ہٹائے بغیر دروازہ تھوڑا سا کھولا۔ بوب بولا۔ ”دروازہ کھولیے۔ آپ شکایت کر رہی تھیں کہ باتھ روم کی کسی ٹونٹی سے پانی ٹپکتا رہتا ہے۔ میں اسے ٹھیک کرنے آیا ہوں۔“

مسز مارٹن نے دروازہ کھولا۔ بوب ابھی اندر آ ہی رہا تھا کہ نارنجی رنگ کی کوئی چیز بجلی کی سی تیزی سے کمرے سے باہر چلی گئی۔ ایک لمحے کی تاخیر سے دونوں کو احساس ہوا کہ وہ تو ونگی تھا جو کچھ دیر سے باہر جانے کو بے قرار تھا اور موقع پاتے ہی تیزی سے نکل گیا تھا۔ مسز مارٹن ہمیشہ اسے اپنے ساتھ لے کر نکلتی تھیں، تنہا کبھی باہر جانے نہیں دیتی تھیں اور اس وقت چونکہ وہ ٹی وی دیکھنے میں منہمک تھیں اس لیے انہوں نے ونگی کی بے تابی پر دھیان نہیں دیا تھا۔

ونگی پلک جھپکتے میں راہداری سے گزر کر سیڑھیوں پر پہنچ چکا تھا۔ مسز مارٹن بے تابی سے چلاّئیں۔ ”ونگی... ونگی... واپس آؤ۔“ پھر وہ برہمی سے بوب سے مخاطب ہوئیں۔ ”دیکھا... تمہاری وجہ سے ونگی نکل گیا۔ جاؤ جلدی سے اسے واپس لاؤ... ہائے میرا ونگی!“

بوب نے ٹھنڈی سانس لی اور اپنی بیزاری چھپاتے ہوئے بولا۔ ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں اسے ڈھونڈ لاؤں گا۔“

لیکن ایک گھنٹے کی تلاش کے بعد بھی عمارت میں ونگی کا کہیں نام و نشان تک نہ ملا۔ مسز مارٹن اس دوران دروازے پر کھڑی ہاتھ ملتی رہیں اور ونگی کو پکارتی رہیں۔ بوب ناکام واپس آیا تو مسز مارٹن نے فرمائش کی کہ انہیں ہر فلیٹ کا دروازہ کھٹکا کر ونگی کے بارے میں معلوم کرنا چاہیے۔

بوب نے باول نخواستہ ہامی بھر لی اور مسز مارٹن بیڈ روم سلیپروں میں ہی گھسر گھسر کرتی اس کے ساتھ ہو لیں۔ ہر دروازے پر دستک دینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ کچھ کرایہ دار گھر پر نہیں تھے، کچھ صحیح طرح انگلش نہیں سمجھتے تھے اور کچھ نے اچھی خاصی ناراضگی کا اظہار کیا کیوں کہ ان کے آرام میں خلل پڑا تھا۔ اس وقت تقریباً دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا جب وہ چھٹی منزل پر ایک دروازے پر پہنچے جس پر مسز ڈائس کے نام کی تختی لگی تھی۔

بوب اس دروازے پر رکتے ہوئے بولا۔ ”مجھے معلوم ہے یہ خاتون تنہا رہتی ہے اور رات کو کام کرتی ہے، دن میں سوتی ہے۔ اس وقت یہ بے چاری سو رہی ہوگی اس سے ہم شام میں معلوم کر لیں گے۔“

”ہرگز نہیں۔“ مسز مارٹن چلاّ اٹھیں۔ ”تم بات کو سمجھ نہیں رہے ہو۔ ونگی کبھی اپارٹمنٹ سے اکیلا باہر نہیں نکلا۔ معلوم نہیں وہ کہاں نکل جائے اور اس کا کیا حال ہو۔ ہمیں اس کو تلاش کرنا پڑے گا۔“

بالآخر دروازے پر دستک دی گئی۔ کچھ دیر بعد بکھرے بالوں اور غنودگی زدہ چہرے والی ایک عورت نے دروازہ کھولا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ بے چاری گہری نیند سے اٹھ کر آ رہی تھی۔ بوب نے جب اپنی آمد کی وجہ بیان کی تو نیند کے خمار سے بوجھل اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”تم نے ایک بلّے کے بارے میں پوچھنے کے لیے مجھے جگا دیا؟“

وہ شاید اسے گالیاں سنانے والی تھی لیکن اسی لمحے اس کی نظر مسز مارٹن کے چہرے پر پڑ گئی جو بے چارگی کی تصویر بنا ہوا تھا' ان کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ تب وہ گویا اپنا غصہ پیتے ہوئے بولی۔ "خاتون! فی الحال تو میں نے تمہارے بلّے کو نہیں دیکھا۔ نظر آیا تو ضرور بتاؤں گی۔" اس نے ٹھک سے دروازہ بند کر لیا۔

"یہ آخری اپارٹمنٹ تھا۔" بوب نے اعلان کیا۔

"اس کا مطلب ہے وہ چلا گیا.... میرا ونگی گم ہو گیا...." مسز مارٹن ہاتھ ملتے ہوئے رونے لگیں۔

"وہ کہیں بھی نہیں جائے گا۔ واپس آ جائے گا۔ جب اسے بھوک لگے گی تب تو ضرور آ جائے گا۔ ہو سکتا ہے آپ نیچے پہنچیں تو وہ دروازے پر بیٹھا آپ کا انتظار کر رہا ہو۔ مجھے تو اب بہت سے کام کرنے ہیں' میں چلتا ہوں۔" بوب جلدی سے کھسک لیا۔

نیچے پہنچ کر مسز مارٹن کا دل ڈوبنے لگا۔ ونگی واپس نہیں آیا تھا۔ مزید کچھ دیر سسکیاں لینے کے بعد مسز مارٹن نے پولیس کو فون کیا۔ فون ریسیو کرنے والے آفیسر کی آواز سے اندازہ ہوا کہ پہلے تو وہ مسز مارٹن کی بات سن کر حیران رہ گیا تھا تاہم بعد میں اس نے ہمدردانہ انداز میں بات کرتے ہوئے ونگی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کر لی۔ مسز مارٹن نے اسے ونگی کی تمام نشانیاں تفصیل سے بتائیں پھر اصرار کیا کہ آفیسر ساری تفصیلات پڑھ کر انہیں سنائے تاکہ انہیں یقین ہو جائے کہ اس نے رپورٹ صحیح لکھی تھی۔ آفیسر نے ان کی یہ فرمائش بھی پوری کر دی۔

فون بند کر کے مسز مارٹن نے ونگی کے چھوٹے سے برتن میں کلیجی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈالے جو انہیں گلی کا قصاب جس کا نام وہائٹ تھا' خاص طور پر کاٹ کر دیتا تھا۔ مسز مارٹن وہ برتن لیے پچھلی سیڑھیوں پر ونگی کے انتظار میں بیٹھی رہیں اور وقفے وقفے سے اسے آوازیں دیتی رہیں۔ حتیٰ کہ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا اور سردی اتنی بڑھ گئی کہ باہر بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ مجبوراً وہ اندر آ گئیں۔

ونگی کے بغیر وہ چھوٹا سا اپارٹمنٹ گویا بہت بڑا اور خالی خالی سا لگ رہا تھا۔ مسز مارٹن ایک ہاتھ سے ونگی کا چھوٹا سا گدا سینے سے لگائے دوسرے ہاتھ سے سُوپ پیتے ہوئے ٹی وی دیکھنے لگیں۔ منگل کی رات کی خصوصی فلم چل رہی تھی۔ وہ ایک المیہ فلم تھی۔ مسز مارٹن کے آنسو سُوپ میں مدغم ہونے لگے۔ فلم کے آخر میں مصیبت زدہ ہیروئن سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔ "اس دنیا میں کسی کو کسی کی پروا نہیں۔ کسی کو پروا نہیں...." بالآخر اس کا چہرہ دھندلا گیا۔

مسز مارٹن ٹشو پیپر سے ناک پونچھتے ہوئے بڑبڑائیں۔ "بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ یہ دنیا والے کسی کی پروا نہیں کرتے۔"

رات بھر وہ ونگی کا گدا سینے سے لگائے کھڑکی کے قریب راکنگ چیئر پر بیٹھی رہیں۔ کبھی ذرا غنودگی میں چلی جاتیں' کبھی چونک کر عقبی کھڑکی کے شیشے سے سیڑھیوں کی طرف دیکھنے لگتیں۔ ونگی کا برتن وہ سیڑھیوں پر ہی رکھ آئی تھیں لیکن وہ جوں کا توں رکھا تھا۔ اس میں موجود کلیجی کے ٹکڑے سیاہ ہوتے جا رہے تھے۔

صبح ہو گئی اور ونگی واپس نہ آیا۔ سورج نے جونہی کمرے میں روشنی پھیلائی' مسز مارٹن جھرجھری سی لے کر کرسی پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ ان کی بے خواب آنکھیں سرخ اور متورم تھیں۔ افسردہ سے لہجے میں انہوں نے گویا خالی کمرے کو مخاطب کیا۔ "ونگی یقیناً مر چکا ہے۔ میرا ونگی مر چکا ہے اور کسی کو کوئی پروا نہیں۔ میرے آس پاس کے لوگوں میں سے ہی کسی نے اسے پکڑ کر مار دیا ہو گا۔ یہ دنیا والے ہمیشہ کسی نہ کسی پر ظلم ڈھانے کا موقع تلاش کرتے رہتے ہیں۔ میں ایک بوڑھی' کمزور اور تنہا عورت ہوں۔ میں بھلا کیا کر سکتی ہوں۔"

ناشتے اور اپارٹمنٹ کی صفائی کے بعد انہوں نے پولیس اسٹیشن فون کیا۔ ڈیوٹی پر موجود آفیسر نے انہیں بتایا کہ نارنجی رنگ کے کسی بلّے کے بارے میں ابھی کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ اس کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔

"سراغ ملے نہ ملے' تمہیں کیا پروا۔ تم کون سا اسے تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔" مسز مارٹن نے تلخ لہجے میں کہا اور کھٹ سے فون بند کر دیا۔

وہ عمارت کے نگران بوب کے گھر بھی گئیں تاکہ ایک بار پھر اس سے ونگی کو تلاش کرنے کے لیے کہیں لیکن وہ گھر پر نہیں ملا اور اس کی بیوی نے صاف کہہ دیا۔ "وہ چوتھی منزل پر ایک دروازہ مرمت کر رہا ہے اور اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ ایک بلّے کو تلاش کرتا پھرے۔"

دل میں غم و غصے کا طوفان لیے مسز مارٹن "لاکھوں میں ایک" دیکھنے ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئیں۔ چائے کا کپ ان کے ہاتھ میں تھا۔ پروگرام کے شرکاء آج اتنے احمق اور کوڑھ مغز تھے کہ ان کے ساتھ دماغ سوزی کرتے ہوئے بے چارہ راڈ رونی ان کی طرف دیکھ کر مسکرانا بھی بھول گیا۔ ان کا ذہن ادھر اُدھر بھٹکنے لگا۔ وہ اس وقت چونکیں جب تیز موسیقی کے درمیان انہوں نے کمپیئر کو یہ کہتے سنا۔ "یہ کام.... مسز ڈائس کا ہے۔"

مسز مارٹن سن سی ہو کر رہ گئیں اور کئی منٹ تک ساکت بیٹھی رہیں۔ انہوں نے نہ تو یہ سنا کہ راڈ رونی نے اس سے پہلے کیا کہا تھا اور اس کے بعد تو وہ کچھ سننے کے قابل ہی نہیں رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا تھا اور کانوں میں شائیں شائیں ہونے لگی تھی۔ انہوں نے جو کچھ سنا تھا اس پر انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس سے پہلے راڈ رونی نے براہ راست ان سے کوئی بات نہیں کی تھی لیکن آج کی تھی تو بڑے کام کی بات کی تھی۔ ظاہر ہے وہ ان کا دوست اور خیر خواہ تھا۔ اسے بھلا ان سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟

"مسز ڈائس..." بالآخر وہ آنکھیں سکیڑ کر ٹی وی کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑائیں۔ "مسز ڈائس نے میرے ونگی کو ہلاک کیا ہے۔ لیکن کیوں راڈ؟ مجھے بتاؤ تو سہی اس ظالم عورت نے ایسا کیوں کیا؟"

لیکن راڈ رونی اب مقابلے کے دوسرے شرکاء سے سوال و جواب میں مصروف ہو چکا تھا۔ وہ مڑ کر انکی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔
مسز مارٹن چند لمحے اپنے چائے کے کپ کو تکتی رہیں۔ ان کے ذہن میں طوفان برپا تھا۔ بالآخر وہ اٹھیں اور پچھلی سیڑھیوں کے راستے تہ خانے کی طرف چل دیں جہاں ان کا لاکر موجود تھا جو چھوٹے سے اسٹور کا کام دیتا تھا۔

دوسری صبح مسز ڈائس منہ اندھیرے ڈیوٹی سے واپس آ رہی تھی۔ وہ تمام رات کھلی رہنے والی ایک مارکیٹ میں کام کرتی رہتی تھی اور اس وقت سخت تھکی ہوئی تھی۔ اس کے ذہن میں اپنے نرم گرم بستر کا تصور تھا اور وہ عمارت کی عقبی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے۔

پانچویں منزل پر اسے اندھیرا نظر آیا۔ شاید وہاں کی لائٹ خراب تھی۔ اس منزل کی سیڑھیاں وہ اندھیرے میں احتیاط سے چڑھ رہی تھی۔ وہ تنگ سی سیڑھیوں کے کونے پر پہنچی تو اچانک ہی اندھیرے سے ایک ہیولا نمودار ہوا۔ وہ غالباً کوئی پستہ قامت سا شخص تھا جو اپنے سائز سے کہیں بڑا، بے ہنگم سا اوور کوٹ اور پیشانی تک جھکا ہوا ہیٹ پہنے ہوئے تھا۔

خوف سے مسز ڈائس کا منہ کھلا لیکن چیخ اس کے حلق سے برآمد نہ ہو سکی کیوں کہ اسی لمحے اس کا پاؤں کسی چکنی چیز پر پھسل گیا۔ وہ ایک سیڑھی نیچے کمر کے بل چوبی جنگلے پر جا ٹکی لیکن اس ہیولے نے جلدی سے اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی اسے دھکا دے دیا۔ وہ چوبی جنگلے کے اوپر سے الٹ کر پانچ منزل نیچے سیدھی پارکنگ لاٹ کے پختہ فرش پر سر کے بل جا کر گری۔ اس کے گرنے کی آواز زیادہ اونچی نہیں تھی لیکن آس پاس اگر کوئی اور سننے والا ہوتا تو یقیناً جھرجھری لے کر رہ جاتا۔ ہیولے پر شاید اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔

دن چڑھے مسز مارٹن اپنے ناشتے کے برتن دھو رہی تھیں جب انہوں نے باہر راہداری میں لوگوں کے بولنے کی آوازیں سنیں۔ انہوں نے دروازہ تھوڑا سا کھولا تو بوب کو ایک دراز قد پولیس آفیسر کے ساتھ راہداری میں کھڑے دیکھا۔ آفیسر نوجوان ہی تھا اور اس کے چہرے پر کم عمری کی بشاشت اور معصومیت تھی۔

"تم میرے بلّے ونگی کے بارے میں کوئی خبر لے کر آئے ہو؟" مسز مارٹن نے آفیسر سے پوچھا۔ "میرا خیال ہے وہ مر چکا ہے۔"

آفیسر نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا شاید بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، بوب نے مسز مارٹن کو مخاطب کیا۔ "بلڈنگ میں ایک حادثہ ہو گیا ہے۔"

"حادثہ...؟ کیسا حادثہ؟" مسز مارٹن نے آنکھیں سکیڑیں۔
"تمہیں یاد ہے چھٹی منزل پر مسز ڈائس رہتی تھی؟" بوب نے پوچھا۔

مسز مارٹن نے بے وقوفانہ سے انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔
تب نوجوان پولیس آفیسر بولا۔ "وہ اوپر کی کسی منزل سے گر کر مر گئی ہے۔ آپ نے صبح منہ اندھیرے کسی قسم کی کوئی آواز تو نہیں سنی؟"

اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے مسز مارٹن آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولیں۔ "اوہ... خدا کی پناہ! یہ عمارت تو اب رہنے کے لیے بالکل محفوظ نہیں رہی۔" پھر جیسے انہیں کچھ خیال آیا۔ "وہ عورت شراب کے نشے میں تو نہیں تھی؟ آج کل مرد کیا، عورتیں کیا، سبھی بہت شراب پیتے ہیں۔"

آفیسر جلدی سے بولا۔ "معاف کیجئے ہم نے آپ کو زحمت دی۔ ہم اب چلتے ہیں۔"

وہ بوب کے ساتھ جانے کے لیے مڑا تو عقب سے مسز مارٹن نے پکارا۔ "سنو... تمہارا نام کیا ہے؟"

"مرفی... میڈم!" آفیسر نے ملائمت سے جواب دیا۔

"میرا خیال تھا تمہیں میرے بلّے کے بارے میں کچھ علم ہو گا۔ اس کا نام ونگی ہے۔ وہ نارنجی رنگ کا ایک بہت پیارا بلّا ہے۔ میں نے اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی تھی۔ دنیا میں میرا اس کے سوا کوئی نہیں..." وہ بھرائی ہوئی سی آواز میں اس کی کچھ اور نشانیاں گنوانے لگیں۔ انہیں افسوس تھا کہ وہ مر چکا تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ اسے کس نے مارا تھا لیکن یہ باتیں پولیس آفیسر کو معلوم نہیں ہونی چاہئیں تھیں۔

"میں اسے تلاش کرنے کی کوشش کروں گا میڈم!" پولیس آفیسر کے لہجے میں خلوص تھا۔

"آؤ، اندر آ جاؤ۔ چائے پینا پسند کرو گے؟" مسز مارٹن نے دعوت دی اور انہیں خود پر حیرت ہوئی۔ مدتوں سے عمارتوں کے نگرانوں کے سوا کسی نے ان کے گھر میں قدم نہیں رکھا تھا۔

"بہت شکریہ لیکن معذرت چاہتا ہوں۔ اس وقت میں ڈیوٹی پر ہوں۔" مرفی نے نہایت شائستگی اور ملائمت سے کہا پھر وہ رخصت ہو گیا۔

اس روز پروگرام "لاکھوں میں ایک" کے دوران راڈ رونی ان سے نظر نہیں ملا رہا تھا لیکن مسز مارٹن کو احساس تھا کہ وہ کن انکھیوں سے ان کی طرف ضرور دیکھ رہا تھا۔ مسز مارٹن نے اثبات میں سر ہلا کر اسے تسلی دی کہ انہیں اس کا پیغام سمجھنے میں دقت نہیں ہوئی تھی اور اس کی روشنی میں جو قدم اٹھانا ضروری تھا وہ انہوں نے اٹھا لیا تھا۔

"لاکھوں میں ایک" کے بعد فلم سیریز "ہمیں جینے دو" شروع ہوئی۔ اس میں آج کی فلم بھی رنج والم سے بھرپور تھی۔ ہیروئن پر

صدموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ آخری سین میں جب کہ وہ غموں سے چُور، اسپتال کے بیڈ پر لیٹی تھی، ایک ڈاکٹر سفید کوٹ پہنے کمرے میں داخل ہوا۔ تب ہیروئن یکدم بستر سے اٹھی اور اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگی۔ "یہی اس المیے کا ذمے دار ہے یہ قصائی....."

اس کے بعد اشتہار چلنے لگے۔ مسز مارٹن کا سر گھوم رہا تھا۔ انہوں نے اٹھ کر ٹی وی کا سوئچ آف کر دیا۔ ان کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور دُکھتے ہوئے ذہن میں بہت سی باتیں گڈمڈ ہو کر رہ گئی تھیں۔

"اچھا... تو یہ قصائی کا کام تھا!" وہ بڑبڑائیں۔ "راڈرونی سے غلطی ہو گئی تھی۔ وہ صحیح مجرم کی نشاندہی نہیں کر سکا تھا..... تبھی تو میں کہوں، آج وہ مجھ سے نظر کیوں نہیں ملا رہا تھا۔ بے چاری مسز ڈائس!"

مسز مارٹن نے وہ رات بھی بے خوابی اور بے آرامی میں گزاری۔ دوسری صبح وہ بہت جلدی اٹھ کر تیار ہو گئیں۔ سردی بہت تھی۔ انہوں نے گرم کپڑے، اوورکوٹ اور دستانے پہنے اور پیدل قصاب وہائٹ کی دکان تک پہنچیں۔ ابھی دکان کھلی نہیں تھی لیکن شیشے کے دھندلائے ہوئے دروازے سے مسز مارٹن دیکھ سکتی تھیں کہ وہائٹ اندر گوشت کاٹنے کی مشین کے پاس کھڑا کام میں مصروف تھا۔ مسز مارٹن نے مستعدی سے دروازے پر دستک دی۔

وہائٹ نے پلٹ کر دیکھا اور ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ دروازے پر آکر اس نے دروازہ ذرا سا کھولا اور ہلکی سی ناگواری سے بولا۔ "مسز مارٹن! آپ سائن بورڈ نہیں دیکھ رہیں؟ دکان ابھی نہیں کھلی۔ آپ تھوڑی دیر میں آجایئے گا۔"

"میں ادھر سے گزر رہی تھی۔ سوچا دوپہر کے کھانے کے لیے بھیڑ کی چانپیں لیتی چلوں۔ دوبارہ آنا میرے لیے مشکل ہو گا۔ تمہیں معلوم ہے، بوڑھی عورت ہوں، سیڑھیاں چڑھنا اترنا اور پیدل چلنا میرے لیے کوئی آسان کام نہیں..."

یہ کہتے ہوئے وہ وہائٹ کو دھکیلتی دکان میں داخل ہو چکی تھیں اور وہائٹ کو شاید اس کا احساس بھی نہیں ہو سکا تھا۔ دروازہ انہوں نے اپنے عقب میں بند کر دیا تھا۔ انہوں نے قصاب کی آنکھوں میں جھانکا اور اس کی ڈھٹائی پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ اس کی آنکھوں میں احساسِ جرم یا پچھتاوے کی پرچھائیں تک نہیں تھی۔ وہ یقیناً ایک سنگدل اور بدفطرت انسان تھا۔ برسوں وہ بے چارے ونگی کے لیے کلیجی کاٹ کاٹ کر دیتا رہا تھا اور اب شاید اسی کو کاٹ کر اپنے سرد خانے میں لٹکا چکا تھا۔ اس تصور سے مسز مارٹن کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔

"بھیڑ کی چانپیں تو ابھی سرد خانے میں ہیں مسز مارٹن! میں بہت مصروف ہوں..."

مسز مارٹن نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں تمہاری برسوں پرانی گاہک ہوں مسٹر وہائٹ! کیا تم میرے لیے اتنی سی زحمت بھی نہیں کر سکتے؟ میں نے اس سے پہلے کبھی تم سے کوئی خصوصی فرمائش کی ہے؟" ان کا لہجہ التجائیہ تھا اور چہرے پر بے پناہ بے چارگی تھی۔

وہائٹ نے ایک اور ٹھنڈی سانس لی۔ چھت کی طرف دیکھ کر آنکھیں گھمائیں اور آخر بے بسی سے کندھے اچکا کر سرد خانے کی چھت کی طرف چل دیا جو دکان کے عقبی حصے میں واقع تھا۔ مسز مارٹن اس کے پیچھے تھیں۔ وہ دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ یخ بستہ سرد خانے سے سرد بھاپ کا جھونکا سا باہر آیا۔

مسز مارٹن نے پھرتی سے دروازہ بند کر دیا اور باہر کی طرف تالے میں لگی ہوئی چابی گھما کر اسے مقفل کر دیا گیا۔ اندر کی طرف سے دھات کے دروازے پر وہائٹ کے گھونسے برسانے کی آواز آئی مگر وہ باہر بہت مدھم سنائی دے رہی تھی۔ مسز مارٹن نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ انہوں نے وہائٹ کے کاؤنٹر کی دراز سے کاغذ اور مارکر تلاش کر کے جلی حروف میں لکھا۔ "بیماری کی وجہ سے دکان آج بند رہے گی۔"

مسز مارٹن نے یہ کاغذ بیرونی دروازے پر چپکا دیا اور اسے بھی مقفل کر کے گھر واپس روانہ ہو گئیں۔

دوسری صبح دستک سن کر انہوں نے دروازہ کھولا تو پولیس آفیسر مرفی کو سامنے کھڑے پایا۔ وہ سردی زدہ اور تھکن سے چُور دکھائی دے رہا تھا۔

"معاف کیجیے گا مسز مارٹن! میں ایک بار پھر آپ کو زحمت دے رہا ہوں... اور ہاں.... اس بات کی بھی معذرت کہ اس بار بھی میں آپ کے ونگی کے بارے میں کوئی خبر نہیں لایا۔" وہ شائستگی سے بولا۔

"تو کیا ابھی تک مسز ڈائس کے بارے میں ہی پوچھ گچھ کر رہے ہو؟"

"نہیں۔ میرا خیال ہے اس بار معاملہ قتل کا ہے اور ہم آس پاس کے تمام لوگوں سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔" مرفی نے جواب دیا۔

"اب اس بلڈنگ میں قتل بھی ہونے لگے۔ خدا کی پناہ! ایسا لگتا ہے جیسے ساری دنیا ایک دوسرے کو قتل کرنے پر لگی ہوئی ہے۔" مسز مارٹن کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"نہیں... قتل اس عمارت میں نہیں ہوا مسز مارٹن! گلی کے قصاب مسٹر وہائٹ کو قتل کیا گیا ہے۔ آپ یہ بتائیں، آپ نے حال ہی میں گلی میں کسی مشکوک قسم کے شخص کو گھومتے پھرتے تو نہیں دیکھا؟"

"مسٹر وہائٹ کو قتل کر دیا گیا ہے؟" مسز مارٹن نے سخت حیرت زدہ نظر آنے کی کوشش کی۔ "میں تو اسے برسوں سے جانتی تھی..." پھر انہوں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "تم مشکوک قسم کے شخص کے

بارے میں پوچھ رہے ہو۔ مجھے تو اس معاشرے میں سبھی مشکوک نظر آتے ہیں۔ کیا مسٹر وہائٹ کے ہاں ڈاکا پڑا تھا جس میں وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے؟"

"نہیں۔ ہمارا خیال ہے کسی نے دشمنی کی بنا پر اسے قتل کیا ہے۔ اسے اس کے سرد خانے میں بند کر دیا گیا تھا۔" مرفی نے بتایا۔

"اوہ خدایا...!" مسز مارٹن کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "آج کل تو کسی کی جان محفوظ نہیں ہے۔ مجھ جیسی بوڑھی عورت کے لیے تو یہ حالات سخت خوفزدہ کر دینے والے ہیں۔"

مرفی اپنی نوٹ بک بند کر چکا تو مسز مارٹن بولیں۔ "تم بہت اچھے آدمی ہو۔ تمہیں دیکھ کر مجھے اپنے آنجہانی بھائی کی یاد آجاتی ہے۔ آؤ... اندر آجاؤ۔ میرے ساتھ ایک کپ چائے پی لو۔ وکی کے بغیر میں اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کر رہی ہوں۔"

مرفی کے چہرے پر شرمیلی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "آپ بھی بہت اچھی خاتون ہیں۔ آپ کو دیکھ کر مجھے اپنی دادی اماں یاد آجاتی ہیں۔ میں آپ کے بلّے کی تلاش میں ہوں۔ مجھے امید ہے کہ وہ کہیں نہ کہیں مل جائے گا۔ چائے میں اس وقت بھی نہیں پی سکتا' ڈیوٹی پر ہوں لیکن کبھی فرصت ہوئی تو ضرور آپ کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیوں گا۔" وہ رخصت ہو گیا۔

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر مسز مارٹن اپنے میلے کپڑے دھونے کے لیے تہ خانے میں چلی گئیں۔ لانڈری روم میں انہوں نے اپنے کپڑے مشین میں ڈالے اور ان کے دھلنے کے انتظار میں بیٹھ گئیں۔ ان کا ذہن ایک بار پھر اِدھر اُدھر بھٹکنے لگا۔ اچانک انہوں نے دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں سنیں۔ وہ باتیں کرتے ہوئے دروازے کے قریب سے گزر کر لاکر روم میں چلے گئے۔ انہیں لانڈری روم میں مسز مارٹن کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا۔ مسز مارٹن ان کی آوازیں صاف طور پر سن سکتی تھیں۔ ان میں سے ایک تو عمارت کا نگران بوب تھا۔ دوسرا کوئی نامعلوم شخص تھا۔

نامعلوم شخص بولا۔ "سنا ہے پرسوں تم اس خبطی بڑھیا کا بلّا تلاش کر رہے تھے۔ تمہیں اسی کام کی تنخواہ ملتی ہے آجکل؟"

بوب نے جواباً جو کہا' مسز مارٹن... وہ نہیں سن سکیں پھر نامعلوم شخص نے بھی کچھ کہا جس پر دونوں نے قہقہہ لگایا پھر بوب کی آواز سنائی دی۔ "تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟" اس کے بعد وہ اداکاروں والے انداز میں بولا۔ "پولیس کے سامنے میں اسی طرح اعترافِ جرم کروں گا۔ ہاں آفیسر! میں نے اسے کتوں کو مارنے والا زہر دے دیا تھا۔ مجھے اپنے جرم کا اقرار ہے اور مجھے معلوم ہے کہ اس جرم میں مجھے بجلی کی کرسی نصیب ہو گی۔"

دونوں نے پہلے سے بلند قہقہہ لگایا پھر وہ نامعلوم شخص گتّے کا ایک بڑا سا کارٹن اٹھائے لاکر روم سے نکلا اور لانڈری روم کے دروازے کے سامنے سے گزرتا چلا گیا۔ وہ ایک ہٹا کٹا شخص تھا۔ کچھ دن سے وہ اکثر ہی عمارت میں نظر آتا تھا۔ آہستہ آہستہ بلڈنگ کا انتظام وہی سنبھال رہا تھا۔ شاید وہ بوب کی جگہ لینے والا تھا۔

مسز مارٹن اپنی جگہ ساکت بیٹھی تھیں۔ ان دونوں کی باتیں سن کر ان کی رگوں میں لہو سرد ہو گیا تھا اور انہیں سانس لینے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ اب ان پر انکشاف ہوا تھا کہ اصل قاتل تو بوب تھا جب وہ وکی کو واپس لانے کے لیے اس کے پیچھے دوڑا تھا تبھی اسے پکڑ کر نیچے کہیں بند کر آیا تھا اور محض مسز مارٹن کو دکھانے کے لیے ان کے ساتھ تلاش کی مہم پر نکلا تھا۔ مسز مارٹن کے دل میں درد کی لہر اٹھی۔ جب وکی کو کہیں چھپا کر' بند کر کے رکھا گیا ہو گا تو وہ کتنا خوفزدہ ہوا ہو گا۔ شاید اس نے میاؤں میاؤں کر کے اپنی مالکن کو پکارا بھی ہو گا۔ پھر بوب نے محض انہیں ستانے کے لیے نہ جانے کس سفاکی سے اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اسے کتا مار زہر دیا گیا ہو گا تو نہ جانے اس پر کیا گزری ہو

گی! اس اذیت کے عالم میں اس نے جان دی ہوگی!

مسز مارٹن متاسفانہ انداز میں سرہلا رہی تھیں۔ مسز ڈائس اور مسٹر وہائٹ تو خواہ مخواہ ہی مارے گئے تھے۔ غلطی سے قتل ہو گئے تھے۔ اصلی مجرم تو بوب تھا۔ بظاہر کس معصومیت سے وہ ان کا ہمدرد بنا ہوا تھا۔ ونکی کی تلاش میں ان کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ مکار... شیطان کہیں کا!

مسز مارٹن دبے قدموں لاکر روم میں جا پہنچیں۔ بوب ایک لاکر میں سر گھسائے کھڑا تھا۔

"بوب!" مسز مارٹن نے پکارا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بھاری ہتھوڑا تھا جو ٹھک سے اس کے پاؤں پر گر پڑا۔ وہ ہلکی سی چیخ مار کر اچھلا تو اس کا سر لاکر کے دروازے سے ٹکرا گیا۔

"مسز مارٹن! آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔" بوب سر سہلاتے ہوئے بولا۔

"آئی ایم سوری۔ میں تو صرف یہ پوچھنے آئی تھی کہ ونکی کا کچھ پتا چلا؟"

مسز مارٹن نے دیکھا' اس کی آنکھوں میں پچھتاوے یا احساسِ جرم کی ذرا سی بھی جھلک نہیں تھی۔ مسز مارٹن کو حیرت ہوتی تھی کہ دنیا کو کیا ہوتا جا رہا تھا۔ لوگ اتنے ڈھیٹ اور بے حس ہوتے جا رہے تھے کہ اپنے کیے پر ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوتے تھے۔

"نہیں۔ ونکی کا کچھ پتا نہیں چلا۔" بوب نے جواب دیا۔ "لیکن آپ مایوس نہ ہوں۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ وہ مل جائے گا۔ یا خود ہی لوٹ آئے گا۔"

"تمہاری ہمدردی کا بہت شکریہ۔ تم نے ونکی کی تلاش کے سلسلے میں میری بہت مدد کی ہے۔ تم اوپر آکر میرے ساتھ چائے پینا پسند کرو گے؟"

"شکریہ مسز مارٹن! میں اس وقت بہت مصروف ہوں۔ ویسے بھی میں چائے کا کچھ زیادہ شوقین نہیں ہوں۔"

"تو پھر میں کافی بنا لوں گی۔" یہ کہتے ہوئے مسز مارٹن نے غمزدہ سے انداز میں نظریں جھکا لیں۔ "لیکن مجھے معلوم ہے تم کافی پینے بھی نہیں آؤ گے۔ تم یہی سوچتے ہو گے کہ کون اس پاگل بڑھیا کے ہاں جا کر وقت ضائع کرے۔" ان کی آواز بھرا گئی۔

"نہیں... نہیں... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" بوب جلدی سے بولا۔ "اچھا۔ ایسا کرتا ہوں... میں کل دس بجے آپ کے ہاں چائے پینے آؤں گا۔ ٹھیک ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔" مسز مارٹن نے بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے کہا۔ اپنے اپارٹمنٹ کی طرف واپس جاتے وقت ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

اپنے کچن میں پہنچ کر انہوں نے الماری کے سامنے کرسی رکھی اور الماری کے اوپر رکھے ہوئے کاٹھ کباڑ میں کچھ تلاش کرنے لگیں۔ جلد ہی انہیں اپنی مطلوبہ چیز مل گئی۔ وہ چوہے مار زہر تھا۔ ڈبا تقریباً پورا ہی بھرا ہوا تھا۔

دوسری صبح ساڑھے نو بجے تک مسز مارٹن' گھر میں ہی بنائے ہوئے تازہ تازہ بسکٹ اور گرم گرم کافی وغیرہ اپنی چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل پر سجا چکی تھیں۔ چوہے مار زہر کا خالی ڈبا وہ بلڈنگ کی برقی بھٹی میں پھینک چکی تھیں۔ وہ خود کافی کے بجائے چائے کی چسکیاں لے رہی تھیں اور زیرِ لب کچھ گنگنا بھی رہی تھیں۔ انہیں بوب کا انتظار تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو انہوں نے اٹھ کر مسکراتے ہوئے دروازہ کھولا۔ دروازے پر بوب کے بجائے پولیس آفیسر مرفی کھڑا تھا۔

"ہیلو میڈم!" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "ذرا دیکھیں تو میں آپ کے لیے کیا لایا ہوں۔"

مسز مارٹن کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مرفی کی گود میں ونکی تھا۔ وہ گندا' کمزور اور بدحال نظر آ رہا تھا لیکن اس کے ونکی ہونے میں بہرحال کوئی شبہ نہیں تھا۔

"تمہیں... تمہیں... ونکی مل گیا!" انہوں نے دیوانہ وار ہاتھ پھیلائے۔ مرفی نے نہایت طمانیت بھری مسکراہٹ کے ساتھ بلا ان کی گود میں دے دیا۔ مسز مارٹن نے اسے سینے سے چمٹا لیا۔

مرفی بولا۔ "یہ مجھے یہاں سے چند بلاک دور ایک عقبی گلی میں بھٹکتا ہوا نظر آیا۔ آپ نے تمام نشانیاں مجھے بتا رکھی تھیں۔ میں نے اسے آسانی سے پہچان لیا۔ ویسے یہ کافی شرمندہ نظر آ رہا ہے۔"

"میں کیسے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ میں تو سمجھی تھی..." انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ "مجھے... مجھے یقین نہیں آ رہا میرا ونکی گھر آ گیا ہے۔ بھوکا لگ رہا ہے۔ میں اس کے لیے دودھ گرم کر کے لاتی ہوں..." ان پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی کچن کی طرف چل دیں۔ دراز قد مرفی کمرے کے وسط میں کھڑا تھا اور انہیں دیکھ کر ایک عجیب سی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ وہ خوشی جو کسی کے لیے کچھ کرنے' کسی کو کوئی خوشی دینے سے حاصل ہوتی ہے۔

پھر اس نے میز پر سجے ہوئے کافی کے برتن اور لوازمات دیکھے۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ بڑھیا کتنی مرتبہ اسے چائے کے لیے مدعو کر چکی تھی۔ آج تو اسے چند منٹ کی گنجائش نکال ہی لینی چاہیے تھی۔ چند منٹ سے کیا فرق پڑتا تھا۔ بڑھیا یقیناً احساسِ تنہائی کا شکار تھی۔ اگر چند منٹ کے لیے اس کے پاس بیٹھنے سے اسے خوشی حاصل ہو سکتی تھی تو ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

تازہ تازہ بسکٹ دیکھ کر اس کا جی للچا گیا۔ اس نے ایک بسکٹ اٹھا کر منہ میں ڈال لیا۔ ذائقہ بہت اچھا تو نہیں تھا لیکن تازہ ہونے کی وجہ سے معقول ہی لگ رہا تھا۔ اس نے دوسرا بسکٹ بھی اٹھا کر چبانا شروع کر دیا اور پھر...!

WHO KILLED WE WINKY
BARBRA OWENS
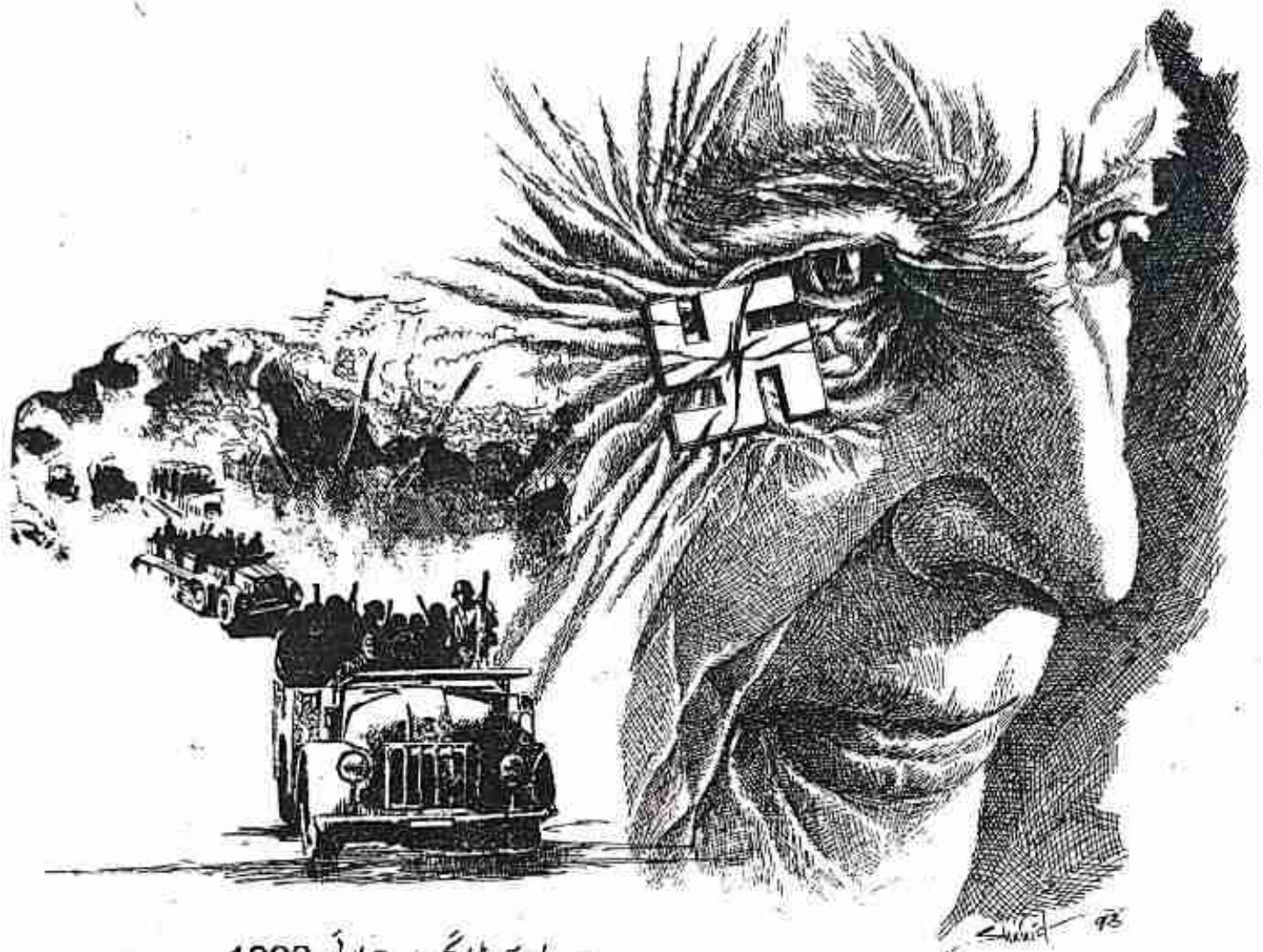
جاسوسی ڈائجسٹ، جولائی 1993ء

اُس راز کا قصہ جس کی حفاظت کے لیے بے دریغ انسانی جانوں کی قربانی دی گئی۔
اُس ڈاکٹر کی اُلجھن جس کے نزدیک ایک مریض کی صحت بہت اہمیت رکھتی تھی۔
اُس مریض کی مجبوری جو صحت مند ہونا چاہتا تھا مگر ہو نہیں سکتا تھا۔

چالیس سال گزرنے کے بعد بھی اس راز نے امریکا بہادر کی نیند حرام کر رکھی تھی

مہلک راز

عائشہ جمال

میں اپنی اس تحریر کو بادلِ نخواستہ خفیہ قرار دیتا ہوں کیوں کہ دیانت داری اور پیشہ ورانہ اخلاقیات کا تقاضا یہی ہے لیکن ساتھ ہی میں اسے منظرِ عام پر لانے پر بھی مجبور ہوں کیوں کہ بنی نوعِ انساں کا مفاد اسی میں ہے اس سے پہلے میں نے کبھی کسی راز کو اس طرح کاغذ پر منتقل نہیں کیا۔ اگر میں نے کچھ لکھا بھی' تو وہ اپنی یادداشت اور اپنے استعمال کے لیے تھا لیکن اینڈریو کو کسلے کا کیس اس قدر مختلف ہے اور اس سے میرے آگاہ ہو جانے کے بعد کچھ ایسے حالات پیدا ہو چکے ہیں کہ ان تمام تفصیلات کو کاغذ پر منتقل کرنا اور بنی نوعِ انساں کے لیے محفوظ کر دینا نہایت ضروری ہو گیا ہے۔

میں ایک ماہرِ نفسیات ہوں اور میری لینڈ میں پریکٹس کرتا ہوں۔ میری لینڈ میں چونکہ مسلح افواج کے حاضر سروس اور ریٹائرڈ آفیسرز بڑی تعداد میں آباد ہیں اس لیے میرے مریضوں میں بھی ان کی خاصی تعداد ہے۔ اینڈریو کو کسلے ریاست ہائے متحدہ امریکا کی فوج کا ایک ریٹائرڈ بریگیڈیئر جنرل تھا اور پہلی بار ۸۷ء کے موسم سرما میں مجھ سے ملاقات کے لیے آیا تھا۔

اس وقت اسے ریٹائر ہوئے چند ہی سال ہوئے تھے۔ وہ سیدھا تن کر چلنے کا عادی تھا۔ اس کا جسم تختے کی طرح سیدھا اور فولاد کی طرح مضبوط نظر آتا تھا۔ اس کے لہجے سے بھی وہی تحکم'

وہی سختی جھلکتی تھی جو ملازمت کے دوران نمایاں رہی ہوگی۔ بہت سے فوجی آفیسرز اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد لباس، وضع قطع اور انداز و اطوار سے فوجی نظر آئیں جب کہ بعض اپنی شخصیت سے اس دور کی ہر نشانی کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں اور مکمل طور پر سویلین نظر آنا چاہتے ہیں۔

شخصیت اور لہجے سے قطع نظر گوکسلے کا شمار بھی موخر الذکر آفیسرز میں کیا جا سکتا تھا۔ وہ اسپورٹس شرٹس، کارلائے کی پتلونیں اور جوگرز وغیرہ زیادہ استعمال کرتا تھا۔ وہ سویلین نظر آنے کی حتی الامکان کوشش کرتا تھا اور شعوری طور پر اپنے آپ کو سابق جنرل ظاہر کرنے کی قطعاً خواہش نہیں رکھتا تھا۔ وہ اس بات کو بھی پسند نہیں کرتا تھا کہ اسے "جنرل" کہہ کر مخاطب کیا جائے۔ وہ مسٹر "گوکسلے" یا زیادہ شناسائی کے بعد صرف اینڈریو کہلانا زیادہ پسند کرتا تھا۔

وہ میرے پاس بے خوابی کی شکایت لے کر آیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ چوبیس گھنٹے میں بہ مشکل تین چار گھنٹے سو پاتا تھا اور رات کا بیشتر وقت کروٹیں بدلتے گزارتا تھا۔ بیوی کے اصرار پر وہ کئی ماہ تک ٹال مٹول کے بعد بالآخر اپنے فیملی ڈاکٹر سے اس سلسلے میں بات کرنے پر آمادہ ہوا تھا۔

کئی قسم کے ٹیسٹ وغیرہ کرانے کے بعد بالآخر ڈاکٹر نے اسے بتایا تھا کہ اسے کوئی جسمانی عارضہ نہیں تھا۔ پھر نہایت ہوشیاری سے اس نے جنرل کو بُرا منانے کا موقع دیے بغیر گول مول سے الفاظ میں مشورہ دیا تھا کہ اسے کسی ماہرِ نفسیات سے رجوع کرنا چاہیے۔ یوں جنرل گوکسلے مجھ تک پہنچا تھا۔

جلد ہی میں بھی اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ جنرل کی بے خوابی کا سبب کوئی جسمانی نہیں، ذہنی مسئلہ ہی تھا لیکن ذہنی طور پر بھی وہ ہر اعتبار سے نارمل انسان معلوم ہوتا تھا۔ وہ ایک ہموار زندگی گزار رہا تھا۔ اسے اپنی بیوی اور چاروں بچوں سے محبت تھی۔ اس کے ذہن میں کسی قسم کا احساسِ کمتری نہیں تھا۔ وہ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر بتاتا تھا کہ ۱۹۵۱ء میں وہ نیئر فاریسٹ نامی چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا تھا اور غربت میں پرورش پائی تھی۔ اوپر سے ۳۳ء میں ملک کو مشہور عالم معاشی بحران نے آ جکڑا تھا۔ تب وہ فوج میں صرف اس خیال سے بھرتی ہو گیا کہ کالج کی تعلیم جاری رکھنے کا یہی ایک راستہ نظر آیا تھا ورنہ وہ تعلیم جاری رکھنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

دوسری جنگِ عظیم کے دوران اس نے جنرل آئزن ہاور کی قیادت میں آرمی ائرکور میں افریقہ اور یورپ میں خدمات انجام دی تھیں پھر وہ ۷۰ء تک ناٹو کے ہیڈ کوارٹر میں بیلجئم میں تعینات رہا۔ اس کے بعد ۷۵ء یعنی اپنی ریٹائرمنٹ کے زمانے تک میری لینڈ میں ایک یونٹ کا انچارج رہا۔

اس نے اپنے اچھے، بُرے، ڈراؤنے خوابوں کے بارے میں بھی سب کچھ بتا دیا۔ بظاہر یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے کوئی بھی بات چھپانے کی کوشش نہیں کر رہا تھا لیکن ایک سوال سے وہ کنی کترا رہا تھا۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ راتوں کو بے خوابی کے دوران وہ کیا سوچتا ہے؟ تو اس نے گول مول سا جواب دیا۔ "کوئی خاص بات نہیں۔"

لیکن میرے مسلسل کریدنے پر بالآخر اس نے اعتراف کر لیا۔ "اس دوران میں جو کچھ سوچتا ہوں اس کے بارے میں بات کرنے کی مجھے اجازت نہیں۔"

پانچ سال تک وہ ہر ماہ باقاعدگی سے میرے پاس آتا رہا۔ میں مہینے میں اس کے ساتھ ایک سیشن کرتا اور میرے ایک سیشن کی فیس تین سو ڈالر ہوتی تھی۔ وہ فیس بے چون و چرا ادا کرتا رہا لیکن اس موضوع پر اس نے بات کر کے نہ دی جو مسئلے کی اصل جڑ تھا۔ شاید اسے یقین تھا کہ میں اس بات سے آگاہ ہوئے بغیر کسی طرح اس کا مسئلہ حل کر سکوں گا۔ یہ کچھ اسی طرح کی بات تھی جیسے کوئی ملزم وکیل کو یہ بتائے بغیر کہ اس پر الزام کیا ہے؟ اس سے توقع رکھے کہ وہ اس کا کیس جیت جائے گا۔ میں نے بارہا اسے بتایا کہ اس طرح یہ کام ممکن نہیں تھا۔ اس نے تسلیم کیا کہ اسے خود بھی اس بات کا احساس تھا۔ اس نے اپنے راز کے بارے میں زبان نہ کھولی۔ اس کے باوجود نہ جانے کس آس پر میرے پاس آتا رہا۔

ایک بار میں نے اسے مشورہ دیا۔ "اگر آپ اس سلسلے میں محکمۂ دفاع پینٹاگون سے بات کرتے تو شاید وہ اس راز کے بارے میں کم از کم نفسیات کے ایک ڈاکٹر سے بات کرنے کی اجازت تو آپ کو دے ہی دیتے۔ امریکی محکمۂ دفاع (پینٹاگون) میں ایک قانون موجود ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جن رازوں کی اہمیت کم ہو جاتی ہے ان کی الگ درجہ بندی کر دی جاتی ہے اور ان کے بارے میں کسی سے بات کرنے، بعض اوقات ان کے بارے میں تقریر کرنے اور بعض اوقات انہیں شائع تک کرنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔"

گوکسلے مسکراتے ہوئے بولا۔ "اس راز کے بارے میں وہ کبھی ایسا نہیں کریں گے۔ کم از کم میری اور تمہاری زندگی میں تو نہیں کریں گے کیوں کہ اس سے تمام مسلح افواج کے لیے بہت بڑا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔"

پھر اس کے چہرے سے مسکراہٹ اور زندگی کی چمک غائب ہو گئی۔ وہ بہت دھیمی آواز میں بولا۔ "اگر میں تمہیں اس واقعے کے بارے میں بتا دوں تو وہ ہم دونوں کو ہلاک کر دیں گے۔ وہ ہر لمحے میری نگرانی کرتے ہیں۔"

ایک لمحے کے لیے مجھے شبہ ہوا کہ جنرل بھی کسی واہمے کا شکار تو نہیں؟ لیکن پھر مجھے یہ خیال دل سے نکالنا پڑا۔ اس کی دماغی حالت بالکل ٹھیک تھی۔ مجھے آج تک اس میں ذہنی کمزوری یا عدم توازن کی کوئی علامت نہیں ملی تھی۔ اسے جو مسئلہ بھی پریشان کیے ہوئے تھا وہ یقیناً ٹھوس اور حقیقی تھا۔

اس کے راز کی طرف پہلا اشارہ مجھے ۱۹۹۰ء کے موسم گرما میں ملا۔ اس وقت تک میں اس راز تک پہنچنے کی کوششیں ترک کر چکا تھا اور میرا خیال تھا کہ سابق جنرل اسے قبر تک ساتھ ہی لے کر جائے گا اور میں اس سے ہرگز آگاہ نہیں ہو سکوں گا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ کاش میرا یہ خیال درست ہی ثابت ہوتا۔

اس روز میں اچانک ہی اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ جنرل کے ذہن میں یقیناً کسی قسم کا احساسِ جرم بیٹھا ہوا تھا۔ اگر میں اسے یقین دلانے کی کوشش کروں کہ جو کچھ ہوا اس کا ذمے دار وہ نہیں تھا تو شاید وہ زبان کھولنے پر آمادہ ہو جائے۔

میں نے باتوں باتوں میں اچانک اس سے سوال کیا۔ ”اینڈریو! جو کچھ بھی ہوا کیا اس کے احکامات تم نے دیے تھے؟“

”نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”مجھے اس قسم کے اختیارات حاصل نہیں تھے لیکن میں نے احکامات پر عملدر آمد میں حصہ لیا اور جو کچھ ہوا اس میں میرا بڑا کردار تھا۔“

”لیکن تم ایک فوجی تھے اور فوجی کو ہر حال میں احکامات کی تعمیل کرنا ہوتی ہے۔ تم نے وہی کیا جو تمہیں کرنا چاہیے تھا۔ جو کچھ ہوا اس کے ذمے دار تم نہیں تھے کیوں کہ حکم کسی اور نے دیا تھا۔“

”یہ بات ان بچوں کو بتاؤ جو تعداد میں بیس یا اس سے کچھ زیادہ تھے اور سمجھ رہے تھے کہ آخر کار مصیبت ختم ہو گئی۔“

”کیا۔۔؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ اس کی بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی تھی لیکن اس کی وضاحت کے بجائے وہ اچانک ہی بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی کسی جنرل کو روتے نہیں دیکھا تھا۔

اس کے چند ماہ بعد مجھے پتا چلا کہ جنرل کو جسمانی عارضہ بھی لاحق ہو گیا ہے اور وہ بھی نہایت مہلک قسم کا۔ ڈاکٹروں نے تشخیص کیا تھا کہ اس کا دل ناکارہ ہو چکا تھا اور اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ عمر رسیدہ ’ریٹائرڈ جنرل تیزی سے موت کے منہ میں جا رہا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ آئندہ اس سے میری ملاقات ہوگی۔ کاش اس سے ملاقات واقعی نہ ہوئی ہوتی۔

اکتوبر ۱۹۹۲ء کی ایک شام وہ مجھ سے ملاقات کا وقت طے کیے بغیر اچانک ہی میرے کمرے میں داخل ہوا۔ باہر درختوں سے خزاں رسیدہ پتے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ جنرل بھی ایک خزاں رسیدہ پتا تھا جو کسی بھی وقت شاخِ حیات سے ٹوٹ کر گرنے والا تھا۔

وہ ایک قطعی بدلا ہوا انسان دکھائی دے رہا تھا۔ موت نے واقعی اس کے سراپا اور اس کی حرکات و سکنات پر اپنا سایہ ڈال دیا تھا۔

اس کی حالت دیکھ کر مجھے شدید دھچکا لگا۔ وہ شخص جو کچھ عرصہ پہلے تک فولادی پیکر کا مالک دکھائی دیتا تھا‘ اب بسترِ مرگ سے کچھ دیر کے لیے اٹھ کھڑا ہونے والا نحیف و نزار انسان معلوم ہوتا تھا جس کے لیے چلنا پھرنا اور بات کرنا بھی دشوار تھا۔ میں نے کئی ایسے مریض دیکھے تھے جن کے دل ناکارہ اور ناقابلِ علاج ہو چکے تھے لیکن ان میں سے کسی کی حالت میں نے اینڈریو جیسی قابلِ رحم نہیں دیکھی تھی۔ وہ گویا کسی عضو کے دھیرے دھیرے ناکارہ ہونے سے نہیں مر رہا تھا بلکہ اس کے جسم میں تو جیسے کوئی زہر سرایت کر گیا تھا۔

مریضوں سے فارغ ہوتے ہی میں اسے اپنے خاص کمرے میں لے گیا جہاں میں مریضوں سے سیشن کرتا تھا۔ کاؤچ پر نیم دراز ہوتے ہی وہ بولا۔ ”مجھے وہ بات کسی نہ کسی کو بتانی ہوگی۔ میں یہ بوجھ سینے سے اتار دینا چاہتا ہوں‘ یہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ قبر میں نہیں لے جا سکتا۔“

اس وقت اس کا ذہنی‘ جذباتی بوجھ کم کرنا اشد ضروری تھا۔ میں نے کہا۔ ”تم سکون‘ آرام اور بے فکری سے بات کرو۔ تم جو کچھ بھی کہو گے مجھ تک ہی محدود رہے گا۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ وہ اذیت زدہ لہجے میں بولا۔ ”لیکن تمہیں کسی کو یہ بھی نہیں بتانا ہوگا کہ میں نے تم سے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے بارے میں کوئی بھی بات کی تھی۔ وہ تمہاری بھی نگرانی کرتے رہیں گے کیوں کہ تم میرے نفسیاتی معالج ہو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس وقت بھی تمہاری نگرانی کر رہے ہوں گے۔ اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ تم اس راز سے آگاہ ہو چکے ہو تو وہ تمہیں قتل کر دیں گے‘ جس طرح انہوں نے دوسروں کو قتل کر دیا۔ گزشتہ برسوں میں ایک ایک کر کے وہ سب پُراسرار حالات میں موت کا شکار ہو چکے ہیں۔

بعض کو تو خاص طور پر قتل ہی کیا گیا اور بعد اس طرح غائب ہو گئے کہ ان کا کوئی نشان تک نہ ملا۔"

"کتنے تھے ایسے لوگ؟" میں نے بظاہر پُرسکون لہجے میں پوچھا لیکن میرے اندر ہلچل برپا ہو چکی تھی۔

"صحیح تعداد تو مجھے نہیں معلوم۔ پائلٹوں اور گراؤنڈ پر کام کرنے والوں کو ملا کر چوبیس پچیس آدمی تو ہوں گے۔ اس کے علاوہ واشنگٹن میں کتنے لوگوں کو یہ بات معلوم تھی، اس کا مجھے علم نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

میں اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ میں نے مختلف رپورٹوں اور معلوماتی مضامین میں پڑھا تھا کہ سرکاری ایجنٹ ایسے آلات استعمال کرتے ہیں جن کے ذریعے نہ صرف کھلی بلکہ بند کھڑکیوں کے راستے بھی، اس کمرے میں ہونے والی گفتگو سنی جا سکتی تھی۔ میں چند لمحے ٹریفک کو دیکھتا رہا پھر کھڑکی بند کر دی۔ یہ سوچ کر نہیں کہ اس طرح ہماری گفتگو کہیں نہیں سنی جا سکے گی بلکہ محض اس لیے کہ اس طرح کمرے میں کچھ تحفظ کا احساس ہونے لگا تھا۔ پھر میں اپنی کرسی پر واپس آ بیٹھا اور میں نے جنرل سے فرمائش کی کہ وہ بالکل شروع سے بات کرے۔

"یہ وسط نومبر ۶۱ء کا واقعہ ہے۔" جنرل نے کہنا شروع کیا۔ "میں ناٹو کے ہیڈ کوارٹرز میں بروسلز میں تعینات تھا اور امریکا کی آرمی ائرفورس کی کمانڈ سے وابستہ تھا۔ میرا باس جنرل مارک ایچی سن تھا۔ شاید تمھیں یاد ہو کہ سات سال قبل اس کا کیا انجام ہوا تھا۔"

"کچھ یاد تو پڑتا ہے۔" میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "شاید اس کے طیارے کو کوئی حادثہ پیش آ گیا تھا۔"

جنرل گہری سانس لے کر بولا۔ "وہ مجھ سے دو سال قبل ریٹائر ہوا تھا۔ اس نے اس راز کو راز ہی رکھا۔ سات سال قبل وہ اور اس کی بیوی دو انجن والے اپنے ایک ذاتی طیارے میں نیو میکسیکو کے ایک ائرپورٹ سے روانہ ہی ہوئے تھے کہ طیارہ دھماکے سے ہوا میں پھٹ گیا۔ مقامی پولیس کو اس واقعے میں تخریب کاری کے ثبوت ملے لیکن پھر وہاں ایف بی آئی کے لوگ تحقیقات کرنے پہنچے اور انھوں نے اعلان کر دیا کہ طیارہ ایک فیول لائن بند ہو جانے کی وجہ سے دھماکے سے پھٹا تھا۔ کیسی بے وقوفی کی بات ہے!"

وہ تھکے تھکے سے انداز میں مسکرایا اور ذرا توقف کے بعد بولا۔ "وہ آرمی ائرفورس کا ریٹائرڈ جنرل تھا اور اسے گویا اتنا بھی نہیں معلوم تھا کہ فیول لائن کیسے صاف رکھی جاتی ہے! جب کہ میری معلومات کے مطابق جنرل خود فارغ وقت میں اپنے طیارے میں کچھ نہ کچھ کرتا رہتا تھا اور اسے نہایت شاندار حالت میں رکھتا تھا۔ وہ اس کے ایک ایک کل پرزے کی حالت سے واقف تھا۔"

ان یادوں نے گویا ایسٹربرو کو مزید تھکا دیا۔ اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔ "وہ نومبر ۶۱ء کی چودہ تاریخ تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ منگل کا دن تھا۔ سخت سردی تھی۔ باد و باراں کا طوفان آیا ہوا تھا۔ کسی بھی قسم کی پرواز کے لیے وہ ایک انتہائی ناموزوں دن تھا۔ فرانس کے ساحلوں سے لے کر نیدر لینڈ کے شمالی علاقوں۔۔۔ بلکہ اس سے آگے تک بھی کوئی چیز پرواز نہیں کر رہی تھی۔ مشرقی یورپ وغیرہ کے بہت سے شہروں کے ہوائی اڈوں سے پروازیں ملتوی یا منسوخ کر دی گئی تھیں۔ اس لیے اس وقت ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہمیں پیغام ملا کہ عین انگلش چینل کے اوپر کوئی طیارہ پرواز کرتا ریڈار پر دیکھا گیا تھا۔"

مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ جنرل کسی اڑن طشتری کی کہانی نہ شروع کر دے لیکن وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ابتدا میں ریڈار کی اسکرین پر یہ واضح نہیں تھا کہ وہ کوئی طیارہ تھا۔ اسکرین یا تو بالکل سادہ تھی پھر اچانک ہی اس پر کوئی چیز پرواز کرتی دکھائی دینے لگی تھی۔ یہ ریڈار کا نقص بھی نہیں تھا کیوں کہ وہ چیز بیک وقت کئی ریڈارز کی اسکرین پر نمودار ہوئی تھی۔ وہ کوئی بہت بڑی چیز تھی جو سست رفتاری سے پرواز کرتی مشرق کی طرف جا رہی تھی۔"

جنرل نے گلاس سے پانی کے چند گھونٹ بھرے پھر سلسلہ کلام جوڑا۔ "ہائی کمان نے فوری طور پر ایک ہنگامی میٹنگ طلب کی۔ ہم چھ سات جنرل کانفرنس روم میں جمع ہوئے۔ میں اور ایچی سن آرمی ائرفورس کی طرف سے تھے۔ تین ریگولر جنرل ائرفورس کے تھے۔ دو یا تین کرنل تھے جو اے ڈی کے طور پر فرائض انجام دے رہے تھے۔ تقریباً بیس منٹ تک زبردست بھگدڑ اور افراتفری رہی۔ اس دوران اس محوِ پرواز چیز کے بارے میں رپورٹیں موصول ہوتی رہیں۔ وہ سست رفتاری سے بدستور مشرق کی طرف جا رہی تھی۔ ہم اس خوف سے مرے جا رہے تھے کہ وہ کوئی تباہ کن قسم کا نو ایجاد شدہ روسی جنگی طیارہ نہ ہو۔"

"روسی طیارہ۔۔۔ اور مغرب کی طرف سے؟" میں نے ملامت سے کہا۔

"یہ یاد رکھو کہ وہ زمانہ کون سا تھا۔" جنرل نے کہا۔ "دیوارِ برلن کو تعمیر ہوئے تین مہینے گزرے تھے۔ ہر طرف تناؤ اور کشیدگی تھی۔ ہمیں اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ تیسری جنگ عظیم سر پر کھڑی تھی۔ ہمیں یہ بھی خوف تھا کہ سوویت یونین نے خفیہ طور پر کچھ نہایت خوفناک اور تباہ کن ہتھیار بنا لیے ہیں جن کے بارے میں کسی کو کچھ علم نہیں۔ ہم ابھی ان کے "اسپتنک" کی ایجاد پر ہی حیرت کے جھٹکے سے نہیں سنبھلے تھے۔ ہمیں شبہ ہوا کہ شاید روسیوں کا وہ طیارہ ہمارے ریڈاروں کی رسائی سے کہیں زیادہ اونچائی پر پرواز کر رہا تھا لیکن طوفان کی وجہ سے اسے انگلش چینل پر کچھ نیچے آنا پڑا تھا اس لیے ریڈار کی زد میں آ گیا تھا اور وہ اب مشرق کی طرف سفر کر رہا تھا تاکہ اس سمت سے ہم پر حملہ کر سکے جس کا ہمیں وہم و گمان بھی نہ ہو۔ بلکہ شاید یہ کسی دو طرفہ حملے کی تیاریوں کا ایک حصہ ہو۔

بالآخر کمانڈنگ جنرل نے حکم دیا کہ تفتیش کے لیے طیارے بھیجے جائیں۔ میں اور ایچی سن اپنے اپنے دفتر میں واپس آئے اور ہم نے تین فائٹر جیٹ طیاروں کو اس نامعلوم طیارے کو گھیرنے کا حکم دیا۔ اس وقت وہ نیدر لینڈ پر پرواز کر رہا تھا۔ مشرق کی طرف اس کا سفر جاری تھا۔ محکمۂ دفاع کو اس کے بارے میں مطلع کر دیا گیا تھا۔ برطانویوں اور فرانسیسیوں نے بھی اسے اپنے اپنے ریڈار سسٹم پر دیکھ لیا تھا۔"

جنرل ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ وہ گویا بولتے بولتے تھک گیا تھا۔ ذرا دم لینے کے بعد اس نے یادوں کی مزید کڑیاں جوڑنا شروع کیں۔ "جنرل ایچی سن اور میں اس وقت فلائٹ کنٹرول سینٹر میں تھے جب کیپٹن گرہارٹ کا پیغام موصول ہوا۔ کیپٹن گرہارٹ ان تین طیاروں کی کمان کر رہا تھا جو اس نامعلوم طیارے کے تعاقب میں روانہ ہوئے تھے۔ وہ اس وقت ہمارا مشاق ترین جنگی ہوا باز تھا۔ کوریا کی جنگ میں حصہ لے چکا تھا۔ اس نے ریڈیو پر پیغام دیا کہ بادلوں میں طیارے کو صاف طور پر نہیں دیکھا جا سکتا تھا تاہم یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ غیر معمولی طور پر بڑا طیارہ تھا۔ اس کے ونگز بھی بہت بڑے تھے۔ وہ کم مگر یکساں رفتار سے بدستور مشرق کی طرف محوِ پرواز تھا۔

ہم نے گرہارٹ کو اس کے قریب جانے کا حکم دیا لیکن اس طوفان میں اپنے طیاروں کو خطرے میں ڈالے بغیر اس کے زیادہ قریب جانا ممکن نہیں تھا۔ بہرحال ایچی سن اس کی طرف سے آنے والی لمحے لمحے کی رپورٹ کمانڈنگ جنرل کو دے رہا تھا اور میرا خیال ہے' وہاں سے ہیڈ کوارٹر یہ رپورٹ محکمۂ دفاع کو بھجوا رہا تھا پھر اچانک گویا دھماکا ہو گیا۔"

"کیسا دھماکا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"ہمارے ایک فائٹر پائلٹ نے اس عظیم الجثہ طیارے کی دُم پر سے گزرنے کی کوشش کی تاکہ دُم پر اگر کوئی نشان وغیرہ موجود ہو تو اس کی مدد سے اسے شناخت کیا جا سکے۔ اس نے بڑے طیارے کے پائلٹ کی نظر سے بچتے ہوئے یہ کام کرنے کی کوشش کی تھی لیکن یک لخت اسے مار گرایا گیا۔"

"وہ کس طرح؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"پہلے تو گرہارٹ کی بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ بدحواس اور خوفزدہ ہو گیا۔ پھر اس نے خود اس دیو پیکر طیارے کے قریب جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ بھی مرتے مرتے بچا۔ تب اسے معلوم ہوا کہ طیارے کی دُم کی طرف بھی گنر موجود تھا جس نے گن سے ہمارا طیارہ مار گرایا تھا۔ اس سے طیارے کی ساخت کا بھی اندازہ ہو

گیا۔ وہ دراصل "فلائنگ فورٹریس" تھا۔ وہ واقعی ایک ایسا طیارہ تھا جو اپنے نام سے پوری پوری مطابقت رکھتا تھا۔ یعنی اڑتا ہوا قلعہ۔"

۴۴ء میں رودبار انگلستان پر پرواز کرتے ہوئے فلائنگ "فورٹریس" کا تصور کرکے واقعی میری ریڑھ کی ہڈی میں بھی سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔

جنرل نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "اور وہ ایک امریکی طیارہ تھا۔ گرہارٹ نے اس کی دُم کے اوپر سے پرواز کی کوشش کرتے ہوئے نشانات وغیرہ دیکھ لیے تھے اور اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ ایک امریکی طیارے نے ایک امریکی جیٹ فائٹر کو ہی مار گرایا تھا۔!"

میں اس وقت خود کو ماہر نفسیات کے بجائے ایک بچہ محسوس کر رہا تھا جو کوئی آسیبی کہانی سن رہا تھا اور کہانی میں زبردست ڈرامائی موڑ آچکا تھا۔ جنرل کہہ رہا تھا۔ "گرہارٹ نے طیارے کا تعاقب جاری رکھا اور اس کے پائلٹ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش بھی کرتا رہا۔ اس دوران وہ لمحے لمحے کی رپورٹ بھی ہمیں دے رہا تھا اور ہم وہ معلومات ہیڈکوارٹرز کو بھیج رہے تھے۔ ہیڈکوارٹرز کا بیٹھا کون سے رابطہ تھا پھر جتنی تیزی سے ہمیں احکامات موصول ہوئے اس سے اندازہ ہوا کہ بات محکمۂ دفاع سے بھی اوپر تک جا رہی تھی۔ غالباً ہر لمحے کی رپورٹ وہائٹ ہاؤس کو دی جا رہی تھی کیوں کہ محکمۂ دفاع نے ہم سے فوری طور پر معلومات طلب کیں کہ پہلی بار طیارے کو ریڈار پر کہاں نمودار ہوتے دیکھا گیا تھا۔ ان کا حکم تھا کہ انہیں نقشے پر بالکل صحیح طور پر اس مقام کے بارے میں مطلع کیا جائے۔

انہیں مطلع کر دیا گیا۔ اس دوران گرہارٹ اور دوسرے پائلٹ کیپٹن بیکر نے اس طیارے کا تعاقب جاری رکھا۔ اس وقت تک وہ مغربی جرمنی کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ ہم محکمۂ دفاع سے احکامات کا انتظار کر رہے تھے۔ گرہارٹ اور بیکر مسلسل اس طیارے کے تعاقب میں تھے۔ فرانس اور برطانیہ کے جنگی ہوائی اڈے مغربی جرمنی میں موجود تھے۔ انہوں نے بھی وہاں سے اپنے طیارے فضا میں بھیجے لیکن واشنگٹن والوں نے نہ جانے کس طرح انہیں واپس بھجوا دیا پھر ہمیں حکم ملا کہ اس طیارے کو مار گرایا جائے۔"

"امریکی طیارے کو مار گرایا جائے؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

"ہاں۔" جنرل نے سر ہلایا۔ "ایکی سن نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ میں نے اس کی حمایت کی۔ کمانڈنگ جنرل بھی ہمیں حکم عدولی کا مجرم ٹھہرانے کا خواہشمند نظر نہیں آرہا تھا۔ ہم سب محسوس کر رہے تھے کہ محکمۂ دفاع کا حکم غیر قانونی تھا۔ آپ غیر قانونی حکم کی تعمیل کرنے کے پابند نہیں ہوتے بلکہ بعض اوقات تو غیر قانونی حکم کی تعمیل کرنے پر آپ کے خلاف کارروائی بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ محکمۂ دفاع کو ایک غیر معمولی کام کرنا پڑا۔ یعنی اسے اپنے حکم کی وضاحت کرنا پڑی اور اس کا پس منظر بیان کرنا پڑا۔"

"بہت خوب! کیا تھا وہ پس منظر؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"وہاں سے پیغام آیا کہ اس فلائنگ فورٹریس کو ایک شخص اپنی مرضی سے اڑائے لیے جا رہا تھا اور جہاز بموں سے لدا ہوا تھا۔ وہ شخص تمام بم برلن پر گرانا چاہتا تھا جس کے نتیجے میں تیسری عالمی جنگ چھڑ سکتی تھی۔" جنرل نے بتایا۔

یقیناً یہ عین ممکن تھا۔ مسلح افواج میں کبھی کبھار کوئی انتہا پسند یا جنونی نکل آتا ہے جو ایسے حالات سے گزرا ہوتا ہے کہ ردِعمل کے طور پر وہ کچھ بھی کر گزر سکتا ہے۔ وہ بھی کوئی ایسا ہی انتہا پسند ہو سکتا تھا جس کے ہاتھ پرانا فلائنگ فورٹریس لگ گیا تھا۔ بلکہ ضروری بھی نہیں تھا کہ اس کا تعلق فوج سے ہوتا۔ وہ کوئی دولت مند انتہا پسند بھی ہو سکتا تھا جو اپنے ردِعمل کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ ساٹھ کی دہائی میں ایسے بہت سے کیس سننے میں آئے تھے۔

لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ انگلش چینل پر ہی یکدم ریڈاروں پر کیسے نمودار ہوا تھا اور واشنگٹن والوں نے اس کے نمودار ہونے کی جگہ بالکل صحیح طور پر جاننا کیوں ضروری سمجھا تھا؟

جنرل بولا۔ "ہمیں جس طرح صورتحال بتائی گئی ہم نے اس سے گرہارٹ کو مطلع کر دیا۔ گرہارٹ نے مغربی جرمنی میں دریائے ایلر کے قریب سیلی کے مقام پر اس طیارے کو مار گرایا۔ دوسرے روز طوفان تھمتے ہی میں طیارے کے ذریعے اس مقام پر پہنچا جہاں طیارے کو گرایا گیا تھا تاکہ اگر وہاں سے کوئی بھی ایسی چیز مل سکے جسے امریکا بھجوانا ضروری ہو تو بھجوایا جا سکے۔"

"تمہیں وہاں کیا ملا؟" میں نے پوچھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے جواب دیا۔ "ایک تباہ شدہ امریکی فورٹریس اور اس کا پورا باقاعدہ عملہ اور آفیسرز جو ہلاک ہو چکے تھے۔ ان کی وردیوں کے بچے کھچے حصوں سے اندازہ ہوا کہ وہ امریکی ائرفورس کے بالکل صحیح اور قانونی ملازم تھے۔ ائرفورس کے اپنے ہوا باز۔ ان کی عمریں بیس اور تیس کے درمیان تھیں لیکن ان کے سن پیدائش کم از کم چالیس سال پہلے کے تھے۔"

اس کی بات ذرا دیر سے میری سمجھ میں آئی۔ یعنی وہ دوسری جنگ عظیم کے زمانے کا عملہ تھا جو جہاز کو اڑائے لیے جا رہا تھا اور موت کے منہ میں پہنچ گیا تھا لیکن یہ ایک ناقابلِ یقین سی بات تھی۔ میں نے جب جنرل سے کہا کہ یہ بات میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہی تو وہ بولا۔ "اس کے لیے مجھے تھوڑا سا پس منظر بیان کرنا پڑے گا کیوں کہ یہ غالباً یہ تمہارے ہوش سنبھالنے سے پہلے کی باتیں ہیں۔ یہ واقعہ ۱۹۴۸ء میں نیدرلینڈ میں رونما ہوا تھا۔ اس وقت کے تمام یورپی اخبارات میں اس کا بڑا چرچا رہا تھا۔ معلوم نہیں امریکی اخبارات میں یہ واقعہ رپورٹ ہوا تھا یا نہیں کیوں کہ میں

اس وقت بیلجئم میں تھا اس لیے مجھے یہاں کا پتا نہیں لیکن یورپ میں اس واقعے سے بہرحال بڑی ہلچل رہی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ ۴۸ء میں نیدرلینڈ میں ڈینجلو کے مقام پر زبردست طوفان بادوباراں میں ایک امریکی فلائنگ فورٹریس گر کر تباہ ہو گیا تھا اور اس کا پورا عملہ ہلاک ہو گیا تھا۔ تحقیقات کرنے والوں کا فیصلہ تھا کہ وہ ایک ایسا طیارہ تھا جو ۴۴ء میں انگلینڈ سے برلن پر بمباری کے لیے روانہ ہوا تھا۔ وہ اتحادیوں کے ایک اسکواڈرن کا حصہ تھا۔ وہ عین اسی مقام سے انگلش چینل عبور کر رہا تھا جہاں ہم نے اسے ریڈار پر دیکھا تھا۔ اس مقام پر اسکواڈرن کے بالکل ویسے ہی تین جہاز اکٹھے بالکل اس طرح غائب ہو گئے تھے جیسے ہوا میں تحلیل ہو گئے ہوں۔ ۴۴ء میں وہ تین جہاز غائب ہوئے تھے۔ ۴۸ء میں ان میں سے ایک ڈینجلو کے مقام پر بادوباراں میں گر کر تباہ ہوتا دیکھا گیا۔ دوسرا ۶۱ء میں ہم نے سِسلی کے مقام پر مار گرایا۔"

ہم دونوں بہت دیر تک خاموش رہے۔ جنرل واقعی برسوں تک ایک ناقابلِ یقین اور اذیت ناک راز کا بوجھ سینے پر لیے پھرتا رہا تھا۔ کوئی تعجب نہیں تھا کہ اس کی راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ امریکی فضائیہ کے وہ لوگ جن کی زندگی کا ایک درمیانی وقفہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا' اپنی دانست میں اپنے مشن پر' دوسری جنگ عظیم ہی کے دوران برلن پر بمباری کرنے جا رہے تھے اور انہیں ایک امریکی طیارے نے ہی مار گرایا تھا۔ انہیں تو پتا ہی نہیں چل سکا ہو گا کہ ان کے ساتھ درحقیقت ہوا کیا۔ وہ صرف بیس بیس' پچیس پچیس سال کے نوجوان تھے۔ ان کے لواحقین بھی نہیں جان سکے ہوں گے کہ ان کے ساتھ کیا ہوا۔

بالآخر جنرل بولا۔ "محکمۂ دفاع درحقیقت اس طیارے کے نمودار ہونے کا منتظر تھا۔ اس سے پہلے چونکہ ۴۴ء کے گمشدہ تین طیاروں میں سے ایک طیارہ ۴۸ء میں نمودار ہو چکا تھا' اس لیے محکمۂ دفاع کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک روز دوسرا طیارہ بھی نمودار ہو گا۔ اس لیے جب انہوں نے ریڈار پر ایک پُراسرار طیارے کے نمودار ہونے کی خبر سنی تو انہوں نے سب سے زیادہ زور یہ جاننے پر دیا تھا کہ طیارہ کہاں سے نمودار ہوتا دیکھا گیا تھا۔ یہ معلوم ہونے کے بعد انہیں خودبخود یہ معلوم ہو گیا تھا کہ طیارے میں کون لوگ تھے' کہاں جا رہے تھے اور کیا کرنے جا رہے تھے..."

جنرل نے مزید بھی بہت کچھ کہا لیکن میں جو کچھ سن چکا تھا اس سے ہی میرا سر گھوم رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ جو لوگ بھی اس واقعے سے آگاہ تھے' انہیں سختی سے زبانیں بند رکھنے کے احکامات ملے تھے اور جنرلوں اور کرنلوں نے اصل بات کو ذرائع ابلاغ سے چھپانے کے لیے نہ جانے کیا ذرائع استعمال کیے تھے۔ کہیں کے اخبارات میں بھی اس واقعے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں چھپا تھا۔ طیارے کے ٹکڑوں کو کہیں محفوظ کرنے یا ٹھکانے لگانے اور لاشوں کی تدفین کا کام بھی نہایت رازداری سے انجام دیا گیا۔

کیپٹن گرہارٹ کا ۶۳ء میں کار کے ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ ۶۵ء میں کیپٹن بیکر بھی ایک حادثے میں مارا گیا۔ اس واقعے سے تعلق رکھنے والے باقی افراد بھی یا تو حادثات میں مارے گئے' قتل ہو گئے یا پھر غائب ہو گئے اور ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ یہ سب کچھ اس واقعے کے بعد دس سال کے اندر اندر ہو گیا۔

جنرل اینڈریو کوکسلے نے جس روز مجھ سے یہ باتیں کیں' اسی رات اپنے گھر پر اس کا بھی حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہو گیا۔ اس کی بیوی کا پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ کسی کو بھی صحیح طور پر معلوم نہیں تھا کہ جنرل کی لاش کس نے دریافت کی تھی۔ دوسری صبح نہایت عجلت سے' کسی قسم کے پوسٹ مارٹم وغیرہ کے بغیر ہی اسے سپردِ خاک کر دیا گیا۔

اس کی تدفین کو صرف دو دن ہی گزرے ہیں اور میں اپنے آپ کو مجبور پا رہا ہوں کہ ان واقعات کو کاغذ پر منتقل کر دوں۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ میری نگرانی کی جا رہی ہے۔ میں جہاں بھی جاتا ہوں میرا تعاقب ہوتا ہے اور مجھے ہر لمحے احساس ہوتا ہے کہ کوئی مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہے۔

میں یہ سب کچھ اپنے وکیل کے لیے قلمبند کر رہا ہوں۔ اپنی یہ تحریر میں ایک سربمہر لفافے میں محفوظ کر دوں گا۔ وکیل کو میری ہدایت ہو گی کہ اگر میں پُراسرار حالات میں مارا جاؤں یا غائب ہو جاؤں تو اس لفافے کو کھول لیا جائے اور اسے کسی صحافی کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ اس کے استعمال کی کوئی صورت نکال سکے۔

اگر اس وقت آپ یہ تحریر پڑھ رہے ہیں تو اس کا مطلب ہے دونوں میں سے ایک بات ہو چکی ہے۔ یعنی یا تو میری موت پُراسرار حالات میں واقع ہو چکی ہے یا پھر میں غائب ہو چکا ہوں لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ دنیا کو معلوم ہونا چاہیے کہ نومبر ۶۱ء میں ایک روز طوفان بادوباراں کے دوران کیا ہوا تھا۔ جنرلوں نے جو کچھ کیا' غلط نہیں کیا۔ ان کے فوری ایکشن نے تیسری عالمگیر جنگ کو شروع ہونے سے پہلے روک لیا۔ اگر برلن پر وہ سارے بم گر جاتے تو یقیناً تیسری عالمگیر جنگ شروع ہو جاتی جس میں یقیناً ایٹمی طاقت کا استعمال ہوتا۔

یہ بات بھی زیادہ اہم نہیں ہے کہ اس واقعے سے تعلق رکھنے والے کسی اچھے انجام سے دوچار نہیں ہوئے۔ تاہم ان کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ بے حد افسوسناک ہے۔

سب سے اہم اور اصل قابلِ غور بات تو یہ ہے کہ ۴۴ء میں انگلش چینل کے اوپر پرواز کرتے ہوئے تین امریکی "فلائنگ فورٹریس" غائب ہوئے تھے اور ابھی ان میں سے صرف دو نمودار ہوئے ہیں۔ ایک ابھی باقی ہے....

اس کا مطلب سمجھتے ہیں آپ؟؟

COXLEY'S SECRET
DAVID BRALY

شکرگڑھ کے ایک غریب خاندان میں میری پیدائش ہوئی۔ کچھ عرصے بعد ہی والدہ وفات پاگئیں۔ والد نے زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے اسکول میں داخلہ دلا دیا۔ ابھی میں نے ایف اے ہی کیا تھا کہ میرے والد دو چوہدریوں کے ایک تنازعے میں اپنے آقا پر قربان ہوگئے۔ مجھ پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ عرصۂ حیات تنگ ہونے پر میں نے ایک جعلی پیر مشعل شاہ کا سارا ڈھونڈ لیا۔ بھانڈا پھوٹ جانے پر مشعل شاہ نے مجھے اپنے ایک ٹھیکیدار دوست کے پاس بھیج دیا جہاں لالی نامی ایک لڑکی مجھ سے ٹکرائی اور میں اس کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہوگیا۔ ابھی میں مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کرپایا تھا کہ اشرف خان نامی ایک اسمگلر مجھ سے
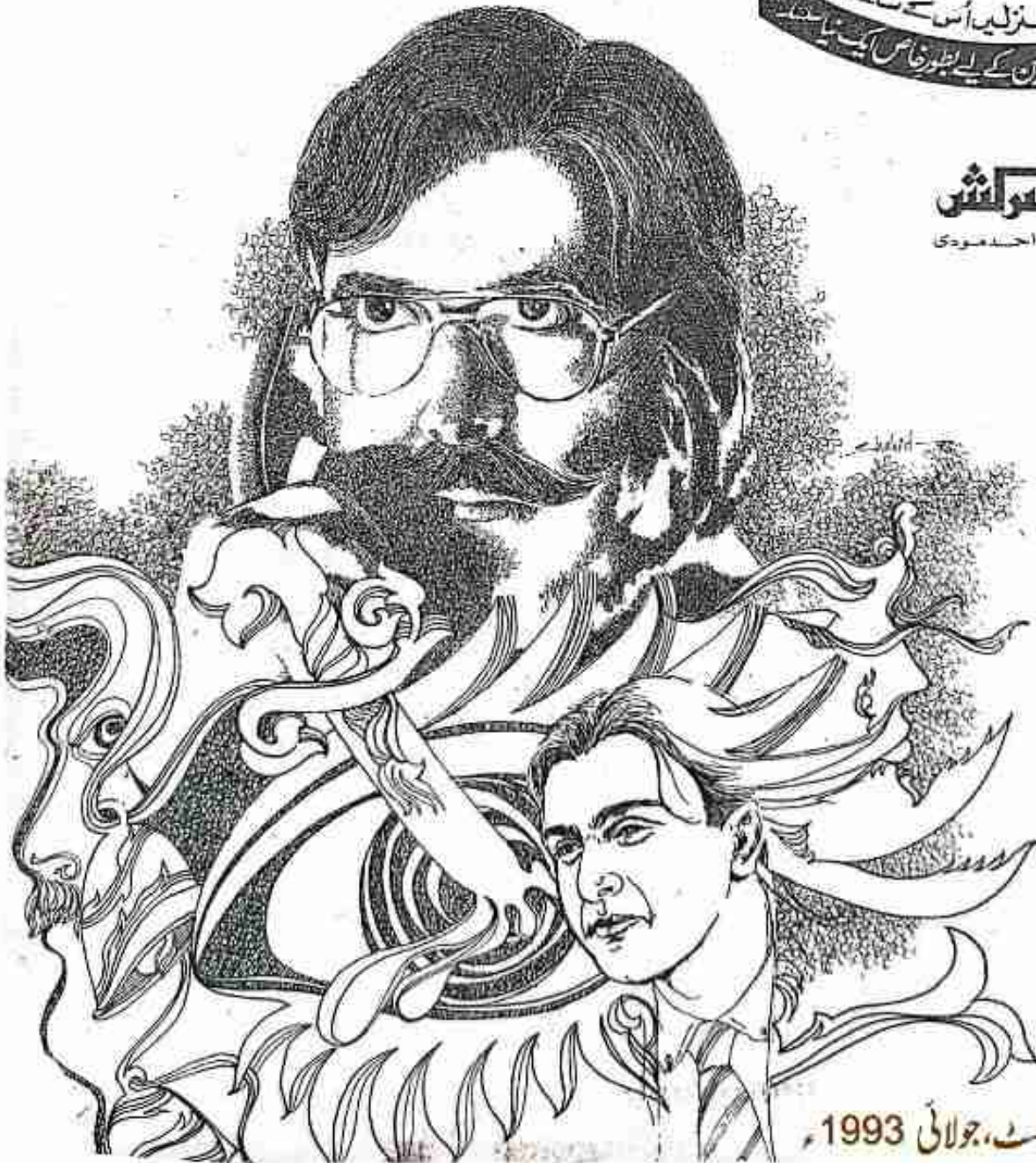
آ نکرایا۔ میں نے اشرف خان کے ساتھ مل کر اسمگلنگ کا مال ادھر ادھر کرنا شروع کردیا۔ ہمارا دھندا کامیابی سے جاری تھا کہ ایک روز میں خرکاروں کے ہتھے چڑھ گیا۔ انہوں نے مجھ پر بہت تشدد کیا۔ ایک روز موقع پاکر میں ایک نوعمر لڑکے راشد کے ہمراہ خرکاروں کے کیمپ سے بھاگ نکلا۔ جاں گسل مراحل سے گزرنے کے بعد میں نے راشد کو اس کے گھر چھوڑا اور اشرف خان کے پاس پہنچ گیا۔ اشرف خان نے میری گمشدگی سے پریشان ہوکر استاد لمبو کے ایک آدمی کو قتل کردیا تھا۔ ہم نے دوبارہ اپنے دھندے کا آغاز کردیا۔ ایک کامیاب مشن سے لوٹنے کے بعد ہم گھر میں آرام کررہے تھے کہ استاد لمبو کی مخبری پر کسٹم اور ایکسائز والوں نے چھاپا مارا۔ افراتفری کے عالم میں فرار ہوتے ہوئے اشرف خان گولی لگنے سے ہلاک ہوگیا۔ میں نے بعد میں اشرف خان کے کزن قاسم خان کے ساتھ کام شروع کردیا۔ ایک روز سرحد پار کا چکر لگاتے ہوئے میں رینجرز کے ہاتھوں مرتے مرتے بچا۔ اسی دوران مجھے راشد کے دو خطوط ملے۔ فرصت ملتے ہی میں راشد کے گھر جا پہنچا جہاں میری ملاقات اس کی بہن راحیلہ سے ہوئی جو محبت میں بدل گئی۔ قاسم خان منشیات کی ایک بڑی کھیپ امریکا اسمگل کرتے ہوئے گرفتار ہوگیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی الگ 'خودمختار حیثیت بنانے کے لئے میں گروہ سے علیحدہ ہوگیا۔ اس دوران راحیلہ نے اچانک ہی شادی کرلی۔ یہ میری زندگی کی بدترین شکست تھی۔ میرا کام کامیابی سے چل نکلا تھا۔ میں نے اپنی بلیک منی کو وائٹ کرنے کے لئے کراچی میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل بنانے کے ساتھ ساتھ ایک فلم کمپنی بھی خریدلی۔ فلم میکنگ کے دوران ہی مجھے خانہ بدوشی کے عرصے میں ٹھیکیدار کے ہاں ٹکرانے والی لڑکی لالی ملی جو آج کی مشہور فلم اسٹار ستارہ تھی۔ ایک فلم کی شوٹنگ کے موقع پر میری ملاقات ایک ایکسٹرا لڑکی ہنی سے ہوئی' جس نے بعد میں ایک بہت کٹھن موقع پر اپنی جان خطرے میں ڈال کر میری مدد کی۔ ایک موقع پر استاد لمبو کو سامنے دیکھ کر میرے وجود میں دبی ہوئی نفرت کی آگ پوری شدت سے بھڑک اٹھی۔ ایک سخت اور خونریز معرکے کے بعد میں نے اسے گردن توڑ کر ہلاک کردیا۔ ایک جعلی فلمی مصنف نصیر نواز کو میں نے اس کی دوسروں کے ساتھ زیادتیوں اور ظلم پر اس خوب صورتی سے پھانسی پر لٹکایا کہ اس کی موت خودکشی معلوم ہو۔ کراچی میں ایک اسمگلر سیٹھ عالم شیر کے آدمیوں نے میری ایک لانچ کو گرنیڈ مار کر تباہ کردیا۔ اس کے جواب میں اچھی خاصی مرمت کے بعد عالم شیر نے ایک بھاری رقم زرتلافی کی مد میں دینا منظور کرلی۔ ایک موقع پر مجھ پر گھات لگا کر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ حملہ آوروں میں سے تین میرے آدمیوں کے ہاتھوں مارے گئے جبکہ چوتھا میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچا۔ زندگی کے انہی ہنگامہ خیز روز و شب میں کراچی میں میرے فائیو اسٹار ہوٹل کے افتتاح کا خوب صورت لمحہ بھی آگیا۔ میں کراچی پہنچا تو میری ملاقات اچانک ہی راشد سے ہوگئی۔ اس کے ممی ڈیڈی فوت ہوچکے تھے اور راحیلہ کو طلاق ہوگئی تھی۔ ان دونوں سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں کراچی سے واپس لاہور پہنچا تو عجیب و غریب واقعات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ کوئی ریڈ ڈاٹ نامی پُراسرار تنظیم تھی جو میری مخالفت پر اتر آئی تھی۔ ان کے ایک بندر نما عجیب و غریب کارندے اے ٹن نے مجھے زچ کرکے رکھ دیا۔ انہوں نے ہنی اور اس کی والدہ کو بھی اغوا کرلیا۔ انہی کی والدہ کو بعد میں قتل کردیا گیا۔ ایک روز گھر واپسی پر سیکیورٹی انچارج نے بتایا کہ اے ٹن نے گھر میں گھس کر تلاشی لی تھی وہ کسی گمشدہ سیاہ باکس کی تلاش میں تھا۔ ایک صبح میں ایک ڈانس شو سے واپسی پر اخبار دیکھ رہا تھا کہ میری نظر ڈانس شو والی لڑکی پرنس تمینہ پر پڑی۔ یک لخت میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ پرنس تمینہ اصل میں گمشدہ ہنی تھی۔ میں ہنی عرف پرنس تمینہ کا راز جاننے کے لئے اس کے ہوٹل پہنچ گیا۔ وہاں ہنی کے اغواکنندگان میں سے ایک میرے ہاتھوں مارا گیا اور دو کو میرے آدمیوں نے ہلاک کردیا۔ ملاقات ہونے پر ہنی نے مجھے اپنے متعلق بتانے کے بعد ریڈ ڈاٹ کے بارے میں بھی بہت سی کارآمد باتیں بتائیں۔ ہنی سے ملاقات کے چند روز بعد ایک انتہائی ہولناک سازش میرے علم میں آئی جس کے تحت ملک کے وزیر خارجہ کو ایک تقریب کے دوران میرے کراچی کے فائیو اسٹار ہوٹل میں قتل کردیا جانا تھا لیکن میں نے اس خوفناک سازش کو اتنی کامیابی سے ناکام بنایا کہ حفیظ صاحب حیران رہ گئے۔ میں اس سازش کو ناکام بنانے کے بعد لاہور روانہ ہوگیا۔ میں نے راحیلہ اور راشد کو لاہور شفٹ ہونے پر آمادہ کرلیا تھا اور اس پر بہت خوش تھا۔ دورانِ سفر میری ایک شخص ملک ریاض راہی سے ملاقات ہوئی جو میرے دو پرانے دشمنوں مرحوم ملک اسلم اور ملک قیصر کی دولت و جائداد کا وارث تھا اور میرے بارے میں کافی معلومات رکھتا تھا۔ اس حوالے سے اس کا میرے بارے میں معلومات رکھنا مجھے کھٹک رہا تھا۔ گھر پہنچ کر غسل وغیرہ کرنے کے بعد مجھے پتا چلا کہ پرنس تمینہ ہوٹل سے غائب ہے لیکن جلد ہی ریڈ ڈاٹ کے ایڈم عرف ایڈی کے فون سے معلوم ہوگیا کہ ہنی ان کی تحویل میں تھی۔ انہیں یہ بات معلوم ہوگئی تھی کہ حفیظ صاحب والا منصوبہ ہنی ہی کے ذریعے لیک آؤٹ ہوا تھا۔ آخر کار ایک روز اے ٹن میرے قابو میں آہی گیا۔ اس کی گرفتاری میں میرے ایک پرستار وسیم احمد نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ میں نے اسے اپنے ایک خفیہ ٹھکانے دو نمبر پہنچادیا۔ دوسرے روز میں اپنی حفاظت کا بندوبست کرکے شکرگڑھ پہنچ گیا جہاں ملک ریاض نے ایک شاندار دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ ملک ریاض کی طرف سے میرے خدشات اس وقت درست ثابت ہوئے جب اس نے تمام مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد مجھ سے پچاس لاکھ کا مطالبہ کیا۔ اس موقع پر مشہور ڈاکو نورو ماچھی اور اس کا گروہ بھی موجود تھا۔ اچانک ایک برجی کے عقب سے اسمگلر سیٹھ عالم شیر بھی نکل کر سامنے آگیا۔ اسے یہاں دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ میں نے نہایت ہوشیاری سے اپنے ساتھیوں کو مخصوص سگنل دیا۔ پھر کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ ملک ریاض اور عالم شیر کا منصوبہ انہی پر الٹ گیا۔ میرے ساتھیوں نے ایک آدھ کے علاوہ تمام ڈاکوؤں کو ختم کردیا۔ عالم شیر بھی گولی لگنے سے زخمی ہوا۔ ملک شیر کی بھی میں نے اچھی طرح خبر لی جبکہ اس سے قبل میں نورو ماچھی کو چھت سے نیچے پھینک چکا تھا۔ ان سب کو اچھا خاصا سبق دینے کے بعد ہم واپس شہر پہنچ گئے۔ دوسرے دن میں اے ٹن کی خبر لینے "دو نمبر" پہنچا تو جولی عرف مس ٹرپ نے بتایا کہ سر پر پڑنے والی ضرب سے اس کی ذہنی صلاحیتیں ختم ہوگئی ہیں۔ اسی دوران ریڈ ڈاٹ والوں نے ستارہ کو اغوا کرلیا۔ وہ ستارہ کے بدلے اے ٹن کا تبادلہ چاہتے تھے۔ اے ٹن کیونکہ ذہنی سطح پر بچہ بن جانے کے سبب میرے لئے بیکار تھا للذا میں اس تبادلے پر تیار ہوگیا لیکن تبادلے کے وقت انکشاف ہوا کہ اے ٹن بالکل ٹھیک ہے۔ اے ٹن کی ڈرامے بازی پر مجھے غصہ تو بہت آیا مگر میں نے برداشت سے کام لیا۔ ستارہ کے ساتھ واپسی میں میں نے ایک پہلوان جی کو ریڈ ڈاٹ کے پُراسرار گمشدہ بلیک باکس کے ساتھ تانگے میں محوِ سفر دیکھا تو تعاقب کرتا ہوا ان کے اکھاڑے پر پہنچ گیا۔ پہلوان جی شریف اور وضع دار آدمی تھے' انہوں نے بلیک باکس میرے حوالے کردیا۔ میری ہدایت پر ٹونی نے وہ باکس کھلوایا تو اس میں سے چند افراد کے ناموں پر مشتمل ایک فہرست برآمد ہوئی۔ وہ سب اہم افراد تھے جو اہم محکموں میں اہم عہدوں پر فائز تھے۔ فہرست دیکھنے کے بعد میں آفس میں اکیلا بیٹھا ڈاک دیکھ رہا تھا کہ ڈاکو نورو ماچھی کا بھائی دیرو ماچھی اپنے بھائی کا انتقام لینے کے لئے شیشے کا دروازہ توڑ کر جھپاک سے اندر آگیا مگر کچھ دیر بعد اس کی حسرتِ انتقام خود اس کے اپنے وجود کے ساتھ خاک میں مل گئی۔ میرے گارڈ فضل الٰہی نے نہایت مشاقی اور مہارت سے سیون ایم ایم کا برسٹ مار کر اسے ہلاک کردیا جبکہ اس کے بقیہ دو ساتھیوں کو ٹونی نے گولی ماردی اور ایک فرار ہوگیا۔ رات کو میرے گھر پر بھی نورو کے آدمیوں نے حملہ کیا اور اس مرتبہ بھی انہیں دو لاشیں چھوڑ کر فرار ہونا پڑا۔ ایک روز پروگرام کے مطابق راحیلہ اور راشد لاہور پہنچ گئے۔ میں آدھی رات کو انہیں ان کی رہائش گاہ چھوڑ کر واپس آرہا تھا کہ اچانک ایک شخص گاڑی کے سامنے آگیا۔ وہ میرے بچپن کا دوست ریاض عرف راجو تھا۔ میں اس طرح اچانک اس کے ملنے پر حیران تھا کہ دوسری حیرت مجھ پر اس وقت ٹوٹی جب میں اس کے گھر پہنچ کر اس کی بیوی سے ملا۔ وہ میرے بچپن کی پہلی محبت شمیم تھی۔ میں ان کے ساتھ کچھ وقت گزار کر واپس گھر آگیا۔ دوسرے روز خلیفہ نواز پی بیکر نے مجھ سے دفتر میں ملاقات کی۔ میں نے انہیں جس جدید قسم کے اکھاڑے کی

پیشکش کی تھی' وہ اس پر رضامند ہو گئے تھے۔ ریاض راہی اور عالم شیر بار کھانے اور تنبیہ کے باوجود کیونکہ مسلسل میرے راستے کا پتھر بنے ہوئے تھے' لہٰذا میں نے انھیں راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس فیصلے کے چند ہی روز بعد ٹونی نے ملک ریاض راہی کا اس خوبصورتی سے پتا صاف کیا کہ اس کی موت حادثہ معلوم ہو۔ عالم شیر بھی بس اب چند ہی دنوں کا مہمان تھا۔ فون پر ٹونی سے ملک ریاض کے متعلق خوشخبری سننے کے بعد میں سکون کی گہری نیند سو گیا لیکن میری آنکھ اپنے بیڈ روم میں نہیں کہیں اور ہی کھلی تھی اور اے ٹن میرے قریب بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ یہ ایک انتہائی جدید اور سائنٹیفک عمارت تھی۔ اے ٹن کے مطابق مجھے مذاکرات کے لئے یہاں لایا گیا تھا۔ طبیعت بحال ہونے پر ایک لڑکی لیونا مجھے ایک پُراسرار قسم کے ہال میں لے گئی جہاں ایک میز کے گرد اے ٹن' ایڈی اور ایک مختصر جوڑا بیٹھا تھا۔ ایک طرف میں نے اس چمپینزی کو بھی بیٹھے دیکھا جس نے مجھے عاجز کردیا تھا۔ کچھ دیر انتظار کے بعد ایک اندھیرے گوشے سے ایک دراز قد اور پُراسرار سا شخص نمودار ہوا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کا کوئی چہرہ نہیں تھا بلکہ اس کے نہایت چوڑے کندھوں کے درمیان سر کی جگہ ایک بہت بڑا سفید انڈا رکھا تھا۔ اس کا نام مجھے باس ون بتایا گیا۔ باس ون نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور مذاکرات کی ابتدا کرتے ہوئے ریڈ ڈاٹ کے متعلق بہت تفصیل سے بتانے کے بعد میرے پوچھے پر یہ حیرت انگیز انکشاف کیا کہ وہ مجھے پاکستان کا سربراہِ مملکت بنانا چاہتے ہیں۔ میں اس پیش کش پر حیران رہ گیا۔ باس ون نے مجھے سوچنے کے لئے دو ماہ کی مہلت دی اور پھر کسی سریع الاثر گیس کے ذریعے بے ہوش کرکے واپس میرے بیڈ روم میں پہنچا دیا گیا۔ میں نے بہت سوچ بچار کے بعد اس سلسلے میں وزیرِ خارجہ حفیظ صاحب سے بات کرنے کا فیصلہ کیا لیکن اس سے قبل میں نے چند چھوٹی موٹی پریشانیوں سے جان چھڑالینا بہتر سمجھا۔ کوئی مختار رفیق نامی بدمعاش' راجو اور شمیم کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ اس نے شمیم کے اصطبل کو بھی آگ لگادی تھی۔ میں نے اصطبل پہنچ کر مختار رفیق اور اس کے گرگوں کو اچھا خاصا سبق دے ڈالا۔ چہرے پر زوردار گھونسا لگنے سے مختار رفیق حواس کھو بیٹھا۔ اس کے بعد میں نے راحیلہ سے مل کر شہر سے باہر عالم شیر کو گھیرنے کا پروگرام بنایا اور ایک خونریز معرکے کے بعد آخر کار اسے اور اس کے کچھ ساتھیوں کو عالمِ بالا پر بھیج دیا۔ دوسرے روز میں ستارہ سے ملنے چلا گیا۔ رات کے پچھلے پہر وہاں سے گھر واپسی پر ابھی میں گاڑی سے اترنے کا ارادہ ہی کررہا تھا کہ اپنے عقب میں ایک ہلکی سی کراہ سن کر چونک گیا۔ پیچھے مُڑ کر دیکھا تو وہ ایک کمسن اور فرشتہ صورت لڑکی تھی۔ میں اپنی گاڑی میں اس کی موجودگی کو دشمنوں کی کوئی نئی چال سمجھا تھا جبکہ ایسا نہیں تھا۔ وہ ایک بڑے آدمی کی بیٹی تھی جسے تاوان کی غرض سے اغوا کیا گیا تھا۔ اس لڑکی نبیلہ کو پامال کیا گیا' اس سے پیشہ کرایا گیا' اس کے ماں باپ بھی تاوان کی رقم لے جاتے ہوئے کار کے حادثے میں ہلاک ہوگئے۔ اور ان تمام زیادتیوں کا ذمے دار بھی مختار رفیق تھا۔ میں نے نبیلہ کو اپنے گاؤں کی ایک عورت تاجاں کے پاس چھوڑ دیا لیکن مختار رفیق نے نہایت سفاکانہ انداز میں انھیں قتل کرادیا۔ اس سفاکی پر میرا خون کھول اٹھا اور میں نے اس سانحے کے تمام ذمے داروں کو مختار رفیق سمیت جہنم رسید کردیا۔ ان سے نمٹ کر میں نے ریڈ ڈاٹ کے سلسلے میں حفیظ صاحب کو آگاہ کیا' پھر راحیلہ کی طرف چلا گیا۔ رات گئے گھر واپس پہنچا تو وہاں ہر چیز جل کر راکھ ہوچکی تھی۔ میرے گھر کو ریڈ ڈاٹ والوں نے آگ لگادی تھی کیونکہ انھیں پتا چل گیا تھا کہ میں نے ان کی ہدایات کے برعکس حکومت کی ایجنسیوں سے ملاقات کی ہے۔ میں نے اپنے جلتے ہوئے گھر کے پاس ریڈ ڈاٹ کے چمپینزی کو بھی دیکھا اور اسے گولی سے نشانہ بنانے کی کوشش کی لیکن ہمیشہ کی طرح وہ اس بار بھی بچ کر نکل گیا۔ میں علی الصباح ستارہ کے گھر پہنچ گیا۔ مجھے ستارہ کے گھر پہنچے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ایڈی نے ستارہ کو فون کرکے مجھے اپنے گھر سے نکال دینے کو کہا مگر ستارہ نے صاف انکار کردیا۔ اس جرم کی پاداش میں ستارہ کو شوٹنگ کے دوران زہر دے کر ہلاک کردیا گیا۔ میں اسٹوڈیو میں ستارہ کی لاش دیکھ کر اور کچھ معلومات کرکے شمیم کے گھر پہنچ گیا۔ دروازے پر میرا استقبال ایک بہت خوب صورت' صحت مند اور ذہین بچے نے کیا۔ یہ شمیم کا بیٹا تھا' مری میں پڑھتا تھا لیکن آج کل چھٹیوں پر گھر آیا ہوا تھا۔ مختصراً شمیم کو اپنے حالات سے آگاہ کرکے میں ایک بیڈ روم میں پڑ کر سو گیا۔ لیکن ابھی کچھ ہی دیر سویا تھا کہ شمیم نے مجھے بیدار کردیا۔ کیونکہ میرے آدمیوں' احمد اور آفتاب نے بلیک برڈ کو پکڑلیا تھا۔ لیکن جب میں احمد کے ہمراہ صورتِ حال کا جائزہ لینے پہنچا تو بلیک برڈ غائب تھا اور آفتاب اُدھڑی ہوئی لاش کی صورت میں زمین پر پڑا تھا۔ ابھی میں اس کا معائنہ ہی کررہا تھا کہ اندر سے ملازمہ اور شمیم کی چیخیں سنائی دیں۔ میں بھاگم بھاگ اندر پہنچا تو پتا چلا' بلیک برڈ شمیم کے بیٹے عمار کو اٹھا کر لے گیا ہے۔ شمیم اپنے بیٹے کی وجہ سے بے حال ہورہی تھی۔ اس نے روتے روتے انکشاف کیا کہ عمار میرا بیٹا ہے تو میں سکتے میں رہ گیا۔ بلیک برڈ' عمار کو اغوا کرکے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا مگر میں نے اور احمد نے تیز رفتاری سے تعاقب کرکے اسے گھیرلیا۔ بلیک برڈ کے دو ساتھی ہمارے ہاتھوں مارے گئے جبکہ وہ خود عمار کو چھوڑ کر زخمی حالت میں بھاگ نکلا۔ میں عمار کو شمیم کے پاس چھوڑ کر راحیلہ کی طرف چلا گیا۔ میں راحیلہ اور راشد کے ساتھ گپ شپ میں مصروف تھا کہ وہاں بھی ریڈ ڈاٹ والوں نے حملہ کرکے تباہی پھیلادی۔ اس حملے میں راشد بھی گولی لگنے سے ہلاک ہوگیا لیکن ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ راحیلہ' بلیک برڈ کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ میں راشد کی الم ناک موت کے سانحے سے ابھی سنبھلا بھی نہیں تھا کہ اسلام آباد سے نفیس صاحب کا بلاوا آگیا۔ ان کے ساتھ ایک طویل اور تھکا دینے والی میٹنگ کے بعد باہر نکل کر میں اپنی گاڑی کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ایک خوف ناک دھماکا ہوا اور میں نے گاڑی کے پرخچے اڑتے دیکھے۔ ایک گارڈ ہلاک ہوگیا جب کہ دوسرا گارڈ اور ڈرائیور بری طرح زخمی ہوگئے۔ نفیس صاحب کے آدمیوں نے مجھے واپس ہوٹل میں پہنچادیا جہاں سے میں بلا مقصد ڈرائیونگ کو نکل کھڑا ہوا۔ اس بے مقصد ڈرائیونگ کے دوران اے ٹن اور اس کے ایک ساتھی نے مجھے اغوا کرکے اپنے کسی خفیہ ٹھکانے پر پہنچادیا جہاں میری ملاقات باس ٹو سے کرائی گئی۔ باس ٹو کے کندھوں پر بھی چہرے کی جگہ انڈا رکھا ہوا تھا۔ باس ٹو نے پیش کش کی کہ اگر میں وزیرِ خارجہ حفیظ صاحب کو راستے سے ہٹا کر ان کی ڈی کو وزیرِ خارجہ ڈکلیئر کردوں تو وہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں گے۔ کچھ سوچ کر میں نے ہامی بھرلی اور لاہور واپس پہنچ کے راحیلہ کی طرف چلا گیا۔ راحیلہ نے دروازہ کھولا تو اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ اس نے نیچے سڑک پر کسی شخص کو گولی مار کر ہلاک کردیا تھا جو اس کے فلیٹ کی نگرانی کررہا تھا۔ میں نے راحیلہ کو ریڈ ڈاٹ کے حوالے سے موجودہ صورتِ حال بتائی تو اس نے اصرار کیا کہ ریڈ ڈاٹ کے کارندے یعنی حفیظ صاحب کی ڈی عرفان کو اغوا کرلیا جائے۔ منصوبہ ترتیب دینے کے بعد میں نے حفیظ صاحب کو فون کرکے ملاقات کا وقت لے لیا اور حفیظ صاحب کی ڈی عرفان کو ساتھ لے کر حفیظ صاحب کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ راستے میں میں نے راحیلہ اور اپنے دیگر ساتھیوں کو مختلف گلیوں میں ارد گرد پوزیشن سنبھالے دیکھا۔ حفیظ صاحب کے پاس پہنچتے ہی میں نے تمام تر خطرات کے باوجود انھیں عرفان کی اصلیت سے آگاہ کردیا۔ حفیظ صاحب نے فوراً سیکیورٹی والوں کو طلب کرلیا لیکن ساری تدبیریں دھری رہ گئیں۔ ایک خوفناک دھماکے کے ساتھ کوٹھی کا بیشتر حصہ ملبے کا ڈھیر بن گیا اور اس کے ساتھ ہی بے تحاشا گولیاں چلنے لگیں۔ دھماکا ہوتے ہی راحیلہ کوٹھی میں گھس آئی تھی۔ اچانک میں نے اور راحیلہ نے دو آدمیوں کو فضا میں پرواز کرکے تیزی سے اپنی طرف آتے دیکھا۔ چند سیکنڈ بعد وہ ہمارے سامنے ملبے کے ڈھیر پر آن اترے۔ ریڈ ڈاٹ کا یہ نیا شعبدہ میرے سامنے آیا تھا۔ ان فضائی مخلوق قسم کے انسانوں نے مجھے اور راحیلہ کو پکڑنے یا ہلاک کرنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکے۔ کوٹھی ملبے کا ڈھیر بن چکی تھی' حفیظ صاحب کے سب گارڈ ہلاک ہوچکے تھے اور خود حفیظ صاحب بے ہوش پڑے تھے۔ وہ دونوں فضائی انسان' پولیس کی آمد پر حفیظ صاحب کی ڈی عرفان کو ساتھ لے کر فرار ہوگئے۔ میں نے اور راحیلہ نے کلاشنکوف کا برسٹ مار کر انھیں ہلاک کرنے کی کوشش کی لیکن گولیوں کا ان پر ذرا بھی اثر نہ

ہوا۔ اس ہنگامے کے بعد راحیلہ اپنے آدمیوں کی خبرگیری کے لئے وہیں ٹھہر گئی جبکہ میں اپنے ایک واقف میک اپ مین انوار کے پاس پہنچ گیا۔ میری ہدایت پر انوار نے میرے ایک خاص آدمی منصور پر میرا بہت عمدہ میک اپ کردیا۔ اب منصور کو میرا کردار ادا کرنا تھا کیونکہ میں کچھ عرصے کے لئے منظر سے ہٹنا چاہتا تھا۔ انوار نے مجھ پر بھی ایک دیہاتی ٹائپ دودھ والے کا میک اپ کردیا اور میں تیزرو میں سوار ہوکر نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہوگیا لیکن میرا میک اپ اور میری تمام تر چالاکی اس وقت دھری رہ گئی جب ریڈ ڈاٹ کی فضائی مخلوق نے تیزرو کو رات کے اندھیرے اور گھنے جنگل میں رکوا کر مجھے گھیر لیا۔ میں نے ان کے ایک آدمی کی گردن توڑ دی اور گھنے جنگل میں گھس کے سڑک کے قریب رہتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھتا رہا۔ خوش قسمتی سے جلد ہی مجھے ایک ٹرک میں لفٹ مل گئی لیکن کچھ ہی دیر کے سفر کے بعد اس کمبخت فضائی مخلوق نے ٹرک کو بھی گھیر لیا۔ ٹرک میں سفر کے دوران اچانک میری نظر اپنی قیمتی گھڑی پر پڑی تو ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ ریڈ ڈاٹ والوں نے یقیناً میری گھڑی میں کوئی ڈیوائس چھپادیا تھا جس کے ذریعے وہ ہر جگہ مجھ تک پہنچ جاتے تھے۔ ٹرک ڈرائیور شیر خان کو میری گھڑی پسند آگئی تھی لہٰذا میں نے پیچھا چھڑانے کی خاطر وہ گھڑی شیر خان کو تحفتاً دے دی۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد ایک فضائی شیطان نے کوئی سفید اور چمکتی ہوئی چیز ٹرک پر پھینکی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے پیچھے چھلانگ لگادی اور ایک برساتی نالے میں گرا۔ کچھ دیر بعد پانی کی تہہ سے اوپر آیا تو ٹرک کے ساتھ ساتھ شیر خان کے بھی پرخچے اڑ چکے تھے۔ کلینر رستم خان کو فضائی شیطان پہلے ہی ہلاک کرچکا تھا۔ قتل کرادینے والے فضائی شیطان کا اب وہاں کچھ نہ تھا۔ شاید وہ اپنا مشن مکمل کرکے واپس جاچکا تھا۔ اس جگہ سے بہت دور نکل آنے کے بعد میں بس پکڑ کر پہلے تو ملتان پہنچا اور وہاں سے کراچی ایکسپریس کے ذریعے سکھر پہنچ گیا۔ یہاں ایک اچکے نے شہر تک لفٹ دینے کے بہانے راستے میں سنگر گیل پر مجھے لوٹنے کی کوشش کی اور ریوالور نکال لیا۔ اس کے ساتھ چھینا جھپٹی میں میرا تھیلا دریا میں گر گیا جس میں چودہ لاکھ روپے موجود تھے۔ میں نے غصے اور جھنجلاہٹ میں اس اچکے کو بھی اٹھا کر دریا میں پھینک دیا۔ سکھر سے میں کندھ کوٹ جانے والی بس میں سوار ہوگیا ——

کندھ کوٹ کی طرف سفر کرتے ہوئے مجھے چند خونخوار اور وحشی افراد نے بھری بس سے کسی ایسے شخص کے شبے میں اغوا کرلیا جس نے ان کے سردار کے بیٹے کو قتل کردیا تھا۔ میں نے انہیں ہر طرح یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں ان کا مطلوبہ آدمی نہیں ہوں مگر وہ میری بات ماننے پر تیار نہیں تھے۔ وہ مجھے اپنے سردار نواب سرور کے پاس پہنچانا چاہتے تھے۔ ایک طویل سفر کے بعد وہ مجھے ساتھ لے کر پہاڑی علاقے میں موجود ایک قلعہ نما مکان میں پہنچ گئے۔ انہوں نے میرے ساتھ کوئی تشدد یا زیادتی نہیں کی تھی البتہ میرے ہاتھ پیر باندھ دیے گئے۔ ہمیں اس جگہ پہنچے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ نواب سرور کی بھانجی نواب زادی نگینہ بھی وہاں پہنچ گئی۔ اس کا شوہر شدید زخمی حالت میں اس کے ساتھ تھا۔ ڈاکوؤں نے ان پر حملہ کیا تھا۔ نواب زادی اور اس کے دو بچے محفوظ رہے تھے مگر شوہر کی حالت انتہائی تشویش ناک تھی۔ تقریباً ڈھائی کروڑ روپے کا سونا بھی نواب زادی کے ساتھ تھا۔ نواب زادی کو اس ڈیرے پر پہنچے ابھی کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ ڈاکو بھی اس کے تعاقب میں وہاں تک پہنچ گئے۔ وہ یقیناً اس سونے کے چکر میں تھے جو نواب زادی اپنے ساتھ لائی تھی۔ ڈاکوؤں نے ڈیرے پر اندھا دھند فائرنگ کرکے ڈیرے کے بیشتر لوگوں کو ہلاک کردیا۔ مجھے گرفتار کرکے لانے والوں کا سرغنہ عیسیٰ خان بھی ہلاک ہوگیا جبکہ بلال خان ان کا مقابلہ کرنے کی حتی المقدور کوشش کررہا تھا۔ میرے ٹوکنے پر بلال نے نواب زادہ حسام کی نبض چیک کی پھر چادر سے نواب زادہ کا چہرہ ڈھانپ کر سر جھکالیا۔ نواب زادی نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آخر کار اس چٹان کے سینے سے چشمہ پھوٹ پڑا تھا۔

قسط نمبر: ۳۷

نواب زادی خاصی دیر تک روتی رہی۔ کسی نے اسے چپ کرانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ شاید کسی میں اتنی جرأت ہی نہیں تھی یا پھر میری طرح وہ بھی یہی سوچ رہے تھے کہ اس پتھر کے لیے کچھ دیر اشک بہالینا ہی بہتر تھا۔

آخر کار اس کے آنسو تھم ہی گئے۔ آنسوؤں سے تر چہرہ اس نے اپنے اسکارف سے اچھی طرح پونچھ لیا۔ اب اس کا چہرہ پتھرا سا گیا تھا۔ اس پر کوئی تاثر باقی نہیں رہا تھا۔ صرف متورم اور سرخ آنکھیں بتا دے رہی تھیں کہ وہ روتی رہی تھی۔

بلال شیدی کی طرف دیکھے بغیر اس نے بدلی بدلی اور سپاٹ سی آواز میں پوچھا "اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

عجیب احمقانہ سوال تھا۔ وہاں تو کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ کوئی نواب زادی کو کیا بتاتا۔

"میں... میں کیا بتا سکتا ہوں نواب زادی صاحبہ!" بلال شیدی الجھن آمیز لہجے میں بولا۔

نواب زادی کو شاید جواب کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو گویا یونہی بس تو یہی سی حالت میں سوال کر گئی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کا چہرہ جو اب بے حد بھیانک ہوچکا تھا' چادر سے ڈھانپ دیا۔ وہ خود بھی اب شاید اس چہرے پر نظر ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔

پھر وہ دھیرے دھیرے اٹھی اور یوں تن کر کھڑی ہوگئی کہ اس کا قد اصل سے کچھ اونچا محسوس ہونے لگا۔ رات سے اب تک اس کی حالت میں بڑا تغیر آچکا تھا۔ اس کا حسن گویا کہیں پس منظر میں چلا گیا تھا۔ وہ ایک آسیب زدہ سی مخلوق دکھائی دینے لگی تھی۔

پھر وہ ویسی ہی بدلی بدلی اور آسیب زدہ سی آواز میں بولی "مجھے ایک گن دو۔ میں باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہتی ہوں۔"

"لیکن کس سے نواب زادی صاحبہ؟" بلال شیدی نے تعجب سے پوچھا "کیا باہر آپ کو کوئی نظر آرہا ہے؟"

"نظر آئے یا نہ آئے' ہمیں کچھ تو کرنا ہوگا۔ آخر ہم کب تک یونہی چوہوں کی طرح دبکے بیٹھے رہیں گے؟" وہ برہمی سے بولی اور یکدم ہی اس کے چہرے کا پتھریلا پن دور ہوگیا۔ وہ پھر سے ایک زندہ عورت نظر آنے لگی۔ اس کا چاندنی سا چہرہ ڈوبتے سورج کی طرح دہک اٹھا۔

"کبھی کبھی یوں بھی بیٹھنا پڑتا ہے نواب زادی صاحبہ!" بلال شیدی احترام اور تحمل سے بولا "یہ اسلحے کی نہیں' حوصلے اور اعصاب کی جنگ ہے۔ اپنی قبائلی لڑائیوں میں ہم نے ایسا بھی وقت گزارا ہے جب ہم آٹھ آٹھ دن پہاڑوں پر مورچے لگائے بیٹھے رہے۔ ہمارا تجربہ تو پھر بھی بہت کم ہے۔ قبیلے میں ایسے بھی لوگ ہیں جو سرکار سے جنگلوں میں مہینوں اور برسوں پہاڑوں پر رہے۔ بکریاں ذبح کرکے کچا گوشت کھاتے رہے۔ جب وہ نیچے آئے تو ان میں سے بہت سوں کو ٹی بی تھی اور ان کے جسموں پر جوئیں اس طرح چل رہی تھیں جس طرح مٹھاس سے لتھڑی ہوئی جگہ پر

چیونٹیاں چلتی ہیں۔ میل کی تہیں اس طرح جمی ہوئی تھیں کہ چاقو سے کھرچی جاسکتی تھیں۔"

"تم مجھے تاریخ سنانے مت بیٹھ جایا کرو۔" نواب زادی غصے سے بولی "اس وقت کی بات کرو' اس وقت ہم کیا کریں۔ نہ وہ سامنے آرہے ہیں اور نہ ہی ہم کوئی فیصلہ کن قدم اٹھا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔"

میں نے بلال شیدی کے بھنچے ہونٹوں پر ایک لمحے کے لیے خفیف سی مسکراہٹ کی جھلک دیکھی۔ وہ نہایت دھیمے اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا "اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ کو زندگی میں کبھی اس قسم کی صورت حال سے واسطہ ہی نہیں پڑا۔ آپ نے صرف حکم کی تعمیل ہوتے دیکھی ہے' جنبش ابرو سے حالات تبدیل ہوتے دیکھے ہیں۔ بے بسی شاید پہلی بار آپ کی زندگی میں آئی ہے۔"

اسے شاید احساس ہوا کہ اس کے الفاظ اور انداز کو گستاخی نہ سمجھ لیا جائے۔ اس کے لہجے میں یکدم مٹھاس اور ملائمت آگئی "خواہ آپ اسے میری گستاخی سمجھیں اور خواہ کتنی ہی برہم ہوں لیکن میں آپ کو باہر جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ صرف خودکشی ہوگی اور کچھ نہیں۔ نواب زادہ صاحب کے ساتھ جو کچھ ہوا اس وقت ہم آپ کے ساتھ نہیں تھے۔ جو لوگ ساتھ تھے انہوں نے جان دے کر اپنا فرض ادا کردیا۔ اب آپ ہماری حفاظت میں ہیں۔ اگر خدانخواستہ آپ کو کچھ ہوگیا اور ہم زندہ بچ گئے تو ہم قبیلے میں واپس جانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ بڑے نواب صاحب کو کیا منہ دکھائیں گے؟ اس لیے اگر اب جان دینے کا مرحلہ آئے گا تو پہلے ہم دیں گے۔ موت کے سامنے سینہ تان کر جانے کی ضرورت ہوگی تو ہم جائیں گے۔ آپ اس قسم کی کوئی کوشش نہیں کریں گی۔ اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔"

"یہ بے بسی میرے لیے موت سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔" نواب زادی مٹھیاں بھینچ کر بولی۔ وہ یقیناً مبالغے سے کام نہیں لے رہی تھی' سچ بول رہی تھی۔ اس طبقے کے لیے بے بسی سب سے بڑی سزا تھی۔

اس کا انداز دیکھ کر مجھے راحیلہ یاد آگئی۔ وہ سردار زادی تو نہیں تھی لیکن اس کے مزاج میں بھی کہیں کچھ ایسے ہی جراثیم موجود تھے۔ ریڈ ذات کے مقابلے میں اسے بھی بے بسی گوارا نہیں تھی۔ ایک خاص حد تک پہنچنے کے بعد اس کے لئے سب کچھ ناقابل برداشت ہوگیا تھا۔ اس نے جو کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کیا تھا وہ بہت تباہ کن ثابت ہوا تھا۔ میں جو آج اس ویرانے میں پھنسا بیٹھا تھا' اس میں کسی حد تک اس کی کارروائیوں کو بھی دخل تھا۔ بہرحال میں اسے زیادہ قصوروار نہیں سمجھتا تھا۔ اس کی نیت نیک تھی اور سب سے بڑی چیز نیت ہی ہوتی ہے۔ وہ میری دوستی اور تعلق خاطر میں ہی جان پر کھیل رہی تھی اور اپنی دانست میں اس نے مسئلہ حل کرنے ہی کی کوشش کی تھی۔

میں نے جلدی سے یادوں کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی۔ جو ہونا تھا وہ ہوچکا تھا۔ اس کے بارے میں سوچتے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ مجھے زمانۂ حال میں ہی رہنا چاہیے تھا اور اپنی توجہ اس پر رکھنی چاہیے تھی جو میری آنکھوں کے سامنے ہورہا تھا۔

نواب زادی چند لمحے اپنی جگہ مٹھیاں بھینچے کھڑی رہی اور گہری گہری سانسیں لیتی رہی۔ ایک اچھی علامت یہ تھی کہ وہ اپنے غم و غصے کو ضبط کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ آپے سے باہر نہیں ہورہی تھی۔

آخرکار وہ قدرے شکست خوردہ سے لہجے میں بولی "میں اپنے بچوں کے پاس جارہی ہوں۔"

بلال شیدی نے بے تابی سے ہاتھ بلند کیا "پلیز۔ نواب زادی صاحب! آپ اس کمرے سے کہیں بھی جانے کی کوشش نہ کریں اور دیوار کی اوٹ میں ہی رہیں۔ یہ کمرا ہر لحاظ سے بہترین ہے۔ پناہ گاہ کے طور پر بھی اچھا ہے اور ڈاکوؤں پر نظر رکھنے کے لیے بھی۔ یہاں ہم اپنا بچاؤ بھی کرسکتے ہیں اور جب ڈاکو سامنے آئیں گے تو یہیں سے جوابی فائرنگ بھی سب سے زیادہ فائدہ مند رہے گی۔ یہی کمرا سب سے بڑا بھی ہے۔ فی الحال آپ یہاں سے کہیں بھی نہ جائیں۔"

"جہاں بچے ہیں وہ کمرا یہاں سے بہت دور تو نہیں ہوگا۔" نواب زادی کے لہجے میں اب تیز و تندی نہیں تھی "وہ۔ بھیماں بھی تو وہاں سے دو تین مرتبہ یہاں آچکی ہے۔"

"اس کی بات اور ہے نواب زادی صاحب!" بلال بولا "اسے گولی لگ بھی گئی تو کیا فرق پڑجائے گا۔ اس کی اور آپ کی جان برابر تو نہیں ہے۔"

کسی کی توجہ میری طرف نہیں تھی۔ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا لیکن یہ وہ مسکراہٹ تھی جو دل میں زہر سا پھیلنے کے بعد ہونٹوں پر آتی ہے۔ بلال کے خیال میں نواب زادی اور بھیماں کی جان برابر نہیں تھی۔ میں سوچ رہا تھا' خدا نے تو سب کو برابر پیدا کیا تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ نہ جانے کتنی درجہ بندیاں ہوتی چلی گئیں۔ بادشاہ' سردار' نواب' اُمراء اور صاحبانِ حیثیت تو محلوں' قلعوں اور فصیلوں میں محفوظ رہنے لگے۔ جتھے کے جتھے ان کی حفاظت پر مامور رہنے لگے اور بے چارہ عام' غریب اور بے حیثیت انسان کھلے آسمان تلے آفتوں' دشمنوں' درندوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنے کے لیے بے سہارا رہ گیا۔ نہ جانے کس کس کا نوالہ بنتا رہا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حیثیتیں اور انداز خواہ کتنے ہی بدل گئے تھے لیکن فرق اب بھی وہی چھوٹے بڑے کا تھا۔ وہ جو بڑے تھے' ان کے گرد آج بھی فصیلیں تھیں' محافظ تھے۔ ان کے لیے جان دینے والوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ جو بے چارے چھوٹے تھے' بے حیثیت تھے ان کا خون آج بھی پانی سے ارزاں تھا۔

ستم تو یہ تھا کہ جو غریبوں اور بے حیثیتوں کے کندھوں پر سوار ہو کر بڑے بنتے تھے' ان کے نام کی مالا جپتے تھے' ہر وقت غریبوں کی وکالت کرتے ہوئے جن کا گلا سوکھتا تھا وہ بھی جب بڑے بن جاتے تھے' انہیں کوئی مقام مل جاتا تھا' وہ لیڈر' وزیر' سفیر یا کچھ اور بن جاتے تھے تو ان کے گرد بھی فصیلیں بہت اونچی ہو جاتی تھیں۔ ان کی جان قیمتی ہو جاتی تھی اور عام آدمی کی جان بے قیمت۔ سودے بازیوں' عہدوں' وزارتوں' سفارتوں کے لئے وہ ہوتے تھے اور لاٹھیاں' گولیاں کھانے' خون بہانے کے لیے بے چارے عوام اور ورکر۔ بڑوں کی حفاظت کے لیے چھوٹے بے چارے اپنے سروں کی فصیل کھڑی کیے رکھتے تھے اور اسی میں خوش رہتے تھے۔ یہ بڑی پرانی کہانی تھی۔ ہزاروں سال میں کبھی کبھار کوئی ایسا بڑا بھی پیدا ہو جاتا تھا جس کے دل میں واقعی چھوٹوں کا درد ہوتا تھا' جو واقعی اپنی جان کو چھوٹوں کی جان کے برابر سمجھتا تھا ورنہ بس کھوکھلی باتیں تھیں' جھوٹے نعرے تھے' دلوں کو گرمانے والے مگر جان کا نذرانہ لینے والے الفاظ تھے۔

"لیکن میں اب ہر حال میں بچوں کے پاس جانا چاہتی ہوں۔" اس کے لہجے میں تھکن آمیز ضد تھی۔ وہ اب اپنے شوہر کی لاش کی طرف بالکل نہیں دیکھ رہی تھی۔ جس حد تک بھی ممکن تھا' فی الحال وہ شاید اس حقیقت سے نظر چرانا چاہتی تھی کہ وہ بیوہ ہو چکی تھی' اس کے سر سے ایک مضبوط چھت ہٹ چکی تھی۔

"میں انہیں یہیں بلواتا ہوں۔" بلال شیدی بولا۔

"وہ یہاں آئیں گے تو کیا ان کی جان کو خطرہ لاحق نہیں ہوگا؟" نواب زادی تڑپ کر بولی "اس سے تو بہتر ہے میں اپنی جان کو ہی خطرے میں ڈال لوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے نواب زادی صاحبہ!" بلال زور دے کر بولا "آپ مطمئن رہیں' ہمارے آدمی انہیں کسی ترکیب سے اور بہت حفاظت سے لائیں گے۔ وہ بچوں کی ڈھال بن کر چند گز کا یہ فاصلہ طے کریں گے۔"

کمرے میں اب صرف دو کلاشنکوف بردار زندہ تھے اور میرا اندازہ تھا کہ باہر احاطے میں بھی چار دیواری کی اوٹ میں صرف تین چار آدمی ہی زندہ رہ گئے تھے۔ بلال شیدی نے کمرے میں موجود دونوں کلاشنکوف برداروں کو ہدایات دیں اور وہ دروازہ نہایت آہستگی سے تھوڑا سا کھول کر پیٹ کے بل باہر رینگ گئے۔ بلال نے خود نہایت محتاط انداز میں آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا تاہم کنڈی نہیں چڑھائی۔

کمرے میں موت کا سا سکوت چھا گیا۔ موت اپنی تمام تر بدصورتی کے ساتھ کمرے میں موجود ہی تھی۔ بہت دیر سے ڈاکوؤں نے کوئی فائر نہیں کیا تھا۔ میں جس زاویے پر بیٹھا تھا وہاں سے مجھے کھڑکی کے راستے ایک پہاڑی کا کچھ حصہ ترچھے سے انداز میں دکھائی دے رہا تھا۔ فضا پر جیسا گہرا سکوت طاری تھا اس سے کوئی اس خوش فہمی میں بھی مبتلا ہو سکتا تھا کہ شاید ڈاکو ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔

لیکن کم از کم میں اور بلال شیدی اس خوش فہمی میں نہیں تھے۔ مجھے پہاڑی کا جو حصہ نظر آ رہا تھا میں نے اس کے عقب میں چند لمحے پہلے ایک سیاہ سی چیز کو حرکت کرتے دیکھا تھا جو غالباً کسی ڈاکو کی پگڑی تھی۔ پہاڑیوں کے پیچھے کچھ پُراسرار سی نقل و حرکت جاری تھی۔ بلال شیدی کو بھی اس کا احساس تھا۔ وہ پُرخیال انداز میں اپنی مونچھ کو بل دیتے ہوئے ترچھے زاویے سے مسلسل باہر دیکھ رہا تھا۔

دن ڈھلنے لگا تھا۔ بھوک اور پیاس اب میرا بھی امتحان لینے لگی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ دوسروں کی حالت مجھ سے زیادہ خراب تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ باورچی خانے میں کھانے کا سامان تو موجود تھا لیکن مکان میں جس طرح لاشیں بکھری پڑی تھیں ان کی موجودگی میں کسی کو بھی اخلاقی طور پر یہ اچھا معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ وہ رُکھاں کو کھانا تیار کرنے کا پیغام بھیجے۔ خصوصاً جبکہ خود رُکھاں کا شوہر بھی مارا جا چکا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مکان میں نواب زادہ حشام کی لاش موجود تھی۔ اس کے سرہانے بیٹھ کر تو کوئی کچھ کھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

بہت دیر سے پھیلی ہوئی سکوت کی چادر یک لخت ہی تار تار ہو گئی۔ ڈاکوؤں کی رائفلیں ایک بار پھر گرج اٹھیں تھیں۔ بلال شیدی کچھ اس طرح اچھلا جیسے شکار کی گھات میں بیٹھے ہوئے درندے پر عقب سے کسی نے پتھر کھینچ مارا ہو۔ اس نے ہڑبڑا کر دروازے کی طرف دیکھا مگر دروازہ بدستور بند تھا۔

اس بار مکان میں سے کسی نے بھی فائرنگ کا جواب نہیں دیا۔ حتیٰ کہ بلال شیدی نے بھی گولی نہیں چلائی۔ شاید ان لوگوں کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ گولیاں ضائع کر رہے تھے۔ جب تک دشمن قریب نہ آ جاتا' ان کا کلاشنکوفوں سے برسٹ مارتے رہنا بیکار تھا۔ اُدھر ڈاکو کوئی فیصلہ کن کارروائی کرنے کے لیے مکان کے قریب نہیں آ سکتے تھے کیونکہ مکان کے چاروں طرف کھلا میدان تھا اور کھلے میدان میں کم فاصلے پر موجود کلاشنکوفیں بہرحال ان کے لیے خطرناک تھیں۔ اس طرح صرف محصورین ہی نہیں' محاصرہ کرنے والے بھی ایک عجیب سی صورت حال میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ مکان والوں کے سامنے تو اس صورت حال سے نکلنے کی کوئی تدبیر نہیں تھی۔ ڈاکوؤں کی طرف کیا کھچڑی پک رہی تھی اس کا کسی کو کچھ اندازہ نہیں تھا۔

شاید ڈاکو اپنی تمام تر جہالت کے باوجود اعصابی جنگ کی اہمیت سے آگاہ تھے۔ شاید وہ انتظار کر رہے تھے کہ ڈیرے والوں کے اعصاب جواب دے جائیں تو وہ کوئی حتمی کارروائی کریں۔ اگر وہ کسی کمک کے انتظار میں تھے تب بھی فائدے میں تھے کیونکہ ڈیرے داروں کے اعصاب واقعی چٹخنے لگے تھے۔ میں جن لوگوں کو

دیکھ پا رہا تھا، ان میں مجھے صرف بلال شیدی کے اعصاب کچھ ٹھکانے پر محسوس ہو رہے تھے۔

ڈاکوؤں کے فائروں کی بازگشت معدوم ہونے سے پہلے دوبارہ فائروں کی تڑتڑاہٹ گونجی اور بلال شیدی کا اضطراب بڑھ گیا۔ اس کی نظر دروازے پر تھی۔ یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ گولیاں اسی دیوار پر برس رہی تھیں جس میں دروازہ تھا لیکن لکڑی کا وہ بھاری بھرکم، موٹا اور بھدا سا دروازہ فی الحال کسی طرح گولیوں سے بچا ہوا تھا۔

اچانک دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور نواب زادی کے دونوں بچے اندر لڑھک آئے۔ وہ چوپایوں کی طرح چاروں ہاتھوں پیروں کے بل چل رہے تھے۔ کسی نے عقب سے انہیں ہلکا سا دھکا دیا تھا اور وہ منہ کے بل گرتے گرتے بچے تھے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید یہ حرکت کرنے والا موت کی سزا کا مستحق قرار پاتا لیکن موت کے احکامات جاری کرنے والوں کے سروں پر بھی اس وقت موت پَر پھیلائے ہوئے تھی اس لیے کسی کو اس گستاخی کا احساس نہ ہوا۔

دونوں بچے سخت دہشت زدہ اور حواس باختہ تھے۔ فوری طور پر تو انہیں اپنی ماں بھی نظر نہیں آئی۔ نواب زادی یکدم چٹائی سے اٹھی اور انہیں سنبھالنے کے لیے لپکنے ہی لگی تھی کہ بلال کلاشنکوف سے اشارہ کرتے ہوئے گھٹی گھٹی سی آواز میں چیخا "جھک کر... جھک کر"

نواب زادی کو بروقت اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ جس طرح سیدھی کھڑی تھی اگر اسی طرح تیزی سے اپنے بچوں کی طرف بڑھتی تو اسے کھڑکی کے سامنے سے گزرنا پڑتا اور عین ممکن تھا کہ اس دوران کھڑکی کے راستے آنے والی کوئی گولی اس کا لہو چاٹ جاتی۔ کھڑکی کے سامنے اب تک جس چیز نے بھی حرکت کی تھی، اس پر گولی ضرور آئی تھی۔

دیوار کی اوٹ میں رہنے کے لیے نواب زادی کو بھی ہاتھ پیروں کے بل جھکنا پڑا۔ ان اعصاب شکن حالات میں بھی بلاشبہ یہ میرے لیے ایک دلچسپ نظارہ تھا۔ بلاشبہ حالات کبھی کبھی بڑے ستم ظریفانہ مناظر دکھاتے ہیں۔ وہ گردنیں جو نخوت اور تکبّر سے ہمیشہ اکڑی رہتی ہیں، پل بھر میں شاخِ ثمربار کی طرح جھک جاتی ہیں۔ وجہ خواہ کچھ بھی ہو لیکن ان کا جھک جانا... بلکہ مضحکہ خیز حد تک جھک جانا بڑا دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔

نواب زادی اگر چند لمحے انتظار کر لیتی تو بچے خود ہی اس کے پاس پہنچ جاتے۔ وہ اتنی دیر اس کی آنکھوں سے دور رہے تھے، وہ جدائی تو اس نے برداشت کر لی تھی لیکن اب سامنے آگئے تھے تو اس سے ایک لمحے کے لیے بھی چند گز کا فاصلہ برداشت نہیں ہوا تھا۔ اس نے لڑکے اور لڑکی دونوں کو بیک وقت آغوش میں بھر لیا۔

وہ روئی تو نہیں البتہ اس کی آنکھیں ایک بار پھر نم ضرور ہو گئیں۔ بچے رونے لگے حالانکہ ابھی شاید انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ چارپائی پر چادر سے ڈھکا ہوا ان کے باپ کا وجود اب ایک لاش میں تبدیل ہو چکا ہے۔

دروازہ ابھی کھلا ہی تھا۔ جمیماں بھی چوپائے ہی کی طرح چلتی، گرتی پڑتی تیزی سے کمرے میں آگئی۔ پھر ان کلاشنکوف برداروں میں سے ایک رینگتا ہوا اندر آنے لگا لیکن اسے اندر آنے میں بڑی دقت پیش آرہی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے ساتھی کو گھسیٹتا ہوا لا رہا تھا۔

اس کا ساتھی جو زندہ سلامت اس کے ساتھ گیا تھا، اب اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ مر چکا تھا۔ وہ دونوں اور شاید جمیماں بھی بچوں کی ڈھال بن کر آرہے ہوں گے اور آخر کار ایک ڈھال کام آگئی تھی۔ اس کی خون میں لت پت لاش اندر آگئی۔ بلال شیدی کے چہرے کے کھنچاؤ میں اضافہ ہو گیا۔ مجھے مرنے والے کا نام معلوم نہیں تھا۔ اس کے سر پر پگڑی نہیں رہی تھی۔ ایک گولی اس کی ایک کنپٹی میں پیوست ہو کر دوسری کنپٹی سے نکل گئی تھی۔ دوسری گولی ہنسلی کی ہڈی کے قریب کچھ ایسے رُخ سے لگی تھی کہ غالباً سینے میں اُتر گئی تھی۔

دوسرا شخص جو اس کے ساتھ گیا تھا اور زندہ واپس آنے میں کامیاب ہو گیا تھا، بہت دل گرفتہ تھا۔ مقتول سے شاید اس کی دوستی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے لیکن وہ بالکل خاموش تھا۔ اس نے یہ بتانے کی کوشش نہیں کی کہ اس کا ساتھی کس طرح مارا گیا۔ کسی نے اس سے پوچھا بھی نہیں۔ شاید پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ چند گز کا فاصلہ اس کے لیے موت کی مسافت بن گیا تھا جبکہ وہی فاصلہ جمیماں کئی بار خیروعافیت سے طے کر چکی تھی۔ یہ بھی نصیب نصیب کی بات تھی۔ اس کا اپنا ساتھی اور بچے بھی خیریت سے آگئے تھے۔ بس صرف اسی کی موت گویا اسے کمرے سے باہر لے گئی تھی۔

نواب زادی نے صرف ایک نظر اس کی طرف دیکھا تھا اور نہایت معمولی سے تاسف سے کہا تھا "اوہ... یہ مر گیا!" اس کے بعد وہ دوبارہ اپنے بچوں کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ ہمارے ملک میں بہت سے طبقات ایسے ہیں جن کے لیے اس قسم کی باتیں نئی یا اہم نہیں ہوتیں۔ لوگ ان کے لیے جانیں دیتے ہی رہتے ہیں۔ بعض لوگوں کو صدقہ اتارنے کے لیے ایک بکرا میسّر نہیں آتا اور بعض لوگوں پر سے سیکڑوں انسان نچھاور ہوتے رہتے ہیں۔ یہ بھی نصیب نصیب کی بات ہے۔ جن پر سے وہ نچھاور ہوتے ہیں انہیں شاید دوسرے دن یاد بھی نہیں رہتا کہ کسی نے ان کے لیے جان دی تھی۔ بہت ہوا تو اظہارِ افسوس کے لیے دو چار جملے بول دیے اور سوگوار لواحقین کے ہاتھ پر کچھ نوٹ رکھ دیے۔ چلیے حق ادا ہو گیا، حساب برابر ہو گیا۔

کمرے میں اس لاش کے اضافے کے بعد ایک بار پھر سکوت چھا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بچوں کی حالت کچھ خراب

ہوتی جارہی تھی۔ وہ کچھ کھانے پینے کے لیے مانگ رہے تھے۔ پینے کے لیے تو کچھ تھا ہی نہیں۔ البتہ ان کے لیے کھانے کی کسی چیز کی تلاش میں ایک بار پھر قربانی کی بکری بھیماں کو روانہ کیا گیا۔

وہ رُکھاں کے پاس گئی جس کے شوہر کو مرے ہوئے دو گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے۔ اس نے رات کے بچے ہوئے گوشت کی ایک پلیٹ بچوں کے لیے بھیجی۔ نواب زادی، بچوں کو اس باسی گوشت کی بوٹیاں کھلانے کی کوشش کرنے لگی۔ انہوں نے تھوڑی بہت کھائیں لیکن خالی سالن کھانے سے ان کی پیاس اور بڑھ گئی۔

وہ پانی کے لیے باقاعدہ رونے لگے۔ پیاس سے سبھی کا بُرا حال تھا۔ نواب زادی کے ہونٹوں پر بھی پپڑیاں جم رہی تھیں اور وہ بچوں کو سمجھانے کی کوشش کررہی تھی کہ پانی ابھی نہیں مل سکتا۔

اس وقت تک شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا لیکن ڈاکوؤں کی وجہ سے مکان میں کہیں کوئی بتی روشن نہیں کی جارہی تھی۔ لاشوں کی موجودگی کی وجہ سے کمرے میں ایک عجیب سی بو محسوس ہونے لگی تھی۔

میں اپنے ہاتھوں کی حالت دیکھ تو نہیں سکتا تھا لیکن مجھے ان پر ورم کا احساس ہونے لگا تھا۔ کندھے اور ٹانگیں شل ہونے لگی تھیں۔ اب تو میری قوت برداشت بھی جواب دینے لگی تھی۔ بڑی شدت سے دل چاہ رہا تھا کہ اب میری بندشیں کھل جائیں، ڈاکوؤں کا دھڑکا ختم ہوجائے اور میں کھلے میدان، کھلی ہوا میں دیوانوں کی طرح کافی دیر تک یونہی بے مقصد اِدھر اُدھر دوڑتا رہوں، اپنا لہو گرماتا رہوں۔ یہ مجھے ہی معلوم تھا کہ میں کس طرح خود پر قابو رکھے بیٹھا تھا۔

وہ ڈاکو بھی بڑے ہی صابر اور مستقل مزاج قسم کے لوگ تھے۔ میرے ذہن میں تو ڈاکوؤں کا تصور خاصا مختلف قسم کا تھا کہ وہ گولیاں چلاتے، گھوڑے دوڑاتے آتے ہوں گے۔ چند لمحوں میں سب کچھ تہس نہس کرتے ہوں گے اور لوٹ مار کرکے بھاگ جاتے ہوں گے۔ یعنی آندھی کی طرح آئے اور بگولے کی طرح گئے۔ لیکن یہ ڈاکو تو گویا خود کو پرانے زمانے کے بادشاہوں کی فوج اور اس کچے مکان کو قلعہ سمجھ کر اس کے گرد بڑے صبر و سکون سے محاصرہ ڈال کر بیٹھ گئے تھے۔

رات کا اندھیرا گہرا ہوا تو پانی کے لیے بچوں کا اصرار بڑھنے لگا۔ خود نواب زادی بھی اب پژمردہ و مضمحل نظر آرہی تھی۔ شاید یہ ماحول کی وحشت انگیزی کا بھی اثر تھا۔ ابھی تک کہیں بتیاں روشن نہیں کی گئی تھیں لیکن آسمان پر ابتدائی تاریخوں کا چاند اور اس سے دور دور تارے بھی بکھرے ہوئے تھے۔ ان کی وجہ سے کم از کم اتنی روشنی ضرور موجود تھی جتنی صبح صادق کے وقت ہوتی ہے۔

اندھیرا ہونے کا تھوڑا سا فائدہ بھی ہوا تھا۔ نقل و حرکت میں ذرا آسانی ہونے لگی تھی۔ اب ایسا نہیں تھا کہ دیوار کی آڑ سے ہٹ کر کسی نے ذرا حرکت کی اور فوراً گولی آئی بلکہ گولی چلے اتنی دیر گزر گئی تھی کہ بلال شیدی کو خوش فہمی ہونے لگی کہ شاید ڈاکو مایوس ہوکر یا کسی اور وجہ سے محاصرہ ترک کرکے چلے گئے تھے۔

اپنے اس خیال کی تصدیق کے لیے اس نے ایک لالٹین روشن کرکے ایک ڈنڈے پر ٹانگ کر، خود دیوار کی اوٹ میں ہی رہتے ہوئے کھڑکی کے سامنے کی۔ دوسرے ہی لمحے تڑاتڑ کئی فائر ہوئے اور لالٹین کے پرخچے اڑ گئے۔ کمرے میں پھیلی ہوئی عجیب طرح کی بُو میں مٹی کے تیل کی بُو کا بھی اضافہ ہوگیا۔ بلال شیدی کی خوش فہمی رفع ہوگئی۔ غنیمت تھا کہ وہ لالٹین لے کر خود کھڑکی کے سامنے نہیں گیا تھا ورنہ اپنے خیال کی تصدیق اسے بہت ہی مہنگی پڑتی۔

بچّے مسلسل رو رہے تھے۔ آخرکار نواب زادی پھنسی پھنسی آواز میں بولی "بلال! پانی کے لیے کچھ کرو نا... اب تو میرا بھی دم نکلا جارہا ہے۔"

"کیا کروں نواب زادی صاحبہ؟" بلال شیدی نے بے بسی سے پوچھا "پانی کا چشمہ پہاڑیوں کی طرف ہی ہے۔ اُدھر جانا موت کو دعوت دینے والی بات ہے۔ ڈیرے میں اس وقت مجھ سمیت صرف چار مرد زندہ رہ گئے ہیں۔ دو طرف کی دیواروں سے تو اب فائرنگ کا جواب دینے والا یا ڈاکوؤں کو روکنے والا بھی کوئی نہیں رہا۔ ان میں سے بھی ایک اگر پانی لینے چلا جائے تو اس کے زندہ واپس آنے کی روپے میں چار آنے بھی امید نہیں ہے۔ ان حالات میں، میں کسی کو بھیجنا نہیں چاہتا۔ بھیجنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہے۔"

"لیکن اس طرح تو ہم پیاس سے مرجائیں گے۔ بچوں کی حالت بھی تم دیکھ رہے ہو۔" نواب زادی کراہنے کے سے انداز میں بولی۔ کم از کم فی الحال ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا طنطنہ اور نخوت رخصت ہوچکی تھی۔ بلال شیدی نے یہ نہیں کہا کہ باقی سب لوگوں کا بھی تو پیاس سے یہی حال تھا۔

بلال نے کوئی جواب نہ دیا تو نواب زادی بولی "آخر یہ لوگ کب تک اسی طرح گھیرا ڈالے بیٹھے رہیں گے؟"

"میری تو خود سمجھ میں نہیں آرہا۔" بلال بولا "اتنی دور سے تو ان سے مذاکرات بھی نہیں ہوسکتے ورنہ میں زور سے چیخ کر ہی یہ پیغام ان تک پہنچا دیتا کہ ہم سب کچھ ان کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہیں۔ وہ صرف آپ کی اور بچوں کی جان بخش دیں۔"

نواب زادی کے پژمردہ وجود میں گویا برقی رو سی دوڑ گئی۔ تڑپ کر بولی "ہم ان ڈاکوؤں سے جان بخشی کی بھیک مانگیں گے! تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ سونا بھی ہم ہرگز ان کے حوالے نہیں کریں گے۔ جب نواب زادہ صاحب ہی نہیں رہے..." پھر گویا اسے کچھ خیال آیا اور اس نے باقی لوگوں کا ذکر بھی شامل کرلیا "اور ہمارے اتنے آدمی بھی مرچکے تو اب ان کے آگے سر جھکانے سے کیا فائدہ؟"

میں نے دل ہی دل میں سوچا' اور یہ سب کچھ ہونے سے پہلے آپ نے اس لیے سونا ڈاکوؤں کے حوالے نہیں کیا ہوگا کہ شاید آپ سب کچھ بچانے میں کامیاب ہوجائیں' واقعی زر' زن' زمین اور اقتدار نے انسان کو بڑی مصیبت میں ڈالا ہوا تھا۔

دوسرے ہی لمحے مجھے یہ بھی خیال آیا کہ مصیبت کا کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ میں تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تہی دست وقلاش پھر رہا تھا مگر اس کے باوجود مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ مصیبت میں پھنسنا مقدر میں لکھا ہو تو انسان پھنس کر ہی رہتا ہے۔ صرف مصیبت کی نوعیت بدلتی رہتی ہے۔

نواب زادی کا بیٹا روتے روتے چند لمحے کے لیے خاموش ہوگیا۔ پھر اس نے بیٹھی بیٹھی سی آواز میں پوچھا "ممی! کیا پاپا....؟" وہ سوال مکمل نہ کرسکا۔ اسے ہچکی سی آئی۔ وہ دونوں بہن بھائی شاید ابھی اپنے پاپا کو زندہ ہی سمجھ رہے تھے تاہم جب سے وہ کمرے میں آئے تھے' انہوں نے اپنے باپ کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

نواب زادی نے بیٹے کے ادھورے سوال کا جواب دینے کے بجائے ایک بار پھر اسے سینے سے لگالیا اور بلال سے مخاطب ہوئی "خدا کے لیے پانی کا کچھ کرو..... ورنہ ہم مرجائیں گے۔" ایک بار پھر اس کی آواز ٹوٹ سی گئی۔

بلال شیدی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ الجھن میں تھا۔ اچانک جھماں نے کھنکار کر گلا صاف کیا تو گویا ایک طویل وقفے کے بعد دوسروں کو کمرے میں اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔

وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں نواب زادی سے مخاطب ہوئی "اگر آپ کی اجازت ہو۔ آپ بُرا محسوس نہ کریں تو میں پانی لانے کی کوشش کروں؟ میں یہاں لڑائی میں تو حصہ نہیں لے سکتی۔ میں یہی کام کرنے کی کوشش کروں۔"

نواب زادی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اس پیشکش پر شکر گزار نہیں ہوئی تھی۔ اس کے نزدیک گویا اس کا یہی بڑا احسان تھا کہ اس نے کوئی اعتراض یا انکار نہیں کیا تھا۔

بلال شیدی بولا "تم پانی لے کر واپس نہیں آسکو گی' اس لیے تمہاری بھی جان گنوانے کا کیا فائدہ؟" گویا اسے بھی اصل فکر اس بات کی تھی کہ پانی نہیں آسکے گا ورنہ جھماں کا مرجانا تو ایسی کوئی اہم بات نہیں تھی۔

"میں کوئی ترکیب کرتی ہوں۔ شاید میں زندہ واپس آجاؤں۔" جھماں کے لہجے میں اب بھی ہچکچاہٹ تھی۔

"کیسی ترکیب؟" بلال شیدی نے پوچھا۔

"آپ سُنیں تو شاید مذاق اُڑائیں۔" جھماں نے شرمساری کے سے انداز میں سر جھکالیا۔ پیاس کے مارے اس کے حلق سے بھی آواز مشکل سے نکل رہی تھی۔

"ہم میں سے کسی میں بھی اس وقت کسی کا مذاق اُڑانے کی سکت نہیں ہے۔" بلال شیدی تلخی سے بولا "تمہیں جو کہنا ہے جلدی کہو۔"

"میں صبح سے اس کمرے سے دوسرے کمرے تک بکری کی طرح چاروں ہاتھ پیروں پر چلتی ہوئی کئی چکر لگا چکی ہوں۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی "مجھے لگ رہا ہے کہ اس کام کی مجھے کافی پریکٹس ہوگئی ہے۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہوگئی۔

"تو پھر؟" بلال شیدی نے بے تابی سے پوچھا۔

"پچھلی رات کے کھانے کے لیے یہاں ایک بڑی سی بکری ذبح کی گئی تھی۔" جھماں بولی۔ "اس کی کھال ابھی تک باورچی خانے میں پڑی ہے اور خراب نہیں ہوئی ہے۔ اس میں ابھی نرمی بھی باقی ہے۔ میں وہ کھال لپیٹ کر بکری بن کر جاتی ہوں۔ اس کی سری بھی موجود ہے' وہ آپ میری گُدی پر باندھ دیں۔ کم روشنی میں دور سے میں بکری ہی نظر آؤں گی یا یوں سمجھ لیں کہ بکری کا سایہ نظر آؤں گی۔"

"کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں ہنستا لیکن اس وقت میرا دل زخمی ہے اور روح اداس ہے۔" بلال شیدی بولا "تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟"

"کوشش کرکے دیکھنے میں کیا حرج ہے؟" جھماں بولی "جان تو ویسے بھی بچتی دکھائی نہیں دے رہی۔ اگر میں کامیاب ہوگئی تو مجھے ذرا فخر ہوجائے گا کہ میں نے نواب زادی صاحبہ کی کوئی خدمت کی تھی اور اگر جان چلی گئی تب بھی کوئی ایسی خاص بات نہیں۔ میرا کون سا یہاں کوئی رونے والا بیٹھا ہے۔ ایک گندی عورت اس دنیا میں نہیں رہے گی' دھرتی کا کچھ بوجھ ہی کم ہوجائے گا۔"

اس کے لہجے میں طنز کی چبھن نہیں تھی لیکن اگر کوئی محسوس کرنا چاہتا تو محسوس کر بھی سکتا تھا۔ میرا خیال تھا' نواب زادی اس کی پیشکش مسترد کردے گی' اسے کسی بھی طریقے سے پانی لانے سے منع کردے گی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ چہرے پر تھکن اور اضمحلال لیے خاموش بیٹھی رہی۔

بلال شیدی بھی ایک لمحے خاموش رہا پھر تھکے تھکے سے لہجے میں بولا "بکری کیا پانی کا مٹکا اپنے سر... بلکہ سری پر رکھ کے لائے گی؟"

"ظاہر ہے' میں مٹکا تو نہیں لاسکتی۔" جھماں بولی "میں پیٹ کے ساتھ باندھ کر کوئی چھوٹا موٹا برتن لاسکتی ہوں۔ کوئی ایسے ڈھکن والا برتن ہو جس میں پانی گرنے یا چھلکنے سے بچا رہے۔"

"ایسا تو یہاں کوئی برتن بھی نہیں ہوگا۔" بلال مایوسی سے بولا۔

نواب زادی جلدی سے بولی "باہر ہماری گاڑی میں ہمارا بڑا تھرموس موجود ہے۔ وہ ٹوٹنے سے بچ گیا ہے۔ وہ اس کام کے لیے بہت مناسب ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ جھماں کے ہونٹوں پر خفیف سی

مسکراہٹ آئی تھی لیکن وہ میرا وہم بھی ہو سکتا تھا۔ کمرے میں روشنی کچھ خاص نہیں تھی۔

بھیماں دھیمے لہجے میں بولی "ہاں تھرموس ٹھیک رہے گا۔ اسے میں پیٹ سے باندھ کر جاسکتی ہوں اور اس میں پانی بھی حفاظت سے آسکتا ہے۔" پھر اس نے اجازت طلب نظروں سے بلال شیدی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "میں تیاری کروں؟"

"کرلو۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" بلال شیدی نے کچھ شکست خوردہ سے لہجے میں اعتراف کیا۔

"فقیرے کو ذرا میرے ساتھ بھیج دیں، ہم باہر سے چیزیں لے آئیں۔" بھیماں نے فرمائش کی۔ تب مجھے معلوم ہوا، فقیرا اس کلاشنکوف بردار کا نام تھا جو کچھ دیر پہلے اپنے ساتھی کے ہمراہ دوسرے کمرے سے نواب زادی کے بچوں کو لینے گیا تھا۔ اس کے ساتھی کی لاش اب کمرے میں اس کے سامنے ہی پڑی تھی اور وہ ابھی تک کھوئی کھوئی سی نظروں سے اسی کو دیکھے جارہا تھا۔

بلال شیدی کا اشارہ پاکر وہ تھکے تھکے سے انداز میں بھیماں کے پیچھے چل دیا۔ رکوع کی سی حالت میں وہ نہایت آہستگی سے کمرے سے باہر چلے گئے۔ ایک بار پھر کمرے میں اعصاب شکن سکوت چھاگیا۔ زندگی کچھ عجیب سا ہی تماشا مجھے دکھارہی تھی۔ اس قسم کی صورت حال کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا جس سے اس وقت میں دوچار تھا۔ میں بس ایک عضوِ معطل کی طرح ایک طرف پڑا تھا۔ ایک بے وقعت جانور کی طرح مجھے باندھ کر ایک طرف بٹھادیا گیا تھا۔

اب مجھے افسوس ہورہا تھا کہ جس وقت بلال شیدی اور اس کے ساتھیوں نے مجھے قابو میں کیا تھا اس وقت میں نے ذرا بھی مزاحمت کیوں نہیں کی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ اس وقت ذرا سی بھی مزاحمت یا فرار کی کوشش میں جان جانے کا ننانوے فیصد امکان تھا، اسی لیے میں نے اپنے آپ کو بلا مزاحمت ان کے حوالے کردیا تھا۔ میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ بعد میں کوئی موقع نظر آیا تو ہاتھ پاؤں ماروں گا۔

اُس وقت مجھے یقین تھا کہ بعد میں بھی کوئی نہ کوئی موقع ضرور ملے گا لیکن میری یہ امید پوری نہیں ہوسکی تھی اور صورت حال خراب سے خراب تر ہی ہوتی گئی تھی۔ نواب زادی گویا صرف اپنے لیے ہی نہیں، سبھی کے لیے نحوست کا پیغام لے کر آئی تھی۔ ہاتھ بندھ جانے کی وجہ سے میں کچھ زیادہ ہی بے بس ہوکر رہ گیا تھا۔ اگر ڈاکوؤں والا مسئلہ نہ آن پڑتا تب بھی شاید کوئی صورت نکل ہی آتی۔ اب جو حالات تھے ان کی نسبت تو مجھے ننانوے فیصد موت کا رسک لے لینا بہتر معلوم ہونے لگا تھا۔ بے شک اس وقت بھی میں نہتا تھا اور پانچ کلاشنکوف برداروں کے نرغے میں تھا لیکن میرے ہاتھ تو آزاد تھے اور میرے اردگرد کھلا میدان تھا۔ اگر میں ہمت کرتا تو شاید زندہ بچ جانے کا ایک فیصد امکان بڑھ کر ننانوے فیصد ہوجاتا۔ تقدیر کے ترازو میں امکانات کے پلڑے ادل بدل جاتے۔ یہ بے بسی تو موت سے بدتر محسوس ہونے لگی تھی۔

بھیماں اور فقیرا آخرکار خیروعافیت سے لوٹ آئے۔ ان کے پاس بکری کی کھال، تھرموس اور مستلی کے بہت سے ٹکڑے تھے۔ بھیماں کو بکری بنانے کی کوششیں شروع ہوگئیں۔ بکری کی کھال خاصی حد تک خشک ہوچکی تھی لیکن ابھی تڑنے مڑنے کے قابل تھی۔ میں ذرا فاصلے پر بیٹھا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس فاصلے پر مجھے کھال میں سے ایک خاص قسم کی بدبو اٹھتی محسوس ہورہی تھی لیکن بھیماں نے کسی خاص کراہیت کا اظہار کیے بغیر کھال اپنے جسم پر لپٹوالی۔

بکری سینگوں والی تھی۔ اس کی سری بھی کسی نہ کسی طرح بھیماں کے سر پر باندھ دی گئی اور اس کے گویا دو سر ہوگئے۔ کچھ دیر بعد آخرکار ایک بھدی سی بکری تیار ہوگئی تاہم مجھے امید تھی کہ دور سے وہ محض ایک ہیولے کی طرح دکھائی دے گی اور اگر اس کی زندگی کچھ لمبی ہوئی تو ڈاکوؤں کی آنکھوں کو دھوکا دے جائے گی۔

البتہ ایک دعا کرنی چاہیے تھی کہ کہیں بھون کر کھانے کے لیے ڈاکوؤں کو بھی کسی بکری کی ضرورت نہ ہو اور چشمے پر بکری کا ہیولا دیکھ کر وہ خوشی سے اچھل نہ پڑیں۔ گولی چلا کر اسے شکار کرلیں اور جب اٹھانے آئیں تو اندر سے کچھ اور برآمد ہو۔ اس صورت میں شاید انہیں پچھتاوا ہوتا کہ اس بکری کو تو زندہ سلامت پکڑنا چاہیے تھا۔

بہرحال اس کے پیٹ سے بڑا سا تھرموس بھی باندھ دیا گیا جس کی وجہ سے وہ کچھ اور بے ہنگم ہوگئی۔ اسے مکان کے عقبی دروازے سے روانہ ہونے کی ہدایت کی گئی۔ دیواروں سے لگ کر سرکتی ہوئی وہ رخصت ہوگئی۔ فی الحال وہ دو ٹانگوں پر ہی چل رہی تھی لیکن نہ جانے کتنا فاصلہ اسے چاروں ہاتھ پیروں پر طے کرنا تھا۔ میں اس عورت کی ہمت کی دل ہی دل میں داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ سب کچھ وہ اس عورت کے لیے کررہی تھی جس نے اسے گندی عورت کہا تھا اور اپنی ٹانگیں دبانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ عورت واقعی عجیب ہوتی ہے۔ ہر عورت!

میرے اندازے کے مطابق اسے ڈیرے سے نکلے ہوئے بہ مشکل چند منٹ ہوئے ہوں گے کہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے ایک بار پھر فضا مُرتعش ہوگئی۔ میرا دل ڈوب سا گیا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ وہ شیرنی جو بکری کی کھال پہن کر سنگدل و سفاک انسانوں کے لیے پانی لینے گئی تھی، زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی ہے۔

لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ گولیاں تو مکان پر برسی تھیں۔ کھڑکی سے گولیاں اس کمرے میں بھی آئی تھیں جہاں ہم لوگ موجود تھے۔ کھڑکی کی چوکھٹ کا کچھ بچا کچھا حصہ بھی اڑ گیا تھا۔ شاید ڈاکوؤں نے اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے ایک بار پھر زور شور سے فائرنگ کی تھی۔ سکوت کا وقفہ چونکہ بہت طویل ہوگیا

تھا۔ شاید ڈاکوؤں نے سوچا ہو کہ ہم دوبارہ ان کے بارے میں اس خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوگئے ہوں کہ وہ محاصرہ ترک کر کے چلے گئے ہیں۔

میں دل ہی دل میں بھیماں کی سلامتی کی دعا کر رہا تھا جسے خواہ مخواہ ہی نواب زادی کی نظر میں عظیم عورت بننے یا اسے ایثار و احسان کے بوجھ تلے دبانے کا شوق چرایا تھا۔ نواب زادی نے اپنی زبان سے اس کی شخصیت پر "گندی عورت" کی جو چھاپ لگائی تھی شاید وہ اسی کی زبان سے اسے صاف کرانا چاہتی تھی مگر اس کے لیے وہ جو کچھ کر رہی تھی وہ ایک مہنگا سودا تھا۔

ڈاکو صرف چند سیکنڈ زوردار فائرنگ کرنے کے بعد ایک بار پھر آرام سے بیٹھ گئے۔ اس بار سکوت کا وقفہ زیادہ صبر آزما اور زیادہ طویل محسوس ہوا کیونکہ سب کو بھیماں کی واپسی کا انتظار تھا۔ بچوں کا رونا دھونا بھی اب ہلکی ہلکی روں روں میں بدل گیا تھا۔ انہیں بھی اتنا احساس تو تھا کہ بھیماں ان کے لیے پانی لینے گئی تھی اور اس کی واپسی کا انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

یہ انتظار بے ثمر ثابت نہیں ہوا۔ ایک طویل انتظار کے بعد آخر کار بھیماں لوٹ آئی۔ کم از کم جان کے معاملے میں وہ عورت واقعی قسمت کی دھنی تھی۔ وہ تھکن سے چُور اور بے حال تھی۔ کمرے میں پہنچتے ہی فرش پر ڈھیر ہوگئی۔ بلال شیدی نے اس کے پیٹ پر بندھا ہوا بڑا سا تھرموس علیحدہ کیا۔

سینگوں والی وہ بکری جو اس کی گُدّی پر باندھی گئی تھی، اب اس کے گلے میں لٹک رہی تھی اور وہ کوئی عجیب الخلقت سی چیز نظر آرہی تھی۔ اس کے گھٹنے اور ہاتھ چھلے ہوئے تھے۔ بلال شیدی نے اسے سہارا دے کر چٹائی پر لٹایا اور پہلے اسی سے پوچھا "پانی پیو گی؟"

وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی "میں تو چشمے پر ہی خوب پیٹ بھر کر پانی پی آئی ہوں۔ میں تو شاید اب کل تک آرام سے پیاس برداشت کرلوں۔ ہم تو ویسے بھی صحراؤں میں بھٹکنے والے لوگ ہیں۔ تم پانی نواب زادی صاحبہ کو دو۔"

بلال شیدی نے تھرموس نواب زادی کے حوالے کردیا۔ اس نے تھرموس ہی کے ڈھکنے میں پہلے دونوں بچوں کو پانی پلایا پھر خود پیا اور تھرموس بند کر کے حفاظت سے ایک طرف کو رکھ لیا۔ تھرموس بڑا تھا اور اب بھی یقیناً آدھے سے زیادہ بھرا ہوا تھا لیکن اس نے بلال شیدی تک کو پانی کے لیے نہیں پوچھا حالانکہ مجھے یقین تھا، بلال کے حلق میں بھی کانٹے پڑ چکے تھے۔ مگر بظاہر وہ بے نیاز بنا ہوا تھا۔ تھرموس نواب زادی کے حوالے کرنے کے بعد وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔

پانی پینے کے بعد بچوں کی روں روں بھی بند ہوگئی اور نواب زادی کے جسم میں بھی گویا جان سی آگئی۔ اس کے لہجے میں کچھ دیر کے لیے جو اضمحلال آیا تھا، وہ دور ہوگیا۔ وہ سنبھل کر بیٹھتے ہوئے ایک بار پھر پہلے ہی کی طرح نخوت بھرے سے لہجے میں بولی "آخر ہم کب تک اس طرح معذور اور مجبور سے بنے بیٹھے رہیں گے؟ کوئی ترکیب سوچو نا... کچھ کرو نا۔"

"جب سے ڈاکوؤں نے ہمیں گھیرے میں لیا ہے تب سے میں مسلسل سوچ ہی رہا ہوں۔" بلال شیدی کمزور سی آواز میں بولا "لیکن میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ جو ترکیب بھی سوچتا ہوں، کوئی نہ کوئی مجبوری اس کی راہ میں حائل ہوجاتی ہے۔ آپ ہی کچھ مشورہ دیجیے۔" بھوک اور پیاس نے بلال شیدی کو نڈھال کرنا شروع کردیا تھا۔

نواب زادی نے پہلے اپنے دونوں بچوں کو محفوظ گوشے میں ذرا اور پیچھے کھسکا کر بٹھایا پھر اس نے بہت جھک کر کھڑکی کے نیچے سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ کر ایک مرنے والے کی کلاشنکوف اٹھائی اور دوسرے کونے میں جاکر ترچھے زاویے سے کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔

وہاں سے وہ تیسرے کونے میں چلی گئی۔ اپنی دانست میں شاید وہ کسی ماہر جرنیل کی طرح گویا اپنے مورچے سے میدان جنگ کا جائزہ لے رہی تھی لیکن مجھے اس کا انداز مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ اس کمرے کے مختلف کونوں سے کھڑکی کے راستے پہاڑیوں کا جائزہ لینے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بلال شیدی کو اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اس بات کا

نیٹ نے اپنا گرم اور ملائم ہاتھ ملا کر کہا "بہت خوشی ہوئی" ظاہر ہے کہ یہ رسمی فقرہ تھا۔ مگر جب ہم نے یہی فقرہ دُہرایا تو درحقیقت یہ سچائی تھی۔ ایسی لڑکیوں سے مل کر بھلا کون بدذوق ہے جسے خوشی نہ ہوگی؟

اتنی دیر میں سامنے والا ایک دروازہ کھلا جو ڈائننگ روم کا دروازہ تھا۔

"لو کیٹ بھی آگئی!" بڑی بی بولیں "لو علی! کیٹ سے بھی مل لو۔ یہ بھی میری بیٹی ہے۔"

ہمیں مجبوراً نیٹ کا ہاتھ چھوڑنا پڑا کیونکہ کیٹ نے مصافحے کے لیے ہماری طرف اپنا ہاتھ بڑھادیا تھا اور مغربی آداب کے مطابق مصافحہ صرف دائیں ہاتھ سے ہی کیا جاتا ہے۔

علی سفیان آفاقی کے سفرنامے
"امریکا چلیں" سے اقتباس
شائع شدہ ماہنامہ "سرگزشت" جون ۹۳ء

اندازہ تھا' وہ ان معاملات میں زیادہ ماہر تھا لیکن مسئلہ وہی تھا کہ وہ مجبور تھا۔

نواب زادی تیسرے کونے کی طرف جانے کے لیے بظاہر بڑے زبردست انداز میں گویا گھات لگائے دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھی تو اُدھر میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ میں اس غلط فہمی میں رہا کہ وہ میری موجودگی سے بہت اچھی طرح باخبر ہے اس لیے خود ہی کترا کر گزر جائے گی۔

لیکن وہ ایکشن کی ملکہ شاید اس وقت کسی تدبیر کی تلاش میں زیادہ ہی دور نکلی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا اور میں بھی اپنی حالت کی وجہ سے بروقت اس کے راستے سے نہیں ہٹ سکا۔ وہ مجھ سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچی۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ میں اسے سنبھالنے کا "اعزاز" بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

غصے سے اس کا برا حال ہو گیا۔ طیش اور حقارت سے اس نے مجھے ٹھوکر رسید کی۔ اس ٹھوکر کی چوٹ مجھے اپنے جسم پر نہیں' دل میں محسوس ہوئی۔

نواب زادی نے برہمی سے بلال شیدی کی طرف دیکھا اور میری جانب اشارہ کرتے ہوئے گھٹی گھٹی لیکن غیظ آلود آواز میں بولی "ایک تو اس منحوس کو تم نے معلوم نہیں کیوں یہاں بٹھا رکھا ہے۔ آخر اس کا یہاں مصرف کیا ہے؟ کب سے یہ اس دیوار کے ساتھ چپکا بیٹھا ہے اور مسلسل سب کو گھورے جا رہا ہے۔ مجھے اس کی نظروں سے الجھن ہونے لگی ہے۔ یہ قیدی ہے تو اسے قید خانے میں پہنچاؤ۔"

"میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ وہاں کوئی کوٹھری خالی...." بلال نے اسے یاد دلانا چاہا۔

لیکن وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی "ضرورت پڑنے پر ایک کوٹھری میں چار قیدی بھی ٹھونسنے پڑیں تو ٹھونس دیا کرو۔ اسے فوراً قید خانے میں پہنچاؤ۔ میں مزید ایک منٹ بھی یہاں اس کی صورت دیکھنا نہیں چاہتی۔"

بلال شیدی نے مزید کچھ نہ کہا۔ وہ ایک لمحے کے لیے اپنے خشک ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ پھر اس نے فقیرے کو اشارہ کیا "جاؤ گُرکھاں سے چابیاں لے آؤ اور اس قیدی کو قید خانے میں پہنچاؤ۔"

فقیرے نے اثبات میں سر ہلایا اور کلاشنکوف چھوڑ کر کمرے سے باہر رینگ گیا۔ میرے سینے میں مایوسی کی یخ بستگی کچھ گہری ہو گئی۔ بیٹھے بٹھائے خواہ مخواہ مجھے قید خانے میں بھیجے جانے کا حکم صادر ہو گیا تھا۔ میں اس کمرے میں سب کے درمیان بیٹھا تھا تو نہ جانے کیوں میرے دل پر مایوسی کا غلبہ گہرا نہیں تھا۔ میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ جب سے بھیماں بہ خیر و عافیت چشمے سے پانی لے کر آئی تھی تب سے تو نہ جانے کیوں میرے دل میں ایک بے عنوان اور موہوم سی امید کی کرن ابھر آئی تھی۔

لیکن قید خانے میں جانا گویا میرے لیے مزید مجبور ہو جانے کے مترادف تھا۔ بہرحال میں خاموش تھا۔ ظاہر ہے بولنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا' اُلٹا کوئی نقصان ہی پہنچ سکتا تھا تاہم میں ایک ٹک نواب زادی کی طرف ضرور تکتا رہا حالانکہ مجھے احساس تھا کہ وہ تنک مزاج عورت ایک حقیر قیدی کو یوں اپنی طرف تکتے پاکر مزید چڑ کر کلاشنکوف کا برسٹ بھی مار سکتی تھی۔ کلاشنکوف اس کے ہاتھوں میں ہی تھی۔

اس نے میری طرف مزید توجہ نہیں دی۔ میرے بارے میں حکم صادر کر کے وہ گویا کچھ مطمئن ہو گئی تھی۔ چاروں کونوں سے کھڑکی کا جائزہ لینے کے بعد وہ اسی کونے میں واپس پہنچ گئی جہاں اس کے بچے موجود تھے۔ ایک بار پھر اس نے تھرموس کھول کر نہایت احتیاط سے دو گھونٹ پانی پیا۔ بلال شیدی ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا لیکن نواب زادی نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔

اس نے تھرموس نہایت احتیاط سے واپس کونے میں رکھ دیا اور کلاشنکوف گود میں لیے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھی۔ کم از کم بظاہر تو یہی نظر آ رہا تھا۔

فقیرا چابیاں لے آیا اور کلاشنکوف اس نے دوبارہ اٹھالی۔ نواب زادی اس وقت بے خیالی میں دھیرے دھیرے تھرموس پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ وہ گندی عورت کا لایا ہوا پانی دو مرتبہ پی چکی تھی اور اس نے ایک بار بھی اس "گندی عورت" کا شکریہ ادا نہیں کیا تھا۔

بھیماں نے اس وقت تک بکری کی کھال اور بیری وغیرہ اتار کر ایک طرف پھینک دی تھی۔ گزشتہ رات تک وہ اچھی بھلی' صاف ستھری عورت دکھائی دے رہی تھی۔ اب ظاہری طور پر واقعی بہت گندی دکھائی دے رہی تھی لیکن اس کے اندر کا اُجلا پن میری نظر میں بہت بڑھ گیا تھا۔

کسی ایسے انسان کے لیے ایثار کرنا' اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا اور بے پناہ تکلیف اٹھانا بہت بڑے ظرف کی بات ہوتی ہے جس نے آپ کو حقیر سمجھا ہو' آپ کی عزتِ نفس کو مجروح کیا ہو' بہت سے لوگوں کی موجودگی میں آپ کو ذلیل کیا ہو۔ اس انسان کے لیے ایثار اور جاں نثاری کا مظاہرہ کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں اور اس ایثار پر بھی نہ پگھلنے' نہ بدلنے والا انسان نہیں' کوئی پتھر ہی ہو سکتا ہے' وہ بھی نہایت بیکار قسم کا۔ ورنہ پتھر تو ہیرے جواہرات بھی ہوتے ہیں۔

بلال شیدی نے مجھے فقیرے کے آگے آگے چلنے کی ہدایت کرتے ہوئے کہا "یہ تو تمہیں معلوم ہی ہو گا کہ کس طرح چلنا ہے۔ اگر فی الحال تم اپنے بھائی بندوں یعنی ڈاکوؤں کے ہاتھوں گولی کھا کر مرنا نہیں چاہتے تو بہت احتیاط سے جانا۔"

میں اور فقیرا آگے پیچھے' شترمرغ کی طرح بالکل کبڑے ہو کر' دیوار سے لگ کر چلتے ہوئے کمرے سے نکلے اور اسی طرح دیواروں ہی کے ساتھ لگ کر نہایت آہستگی سے قدم اٹھاتے خاصا فاصلہ طے

کرکے آخر کار مکان کے عقب میں جا پہنچے۔

یہاں چار دیواری کے اندر بھی ایک اور نیچی سی دیوار تھی۔ فقیرا عقب سے نیچی آواز میں مجھے ہدایات دیتا آرہا تھا۔ میں اس کی ہدایت کے مطابق بہت زیادہ جھک کر چلتا ہوا جب اس دیوار کے عقب میں پہنچا تو مجھے بالکل حوالات کی طرح ایک سیدھ میں سات آٹھ کوٹھریاں نظر آئیں۔

کوٹھریاں بہت ہی چھوٹی تھیں۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ ہر کوٹھری ایک بڑے صندوق سے مشابہ تھی جس میں سلاخ دار دروازہ لگا ہوا تھا۔ اس کوٹھری میں اوسط قد کاٹھ کا آدمی بھی نہ تو سیدھا کھڑا ہوسکتا تھا اور نہ پاؤں پھیلا کر لیٹ سکتا تھا۔

ہر کوٹھری کے فرش پر خشک گھاس پھونس کی تہ جمی ہوئی تھی۔ مدّھم روشنی میں ذرا غور سے دیکھنے پر سب کچھ نظر آرہا تھا۔ ہر کوٹھری کے دروازے سے ایک قیدی سلاخیں تھامے باہر جھانکنے کی کوشش کررہا تھا۔ تقریباً سبھی کے سر کے بال اور داڑھی مونچھیں جھاڑ جھنکاڑ کی طرح بڑھی ہوئی تھیں اور جسموں پر چیتھڑے جھول رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مُدّت سے وہیں قید تھے۔

فقیرے نے پہلی ہی کوٹھری کا تالا کھولا اور مجھے اندر دھکیل دیا۔ وہ اس وقت زندگی سے بے زار معلوم ہوتا تھا۔ اس نے کوئی بات نہیں کی، مجھے کوئی ہدایت نہیں دی، بس کوٹھری میں دھکیلا اور تالا لگا کر واپس چلا گیا۔

کوٹھری میں جو قیدی پہلے سے موجود تھا، وہ ایک طرف کو سُکڑ سمٹ سا گیا۔ کوٹھری اتنی چھوٹی تھی کہ میری آمد کے بعد گویا ہجوم ہوگیا تھا اور وہ کھچا کھچ بھر گئی تھی۔ اندر اس سے بھی بُری بُو پھیلی ہوئی تھی جیسی چڑیا گھر کے کٹہروں سے آتی ہے۔

کوٹھری میں پہلے سے موجود قیدی نہایت افسردہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک میانہ قامت مگر مضبوط کاٹھی کا آدمی تھا۔ کھدر کی بوسیدہ اور کہیں کہیں سے پھٹی ہوئی شلوار قمیص میں تھا۔ بال اس کے بھی بڑھے ہوئے تھے مگر عجیب بات یہ تھی کہ اس کی شخصیت میں وہ کھُردرا پن نہیں تھا جو میں نے اب تک تقریباً سبھی کے چہروں پر دیکھا تھا۔

صحراؤں، جنگلوں اور پہاڑوں میں زندگی گزارنے والوں کی شخصیت میں ایک مخصوص کھردرا پن ضرور آجاتا ہے مگر اس کی شخصیت میں وہ مفقود تھا۔ اس کی جھاڑ جھنکاڑ اور میلی کچیلی سی شخصیت کی تہ میں گویا کوئی شہری شخص چھُپا ہوا تھا۔ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ جگہ فراہم کرنے کے لیے ایک دیوار سے لگ کر اکڑوں بیٹھ گیا تھا۔

میں نے دیکھا، اس کی ایک ٹانگ خاصی موٹی زنجیر سے بندھی ہوئی تھی اور وہ زنجیر لوہے کے ایک حلقے سے منسلک تھی جو کچی دیوار میں پیوست تھا۔ کوٹھریاں کچی ہی تھیں۔ سلاخ دار دروازہ بھی کچی دیوار ہی میں پیوست تھا اور اس کے آہنی قبضے نہ جانے کتنی گہرائی میں گڑے ہوئے تھے۔

دیواریں وغیرہ کچی ہی سہی لیکن اتنی موٹی موٹی اور ٹھوس تھیں کہ ان میں جو کچھ بھی جڑا ہوا تھا، مضبوطی سے ہی جڑا ہوا تھا۔ کوٹھری میں کسی قسم کا کوئی سامان، کمبل یا چادر تک موجود نہیں تھی جبکہ صحرائی علاقوں کی راتیں گرمیوں میں بھی خاصی سرد ہوتی ہیں۔ کوٹھریوں کے دروازے سلاخ دار ہونے کی وجہ سے گویا کھلے ہی تھے۔

یہ غنیمت تھا کہ ان کوٹھریوں کے سامنے نہ صرف چار دیواری کا ایک حصہ بلکہ ایک اور موٹی سی فاضل دیوار بھی موجود تھی ورنہ ڈاکو تو جس طرح چاروں طرف سے فائرنگ کررہے تھے اس سے ان قیدیوں کا تو صفایا ہو ہی جاتا۔ سلاخ دار دروازوں سے گولیاں سیدھی اندر آتیں۔

کوٹھریاں ذرا اونچائی پر بنی ہوئی تھیں۔ چار دیواری اور فاضل دیوار دونوں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تھیں، اس لیے کوٹھری میں بیٹھ کر بھی آسمان کا کچھ حصہ نظر آتا تھا اور کھڑے ہوکر تو دور پھیلی ہوئی پہاڑیوں میں سے کسی کی چوٹی بھی دیکھی جاسکتی تھی۔ اس کے باوجود کوٹھریاں گولیوں کی براہِ راست رسائی سے محفوظ تھیں۔

دوسرا قیدی بدستور خاموش تھا اور گہری نظروں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا "معاف کرنا

بھائی! میں نے آکر تمہارے لیے بھی تنگی پیدا کردی لیکن تم نے دیکھ ہی لیا ہوگا کہ میں اپنی خوشی سے نہیں آیا ہوں' بھیجا گیا ہوں۔"

وہ غالباً مجھے صاف اُردو بولتے سن کر ذرا چونکا۔ میرا حلیہ اس لہجے سے میل نہیں کھا رہا تھا لیکن میں نے جان بوجھ کر صاف اُردو میں بات کی تھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ میری بات سمجھتا ہے یا نہیں۔

جھاڑ جھنکاڑ داڑھی مونچھوں کی اوٹ سے جھانکتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور ایک لمحے گویا کچھ سوچنے کے بعد وہ بولا "ظاہر ہے بھائی ... اپنی خوشی سے کون بدنصیب یہاں آتا ہے۔ سب لائے ہی جاتے ہیں' بھیجے ہی جاتے ہیں۔"

لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ اُردو اس کی مادری زبان نہیں تھی لیکن وہ بہت اچھے طریقے سے اُردو بولنے پر قادر تھا۔ نہ جانے کیوں اس کی شخصیت کا جائزہ لینے کے بعد مجھے اس بات کی توقع تھی' اس لیے مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔

اس نے قدرے دوستانہ سے لہجے میں پوچھا "تمہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟ کیا قصور سرزد ہوا ہے تم سے؟"

"معلوم نہیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔ "شاید میں نے اللہ میاں کے سامنے زیادہ بقراط بننے کی کوشش کی تھی۔ جب تک میں نے اپنے آپ کو تن بہ تقدیر چھوڑے رکھا' میں بڑے سے بڑے خطرے سے بچ کر نکلتا رہا۔ جونہی میں نے اپنی دانست میں بہت عقلمند بن کر تدبیر لڑانے کی کوشش کی' میں عجیب و غریب گورکھ دھندے میں پھنس گیا۔ میری شکل ایک ایسے شخص سے جا ملی جس کا میں نے زندگی میں کبھی نام بھی نہیں سنا تھا۔ ایک ایسا جرم میرے کھاتے میں پڑ گیا جو میں نے خواب میں بھی نہیں کیا تھا۔"

اس کی کشادہ پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ وہ آنکھیں سکیڑ کر مجھے گھورتے ہوئے بولا "بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی' بہت الجھی ہوئی سی بات ہے۔"

"ہاں۔ اس وقت میرا ذہن بھی الجھا ہوا ہے اور اس سے زیادہ میری زندگی الجھی ہوئی ہے۔ ان لوگوں نے مجھے ایک ایسا ڈاکو سمجھ لیا ہے جس کا نام میں نے کبھی اخبار میں بھی نہیں پڑھا' ماکھو چاچڑ۔ اور ان کا خیال ہے کہ میں نے نواب زادہ خاقان کے قتل میں حصہ لیا تھا۔" میں نے اپنی رام کہانی کا خلاصہ دُہرایا۔

وہ ایک لمحے خاموش رہا پھر عجیب سے انداز میں ہنس دیا۔ "معلوم ہوتا ہے تمہیں فوراً ہی میری بے گناہی کا یقین آگیا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں" اس نے اطمینان سے جواب دیا "تم ماکھو چاچڑ نہیں ہوسکتے۔"

"کیوں؟ تم ماکھو چاچڑ کو جانتے ہو کیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"پھر اتنے وثوق سے کیوں کہہ رہے ہو؟" میں نے جاننا چاہا۔

"یہ میں نہیں کہہ رہا' میرا دل کہہ رہا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"کمال ہے!" میں نے گہری سانس لے کر کہا "تم نے کسی دلیل' کسی بحث کے بغیر میری بات کا یقین کرلیا اور ان لوگوں کو میں کل صبح سے یقین دلانے کی کوشش کررہا ہوں لیکن یہ مان کر ہی نہیں دیتے۔"

"یہ ہماری فطرت ہے یا شاید ہمارا قومی مزاج ہے۔" وہ دانشورانہ لہجے میں بولا "ایک بار کوئی بات ہمارے دماغوں میں بیٹھ جائے بس پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے ہمارے دماغ سے نکال نہیں سکتی۔ اسی طرح جب ہم کسی انسان کو سر پر بٹھاتے ہیں تو اس کی باقاعدہ پوجا شروع کردیتے ہیں۔ کوئی لاکھ ہمیں بتائے وہ ایسا نہیں' ایسا ہے لیکن ہم سمجھانے والے کی بات سننا تو درکنار' اسے ٹکڑے ٹکڑے کردینے پر تل جاتے ہیں۔ ہمارا المیہ یہی ہے۔ ہم کبھی کسی کی معقول بات کو معقولیت سے نہیں سنتے۔"

اب میں نے بغور اس کی طرف دیکھا اور غیر ارادی سے انداز میں پوچھا "تم کون ہو؟"

وہ ایک بار پھر عجیب سے انداز میں ہنسا اور بولا "میرا حلیہ دیکھنے کے بعد تمہیں میرے منہ سے یہ باتیں عجیب لگ رہی ہوں گی۔ تم چونک گئے ہو۔ میں بھی تمہیں مہذب لہجے میں بات کرتے سن کر چونکا تھا۔ لگتا ہے ہم دونوں کو حالات نے زیادہ ہی لپیٹ رگڑا دیا ہے۔ تم اپنے بارے میں بتاؤ یا نہ بتاؤ' بہرحال میں تمہیں اپنے بارے میں بتا دیتا ہوں۔ میرا نام بابو غلام حسین ہے اور میں سیاسی قیدی ہوں۔"

"سیاسی قیدی؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا "اور یہاں؟ اس ویرانے میں؟"

"ہاں۔ سیاسی قیدی کوئی صرف سرکاری جیلوں میں ہی تو نہیں ہوتے۔" وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے تلخ سے لہجے میں بولا "لگتا ہے تم نے دنیا کچھ زیادہ نہیں دیکھی۔"

"میرا خیال تو یہی تھا کہ میں نے بہت دنیا دیکھی ہے لیکن دنیا بہت بڑی ہے جسے انسان اپنی مختصر سی زندگی میں نہیں دیکھ سکتا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان ساری دنیا دیکھ لیتا ہے لیکن اپنی ناک تلے کی چیز نہیں دیکھ پاتا اور ہمارے ہاں تو ویسے بھی بے شمار چیزوں پر بہت گہرے گہرے رنگوں کے .... بہت دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔" میں نے ہلکے سے تاسف سے کہا۔

"یہ بڑے نواب صاحب کی حوالاتوں میں سے ایک ہے۔ چھوٹی اور عارضی جیل۔" وہ گرد و پیش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "یہاں سے ہم سب کو بڑے نواب صاحب کی اصل' بڑی اور پکی جیل میں جانا ہے۔ باقاعدہ سزا سننے کے بعد۔ اور اگر قید کی سزا

نہ ہوئی' کوئی اور سزا ہوئی تو پھر....." اس نے کندھے اُچکا کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"کیا سب قیدی بہت عرصے سے یہیں پڑے ہوئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ کوئی کوئی ایسا بھی ہے جسے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ دراصل ہم مختلف مقامات سے پکڑے گئے ہیں۔ ہم ابھی راستے میں ہیں۔ کبھی ہمیں لے جانے کے لیے گاڑی نہیں ہوتی اور کبھی ہمیں لے جانے والوں کا موڈ نہیں ہوتا کہ وہ ہمیں لے کر جائیں۔ اصل اور بڑی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک ہمارا تخت سے بلاوا ہی نہیں آیا۔ نواب صاحب کو تو معلوم ہی نہیں ہوگا کہ ہم یہاں قید ہیں۔ کبھی ان کا کوئی ذمّے دار اہلکار اس سلسلے میں ان کے سامنے زبانی رپورٹ پیش کرے گا اور انہیں اس طرف توجہ دینے کی فرصت ہوگی تو وہ حکم صادر کریں گے۔ پھر ہمیں فٹافٹ وہاں پہنچا دیا جائے گا۔ اگر اس وقت تک ہم زندہ ہوئے۔"

"سب لوگ مختلف چکروں میں پکڑے گئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ کوئی کسی دوسرے اور دشمن قبیلے کا ہے' کوئی زمینوں یا مال کے لین دین کے جھگڑے میں پکڑا گیا ہے' کسی سے ویسے ہی نواب صاحب کا کوئی خاص اہلکار اپنے کسی معاملے میں ناراض ہوگیا ہے اور اس نے اسے کسی چکر میں پھنسا دیا ہے۔ کوئی قبیلے کا مفرور مجرم ہے' قبیلے کے کسی قانون کے خلاف ورزی کرکے بھاگا تھا۔ کوئی واقعی کسی قسم کا جرم کرکے بھاگا ہے لیکن اسے سرکار یا پولیس کے بجائے نواب صاحب کے اہلکاروں نے گرفتار کیا ہے۔" اس نے کہا۔

"اور تم سیاسی قیدی کیسے ہوگئے؟" میں نے جاننا چاہا۔

"میں ایک نہایت معمولی سا' غیر اہم سا اور غریب سا ورکر ہوں' اس لیے شاید مجھے تو سیاسی قیدی کہلانا بھی زیب نہیں دیتا۔ یہ دو الفاظ سن کر ہمارے ذہنوں میں مشہور' بڑے اور پیشہ ور سیاست کاروں۔ بلکہ یوں کہو کہ سیاست فروشوں کے نام آتے ہیں جن کے جیل میں جاتے ہی اخباروں میں بیانات چھپنے شروع ہوجاتے ہیں کہ انہیں وہاں اے کلاس دی جائے' ٹی وی ریڈیو فراہم کیے جائیں' خدمت گار دیا جائے' اخبارات مہیا کیے جائیں۔ اور بے چارہ معمولی ورکر جو جلسے جلوسوں میں بھی ڈنڈے کھاتا ہے' پھر تھانے میں چھتر کھاتا ہے' جیل میں آکر ڈنڈا بیڑی لگواتا ہے' بند وارڈ میں رہتا ہے یا جیل سے باہر رہ کر ہی تحریکوں کا ایندھن بنتا ہے' گاجر مولی کی طرح کٹتا ہے اور اپنے لیڈر کا قد اونچا کرتا ہے۔"

"یہ سب کچھ تو صحیح ہے' میں خود اکثر ان باتوں کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں لیکن میرا پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر تم سیاسی قیدی ہو تو اس حوالات میں کیوں پائے جارہے ہو؟ اگر جیل ہی تمہارا مقدر تھی تو تمہیں سرکاری جیل میں ہونا چاہیے تھا۔" میں نے اپنے سوال کی وضاحت کی۔

"میں بڑے نواب صاحب کا باغی ہوں اور جو لوگ ہمارے قبائلی نظام کے دائرے میں رہتے ہیں' ان پر کوئی اور قانون لاگو ہونے کی نوبت نہیں آتی۔ ہمارے نواب صاحب اتنے بڑے جاگیردار' سردار اور نواب ہوتے ہوئے بھی انقلاب لانے اور غریبوں کی حالت بدل دینے کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ان کی پارٹی کے منشور کی بنیاد بھی یہی تھی۔ ہم جیسے لوگوں کی سادگی دیکھو کہ ہم ان کی حیثیت اور مقام کو دیکھتے ہوئے بھی ان سب باتوں پر اعتبار کرتے تھے' ان کے لیے دن رات سیاسی کام کرتے تھے۔ میں ایک چھوٹے سے شہر میں ان کی پارٹی کی شاخ کا صدر تھا اور اپنی دانست میں بہت بڑا انقلابی تھا' انقلاب کے لیے کام کررہا تھا۔"

غلام حسین نے ایک لمحے کے لیے خاموش ہوکر اپنے کھچڑی بالوں میں انگلیاں پھیریں' عجیب سے انداز میں مسکرایا پھر بولا "لیکن جب بالوں میں چاندی چمکنے لگی تب سمجھ میں آیا کہ ہمارے ہاں تو نیچے سے اوپر تک فراڈ ہورہا ہے۔ کہیں مذہب کے نام پر' کہیں حقوق کے نام پر' کہیں سیاست کے نام پر' کہیں انقلاب کے نام پر۔ علامہ اقبال کتنے دوراندیش تھے۔ کتنے برس پہلے وہ کہہ گئے تھے۔

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے' سلطانی بھی عیاری

ان کے زمانے میں تو پھر بھی کچھ اخلاقی اقدار باقی تھیں۔ اگر وہ آج زندہ ہوتے تو یقیناً ان میں شعر کہنے کی بھی سکت نہ رہتی۔ شدتِ غم سے گریباں چاک کرکے وہ بیابانوں کی طرف نکل جاتے۔"

"بہت دیر سے انکشاف ہوا تم پر ان باتوں کا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"المیہ تو یہ ہے کہ بعض لوگوں پر تو اس عمر میں بھی نہیں ہوتا۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"خیر... تم پر جب انکشاف ہوا تو تم نے کیا کیا؟" میں نے پوچھا۔

"میں رسّی تڑا کر بھاگا۔ میں نے اقتدار کی جنگ میں کچھ ایسے تماشے دیکھے کہ میری انقلابی روح شدید زخمی ہوگئی۔ میں نے اپنے انقلاب کی گٹھڑی سمیٹی اور عہدے سے استعفا دے کر بھاگ لیا۔ اِدھر اُدھر بیٹھ کر کچھ باتیں بھی کیں۔ انقلابی کی روح پر تازیانہ پڑتا ہے تو وہ کچھ دنوں کے لیے بہت بڑ بڑ کرتا ہے' بکواسی ہوجاتا ہے۔ میری بکواس کی رپورٹیں بھی اوپر پہنچیں تو مجھے باغی قرار دے دیا گیا اور میری گرفتاری کے احکامات جاری ہوگئے۔ نجی سطح پر گرفتاری کے احکامات جن کے نتیجے میں اس وقت میں تمہارے سامنے ہوں۔"

اس نے استہزائیہ انداز میں اپنے سراپا کی طرف اشارہ کیا "یہ تمہارے سامنے انقلاب بیٹھا ہے۔ پاؤں میں زنجیر پہنے' سلاخ

دار دروازے کے پیچھے۔ ہر انقلاب کی ہمارے ہاں یہی کہانی ہے جو باربار دُہرائی جاتی ہے۔"

پھر وہ ایک طویل سانس لے کر قدرے پُرسکون لہجے میں بولا "تم آئے ہو تو تم سے یہ باتیں کرکے دل کی بھڑاس نکال کے بڑا سکون ملا ہے۔ یہ آس پاس کی کوٹھریوں میں جو قیدی بند ہیں' ان سے اس قسم کی باتیں نہیں کی جاسکتیں۔ یہ تو اُردو بھی زیادہ نہیں سمجھتے اور سیاست و فلسفے کی باتیں تو یہ اپنی زبان میں بھی صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے۔"

پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا' ہمدردانہ لہجے میں بولا "لاؤ یار! میں تمہاری رسیّاں تو کھول دوں۔ لگتا ہے بہت دیر سے بندھے ہوئے ہو۔"

"اگر کسی نے دیکھ لیا تو کیا تمہیں سزا نہیں ملے گی؟" میں نے پوچھا۔

"سزا ...؟ سزا تو بہت سخت ملے گی۔ ہم قیدی .... اپنی اپنی کوٹھری میں رہتے ہوئے اپنی تنہائی اور ذلت کے احساس سے تنگ آکر اگر اونچی آوازوں میں باتیں کرنے لگ جاتے ہیں تو اس پر بھی یہاں کے محافظ آکر بہت مارتے ہیں۔ گدھوں کو بھی اگر اس طرح ڈنڈوں سے پیٹا جائے تو شاید کسی کونے کھدرے میں سوئے ہوئے یا کھوئے ہوئے محکمۂ انسدادِ بے رحمیٔ حیوانات والے آجائیں لیکن ہماری چیخ و پکار پر کان دھرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اسی لیے تم نے شاید محسوس کیا ہو کہ برابر کی کوٹھریوں میں قیدی بالکل خاموش ہیں ورنہ شاید تمہاری آمد پر وہ کوئی سوال کرتے' کچھ جاننے کی کوشش کرتے۔ حالانکہ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس وقت کسی کو ادھر آنے کا ہوش نہیں ہے۔ اس کے باوجود بے چارے خاموش کھڑے ہیں۔ خوف ان کے لاشعور تک میں بیٹھ گیا ہے۔"

"اور تمہیں سزا کا خوف نہیں ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"بہت زیادہ ہے" وہ جھرجھری سی لے کر بولا "ڈنڈے کھانے اور کسی بھی طرح کا تشدد سہنے سے میں بہت ڈرتا ہوں۔ میری روح فنا ہوتی ہے۔ میں کم تعلیم یافتہ ہوں لیکن پڑھنے لکھنے کا شوق رکھنے والا آدمی ہوں۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میرے ساتھ کبھی یہ کچھ ہوگا۔"

"اس کے باوجود میری رسیّاں کھول رہے ہو؟"

"ہاں۔ میں یہ تو نہیں چاہتا کہ میں کوئی چھوٹی موٹی حرکت کروں اور وہ لوگ آکر میری کھال اُدھیڑیں یا ہڈیاں توڑیں۔ میں کوئی بڑی حرکت کرنا چاہتا ہوں جس کے نتیجے میں وہ لوگ آکر فوراً ہی غصے میں مجھے گولی ماردیں اور میرے خیال میں تمہاری رسیّاں کھول دینا ایسی ہی حرکت ہوگی۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "حالانکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس پنجرے میں تو پھر بھی تم قیدی رہو گے لیکن ہاتھ کھلے ہوں گے تو تھوڑا بہت آزادی کا احساس ضرور ہوگا۔"

"خواہ اس کے عوض تمہیں گولی کھا کر مرنا پڑے؟"

"ہاں۔ گولی کھا کر مرنے سے میں نہیں ڈرتا۔ جو ذلت اس وقت میں ظاہری طور پر اٹھا رہا ہوں' اس سے زیادہ اپنے دل میں محسوس کررہا ہوں۔ اس سے تو لاکھ درجے بہتر ہے کہ انسان گولی کھا کر مرجائے۔" اس کے لہجے میں گہرا کرب پنہاں تھا۔

میں نے پشت اس کی طرف کرلی اور وہ میری بندشیں کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ رسیّاں میری کلائیوں پر بہت زیادہ سختی سے تو نہیں باندھی گئی تھیں لیکن گرہیں خاص ترکیب سے لگائی گئی تھیں کہ آسانی سے نہ کھل سکیں۔

غلام حسین گرہیں کھولنے کی کوشش کررہا تھا اور میں قسمت کے اس تماشے پر حیران ہورہا تھا کہ بعض اوقات انسان جس چیز سے ڈر رہا ہوتا ہے اسی میں اس کی بھلائی کا سبب نکل آتا ہے۔ جس چیز کو دیکھ دیکھ کر وہ کڑھتا ہے وہی اس کی بہتری کا باعث بن جاتی ہے۔

میں جب سے اس ڈیرے پر پہنچا تھا' کئی بار قید خانے کا ذکر سن چکا تھا اور ڈر رہا تھا کہ کہیں مجھے لے جاکر وہیں نہ ٹھونس دیا جائے لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہاں غلام حسین جیسا قیدی مل جائے گا جو فوراً ہی میرا دوست بن جائے گا اور اپنی بساط کے مطابق میری مدد پر کمربستہ ہوجائے گا۔

میں نواب زادی کی نخوت اور تکبّر دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں کباب ہوا جارہا تھا لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس نخوت اور تکبّر کی وجہ سے مجھے قید خانے جانا پڑے گا جو میرے حق میں بہتر ثابت ہوگا۔

کب سے میری خواہش تھی کہ کسی طرح میرے ہاتھ کھل جائیں۔ انسان خواہ قید میں ہی ہو لیکن اس کے ہاتھ پاؤں کھلے ہوں تو وہ اپنے آپ کو اتنا مجبور محسوس نہیں کرتا لیکن اگر ہاتھ بندھے ہوں تو خواہ آپ کھلے میں بھی پھر رہے ہوں' آپ اپنے آپ کو واقعی ایک قیدی اور مجبورِ محض محسوس کرتے ہیں۔ اس نکتے سے غلام حسین بھی آگاہ تھا۔

بلال شیدی شاید اسی اندیشے سے مجھے قید خانے میں نہیں بھیج رہا تھا کہ اتنی تنگ سی کوٹھری میں دو قیدی موجود ہوں گے تو شاید وہ ایک دوسرے کی مدد کی کوئی صورت نکال لیں لیکن شاید دل ہی دل میں نواب زادی کی رعونت سے بے زار ہوکر اس نے اس سارے معاملے پر لعنت بھیج دی تھی اور سوچ لیا تھا کہ اس کی طرف سے سب بھاڑ میں جائیں' جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا' اسے نواب زادی کی خفگی مول لینے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی لیے اس نے فقیرے کو مزید کسی احتیاطی تدبیر کی ہدایت بھی نہیں کی تھی۔ بس وہ آیا تھا اور مجھے کوٹھری میں دھکا دے کر چلا گیا تھا۔

غلام حسین آخرکار گرہیں کھولنے میں کامیاب ہوگیا۔ چند

لمحے بعد ہی اس نے پتلی سی وہ رسّی میرے قدموں میں ڈال دی۔ رسّی کھلنے کے بعد بھی میں فوری طور پر بازو سیدھے کرنے اور سامنے کی طرف لانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ کندھوں تک بازو گویا لکڑی کے ہو گئے تھے۔

بڑی مشکل سے بازو سیدھے کر کے میں نے ہاتھوں کا جائزہ لیا۔ ان پر ورم سا آ گیا تھا اور رسّیاں زیادہ سختی سے نہ بندھی ہونے کے باوجود ان کے گہرے گہرے نشان جلد میں خوب اچھی طرح نقش ہو کر رہ گئے تھے۔ ہاتھ بالکل سُن تھے۔ میں نے بازوؤں کو پچاس ساٹھ زوردار جھٹکے دیے' ہاتھوں کو آپس میں رگڑ رگڑ کر ان کی مالش کی۔ نہ جانے کتنی مرتبہ مٹھیاں کھولیں' بند کیں۔

آخر کار بازوؤں میں وہی طاقت و توانائی لوٹ آئی جس سے دل کو بڑی ڈھارس رہتی تھی۔ غلام حسین نے سچ کہا تھا۔ اب بھی گو کہ میں آزاد تو نہیں ہو گیا تھا' پنجرے جیسی کوٹھری میں ہی بند تھا لیکن دل کو جیسے کچھ قرار سا آ گیا تھا۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا "اب میں تمہاری... بلکہ یوں کہو کہ اپنی اور تمہاری مدد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

کوٹھری کا سلاخ دار دروازہ چونکہ کچی دیواروں میں نصب تھا اس لیے مجھے امید کی کرن نظر آ رہی تھی۔ میری غیر معمولی اور خدا داد جسمانی طاقت جو زندگی میں بارہا بڑے عجیب اور ناقابل یقین انداز میں میرے کام آئی تھی' اس وقت بھوک پیاس اور مسلسل ذلت و خواری کی وجہ سے کافی متاثر ہو چکی تھی پھر بھی مجھے امید تھی کہ اس وقت وہ شاید کام دے جائے۔

میں نے ترچھے ہو کر پاؤں زمین پر جمائے' دروازے کی دو موٹی موٹی سلاخیں مضبوطی سے گرفت میں لیں اور پہلے تو دروازے کو جھنجوڑ کر اس کے وہ آہنی حصے ڈھیلے کرنے کی کوشش کی جو مٹی کی دیواروں میں پیوست تھے۔

اس میں مجھے معمولی سی کامیابی ہوتی دکھائی دی لیکن ساتھ ہی کچھ کھڑکھڑاہٹ بھی پیدا ہوئی۔ بابو غلام حسین فوراً گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور میری کمر پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "یہ کیا کر رہے ہو یار؟ تم تو مروا دو گے۔ بڑا شور ہو رہا ہے' وہ لوگ آ جائیں گے۔"

"ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ تم گولی کھا کر مرنے سے نہیں ڈرتے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"وہ تو میں نے غلط نہیں کہا تھا لیکن اب اس بات کی گارنٹی تو نہیں ہے کہ وہ آتے ہی ہمیں گولی مار دیں۔ ہو سکتا ہے وہ ہم پر تشدد شروع کر دیں جس سے میں بہت ڈرتا ہوں۔" وہ بے بسی سے بولا۔

میں نے دروازے کو جھنجوڑنا بند کر دیا اور دوبارہ پاؤں مضبوطی سے جما کر خاموشی سے اسے باہر کی طرف دھکیلنے لگا۔ سانس روک کر میں نے اس پر پوری طاقت صرف کر دی۔ میرا خیال تھا کہ دروازہ اکھڑ کر باہر جا گرے گا لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ یہ محض میری خوش فہمی ثابت ہوئی۔ طاقت آزمائی کرتے کرتے مجھے اندیشہ محسوس ہونے لگا کہ میری کنپٹیوں کی نسیں پھٹ جائیں گی۔

بابو غلام حسین ایک بار پھر میری پیٹھ تھپکتے ہوئے بولا "تارزن بننے کی کوشش مت کرو۔ یہ دروازہ نہیں اکھڑے گا۔ کہنے کو یہ مکان کچی اینٹوں اور مٹی سے بنا ہوا ہے لیکن یہ خاص قسم کی مٹی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بھربھری اور کمزور ہونے کے بجائے زیادہ ٹھوس ہو گئی ہے۔ تقریباً سیمنٹ کی طرح۔ بارشیں پڑنے سے یہ گھلی کم ہے اور مضبوط زیادہ ہوئی ہے۔"

"دروازے کو جھنجوڑنے سے مجھے کچھ نتیجہ برآمد ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔" میں نے زور آزمائی ترک کرتے ہوئے کہا۔

"نتیجہ یقیناً برآمد ہوتا مگر وہ ہم دونوں کے لیے عبرت ناک ہوتا۔" غلام حسین ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"اب میرے ہاتھ کھلے ہیں' اب مجھے ان لوگوں کی کچھ زیادہ پروا نہیں ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "دوسری بات یہ کہ اس وقت ان لوگوں کا تھوڑے بہت شور کی طرف دھیان نہیں جائے گا۔ ان کی جان پر بنی ہوئی ہے۔ بہت برا حال ہے ان لوگوں کا۔"

"پھر بھی میں تمہیں اس دروازے کو اس طرح کھڑکھڑانے کی اجازت نہیں دوں گا۔ اگر ان کا حال برا ہے تو کہیں وہ ہم پر اور بھی زیادہ غصہ نہ اتاریں۔" غلام حسین دھیمی آواز میں بولا "ویسے صورت حال کیا ہے؟ میرے خیال میں تو اب ڈاکو چلے گئے ہیں۔"

"ڈاکو جانے کے لیے نہیں آئے۔ وہ جو لینے کے لیے آئے ہیں وہ لے کر ہی جائیں گے۔" میں نے وثوق سے کہا۔

پھر میں نے اسے اندر کی صورت حال سے آگاہ کیا۔ اسے بتایا کہ ڈیرے پر صرف تین یا چار مرد زندہ رہ گئے ہیں۔ باقی سب مر چکے ہیں۔ ڈاکوؤں کو یقیناً تین چار کروڑ کے سونے کی خبر ملی ہوئی تھی اور لگتا یہی تھا کہ وہ ہر حال میں سونا حاصل کر کے رہیں گے۔ میرے خیال میں انہیں ایک فیصلہ کن حملہ کرنے کے لیے کمک کا انتظار تھا۔

ملگجی روشنی میں بھی مجھے غلام حسین کی آنکھوں میں چمک سی نمودار ہوتی محسوس ہوئی۔ وہ دبی دبی آواز میں ذرا جوش سے بولا "تمہارا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے۔ تبھی وہ اتنے صبر و سکون سے گھیرا ڈالے بیٹھے ہیں ورنہ یہ مخلوق اتنا صبر کرنے والی تو نہیں۔"

"لیکن اس میں ہمارے لیے تو ایسی کوئی خوش ہونے والی بات نہیں ہے۔" میں نے کہا "ڈاکو جب فیصلہ کن حملہ کریں گے تو ساتھ ہی ہم بھی شاید بے بسی کی موت مارے جائیں۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" اس نے تسلیم کیا اور اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی۔ کوٹھریوں کے سامنے موجود فاصل دیوار کے اوپر سے نظر آنے والے تاروں کی طرف دیکھتے ہوئے وہ پُر خیال سے لہجے میں بولا "اگر میرا زندہ حالت میں ڈاکوؤں سے سامنا ہو گیا تو میں ہاتھ باندھ کر ان سے درخواست کروں گا کہ وہ مجھے اپنے گروہ میں

شامل کرلیں۔ شاید وہ میری بات مان لیں۔"

"مجھے امید نہیں ہے کہ تم ان کے معیار پر پورا اتر سکو گے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "تم انٹرویو میں کوالیفائی نہیں کر سکو گے۔ اگر انٹرویو میں پاس ہو بھی گئے تو عملی امتحان میں یقیناً رہ جاؤ گے۔"

اس نے ایک طویل اور سرد آہ بھری "گویا تم میرے اس خیال کی تصدیق کر رہے ہو کہ آئیڈ یلسٹ لوگ ہر میدان میں ناکام ہوتے ہیں؟"

"ہاں۔ کافی حد تک یہی درست ہے لیکن کبھی کبھی آئیڈ یلسٹ لوگ بہت حیرت انگیز کامیابی بھی حاصل کر جاتے ہیں' دنیا میں مثالیں چھوڑ جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"میں سوچتا ہوں..." بابو غلام حسین نے کہا لیکن وہ جملہ مکمل نہ کر سکا۔ مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کیا سوچتا تھا کیونکہ اسی لمحے اچانک ہی گویا جہنم کا دہانہ کھل گیا۔ یک لخت ہی اتنے خوف ناک انداز میں فائرنگ شروع ہوئی گویا کسی بہت بڑی فوج نے مکان کو نرغے میں لے کر حملہ کر دیا ہو۔ اس بار تو مشین گنوں کی تڑتڑاہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔

اتنی دیر سے چھایا ہوا سکوت یک لخت ہی درہم برہم ہو گیا تھا۔ میرے اندیشے درست ہی معلوم ہوتے تھے۔ آخر کار فیصلہ کن حملہ ہو گیا تھا۔ ڈاکوؤں کو جس کمک کا انتظار تھا شاید وہ آن پہنچی تھی۔ میرے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ ہم چڑیا گھر کے پنجروں سے بھی بدتر اس کوٹھری میں بند' بالکل ہی مجبور اور لاچار تھے۔

غلام حسین خوف زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ فائرنگ کا شور خاصا تیز تھا اور مجھے اندازہ تھا کہ اندر کافی ہڑبونگ مچ چکی ہوگی۔ میں نے غلام حسین سے کہا "اگر اس وقت کسی نے دروازے کی کھڑکھڑاہٹ سن بھی لی تو زیادہ توجہ نہیں دے گا۔ اس لیے میں ایک بار پھر کوشش کر رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے پوری طاقت سے ایک بار پھر دروازے کو جھنجوڑنا شروع کر دیا۔ دروازہ خاصا ڈھیلا ہو گیا تھا لیکن اس کے اکھڑنے کے آثار اب بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ مجھے موت سے تو نہیں البتہ بے بسی کی موت سے ضرور خوف آتا تھا۔ انسان آزاد ہو اور اپنی بقا کے لیے ہاتھ پاؤں مار سکتا ہو' اس عالم میں اسے موت آ جائے' میرے خیال میں یہ کوئی خوف ناک بات نہیں تھی۔ لیکن انسان مقید ہو یا اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوں اور اس عالم میں وہ چوہے کی طرح مارا جائے' یہ تصور مجھے ضرور خوف زدہ کر دیتا تھا۔

سامنے کی دیوار سے اوپر آسمان کا جتنا ٹکڑا دکھائی دے رہا تھا' اچانک ہی میری نظر اس طرف اٹھی اور میرا دل گویا دھڑکنا بھول گیا۔ فضا میں کوئی چیز تیرتی ہوئی سیدھی مکان کی طرف آ رہی تھی۔ میں نے فوراً دروازے کا پیچھا چھوڑا اور دیوار کے ساتھ لگ کر سجدے کی سی حالت میں گر گیا۔ میں نے چیخ کر غلام حسین سے کہا "تم بھی یونہی کرو۔"

دوسرے ہی لمحے مجھے معلوم ہو گیا کہ میرا اندازہ صحیح تھا۔ میں نے فضا میں جس چیز کو پرواز کرتے دیکھا تھا وہ راکٹ ہی تھا اور اسے یقیناً راکٹ لانچر سے ہی فائر کیا گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ڈاکوؤں کے پاس راکٹ لانچر اور مشین گنیں تک پہنچ چکی تھیں۔ ان چیزوں کے ساتھ یقیناً مزید افراد بھی آئے ہوں گے۔ اب اس مکان کا اور اس میں زندہ بچ جانے والوں کا اللہ ہی حافظ تھا۔

غلام حسین تو صحیح طور پر سجدے کی سی حالت میں بھی نہیں آنے پایا تھا کہ ایک خوف ناک دھماکا ہوا اور مجھے یہی لگا کہ دیواریں ہم پر آ گریں گی لیکن ہماری قسمت اچھی تھی جو ایسا نہیں ہوا لیکن چھت اور دیواروں سے ڈھیروں مٹی ہم پر گری۔

اندر سے کسی کے چیخنے کی آوازیں سنائی دیں۔ آوازیں نسوانی معلوم ہوتی تھیں لیکن میرے لیے اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ نواب زادی کی آواز تھی' جھماں کی یا پھر رُکھاں کی۔ وہ گھٹی گھٹی سی آواز تھی۔ اندر یقیناً کوئی اور قیامت گزر گئی تھی۔ آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ مکان کا کچھ حصہ منہدم بھی ہوا تھا۔

درودیوار میں ارتعاش تھمنے سے پہلے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسرا راکٹ لانچ ہونے سے پہلے اگر ہم اس کوٹھری سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے تو شاید ہمارے حق میں بہتر ہوتا۔ فی الحال بھی قسمت ہم پر مہربان ہی رہی تھی کہ راکٹ غالباً مکان کے اس حصے پر جا کر گرا تھا جہاں کچھ دیر تک پہلے میں دیگر لوگوں کے ساتھ موجود تھا۔ مجھے اب اس متکبر نواب زادی کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا جس نے بری طرح خار کھا کر مجھے اس قید خانے میں بھیج دیا تھا۔

میں نے ایک بار پھر دروازے کو پکڑا اور زور آزمائی شروع کی۔ مجھ پر ایک خوش کن انکشاف ہوا کہ راکٹ کی تباہ کاری نے میرا کام بہت آسان کر دیا تھا۔ دیواریں شاید کچھ اس طرح جھنجھنائی تھیں کہ آہنی دروازے کے جو حصے ان میں پیوست تھے' وہ مزید ڈھیلے ہو کر باہر نکل آئے تھے۔

میں نے پوری طاقت صرف کر کے ایک جھٹکا دیا جو آخری جھٹکا ثابت ہوا۔ سلاخ دار دروازہ باہر جا گرا۔ اس کے ساتھ شاید اوندھے منہ میں بھی جا گرتا لیکن میں نے بروقت اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

اس وقت تک کوئی وہاں نہیں پہنچا تھا۔ معلوم نہیں کون زندہ بچا تھا' کون مر چکا تھا۔ جو زندہ بچے بھی ہوں گے انہیں یقیناً اس طرف توجہ دینے کا ہوش نہیں ہوگا۔ تاہم میرے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ دوسرا راکٹ لانچ ہونے سے پہلے مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ دوسرا راکٹ قید خانے پر ہی آ گرتا۔

یہ خیال بجلی کی سی تیزی سے میرے ذہن میں آیا لیکن میں

فوری طور پر وہاں سے نہ بھاگ سکا۔ مجھے غلام حسین کا خیال آگیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے زنجیر اس کے پاؤں میں ہی نہیں' میرے پاؤں میں بھی تھی۔ اس کے پاؤں میں قید خانے کی زنجیر تھی اور میرے پاؤں میں اس کے احسان کی زنجیر تھی۔ اس نے سزا کی پروا کیے بغیر میرے ہاتھوں کی بندشیں کھولی تھیں۔

اگر اس نے یہ زحمت اور ہمت نہ کی ہوتی تو میرے لیے اس وقت کوٹھری کا دروازہ اکھاڑنا ممکن نہ ہوتا۔ فائرنگ شروع ہونے کے بعد تو اتنی مہلت ہی نہیں مل سکتی تھی کہ وہ میری رسّیاں کھولتا۔

میں تیزی سے گھوما۔ غلام حسین پُرامید نظروں سے میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی زنجیر کا وہ سرا پکڑا جو دیوار میں پیوست کڑے سے منسلک تھا۔ میں نے ایک پاؤں دیوار پر جمایا اور کڑے کو دیوار سے اکھاڑنے کے لیے زور آزمائی شروع کی۔ ایک ہمت افزا بات یہ تھی کہ آہنی کڑا بھی دیوار میں ڈھیلا پڑ چکا تھا۔ کچھ اوپر تو دیوار میں ہلکی سی دراڑ بھی نمودار ہو چکی تھی۔

غلام حسین نے بھی حسب مقدور میرا ہاتھ بٹانے کی کوشش کی۔ ہم رسّا کشی کے انداز میں زنجیر کو کھینچ رہے تھے۔ مشین گنوں اور دور مار رائفلوں سے فائرنگ اس دوران بھی جاری تھی لیکن ہماری خوش قسمتی تھی کہ قید خانے کی طرف فائرنگ کا زور کم ہی تھا اور فاصل دیوار کی وجہ سے تو ہم بالکل ہی محفوظ تھے۔

چند سیکنڈ میں ہی ہماری کوشش بار آور ہوگئی۔ کڑے کا پچھلا حصہ ایک بڑی سی "ٹی" کی شکل کا تھا جو دیوار سے آخر کار نکل آیا لیکن اس زور آزمائی اور لوہے کی مسلسل رگڑ سے میرے ہاتھوں میں جلن سی ہونے لگی۔ خود پرستی سے قطع نظر میں اپنے ہاتھوں کو آہنی ہاتھوں میں شمار کر سکتا تھا لیکن لوہا بھی اتنی دیر تک اور اتنے دباؤ کے ساتھ لوہے سے رگڑ کھاتا رہے تو اس پر بھی کچھ نہ کچھ اثرات تو نمودار ہو ہی جاتے ہیں۔

غلام حسین نے اپنی زنجیر کا سرا ہاتھ میں تھام لیا۔ فی الحال اس زنجیر کو اس کے پاؤں سے نہیں نکالا جا سکتا تھا۔ ہم دونوں رکوع کی سی حالت میں کوٹھری سے نکلے اور سامنے والی دیوار کی اوٹ میں جا پہنچے۔ اسی دوران پیچھے سے دوسرے قیدیوں کا شور سنائی دیا۔

وہ ہمیں فرار ہوتے دیکھ کر شور مچا رہے تھے کہ ہم ان کی بھی کچھ مدد کریں لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ ہر کوٹھری کا تالا توڑنا یا دروازہ اکھاڑنا اور پھر ہر قیدی کی زنجیر دیوار سے نکالنا ہمارے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لیے ہم نے انہیں ان کے حال پر چھوڑا اور فاصل دیوار کی اوٹ سے نکل کر چاروں ہاتھ پیروں کے بل بیرونی دیوار کی طرف بڑھے۔ گولیوں کی بوچھاڑ اس طرف ایسی شدید نہیں تھی اور ہم چوپایوں کی طرح چلتے ہوئے ان کی زد سے محفوظ رہ سکتے تھے۔

ہم بیرونی دیوار تک تو صحیح سلامت پہنچ گئے لیکن اس کے اوپر چڑھنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ گولیاں اس کے بالائی کنارے کو اُڑاتی ہوئی اندر آرہی تھیں۔ اس بدنصیب مکان پر نہ جانے کتنی گولیاں برسائی جا چکی تھیں کہ اس کی دیواریں اوپر سے دندانے دار سی ہو چکی تھیں۔

میں اور غلام حسین دیوار سے چپک کر سکڑے سمٹے بیٹھے تھے۔ میں آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد ہی میرے اندیشے کے مطابق دوسرا راکٹ آتا دکھائی دیا۔ اس راکٹ نے تو اس طویل و عریض مکان کا خاصا بڑا حصہ منہدم کردیا اور کہیں آگ بھی بھڑک اٹھی۔ قیدیوں کی بھی چیخ وپکار سنائی دے رہی تھی۔ حالانکہ قید خانہ اب بھی سلامت تھا۔

چار دیواری کا جتنا حصہ ہم دیکھ سکتے تھے' اس کے عقب میں اب بلال شیدی کا کوئی آدمی تعینات دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ معلوم نہیں کوئی زندہ بھی بچا تھا یا نہیں۔ کچھ ہی دور مکان کے ایک کونے پر ہمیں ایک لاش تو آڑی ترچھی پڑی نظر آرہی تھی۔

دوسرا راکٹ پھینکے جانے کے بعد فائرنگ بند ہوگئی تھی۔ شاید ڈاکو دوسرے راکٹ کی تباہ کاری کا جائزہ لے رہے تھے۔ میں نے غلام حسین سے کہا "جلدی آؤ۔ یہی موقع ہے کہ ہم دیوار پھلانگ جائیں۔"

لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ جب ہم دیوار کے اوپر پہنچیں گے تو ملگجی روشنی میں شاید بہت دور سے بھی ہمارے ہیولے دیکھ لیے جائیں۔ ڈاکوؤں کے پاس یقیناً دوربینیں بھی تھیں یا پھر ان کی دور مار رائفلوں پر دوربینیں لگی ہوئی تھیں۔ ادھر مکان میں کہیں آگ لگ جانے کی وجہ سے بھی اس دیوار تک روشنی ذرا سی بڑھ گئی تھی جہاں ہم موجود تھے۔

ہمارے لیے صرف وہی ایک لمحہ خطرناک تھا جب ہم دیوار کے اوپر پہنچتے۔ باہر چھلانگ لگا دینے کے بعد تو ہمارے عقب میں دیوار ہوتی یعنی پس منظر گویا تاریک ہوجاتا اور ہم اس میں گڈمڈ ہوجاتے۔ بس اسی ایک درمیانی لمحے میں اگر کوئی گولی ہمارے جسم کے پار نہ ہوتی تو ہم بچ نکلنے کی کچھ امید رکھ سکتے تھے۔

میں نے غلام حسین کا ہاتھ پکڑا اور اسے چار دیواری کے کونے کی طرف تقریباً کھینچتا ہوا لے چلا۔ اس طرف روشنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس گوشے میں دو تین اُجڑے اُجڑے سے درخت بھی موجود تھے۔ درختوں کے پس منظر کا سہارا لیتے ہوئے دیوار پر چڑھنا کافی حد تک محفوظ ثابت ہو سکتا تھا۔

غلام حسین تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ دوسرا راکٹ گرتے دیکھ کر اور اس کا دھماکا سن کر وہ دہشت زدہ ہو گیا تھا حالانکہ ہم ابھی مکان کے پچھلی طرف ہی تھے اور دونوں راکٹوں کی تباہ کاری کا صحیح طور پر نظارہ نہیں کر سکے تھے۔ دوسرا راکٹ گرنے کے بعد تو مکان کے اگلے حصے کی طرف سے کوئی چیخ بھی سنائی نہیں دی تھی۔ معلوم نہیں کوئی زندہ بھی بچا تھا یا نہیں۔

کونے میں پہنچ کر میں نے اکڑوں بیٹھتے ہوئے غلام حسین کو پہلے

اپنے کندھوں پر چڑھایا اور اسے ہدایت کی "دیوار پر ایک لمحے کے لیے بھی نہ بیٹھنا' فوراً باہر کود جانا۔"

وہ بری طرح حواس باختہ تھا۔ دو مرتبہ تو وہ میرے کندھوں پر چڑھنے کی کوشش میں گر پڑا۔ پاؤں میں پڑی ہوئی بھاری زنجیر بھی اس کے لیے مصیبت بن رہی تھی۔ آخر کار میں نے ہی اسے تقریباً گود میں اٹھا کر دیوار پر چڑھایا اور وہ ہانپتا کانپتا دوسری طرف کود گیا۔

میں نے ایک لمحے انتظار کیا۔ کوئی گولی نہیں چلی تو میں نے بازو بلند کر کے ہاتھ دیوار پر جمائے اور بلی کی طرح جسم کو بل دیتے ہوئے دیوار پر چڑھ کر فوراً ہی دوسری طرف کود گیا۔ دوسری طرف بھی میں دیوار سے چپک گیا اور فوری طور پر حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے دیکھا' غلام حسین قریب ہی تقریباً سجدے کی سی حالت میں پڑا کمر پر ہاتھ رکھے کراہ رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" میں نے تیز سی سرگوشی میں پوچھا۔

"لگتا ہے کمر میں جھٹکا آگیا ہے۔ مجھ سے تو سیدھا کھڑا ہی نہیں ہوا جارہا۔" وہ کراہتے ہوئے بولا "اصل میں مجھے پہلے بھی کچھ چوٹیں بڑی غلط سلط جگہوں پر لگی ہوئی ہیں۔ قید خانے میں محافظوں نے کئی بار مارا تھا۔"

"فکر مت کرو' صرف حوصلہ بلند رکھو' سب ٹھیک ہوجائے گا۔" میں نے اس کی ہمت بڑھانے کی کوشش کی "سیدھے کھڑے ہونے کی ہمیں ویسے بھی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں تو ابھی نہ جانے کتنا فاصلہ رکوع کی سی حالت میں یا چوپایوں کی طرح طے کرنا ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

ہم دونوں بالکل کبڑے ہوکر دیوار کے ساتھ لگ کر ایک طرف کو کھسکنے لگے۔ میں بہت زیادہ پُریقین نہیں تھا کہ ہم ڈاکوؤں کے گھیرے سے زندہ سلامت نکل جائیں گے لیکن میرا فلسفہ یہی تھا کہ جدوجہد آخری سانس تک جاری رکھنی چاہیے۔

صورت حال خاصی مایوس کن تھی۔ میں بہت پہلے سے ہر امکان پر غور کرچکا تھا۔ مکان چاروں طرف سے پہاڑیوں میں گھرا ہوا تھا۔ پہاڑیوں اور مکان کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ پہاڑیوں ہی کے درمیان ایک طرف کچھ حصہ خالی تھا۔ اسے گزرگاہ سمجھا جاسکتا تھا۔

یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کس پہاڑی کے عقب میں ڈاکو موجود تھے اور کس کے عقب میں نہیں۔ بہرحال پہاڑیوں کے درمیان سے گزرنے کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ جو ایک گزرگاہ میسّر تھی' مجھے یقین تھا کہ اس کے دونوں طرف کی پہاڑیوں پر ضرور ڈاکو موجود ہوں گے اور گزرگاہ کی کڑی نگرانی کررہے ہوں گے۔ توقع یہی رکھنی چاہیے تھی کہ اس گزرگاہ پر متحرک نظر آنے والے کسی سائے پر بھی وہ گولی ضرور چلائیں گے۔ اس کے علاوہ درمیانی میدان کو عبور کر کے اس گزرگاہ تک یا کسی بھی پہاڑی تک پہنچنا اپنی جگہ ایک جان لیوا امتحان تھا۔

اس سارے طویل دائرے میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کی آڑ لے کر انسان آگے بڑھ سکتا۔ بس یہ غنیمت تھا کہ زمین سپاٹ نہیں تھی۔ نشیب و فراز سے پُر تھی۔ اگر کوئی زمین پر تقریباً رینگنے کے سے انداز میں سفر کرتا تو یہ نشیب و فراز اس کا ساتھ دے سکتے تھے۔ ان کی وجہ سے' محض تاروں کی روشنی میں دور سے کسی کو اس کی حرکت نظر نہیں آسکتی تھی۔ ابتدائی تاریخوں کا چاند بھی اب غائب ہوچکا تھا۔

دیواروں میں وہ چھوٹے چھوٹے چوکور سوراخ موجود تھے جن کے عقب میں' میں نے بلال شیدی کے آدمیوں کو مورچہ بند ہوکر فائرنگ کرتے دیکھا تھا۔ ہم اتنا نیچے ہوکر گزر رہے تھے کہ ان سوراخوں سے کوئی ہمیں نہ دیکھ سکے۔ کسی سوراخ سے اب گن کی نال جھانکتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر بھی ہم ہر ممکن احتیاط کررہے تھے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کسی سوراخ کے عقب میں اب بھی کوئی شخص موجود ہو۔

چار دیواری کے کونے پر پہنچ کر ہم رک گئے۔ غلام حسین ہانپتے ہوئے سرگوشی میں بولا "اگر مزید کوئی راکٹ فائر ہوگیا تو؟"

"بس ... پھر تو اس مکان اور مکان والوں کا کچھ نہیں بچے گا۔" میں نے کہا۔

"لیکن میرا خیال ہے ڈاکو اس بری طرح تباہی پھیلانے کی حماقت نہیں کریں گے۔ انہیں اندازہ ہوگا کہ اس کے بعد تو سونا بھی نہ جانے کس شکل میں' کہاں کہاں تک بکھر جائے۔ اسے سمیٹنا بہت مشکل ہوجائے گا۔ وہ صرف مزاحمت کے امکان کو ختم کررہے ہیں۔ میرے خیال میں وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ جب وہ پہاڑیوں سے اتر کر مکان کی طرف بڑھیں تو کوئی ان کا راستہ روکنے والا موجود نہ ہو۔ اور اگر ہو بھی تو اسے اپنی کوشش میں کوئی کامیابی نہ ہو۔"

اسی لمحے ایک بار پھر فائرنگ شروع ہوگئی لیکن اب اس میں شدت نہیں تھی۔ ڈاکو گویا بہت سوچ سمجھ کر وقفے وقفے سے اور کہیں کہیں سے گولیاں چلا رہے تھے۔ مکان کی طرف سے اب قطعاً کوئی فائر نہیں ہورہا تھا۔ اس کے ایک حصے سے شعلے بلند ہورہے تھے جو پھیلتے دکھائی دے رہے تھے۔

مکان کے طویل و عریض احاطے میں تین چار گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میرا اندازہ تھا کہ آگ ابھی ان تک نہیں پہنچی تھی۔ آگ ان تک پہنچنے کے بعد تباہی کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوسکتا تھا۔ سونا بھی انہی میں سے کسی گاڑی میں موجود تھا۔

میں نے سرگوشی میں غلام حسین سے کہا "میرا خیال ہے ڈاکوؤں کو اندازہ ہوچکا ہے کہ یہاں مزاحمت بالکل دم توڑ چکی ہے۔ اب جلد ہی وہ پہاڑیوں سے اترنا شروع کریں گے۔ وہ لوگ مشین گنیں پہاڑیوں پر نصب کرچکے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ کچھ ڈاکو

سنیئے! مظلوم مُسلمانوں کا لہو آپکو پکار رہا ہے

بوسنیا، کشمیر، فلسطین، صومالیہ، برما، کردستان، افغانستان اور وسطِ ایشیا کی مسلم ریاستوں میں انسانیت سِسک رہی ہے۔

ستم رسیدہ عورتوں، بچوں، ضعیفوں اور معذوروں کی امید بھری نگاہیں آپ پر لگی ہیں۔

انہیں مایوس نہ کیجئے

اِنکی مدد آپ کا دینی، مِلّی اور انسانی فریضہ ہے

"اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا" (القرآن)

اِمدادی رقوم کی ترسیل کیلئے

مسلم ایڈ انٹرنیشنل، حبیب بینک لمیٹڈ پشاور کینٹ، فارن کرنسی اکاونٹ نمبر ۵-۱۲۱-۶۷ یا پاکستانی روپیہ اکاونٹ نمبر ۵۱۸۵-۵۸

مسلم ایڈ انٹرنیشنل پی او بکس ۹۱۴ پشاور فون: ۴۳۲۰۳-۴۴۶۰۱

کراچی فون: ۵۲۶۱۸۱ پشاور فیکس: ۰۵۲۱-۸۴۰۳۷۱

پہاڑیوں سے اُتر کر مکان کو گھیرے میں لے کر اس کی طرف بڑھیں گے اور کچھ ڈاکو پہاڑیوں پر ہی رہ کر مشین گنوں کے ذریعے ان کو کَور دیں گے۔"

پھر ایک گہری سانس لے کر میں نے کہا "اگر ہم جلد اس دائرے سے نکلنے میں کامیاب نہ ہوسکے تو راستے میں ڈاکوؤں سے ہمارا آمنا سامنا بھی ہوسکتا ہے۔"

"اور ہم بالکل نہتے ہیں۔" غلام حسین ہونٹوں پر زبان پھیر کر پھنسی پھنسی سی آواز میں بولا۔

"ہاں" میں نے نہ جانے کیوں اس صورت حال میں بھی غیر ارادی سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا "لیکن تم قدرت کے ایک تماشے پر ذرا غور کرو۔ ہم نہتے تھے اور ایک کوٹھری میں مقید تھے۔ تمہاری ٹانگ اور میرے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے لیکن ہم اس مکان سے زندہ سلامت نکل آئے ہیں۔ وہاں بہت سے کلاشنکوف بردار موجود تھے جو آزاد تھے' مورچہ بند تھے مگر وہ مرچکے ہیں۔"

غلام حسین نے آنکھیں پٹ پٹا کر میری طرف دیکھا۔ میری بات سے اسے گویا ایک نیا حوصلہ ملا۔ میرا اشارہ پاکر وہ اپنی کمر کی تکلیف کو بھول کر ذرا مستعدی سے میرے ساتھ ساتھ مزید آگے کھسکنے لگا۔ فضا میں اب بھی اِکّا دُکّا گولیوں کی سنسناہٹ محسوس ہورہی تھی لیکن وہ ہمارے سروں سے کافی اوپر' دیوار کے کنارے کو چھوتی ہوئی گزر رہی تھیں۔

بغلی دیوار کے وسط میں پہنچنے کے بعد سمت کے حساب سے میں نے فیصلہ کیا کہ اب ہمیں مکان سے دور ہٹنا شروع کردینا چاہیے۔ دیوار سے الگ ہونے کے بعد ہم گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل اس پہاڑی کی طرف بڑھنے لگے جو درّے سے مشابہ گزرگاہ کے قریب واقع تھی۔ میرا خیال تھا کہ اگر ہم زندہ سلامت اس پہاڑی تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے تو پھر ڈاکوؤں کی نظر سے بچ کر اس راستے سے گزرنے کی کوئی ترکیب سوچیں گے۔

ابھی ہم نے اس طرح تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ غلام حسین منمنایا "یار! اس طرح تو گھٹنے چھل رہے ہیں .... میں بڑی تکلیف میں ہوں۔ مجھے لگتا ہے تمہارا ساتھ دینا میرے بس کی بات نہیں۔"

"ہمت نہ ہارو غلام حسین!" میں نے نیچی آواز میں کہا "اگر ہم اس آزمائش سے سرخرو گزر گئے تو شاید کبھی کسی آرام دہ کمرے میں لیٹے لیٹے اس رات کی یاد ہماری رگوں میں لہو کی گردش تیز کردیا کرے۔"

میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ میرے ذہن کے نہاں خانوں میں ایسی بہت سی راتوں کی یادیں محفوظ تھیں۔ اس کے بجائے میں نے کہا "اگر تمہارے گھٹنے چھل رہے ہیں تو اس طرح چلو۔" میں نے اسے ہاتھوں اور پیروں کے پنجوں کے بل چل کر دکھایا جس میں گھٹنے زمین پر نہیں لگتے تھے۔

عجیب مضحکہ خیز سی حالت میں ہم زمین کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے کے بعد غلام رسول کو سستانے کے لیے رکنا پڑتا۔ اس کے پاؤں کی زنجیر اور کمر کی تکلیف بھی اسے تنگ کررہی تھی۔ ابھی تک ہم پر کوئی فائر نہیں ہوا تھا۔ اس سے میرا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ شاید ڈاکوؤں کی تمام تر توجہ مکان کی طرف تھی۔ بہرحال ہم کھڑے ہوکر چلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔

اس مضحکہ خیز سی حالت میں چلتے چلتے راستے میں کہیں کوئی جھاڑی میسّر آجاتی تو اس کی اوٹ میں بیٹھ کر ذرا تحفظ کا احساس ہوتا۔ پیاس سے میرے حلق میں کانٹے پڑگئے تھے۔ اب تو پیاس واقعی میری برداشت سے بھی باہر ہوتی جارہی تھی۔ پچھلے ایک آدھ گھنٹے کے دوران میں نے جو طویل زور آزمائی کی تھی اور اس کے بعد سے جس طرح پُرمشقت انداز میں ہم تقریباً رینگ رینگ کر آگے بڑھ رہے تھے' اس سے میری پیاس بھڑک اٹھی تھی۔ بھوک الگ ستارہی تھی۔ بار بار میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگتا۔ ایک بار مجھے نواب زادی کا خیال آیا جس نے بڑے تھرموس میں بچا ہوا پانی سنبھال کر رکھ لیا تھا۔ معلوم نہیں اسے پینا نصیب بھی ہوا تھا یا نہیں۔

تقریباً آدھا راستہ طے کرکے غلام حسین ہمت ہار گیا اور زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ اس کے حلق سے اب جو آواز نکل رہی تھی وہ سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی لیکن اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی "میں اب ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔" وہ ہانپتے ہوئے بولا "میں تو اب یہیں لیٹ کر انتظار کروں گا اور جو کچھ قسمت میں ہوا وہ بھگتوں گا۔ تم اپنا سفر جاری رکھو دوست ... اور ہاں۔ کم از کم مجھے اپنا نام تو بتاتے جاؤ۔ میں نے ابھی تک تمہارا نام ہی نہیں پوچھا۔"

"فضل ہے میرا نام" پیاس کی شدت سے الفاظ گویا میرے حلق میں خراشیں سی ڈالتے ہوئے برآمد ہوئے "اور میں تمہیں یہاں چھوڑ کر ہرگز نہیں جاؤں گا۔ خواہ مجھے تم کو بازوؤں پر اٹھا کر سیدھے کھڑے ہوکر چلنا پڑے۔"

"بیکار باتیں مت کرو۔" اس کے چیختے ہوئے ہونٹ تھرتھرائے "اب تو باقی فاصلہ اسی طرح چلتے ہوئے بھی خیریت سے طے ہوجائے تو یہ خدا کا خاص ہی کرم ہوگا۔ اب تو پہاڑیاں قریب ہی نظر آرہی ہیں۔ تم سیدھے کھڑے ہونے کا رسک ہرگز مت لینا۔ کسی بھی لمحے کسی ڈاکو کی نظر پڑسکتی ہے۔ میں تو اسی پر حیران ہوں کہ ابھی تک زمین پر اس طرح حرکت کرتے ہوئے بھی ہم ان کی نظر میں کیوں نہیں آئے۔ ڈاکوؤں کی نظر تو بہت تیز ہوتی ہے۔"

"ہم یہاں تک خیریت سے پہنچ گئے' اس کے باوجود تم مایوس ہورہے ہو۔" میں نے اس کا سر سہلاتے ہوئے کہا "مشکل مراحل

تو ہم نے سر کر لیے ہیں۔ اٹھو... بس تھوڑی ہمت اور کرو۔ تم کیسے انقلابی ہو؟ میرا تو خیال تھا انقلابی کی روح بڑی طاقتور اور اس کی قوتِ ارادی بہت مضبوط ہوتی ہوگی۔"

"میرے دماغ سے انقلاب .... سیاست... سب کچھ نکل چکا ہے۔ میں ہر چیز سے تائب ہو چکا ہوں۔ میں تو شاید اس وقت زندگی سے بھی تائب ہو چکا ہوں۔ مجھے اب زندگی سے کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی... میں یہیں لیٹ کر آرام و سکون سے مر جانا چاہتا ہوں۔ خدا حافظ افضل، میرے دوست! کاش تم سے کچھ اچھے حالات میں ملاقات ہوئی ہوتی۔"

اس نے یوں آنکھیں بند کر لیں جیسے اسے یقین ہو کہ فرشتۂ اجل اس کے سرہانے پہنچ چکا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ذرا زور سے جھٹکا دیا تو اسے آنکھیں کھولنا پڑیں۔

"بکواس مت کرو۔" میں نے اسے ڈانٹا "اگر تم سے نہیں چلا جا رہا تو میری پیٹھ پر سوار ہو جاؤ۔ میں تمہیں لے چلوں گا بودے قسم کے انقلابی!"

"نہیں ... اب مجھے اپنی جان پر اتنا بھی بوجھ مت بناؤ"

آخر کار وہ کراہ کر ایک بار پھر اٹھ بیٹھا۔ میرے اصرار کے باوجود وہ میری پیٹھ پر سوار نہیں ہوا اور ایک بار پھر پہلے کی طرح میرے ساتھ گھسٹنے لگا۔

مزید کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد زمین یکدم ہی کچھ زیادہ نشیبی سی ہو گئی۔ ہم اس نشیب میں اتر گئے۔ وہاں مٹی نم تھی اور مجھے پانی کی "خوشبو" بھی محسوس ہوئی۔ پھر سامنے نہایت خفیف سی جھلملاہٹ دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ ایک بہت بڑی کڑاہی سے مشابہ اس نشیبی حصے کے مرکز میں چھوٹا سا ایک چشمہ موجود تھا۔

ایک لمحے کے لیے میں بالکل دم بخود سا ہو گیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ یہ دستِ غیب کی کیسی عجیب مہربانی تھی کہ ہم قطعی لاعلمی میں، قطعی غیر ارادی طور پر چشمے پر آ پہنچے تھے۔ مجھے گمان تک نہیں تھا کہ میں نے دتّہ تما گزرگاہ تک پہنچنے کے لیے جو سمت منتخب کی ہے اس کے راستے میں چشمہ بھی پڑتا ہوگا۔

مجھے ایک اور خیال نے بھی حیران کر دیا تھا۔ وہ جمیماں کا خیال تھا۔ میں یہاں تک کا فاصلہ طے کر کے آیا تھا اور مجھے ہی معلوم تھا کہ یہ فاصلہ میں نے کس طرح طے کیا تھا۔ جمیماں بکری کی گندی کھال جسم پر لپیٹ کر، گردن پر بکری کی سری باندھ کر یہاں تک آئی تھی اور پھر پانی سے بھرا تھرموس پیٹ پر باندھ کر واپس بھی گئی تھی۔ کیا کوئی اس کے اس احسان کا صلہ دے سکتا تھا؟ کیا کوئی اس "گندی عورت" کی جرأت و ہمت کی داد دینے کے لیے الفاظ تلاش کر سکتا تھا؟

میں غلام حسین کو تیزی سے آگے لپکتے دیکھ کر اپنے خیالات کی دنیا سے باہر آیا۔ غلام حسین کو ذرا تاخیر سے پانی نظر آیا تھا اور اس کے جسم میں گویا زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی تھی۔ وہ چوپایوں کی طرح پانی تک پہنچا اور سنبھل نہ سکا۔ غڑاپ سے منہ کے بل پانی میں گر گیا۔

وہ سنبھل کر اٹھ گیا لیکن چوپایوں ہی کی طرح کھڑے کھڑے پانی سے منہ لگا کر پینے لگا۔ میں بھی اس کے قریب پہنچ کر اسی طرح پانی پینے لگا۔ میرے ہاتھ تقریباً کہنیوں تک پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

وہ میری زندگی کا عجیب ہی تجربہ تھا۔ برسوں بعد شاید مجھے پانی اتنا لذیذ محسوس ہوا تھا۔ ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال بھی نہیں رہا تھا کہ پانی گندا یا خراب تو نہیں۔ اس میں کوئی آمیزش یا آلودگی تو نہیں۔

غلام حسین نے زیادہ پانی نہیں پیا۔ چند سیکنڈ ہی شڑپ شڑپ اور غڑپ غڑپ کرنے کے بعد وہ پیچھے ہٹ کر چشمے کے کنارے چت لیٹ گیا۔ وہ آنکھیں بند کیے ہانپ رہا تھا۔ میں نے پانی سے منہ نہیں ہٹایا۔ وہ گویا آبِ حیات تھا جو گھونٹ گھونٹ میرے معدے میں اتر رہا تھا اور رگ و پے میں نئی زندگی کی لہر دوڑ رہی تھی۔

اسی دوران ایک اور احساس نے مجھے حیران کر دیا۔ مجھ پر انکشاف ہوا کہ اس وقت اس طرح پانی پینے میں مجھے بڑا لطف آ رہا تھا۔ اس انکشاف پر مجھے دل ہی دل میں حیرت کے ساتھ شرمندگی بھی ہوئی۔ کہیں اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ ہر انسان کے اندر ایک درندہ چھپا ہوتا ہے جو مختلف مواقع پر مختلف انداز سے سامنے آسکتا ہے اور اپنی جبلت کا اظہار کر سکتا ہے۔

گھپ اندھیرے میں چوپایوں کی طرح پانی پیتے ہوئے مجھے ان فائیو اسٹار ہوٹلوں کا بھی خیال آیا جہاں میری نشست و برخاست رہتی تھی۔ میرے لیے ٹشو پیپر میں لپٹا ہوا اور اسٹرلائزڈ یعنی کھولتے پانی سے جراثیم سے پاک کیا گیا گلاس آتا تھا جس میں میں فلٹر شدہ پانی پیتا تھا۔ فائیو اسٹار ہوٹل میں عموماً پانی کے لیے فلٹر پلانٹ بھی لگا ہوتا ہے۔ میری جو کوٹھی تباہ ہو چکی تھی اس میں بھی فلٹر پلانٹ موجود تھا۔

لاہور میں پانی ٹیوب ویلوں کے ذریعے سپلائی ہوتا ہے۔ زمین کا پانی میٹھا ہوتا ہے لیکن ایک بار میں نے ایک رسالے میں سائنسی رپورٹ پڑھی کہ زمین کا پانی قدرتی طور پر فلٹر شدہ تو ہوتا ہے لیکن پینے کے لیے بہتر ہوتا ہے کہ اسے ایک بار پھر فلٹر کرلیا جائے۔ چنانچہ میں نے گھر میں نصب کرانے کے لیے چھوٹا سا ایک فلٹر پلانٹ جرمنی سے منگوایا تھا۔

مجھے ان سارے انتظامات اور اہتمام کے بارے میں سوچتے ہوئے پھر اپنی موجودہ حالت پر غور کرتے ہوئے ہنسی آگئی۔ اللہ اللہ کیا تضاد تھا! کیسا فرق تھا!

بہت شدید پیاس میں زیادہ پانی پی جانا اکثر نقصان دہ ہوتا ہے لیکن اس وقت مجھے اس بات کی بھی پروا نہیں تھی۔ میں پانی پیتا ہی چلا گیا حتیٰ کہ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میرے معدے کی جگہ

ایک بڑی سی مشک نے لے لی ہے۔

آخر کار جب پانی حلق کے راستے اُلٹ کر واپس آنے لگا تب میں نے پینا بند کیا اور غلام حسین ہی کی طرح چشمے کے کنارے چت لیٹ گیا۔ نہ جانے کیوں اس وقت میرا کسی بیل کی طرح ڈکرانے کو جی چاہ رہا تھا۔

آخر میں نے دل ہی دل میں خود ہی اپنے آپ کو ڈانٹا۔ اب ایسی بھی کیا حیوانی جبلت کہ انسان کا ڈکرانے کو ہی دل چاہنے لگے۔ مجھے انسانی کھال میں ہی رہنا چاہیے تھا۔ چند لمحے بعد میں نے اپنی حالت بہتر محسوس کی تو میں اٹھ بیٹھا۔

چشمے سے مزید استفادہ کرنے کے لیے میں نے ہاتھ منہ اور پاؤں اچھی طرح دھوئے حالانکہ مجھے معلوم تھا اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا۔ چند منٹ بعد پھر وہی حالت ہو جائے گی لیکن اس سے طبیعت میں بڑی تازگی اور فرحت آگئی۔

لیکن اس کام سے فارغ ہو کر جب میں نے از سرِ نو اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو وہ تازگی اور فرحت فوراً رخصت ہو گئی۔ قریب ترین پہاڑی جو درّہ نما راستے کے بھی قریب ہی تھی، ایک بہت بڑے ہیولے کی طرح دکھائی دے رہی تھی اور اس کی بلندی پر چھوٹا سا ایک اور ہیولا دکھائی دے رہا تھا۔

وہ ٹرائی پوڈ یعنی تین ٹانگوں والے اسٹینڈ پر نصب ایک مشین گن کا ہیولا تھا لیکن اس کے عقب میں کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ رات کے سناٹے اور تاریکی میں اس قسم کی چیزوں کے ہیولے زیادہ خوف ناک سے دکھائی دیتے ہیں۔ فائرنگ اس وقت بالکل بند تھی۔ معلوم نہیں ڈاکو اس وقت پہاڑیوں کے عقب میں کیا کر رہے تھے اور کیا حکمتِ عملی اختیار کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔

مجھے یہ بھی اندیشہ تھا کہ کہیں انہوں نے پہاڑیوں سے اترنا شروع نہ کر دیا ہو۔ اگر انہوں نے اب مکان کی طرف پیش قدمی کا فیصلہ کر لیا تھا تو واقعی راستے میں ان سے مڈبھیڑ کا شدید خطرہ تھا۔

میں نے غلام حسین کو اشارہ کیا اور ہم نے ایک بار پھر چوپایوں کی طرح سفر شروع کر دیا۔ میں تو پانی پی کر اپنے آپ کو کافی تازہ دم محسوس کر رہا تھا لیکن غلام حسین کچھ سست پڑ گیا تھا تاہم وہ میرا ساتھ دینے کی حتی الامکان کوشش کر رہا تھا۔

غنیمت یہ تھا کہ جوں جوں ہم پہاڑی کے نزدیک ہوتے جا رہے تھے، راستے میں جھاڑیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کی وجہ سے ملگجے اندھیرے میں ہمارے دیکھ لیے جانے کا امکان ذرا کم ہو رہا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ پہلے ہم پہاڑی کے دامن میں پہنچیں پھر اس سے گردنیم دائرے میں چکر کاٹ کر درّہ نما راستے تک پہنچیں۔ اس صورت میں ہمیں کم از کم ایک طرف سے پہاڑی کی اوٹ میسّر رہتی۔

میرے لیے یہ بات خاصی حیرت کا باعث بنی کہ ہم خیر و عافیت سے پہاڑی کے قریب پہنچ گئے۔ اس دوران سکوت ہی طاری رہا۔

میں نے مُڑ کر مکان کی طرف دیکھا۔ اس کی چار دیواری میں نارنجی سی روشنی رقص کرتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ مکان میں بدستور آگ لگی ہوئی تھی لیکن زیادہ نہیں پھیلی تھی۔ شاید بیچ بیچ میں مٹی کی بھاری بھرکم دیواروں نے آگ کا راستہ روک لیا تھا۔

مکان کے اندر کا منظر تو ظاہر ہے ہم نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن احساس یہی ہو رہا تھا کہ اندر کسی قسم کی نقل و حرکت نہیں ہو رہی تھی۔ جہاں ہم پہنچ چکے تھے، اس زاویے سے مجھے ایک جگہ سے مکان کی چار دیواری بھی ٹوٹی ہوئی نظر آئی لیکن شگاف زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس میں سے صرف ایک ٹوٹی چھت کا لٹکتا ہوا حصہ نظر آ رہا تھا جس پر ایک شعلہ پھڑپھڑا رہا تھا۔

ادھر پہاڑیوں پر بھی سکوت طاری تھا۔ کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ ان کے پچھلی طرف ڈاکو اوپر ہی چڑھے ہوئے تھے یا اتر آئے تھے۔ ابھی تک کوئی ڈاکو پہاڑی کے عقب سے نکل کر سامنے آتا بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ ان کا پُراسرار انداز مجھے زیادہ تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔ آخر وہ کمبخت کیا کر رہے تھے؟

کیا پیش قدمی کرنے کے لیے وہ صبح کا انتظار کر رہے تھے؟ مگر یہ تو ایک حماقت ہوتی۔ دن کی روشنی میں تو مکان کے ارد گرد پھیلا ہوا میدان عبور کرتے وقت وہ خود بڑا واضح ٹارگٹ بن جاتے۔ اگر مکان میں کوئی ایک کلاشنکوف بردار بھی زندہ ہوتا تو وہ چار دیواری کی آڑ میں رہتے ہوئے ان میں سے بہت سوں کو ہلاک کر سکتا تھا۔

تو پھر آخر وہ کیا کر رہے تھے؟

میں نے اس سوال میں سر کھپانا ترک کر کے غلام حسین کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور پہاڑی کے دامن میں ہی رہتے ہوئے ہم خرگوشوں کی طرح اچھلتے درّہ نما راستے کی طرف بڑھے۔

ہم اس ہموار اور نہایت کشادہ پگڈنڈی کے کافی قریب پہنچ چکے تھے جب اچانک ہی ہمیں گھوڑے کی تیز ہنہناہٹ سنائی دی۔ گھوڑا پہاڑی کے دوسرے طرف کہیں ہنہنایا تھا لیکن فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ قدرت نے ایک بار پھر ہماری مدد کی تھی۔ یہ آواز ہمارے لیے گویا خطرے سے خبردار کرنے والا سگنل ثابت ہوئی۔

ہم سے چند قدم آگے ایک جھاڑی موجود تھی۔ ہم لپک کر اس کی آڑ میں سینے کے بل لیٹ گئے۔ ہم سے یہ احتیاط بروقت ہی ہو گئی ورنہ ہم تو سیدھے پگڈنڈی کی طرف ہی جا رہے تھے۔ اگر ہم کچھ اور آگے پہنچ گئے ہوتے تو وہ درّہ ہمارے لیے درّۂ مرگ ثابت ہوتا کیونکہ دوسرے ہی لمحے بیک وقت کئی گاڑیوں کے انجن اسٹارٹ ہونے اور کئی گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں بلند ہوئیں۔

آوازیں پہاڑی کے دوسری طرف سے سنائی دی تھیں۔ چند ہی لمحے میں وہ تیزی سے قریب آگئیں اور پھر ہم نے خاصے فلمی سے انداز میں درے سے چار جیپیں اور چھ گھوڑے نمودار ہوتے

دیکھے۔ سکوتِ شب کی چادر یکدم ہی تار تار ہو گئی تھی۔

جیپیں نہایت تیز رفتاری سے گرجتی دھول اُڑاتی اور ادھر اُدھر لہراتی مکان کی طرف روانہ ہوئی تھیں اور گھوڑے بھی ان کا ساتھ دینے کی پوری پوری کوشش کر رہے تھے۔ جیپوں میں اور گھوڑوں پر سوار کئی ڈاکو طوفانی اور خالص "ڈاکوانہ" انداز میں رائفلوں اور سب مشین گنوں سے فائرنگ کر رہے تھے۔

انہوں نے محصورین کو شکست دینے کی کارروائی تو مکمل کر لی تھی۔ اب وہ شکار پر آخری وار کرنے کے لیے اچانک اور نہایت بھرپور طریقے سے آگے بڑھے تھے۔ انہوں نے درمیانہ فاصلہ بہت تیز رفتاری سے اور ایک ہی سمت سے طے کرنے کی حکمت عملی اپنائی تھی تاکہ اگر مکان میں ایک آدھ یا اس سے زیادہ کلاشنکوف بردار بھی زندہ ہوں تب بھی ڈاکوؤں کو زیادہ جانی نقصان کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

پہاڑیوں کے عقب میں اسی لیے اتنی دیر سے سکوت چھایا ہوا تھا کہ وہ سب پیچھے ہی پیچھے پہاڑیوں سے اتر کر ایک جگہ جمع ہو رہے تھے اور یکدم دھاوا بولنے کی تیاری کر رہے تھے۔ میری دھڑکنیں تو اس تصور سے تیز ہو رہی تھیں کہ اگر ہم چند لمحے پہلے پگڈنڈی کے قریب پہنچ گئے ہوتے تو ہمارا کیا انجام ہوتا؟ گو کہ ڈاکوؤں نے اپنی جیپوں کی ہیڈ لائٹس روشن نہیں کی تھیں لیکن ان کی نظر ضرور ہم پر پڑ جاتی اور اگر ہم ادھر اُدھر بھاگنے کی کوشش کرتے تب بھی بالکل اسی طرح مارے جاتے جس طرح شکاریوں کے ہاتھوں وہ جنگلی خرگوش مارے جاتے ہیں جو بے خبری میں اچانک ہی جھاڑیوں یا جھنڈوں سے نکل کر ان کے سامنے آجاتے ہیں۔ اب وہ ہم سے صرف پچیس تیس قدم کے فاصلے سے گزرے جا رہے تھے لیکن اس وقت وہ یقیناً بہت جوش میں تھے۔ ان کی تمام تر توجہ صرف مکان کی طرف تھی' اس لیے ہمارے دیکھ لیے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ویسے بھی ہم جھاڑی کی اوٹ میں تھے۔ کسی کو وہاں ہماری موجودگی کا شبہ ہوتا اور وہ ہمیں تلاش کرتا تبھی ہم کسی کی نظر میں آسکتے تھے۔

جس وقت ہم اپنا سفر طے کر رہے تھے' اس دوران ڈاکو یقیناً پہاڑیوں کے عقب میں بلندی سے اتر کر جمع ہو رہے تھے۔ شاید اسی لیے کسی کو ہماری موجودگی کا شبہ تک نہیں ہوا تھا۔ اب وہ ہمارے سامنے سے گزر گئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم نے اپنے سفر کا مشکل ترین مرحلہ سر کر لیا تھا۔

ڈاکو ہم سے خاصی دور اور مکان کے کافی قریب پہنچ چکے تو میں نے غلام حسین کو اشارہ کیا اور ہم اٹھ کر اب چوپایوں کی طرح چلنے کے بجائے رکوع کی سی حالت میں دوڑتے ہوئے پگڈنڈیوں کی طرف بڑھے۔

دتہ نما حصے میں پہنچ کر ہم رک گئے پھر محتاط انداز میں چند قدم آگے بڑھائے۔ ہم چوروں کی طرح پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔ جب ہمیں یقین ہو گیا کہ پہاڑی کے دوسری طرف کوئی موجود نہیں ہے تو ہم نے پگڈنڈی کے کنارے تیز دوڑنا شروع کر دیا۔ میں نے مڑ کر یہ بھی دیکھنے کی کوشش نہیں کی کہ ڈاکوؤں کو مکان کی طرف سے کسی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا یا نہیں۔ ہمیں تو اس وقت اپنی پڑی ہوئی تھی تاہم عقب سے فائرنگ کی آوازیں بدستور آ رہی تھیں۔

پگڈنڈی پر زیادہ اندھیرا محسوس ہو رہا تھا' اس کے باوجود ہمیں اپنا سفر آسان لگنے لگا تھا۔ ایک تو راستہ ہموار تھا' دوسرے ہمیں چوپایوں کی طرح یا خرگوشوں اور مینڈکوں کی طرح پھدک پھدک کر نہیں چلنا پڑ رہا تھا۔

جلد ہی پگڈنڈی معدوم ہو گئی۔ سمت کا کوئی احساس نہیں رہا تھا۔ چاند بھی معدوم تھا۔ میں اپنی دانست میں اسی سمت میں بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا جدھر سے بلال شیدی وغیرہ کے ساتھ بھجو میں آیا تھا حالانکہ اسی سمت میں سفر کرنا کوئی عقلمندانہ فیصلہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس وقت ہم بھجو میں تھے اور گھنٹوں ہم نے صرف ویرانوں ہی میں سفر کیا تھا اور نہ جانے کتنی مرتبہ ڈرائیور نے کس کس سمت میں گاڑی موڑی تھی۔ اب بھلا پیدل اس طرف سفر کر کے میں کہاں پہنچنے کی امید رکھ سکتا تھا؟

بہرحال ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا کہ بس چلتے رہیں اور ڈاکوؤں سے زیادہ سے زیادہ دور نکلنے کی کوشش کریں لیکن جلد ہی ہمیں سمت بدلنا پڑی۔ جس طرف ہم جا رہے تھے' ادھر تقریباً چالیس پچاس قدم آگے مجھے ایک ٹیلہ سا دکھائی دیا اور میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کیا کہ اس ٹیلے کے عقب میں کوئی موجود تھا حالانکہ ہمیں کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی' کوئی حرکت دکھائی نہیں دی تھی۔

میں نے غلام حسین کا ہاتھ پکڑا اور اس ٹیلے سے کترا کر گزرنے کے لیے یکدم دائیں طرف مڑ گیا۔ غلام حسین بے چارہ اپنے آپ کو اپنی بساط سے بڑھ کر مضبوط آدمی ثابت کرنے کی کوشش تو کر رہا تھا لیکن اس میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں تھا۔ وہ میرے ساتھ تقریباً گھسٹ رہا تھا۔

وہ میرے ساتھ رہنے اور فرار میں کامیاب ہونے کے معاملے میں اتنا زیادہ پُرجوش بھی نہیں تھا۔ قید خانے میں اس نے نہ جانے کتنا عرصہ گزارا تھا۔ اس کی روح خاصی پژمردہ تھی یا پھر شاید بات صرف یہ تھی کہ وہ بہرحال ایک عام سا آدمی تھا اور جس صورت حال سے ہم گزر رہے تھے وہ ایک عام آدمی کے لیے نہایت اعصاب شکن تھی۔

لیکن میری شدید خواہش تھی کہ وہ میرے ساتھ چلتا رہے اور اگر میں اپنی فرار کی کوششوں میں کامیاب ہو جاؤں تو وہ میرا ہم قدم ہو۔ وہ ایک اچھا آدمی معلوم ہوتا تھا اور اچھے آدمی میری کمزوری تھے۔

ہم جوگنگ کے سے انداز میں دوڑ رہے تھے۔ سمت تبدیل کر کے ہم چند قدم ہی بڑھے تھے کہ غلام حسین کا پاؤں کسی چھوٹے سے گڑھے میں آ گیا جسے میں پھلانگ چکا تھا۔ وہ لڑکھڑایا۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے نکل گیا اور وہ اوندھے منہ گر گیا۔ اس کے گرنے سے اچھی خاصی دھپ کی سی آواز پیدا ہوئی اور اس کے منہ سے زوردار کراہ بھی نکلی۔

میں نے ہڑبڑا کر مُڑ کر دیکھا۔ مجھے ٹیلے کے عقب میں ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ اور کچھ حرکت کا احساس ہوا۔ اس وقت مجھے حیرت کا جھٹکا سا لگا جب دوسرے ہی لمحے میں نے کسی جیپ کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سُنی۔ اِدھر میں غلام حسین کو کھینچ کر کھڑا کرنے میں کامیاب ہوا اور اُدھر ٹیلے کے عقب سے ایک جیپ نکل آئی۔

”غلام حسین ... جتنا تیز بھاگ سکتے ہو بھاگو۔“ میں نے سرگوشی میں کہا کیونکہ ہمارے آس پاس چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔

اس نے بھی میری طرح پنجوں کے بل بھاگنے کی کوشش کی تاکہ ہمارے قدموں کی آواز پیدا نہ ہو لیکن ہماری اس احتیاط کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ہمیں دیکھ لیا گیا تھا۔ جیپ ہمارے ہی تعاقب میں آ رہی تھی۔ اس کی ہیڈلائٹس تو روشن نہیں ہوئی تھیں لیکن ہمارے ہیولے یقیناً دیکھ لیے گئے تھے۔

میں دل ہی دل میں ڈاکوؤں کی مہارت اور تجربہ کاری کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ انہوں نے اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا تھا کہ مکان میں محصور لوگوں کے لیے بھی کوئی کمک پہنچ سکتی تھی۔ شاید کوئی اچانک ہی اس طرف آ نکلتا اور وہ بلال شیدی وغیرہ کا مددگار ہوتا یا ویسے ہی کوئی ایسا فرد یا افراد اس طرف آ جاتے جو صورتِ حال میں مداخلت کرنے کے قابل ہوتے۔

اسی لیے ڈاکوؤں نے ایک جیپ اس مقام پر بھی کھڑی کر رکھی تھی۔ یہ گویا ان کی جائے واردات کی ”سرحد“ تھی۔ انہوں نے اپنے شکاروں کے گرد جس طرح گھیرا ڈالا ہوا تھا‘ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی آ کر ان کی کارروائی میں خلل ڈالے یا ان کی یکسوئی کو متاثر کرے۔ یہ بات میری سمجھ میں آ گئی لیکن اب اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

میں بہت تیز بھاگا اور غلام حسین نے بھی ہمت کر کے میرا ساتھ دیا لیکن انجن کی غراہٹ تیز ہوئی اور وہ اس سے زیادہ تیز رفتاری سے ہمارے تعاقب میں آئی۔ اس کی ہیڈلائٹس بھی روشن ہو گئیں اور ہم دونوں روشنی میں نہا گئے۔ مجھے کچھ یوں لگا جیسے ہم دونوں سربازار عریاں ہو گئے ہیں۔

انجن کی غراہٹ سے بلند تر کسی کی گرج سنائی دی ”رک جاؤ“ اس سے آگے کچھ نہیں کہا گیا تھا لیکن ان دو لفظوں میں جو دھمکی پوشیدہ تھی میں نے اسے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر محسوس کر لیا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر فوراً رک گیا لیکن غلام حسین سے غلطی سرزد ہوئی۔ یا پھر شاید اس کی تقدیر کا اختتامی باب کچھ اسی طرح تھا کہ وہ دوڑتا چلا گیا۔

وہ چند قدم سے زیادہ نہ دوڑ سکا۔ اسٹین گن گرجی اور وہ ناہموار زمین پر بہت دور تک قلابازیاں کھاتا گیا۔ میں نے اس کے بوسیدہ لباس میں سوراخ نمودار ہوتے اور پھر انہیں خون سے رنگین ہوتے دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ساکت ہو گیا۔ یہ سب کچھ گویا سلوموشن میں ہوا تھا۔

وہ مُڑی تُڑی سی حالت میں اس طرح مجھ سے کچھ دور پڑا تھا جیسے بچوں نے کسی گڈے سے کھیلنے اور دل بھرنے کے بعد اسے توڑ پھوڑ کر پھینک دیا ہو۔ ایک طرف سے اس کا چہرہ مجھے دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا منہ اور آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ چہرہ گویا مسخ ہو کر رہ گیا تھا۔ زبان منہ سے باہر آ گئی تھی۔

میری دھڑکنیں یک لخت جیسے تھم سی گئیں۔ اس بے چارے نے تو میری رفاقت کا سہارا پا کر اپنی بساط سے بڑھ کر جدوجہد کی تھی۔ نہایت جاں گسل مرحلوں سے وہ گزر آیا تھا اور اب جبکہ بیکراں فضاؤں میں آزادی کی سانس لینے کا عمل شروع ہوتا دکھائی دے رہا تھا تو یک لخت ہی سانسوں کی ڈور کاٹ دی گئی تھی۔ یہ بہت ہی وحشیانہ مذاق تھا!

میرا جسم تختے کی طرح اکڑ کر رہ گیا تھا کیونکہ میرے خیال میں دوسرے ہی لمحے میرے جسم میں بھی گولیاں پیوست ہونے والی تھیں۔ یہ انتظار شاید ایک آدھ سیکنڈ پر ہی مشتمل رہا ہو لیکن اس کی اذیت اور طوالت کو میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس کا اندازہ بھی صرف وہی کر سکتا ہے جسے کبھی ایسا انتظار کرنے کا اتفاق ہوا ہو موت جس کے قریب سے سرگوشی کرتی ہوئی گزری ہو۔

لیکن دوسرا برسٹ نہیں مارا گیا۔ کچی زمین پر زوردار رگڑ کی آواز کے ساتھ جیپ میرے عقب میں آن رکی۔ میں نے کن انکھیوں سے پیچھے دیکھا۔ وہ یقیناً ڈاکو ہی تھے۔ ڈاکوؤں کی دوسری جیپوں کی طرح یہ بھی ایک کھلی جیپ تھی اور اس میں صرف دو اشخاص موجود تھے۔

ایک ڈرائیو کر رہا تھا‘ دوسرا اس کے برابر اسٹین گن سنبھالے بیٹھا تھا۔ جیپ رکی تو وہ دونوں ہی چھلانگ لگا کر اتر آئے اور میرے قریب آ گئے۔ اسٹین گن والا مجھے کور کیے کھڑا رہا۔ ڈرائیو کرنے والا دوڑ کر غلام حسین کے قریب پہنچا اور اس کی لاش کو سیدھا کر کے یوں اس کا چہرہ بغور دیکھنے لگا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے غلام حسین کے پاؤں میں بندھی ہوئی بھاری زنجیر کا سرا بھی ہاتھ میں اٹھا کر دیکھا۔

اس کے ہاتھوں میں گن نہیں تھی لیکن اس کی کمر کے گرد موٹے رسّے کی طرح بل کھایا ہوا ایک سیاہ کپڑا بندھا ہوا تھا۔ اس میں ایک ماؤزر اڑسا ہوا تھا۔

غلام حسین کا معائنہ کر کے وہ واپس آیا اور اپنے ساتھی سے

مخاطب ہوا "یہ تو قیدی معلوم ہوتا ہے۔"
اس کے لہجے میں یہ تاثر تو تھا جیسے وہ کہنا چاہ رہا ہو کہ ہم نے خواہ مخواہ ہی اسے مارنے کی زحمت کی لیکن لہجے میں تاسف ہرگز نہیں تھا۔ غلام حسین گویا ایک بے وقعت جانور یا کیڑا مکوڑا تھا جو اپنی غلطی یا ان کی جلد بازی سے مرگیا سو مرگیا' اس میں افسوس یا پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔

پھر اس نے خونخوار سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "تم کون ہو؟"

وہ لوگ سندھی میں بات کر رہے تھے۔ میں نے ٹوٹی پھوٹی سندھی میں جواب دیا "میں بھی قیدی ہوں۔" پھر میں نے پیچھے کی طرف اشارہ کیا "میں بھی اُدھر ڈیرے پر قید تھا۔ آپ کے ساتھیوں نے راکٹ پھینکے تو ہماری کوٹھری ٹوٹ گئی اور ہم نکل بھاگے۔"

"لیکن تمہارے پیر میں زنجیر نہیں ہے۔" اس نے مجھے گھورا۔

"میں ابھی نیا قیدی تھا۔ کل رات ہی پہنچا تھا۔ کوٹھری میں اس کے ساتھ بند تھا۔" میں نے غلام حسین کی طرف اشارہ کیا "کوٹھری میں دوسری زنجیر نہیں تھی۔ میرے صرف ہاتھ رسّی سے بندھے ہوئے تھے۔ اس نے کھولے تھے۔"

اسٹین گن والا کچھ اور قریب آگیا۔ اب وہ بھی میرے تقریباً سامنے ہی تھا۔ اس کی آنکھوں میں کسی خیال کی چمک ابھری تھی۔ ہمارے عقب میں جیپ کا انجن بدستور گھرگھرا رہا تھا اور ہیڈلائٹس آن تھیں۔

اسٹین گن والے نے کھرکھراتی آواز میں کہا "اڑے... تم قیدی ہے' ڈیرے سے بھاگا ہے۔ تم کو کچھ پتا ہے اُدھر نواب زادی کا سونا کدھر رکھا ہے؟"

"آپ لوگوں کے راکٹ پھینکنے سے پہلے تک کا تو مجھے پتا ہے۔" میں نے ادب سے جواب دیا "ڈیرے پر اندر تین چار گاڑیاں کھڑی ہیں۔ نواب زادی نے اپنی بجو سے نکلوا کر ان میں سے کسی میں رکھوایا تھا۔"

اب گویا اس بات کی تصدیق ہوگئی تھی کہ انہیں سونے کے بارے میں معلومات حاصل تھیں۔ اسٹین گن والے نے ماؤزر والے کو اشارہ کیا اور اس وقت مجھے حیرت کا ہلکا سا جھٹکا لگا جب اس نے اپنی ڈھیلی ڈھالی قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر نہایت عمدہ قسم کا ایک واکی ٹاکی نکالا اور اس کا بٹن دباتے ہوئے' ایریل باہر نکالتے ہوئے اسے منہ کے قریب لایا۔

دوسری طرف رابطہ قائم ہونے پر پہلے تو چند فائروں کی آواز سنائی دی پھر کسی کی کھردری سی آواز ابھری۔

"کیا پوزیشن ہے؟" ماؤزر والے نے پوچھا۔

"آدمی اندر کود گئے ہیں لیکن ایک آدمی کمرے میں بند ہوگیا ہے۔ اس کے ساتھ شاید عورتیں بھی ہیں۔ دیکھتے ہیں' منٹ دو منٹ میں کچھ ہو جائے گا۔ قابو میں نہیں آیا تو گرنیڈ ماریں گے۔" دوسری طرف سے جواب ملا۔

ماؤزر والا اسے شرم دلانے کے سے انداز میں بولا "اڑے.. اُدھر ڈیرے سے دو قیدی نکل کر یہاں تک پہنچ گئے' تمہیں پتا ہی نہیں چلا۔"

"کوئی بات نہیں' دفع کرو ان کو گولی مارو۔" دوسری طرف سے بے پروائی سے کہا گیا۔

"ایک کو تو مار ہی دی ہے' دوسرے کو بھی مار دیں گے۔" ماؤزر والے نے کہا "ویسے اس نے کام کی بات بتائی ہے۔ سونا اُدھر کھڑی ہوئی گاڑیوں میں کسی گاڑی میں ہے۔ پہلے اس کو قابو کرو۔"

"ٹھیک ہے" دوسری طرف سے جواب ملا اور ماؤزر والے نے واکی ٹاکی دوبارہ قمیص کے نیچے کہیں اڑس لیا۔ اس دوران اس کی نظر مسلسل مجھ پر رہی تھی۔ اس کا ماؤزر اب بھی کمر سے بندھے کپڑے میں ہی اڑسا ہوا تھا۔ اس نے اسٹین گن والے کو اشارہ کیا۔ یہ اشارۂ اجل تھا۔

اس نے گویا بہ زبانِ خموشی کہا تھا "اڑا دو اسے بھی۔"

میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ مجھ سے انہیں کیا خطرہ یا کیا پرخاش تھی؟ غلام حسین اگر جلد بازی میں ان کے ہاتھوں قتل ہو بھی گیا تھا تو اب مجھے قتل کرنے کا مقصد کیا تھا؟ اس سے وہ کون سا فائدہ حاصل کرنا چاہتے تھے؟

غلام حسین کی لاش اب بھی میری نظروں کے سامنے تھی اور میری کھوپڑی میں اس وقت سے نہایت تیزی کے ساتھ بارود کا ایک ڈھیر جمع ہو رہا تھا جب سے میں نے اسے گولیاں کھا کر گرتے دیکھا تھا۔ اس بے ضرر اور شریف آدمی کی زندگی کا سفر یوں تو رائیگاں گیا تھا لیکن میرے ساتھ ایک نئی امید کا دامن تھام کر اس نے جیسے جاں سوز مرحلے سے گزر کر آزادی حاصل کی تھی' اس کے بعد اس کا ایک حقیر جانور کی طرح مارے جانا میرے دل پر بڑی گہری خراش ڈال گیا تھا۔

ماؤزر والے نے اسٹین گن والے کو اشارہ کر کے میری موت کا حکم صادر کیا تو گویا میری کھوپڑی میں ابھرتے ہوئے بارود کے ڈھیر کو چنگاری مل گئی۔ میرے حلیے سے انہوں نے یقیناً مجھے ایک مفلوک الحال اور گیا گزرا دیہاتی ہی سمجھا ہوگا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں ہلاک کر ڈالنا ضروری سمجھا تھا۔ شاید غیر ضروری سفاکی ان کی فطرت میں شامل ہو چکی تھی۔

بہرحال اپنی لاشعوری حقارت کی وجہ سے اسٹین گن والا بے خیالی میں میرے کافی قریب آچکا تھا جتنا اسے نہیں آنا چاہیے تھا۔ اس سے پہلے کہ ٹریگر پر اس کی انگلی کا دباؤ بڑھتا' میرا ہاتھ اتنی تیزی سے گن کی نال پر پہنچا کہ وہ بروقت دیکھ نہ سکا۔

ایک ہاتھ سے گن کی نال آسمان کی طرف کرتے ہوئے میں نے اس کے پیٹ میں لات رسید کی اور دوسرے ہی لمحے گن

میرے ہاتھ میں تھی۔ ماؤزر والے نے انتہائی پھرتی سے پیچھے ہٹتے ہوئے کمر میں باندھا ہوا ماؤزر نکالنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔

شاید اس کے وہم و گمان میں بھی نہ رہا ہو کہ میں گن کے استعمال میں اتنا ماہر ہو سکتا ہوں۔ دوسرے ہی لمحے اسٹین گن گرجی اور ایک ہی برسٹ میں دونوں کا قصہ تمام ہو گیا۔ وہ دونوں اچھل کر پیچھے جا گرے اور ساکت ہو گئے۔

غلام حسین کی لاش کے قریب جا کر میں نے صرف اتنا کہا "معاف کرنا دوست۔"

اسٹین گن میں نے اس کے قریب ہی پھینک دی۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا تھا کہ اسٹین گن ساتھ ہی رکھ لوں لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا حالانکہ اس کی کوئی خاص وجہ بھی نہیں تھی۔ میں اب وہاں مزید رکنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ میں جلدی سے ڈاکوؤں کی جیپ میں بیٹھا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

میں اپنی دانست میں اب بھی اسی راستے پر چلنے کی کوشش کر رہا تھا جس سے بلال شیدی وغیرہ مجھے لائے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح کندھ کوٹ یا کشمور واپس پہنچ جاؤں لیکن اس ویرانے اور تاریکی میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ میں درحقیقت کس طرف جا رہا تھا۔

بہرحال مجھے اس کی کوئی زیادہ پروا بھی نہیں تھی۔ میرا مقصد تو کسی آبادی میں پہنچنا ہی تھا۔ کندھ کوٹ یا کشمور نہ سہی، کوئی اور شہر سہی۔ جیپ زیادہ اچھی کنڈیشن میں نہیں تھی لیکن جیپ کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ ہر حال میں بھاگتی رہتی ہے۔ کوئی بہت ہی بڑا نقص ہو جائے تب شاید رکتی ہے ورنہ یہ بڑا ساتھ دینے والی سواری ہے۔ میں اسے حتی الامکان تیز رفتاری سے بھگائے لیے جا رہا تھا۔

راستے میں، میں نے جیپ میں ذرا اِدھر اُدھر نظر ڈالی تو اگلی سیٹوں کے نیچے مجھے کینوس کا ایک بڑا سا بیگ پھنسا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے گاڑی روک کر اسے کھول کر دیکھا۔ اس میں ہینڈ گرنیڈ اور مختلف گنوں کے بہت سے میگزین بھرے ہوئے تھے۔ میں نے وہ تھیلا بھی اٹھا کر راستے میں پھینک دیا۔ میں چاہتا تھا کہ اگر اچانک کہیں قانون کے محافظوں سے سامنا ہو جائے تو میں انہیں زیادہ سے زیادہ بے ضرر حالت میں ملوں۔

کئی گھنٹے کے سفر کے بعد بھی میں ویرانے میں ہی رہا۔ حتیٰ کہ جیپ ریزرو پر لگ گئی۔ پھر ریزرو پیٹرول بھی ختم ہو گیا۔ جیپ کے پیچھے پیٹرول کا بڑا سا ایک فاضل ڈبا لگا ہوا تھا۔ اس میں تین چار گیلن پیٹرول موجود تھا۔ میں نے وہ بھی ٹینک میں انڈیل لیا اور سفر جاری رکھا۔

پیٹرول پر چلنے والی جیپیں پیٹرول بہت کھاتی ہیں۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ پرانی ساخت کی اس جیپ میں جو فاضل ڈبا میں نے انڈیلا تھا وہ بھی زیادہ دیر ساتھ نہیں دے گا۔ صبح کا اُجالا پھیل چکا تھا اور میں ابھی تک ویرانے میں ہی تھا۔ اب تو مجھے تشویش ہونے لگی تھی کہ میں اس ویرانے سے نکل بھی سکوں گا یا نہیں؟

مجھے حیرت بھی تھی کہ کیا ہمارے ملک میں اتنے طویل و عریض، غیر آباد علاقے بھی موجود تھے جن میں اتنی دیر تک اتنی تیز رفتاری سے سفر کرتے رہیں اور کسی آبادی کا نام و نشان دکھائی نہ دے۔ ٹرین یا سڑک سے سفر کرتے وقت تو احساس ہوتا تھا کہ کچھ نہ کچھ دیر کے بعد آخر کار کسی نہ کسی قسم کی آبادی کے آثار دکھائی دے ہی جاتے تھے لیکن میرے راستے میں تو ویرانے کے سوا کچھ بھی نہیں آیا تھا۔

کبھی چٹیل میدان، کبھی صحرائی سا علاقہ، کبھی جنگل، کہیں ٹیلے، کہیں برساتی جوہڑ اور نالے آتے رہے لیکن کوئی آبادی نہیں آئی۔ میں یقیناً بھٹک چکا تھا اور مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ میں کس طرف جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ میرے لیے تو یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل ہو گیا تھا کہ میں بلوچستان میں بھٹک رہا تھا یا سندھ میں۔

جس طرح کے علاقے میرے راستے میں آئے تھے ویسے دونوں ہی صوبوں میں ہو سکتے تھے۔ ایک بار تو مجھے یہ اندیشہ بھی محسوس ہوا کہ میں لاعلمی میں کسی ایسے سرحدی علاقے سے انڈیا میں داخل نہ ہو جاؤں جہاں کوئی چوکی، پہرہ، کوئی باڑھ یا حدود ظاہر کرنے والا نشان موجود نہ ہو۔ یا اگر کچھ نشانیاں موجود ہوں تو وہ میرے لیے ناقابلِ شناخت ہوں۔

بھوک سے الگ جان نکل رہی تھی۔ اب تو بار بار آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ بڑی مشکل سے میں ڈرائیونگ جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس وقت میں جہاں سے گزر رہا تھا وہ علاقہ تو نیم صحرائی سا تھا لیکن خاصا دشوار گزار تھا۔ بار بار میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگتا تو اسٹیئرنگ وھیل پر بھی قابو نہ رہتا اور جیپ بری طرح غراتے ہوئے ادھر اُدھر لہرانے لگتی۔

ایسے ہی دو ایک موقعوں پر جیپ اُلٹتے اُلٹتے بچی۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ جیپ اُلٹتی تو میں گردن یا ہاتھ پاؤں تڑوا بیٹھتا۔ اس اندیشے سے سہم کر میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر خود کو زیادہ سے زیادہ مستعد رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے ڈرائیو کر رہا تھا۔

کبھی کبھی ایک آدھ لمحے کے لیے مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا جیسے میں خواب کے عالم میں سفر کر رہا ہوں۔ وہی جیپ کی مستقل گھرر گھرر، وہی بیاباں، وہی ویرانے، وہی سکوت، وہی تنہائی۔ بس کبھی کبھی چیلوں کی آواز سنائی دے جاتی تھی، وہ بھی روح کی افسردگی اور مایوسی کو بڑھا دینے والی آواز تھی۔

میں نے گزشتہ رات جانوروں کی طرح پیٹ بھر کے جو پانی پیا تھا، وہ بھی اندر ہی اندر نہ جانے کہاں تحلیل ہو گیا تھا۔ جس طرح جیپ دھڑا دھڑ پیٹرول کو ٹھکانے لگا رہی تھی اسی طرح میرے اندر بھی گویا کوئی انجن رواں تھا جو شاید خوراک نہ ملنے کی وجہ سے پانی کو ہی دھڑا دھڑ جذب کر رہا تھا، ٹھکانے لگا رہا تھا۔ پیاس سے ایک

بار پھر میری گزشتہ رات جیسی ہی حالت تھی۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم رہی تھیں اور حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ بالکل ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے میں نے کئی دن سے پانی نہیں پیا تھا۔

میں نے جیپ کی اچھی طرح تلاشی لی۔ میرا خیال تھا کہ ڈاکوؤں کی کوئی نہ کوئی چھاگل کوئی تھرموس' بوتل یا کوئی نہ کوئی اور ایسی چیز ضرور موجود ہوگی جس میں پانی ہوگا لیکن میرے لیے یہ انکشاف بڑی حیرت کا باعث تھا کہ اس جیپ میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔

آخرکار وہی ہوا جس کے اندیشے سے میرا دل پہلے ہی ڈوب رہا تھا۔ جیپ ایک دھچکے سے ایک گڑھے سے باہر آئی اور مزید صرف چند فٹ کا فاصلہ طے کرکے اس کا انجن گھرگھرا کر خاموش ہوگیا۔ میں نے کئی بار سیلف لگایا لیکن انجن چند ایک مرتبہ گویا صرف کھانس کر رہ گیا۔ مجھے معلوم تھا' یہ کوشش فضول ہے۔ جیپ کی "رگ و پے" میں دوڑتے ہوئے اس سیال کے سوتے خشک ہوگئے تھے جو اس کے لیے عرقِ حیات تھا' جو اسے زندہ و متحرک رکھتا تھا۔ سرِدست جیپ مُردہ ہوچکی تھی۔

میں نے اسٹیئرنگ وھیل پر سر ٹکا دیا اور چند منٹ اسی طرح آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ مجھے غنودگی سی محسوس ہونے لگی لیکن مجھے معلوم تھا' یہ غنودگی میرے لیے اچھی نہیں تھی۔ میں نے اپنے آپ پر جبر کرتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور سر اٹھایا۔

میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ تاحدِ نظر وہی ویرانہ تھا۔ میں نے جو سفر کیا تھا وہ محض رائیگاں ہی گیا تھا۔ میں نے جس مقام پر ڈاکوؤں کو ہلاک کیا تھا' اگر میں وہیں کھڑا رہتا تب بھی میرے لیے کیا فرق پڑتا تھا؟ وہ بھی ایک ویرانہ تھا اور یہ بھی اک بیاباں تھا۔ وہاں بھی میرے سامنے کوئی منزل نہیں تھی اور یہاں بھی میں گم کردہ راہ مسافر تھا۔

میں جیپ سے اتر آیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کس سمت میں چلنا چاہیے۔ ہر سمت ایک ہی جیسی بے اماں دکھائی دے رہی تھی۔ سورج اب سر پر آچکا تھا اور گویا پورے جسم کو جھلسا رہا تھا۔ خصوصاً میرے چہرے اور ہاتھوں کی کھال تو گویا پک رہی تھی۔ سورج سر پر تھا تو یہ اندازہ کرنا بھی مشکل ہوگیا تھا کہ مشرق کدھر تھا اور مغرب کدھر۔

چند لمحے کے تذبذب کے بعد آخرکار میں اندازاً مغرب کی طرف چل دیا۔ میں تقریباً ایک گھنٹا چلتا رہا۔ اس دوران کئی بار میری آنکھوں کے سامنے رنگ برنگے دائرے لہرائے اور سب کچھ میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ میں لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچا۔ میں نے اپنی یوگا کی مشقوں کو کام میں لانے کی بہت کوششیں کیں لیکن صعوبتوں کا بوجھ اتنا زیادہ تھا کہ جسم اور روح ایک دوسرے کی کچھ خاص مدد نہیں کر پا رہے تھے۔

میں نے اپنی قوتِ ارادی سے کام لینے کی انتہائی کوشش کی۔ اس کے بعد میرا حال کچھ عجیب ہی ہوگیا۔ میرا ذہن گویا میرے جسم کے ساتھ نہ رہا۔ میں اس ویرانے میں تیز تیز چلا جارہا تھا لیکن مجھے واضح طور پر احساس نہیں تھا کہ میں چل رہا ہوں۔ میرا ذہن گویا زمین اور آسمان کے درمیان کہیں معلق تھا جبکہ میرا جسم مشینی انداز میں حرکت کیے جارہا تھا۔

مجھے وقت گزرنے کا احساس نہیں تھا اور نہ ہی یہ اندازہ تھا کہ میں نے کتنا فاصلہ طے کرلیا تھا۔ لاشعور میں کہیں بس یہ احساس بیٹھا ہوا تھا کہ میرے اردگرد بیکراں ویرانہ پھیلا ہوا تھا اور مجھے اس کو عبور کرنا تھا۔ میرا جسم گویا ایک مشین تھی جسے کسی کمپیوٹر نے پروگرام فیڈ کردیا تھا اور وہ بس چلتی جارہی تھی۔ میرے احساسات گویا مرچکے تھے۔

جسم آخر جسم ہی تھا اور وہ بھی انسانی جسم' کہاں تک ساتھ دیتا۔ مجھے احساس ہوا کہ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے اندر بھی روشنی دم توڑنے لگی تھی۔ میں اپنے اندر قوتِ ارادی کی جو مصنوعی برقی رو دوڑائے ہوئے تھا' وہ آخرکار جواب دینے لگی تھی۔ ویرانہ گویا جوں کا توں میرے گرد موجود تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ میں دو قدم بڑھتا تھا تو ویرانہ چار قدم مزید پھیل جاتا تھا۔

پیٹ میں بھوک کا عفریت پنجے گاڑے ہوئے تھا اور پیاس کی شدت سے حلق کچھ ایسا ہورہا تھا جیسے وہ خشک لکڑی سے بنا ہو اور کوئی مسلسل اس پر ریگ مال رگڑ رہا ہو۔

آخرکار جسم نے مشین کی طرح حرکت کرتے رہنے سے انکار کردیا' قوتِ ارادی نے ساتھ چھوڑ دیا' قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ اس وقت مجھے سامنے ہی ایک خاصی کشادہ پگڈنڈی دکھائی دینے لگی تھی جس پر گاڑیوں کے پہیوں' جانوروں کے کھروں اور انسانی قدموں کے نشانات دکھائی دے رہے تھے۔

وہ پگڈنڈی اس ویرانے کو کراس کررہی تھی جس میں میرا سفر جاری تھا۔ اچانک ہی اس پر میری نظر پڑی تھی۔ ظاہر تھا کہ وہ پگڈنڈی کسی نہ کسی آبادی کی طرف سے کسی دوسری آبادی کی طرف جارہی تھی۔ ایک لاحاصل سے سفر کے بعد مجھے پہلی بار کسی آبادی کی طرف اشارہ کرتی ہوئی کوئی چیز دکھائی دی تھی لیکن مجھ میں اس تک پہنچنے کی بھی سکت نہیں تھی۔

میں نے بڑی کوشش کی کہ مزید چند قدم کا فاصلہ طے کرکے پگڈنڈی تک پہنچ جاؤں اور اس پر دائیں یا بائیں کسی بھی سمت میں ایک نئی امید کے سہارے سفر جاری رکھ سکوں لیکن جسم نے ساتھ نہ دیا۔ مزید ستم یہ ہوا کہ مجھے ایک پتھر سے ہلکی سی ٹھوکر لگ گئی۔ یوں گویا کسی گرتی ہوئی دیوار کو ایک غیبی ہاتھ نے ٹھوکا دے دیا۔

میں اوندھے منہ گرا اور پھر اٹھ نہ سکا۔ گرنے کے بعد بھی مجھے کافی دیر تک ہوش رہا اور میں اٹھنے کی کوشش کرتا رہا۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ جسم اپنی جگہ سے جنبش نہیں کررہا تھا لیکن پھر

بھی میں اپنی دانست میں کھڑا ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔

آخر کار مجھ میں اس بے حرکت جدوجہد کی بھی سکت نہ رہی۔ لیٹے رہنا مجھے بھلا محسوس ہونے لگا۔ میرے شکستہ جسم اور کچلے ہوئے سے اعصاب کو بے حد سکون سا ملا۔ درحقیقت تو میں پہلے ہی بے حس و حرکت تھا لیکن اب میں نے ذہنی طور پر بھی اپنے آپ کو بے حس و حرکت تسلیم کرلیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ مجھے گویا ایک مُدّت کے بعد ذرا آرام کا احساس ہوا اور یک بیک ہی مجھے گہری نیند آگئی۔ معلوم نہیں وہ نیند تھی یا بے ہوشی لیکن اس وقت وہ مجھے ایک انمول راحت کی پیامبر محسوس ہوئی۔

وہ بے خبری کا وقفہ نہایت خوب صورت اور تسکین بخش تھا کیونکہ اس کے دوران ایک تو اذیتوں کا احساس مٹ گیا' دوسرے اس دوران مجھے خوب صورت اور دل فریب خواب آتے رہے۔ پریاں مجھے جھولا جُھلاتی رہیں اور خوب صورت کنیزیں میرے لیے اپنے کندھوں پر خوب صورت بلوری صراحیاں لاتی رہیں جن میں یخ بستہ آبِ شیریں بھرا ہوا تھا۔ میں دھڑا دھڑ انہیں خالی کرکے ایک طرف پھینکتا رہا۔

مجھے نہ جانے کتنی دیر بعد احساس ہوا کہ خواب کچھ ایسے خوب صورت نہیں رہے تھے۔ پریاں مجھے جھولا جُھلانے کے بجائے شاید اِدھراُدھر دھکیل رہی تھیں۔ کوئی ایک طرف دھکا دیتی تھی تو دوسری فوراً واپس دھکیل دیتی تھی۔

پھر وہ پریاں بھی غائب ہوگئیں۔ بس کوئی غیبی ہاتھ تھا جو مجھے جھٹکے دیے جارہا تھا۔ ٹھنڈے میٹھے پانی کی صراحیاں لے کر آنے والی کنیزیں بھی نہ جانے کہاں چلی گئیں۔ کوئی غیبی ہاتھ ہی مجھے پانی پلانے کے بجائے میرے منہ پر پھینکنے لگا۔

آخر کار یہ سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ میں گویا کسی تاریک دلدل کی تہ میں بہت دیر تک پڑا رہا۔ پھر دھیرے دھیرے خود بخود اوپر آنے لگا۔ جسم اب بھی دھیرے دھیرے ہلکورے لے رہا تھا' کبھی کبھی نارنجی اور کندنی سی روشنی میری آنکھوں میں چبھنے لگتی۔

پھر اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ میری آنکھیں تو کھلی ہوئی تھیں اور میں کسی ایسی چیز میں لیٹا ہوا تھا جو مسلسل ہل رہی تھی۔ سورج ڈوبنے کو تھا اور اس کی الوداعی کرنیں میری آنکھوں میں چبھ رہی تھیں۔

میں نے گردن ہلا کر اِدھراُدھر دیکھنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ میں کچھ اس قسم کی ایک گھوڑا گاڑی میں لیٹا ہوا تھا جیسی پنجاب میں گجر دودھ کے ڈرم ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لیے استعمال کرتے ہیں تاہم یہ اس سے کچھ چھوٹی اور ہلکی تھی' اس میں گھوڑے کی جگہ خچر جتا ہوا تھا۔

تقریباً میرے ہی جیسے میلے کپڑوں میں ایک دیہاتی اگلے تختے پر گٹھری کی طرح بیٹھا تھا اور خچر کو ہانک رہا تھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ میں خشک گھاس پھونس کے آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ عیاشی کی انتہا یہ تھی کہ میرے سرہانے بھی تکیے کی کمی پوری کرنے کے لیے ایک میلی کچیلی سی گدڑی رکھی ہوئی تھی۔

میرا چہرہ پانی سے تر تھا' گریبان بھی نم محسوس ہورہا تھا۔ یقیناً میرے چہرے پر پانی چھڑکا گیا تھا اور شاید مجھے پلانے کی بھی کوشش کی گئی تھی کیونکہ میرے منہ میں اب پہلے جیسی انتہا کی خشکی نہیں تھی۔ شاید اس شخص نے مجھے ہوش میں لانے کی تدبیریں کی تھیں لیکن اس وقت میں ہوش میں نہیں آیا تھا۔ شاید اس کے خاصی دیر بعد میری آنکھیں کھلی تھیں۔

گھوڑا گاڑی میں کوئی سامان نہیں تھا۔ گاڑی چلانے والے کا چہرہ ایک طرف سے میں دیکھ سکتا تھا۔ وہ مضبوط کاٹھی اور پکی عمر کا ایک سیدھا سادا سا دیہاتی معلوم ہوتا تھا۔ حلیہ ویسا ہی تھا جیسا عموماً غریب اور سیدھے سادے دیہاتیوں کا ہوتا ہے۔ چہرے پر خشخشی سی داڑھی تھی۔

میں گردن موڑے اس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس نے بھی گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ وہ شاید کسی گہری سوچ میں تھا۔ مجھے اچانک ہوش میں دیکھ کر کچھ گڑبڑا سا گیا۔ خچر ڈُلکی چل رہا تھا۔ اس نے اس کی رفتار اور بھی کم کردی اور میری طرف کو ذرا ترچھا سا ہوکر بیٹھ گیا۔

"اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" اس نے سوال سندھی میں کیا تھا۔

"ہوش میں آگیا ہوں... یہی بڑی بات ہے۔" میں نے ٹوٹی پھوٹی سندھی میں جواب دیا جس میں اُردو کی زیادہ آمیزش تھی "تمہاری بڑی مہربانی کہ تم نے راستے میں سے مجھے اٹھالیا۔"

اب وہ بھی تقریباً اُردو میں بات کرنے لگا "ہاں ادا... میں نے جب تم کو راستے میں پڑے دیکھا تو پہلے تو میں ڈر گیا۔ میں نے سوچا پتا نہیں کیا معاملہ ہے۔ مجھے اس چکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔ غریب آدمی ہوں بابا.... تم کو پتا ہے غریب آدمی ویسے ہی ہر بات سے ڈرتا ہے۔ میں آگے نکل گیا تھا لیکن پھر اللہ کا خیال آگیا۔ آخر مسلمان ہوں' دل نہیں مانا کہ کسی کو مصیبت میں دیکھ کر ایسے گزر جاؤں۔"

وہ مشفقانہ سے انداز میں مسکرایا۔ وہ ذرا بھی خوب صورت نہیں تھا لیکن کم از کم مجھے اس لمحے بہت خوب صورت دکھائی دیا۔ وہ اپنی میلی اور مختصر پگڑی درست کرتے ہوئے بولا۔

"تم لمبے چوڑے' وزنی آدمی ہو اور بے ہوشی میں آدمی کا وزن کچھ اور بھی زیادہ لگتا ہے۔ میرے لیے تم کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالنا بہت مشکل کام تھا.. بہت ہی مشکل۔ مگر بس اچھے کاموں میں اللہ آدمی کی مدد کرتا ہے۔"

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر سرسری سے لہجے میں بولا "تم کون ہو؟ کیوں بے ہوش پڑے تھے؟ وہاں کیسے پہنچے تھے؟"

"یہ بہت لمبی کہانی ہے پھر کسی وقت سہی۔" میں نے گاڑی میں لگا ہوا ایک بانس پکڑ کر اٹھنے کی کوشش کی۔ میں اپنے آپ کو

برسوں کا بیمار محسوس کر رہا تھا اور اپنی آواز مجھ سے پہچانی نہیں جا رہی تھی۔

میں اٹھ کر بیٹھنے میں کامیاب ہوگیا تو پیٹ میں جیسے کوئی خوابیدہ عفریت بیدار ہوگیا۔ میں نے ساری شرم اور تکلف کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا "یہ بتاؤ تمہارے پاس کھانے کو کچھ ہے؟"

"ہاں ہاں" اس نے لگام ڈھیلی چھوڑتے ہوئے مستعدی سے کہا "میں اپنے لیے روٹی لے کر گیا تھا لیکن مجھے راستے میں وقت ہی نہیں ملا اور بھوک بھی کوئی خاص نہیں تھی۔ میں نے سوچا' رات کو گھر واپس پہنچ کر ہی کھاؤں گا۔ لو یہ تم کھالو۔"

اس نے گاڑی کے ایک کونے سے ایک پوٹلی برآمد کی اور میری طرف بڑھائی۔ میں نے بے تابی سے اسے کھولا۔ اس میں موٹی موٹی' مڑی تڑی اور ذرا سوکھی سی دو روٹیاں تھیں۔ ان کے درمیان کٹا ہوا کچھ پیاز اور تھوڑا سا اچار تھا۔

میں بتا نہیں سکتا کہ پہلا نوالہ منہ میں ڈالنا مجھے کتنا لذت بخش عمل محسوس ہوا لیکن خشک منہ اور خشک حلق میں وہ خشک سا کھانا اٹکنے لگا۔ میرے محسن نے گویا میری مشکل کو سمجھتے ہوئے مجھے ایک چھوٹی سی مشک سے المونیم کے ایک پچکے ہوئے سے گلاس میں پانی نکال کر دیا اور بولا "چباتے جاؤ اور ایک ایک گھونٹ پانی کے ساتھ نگلتے جاؤ۔"

میں نے اس کے مشورے پر عمل کیا اور جلد ہی میرے نظامِ ہضم کے وہ غدود بھی رطوبتیں بنانے لگے جو اپنا کام بھول چکے تھے۔ چند منٹ میں ہی دونوں روٹیاں میرے پیٹ میں پہنچ گئیں۔ پیاز' اچار کچھ بھی نہ بچا۔ اس وقت اگر دو چار ویسی روٹیاں اور ہوتیں تو میں وہ بھی چٹ کر جاتا۔

وہ شخص معذرت خواہانہ سے لہجے میں بولا "میرے پاس کوئی دال' سالن وغیرہ نہیں تھا ورنہ ضرور پیش کرتا۔ ہم لوگ تو زیادہ تر پیاز اور اچار سے ہی روٹی کھاتے ہیں۔ سالن ہمارے گھروں میں کبھی کبھار ہی پکتا ہے۔"

گویا ایک عام دیہاتی کا آج بھی وہی حال تھا جو میرے بچپن میں ہوا کرتا تھا۔ وہ آج بھی مفلس' قلاش اور کچلا ہوا تھا مگر محبت' انسانیت اور اللہ کا تشکر آج بھی اسی میں تھا۔ میں نے پکے مکانوں میں' زندگی کی تمام آسائشوں کے درمیان بیٹھے ہوئے لوگوں کو بُری بُری شکلیں بنا کر کہتے سنا تھا' اس ملک نے ہمیں کیا دیا ہے۔ ہمیں یہاں مسائل کے علاوہ کیا ملا ہے۔ ہر جگہ ہماری حق تلفی ہو رہی ہے' وغیرہ وغیرہ۔

مگر جو بے چارے ہر اعتبار سے واقعی کچلے' مسلے ہوئے اور محروم لوگ تھے وہ بات بات پر خدا کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتے تھے۔ وہ کسی سے کچھ نہیں مانگتے تھے' کسی سے کچھ نہیں چھینتے تھے' کسی کا گھر نہیں جلاتے تھے' کسی کو آگ میں نہیں جھونکتے تھے۔

میرے پیٹ کے دوزخ کو ایندھن مل گیا تھا تو رگ و پے میں زندگی کی حرارت دوڑ گئی تھی۔ آنکھوں میں روانی سی آگئی تھی اور نظر گویا تیز ہوگئی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو مجھے ایک طرف نہر یا دریا کا پشتہ سا نظر آیا جو بہت دور تک جا رہا تھا۔ دیوارِ چین کی طرح دونوں طرف ہی اس کا کوئی سرا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہم اس سے بہت دور رہتے ہوئے اس کے متوازی ہی سفر کر رہے تھے۔ اس علاقے میں سبزے کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔

"بھائی! تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے ادھر اُدھر کا جائزہ لینے کے بعد پوچھا۔

"حاتو" اس نے جواب دیا۔

"بھائی حاتو! یہ کون سا علاقہ ہے اور ہم اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ کچے کا علاقہ ہے اور ہم اس وقت کیٹی مراد جا رہے ہیں۔ میں وہاں رہتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"خدا کی پناہ!" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ یہ میں کہاں سے کہاں نکل آیا تھا۔ اگر میری تمام تر سخت جانی کے باوجود میری حالت خراب تھی تو اس میں جسم کا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں نے جیپ میں غالباً سیکڑوں میل سفر کیا تھا اور اس کے بعد پیدل بھی نہ جانے کتنا چلا تھا۔ بھٹک کر میں اس علاقے میں آنکلا تھا جس کے بارے میں' میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

حاتو' خچر کو ایک چھڑی رسید کر کے اس کی رفتار بڑھاتے ہوئے بولا "تم نے بتایا نہیں تم کون ہو' کہاں سے آئے ہو' کہاں جا رہے تھے اور تمہارے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا؟"

"میرا نام افضل ہے" میں نے ایک لمحے سوچنے کے بعد کہا "قصہ تو بہت لمبا ہے' بس یوں سمجھ لو کہ ڈاکوؤں نے مجھے کسی امیر آدمی کے دھوکے میں اغوا کر لیا تھا جبکہ میں ایک غریب سا آدمی ہوں۔ بہت دن وہ مجھے لیے اِدھر اُدھر پھرتے رہے تھے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں وہ آدمی نہیں ہوں جسے وہ اصل میں اغوا کرنا چاہتے تھے پھر جب انہیں پتا چل گیا کہ ان سے غلطی ہوگئی ہے تو انہوں نے مجھے جنگل میں ہی چھوڑ دیا۔ میں کل سے پیدل چل رہا تھا۔ بھوک' پیاس اور تھکن سے بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔"

"چہ.. چہ.. چچ" اس نے متاسفانہ سے انداز میں سر ہلایا "ادا! ڈاکوؤں نے تو ایسی زندگی خراب کی ہے کہ کیا بتائیں۔ کوئی زمانہ تھا کہ صرف امیر آدمیوں کو ڈاکوؤں سے خطرہ رہتا تھا۔ اب تو میرے جیسے کنگلے کو بھی گھر سے نکلتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ کہیں کوئی میرا خچر ہی نہ چھین لے۔ بابا! اب تو ڈاکو دیکھتے ہی نہیں ہیں کہ کوئی پیسے والا ہے یا بے چارہ سوالی ہے۔ پہلے تو بس آنکھ بند کر کے اٹھا کر لے جاتے ہیں' بعد میں پوچھتے ہیں کہ اس کے پاس یا اس کے رشتے داروں کے پاس کتنا مال ہے۔ اب تو مسجد میں نمازی تک محفوظ نہیں ہیں۔ بعض گوٹھوں میں تو ایسا بھی ہوا کہ نماز ہو رہی تھی' ڈاکو

آئے اور امام سمیت سارے نمازیوں کو اٹھا کر لے گئے۔"

حاتو نے آسمان کی طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑے، ایک ٹھنڈی سانس لی اور افسردہ لہجے میں بولا "اڑا! یہ سب قیامت کی نشانیاں ہیں۔ پہلے ڈاکوؤں کا بھی کچھ دین ایمان ہوتا تھا۔ عورت پر کبھی ظلم نہیں کرتے تھے، کوئی قرآن شریف اٹھا کر سامنے آجاتا تھا تو اسے معاف کر دیتے تھے، سیّد کو کچھ نہیں کہتے تھے اور مسجد کے سامنے تو اونچی آواز میں بات بھی نہیں کرتے تھے۔"

وہ ایک لمحے خاموش رہا۔ پھر بولا تو اس کے لہجے کی افسردگی بڑھ چکی تھی "اب تو سب کچھ بدل گیا ہے۔ گوٹھوں پر دھاوا بولتے ہیں تو سب سے پہلے خوب صورت لڑکیاں تلاش کرتے ہیں۔ قرآن کو خاطر میں نہیں لاتے۔ کوئی سیّد ہو یا کچھ اور گولیوں سے بھون ڈالتے ہیں اور مسجد کا تو میں بتا ہی چکا ہوں کہ امام سمیت نمازیوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ پتا نہیں ہمارا کیا بنے گا۔"

"فکر نہیں کرو اڑا حاتو!" میں نے ذرا آگے کھسک کر اس کے کندھے پر تھپکی دی "ظلم جب حد سے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔ انسان جب اپنے ہاتھ پاؤں اتنے پھیلا لیتے ہیں کہ دوسرے انسانوں کے لیے عذاب بن جاتے ہیں تو پھر ان کی گردنیں پکڑنے کے لیے ایک غیبی ہاتھ حرکت میں آجاتا ہے۔ جب نیچے والوں کی بادشاہی ناکارہ ہو جاتی ہے تو آسمان والے کی بادشاہی حرکت میں آتی ہے۔ آخر وہ بھی تو دنیا کا تماشا دیکھ رہا ہے نا۔"

"ہاں بھائی! آجکل تو ہم اسی امید پر زندہ ہیں۔" وہ اداسی سے بولا۔

ہم ایک گاؤں کے قریب پہنچ چکے تھے لیکن رات کے ملگجے اندھیرے میں مجھے دور سے اس کے آثار دکھائی نہیں دیے تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ابھی آسمان پر ایک تارا بھی نمودار نہیں ہوا تھا اور خود گاؤں کا یہ عالم تھا کہ کسی گھر میں شاید کوئی دیا روشن نہیں تھا، کوئی دروازہ یا کھڑکی کھلی نہیں تھی۔ کسی روزن سے روشنی کی کرن نہیں پھوٹ رہی تھی۔ گلیاں ویران تھیں۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ گلیوں میں کہیں کوئی مویشی تک بندھا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شہرِ خموشاں کا سا منظر تھا۔

لیکن جب گاڑی ایک چوڑی سی گلی میں داخل ہوئی تو دو تین آوارہ کتوں نے بھونک کر ہمارا استقبال کیا اور شہرِ خموشاں کا سکوت ٹوٹ گیا۔ حاتو نے انہیں ڈانٹا۔ وہ یقیناً حاتو کو پہچانتے تھے اور اس کا لحاظ کرتے تھے۔ اس کے "احترام" میں خاموش ہو کر ادھر اُدھر کہیں دبک گئے۔

حاتو چھڑی سے چاروں طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "دیکھ رہے ہو؟ یہ گاؤں قبرستان معلوم ہو رہا ہے۔ یہ کیٹی مراد ہے۔ ایک چھوٹا سا گاؤں سمجھ لو۔ بہت زیادہ رونق تو یہاں پہلے بھی نہیں ہوتی تھی لیکن پھر بھی زندگی کا کچھ نہ کچھ مزہ آتا تھا۔ اوطاقیں کھلتی تھیں، یار دوست کچہری کرتے تھے۔ کچہری سمجھتے ہو نا؟ محفل یا مجلس کو کہتے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"لیکن اب سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ شام ہوتی ہے تو لگتا ہے گاؤں میں جن پھر گیا ہے۔" وہ بولا "ہماری کیٹی، کچے کے علاقے کی سب سے بڑی کیٹی تھی۔ یہاں زندگی کی ساری دلچسپیاں تھیں، سارے کھیل تماشے ہوتے تھے۔ اب اگر کچھ ہوتا بھی ہے تو مغرب کی اذان سے پہلے ختم ہو جاتا ہے۔ سیلاب کے دنوں کو چھوڑ کر باقی سب دنوں میں یہاں فصلیں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ کچے کی زمین بہت زرخیز ہے لیکن ہم وڈیرا سائیں کے غلام ہیں، ان کے ہاری ہیں۔ فصلیں آتی ہیں تو ان کے آدمی لے جاتے ہیں۔ ہمیں گزر بسر کے لیے کچھ ملتا ہے تو وڈیرے کے آدمیوں کے بعد ڈاکو آجاتے ہیں۔ کسی کے پاس اگر کسی طرح چار پیسے یا زیور وغیرہ ہو جائے تو وہ ڈاکو لے جاتے ہیں۔ ہم تو بس دو وقت کی روکھی سوکھی روٹی کے لیے دن رات خون پسینہ ایک کرتے ہیں اور شاید زندگی بھر کرتے رہیں گے۔"

"فصلیں کہاں ہوتی ہیں؟ ادھر تو کوئی زرعی زمین نظر نہیں آرہی۔" میں نے آنکھیں سکیڑ کر اندھیرے میں دور تک دیکھنے کی کوشش کی۔

"زمینیں بند کے دوسری طرف ہیں۔" اس نے اشارے سے بتایا "پہلے ہم لوگ بھی عارضی سی جھونپڑیاں بنا کر اُدھر ہی رہتے تھے لیکن جب سیلاب آتا تھا تو فصلوں کے ساتھ ساتھ ہمارے گوٹھ۔۔۔ یا کیٹیاں بھی اُجڑ جاتی تھیں۔ اس لیے اب ہم لوگ اس طرف آگئے ہیں۔ اگر بند نہ ٹوٹے تو ہم لوگ اِدھر بچے رہتے ہیں۔"

میں سوچ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ کس کس حال میں لوگ زندگی گزار رہے تھے۔ اور یہ وہ لوگ تھے جو کبھی احساسِ محرومی کے نعرے لگاتے ہوئے سڑکوں پر نہیں آتے تھے۔ کبھی پریس کانفرنسیں نہیں کرتے تھے۔ بس سر جھکا کر جفاکشی اور صبر شکر کے ساتھ اپنا کام کرتے رہتے تھے، زندگی کی صعوبتیں جھیلتے رہتے تھے اور کچھ لوگ عالیشان بنگلوں اور پُر آسائش مکانوں میں بیٹھے ان کے نام پر سودے پکے کرتے رہتے تھے۔ ان بے چاروں کو علم بھی نہیں ہوتا تھا کہ ان کے نام پر ان کے دلالوں نے کیا کچھ حاصل کر لیا۔

وہ اپنی دُھن میں بولا "ویسے سائیں۔۔ یہ سیلاب بڑے کام کی چیز۔ جب بھی آتا ہے کئی سال کے لیے زمینوں کو اتنا زرخیز بنا جاتا ہے کہ ساری کسریں پوری ہو جاتی ہیں۔"

"کچے کی زمینیں ہیں کس کی؟" میں نے پوچھا۔

"کئی بڑے زمینداروں نے آپس میں بانٹ رکھی ہیں۔" حاتو نے بتایا "جیسے ہم وڈیرا سائیں مراد خان کے ہاری ہیں۔ بند کے دوسری طرف کئی ہزار ایکڑ زمین ان کی ہے۔ ہم انہی کے ہاری ہیں، اس لیے اس کیٹی کا نام بھی کیٹی مراد ہے۔"

"اور یہ مراد صاحب رہتے کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بہت سی جگہوں پر رہتے ہیں۔ نواب شاہ، حیدر آباد اور کراچی میں ان کی شاندار کوٹھیاں ہیں۔ ان کی اصل زرعی زمین تو نواب شاہ کے قریب ہے۔ یہ کچے کی زمین تو انہوں نے یونہی فالتو فنڈ میں دبا رکھی ہے۔ یہاں تو وہ دو چار سال میں ایک آدھ مرتبہ ہی آتے ہیں۔ زیادہ انتظام ان کے آدمی ہی چلاتے ہیں۔ ان کا ایک خاص آدمی ہے دلبر خان ... بس وہ سب کچھ کرتا ہے۔ وہ ہر چیز کا مالک ہے۔"

پھر وہ ادھر اُدھر دیکھ کر رازدارانہ سے انداز میں بولا "بلکہ میں نے تو سنا ہے کہ ڈاکو بھی اس کی بات مانتے ہیں۔ ویسے ڈاکو تو وڈیرا سائیں مراد خان کے آگے بھی ہاتھ جوڑتے ہیں اور اپنی سب وارداتوں میں سے ان کو حصہ بھی بھیجتے ہیں لیکن میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی۔"

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہم تو وڈیرا سائیں ہی کے آدمی ہیں اور بہت غریب ہیں۔ اس کے باوجود کبھی کبھی ڈاکو ہم کو بھی تنگ کرنے آجاتے ہیں۔ جس کے پاس کچھ ہو وہ لے جاتے ہیں۔ ہم دلبر خان کی بھی منت کرتے ہیں اور کئی مرتبہ ہم نے وڈیرا سائیں مراد خان کو بھی پیغام بھیجا لیکن انہوں نے آج تک ڈاکوؤں کو روکا نہیں۔ چلو وہ باقی دنیا میں تو جو دل چاہے کرتے پھریں لیکن کم سے کم ہم غریبوں کو تو بخش دیں۔ آخر سائیں مراد اپنی رعایا کو ڈاکوؤں سے محفوظ رکھنے کا کوئی بندوبست کیوں نہیں کرتے؟"

"میری سمجھ میں تو ایک ہی بات آتی ہے۔" میں نے ایک لمحے سوچ کر کہا "سائیں مراد چاہتے ہیں کہ آپ لوگ زیادہ سے زیادہ مجبور، ڈرے سہمے اور مالی طور پر بالکل کمزور رہیں تاکہ ہمیشہ ان کے سامنے ہاتھ جوڑتے رہیں اور کبھی بغاوت کا نہ سوچیں۔ شاید ان کا یہ خیال ہو کہ ان لوگوں پر ذرا خوشحالی آئے گی تو یہ پرپُرزے نکالنے لگیں گے۔ رسّی تڑا کر بھاگنے کی سوچنے لگیں گے۔"

"یہ تو ہمیں بھی اندازہ ہے کہ شاید وہ ایسا سوچتے ہوں۔" حاتو مُربیانہ انداز میں سرہلاتے ہوئے بولا اور تب مجھے احساس ہوا کہ یہ سیدھے سادے اور ان پڑھ سے لوگ عقل و شعور اور آگہی سے اتنے بھی محروم نہیں ہوتے جتنا سمجھا جاتا ہے۔ وہ بے چارے اپنی زبانیں خوف، مصلحت یا کسی اور وجہ سے بند رکھتے ہوں یا انہیں اپنی بات کہنے کا سلیقہ نہ آتا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ کچھ سمجھتے ہی نہیں تھے۔

باتیں ہم دونوں ایک دوسرے کی سہولت کے لیے گڈمڈ قسم کی زبان میں کر رہے تھے۔ میں آپ کی سہولت کے لیے یہ سب کچھ سیدھی اور آسان اُردو میں بیان کر رہا ہوں۔ ظاہر ہے حاتو اس طرح اُردو بولنے پر قادر نہیں تھا اور نہ ہی وہ دوسرے کردار جو مجھے آئندہ اس علاقے میں ملے اس طرح بولتے تھے لیکن ان کا مفہوم کم و بیش یہی تھا جو میں بیان کرتا جا رہا ہوں یا آئندہ کروں گا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد حاتو بولا "لیکن وڈیروں کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ جب آدمی حد سے زیادہ مجبور ہوتا ہے تب بھی رسّی تڑا کر بھاگ جاتا ہے۔ آٹے کو بھی چکی میں حد سے زیادہ پیستے رہو تو وہ جل جاتا ہے، کھانے کے قابل نہیں رہتا۔ انسانوں کو بھی ایک حد تک پیسنا چاہیے، اس سے زیادہ نہیں۔"

"ان کی سمجھ یا تجربے میں یہ بات ابھی تک آئی نہیں ہوگی یا انہیں یقین ہوگا کہ آپ لوگ کہیں جا ہی نہیں سکتے۔ آپ کے لیے فرار کا کوئی راستہ ہے بھی نہیں۔ آپ کی جڑیں یہیں ہیں اور یہیں رہیں گی۔ اس لیے بے فکری سے وہ وہی کرتے ہیں جو اُن کا دل چاہتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ مزاج بھی بن جاتا ہے۔ انسانوں کو بالکل مجبور اور محتاج کرکے ان پر حکومت کرنے میں ایک لذت ہے جو ایک بار منہ کو لگ جائے تو چھوٹتی نہیں۔"

اس دوران گاڑی ایک کچے گھر کے سامنے جارکی تھی جس کی چھت سرکنڈوں کی تھی اور اس پر توڑی والی مٹی کی بہت موٹی تہ تھوپی گئی تھی۔ گاڑی سے اترنے سے پہلے حاتو رازدارانہ سے انداز میں بولا "بھائی! میں تم سے سچی سچی بات کروں گا۔ تم مجھے مصیبت زدہ اور اچھے آدمی لگے۔ میں تمہیں باتوں باتوں میں یہاں تک لے تو آیا لیکن ایک تو میں بتا چکا ہوں کہ میں بہت ہی غریب آدمی ہوں، ویسے ہی تمہاری کوئی زیادہ مدد نہیں کرسکتا۔ دوسرے حالات بہت خراب ہیں۔ ہمیں بڑی سختی سے ہدایت ملی ہوئی ہے کہ اجنبیوں کے بارے میں بہت احتیاط کریں۔ کسی اجنبی کو گھر میں پناہ نہ دیں۔"

"کوئی بات نہیں بھائی حاتو!" میں نے جلدی سے کہا "تم نے میری جتنی مدد کی اتنی ہی بہت ہے۔ میں تمہارے ہاں پناہ نہیں لوں گا۔ اللہ کی زمین بہت بڑی ہے اور میں اس وقت گویا اللہ کی زمین ہی دیکھنے کے لیے نکلا ہوا ہوں۔ میں آگے چلا جاؤں گا۔"

"نہیں نہیں۔ تم سمجھے نہیں۔" وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے ذرا شرمندگی سے بولا "حالات کتنے ہی خراب سہی لیکن ہم غریب لوگ دروازے پر آئے مہمان کو دھکا نہیں دے سکتے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم بڑی خوشی سے آج رات میرے گھر میں ٹھہرو لیکن صبح سورج نکلنے سے پہلے رخصت ہو جانا۔ کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ تم میرے ہاں ٹھہرے تھے۔"

"نہیں، اس کی بھی ضرورت نہیں۔ تم نے میرے لیے بڑی تکلیف اٹھائی۔ میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ میں اب چلتا ہوں۔" میں گاڑی سے اترنے لگا۔

"یہ نہیں ہوسکتا۔" اس نے جلدی سے میرا ہاتھ پکڑلیا "تمہیں اس وقت کہیں پناہ نہیں ملے گی، کوئی دروازہ کھلا نہیں ملے گا۔ کوئی تمہاری دستک سن کر بھی دروازہ نہیں کھولے گا۔ گلیوں میں آوارہ کتے تمہیں گھیر لیں گے اور ان کا شور سن کر ہوسکتا ہے

دلبریا اس کے آدمی تمہیں کوئی مشکوک شخص سمجھ کر پکڑ لیں۔"

میرے ہاتھ پر اس کی گرفت مضبوط تھی اور اپنے محسن کا ہاتھ تو انسان جھٹک بھی نہیں سکتا۔ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا "رات کو تو تمہیں میرے پاس ہی ٹھہرنا پڑے گا۔ صبح جہاں جی چاہے چلے جانا۔"

آخر کار مجھے رکنا ہی پڑا۔ حاتو نے کئی بار دروازے پر دستک دی تب اندر سے ایک خوف زدہ سی، نسوانی آواز سنائی دی "کیر آہے؟" (کون ہے؟)

"ماں آیاں... حاتو" (میں ہوں.. حاتو)

"ہک منٹ ترس" (ایک منٹ ٹھہرو)

دروازہ کھلا تو پرانی اور بوسیدہ سی اجرک میں لپٹی ایک سانولی سی عورت لالٹین اٹھائے سامنے کھڑی دکھائی دی۔ تیرہ چودہ سال کا ایک لڑکا اس کے پاس کھڑا آنکھیں مل رہا تھا۔ حاتو نے باری باری عورت اور لڑکے دونوں کے سروں پر ہاتھ رکھا پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے عورت کو بتایا "موں! ہی اساں جو مہمان آہے۔ گھوٹکری ویندو" (موں! یہ ہمارا مہمان ہے، صبح رخصت ہو جائے گا۔)

"وا! بھلی کرے آیا۔" عورت نے سر جھکا کر مجھے خوش آمدید کہا۔

میں نے اسے سلام کیا، بچے کو پیار کیا اور اس لمحے مجھے اپنی تہی دامنی کا بڑی شدت سے احساس ہوا۔ میں ابھی تک کم از کم اس احساس سے افسردہ نہیں ہوا تھا کہ میری جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں ہے لیکن اس لمحے میں نے اپنے آپ کو بے حد افسردہ، شرمندہ بلکہ عریاں عریاں سا محسوس کیا۔

میرا دل چاہا کہ کاش اس وقت میرے ہاتھ میں کوئی حقیر سا ہی تحفہ ہوتا جو میں اس سیدھی سادی مگر بہت بڑا دل رکھنے والی عورت کی خدمت میں پیش کر سکتا جو اپنی تمام تر غربت اور حالات کی تمام تر خرابی کے باوجود لفظ "مہمان" سن کر پیشانی پر شکنیں ڈالنے کے بجائے خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ کاش میں اس بچے کے ہاتھوں پر کچھ رکھ سکتا جو نہایت پرانے اور بوسیدہ لباس میں تھا مگر اپنے چہرے پر نہایت ہی معصوم اور من موہنی سی مسکراہٹ لیے ہوئے تھا۔

روپیہ واقعی روپے کو کھینچتا ہے اور غریب کے نصیب واقعی غریبانہ ہوتے ہیں۔ امیروں کے گھر مہمان آتے ہیں تو تحفوں سے لدے پھندے آتے ہیں۔ غریب کے گھر مہمان بھی خالی ہاتھ آتے ہیں۔ ویسے میں کروڑپتی، سیٹھ، صنعتکار، بزنس مین اور نہ جانے کیا کچھ کہلاتا تھا لیکن آج حالات نے کچھ ایسا گھیرا ہوا تھا کہ ایک غریب کے گھر آنے کا اتفاق بھی ہوا تو ہاتھ خالی تھے، جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔

حاتو مجھے ایک کوٹھری میں لے گیا جس میں چھوٹی سی ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اس پر پرانی سی رلی بچھی تھی۔ کپڑوں کے چھوٹے چھوٹے، رنگا رنگ بیکار ٹکڑوں کو جوڑ کر گھر کی عورتیں روز تھوڑا تھوڑا وقت نکال کر یہ گدا سا بناتی تھیں۔ کلچر کے تاجر انہیں بیچ کر خوب کماتے تھے۔ مہینوں محنت کرنے والی عورتوں تک سو پچاس روپے بھی نہیں پہنچتے تھے۔

یہی معاملہ سندھی ٹوپیوں کا تھا جن میں شیشے جڑے ہوتے ہیں۔ ایک عورت ہفتوں کی محنت اور دیدہ ریزی سے خوب صورت اور باکمال کڑھائی کے درمیان شیشے جڑ کر ایک ٹوپی تیار کرپاتی ہے جس کا اسے معمولی سا معاوضہ ملتا ہے حالانکہ بازار میں وہ معقول قیمت میں بکتی ہے۔ یہ اور اس قسم کی کچھ باتیں مجھے پہلے سے معلوم تھیں، کچھ ان علاقوں میں بھٹکنے کے دوران معلوم ہوئیں۔

"تم ذرا آرام کرو لیکن سونا مت، میں ابھی آتا ہوں۔" حاتو نے کہا اور مجھے کوٹھری میں چھوڑ کر چلا گیا۔ میں چارپائی پر لیٹ گیا لیکن چارپائی خاصی چھوٹی تھی۔ میری ٹانگیں پائنتی سے خاصی آگے جارہی تھیں۔ کوٹھری میں ایک طرف چٹائی بھی بچھی ہوئی تھی۔ میں نے رلی چارپائی سے اتار کر چٹائی پر بچھائی، یوں کافی آرام دہ بستر تیار کر کے میں اس پر دراز ہو گیا۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ حاتو کیوں مجھے جاگتے رہنے کی ہدایت کر گیا تھا۔ اندازہ اس وقت ہوا جب وہ ایک ڈلیا میں تازہ پکی ہوئی دو گرم گرم روٹیاں اور ایک کٹوری میں تھوڑا سا مکھن اور تھوڑی سی چٹنی لیے کوٹھری میں آیا۔ اس کا بیٹا پانی سے بھرا المونیم کا بڑا سا گلاس اٹھائے پیچھے پیچھے تھا۔

ممنونیت اور شرمندگی سے میری حالت عجیب ہوگئی مگر حاتو میرے تمام ممنونیت بھرے الفاظ کو ان سنا کرتے ہوئے بولا "تم نے راستے میں تمہیں جو دو روٹیاں کھانے کو دی تھیں، مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان سے تمہارا کچھ بھلا نہیں ہوا۔ اس لیے میں نے آکر موں سے کہا کہ کچھ اور بندوبست کر۔ اس بھاگوان نے یہ بندوبست کیا ہے۔ گھر میں اس وقت بس یہی کچھ تھا۔ تھوڑا سا آٹا جس کی یہ روٹیاں پکادیں، یہ ذرا سا مکھن اور ذرا سی چٹنی تھی۔ دل تو بہت چاہ رہا تھا کہ تمہاری کچھ خاطر تواضع کریں لیکن ہم کچھ بھی نہیں کرسکتے۔ ہم کو غریب اور مجبور سمجھ کر معاف کر دینا۔"

میرے حلق میں آنسوؤں کا غبار سا پھیل گیا۔ الفاظ میرا ساتھ چھوڑ گئے۔ میں اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ بس ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ مجھے کچھ یقین نہیں آرہا تھا کہ اسی دنیا میں جہاں ذرا ذرا سی بات پر بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا تھا، حاتو جیسے لوگ بھی باقی تھے۔ ایسے ہی لوگوں کو دیکھ کر دل کو حوصلہ سا ہونے لگتا تھا کہ دنیا جس المناک انجام کی مستحق نظر آتی ہے، شاید ابھی کچھ عرصہ اور اس انجام سے بچی رہے۔

اس کے اصرار پر میں نے وہ کھانا بھی کھالیا۔ یہ میری زندگی کے لذیذ ترین کھانوں میں سے ایک کھانا تھا یا یوں کہیے کہ ایک

جاسوسی ڈائجسٹ، جولائی 1993ء

کھانے کی دوسری قسط تھی۔ اس دوسری قسط کے بعد میں واقعی شکم سیر ہو گیا اور ٹانگیں پسار کر سو گیا۔

لاشعور میں چونکہ یہ احساس موجود تھا کہ مجھے صبح منہ اندھیرے اس گھر سے نکلنا تھا شاید اسی لیے مرغے کی پہلی بانگ کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی۔ اب میں اپنے آپ کو بالکل تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ گزشتہ روز کے واقعات کی تھکن اور درماندگی نے جلد ہی میرا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔

چند لمحے بعد ہی میرا میزبان کوٹھری میں داخل ہوا اور مجھے پہلے سے بیدار بلکہ جانے کے لیے تیار دیکھ کر کچھ شرمندہ سا ہو گیا اور خجالت آمیز لہجے میں بولا "میں ہرگز تمہیں جانے کے لیے نہ کہتا لیکن تمہاری بھلائی اسی میں ہے۔ ایک اجنبی کے لیے ہماری کیٹی میں رہنا اچھا نہیں ہے۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ تم یہاں زیادہ دیر نہ ٹھہرنا۔ اگر تم بند کے ساتھ ساتھ اور آگے سفر کرو گے تو ڈھائی تین میل کے سفر کے بعد ایک دوسری کیٹی آئے گی۔ اس کا نام کیٹی خدا بخش ہے۔ وہاں کا ماحول ذرا مختلف ہے۔ اگر تمہیں کچھ دن گزارنا بھی پڑیں تو وہاں گزارنا۔ وہاں شاید تمہیں کچھ کام بھی مل جائے۔ جیسے ہی تمہاری مجبوری ختم ہو جائے اور تمہارے ہاتھ میں چار پیسے آ جائیں، فوراً اپنے علاقے کی طرف واپس چلے جانا۔ سمجھ گئے نا؟"

"بالکل سمجھ گیا۔" میں نے سعادت مندی سے سر ہلایا "میں اب چلتا ہوں۔"

میرے ساتھ باہر آنے سے پہلے اس نے قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر غالباً واسکٹ کی جیب سے ایک ایک روپے کے دو مڑے تڑے نوٹ نکال کر شرمندہ شرمندہ سے انداز میں میری جیب میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میرے گھر میں اس وقت کل یہی پیسے ہیں۔ آج منشی میرا حساب کرے گا تو تھوڑے سے پیسے ملیں گے تبھی گھر میں بھی سودا سلف آئے گا۔"

میں نے اس کی کلائی تھام کر اسے وہ روپے اپنی جیب میں ڈالنے سے روک دیا۔ میں کبھی ان دو مڑے تڑے نوٹوں کی طرف اور کبھی حاتو کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے یہ دو روپے کسی سیٹھ یا صنعتکار کے دو لاکھ روپوں سے زیادہ قیمتی تھے۔

"یہ روپے تم اپنے پاس ہی رکھو۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے حاتو۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "ویسے تو دنیا کا کوئی کام پیسے کے بغیر نہیں چلتا لیکن میں تجربہ کر کے دیکھ رہا ہوں کہ شاید انسان پیسے کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہو۔ میرا خیال ہے انسان پیسے کے بغیر تو زندہ رہ سکتا ہے 'انسانوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"معلوم نہیں۔ شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" وہ سادگی اور تذبذب سے بولا "لیکن یہ پیسے تو تم کو ہر حال میں رکھنے پڑیں گے۔ میرا دل نہیں مان رہا کہ کوئی مصیبت زدہ اور خالی ہاتھوں والا مسافر میرے گھر سے خالی ہاتھ ہی چلا جائے۔"

اس وقت میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا جب میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو آتے دیکھے۔ وہ گلوگیر آواز میں بولا "مجھے معلوم ہے' دو روپے کی آج کل کے زمانے میں کوئی وقعت نہیں ہے لیکن تم ان پیسوں کو نہیں' اپنے ایک مسلمان بھائی کی محبت کو دیکھنا..."

"یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے اپنے حلق میں پھیلتے غبار کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "جو تم کہہ رہے ہو' میں تمہارے کہنے سے پہلے ہی وہ سوچ رہا تھا۔ جب تم جیسے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے تو زندگی اچھی لگنے لگتی ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہارے ان دو روپوں کو خرچ نہ کروں۔ نشانی کے طور پر سنبھال کر رکھوں۔"

میں نے دونوں نوٹ اس سے لے کر جیب میں رکھ لیے۔ وہ مجھے رخصت کرنے دروازے تک آیا۔ پہلے اس نے دروازہ کھول کر باہر اِدھر اُدھر جھانکا مگر یوں مجھے رخصت کیا جیسے میں دشمن ملک کا کوئی ایجنٹ تھا جسے اس نے ازراہِ ہمدردی دوسروں سے چھپ کر پناہ دے رکھی تھی۔ اس نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔

ابھی صبح کا اجالا پھیلنا شروع نہیں ہوا تھا۔ میں نے گلی میں تیز تیز چلنا شروع کر دیا لیکن گلی کے موڑ پر پہنچ کر میرے قدم خود بخود سست پڑ گئے۔ مجھے یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ جانا کہاں تھا۔ ابھی میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔

دوسری گلی میں دو آوارہ کتوں نے میرا استقبال کیا۔ پہلے انہوں نے متجسس سی نظروں سے میرا جائزہ لیا پھر باہمی اتفاق رائے سے وہ غالباً اسی نتیجے پر پہنچے کہ انہیں بھونکنا چاہیے۔ وہ نقاہت زدہ سے انداز میں بھونکنے لگے لیکن جب میں اس گلی سے گزرتا چلا گیا تو انہوں نے میرا پیچھا چھوڑ دیا۔

کئی گلیوں سے گزرنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو اچانک ہی گاؤں سے باہر پایا لیکن گاؤں سے ذرا ہٹ کر کھلے میدان میں ایک بہت بڑا چھپر پھیلا ہوا تھا۔ اس کے قریب پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ایک خاصا بڑا چھپر ریسٹوران' تھا جیسے عموماً گاؤں دیہات میں ہوتے ہیں۔

لیکن اس چھپر ریسٹوران کے گرد چار دیواری نہیں تھی۔ البتہ اس کے عقب میں بہت سی کچی اینٹیں ترتیب سے رکھی تھیں۔ ایک طرف چکنی مٹی کا ڈھیر بھی نظر آ رہا تھا۔ ان چیزوں کی حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بہت دن سے وہاں پڑی تھیں لیکن ان کے استعمال ہونے اور تعمیر شروع ہونے کی نوبت نہیں آ رہی تھی۔

ریسٹوران کے سامنے کئی بڑی بڑی' پرانی سی چارپائیاں اور بہت سی تپائیں پڑی ہوئی تھیں لیکن ابھی ان پر کوئی گاہک موجود نہیں تھا۔ چارپائیوں کے نیچے صرف دو تین ضعیف الوجود سے کتے گردنیں جھکائے غالباً دنیا کی بے ثباتی پر غور کر رہے تھے۔

چھپر کے نیچے بھی چند تپائیں پڑی تھیں۔ وہ زیادہ صاف ستھری

تھیں اور ان کے سامنے موٹے موٹے، چوبی تختوں کی میزیں بھی موجود تھیں۔ جس طرف مٹی کے کاؤنٹر کی سی صورت میں چولھے اور انگیٹھیاں بنی ہوئی تھیں اس طرف ایک شخص کھڑا کچھ برتن اور دوسرا سامان سیٹ کر رہا تھا۔ وہ ریستوران کا مالک معلوم ہوتا تھا۔ اس کا لباس کچھ صاف ستھرا تھا اور سر پر پگڑی بھی ذرا معززانہ سی تھی۔

ایک شخص کہیں دور سے ایک ڈنڈے میں دو کنستر باندھے، کندھوں پر لٹکائے پانی بھر کر لا رہا تھا۔ وہ غالباً مالک کے معاون اور بیرے وغیرہ کی حیثیت سے فرائض انجام دیتا تھا۔

میں کچھ دیر گلی کے کونے پر ہی کھڑا ان کا جائزہ لیتا رہا۔ انہوں نے میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ مالک ایک چولھے میں آگ روشن کرنے لگا۔ بیرا پانی لا کر ایک طرف رکھے ہوئے لبوترے ڈرم نما مٹکوں میں ڈالنے لگا۔

میں نے چند لمحے صورت حال پر غور کیا اور آخر کار فیصلہ کیا کہ اس چھپر ریستوران پر قسمت آزمائی کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ حالانکہ گزشتہ رات میں نے ڈٹ کر کھانا کھالیا تھا لیکن اس وقت پھر اچھی خاصی بھوک محسوس ہو رہی تھی اور اس سے بھی زیادہ چائے یا کافی کی طلب ہو رہی تھی۔ کافی کی موجودگی کا تو ظاہر ہے یہاں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کسی بھی قسم کی چائے ہی میسّر آجاتی تو غنیمت تھا۔

یہ تجربہ مجھے پہلے بھی ہو چکا تھا کہ غربت میں بھوک زیادہ لگتی ہے۔ دولتمندی کے دور میں عموماً ڈائٹنگ کرنے کو جی چاہتا ہے اور غربت میں دل چاہتا ہے جو سامنے آئے کھا جاؤ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ غربت میں عموماً انسان کو بھگدڑ، مشقت اور تجل خواری سے واسطہ رہتا ہے۔ غربت اور مشقت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مشقت ہوتی ہے تو کھانے کی طلب بھی بڑھتی ہے۔ گاڑی بہت زیادہ حرکت میں رہتی ہے تو پیٹرول بھی زیادہ مانگتی ہے۔ زندگی سے مصنوعی آسائشیں اور آرام رخصت ہوتا ہے تو فطرت کے اصلی تقاضے بیدار ہونے لگتے ہیں۔

میں چھپر ریستوران کے قریب جا پہنچا۔ مالک نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور ذرا چونکا۔ یقیناً اسے پہلی ہی نظر میں اندازہ ہو گیا تھا کہ میں یہاں اجنبی تھا۔ وہ خاصا بارعب سا، ادھیڑ عمر شخص تھا۔ موٹی موٹی مونچھیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔

"کون ہو بھئی... اور کیا چاہیے؟" اس نے کھردرے اور نامہربان سے لہجے میں پوچھا۔

"کچھ ناشتا واشتا ... چائے وائے مل جائے گی؟" میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ میرے لہجے سے گویا اس کے خیال کی تصدیق ہو گئی کہ میں وہاں قطعی اجنبی تھا۔

"ضرور مل جائے گی۔ ابھی تو میں صرف اپنے لیے بنا رہا تھا، تمہارے لیے بھی بنا دوں گا۔" اس نے آنکھیں سکیڑ کر میرا سرتاپا جائزہ لیا۔ عام طور پر ہوٹلوں اور ریستورانوں والے کسی مفلوک الحال گاہک سے بھی پیشگی یہ نہیں پوچھتے کہ اس کے پاس پیسے ہیں یا نہیں۔ لیکن اسے میری ظاہری حالت دیکھ کر شاید کچھ شبہ گزرا اور اس نے اپنے شبے کی تصدیق کر لینا ہی بہتر سمجھا۔

"کچھ پیسے ویسے بھی ہیں جیب میں؟" اس نے پوچھا۔ شاید میری مفلسی کا عکس میرے چہرے پر بھی آگیا تھا۔

"نہیں، پیسے تو نہیں ہیں۔" میں نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔ حاتو کے دیے ہوئے دو روپے میں واقعی خرچ کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"تو پھر کیا یتیم خانہ سمجھ کر ادھر آگیا ہے؟" چھپر ریستوران کے مالک کا لہجہ یک لخت ہی پہلے سے کئی گنا زیادہ کھردرا ہو گیا۔ اس نے قدرے فخریہ انداز میں چاروں طرف اشارہ کیا "اڑے یہ دینو کا ہوٹل ہے، کوئی یتیم خانہ نہیں ہے کہ سب حالی موالی منہ اٹھا کر ادھر آجاتے ہیں۔ مفت خورے میرے پاس دن میں بہت آتے ہیں۔ اگر میں سب کو مفت کھلانے لگوں تو میرا ہوٹل تو چار دن میں نیلام ہو جائے گا۔"

اس نے ایک بار پھر حقارت سے میرا سرتاپا جائزہ لیا اور ناک چڑھاتے ہوئے بولا "کام کے نہ کاج کے، دشمن اناج کے۔ اتنا لمبا چوڑا آدمی ہے، اتنی جان لیے پھر رہا ہے، گبھرو جوان ہے۔ تیرے کو مفت مانگ کر کھاتے ہوئے شرم نہیں آتی!"

اس کے چہرے اور لہجے کی تمام تر حقارت کے باوجود اس وقت نہ جانے کیوں مجھے بدمزگی یا توہین کا احساس نہیں ہوا۔ شاید انسان جب اندر سے بھرا بھرا اور آسودہ حال ہوتا ہے تو اسے مفلس و قلاش کہلانا اور حقارت کا برتاؤ کیا جانا زیادہ برا نہیں لگتا۔ جب میں حقیقتاً مفلس و قلاش تھا تو اس قسم کا رویّہ دل میں آگ لگا دیا کرتا تھا۔

اب تو مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ میں دل ہی دل میں اس صورت حال کو تقریباً انجوائے کر رہا تھا۔ فقیروں کا بھیس بدل کر تماشائے اہلِ کرم دیکھنے میں بھی ایک عجیب اور الگ ہی طرح کی لذت پوشیدہ تھی۔ اس کا اندازہ مجھے دھیرے دھیرے ہو رہا تھا۔ پرانے بادشاہ اور خلفا اگر راتوں کو بھیس بدل کر رعیّت کا حال جاننے کے لیے نکلتے تھے تو اس میں ادائیگی فرض کی دشواریوں اور اپنی ظرف کی آزمائش کے علاوہ یقیناً ایک طرح کی دلچسپی بھی پوشیدہ ہوتی ہوگی۔

اس عالم میں انسان پر دوسروں کے کردار کے بڑے عجیب عجیب پہلو آشکار ہوتے ہیں۔ زندگی بڑے تحیرخیز انداز میں اپنے ان گنت پہلو لیے سامنے آتی ہے۔ سب کچھ بہت دلچسپ بھی لگتا تھا اور عبرت آموز بھی۔ لیکن یہ سب کچھ بہرحال ایک کڑی آزمائش سے کم نہیں تھا۔ اس سے گزرنے کے لیے بڑا حوصلہ چاہیے تھا۔

دینو یقیناً حقارت سے ہنستا، اگر اسے یہ بتایا جاتا کہ اس وقت اس کے چھپر ہوٹل کے سامنے کراچی کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کا

مالک کھڑا تھا جس کا کاروبار پاکستان کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا۔ جس کے لیے پاکستان کے کسی بھی فائیو اسٹار ہوٹل میں بل کی ادائیگی ضروری نہیں تھی، صرف بل پر دستخط کر دینا ہی کافی ہوتا تھا۔ جسے معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ کب اس قسم کے بل اس کے اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں جاتے تھے اور کب ان کی ادائیگی ہو جاتی تھی۔ وہ شخص دینو کے چھپر ہوٹل پر ناشتے کا سوالی بنا کھڑا تھا۔

دینو کو یقیناً اپنے چھپر ہوٹل پر خاصا ناز تھا۔ شاید وہ گاؤں کے خوش حال لوگوں میں سے ایک ہو۔ اس دوران اس نے غالباً رات کے بچے ہوئے ایک آدھ سالن کا برتن چولھے پر رکھ دیا تھا اور دوسرے چولھے پر المونیم کا ایک کالا سا فرائنگ پین رکھ کر اس میں کچھ مکھن ڈال رہا تھا۔

ان چیزوں کی خوشبوؤں سے میری اشتہا تیز ہونے لگی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے شبہ ہوا کہ شاید میرے محسوسات اس درندے کے سے رہے ہوں جو لمحہ بہ لمحہ شکار کے قریب جا رہا ہوتا ہے۔ میری بھوک پیاس، طلب اور توانائیاں سبھی اپنی تمام تر شدتوں کے ساتھ جاگ اٹھی تھیں۔

میں نے اپنے لہجے میں مسکینی برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "دینو سائیں! میں بھکاری نہیں ہوں۔ مانگ تانگ کر کھانا نہیں چاہتا۔ میں تو کام کی تلاش میں ہوں۔ آپ مجھے اپنے ہوٹل میں ویٹر۔ میرا مطلب ہے بیرا رکھ لیں۔"

"اڑے۔ بیرے کا کام بھی کوئی آسان نہیں ہے۔ جو بھی سوالی ادھر مفت کھانا کھانے کے چکر میں آتا ہے، وہ بولتا ہے ہم کو بیرا رکھ لو۔ کوئی بولتا ہے ہم کو برتن دھونے پر رکھ لو۔ کوئی بولتا ہے ہم کو باہر والا بنا لو۔ تم نے کبھی پہلے اس طرح کا کوئی کام کیا ہے؟"

اس نے ایک لمحے کے لیے رک کر سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورا۔ وہ باتوں کے دوران اپنا کام بھی کرتا جا رہا تھا۔ کھانے پینے کی مختلف چیزیں گرم کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ اپنے لیے اچھا خاصا پُرتکلف ناشتا تیار کر رہا تھا۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دیانتداری سے دیتے ہوئے کہا "نہیں۔ میں نے پہلے یہ کام نہیں کیے لیکن میں کر لوں گا۔ انسان کرنا چاہے تو دنیا کا کوئی کام مشکل نہیں ہے۔"

"اڑے یہ سب زبان سے بولنا آسان ہے، کر کے دکھانا بہت مشکل ہے۔" وہ بدستور حقارت سے بولا "میں نے کام چور اور حرام خور زندگی میں اتنے دیکھے ہیں کہ اب میں دور سے ان کی شکل دیکھ کر پہچان لیتا ہوں۔"

اس کا ملازم بھی پانی لینے کے لیے جاتے جاتے رک گیا تھا اور متجسس نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے ہماری گفتگو سن رہا تھا۔ کتوں نے بھی سر اٹھا کر کچھ دیر تک میرا جائزہ لیا تھا لیکن بھونکے بغیر سر جھکا لیا تھا۔

دینو نے مکھن میں دو انڈوں کا شاندار آملیٹ تیار کر لیا تھا۔

فرائنگ پین چولھے سے اتارتے ہوئے وہ بولا "سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مجھے ویٹر، برتن دھونے والے یا باہر والے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں اور سومرل کر سارے کام کر لیتے ہیں۔ ہمیں کسی تیسرے آدمی کی ضرورت نہیں۔ یہ کوئی شہر کا ہوٹل تو نہیں ہے نا۔ میں کوئی لاکھوں روپیہ تو نہیں کما رہا ہوں کہ پوری فوج بھرتی کر لوں۔"

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن وہ کچھ سننے سے پہلے ہی ماتھے پر ہاتھ مار کر جھنجلاہٹ سے بولا "اڑے بابا۔ ماں چیو نا، ٹکھے ماڑہو نہ گھرجے۔۔۔ نہ گھرجے۔" (ارے بابا! میں نے کہا تو ہے کہ مجھے آدمی نہیں چاہیے۔ نہیں چاہیے)

میں نے اس کے چھپر کے عقب میں پڑی ہوئی اینٹوں اور مٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اور اگر میں تمہارے اس ہوٹل کے چاروں طرف دیواریں کھڑی کر دوں تو مجھے کتنے دن تک کھانا مل سکتا ہے؟"

میں نے شاید لاعلمی میں اس کی کمزوری دریافت کر لی تھی۔ اس کی برہمی یک لخت ہی کافی کم ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں اچھی خاصی دلچسپی کی چمک ابھر آئی تھی لیکن وہ اسے دبانے کی کوشش کرتے ہوئے بظاہر بے نیازی سے بولا "تم نے پہلے کبھی چنائی وغیرہ کی ہے؟ راج مستری کا کام کیا ہے؟ اکیلے سب کچھ کر لو گے؟"

"یہ سیدھا سادا سا کام ہے۔ اس کے لیے کوئی راج مستری یا مزدور ہونا ضروری نہیں۔ صرف محنت کی ضرورت ہے۔ میں نے اپنے گوٹھ میں کئی مرتبہ اپنے اور دوسروں کے مکانوں کی دیواریں بنائی ہیں۔ ان میں کھڑکیاں دروازے بھی لگائے ہیں، اوپر چھتیں بھی ڈالی ہیں۔ یہ کون سا شہر میں پلازا بنانے کا کام ہے۔ آسان ہی ہے۔ میں سب کر لوں گا۔ تم دیکھو گے تو طبیعت خوش ہو جائے گی۔" مجھے اس کو قائل کرنے کی کوشش میں لطف آ رہا تھا۔

"وہ تو کام دیکھ کر ہی پتا چلے گا۔" اس کے لہجے میں مزید نرمی آ گئی۔ اس کے الفاظ سے ظاہر تھا کہ وہ تقریباً آمادہ ہو چکا تھا "لیکن جب تک کچھ کام کر کے نہیں دکھاؤ گے، کھانے کو کچھ نہیں ملے گا۔ مجھے مفت خوروں سے بڑی نفرت ہے۔ میں نے خود زندگی میں کبھی مفت کا نہیں کھایا اور نہ ہی کسی کو کھلاتا ہوں۔"

وہ کھڑے ہی کھڑے ایک شاندار پراٹھے کے ساتھ اپنا شاندار آملیٹ چٹ کرنے لگا۔ میں نے تھوک نگلتے ہوئے نظر چرائی اور دھیمے لہجے میں کہا "ٹھیک ہے، میں بھی جب تک تمہیں کچھ کر کے نہیں دکھا دوں گا، تم سے کچھ کھانے کو نہیں مانگوں گا۔"

"ہاں، یہ ہوئی نا مرد بچے والی بات۔" موٹی موٹی مونچھوں کے نیچے اس کے ہونٹوں پر پہلی بار خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی "اگر مجھے تمہارا تھوڑا سا کام دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ تم کام ٹھیک کر لو گے تو میں تمہیں چاروں دیواریں بنانے کی اجازت دے دوں گا جب تک تم کام کرو گے، تمہیں تینوں وقت کھانا یہاں سے ملے گا

بلکہ اگر تمہارے پاس رہنے کا ٹھکانا نہیں ہے تو رات کو تم یہیں سو بھی سکتے ہو۔ یہ میرا ملازم سومر بھی ادھر ہی سوتا ہے۔" اس نے بڑی بڑی چارپائیوں کی طرف اشارہ کیا۔

پھر ایک بڑا سا نوالا حلق سے اتارتے ہوئے اسے گویا کوئی خیال آیا اور وہ خبردار کرنے کے سے انداز میں بولا "لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم اس کام میں پورا مہینہ ہی لگا دو۔ اکیلے آدمی کے لیے یہ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کا کام ہے۔ اگر ساتھ ایک مزدور بھی مل جاتا تو تین دن میں کام ہو جاتا....."

پھر اس نے اعتراف کر ہی لیا کہ اسے اس کام کے لیے آدمی نہیں مل رہا تھا۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "کیٹی میں آدمی تو بہت ہیں لیکن سب سائیں مراد کی زمینوں پر مصروف ہیں۔" اس نے بند کی طرف اشارہ کیا "چاہے پیسے زیادہ ملیں پھر بھی وڈیرا سائیں مراد کی زمینوں سے کام چھوڑ کر تو کوئی نہیں آسکتا نا۔"

میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے تیزی سے ناشتا چٹ کر لیا۔ سومر نے اس دوران پانی کا ایک پھیرا اور لگا لیا۔ دیتو ہونٹ صاف کر کے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے بولا "اب تم ذرا لنگر کس لو۔ کام کرنے کے لیے تمہیں جس سامان کی ضرورت ہوگی وہ سب میرے پاس ہے لیکن کام سارا کا سارا واقعی تمہیں اکیلے ہی کرنا پڑے گا پانی تک خود ہی بھر کر لانا پڑے گا۔ کیونکہ سومر اب دن چڑھتے ہی اِدھر ہوٹل میں مصروف ہو جائے گا۔"

"وہ تو میں کہہ ہی چکا ہوں کہ سب کچھ میں خود ہی کروں گا۔" میں نے اسے ایک بار پھر اطمینان دلایا۔

"ذرا احتیاط بھی کرنا۔ گاہکوں میں آکر اٹھنے بیٹھنے کی ضرورت نہیں۔ لوگوں کو یہ پتا نہ چلے کہ تم کوئی باہر کے آدمی ہو۔ یہ تمہارے ہی حق میں اچھا ہے۔ حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ کہیں خواہ مخواہ تمہارے لیے کوئی پریشانی نہ کھڑی ہو جائے۔" اس کا لہجہ اب اچھا خاصا ہمدردانہ ہو گیا تھا۔

"تم فکر نہ کرو، میں سب سمجھتا ہوں۔ مجھے تمہارے گاہکوں میں آکر اٹھنے بیٹھنے کی فرصت ہی کہاں ملے گی۔" میں نے کہا۔

وہ خاصا مطمئن اور خوش نظر آنے لگا۔ صرف تین وقت کے کھانے پر اسے آدمی مل گیا تھا جو راج اور مزدور دونوں کے فرائض انجام دینے کے لیے تیار تھا۔ اس نے چھپر ہی میں رکھا ہوا سامان میرے حوالے کیا۔ مجھے ایک پرانی، میلی سی، مختصر سی دھوتی بھی دی جس کا میں نے واقعی لنگوٹ کس لیا اور اپنی عظیم الشان شلوار قمیص سنبھال کر ایک طرف رکھ دی۔

بھوک کے عفریت نے میرے معدے کی دیواروں کو اپنے ناخنوں سے کُھرچنا شروع کر دیا تھا لیکن میں کام میں لگ گیا۔ خود ہی پانی بھر بھر کر لایا۔ غنیمت تھا کہ کنواں زیادہ دور نہیں تھا۔ خود ہی میں نے بہت سا گارا تیار کیا، اینٹیں لادلاد کر لایا اور دیوار تعمیر کرنی شروع کر دی۔ جلد ہی میں کام میں مگن ہو گیا اور بھوک کی اذیت کچھ کم ہو گئی۔

دوپہر تک میں ایک طرف کی آدھی سے زیادہ دیوار تعمیر کر چکا تھا اور دیوار کچھ ایسی بری بھی نہیں تھی۔ دیتو نے اعتراف تو نہیں کیا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ میرا کام اور کام کی رفتار، دونوں ہی چیزیں دیکھ کر حیران تھا۔ لیکن میرا خیال ہے اس سے زیادہ حیران وہ اس وقت ہوا ہوگا جب اس نے بڑی محبت سے مجھے کھانے کے لیے مدعو کیا۔

اس نے میری ہی بنائی ہوئی دیوار کی آڑ میں بینچ ڈلوا کر سومر کے ہاتھ میرے لیے کھانا بھجوایا... اور پھر بھجواتا ہی چلا گیا کیونکہ میں منگواتا ہی چلا گیا۔ میں نے اس کے مکھن، گوشت اور روٹیوں پر خوب ہاتھ صاف کیا۔ اس نے بھی ہاتھ تو نہیں روکا لیکن آخرکار جب میں شکم سیر ہو چکا تو وہ میرے پاس آیا اور بولا "خدا کا شکر ہے، میں نے تمہیں صرف تین وقت کے کھانے پر ہی کام پر لگایا تھا۔ اگر ساتھ مزدوری بھی دینے کا وعدہ کرتا تو بڑے گھاٹے میں رہتا۔"

میں نے یونہی اس کا دل دہلانے کے لیے کہا "میں نے تو ابھی ہاتھ روک کر کھایا ہے ورنہ میری خوراک تو اس سے زیادہ ہے۔"

"خیر" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "میں اس لیے نقصان میں نہیں رہوں گا کہ میرے خیال میں تم آدمی ایماندار ہو۔ کام کو لمبا نہیں لٹکا رہے۔ تم تو شاید میرے اندازے سے بھی آدھے وقت میں چاروں دیواریں بنا دو گے۔"

"انشاء اللہ" میں نے بڑے خلوص سے عزم ظاہر کیا۔

تین دن میں، میں نے چھپر کے گرد تین دیواریں کھڑی کر دیں۔ میں نے دو راتیں وہاں گزاری تھیں اور حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ تین دن اور دو راتیں مجھے بہت اچھی محسوس ہوئی تھیں، بڑا لطف

WAITER

"جس وقت پولیس پہنچی تھی تم کیا کر رہے تھے؟" جج نے مُدعا علیہ سے دریافت کیا۔

"ویٹنگ۔ سر۔"

"کس لیے؟"

"رقم کے لیے۔"

"وہ کون تھا جس سے تمہیں رقم ملنے والی تھی؟"

"وہی آدمی جس کا میں انتظار کر رہا تھا۔"

"وہ تمہیں کیوں دیتا یہ رقم؟"

"ویٹنگ کے سلسلے میں سر۔"

"کیا بکتے ہو؟" جھلا کر جج نے کہا۔ "آخر تمہارا پیشہ کیا ہے؟"

"سر، میں ایک ویٹر ہوں۔"

آیا تھا۔ دن بھر شدید مشقت کا پسینہ بہانے' ڈٹ کر کھانے اور شام کو گاہکوں کا سلسلہ ختم ہو جانے کے بعد میں کنویں کے ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے نہا کر کھلے آسمان تلے 'لہلہاتے درختوں کے قریب لمبی چوڑی چارپائی پر ٹانگیں پھیلا کر لیٹتا تو میٹھی میٹھی تھکن کی تہ سے ایک نئی اور انوکھی سی زندگی کی لذت میرے وجود میں چٹکیاں لیتی۔ مجھے کچھ یوں لگا جیسے میں ایک عمدہ' مضبوط اور طاقتور انجن تھا مگر میرے اندر کہیں کہیں میل' گریس اور زنگ جمنے لگا تھا۔ تین دن میں ہی جیسے وہ میل' گریس اور زنگ ڈھل گیا تھا۔ میرے پُرزے اور گراریاں اندر ہی اندر صاف ستھرے ہو کر چمکنے دمکنے لگے تھے۔

اس دوران میں نے نہ صرف اپنے کپڑے دھو لیے تھے بلکہ سومرے کوئلوں والی استری لے کر انہیں استری بھی کر لیا تھا۔ دن بھر لنگوٹ کس کر جان توڑ محنت کرنے کے بعد رات کو صاف ستھرے لباس میں تاروں بھرے آسمان تلے بیٹھ کر دودھ پتی پینے اور سومرے باتیں کرنے میں بڑا مزہ آتا' بڑی فرحت محسوس ہوتی۔ وہ بہت ہی سیدھا سادا اور صاف دل سا نوجوان تھا۔

"ریستوران" میں آنے والے گاہکوں نے میری طرف زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ اگر کسی نے کچھ پوچھا بھی تھا تو ڈینو نے انہیں نہ جانے کیا بتایا تھا۔ بہرحال مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ میرا وقت اچھا گزر رہا تھا۔

چوتھے روز دوپہر کو جب میں چوتھی دیوار آدھی سے زیادہ بنا چکا تھا تو یکایک ہی مجھے اس سوال نے آن گھیرا کہ اب کیا ہوگا؟ کام تو ختم ہونے کے قریب تھا۔ اس کے بعد ڈینو کو میری ضرورت نہیں تھی۔ اب مجھے کدھر کا رخ کرنا تھا؟ مجھے نہیں معلوم تھا زندگی کا دھارا اب مجھے کس طرف لے جانے والا تھا۔

میں نے چوتھے اور آخری نمبر پر سامنے کی دیوار کو رکھا تھا۔ سامنے کی اس دیوار کی تعمیر کرتے وقت میری پشت باہر بیٹھے گاہکوں کی طرف تھی۔ اچانک میں نے دو آدمیوں کو اپنی ادھوری سی دیوار کے قریب سے گزر کر ڈینو کے قریب پہنچتے دیکھا۔ ان میں سے ایک خوب لمبا چوڑا' تنومند تھا۔ اس کی مونچھیں ڈینو کی مونچھوں سے کہیں بڑی اور بارعب تھیں۔ وہ نوجوان ہی تھا۔ سر پر بڑی سی پگڑی تھی۔

دوسرا ذرا چھوٹے قد کا اور کم جسیم تھا لیکن اس کے کندھے پر کلاشنکوف موجود تھی۔ وہ دونوں مٹی کے کاؤنٹر کے سامنے ڈینو کے مقابل جا رکے۔ میں دیوار میں اینٹیں بھی چُن رہا تھا اور یہ منظر بھی دیکھ رہا تھا۔

ڈینو نے پھیکی سی مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا۔ وہ یقیناً ڈینو کے لیے اجنبی نہیں تھے لیکن انہیں دیکھ کر ڈینو کے چہرے سے گویا زندگی کی چمک رخصت ہو گئی تھی۔ تاہم بظاہر وہ حوصلے سے کھڑا رہا۔

لمبے تڑنگے شخص نے خاموشی سے اپنا بڑا سا ہاتھ پھیلا دیا۔ ڈینو نے گلے سے کچھ نوٹ نکال کر گنے اور اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ دراز قد نے گونجیلی سی آواز میں سندھی میں ذرا برہمی سے جو کچھ کہا اس کا مطلب یہ تھا۔

"ابے.. کیا تجھ کو پیغام نہیں ملا تھا کہ اب بھتّہ تین سو روپے ہفتہ کے بجائے چار سو روپے ہفتہ ہوگا؟ سائیں دلبر کا حکم نہیں پہنچا تیرے تک؟"

"پیغام تو ملا تھا سائیں!" ڈینو ہاتھ جوڑ کر بولا "لیکن آپ سائیں دلبر کی خدمت میں ہماری طرف سے فریاد کرنا... آپ خود ہی بتائیں ہم چار سو روپے ہفتہ کیسے دے سکتے ہیں؟ اتنا تو اب خود ہمارے حصے میں نہیں آتا۔ ہم تو تین سو روپیہ ہفتہ ہی پیٹ کاٹ کر دے رہے ہیں۔ گاہکی آدھی رہ گئی ہے۔ پہلے تو رات گئے تک محفلیں جمتی تھیں' گاہک بیٹھے رہتے تھے۔ اب تو مغرب کے بعد سناٹا چھا جاتا ہے۔"

"ابے تقریر بند کر۔ حالات خراب ہیں اسی لیے تو بھتّے کی رقم بڑھ گئی ہے۔ تمہیں کیا پتا' ہمیں علاقے کی حفاظت کے لیے اور تم لوگوں کے کاروبار جاری رکھنے کے لیے کیا کیا مصیبت اٹھانی پڑتی ہے۔ بس سیدھی طرح بتا.... چار سو روپے ہفتہ دے گا یا نہیں؟"

"سائیں! چار سو روپیہ ہفتہ دینے سے تو بہتر ہے میں یہ ہوٹل ہی بند کر دوں۔" ڈینو ہاتھ باندھ کر بولا۔ اس کے ہاتھ بے شک بندھے ہوئے تھے لیکن اس کے لہجے میں بغاوت تھی۔ اس کا لہجہ بلاشبہ اس شخص کا لہجہ تھا جو کسی کی مسلسل زیادتیوں سے تنگ آکر آخرکار زندگی سے بے زار ہو جاتا ہے' اسے اپنی جان کی بھی پروا نہیں رہتی۔

"یعنی تیری طرف سے انکار ہے؟" دراز قد نوجوان پھنکارا۔ چاروں طرف گہرا سناٹا چھا گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا' ریستوران کے بیشتر گاہک کھسک چکے تھے۔

"تین سو روپے ہفتہ دینے سے میں نے انکار نہیں کیا۔ اس سے زیادہ دینا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔" ڈینو نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔

اچانک ہی ان دونوں نے ڈینو کو پکڑ کر کاؤنٹر کے عقب سے کھینچ لیا اور فرش پر گرا کر بھاری بوٹوں کی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ ڈینو رو رہا تھا' فریاد کر رہا تھا۔ آخرکار مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے گارے کا تسلا ایک طرف رکھا اور جس بینچ پر میں کھڑا تھا اس سے چھلانگ لگا دی۔

زندگی کی کٹھن راہوں کے ایک سرکش مسافر کی یہ داستان ابھی جاری ہے۔ باقی واقعات آئندہ ماہ جاسوسی ڈائجسٹ میں پڑھیے
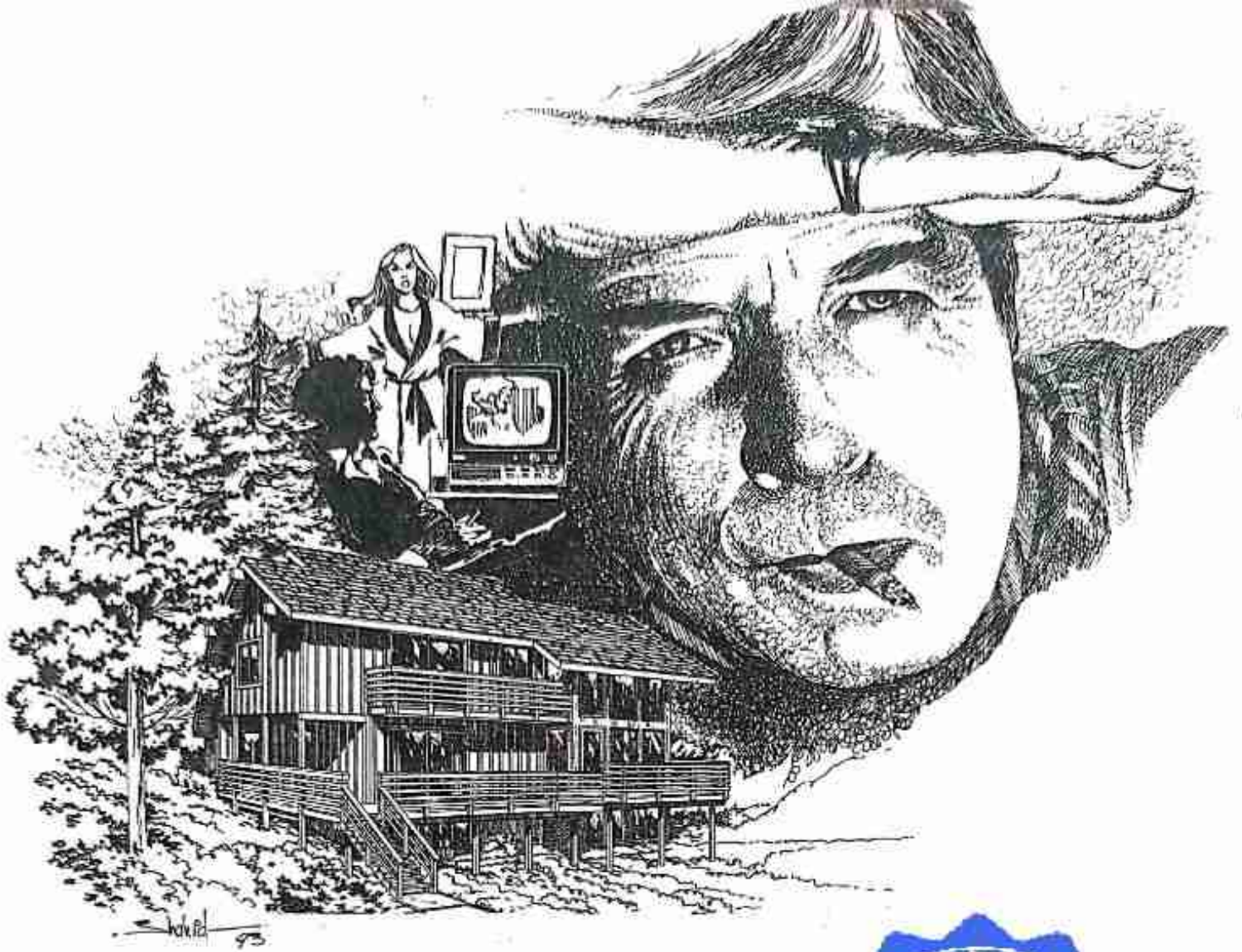
جلد بازی میں کیے گئے فیصلوں پر سے جب جذبات کی دُھند چھٹتی ہے تو حقیقت کی تیز دھوپ نکل آتی ہے جس میں فریقین جُھلسنے لگتے ہیں۔ اہلِ مغرب کج ادائی جن کی گُھٹی میں ہے، جلد ہی ایک دوسرے سے چھٹکارا پانے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں مگر یہ سب اتنا سہل بھی نہیں ہوتا۔ کسی بھی جُرم کا ارادہ بہت آسان اور اس کا ارتکاب اس سے بھی آسان مگر اس کے بعد...

آستین کے لہو کی پکار کا افسانہ۔ مغرب کی روایتوں کا شاخسانہ

کامل ظہیر

مارٹن کی اس عورت سے ملاقات چُھٹی کے دن ہوئی تھی اور اس کے کافی عرصے بعد وہ قائل ہو گیا تھا کہ چُھٹی کے بعض دن بڑے منحوس ہوتے ہیں۔ یعنی بعض اوقات چُھٹی کے دن آپ کی اس عورت سے ملاقات ہوتی ہے جو بعد میں آپ کی بیوی بن جاتی ہے۔

وہ اس وقت جنوبی فرانس میں تھا۔ موسم نہایت اچھا تھا۔ مارٹن کے پیٹ میں نہایت عمدہ کھانا تھا اور فرانسیسی کے صرف تین الفاظ اسے آتے تھے جن کے بل بوتے پر وہ سیاحت کر رہا تھا۔ وہ انگلینڈ سے آیا ہوا تھا پھر اس کی ملاقات ڈائنا سے ہو گئی۔ وہ بھی انگلینڈ سے آئی ہوئی تھی۔

"میں لیورپول سے آئی ہوں ڈیئر!" اس نے بتایا۔ اس کا لہجہ والہانہ تھا اور مارٹن کو اس والہانہ پن سے ہی خبردار ہو جانا چاہیے تھا لیکن اگر اس کے آس پاس کہیں خطرے کی گھنٹی بجی بھی تھی تو اس نے اس کی طرف سے کان بند کر لیے تھے۔ ڈائنا کے بال

سنہرے تھے (بعد میں معلوم ہوا کہ وہ سنہرے رنگے ہوئے تھے) جو نیلے پانیوں کے پس منظر میں زیادہ اچھے لگ رہے تھے۔

وہ چوبی فٹ پاتھوں پر مختلف ساز بجانے والے موسیقاروں کو تالیاں بجا بجا کر داد دے رہی تھی اور اس کے کنگن بڑے تواتر سے کھنک رہے تھے۔ مارٹن کو اس کے منہ سے لفظ "ڈیئر" بھی بڑا سنسنی خیز محسوس ہوا تھا۔ ایک خوشی یہ بھی تھی کہ وطن سے دور اسے انگریزی سننے کو مل رہی تھی۔ وہ بھی ایک خوبصورت عورت کے منہ سے۔

وہ مارٹن کی زندگی کی خوبصورت ترین تعطیلات تھیں۔ دن تمام تر کاہلی کے ساتھ ساحل پر گزرتا پھر ریلوے لائن کے کنارے کہیں کھانا ہوتا پھر اس ٹرین میں واپسی کا سفر جس میں روشنی بہت کم ہوتی تھی۔ اس ملگجے اندھیرے میں ڈائنا کا وجود اس کے قریب حرارتیں بکھیرتا۔ یہ روز و شب روح کو تازہ دم کر دینے والے تھے۔ مارٹن کا انگلینڈ کی یخ بستگی کو بھول جانے کو دل چاہ رہا تھا۔

ڈائنا جس گروپ کے ساتھ آئی ہوئی تھی اسے مارسلز سے واپس روانہ ہونا تھا۔ مارٹن وسطی مارسلز کے اسٹیشن تک اسے خدا حافظ کہنے آیا۔

"خدا حافظ ڈیئر!" ڈائنا نے کہا۔ اس کے بال مارٹن کے رخساروں کو چھو رہے تھے۔

"خدا حافظ۔" مارٹن نے ڈوبتے دل سے کہا۔ "میرے انگلینڈ کے پتے پر مجھے خط لکھنا مت بھولنا۔"

حالانکہ ڈائنا پہلے ہی خط لکھنے کا وعدہ کر چکی تھی لیکن اسے جیسے اعتبار سا نہیں آ رہا تھا۔ اس کے بعد وہ زندگی کی جو تین سب سے بڑی حماقتیں کرنے والا تھا، ان میں سے ایک اس نے وہیں اسٹیشن پر کھڑے کھڑے کر ڈالی۔ یعنی اس نے ڈائنا سے شادی کی خواہش کا اظہار کر ڈالا۔

ڈائنا کچھ شرمائی، کچھ ہچکچائی۔ شادی کی پیش کش کرنے والے کو یہ شرم، یہ ہچکچاہٹ بہت خوبصورت لگتی ہے۔ بعد میں اسے وہ وقت یاد آتا تو اسے یقین ہونے لگتا کہ ڈائنا اس لمحے یقیناً اس کی پیش کش کو دل ہی دل میں تول رہی تھی، نہایت غیر جذباتی انداز میں اس کے نفع و نقصان پر غور کر رہی تھی، اس کے اچھے اور برے پہلوؤں کا جائزہ لے رہی تھی۔ شاید فوری طور پر یہ جائزہ مکمل نہیں ہو سکا تھا۔

لیکن مارٹن کو اس وقت ان باتوں کا اندازہ نہیں ہو سکا تھا، جیسا کہ اکثر لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسے تو بس ڈائنا کی صورت میں ان پرلطف تعطیلات کا عکس نظر آ رہا تھا جو انہوں نے ساتھ گزاری تھیں اور جن کا ہر لمحہ کم از کم اس وقت تک تو ناقابل فراموش محسوس ہو رہا تھا۔

ڈائنا اس کی شکل میں ایک آسودہ حال شخص کو دیکھ رہی تھی جو سیر و تفریح کا دلدادہ معلوم ہوتا تھا اور اس کے بارے میں امکان نظر آتا تھا کہ جس عورت سے وہ خوش رہے گا اس پر دل کھول کر خرچ بھی کرے گا، اسے عیش کرائے گا۔ جس طرح کے مرد کا ڈائنا کو انتظار تھا وہ عمر میں مارٹن سے کچھ کم ہوتا اور اس کے بال سنہرے ہوتے۔ اس لیے ڈائنا واقعی کچھ ہچکچاہٹ میں رہ گئی۔

لیکن جب ٹرین روانہ ہوئی تو اس نے از سر نو غور کیا۔ لیور پول میں کوئی ایسی خوبصورت زندگی اس کی منتظر نہیں تھی۔ یخ بستگی تھی، بارشیں تھیں، دکان کی ملازمت تھی، مشقت کی زندگی تھی اور ناامیدی تھی! اس کے سوا لیور پول میں اس کے لیے رکھا ہی کیا تھا۔

اگلے اسٹیشن پر وہ یکدم ہی ٹرین سے اتر گئی اور ٹیکسی لے کر واپس روانہ ہو گئی۔ جلدی میں اس کا سامان بھی ٹرین میں ہی رہ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ حیرت زدہ مارٹن کے سامنے تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ کشتیاں جلا کر آئی تھی۔

ان کی شادی نائس میں ہوئی۔ ان کے دوستوں کے خیال میں فرانس میں، خصوصاً نائس میں شادی کرنا بڑی ہی رومانوی سی بات تھی۔ ہنی مون کے لیے وہ امریکا چلے گئے۔

ابتدا میں ازدواجی زندگی خاصی ٹھیک ٹھاک محسوس ہوئی۔ ڈائنا گھر کو سجانے سنوارنے میں مصروف رہی۔ اس کے خیال میں گھر میں بہت سی چیزوں کی کمی تھی جنہیں وہ شاپنگ سینٹرز کے چکر لگا لگا کر پورا کرتی رہی۔ ڈائنا کی قربت سے مارٹن کی زندگی میں بھی خوشگوار تبدیلی آئی تھی اور وہ بھی خوش تھا۔

لیکن پھر اکتوبر، نومبر اور دسمبر کے مہینے آئے۔ موسم بد سے بدتر ہوتا گیا۔ بہاریں رخصت ہوئیں، خشک اور سرد ہوائیں چلنے لگیں، پھر بارشیں ہونے لگیں، یخ بستگی پھیلی، برف باری ہونے لگی۔ ان کی ازدواجی زندگی میں بھی موسم کم و بیش سرد ہی رہنے لگا۔

دھیرے دھیرے انہیں احساس ہونے لگا کہ وہ درحقیقت وہ نہیں تھے جو انہوں نے ایک دوسرے کو سمجھا تھا۔ ڈائنا کو احساس ہوا کہ مارٹن سیر و تفریح کا دلدادہ اور شاہ خرچ نہیں تھا جو وہ فرانس کے ساحلوں پر دکھائی دیا تھا بلکہ وہ تو مضافاتی اور دیہی علاقے میں رہنے والا، دیکھ بھال کر خرچ کرنے والا، پرانے سے خیالات کا ایک بزنس مین تھا جو مضافاتی اور دیہی زمینوں، جنگلوں، جھاڑیوں اور فارموں میں سرمایہ کاری کرتا تھا۔ یہی اس کی آمدنی کے ذرائع تھے۔

جہاں تک ڈائنا کا تعلق تھا تو وہ ویسی ہی تھی جیسی نظر آتی تھی۔ شاید مارٹن کی آنکھ ہی دیر سے کھلی تھی۔ مارٹن گھر میں اسے دیکھتا تو اس کی شخصیت میں اسے ایک شرمناک سا گھٹیا پن دکھائی دیتا۔ اس کا میک اپ بہت گہرا، لباس نہایت واہیات اور حرکات و سکنات بے ہودہ محسوس ہوتیں۔

وہ بہت عیش پسند بھی تھی۔ خوشگوار موسموں والے علاقے،

شاندار مکانات، پُرہجوم اور ہنگامہ پرور شہر، عالیشان ہوٹلز، سوئمنگ پولز، خوبصورت ساحل۔ یہ اس کے خواب تھے مگر وہ نیو انگلینڈ کے ایک گاؤں میں آن پھنسی تھی جہاں کم از کم اس کی دلچسپی کی کوئی چیز نہیں تھی اور جہاں سال میں چار ماہ برف جمی رہتی تھی۔

ایک دُکان میں ملازمت اسے اب بھی کرنا پڑ رہی تھی۔ تو پھر لیورپول کی اور یہاں کی زندگی میں فرق ہی کیا رہ گیا تھا؟ بلکہ شاید یہ تو اس سے بھی بدتر تھی۔ جلد ہی وہ گاؤں سے، مارٹن سے، دُکان سے، ہر چیز سے بور ہو گئی لیکن وہ کیا کرے؟ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

اس سوال کا جواب اس نے مختلف مردوں میں تلاش کیا۔ پہلے اس کی زندگی میں جارج آیا جو اس کے برابر والی دکان پر کام کرتا تھا۔ پھر پیٹر.... پھر الیگزینڈر.... پھر لیونارڈ۔ کوئی کسی لحاظ سے اچھا تھا، کوئی کسی اعتبار سے۔ کاؤنٹی روڈ والے موٹیل میں ملاقاتیں رہتیں۔

حالات اور بھی خراب ہو گئے۔ ازدواجی زندگی میں خلیج بڑھ گئی۔ مارٹن معمول سے کچھ زیادہ پینے پلانے لگا۔ وہ رات کو دیر سے گھر آتا اور اس کے بعد ٹی وی کے سامنے جم کر بیٹھ جاتا۔ ڈائنا اب اپنی بے راہروی کو چُھپانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتی تھی۔ وہ راتوں کو دیر سے گھر آتی دکان سے بھی اکثر ناغہ کر لیتی۔ گھر کی حالت خراب رہتی۔ کچن کے خرچ کے لیے ملنے والی رقم وہ بال سیٹ کرانے اور میک اپ کا نت نیا سامان خریدنے پر خرچ کر لیتی۔ دونوں میں اکثر جھگڑا ہوتا، دونوں قسمت کو کوستے اور اس وقت کو بُرا بھلا کہتے جب رومان کے دیوتا نے ان کی آنکھوں میں دھول جھونک دی تھی، انہیں وہ خواب دکھائے تھے جن کی تعبیر پانا ان کے بس میں نہیں تھا۔

لیکن بندھن کو توڑنے کے لیے بھی وہ تیار نہیں تھے۔ ڈائنا اس لیے تیار نہیں تھی کہ اس کے بعد اس کے سامنے کچھ نہیں تھا۔ لیورپول وہ واپس جانا نہیں چاہتی تھی۔ مارٹن اس لیے تیار نہیں تھا کہ بنیادی طور پر وہ آخر ایک رجعت پسند انگریز تھا۔ وہ اپنے سماجی حلقے کے سامنے یہ اعتراف نہیں کر سکتا تھا کہ اس کا تجربہ ناکام ہو گیا تھا۔

دونوں زبان کے کلہاڑے سے ایک دوسرے کو کاٹنے میں لگے ہوئے تھے اور دونوں ہی کے دل میں یہ خواہش جاگزیں رہتی تھی کہ ایک روز وہ سو کر اٹھے گا تو دوسرا فریق کسی معجزے کے تحت ہمیشہ کے لیے غائب ہو چکا ہو گا، ہوا میں تحلیل ہو چکا ہو گا۔ ہر فریق دوسرے سے گویا چُھپ کر خواب دیکھتا کہ اگر دوسرا غائب ہو جائے تو اس کی زندگی کس طرح گزرے گی، اس میں کیا کیا خوشگوار اور حسین تبدیلیاں آئیں گی؟

شاید دوسرے ان گنت ناخوش جوڑوں کی طرح وہ بھی اسی حال میں مزید کئی برس گزارا کرتے رہتے، اگر دو اہم واقعات رونما نہ ہوتے۔ ان میں سے ایک کا تعلق مارٹن کے کاروباری معاملات سے تھا۔

پام فرٹ کے علاقے سے ذرا آگے رہنے والا ایک زمیندار کچھ زمین اور اس پر موجود املاک فروخت کرنا چاہتا تھا اور مارٹن اسے دیکھنے گیا تھا۔ زمین ایک پٹی کی سی شکل میں تھی اور سڑک سے قریب تھی جو ایک اچھی بات تھی۔ اس کے کچھ حصے پر جنگل، کچھ حصے پر چراگاہ اور عقب میں سُوروں کا ایک فارم تھا جو مارٹن کو اچھا نہیں لگا تھا۔

اس طویل و عریض فارم کے گرد تاروں کی باڑھ موجود تھی۔ مارٹن باڑھ کے قریب کھڑا خشک نشیبی زمین کا جائزہ لے رہا تھا جہاں کئی درجن موٹے تازے پلے ہوئے سرخ سُور اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ ان کی ٹانگیں مٹی میں لتھڑی ہوئی تھیں۔

مارٹن نے سوروں کو دیکھ کر نفی میں سر ہلایا تو زمیندار بولا۔ ”میری تو آمدنی کا ذریعہ ہی یہ سُور رہے ہیں۔ یہ جسامت میں بڑے ضرور ہیں لیکن گندے قسم کے سُور نہیں ہیں۔“

”دراصل ہم شہری قسم کے لوگ ہیں۔“ مارٹن نے معذرت خواہانہ سے لہجے میں بولا۔ ”ان سُوروں وغیرہ کو سنبھالنا ہمارے بس کی بات نہیں۔“

زمیندار نے گویا اس کے الفاظ پر توجہ دیے بغیر اسے متاثر کرنے کی کوشش جاری رکھی اور فخریہ لہجے میں بولا۔ ”ان سُوروں کی پرورش اس طرح ہوئی ہے جس طرح حقیقت میں سُوروں کی پرورش ہونی چاہیے۔ کھلی اور آزاد فضاؤں میں سُور بڑا ذہین جانور ہے۔ یہ بند جگہوں میں رہ کر اور گلی بندھی سی تیار شدہ خوراک کھا کھا کر بور ہو جاتا ہے۔ میں دن میں انہیں نشیب کی طرف چھوڑ دیتا ہوں۔ یہ اپنے آپ کو بالکل آزاد اور فطرت کے قریب محسوس

کرتے ہیں....."

مارٹن نے دیکھا، خاردار جنگل نشیب میں بہت دور تک چلا گیا تھا اور کچھ دور پانی کے لیے نالے سے بھی بنے ہوئے تھے۔ زمیندار بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اس کے علاوہ میں نے انہیں ہر چیز کھانے کا عادی بنایا ہے۔ میں وہاں ان کے لیے کھانا تیار کرتا ہوں۔" اس نے چھوٹی سی ایک جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا۔ "کچی پکی ہر چیز یہ کھاتے ہیں۔ روٹی، سبزیاں۔ اس کے علاوہ میں قصاب کے ہاں سے بچی کھچی چیزیں، چھیچھڑے وغیرہ سب لے آتا ہوں۔ یہ سب کھا جاتے ہیں۔"

"گوشت کھا جاتے ہیں؟" مارٹن نے بے یقینی سے پوچھا۔ "میری معلومات کے مطابق تو سُور گوشت خور جانور نہیں ہے۔"

زمیندار نے قہقہہ لگایا۔ "سُور بڑا ہی باکمال جانور ہے۔ انسانوں کی طرح یہ بھی ہر ماحول میں ڈھل جاتا ہے۔ ہر طرح کی عادت اختیار کرلیتا ہے ... اور یہ میرے سُور تو کچھ زیادہ ہی سُور ہیں۔ یہ تو تمہیں بھی اوپر سے نیچے تک کھا جائیں، تمہاری ہڈیاں چبا جائیں۔" اس نے گہری نظر سے مارٹن کا جائزہ لیا گویا خود اپنے لیے بھی ایک آدھ چانپ منتخب کررہا ہو۔

پھر اس نے ایک خوب بھاری بھرکم، موٹے تازے، سفید سُور کی طرف اشارہ کیا جو تھوتھنی اٹھائے متجسس نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "اس سُور کو دیکھ رہے ہو؟ یہ درحقیقت سُورنی ہے۔ مادہ سُور۔ یہ میری پسندیدہ ترین سُورنی ہے۔ آخری بار جب ہم نے اسے وزن کی مشین پر کھڑا کیا تو اس کا وزن ساڑھے سات سو پونڈ تھا۔ یہ تو بہت ہی کھاتی ہے اور دنیا کی ہر چیز کھاتی ہے۔"

"یہ سُور خطرناک تو نہیں ہیں؟" مارٹن نے پوچھا۔

"نہیں۔ بشرطیکہ ان کا پیٹ بھرا ہو اور ان سے چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اس سودے کے بارے میں سوچوں گا لیکن شاید میں زیادہ اچھی قیمت نہ دے سکوں۔ اس زمین کے ساتھ بہت سے مسائل ہیں....."

زمیندار نے اس کی بات کاٹ دی اور ایک بار پھر نئے سرے سے اپنی املاک کی خصوصیات گنوانے لگا جو وہ پہلے ہی کافی تفصیل سے بیان کرچکا تھا۔

آخر کار مارٹن جب اس سے جان چھڑا کر واپس روانہ ہونے میں کامیاب ہوا تو وہ کچھ زیادہ اچھے موڈ میں نہیں تھا۔ اسے ہرگز امید نہیں تھی کہ اس کا سینئر پارٹنر یہ زمین اور فارم وغیرہ خریدنے پر آمادہ ہوگا۔ اسے یہ بھی امید نہیں تھی کہ زمیندار اگلے سال تک بھی اسے بیچنے میں کامیاب ہوجائے گا۔

مارٹن نہ جانے کیوں کچھ مضطرب سا بھی تھا۔ بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے بھاری بھرکم سُوروں کا وہ غول پھرنے لگتا۔ جس انداز میں زمیندار نے ان کی عادتوں کا نقشہ کھینچا تھا اسے یاد کرکے مارٹن کو کراہیت محسوس ہورہی تھی۔

شاید اسی لیے اس رات ڈائنا سے اس کا جو جھگڑا ہوا اس نے خاصی شدت اختیار کرلی۔ وہ پڑوسیوں کی پروا کیے بغیر ایک دوسرے پر خوب چیخے۔ ڈائنا نے اسے شرابی سور کا خطاب دیا اور مارٹن نے اسے طوائف کے نام سے پکارا۔ بالآخر مارٹن نے اپنے کمرے میں جاکر زور سے دروازہ بند کرلیا اور ٹی وی سیٹ آن کرلیا۔ اس کے بعد گویا سب کچھ معمول کے مطابق ہوگیا۔

لیکن نہ جانے کیوں اگلے ہفتے میں دو مرتبہ مارٹن پھر اس زمیندار کی زمین دیکھنے پہنچا تاہم اس نے زمیندار سے ملاقات نہیں کی۔ سُوروں کی چراگاہ کے قریب جاکر وہ دیر تک تاروں کے جنگلے کے پاس کھڑا ان کا جائزہ لیتا رہا۔ اسے خود نہیں معلوم تھا کہ وہ ایسا کیوں کررہا تھا۔ شاید اس کے لاشعور میں کوئی بات تھی۔

تیسری مرتبہ وہ وہاں پہنچا تو ایک قریبی ریستوران سے سُور کے گوشت کے تین برگر بھی ساتھ لیتا گیا۔ وجہ اب بھی اسے معلوم نہیں تھی لیکن وہ تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ نشیب میں پہنچ کر چراگاہ کے جنگلے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ موٹا سا ایک سُور ٹہلتا ہوا اس کے قریب آیا اور متجسس نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تھوتھنی اٹھا کر گویا ہوا میں کسی چیز کی بُو سونگھنے لگا۔

مارٹن نے مشینی سے انداز میں لفافہ کھولا اور برگر نکال لیا۔ جلدی سے ایک اور سور بھی قریب آگیا اور جنگلے کے تاروں سے رگڑ کھانے لگا۔ جنگلا لرزنے لگا۔ مارٹن کچھ گھبرا سا گیا۔ جلدی سے بولا۔ "یہ لو... یہ لو۔" اس نے برگر کا کچھ حصہ توڑ کر جنگلے کے اندر زمین پر پھینک دیا۔

وہ ٹکڑا ایک لمحے میں غائب ہوگیا۔ اس نے ایک اور ٹکڑا پھینکا۔ اس بار اس نے سور کے گوشت کا کباب اور ڈبل روٹی الگ الگ کردی تھی لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس نے دیکھا، سُور وہ دونوں چیزیں پلک جھپکتے میں نگل گئے تھے اور تھوتھنیاں اٹھا اٹھا کر مزید مانگ رہے تھے۔

"دفع ہو جاؤ غلیظ مخلوق!" مارٹن نفرت سے بولا۔ ایک عجیب سی جھنجلاہٹ میں اس نے جنگلے کے ایک چوبی ستون پر گھونسا رسید کیا اور اپنی کار کی طرف واپس چل دیا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تو اس کا جسم پسینے میں تر تھا۔ اسے اتنا احساس ضرور تھا کہ اس کے لاشعور میں کہیں کوئی چیز پل رہی تھی۔ کوئی دھندلا سا خیال..... کوئی عجیب سی بات.....!

اس احساس سے اسے خوف آرہا تھا۔ وہ اس سے بچنا چاہتا تھا۔

اس رات وہ گھر میں اپنا رات کا کھانا خود تیار کرنے کے لیے بچھڑے کے گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹ کر چاپڑ سے اس کو چپٹا کررہا تھا جب ڈائنا اندر آئی۔ وہ اس وقت اچھے موڈ میں تھی۔ عام حالات میں مارٹن اس وقت جھگڑے سے بچنے کی کوشش کرتا اور

ایک کپ اور...؟
TAPAL
ٹپال چائے
دانے دار

شاید کوئی اہم موضوع نہ چھیڑتا لیکن اس کے ذہن میں کھچڑی سی پک رہی تھی۔

"مجھے طلاق چاہیے۔" وہ یکدم بول اٹھا۔ "میں تمہیں لیور پول واپس بھجوانے کے اخراجات دے دوں گا۔"

"کیا کہا؟" ڈائنا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "تمہیں طلاق چاہیے؟ اتنا آسان سمجھ رکھا ہے تم نے یہ کام؟ جب دل چاہا عورت کو لا کر گھر میں ڈال لیا اور جب دل چاہا رخصت کر دیا۔ اس طرح نہیں ہونے دوں گی میں۔"

دوسرے ہی لمحے گویا کچھ سوچے سمجھے بغیر مارٹن کا ہاتھ حرکت میں آیا اور چاپر چپٹے رخ سے ڈائنا کی کھوپڑی پر پڑا۔ وہ ذرا سی بھی آواز نکالے بغیر دھب سے فرش پر گری اور وہیں ساکت ہو گئی۔

ایک لمحے کے لیے مارٹن بے وقوفوں کی طرح کچن کے وسط میں ساکت کھڑا رہا۔ اس کی گویا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو گیا تھا۔ چاپر خود بخود اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ ڈائنا کے پاس بیٹھ گیا۔ آنسو خود بخود اس کے رخساروں پر پھسلنے لگے۔ گلوگیر آواز میں وہ بولا۔ "دیکھا..... اسی لیے تو میں طلاق کی بات کر رہا تھا۔ میں تمہیں تکلیف پہنچانا نہیں چاہتا تھا..... لیکن تم نے میری یہ بات بھی مان کر نہیں دی....."

کئی منٹ تک وہ اسی طرح باتیں کرتا رہا معذرتیں کرتا رہا۔ بہت دیر بعد جا کر اسے احساس ہوا کہ وہ تو مر چکی ہے۔ تب وہ اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا اور ڈاکٹر ایمبولینس پولیس کو بلانے کے لیے ٹیلیفون کی طرف لپکا۔ اس نے ریسیور بھی اٹھا لیا لیکن پھر گویا اسے کوئی خیال آیا اور اس نے ریسیور رکھ دیا۔

بیڈ روم میں جا کر وہ بستر کی ایک چادر اٹھا کر لایا اور لاش کو ڈھانپ دیا۔ پھر میز پر بیٹھ کر اس نے ایک سگریٹ سلگائی اور اپنی کپکپاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ خاصی دیر وہ وہیں بیٹھا رہا۔ وہ کچھ سوچنے کچھ محسوس کرنے کے قابل نہیں تھا۔ دھیرے دھیرے اس کے ذہن نے کام کرنا شروع کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کے گھر میں سب کچھ معمول کے مطابق نظر آنا چاہیے اور اسے سب کام بالکل اس طرح کرنے چاہئیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

اس فیصلے سے اسے خاصے سکون اور طمانیت کا احساس ہوا۔ وہ اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ چاپر اس نے دھو کر واپس اس کی جگہ پر رکھا اور اپنے لیے کھانا تیار کرنے لگا۔ ایک عجیب دیوانگی آمیز سی کیفیت اس پر طاری تھی۔ کبھی اس کا رونے کو دل چاہتا کبھی ہنسنے کو۔ وہ "سوچ" رہا تھا کہ اگر وہ سوچنا چھوڑ دے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

کھانے سے فارغ ہو کر اس نے لاش کو اٹھایا اور مکان کے اندر ہی اندر سے گیراج میں لے جا کر کار میں ڈال دیا۔ اس کے بعد اس نے وہ تمام چیزیں بھی کار میں لاد لیں جن کی اسے ضرورت ہو سکتی تھی۔ آخر میں اس نے اپنے لیے کپڑوں کا ایک فاضل جوڑا بھی رکھ لیا۔

آدھے گھنٹے بعد اس کی کار سوروں کی چراگاہ کے دور افتادہ سرے پر نشیب میں جا رکی۔ اس کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ شام ڈھلے سُوروں کو لے جا کر باڑے میں بند کر دیا جاتا تھا اور صبح کا اجالا پھیلنے پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ وہ گھومتے پھرتے یہاں نشیب میں آ جاتے تھے جہاں اس وقت مارٹن موجود تھا۔

اس نے لاش کو اندر جھاڑیوں میں منتقل کیا پھر کار سے تمام ضروری چیزیں لے کر جھاڑیوں کے قریب جا کر چھوٹی سی ایک فلیش لائٹ روشن کر کے وہ رات کے سناٹے اور اس ویرانے میں ذہنی اندھے پن کے سے عالم میں تیزی سے اپنا کام کرنے لگا۔ اس کے پاس لوہے کا ٹب تیغہ کلہاڑی سب کچھ موجود تھا۔ اس کے باوجود کام آسان نہیں تھا۔

اس مصروفیت میں اسے تقریباً صبح ہو گئی۔ ڈائنا کے لباس کو اس نے نذرِ آتش کر دیا اور لاش کے ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھیر دیے۔ روزانہ کبھی تیز ہوائیں چلتی تھیں کبھی بارش ہوتی تھی کبھی برف باری۔ مارٹن کو یقین تھا کہ ڈائنا کے لباس وغیرہ کی راکھ کا تو شام تک نام و نشان بھی نہیں رہے گا اور جہاں تک لاش کے ٹکڑوں کا مسئلہ تھا تو موٹے موٹے وہ درجنوں سور.....

اس نے اپنے آلودہ کپڑے بھی جلا دیے تھے۔ لباس تبدیل کر کے وہ ذرا سکون کی سانس لے کر درختوں کے ایک جھنڈ میں چھپ کر سوروں کا انتظار کرنے لگا۔

چاروں طرف دھوپ پھیل چکی تھی جب کافی انتظار کے بعد سُوروں کی آمد کے کوئی آثار دکھائی نہ دیے تو وہ سخت دہشت زدہ ہو گیا۔ زمیندار نے اسے خود بتایا تھا کہ سورج کے طلوع ہوتے ہی وہ سُوروں کو باڑے سے نکال کر چراگاہ کی طرف دھکیل دیتا تھا۔ کہیں اس نے اپنا معمول بدل تو نہیں لیا تھا؟ کہیں اس نے بھی جدید طور طریقے تو اختیار نہیں کر لیے تھے اور سُوروں کو باڑے ہی میں رکھ کر تیار شدہ راتب دینا شروع کر دیا تھا؟

سورج سر پر آ رہا تھا اور مارٹن کا جسم نہ صرف پسینے میں بھیگ چکا تھا بلکہ وہ تھر تھر کانپ بھی رہا تھا۔ دفعتاً پہاڑی کی بلندی پر اسے ایک بھاری بھر کم سا وجود نمودار ہوتا دکھائی دیا۔ وہ غول کا پہلا سُور تھا جو نہایت مطمئن انداز میں دھیرے دھیرے گویا چہل قدمی کرتا نشیب کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے کچھ اور سُور بھی آتے دکھائی دیے۔

ایک جگہ رک کر انہوں نے تھوتھنیاں اٹھا کر گویا ہوا میں کچھ سونگھا پھر سیدھے اس طرف آنے لگے جدھر لاش کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ مارٹن جلدی سے جنگلے کے قریب جا پہنچا اور تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے لگا۔

کچھ دیر بعد مارٹن درختوں کے جھنڈ میں جا کر قے کرنے لگا۔ زمیندار نے ان سُوروں کے بارے میں جو کچھ کہا تھا' ٹھیک ہی تھا۔ تاروں کے جنگلے کے اندر اب صرف چند بڑی ہڈیاں پڑی رہ گئی تھیں۔ سور اب ٹہلتے ہوئے غالباً مزید خوراک کی تلاش میں آگے بڑھ رہے تھے۔

مارٹن کے معدے میں خوف اور کراہیت سے گرہیں سی پڑ رہی تھیں لیکن اسے ایک بار پھر جنگلے کو پھلانگ کر اندر جانا پڑا۔ اس نے بڑی بڑی وہ چند ہڈیاں سمیٹیں اور باہر آکر جنگل میں جا کر ایک گڑھا کھود کر دفن کر دیں۔ اب کہیں ڈائنا کے وجود کا کوئی نشان باقی نہیں رہا تھا۔ مطمئن ہو کر وہ اپنی کار میں بیٹھا اور واپس روانہ ہو گیا۔

دو دن بعد اس دکان سے فون آیا جہاں ڈائنا کام کرتی تھی۔ وہ ڈائنا کے بارے میں استفسار کر رہے تھے کہ وہ کام پر کیوں نہیں آ رہی۔ مارٹن نے لاعلمی کا اظہار کیا اور مزید دو دن کے انتظار کے بعد پولیس کو مطلع کیا۔ گاؤں زیادہ بڑا نہیں تھا اور ڈائنا کی شہرت سے اب تقریباً سبھی واقف تھے۔

پولیس کا رویّہ ہمدردانہ تھا۔ پولیس آفیسر نے ابتدائی اور رسمی کارروائی کے بعد گویا اسے تسلی دی۔ "وہ ضرور واپس آ جائے گی۔ زیادہ تر گمشدہ لوگ واپس آ جاتے ہیں۔"

اس طرح چھ ماہ گزر گئے۔ تب لیورپول میں موجود' ڈائنا کے کنبے نے شور مچانا شروع کیا اور اس سلسلے میں سنجیدگی سے تفتیش شروع ہوئی۔ مارٹن سے خوب پوچھ گچھ کی گئی۔ ایک نوجوان' نرم خو مگر نہایت مستقل مزاج قسم کا پولیس آفیسر گویا اس کے پیچھے لگ گیا تھا۔ اس نے ڈائنا کے تمام سامان کا بھی نہایت تفصیل سے جائزہ لیا۔ تب مارٹن کو افسوس ہوا کہ اس سے ایک کوتاہی سرزد ہوئی تھی۔ اسے ڈائنا کا کچھ ضروری سامان' کپڑے اور ایک سوٹ کیس بھی غائب کر دینا چاہیے تھا تاکہ کم از کم یہ تو ظاہر ہوتا کہ وہ کسی سفر پر گئی تھی' جہاں سے شاید اس کا واپسی کا ارادہ نہیں رہا تھا۔

مارٹن اپنی دانست میں ہر چیز معمول پر لا چکا تھا لیکن اب سکون کی تہ میں کوئی طوفان کروٹیں لینے لگا تھا۔ پولیس کی ہمدردی اب غالباً شبہات میں بدلتی جا رہی تھی۔ مارٹن کو اپنے کیے پر کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ اس قسم کے حالات کا شکار ہونے والے بیشتر لوگوں کی طرح وہ خود کو حق بہ جانب سمجھتا تھا۔ پچھتاوا صرف اس بات کا تھا کہ اس سے ضرور کہیں نہ کہیں' کوئی نہ کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے۔

اس کا یہ وہم دن بہ دن بڑھتا جا رہا تھا اور اس کے دل میں ایک مستقل خوف نے گھر کر لیا تھا۔ ہر وقت وہ یہی سوچتا رہتا کہ اس نے ضرور کہیں کوئی سراغ چھوڑ دیا ہوگا۔ شاید چراگاہ میں کہیں نہ کہیں کوئی چیز پڑی رہ گئی ہو گی۔ ادھر نوجوان سراغرساں مستقل

طور پر اس کے پیچھے لگ گیا تھا۔ وہ خود کہہ چکا تھا کہ وہ اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

نہ جانے کیوں مارٹن کو خوف محسوس ہوتا کہ سراغرساں ایک نہ ایک دن اس چراگاہ تک جا پہنچے گا' زمیندار اسے سُوروں کی خوراک کے بارے میں بتائے گا اور پھر...

مارٹن کو اس سے آگے سوچنے کی جراُت نہ ہوتی اور وہ جھرجھری لے کر رہ جاتا۔ واہموں' اندیشوں اور خوف نے اسے اتنا تنگ کیا کہ وہ رہ نہ سکا اور آخر کار ایک شام اس نے اپنی زندگی کی تیسری بڑی حماقت کر ڈالی۔ اس نے اپنا کلپ بورڈ اور قلم وغیرہ لیا۔ گویا وہ کچھ سروے وغیرہ کا کام کرنے جا رہا تھا۔

کار میں بیٹھ کر وہ گھر سے نکلا۔ پہلے اس نے اطمینان کیا کہ کوئی اس کا تعاقب نہیں کر رہا تھا پھر وہ فارم کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ ایک بار چراگاہ کا جائزہ لے کر اطمینان کرنا ضروری تھا کہ کہیں کوئی سراغ تو نہیں رہ گیا تھا' کہیں اس نے کسی چیز کو نظرانداز تو نہیں کر دیا تھا؟

دیہی علاقے میں ٹھنڈ زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ زمین کے گڑھوں میں برف جمی ہوئی تھی۔ سورج ڈوب رہا تھا اور اس کی نارنجی کرنوں کی وجہ سے کہیں کہیں رنگینی کا احساس ہو رہا تھا ورنہ ہر طرف ایک یخ بستہ سی سفیدی پھیلی ہوئی تھی۔

چراگاہ کے دور اُفتادہ حصے میں پہنچ کر وہ خاصی دیر تاروں کے جنگلے سے لگا کھڑا رہا۔ وہ اپنے آپ کو مضمحل اور بیمار محسوس کر رہا تھا۔ بالآخر روشنی غائب ہونے لگی تو اسے احساس ہوا کہ اسے اپنا کام ختم کر لینا چاہیے۔ سُور بھی خود بخود ڈھلائی کی طرف واپس چل دیے تھے۔ وہ غالباً اندھیرا ہوتے ہی باڑے میں واپس جانے کے عادی تھے۔

مارٹن اندر کود گیا اور بغور زمین کا جائزہ لینے لگا۔ کہیں بند گوبھی کا کوئی پتا پڑا تھا اور کہیں شلغم کا کوئی ٹکڑا لیکن جو کچھ اس نے کیا تھا اس کا کوئی معمولی سا سراغ بھی کہیں نہیں تھا۔

کہیں کوئی چیز نہ ملنے سے اسے اطمینان کے بجائے دھیرے دھیرے بے اطمینانی ہونے لگی۔ اس کے اندیشوں کا رخ بدل گیا۔ آخر ایسی بھی کیا بات... کہیں تو کوئی چھوٹی موٹی چیز ہونی چاہیے تھی۔ کوئی بٹن... کوئی زپ کا ہک... کسی ہڈی کا کوئی چھوٹا موٹا ٹکڑا... ایسا بھی کیا صفایا!

یقیناً پولیس اس سے پہلے یہاں پہنچ چکی تھی اور اسے جو بھی سراغ ملا تھا' سمیٹ کر لے گئی تھی۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ عین اس وقت وہ نوجوان سراغرساں اس قسم کی کئی چھوٹی موٹی چیزیں ایک مخصوص لفافے میں بند کر کے لیبارٹری والوں کے حوالے کر رہا ہو...

اسے جھرجھری سی آگئی۔ وہ چاروں ہاتھوں پیروں کے بل اِدھر اُدھر پھر کر زمین پر جھک کر دیوانہ وار کوئی سراغ تلاش کرنے لگا۔ وہ زمین سے برف کی تہیں اکھاڑ اکھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اس کا جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا مگر انگلیاں یخ تھیں اور ہاتھ چٹخنے لگے تھے۔

اس کی وحشت لحہ بہ لحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ کوئی سراغ ملنا ضروری تھا ورنہ وہ اپنے آپ کو محفوظ محسوس نہیں کر سکتا تھا' ایک لمحے کے لیے بھی سو نہیں سکتا تھا' کچھ کھا پی نہیں سکتا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح سخت زمین اور کہیں کہیں جمی برف کو کھرچ رہا تھا۔

وہ تلاش میں اس طرح منہمک تھا کہ اپنے اردگرد اسے کسی وجود کا احساس نہیں ہو سکا۔ اچانک ہی اس نے سر اٹھایا تو اپنے آپ کو سُوروں کے نرغے میں پایا۔ وہ تھوتھنیاں جھکائے گویا اسے سونگھ رہے تھے' عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی شاطر آنکھوں میں بھوک کی چمک تھی۔ بعض کے دہن نیم وا تھے اور ان کے چھوٹے چھوٹے زرد دانت جھانک رہے تھے۔ وہ اپنے بالوں بھرے موٹے موٹے جسموں سے گویا اس کے گرد ایک مضبوط دیوار بنائے کھڑے تھے۔

"نہیں...." مارٹن ہاتھ ہلاتے ہوئے دہشت زدہ لہجے میں بولا پھر چلا اٹھا۔ "جاؤ... جاؤ... خدا کے لیے یہاں سے چلے جاؤ۔" وہ انہیں دھکیلنے لگا۔

مگر سُور دور جانے کے بجائے کچھ اور قریب آگئے۔ مارٹن کے دھکیلنے سے کوئی سُور اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں تھا اور اس کے چیخنے سے گویا ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔ ایک سُور نے اپنی نم آلود تھوتھنی سے اسے چھوا۔ مارٹن نے دہشت زدہ ہو کر ہاتھ گھمایا۔

گزشتہ مہینوں کے دوران ایک انجانا خوف گویا اس کے دل میں قطرہ قطرہ جمع ہوتا رہا تھا۔ اب اس میں یہ نئی دہشت شامل ہو گئی تھی اور یکدم یہ سب کچھ گویا اس کے دل کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ جس راز کی اذیت وہ اس دل میں چھپائے ہوئے تھا وہ بھی گویا اس نہاں خانے سے ابل پڑنے کو بے تاب تھا۔

اس عالم میں اس کا دل اچانک ہی جواب دے گیا اور وہ یخ بستہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کا ہاتھ سینے پر تھا۔ چند لمحے بعد اس کا جسم گویا تشنج کے سے عالم میں اکڑ گیا۔

سُور گویا کچھ حیرت اور کچھ الجھن کے عالم میں اس کی طرف دیکھتے رہے پھر دھیرے دھیرے واپس چل دیے۔

دوسرے روز دن چڑھے وہ دوبارہ اس طرف آئے تو مارٹن کی لاش اسی طرح' اسی جگہ پڑی تھی۔ آج سُور خوب بھوکے تھے... اور تب انہوں نے فیصلہ کیا کہ پیٹ بھرنے کے لیے وہ کھانا بھی کچھ ایسا بُرا نہیں تھا...!

PIGS KILL
JANICE LAW

قاتل آہٹ

بلال احمد

وہ تنہا تھی۔ خوف اور خدشات کے اندھے کنوئیں میں ہاتھ پیر مار رہی تھی۔ روشنی کی کوئی کرن اس کے ہمراہ نہ تھی۔ یہ خوف اُس کے اعصاب کو تباہ کر رہا تھا۔ چلچلاتی دھوپ میں کوئی شجر سایہ دار راہ میں نہ تھا۔ بالآخر اپنی مدد آپ کے اصول کو اپناتے ہوئے اُس نے خود آگے بڑھ کر تیشہ اُٹھالیا اور منزل کی جانب قدم بڑھا دیے۔

خوف کے سناٹے اور وہم کے ہنگامے کے مابین ایک تنہا زندگی کا فسانۂ عبرت

جاسوسی ڈائجسٹ، جولائی 1993ء

چند دن سے قدموں کی وہ آواز میرے تعاقب میں رہنے لگی تھی۔ یوں تو فٹ پاتھ پر چلنے والے بیسیوں راہ گیروں کے قدموں کی آوازیں ایک دوسرے میں گڈمڈ رہتی تھیں لیکن وہ مخصوص آواز رفتہ رفتہ جیسے اپنے آپ کو دوسری آوازوں سے الگ تھلگ کرلیتی تھی۔ اس کا ناتا گویا میرے قدموں سے جُڑ جاتا تھا۔ میں تیز چلنے لگتی تو وہ آواز بھی تیز ہو جاتی، میں رفتار کم کرلیتی تو اس آواز کا تسلسل بھی دھیما پڑ جاتا۔

اب تک مجھے گرمی کی لہر اور اپنے شوہر مارٹن کی یادوں کے سوا کسی چیز کا احساس نہیں تھا۔ میں کام پر جانے کے لیے نکلتی تو اپنے خیالات میں کھوئی چلتی رہتی۔ مجھے صحیح طور پر یاد نہیں تھا کہ کب سے مجھے قدموں کی یہ مخصوص آواز سنائی دینے لگی تھی۔ آواز بہت خفیف تھی۔ شاید کسی اور کو سنائی بھی نہ دیتی ہو۔ وہ ربڑ کے تلے والے جوتے تھے جن کی آہٹ میں سختی تھی۔ غالباً جوگرز تھے۔

اس روز میں نے رفتار تیز کی تو میرے تعاقب میں آنے والا بھی تیز چلنے لگا۔ بالآخر میں تقریباً دوڑنے لگی۔ تب وہ بھی دوڑتا ہوا میرے تعاقب میں آنے لگا۔ پھر وہ میرے برابر ہی آن پہنچا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ گردن گھما کر صحیح طور پر اس کی طرف دیکھتی۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا تو مجھے دھندلے سے سنہرے بالوں کی جھلک دکھائی دی۔ مجھے اپنے رخسار پر کسی کی سانس کی

حرارت تک محسوس ہوئی جس میں سگریٹ کے دھوئیں کی بُو بھی شامل تھی۔

پھر میں نے ایک مضبوط مردانہ ہاتھ اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ اس کی انگلیوں پر نکوٹین کے دھبّے تھے اور ناخن ٹوٹے ہوئے تھے۔ دوسرے ہی لمحے یہ ہاتھ میرے کندھے پر لٹکا ہوا پرس کھینچ کر لے گیا۔ میں نے پرس کو بچانے کی کوشش کی لیکن مجھے عقب سے بڑے زور سے دھکا دیا گیا اور میں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل اس گندے شہر کے گندے سے فٹ پاتھ پر جا گری۔

میں گٹر کے قریب گری تھی۔ میرا ایک رخسار بھی فٹ پاتھ کے فرش پر رگڑ کھا گیا۔ گٹر میں کوڑا کرکٹ پڑا گل سڑ رہا تھا۔ میں نے اپنے بھورے بال پیشانی سے ہٹاتے ہوئے اس شخص کو دیکھنے کی کوشش کی جس نے میرا پرس چھینا تھا۔ وہ مجھے سڑک کے کونے پر نظر سے اوجھل ہوتا دکھائی دیا۔ میں صرف اس کی جیکٹ کی جھلک دیکھ سکی۔ جیکٹ نیلے رنگ کی تھی۔

میرے حواس مختل ہو گئے تھے اور سانس گویا سینے میں رک گئی تھی۔ میں فٹ پاتھ سے نیچے لڑھک گئی تھی اور کوئی گاڑی مجھے کچلتی ہوئی بھی گزر سکتی تھی۔ میں نے تیزی سے گزرتی گاڑیوں کے سائلنسروں سے نکلتا ہوا گرم دھواں اپنے چہرے پر محسوس کیا۔ میں فوری طور پر اٹھنے میں کامیاب نہ ہو سکی اور کسی نے مجھے اٹھنے میں مدد نہیں دی۔ اس کے بجائے لوگ نظر چُرا کر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتے چلے گئے۔ انہوں نے گویا کچھ دیکھا ہی نہیں تھا۔

میرے جسم سے پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔ لباس دو ایک جگہ سے پھٹ گیا تھا اور کہیں کہیں سے مسک گیا تھا۔ ہتھیلیاں اور گھٹنے چھل گئے تھے۔ رخسار پر بھی جلن محسوس ہو رہی تھی۔ حواس کچھ بجا ہوئے تو میں خود ہی اٹھی۔ ایک عجیب سا، توہین اور تذلیل کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ میں نے اپنا بریف کیس اٹھایا اور سٹی کورٹ ہاؤس کی عمارت کی طرف چل دی جو تقریباً ایک بلاک کے فاصلے پر رہ گئی تھی۔

میں آفس میں داخل ہوئی تو ہماری پارٹ ٹائم ریسپشنسٹ اور فل ٹائم ڈراما آرٹسٹ لا ٹیشا کی آنکھیں مجھے دیکھ کر نہایت ڈرامائی انداز میں پھیل گئیں اور وہ گویا اسٹیج پر مکالمے بولنے لگی۔ ”لڑکی تم کہاں تھیں اور کیا کر رہی تھیں جو تمہارا یہ حال ہو گیا ہے؟ تم تو زخمی بھی نظر آ رہی ہو۔“

میں نے اسے بتایا کہ سرِ راہ میرا پرس چھین لیا گیا تھا پھر میں نے اسے پولیس کو فون کرنے کے لیے کہا۔ پہلے اس نے مجھے سہارا دے کر کانفرنس روم میں لے جا کر بٹھایا پھر فون کرنے چلی گئی۔ وہ واپس آئی تو میرے لیے گرم کافی کا کپ اور ہاتھ پاؤں وغیرہ صاف کرنے کے لیے نم آلود پیپر ناولز بھی لے آئی۔

کچھ دیر بعد ظاہری طور پر میری حالت کچھ بہتر ہو گئی لیکن میرے اعصاب ابھی تک تھرتھرا رہے تھے۔ میرے جسم پر کپکپی سی باقی تھی۔ بھاری بھرکم سا ایک باوردی پولیس آفیسر آ پہنچا جس نے میرا بیان لیا لیکن اس کا انداز بتا رہا تھا کہ میرا یہ بیان وغیرہ لکھوانا محض وقت کا ضیاع ہی تھا۔ میں حملہ آور کے صرف بالوں، ہاتھوں اور جیکٹ کے پچھلے حصے کی جھلک دیکھ سکی تھی۔ محض ان کی مدد سے تو اسے انسانوں کے سمندر میں تلاش نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں نے پولیس آفیسر سے پوچھا کہ میری چھینی گئی چیزیں واپس ملنے کا کس حد تک امکان تھا تو وہ پنسل کان پر اٹکا کر پیشانی مسلتے ہوئے بولا۔ ”خاتون! میں آپ کی جگہ ہوتا تو زیادہ پُرامید نہ رہتا، لیکن بہرحال..... کبھی کبھی عجیب واقعات بھی رونما ہو جاتے ہیں۔“

اس کے جانے کے بعد کورٹ ہاؤس میں کام کرنے والی سیکریٹریوں، سرکاری اور عام وکیلوں وغیرہ کی ایک بڑی تعداد مجھ سے اظہارِ ہمدردی کے لیے آئی۔ سب لوگوں نے فرداً فرداً اس موضوع پر بھی اظہارِ خیال کیا کہ شہر جہنم بنتا جا رہا تھا۔

ڈسٹرکٹ اٹارنی میرا باس تھا۔ اسے کام کا جنون تھا۔ کام کا نشہ اس کی رگوں میں اترا ہوا تھا۔ وہ پوچھنے آیا کہ کیا میں کچھ دیر کی چھٹی لینا چاہوں گی۔ ساتھ ہی اس نے مجھے یہ بھی یاد دلایا کہ مجھے یہاں ملازمت کرتے ہوئے صرف ڈھائی ماہ ہوئے تھے اور ابھی میں تنخواہ کے ساتھ بیماری کی چھٹی لینے کی مستحق نہیں ہوئی تھی۔

”دیکھو بیٹی!“ وہ بولا۔ ”اگر تم واقعی گھر جانے کی ضرورت محسوس کر رہی ہو تو.....“

میں نے اس کی بات کاٹ کر اسے تسلی دیتے ہوئے واپس اس کے کمرے میں بھیج دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے دفتر میں کام کا انبار تھا۔ میں نے اسے اطمینان دلا دیا تھا کہ میں، اس کی نئی اسسٹنٹ خواہ کسی حال میں بھی تھی لیکن ایک دن کی بھی چھٹی لے کر گھر نہیں جا رہی تھی۔ وہ کام کے سلسلے میں میری اس لگن سے متاثر ہو کر اپنے کمرے میں واپس گیا تھا لیکن یہ تو مجھے ہی معلوم تھا کہ میرے اس فیصلے میں لگن کو کچھ زیادہ دخل نہیں تھا۔ میں نے اپنے چھوٹے سے کیبن نما آفس میں پہنچ کر کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں اور ذہن کو بھٹکنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا۔

گھر... میرے لیے اب گھر کے کیا معانی رہ گئے تھے؟ بس ایک خالی خالی سا اپارٹمنٹ تھا جس کی دیواریں احساسِ تنہائی کے پنجوں سے میرے ذہن کو نوچنے کے لیے بڑھی آتی تھیں۔ ایک ہفتہ پہلے میرے شوہر مارٹن نے ہماری شادی کی آٹھویں سالگرہ پر مجھے علیحدگی کا حیرت انگیز تحفہ دیا تھا۔

اس نے واقعی مجھے حیران کر دیا تھا۔ اس نے اچانک ہی اپنا سامان دو سوٹ کیسوں میں پیک کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ گھر چھوڑ کر جا رہا تھا، دو تین ہفتوں بعد وہ باقی معاملات طے کرنے کے لیے بھی انتظامات کروے گا۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ گزشتہ رات مجھے علیحدگی کے کاغذات ڈاک سے موصول ہو گئے تھے جو طلاق کی طرف پہلا قدم تھا۔ مارٹن طلاق چاہتا تھا۔

قاصد ابھی کاغذات کی رسید پر مجھ سے دستخط کروا کے رخصت ہی ہوا تھا کہ ممی کا فون آگیا۔ وہ ایک بار پھر وہی شکوہ کررہی تھیں کہ نو ماہ قبل میں نے میڈ سن جیسا پُرسکون اور چھوٹا سا شہر چھوڑ کر نیویارک منتقل ہو کر سخت غلطی کی تھی اور اب ہم زیادہ کرائے کے پُرتعیش اپارٹمنٹ میں رہ کر رقم ضائع کررہے تھے۔ وہ ابھی تک جمع کا صیغہ استعمال کررہی تھیں۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ مارٹن اب اس اپارٹمنٹ میں نہیں تھا۔

پھر وہ فون پر ہی مجھے ایک اخباری مضمون سے اقتباس پڑھ کر سنانے لگیں جس میں بتایا گیا تھا کہ امریکا کے بڑے بڑے شہروں میں جرائم کی شرح کس تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ ان کی ٹیلی فون کال کے دوران مجھے کچھ بولنے کا موقع نہیں ملا اور جب انہوں نے فون بند کیا تو میری سانس گویا سینے میں اٹکی ہوئی تھی۔ اس وقت میں نے یہ فیصلہ بھی کیا تھا کہ انہیں یہ بتانے کی نسبت کہ مارٹن مجھے چھوڑ کر چلا گیا تھا، میں مرجانا زیادہ پسند کروں گی۔

اس کے بعد آج صبح مجھے لُوٹ لیا گیا تھا۔ میں اندر ہی اندر گویا روتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ "خدایا! آخر مجھ سے ایسی کون سی غلطی ہوئی تھی جو میرے ساتھ یہ سب کچھ ہورہا تھا؟"

بالآخر میں نے خود پر جبر کرکے کام شروع کیا تب بھی بار بار مجھے یہی واقعہ یاد آتا رہا۔ آخر اس لٹیرے نے میرا ہی انتخاب کیوں کیا تھا؟ پھر اچانک ہی مجھے ایک اور بات یاد آئی۔ میرے سر پر گویا ہتھوڑا سا پڑا۔ میرا شناختی کارڈ، دیگر کاغذات، سٹی ایمپلائمنٹ کارڈ، ڈرائیونگ لائسنس اور اپارٹمنٹ کی چابیاں بھی تو پرس میں ہی تھیں۔

میں نے اپنے آپ کو کوسا کہ مجھے یہ بات اتنی تاخیر سے یاد آئی تھی۔ لٹیرا تو میرے اپارٹمنٹ میں جاکر وہاں کا بھی صفایا کرسکتا تھا۔ میں نے اپنی عمارت کے منیجر کو فون کیا۔ اس نے مجھے تسلی دی کہ وہ فوراً ہی میرے اپارٹمنٹ کا تالا بدل دے گا اور نئے تالے کی چابی رات کے چوکیدار جمی کے پاس چھوڑ جائے گا۔

اس روز میں نے پانچ بجے ہی کام چھوڑ دیا حالانکہ عام طور پر میں دیر تک کام کرتی تھی لیکن اس وقت میرا تھکن سے بُرا حال تھا اور طبیعت بڑی مضمحل محسوس ہورہی تھی۔ چوٹوں کی تکلیف بھی ابھرنے لگی تھی اور مجھے اندازہ تھا کہ جب میں اپنے ویران اپارٹمنٹ میں تاریکی اور تنہائی میں لیٹوں گی تو یہ تکلیف زیادہ ستائے گی۔

مجھے صحیح طور پر یہ بھی احساس نہیں ہوسکا کہ میں کس طرح گھر تک پہنچی۔ میں جمی سے نئی چابی لے کر فوراً اپنے اپارٹمنٹ میں جا کر اپنے آپ کو اندر مقفل کرکے دنیا سے ناتا توڑ لینا چاہتی تھی لیکن جمی مجھے بلڈنگ کے بڑے اور بھاری بھرکم سے شیشے کے دروازے کے سامنے کھڑا نظر نہ آیا۔

میں نے اسے اِدھر اُدھر تلاش کیا تو وہ دو تین عمارتیں چھوڑ کر ایک عمارت کے برآمدے میں کھڑا سگریٹ پیتا نظر آیا۔ یہ کوئی پہلا موقع نہیں تھا کہ وہ اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر اِدھر اُدھر پھر رہا تھا۔ وہ اکثر ایسا کرتا تھا۔ وہ ڈیوٹی کے معاملے میں زیادہ بھروسے کے قابل نہیں تھا لیکن اس کا رویّہ نہایت دوستانہ اور ہمدردانہ ہوتا تھا، اس لیے منیجر سے اس کی شکایت کرنے کو میرا جی نہیں چاہتا تھا۔

اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی میں نے دہرا تالا بند کیا اور بریف کیس ایک کرسی پر پھینک کر سیدھی فریج کی طرف بڑھی۔ اس وقت کوئی ٹھنڈی میٹھی چیز کھانے کو بڑی شدت سے جی چاہ رہا تھا۔ فریج کے سامنے کھڑے ہو کر ہی میں نے جیکٹ اتاری تو کندھے میں اچھے خاصے درد کا احساس ہوا۔ میں کراہ اٹھی۔ جیکٹ ایک طرف پھینک کر میں نے فریج سے چاکلیٹ آئس کریم نکالی اور اس خوبصورت چمچ سے کھانے لگی جس کا پورا سیٹ ممی نے میری اور مارٹن کی شادی کی پہلی سالگرہ پر تحفے میں دیا تھا۔

آئس کریم کی ٹھنڈک معدے سے گویا میرے پورے دُکھتے ہوئے وجود میں پھیل گئی۔ پھر میں نے گرم پانی سے غسل کیا تب جا کر اپنی حالت کچھ بہتر محسوس ہوئی۔

یہ پیر کا واقعہ تھا لیکن بدھ کے روز تک میرے اعصاب پر اس کے اثرات کم نہیں ہوئے تھے۔ مجھے بار بار اس واقعے کی یاد مضطرب کردیتی۔ ایک اور احساس سے میں کوشش کے باوجود پیچھا نہیں چھڑا پارہی تھی۔ باہر گلی کوچے میں کہیں بھی چلتے وقت مجھے یہ

احساس رہتا جیسے کوئی میرا پیچھا کررہا ہو' مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہو لیکن اجنبی چہروں کے سمندر میں اسے تلاش کرنا بہت مشکل تھا۔

ہر طرف انسانوں کا ایک سیل رواں دکھائی دیتا تھا لیکن دل کی تنہائی تھی کہ بڑھتی جارہی تھی۔ کسی سے کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کرنے کو جی چاہتا۔ اس روز ہماری ریسپشنسٹ لاٹیشا نے اپنائیت سے میرا حال پوچھا تو باتوں باتوں میں' میں نے اسے بتا دیا کہ میرے خیال میں کوئی ہروقت میرا تعاقب کرتا تھا' مجھ پر نظر رکھتا تھا۔

اس نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا اور تب مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے غلطی سرزد ہوچکی تھی۔ مجھے اس سے اس قسم کی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اس نے مجھے اعصاب کو سکون دینے والی کوئی دوا استعمال کرنے کا مشورہ دیا۔

اسی روز بعد میں' میں نے لاٹیشا کو دفتر کے کچھ کلرکوں سے بات کرتے دیکھا۔ وہ کچھ رازدارانہ سے انداز میں کھسر پھسر کررہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں ان کی طرف متوجہ نہیں ہوں۔ کھسر پھسر کرتے ہوئے انہوں نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا اور مجھے اندازہ ہوگیا کہ اب تک دفتر میں سب کو معلوم ہوچکا ہوگا کہ میں اس واہمے میں مبتلا ہوں کہ کوئی غیر مرئی شخص میرا تعاقب کرتا ہے' میری نگرانی کرتا ہے۔ شاید اس احساس کا نتیجہ تھا یا کوئی اور بات تھی کہ کچھ دیر بعد میرے سر میں شدید درد ہونے لگا۔ لیڈیز روم میں جاکر میں نے چند گولیاں اسپرین کی حلق سے اتاریں تب کچھ دیر بعد جاکر کچھ سکون ہوا۔

اس روز شام ڈھلے' ٹلگجے اندھیرے میں گھر تک جانا میرے لیے ایک صبر آزما مرحلہ بن گیا۔ میں گویا کسی ڈراؤنے خواب کے دوران چل رہی تھی۔ کئی بار میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ کوئی میرا تعاقب نہیں کررہا تھا' کوئی میری نگرانی نہیں کررہا تھا اور میرے اردگرد وہی سب چہرے تھے جو روزانہ ہوتے تھے لیکن خود کو سمجھانے بجھانے کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ مختصر سا سفر میرے لیے قیامت ہوا جارہا تھا۔

میں نے ابھی اپنے اپارٹمنٹ کا تالا نہیں کھولا تھا کہ اندر فون کی گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ میں جلدی سے تالا کھول کر فون سننے بھاگی اور اپنے عقب میں دروازہ بند کرنا بھول گئی۔ اس وقت تک فون کی تین گھنٹیاں بج چکی تھیں۔ میرے ریسیور اٹھاتے ہی ہلکی سی کلک کی آواز سنائی دی اور سلسلہ منقطع ہوگیا۔

پھر میری نظر چوپٹ کھلے دروازے پر پڑی اور میں کانپ اٹھی۔ لپک کر میں نے دروازہ بند کیا اور اسے دہرا تالا لگایا۔ اپنے آپ کو اپارٹمنٹ میں مقفل کرلینے کے بعد میری کپکپی کچھ کم ہوئی۔

اس رات بیڈ روم میں جانے سے پہلے میں نے ایک بھاری تپائی گھسیٹ کر دروازے کے پیچھے رکھی پھر اپنے دن کے کپڑوں میں ہی' تمام لائٹس آن رکھ کر بیڈ پر لیٹی رہی۔ ظاہر ہے اس عالم میں نیند کہاں آسکتی تھی۔ خوف کے پردوں میں لپٹا ہوا ایک عجیب سا انتظار میرے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں سمایا ہوا تھا۔ جیسے کوئی آنے والا تھا' جیسے کچھ ہونے والا تھا! اسی عالم میں صبح ہوگئی۔

نیند کی کمی کی وجہ سے جمعرات کی صبح میرے اعصاب کچھ اور کشیدہ تھے۔ میں دفتر جانے کے لیے نکلی تو اپنی بلڈنگ سے چند قدم کے فاصلے پر ہی ایک نیوز اسٹینڈ سے اخبار خریدنے کے لیے رک گئی۔ اچانک میں نے اپنے عقب میں قدموں کی آواز سنی۔ آواز تیزی سے میرے قریب آرہی تھی۔

میں تیزی سے گھومی اور مجھے خیال ہی نہ رہا کہ اس دوران اخبار لینے کے لیے میرا بازو پھیلا ہوا تھا۔ میرا ہاتھ خاصے زور سے مسز سالمن کے منہ پر پڑا جو غالباً اخبار ہی لینے کے لیے تیزی سے آرہی تھیں۔ وہ بہتر سالہ بیوہ خاتون تھیں اور میری ہی بلڈنگ میں رہتی تھیں۔ وہ سڑک پر گر پڑیں۔ ان کے ساتھ ان کا چھوٹا سا کتا بھی تھا جو بری طرح بھونکنے لگا اور میری ٹانگ پکڑنے کے لیے لپکنے لگا۔

"اوہ.... مسز سالمن! مجھے واقعی دلی افسوس ہے...." میں نے تیزی سے کہا۔ "مجھے معاف کردیجیے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے پیچھے آپ آرہی ہیں۔"

میں نے انہیں سہارا دے کر اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن انہوں نے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور خود ہی کوشش کرکے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ پھر وہ غصے سے تقریباً پھنکارتے ہوئے بولیں۔ "تمہاری دماغی حالت کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہوتی۔ آخر تمہیں پاگلوں کی طرح ہاتھ گھمانے کی کیا سوجھی تھی؟ اس طرح گرنے سے میری کوئی ہڈی بھی ٹوٹ سکتی تھی لیکن ٹوٹ بھی جاتی تو تمہیں کیا پروا ہوتی۔ تمہارا تو مسئلہ یہی ہے کہ دوسروں کے لیے تمہارے دل میں ذرا بھی ہمدردی' ذرا بھی احساس نہیں ہے۔"

میں نے ایک بار پھر معذرت چاہی لیکن ان کی برہمی میں کمی نہ آئی۔ وہ اسی خونخوار لہجے میں بولیں۔ "خواہ مخواہ کی معذرتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم سب جوان لوگ ایک جیسے ہوتے ہو۔ ہمیشہ تیزی میں.... ہمیشہ جلدی میں رہتے ہو۔ صرف اپنے بارے میں سوچ رہے ہوتے ہو۔ دوسروں کی تو تمہیں ذرہ برابر بھی پروا نہیں ہوتی۔ تمہاری وجہ سے آج میرے پوپی کو ہارٹ اٹیک بھی ہوسکتا تھا۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنے چھوٹے سے کتے پوپی کو گود میں اٹھالیا اور اس کا سر سہلاتی' اسے پچکارتی وہاں سے چل دیں۔

میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ آفس پہنچ کر میں نے کسی سے مسز سالمن یا گزشتہ رات کی پُراسراری فون کال والے واقعے کا ذکر نہیں کیا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے ساتھی کارکنوں کی افواہ ساز فیکٹری کو مزید خام مال مل جائے۔ اپنی میز پر بیٹھ کر میں نے گہری سانس کے ساتھ جھرجھری سی لی اور فیصلے پر پہنچ گئی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

اس شام سب وے میں گھر واپس جاتے وقت میں ایسے کسی

شخص کی تلاش میں ہر طرف نظر دوڑاتی رہی جس کے بال مٹیالے سنہرے ہوں۔ سب وے کے اس کمپارٹمنٹ میں ایسے کئی مرد موجود تھے۔ کبھی کن انکھیوں سے اور کبھی گردن ادھر ادھر گھما کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے اعصابی تناؤ کی وجہ سے میری آنکھوں اور سر میں درد ہونے لگا۔ بظاہر ان میں سے کوئی میری طرف متوجہ نہیں تھا۔

سب وے سے اتر کر کچھ فاصلہ پیدل طے کر کے میں اپنی بلڈنگ تک پہنچی تو جمی لابی میں دروازے پر ہی کھڑا نظر آیا۔ اس نے دو انگلیاں پیشانی تک لے جا کر سلام کیا اور لفٹ کے لیے بٹن دبا دیا۔ میں کچھ اس طرح لفٹ میں سوار ہوئی جیسے کوئی میرے تعاقب میں آرہا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ جمی عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

اپارٹمنٹ میں پہنچ کر میں نے تالا لگاتے ہی بیڈ روم کا رخ کیا اور کپڑوں کی الماری کھولی۔ سب سے اوپر کے خانے میں ہاتھ مار کر میں نے جوتوں کا ایک ڈبا اپنی طرف کھینچا۔ شیلف سے اتارتے ہوئے ڈبا کھل گیا اور سیاہ ریوالور فرش پر گر پڑا۔

اس ریوالور کو کچن میں میز پر رکھ کر میں دیر تک گھورتی رہی۔ وہ مجھے چھوٹا سا ایک سیاہ آہنی عفریت معلوم ہو رہا تھا۔ مجھے اس وقت سے بندوق، پستول وغیرہ سے بہت خوف آتا تھا جب سے ڈیڈی نے ریوالور سے خودکشی کی تھی۔ ممی حالانکہ یہی کہتی تھیں کہ وہ ایک حادثہ تھا لیکن مجھے کچھ زیادہ یقین نہیں تھا۔

وہ ریوالور جو میرے سامنے رکھا تھا، مارٹن کا تھا لیکن اس نے اسے چھپا کر رکھا تھا، مجھے اس کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ مجھے مارٹن کے جانے کے بعد اس کی موجودگی کا علم ہوا تھا۔ ریوالور دیکھتے ہی میں نے اس کے آفس فون کیا تھا تاکہ وہ جلد از جلد اسے اپارٹمنٹ سے منگوا لے لیکن مارٹن آفس میں نہیں ملا تھا۔ آفس والوں نے مجھے اس کا ایک اور نمبر دیا۔ میں نے اس پر فون کیا تو دوسری طرف سے کسی عورت نے ریسیور اٹھایا۔ تب میں نے کچھ بولے بغیر فون بند کر دیا۔ مارٹن نے یقیناً صرف ریوالور کی موجودگی کو ہی راز نہیں رکھا تھا، اس کی زندگی میں اور بھی بہت سے راز تھے۔

لیکن اب میں ریوالور کی موجودگی پر خدا کا شکر ادا کر رہی تھی۔ میں نے پہلے اچھی طرح اطمینان کیا کہ ریوالور خالی تھا۔ پھر میں نے خالی ریوالور سے نشانے بازی کی فرضی سی مشق شروع کی۔ کلک کی ہر آواز پر میرے اعتماد میں ذرا سا اضافہ ہو جاتا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ میں اسے استعمال کر سکتی ہوں تو میں نے اسے لوڈ کر لیا۔

اس رات موسم کے حال میں بتایا جا رہا تھا کہ گرمی کی لہر دم توڑ رہی تھی۔ آئندہ روز بارش ہونے کا امکان تھا۔ چنانچہ میں نے ریوالور اپنے رین کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ میں نے آزمائشی طور پر رین کوٹ پہن کر دیکھا۔ جیب میں ریوالور کی موجودگی کے باوجود کوئی خاص ابھار دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

دوسرے روز جمعہ تھا۔ میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح جلدی کام ختم کر کے آفس سے نکل جانا چاہتی تھی لیکن عین آخری لمحوں میں میرے اٹھتے اٹھتے ایک ٹیلی فون کال نے مجھے الجھا لیا اور اس کی وجہ سے خاصی دیر ہو گئی۔ آخر کار میں آفس سے نکلی تو شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا اور جس طوفانِ بادوباراں کی پیش گوئی کی گئی تھی وہ سر پر آن پہنچا تھا۔

کالی گھٹائیں امنڈ کر آرہی تھیں لیکن مجھے طوفانِ بادوباراں کی آمد خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ ویک اینڈ آرام سے بستر میں لیٹ کر کتابیں پڑھتے، ٹی وی دیکھتے اور تھوڑا بہت بچی قسم کا کاغذی کام کرتے ہوئے گزار دوں گی۔

میں انڈر گراؤنڈ ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر کھڑی اپنی ٹرین کا انتظار کر رہی تھی۔ پلیٹ فارم پر خاصا ہجوم تھا۔ میں نے بظاہر طائرانہ نظر سے چہروں کا جائزہ لیا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ ایک شخص گویا میری نظر سے بچنے کے لیے ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا تھا۔

میری دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئیں۔ کیا اس کے بال مٹیالے سنہرے تھے؟ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی۔ اگر میں ذرا آگے بڑھ کر دیکھنے کی کوشش کرتی تو شاید بہتر طور پر دیکھ سکتی لیکن ایک تو اسی لمحے چھ سات نوعمر لڑکے ٹیپ ریکارڈر کی موسیقی پر اچھلتے کودتے سیڑھیوں سے اتر کر پلیٹ فارم پر آگئے اور ہجوم میں گویا ہلچل سی پیدا ہو گئی۔ پھر میری ٹرین بھی آپہنچی اور ہلچل بڑھ گئی۔

ٹرین میں مجھے مٹیالے سنہرے بالوں والا کوئی شخص دکھائی نہ دیا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ جس شخص پر مجھے شبہ ہوا تھا وہ میرا تعاقب کر رہا تھا، وہ ٹرین میں سوار ہوا تھا یا نہیں۔ مجھے سیٹ میسر نہیں آئی تھی۔ میں کھڑی تھی اور جوں جوں ٹرین رفتار پکڑ رہی تھی، اس احساس سے میری دھڑکن تیز ہو رہی تھی کہ شاید وہ شخص میرے پیچھے ہی کہیں کھڑا ہو۔ یا پھر شاید وہ کسی دوسرے کمپارٹمنٹ میں موجود ہو۔

بالآخر ایک دھچکے کے ساتھ ٹرین میرے مطلوبہ اسٹیشن پر جا رکی۔ اس اسٹیشن سے میرے گھر تک کا فاصلہ چھ بلاک کا تھا جسے طے کرنا آج مجھے ایک دشوار مرحلہ محسوس ہو رہا تھا لیکن یہ مرحلہ بہرحال مجھے سر کرنا تھا۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر سڑک پر پہنچی۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ رات ہو چکی تھی۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی اور بادلوں کے عقب میں چاند کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔

دکانیں بند ہو چکی تھیں اور سڑکیں ویران تھیں۔ اب مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو رہا تھا۔ مجھے آفس سے اٹھنے میں اتنی دیر نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مجھے وہ فون ریسیو نہیں کرنا چاہیے تھا جس نے مجھے کئی کاموں میں الجھا دیا تھا۔ بھیگے ہوئے ردی کاغذ اور

کرکٹ میں کوئی جادو ہے ضرور! کیا ہے' اس کا پتا اب تک نہیں چل سکا البتہ پچھلی صدی میں ایک افریقی وچ ڈاکٹر نے انگلستان کا ایک مطالعاتی دورہ کیا تھا اور اپنے جادو پر گوروں کے جادو کو افضل قرار دیا تھا۔ وطن واپسی پر اس نے اپنے ہم وطنوں کو اپنے اس تجربے کی روداد کچھ یوں سنائی تھی۔

"صبح کا وقت تھا' ایک گراؤنڈ میں بہت سے لوگ جمع تھے لیکن وہ ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ میدان میں ایک بڑا سفید دائرہ تھا' ایک طرف ایک عمارت سی بنی ہوئی تھی' سب لوگ اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں' میں نے دیکھا کہ دو آدمی سفید کوٹ اور کالی پتلونیں پہنے ہوئے اس عمارت سے نکلے۔ ان کے ہاتھوں میں تین تین لکڑیاں تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے فاصلے پر آمنے سامنے کھڑے ہوگئے پھر انہوں نے وہ لکڑیاں زمین میں گاڑ دیں اور ان پر دو چھوٹی چھوٹی لکڑیاں بھی رکھ دیں۔ تھوڑی دیر بعد گیارہ آدمی سفید کپڑے پہنے ہوئے گراؤنڈ میں داخل ہوئے۔ لوگوں نے انہیں دیکھ کر تالیاں بجائیں۔ ان کے پیچھے پیچھے دو آدمی سفید کپڑوں میں ملبوس' ہیٹ لگائے اور ٹانگوں اور ہاتھوں پر کچھ عجیب سی چیزیں پہنے ہوئے آئے۔ ان کے ہاتھوں میں لکڑی کے چپٹے سے ڈنڈے تھے۔ وہ دونوں ان لکڑیوں کے قریب جاکر آمنے سامنے کھڑے ہوگئے' اس کے بعد کسی نے ایک سرخ رنگ کی چمکتی ہوئی گول سی چیز ایک شخص کی طرف پھینکی' وہ شخص اس چیز کو لے کر ایک طرف کو چلنے لگا۔ کوئی تیس چالیس قدم چل کر وہ رکا' اس نے باقی لوگوں کو مختلف جگہوں پر کھڑا کیا اور پھر اس سرخ گیند کو اپنی پتلون پر رگڑنے لگا۔ بس جناب اس کا اس گیند کو رگڑنا تھا کہ ایک دم بادل گرجنے لگے اور پھر جو بارش ہوئی ہے تو اللہ کی پناہ' پورے چار دن تک نہیں رکی۔ بات یہ ہے بھائیو کہ گوروں نے جو دنیا میں اتنی ترقی کی ہے تو وہ بلاوجہ نہیں۔ ہمارے کالے جادو سے ان کا سفید جادو زیادہ زوردار ہے۔"

چیزوں کے ریپر ہوا سے اڑتے پھر رہے تھے اور ان میں سے کوئی کوئی جاکر کسی دیوار سے چپک جاتا تھا۔ میں اپنے آپ کو سمجھاتی جارہی تھی کہ مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے اور اپنے اعصاب پر قابو رکھنا چاہیے۔ گھر اب صرف ایک بلاک کے فاصلے پر ہی تو رہ گیا تھا۔

اچانک میرے جسم میں سرسراہٹ سی ہوئی اور میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ مجھے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے رک کر سننے کی کوشش کی لیکن میرے عقب میں گویا اس وجود کی حرکت بھی رک گئی۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ شاید وہ میرا وہم تھا۔ میں نے دوبارہ چلنا شروع کیا اور تب احساس ہوا کہ وہ میرا وہم نہیں تھا۔ آہٹ ایک بار پھر میرے تعاقب میں تھی۔

میرا بریف کیس خاصا وزنی تھا۔ میں نے اسے سینے سے چمٹایا اور دوڑنے لگی لیکن میرا اسکرٹ ایسی بناوٹ کا تھا کہ میں محض چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے ہی دوڑ سکتی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ اگر آج خیریت سے گھر پہنچ گئی تو آئندہ کبھی ایسا اسکرٹ نہیں پہنوں گی۔

بالآخر میں اپنی بلڈنگ کے قریب پہنچ گئی۔ شیشے کے دروازے سے روشنی باہر فٹ پاتھ تک آرہی تھی اور زندگی کی حرارت کا احساس دلا رہی تھی۔ میں نے خود کو تسلی دی۔

"صرف دو سیکنڈ اور.... ابھی جمی دروازہ کھولے گا اور میں اندر اپنی بلڈنگ کی پناہ میں پہنچ جاؤں گی۔"

لیکن دوسرے ہی لمحے میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ شیشے کے دروازے کے عقب میں جمی موجود نہیں تھا۔ خالی لابی گویا اپنا پھاڑ سا منہ کھولے میری منتظر تھی۔

"جمی....!" میں نے وحشت زدہ سے انداز میں پکارا اور دروازہ کھول کر تقریباً دوڑتی ہوئی لفٹ کی طرف بڑھی۔ ایک عجیب سی بے بسی کے احساس سے میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ لفٹ کے لیے بٹن دباتے ہوئے میں نے ایک بار پھر تقریباً چیخ کر پکارا۔ "جمی....!" لیکن کوئی جواب نہ آیا۔

لفٹ نیچے آنے کی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ میں نے گردن ذرا گھما کر پیچھے دیکھا۔ شیشے کے دروازے سے باہر فٹ پاتھ پر مجھے ایک سایہ نمودار ہوتا دکھائی دیا۔ حالانکہ لفٹ نیچے نہیں آرہی تھی لیکن میں دیوانہ وار بار بار بٹن دبا رہی تھی۔ پھر میں نے باہر نکلتے اندھیرے سے ایک بازو عمارت کے دروازے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ وہ بازو جمی کا یقیناً نہیں تھا۔ وہ جس آستین میں چھپا ہوا تھا وہ نیلے رنگ کی تھی۔

ادھر لفٹ نیچے آئی اور اس کا دروازہ کھلا' ادھر باہر اس ہاتھ نے شیشے کا بیرونی دروازہ کھول لیا۔ میں نے لفٹ میں گھس کر پاگلوں کی طرح دروازہ بند کرنے کا بٹن دبایا اور دوسرے ہاتھ سے فوراً ہی سترھویں منزل کا بٹن بھی دبا دیا۔ آج مجھے لفٹ دنیا کی سست ترین چیز لگ رہی تھی۔

آہستگی سے دروازہ بند ہونا شروع ہوا۔ بند ہوتے دروازے سے میں نے اس شخص کو تقریباً دوڑ کر لفٹ کی طرف آتے دیکھا۔

ایک تو لفٹ کا دروازہ بند ہو رہا تھا' دوسرے روشنی کا زاویہ ایسا تھا کہ میں اسے صرف ایک ہیولے ہی کی صورت میں دیکھ رہی تھی۔ شاید اسی لیے میرا خوف کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

دروازہ اس وقت تقریباً بند ہو چکا تھا جب وہ لفٹ تک پہنچا۔ اس نے دونوں پٹوں کے درمیان انگلیاں پھنسا کر اسے بند ہونے سے روکنے کی کوشش کی لیکن اسے تاخیر ہو چکی تھی۔ اس نے جلدی سے ہاتھ پیچھے کھینچا لیکن اس وقت تک میں اس کے شکستہ ناخن' اس کی انگلیوں پر نکوٹین کی پیلاہٹ اور اس کے مٹیالے سے بالوں کی جھلک دیکھ چکی تھی۔

میں لفٹ کی پچھلی دیوار سے رگڑ کھاتی ہوئی بیٹھ گئی کیونکہ میری ٹانگوں میں میرا وزن اٹھانے کی سکت نہیں رہی تھی۔ میرے پھیپھڑے گویا پھٹنے کو تھے۔ میں بیک وقت ہانپ بھی رہی تھی اور سسکیاں بھی لے رہی تھی۔ آنسو میرے رخساروں پر پھسلتے ہوئے میرے منہ میں آ رہے تھے۔ میں نے کوٹ کی آستین سے اپنے رخساروں کو پونچھا۔ میرے ہاتھ اس بُری طرح کانپ رہے تھے کہ بریف کیس گر پڑا۔ میں نے اسے اٹھانے کی کوشش نہیں کی بلکہ دونوں ہاتھ بغلوں میں دبا کر اپنی کپکپی پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

آج تو لفٹ گویا چیونٹی کی رفتار سے اوپر جا رہی تھی۔ بالآخر مشینی سرسراہٹ بند ہوئی اور لفٹ ایک ہلکے سے دھچکے کے ساتھ رک گئی۔ دروازہ ذرا سا کھلتے ہی میں پھنستی ہوئی اس کے درمیان سے نکل گئی۔ بریف کیس میں نے لفٹ میں ہی چھوڑ دیا۔ راہداری میں بھی روشنی ناکافی تھی۔ میں تیزی سے اپنے اپارٹمنٹ کی طرف لپکی۔

دروازے پر پہنچ کر میں نے پرس میں ہاتھ ڈال کر چابی تلاش کرنے کے بجائے پورا پرس ہی دروازے کے سامنے بچھی ہوئی میٹ پر الٹا لیا۔ میں کانپتے ہاتھ سے سب چیزوں کو الٹ پلٹ کر چابی تلاش کر رہی تھی جب راہداری کے سرے پر دوسری لفٹ رکنے کی آواز سنائی دی۔ دوسری لفٹ بھی سترھویں منزل پر پہنچ چکی تھی۔

اس وقت تک مجھے چابی مل چکی تھی۔ میں نے لرزتے ہاتھ سے بہ مشکل اسے تالے میں لگایا۔ پہلا تالا کھل گیا لیکن دوسرے تالے میں چابی مجھ سے لگ ہی نہیں رہی تھی۔ ہاتھ بُری طرح کانپ رہا تھا۔ میں نے زور لگانا چاہا تو چابیوں کا گچھا ہی فرش پر گر پڑا۔

"اوہ خدایا...! میری مدد فرما..." میں دل ہی دل میں گڑگڑائی۔ جھک کر میں نے جلدی سے چابیاں اٹھائیں اور دوبارہ تالا کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ انگلیاں گویا شل تھیں' ہاتھ جیسے دیر تک برف میں رہنے کے بعد نکالے گئے تھے۔

آہٹ ایک بار پھر میرے تعاقب میں تھی۔ وہ آ رہا تھا۔ اسی لمحے تالا بھی کھل گیا۔ میں نے تیزی سے تاب گھمائی لیکن اسی لمحے ایک ہاتھ میرے کندھے پر آن ٹکا۔

"نہیں..." میں نے گلوگیر آواز میں کہتے ہوئے تیزی سے وہ ہاتھ جھٹک دیا اور گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ میری آنکھوں میں آنسوؤں کی دھندلاہٹ تھی۔ میں اسے صاف نہیں دیکھ سکتی تھی۔ بس یہ احساس تھا کہ وہ کوئی کرخت اور چوڑا سا چہرہ تھا۔ سگریٹ کی بُو میرے نتھنوں میں گھسی جا رہی تھی۔ چہرہ میرے لیے اجنبی تھا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے لیکن میں اس کی آواز نہیں سن پا رہی تھی کیونکہ لہو میرے کانوں میں شاں شاں کر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے کچھ الفاظ میری سمجھ میں آئے۔

"اے... میرے پاس ایک چیز ہے جسے دیکھ کر تم یقیناً بہت خوش ہوؤ گی خاتون!" اس کی آواز جیسے کہیں دور سے آ رہی تھی۔

اس نے اپنی نیلی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اس کے ہاتھ میں دھات کی جھلک دیکھی۔ میں نے فوراً ہی رین کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور نکال لیا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

یکے بعد دیگرے چار دھماکے ہوئے۔ وہ اچھل کر میرے دروازے کے سامنے والی دیوار سے جا ٹکرایا اور پھسلتا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ دیوار پر خون کی سرخ پٹی رہ گئی۔ میں نے ریوالور پھینک دیا اور دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔ دھماکوں کی بازگشت سے میرے کان پھٹے جا رہے تھے۔

میں راہداری میں دوڑنے لگی' ایک ایک اپارٹمنٹ کا دروازہ پیٹنے لگی لیکن کسی نے دروازہ نہ کھولا۔ میں مدد کے لیے پکار رہی تھی لیکن کوئی بھلا میری مدد کے لیے کیوں آتا؟ میں لفٹ کی طرف دوڑی۔

اسی وقت ایک لفٹ اس منزل پر آ کر رکی۔ دروازہ کھلا اور جمی کا چہرہ گویا ہوا میں تیرتا ہوا میری طرف بڑھا۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا۔ میری سمجھ میں صرف دو لفظ آئے۔ "پولیس والا۔"

"ہاں... یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں... پولیس کو بلاؤ۔" میں نے اس کا بازو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔ لیکن یہ جمی کو کیا ہوا؟ یہ اپنا بازو مجھ سے چھڑا کر پیچھے کیوں ہٹا جا رہا ہے؟ یہ متاسفانہ انداز میں سر کیوں ہلا رہا ہے؟ میں نے سوچا۔

"مس پیٹی!" بالآخر اس کے الفاظ میری سمجھ میں آئے۔ "پریشان نہ ہوں۔ مسئلہ خواہ کچھ بھی ہے وہ حل ہو جائے گا۔ میں نے چند لمحے پہلے ہی ایک پولیس والے کو آپ کے اپارٹمنٹ کی طرف بھیجا تھا... آپ کی مدد کے لیے... میں دیکھ رہا تھا' چند روز سے آپ بہت پریشان تھیں اور آپ کا پرس بھی چھین لیا گیا تھا۔ وہ یقیناً آپ کے پاس پہنچ چکا ہوگا..."

میں اسے بتا نہیں سکی کہ وہ مجھ تک پہنچا ضرور تھا لیکن اب بہت دور... بہت دور پہنچ چکا تھا! دوسرے ہی لمحے میں چکرا کر گر پڑی۔

FOOTS TEPS
KATE ROMANSKY

پس ایجاد

ابو ضیاء اقبال

کسی بھی شے کی ایجاد ایک بڑا کام ہے اور اس ایجاد کی حفاظت اس سے بھی بڑا کارنامہ۔ اسی ایجاد کے لیے انٹرنیشنل سطح پر جاسوسی اور سازش کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا۔ جرمن سیکرٹ سروس کے بہترین دماغ اس کی چوری کے لیے کوشاں تھے تو برٹش سیکرٹ سروس والے اس کی حفاظت کے لیے سرگرداں۔

جان کی بازی لگا کر اپنے مشن کی تکمیل کرنے والے جاسوس کی داستان

وہ ۸۶ کا موسم خزاں تھا جب ہیری چیلنج قلعوں اور باغات کے شہر کلوک برگ پہنچا تھا اور ایک رات کے پچھلے پہر اسے بوری میں بند کر کے جھیل تاہین کے ٹھٹھرے ہوئے پانی میں پھینک دیا گیا تھا۔ ایک ہفتہ قبل اکہرے بدن کا تیس سالہ ہیری ایک کیس کو نمٹا کر قاہرہ میں آرام کر رہا تھا کہ اسے نیویارک سے کیبل ملا۔

"پیارے بیٹے! آرام طلبی کا لبادہ اتار کر زوبرتانیا کے دارالحکومت میں فوراً پہنچو اور ہماری مؤکلہ سے گرینڈ ہوٹل میں ملو۔ وہ برطانوی ہے، نام ایما گنگس مل ہے۔ وہ پریشان ہے کہ اس کا قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا پاپا ایک اوپیرا سنگر کے پیچھے پاگل ہو رہا ہے۔ وہ ایک معروف موجد ہے۔ میں ایک بہت بڑی رقم کی بُو سونگھ رہا ہوں۔ غفلت نہ کرنا... تمہارا بے حد چاہنے والا باپ' دی چیلنج انٹرنیشنل ڈی ٹیکٹیو ایجنسی۔"

منگل کی شام کو ہیری بارش سے بھیگی ہوئی سڑکوں سے گزر کر شہر کے وسط میں واقع ہوٹل گرینڈ امپیریل پہنچا۔ ہوٹل کے ماحول

میں قدامت پرستی کی جھلک تھی۔ وسیع لابی میں اندر زینے پر دبیز قالین بچھے ہوئے تھے۔ باہر اور کمروں کی دیواروں پر بھی رنگین نقش و نگار تھے۔ اس قسم کے مہنگے ہوٹل ہیری کے مزاج کے مطابق نہیں تھے لیکن وہ وہاں ٹھہرنے پر مجبور تھا۔

کاؤنٹر پر رجسٹر میں اپنے نام کا اندراج کرتے ہوئے اس نے استقبالیہ کلرک سے اپنی مؤکلہ کے بارے میں دریافت کیا تو اسے یہ جان کر قدرے حیرت ہوئی کہ ایما کنگس مل نام کی کوئی خاتون اس ہوٹل میں نہیں ٹھہری ہوئی ہے' نہ ہی اس نے آنے سے پہلے کمرا بک کرایا تھا۔ کلرک نے البتہ ایک چٹ اسے تھمادی کہ یہ اسے دینے کے لیے دی گئی ہے۔ چٹ پر نفاست سے یہ تحریر تھا کہ وہ خواہ کتنی ہی دیر سے آئے' مسز جارج اولیور سے اس کے کمرے میں مل لے۔ ہیری کے پوچھنے پر استقبالیہ کلرک نے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بتایا کہ خاتون کا کمرا سب سے بالائی منزل پر ہے۔ اس نے کمرا نمبر معلوم کیا اور زینے طے کرکے اوپر گیا۔ کمرا کشادہ تھا لیکن فضا میں یاسیت سی رچی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ مسز جارج اولیور اس کے تصور کے برعکس سرخ بالوں والی بہت خوب صورت' نوجوان لڑکی تھی۔ ہیری کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے جھٹ دروازہ بند کرلیا اور قدرے جذباتیت کا مظاہرہ کربیٹھی پھر فوراً ہی سنبھل کر پیچھے ہٹ گئی۔ ہیری کی حیرانی دیدنی تھی۔

"میں کبھی کبھی نہ جانے کیوں بہک سی جاتی ہوں۔" مسز جارج خفت سے بولی۔

"کیا مطلب میڈم!" ہیری نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"میں اپنا عورت پن بھول جاتی ہوں۔" مسز جارج نے گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔ "فادر اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ میری پرورش بن ماں کے گھریلو ماحول میں ایک غیر حاضر دماغ سائنس داں کے ساتھ رہتے ہوئے ہوئی ہے۔"

"تم ایما کنگس مل ہو؟" ہیری نے تجسس سے کہا اور اس کے کہے بغیر بھاری بھرکم کشن پر بیٹھ گیا۔

"تم جیسا خوب صورت اور دلکش شخص سراغ رساں کیسے ہوسکتا ہے؟" وہ کہہ گئی' پھر جلدی سے بولی۔ "اوہ! میں یہ کس رو میں کہہ گئی! دراصل جو میرے ذہن میں آتا ہے' بے ساختہ زبان سے نکل جاتا ہے۔ میرے ناولوں میں تو یہ ٹھیک رہتا ہے لیکن روز مرّہ زندگی میں....."

"مسز جارج اولیور نے بہترین ناول لکھے ہیں۔" ہیری نے اس کی بات کاٹی۔ "لیکن..... کیا..... میرا مطلب ہے مسز جارج اولیور تم ہی ہو؟"

"میں جس طرح کے جذباتی ناول لکھتی ہوں' ان کے لیے قلمی نام ہی مناسب ہے۔ ایک کنواری لڑکی کے لیے یہ سب کچھ لکھنا قطعی درست نہیں ہے۔" ایما نے کہا۔ "لیکن تم تو دقیانوسی مصنفوں کو پسند کرتے ہوگے۔"

"سنو مس کنگس مل!" ہیری نے خشک لہجے میں کہا۔ "میں قاہرہ سے طویل فاصلہ طے کرکے یہاں ادبی گفتگو کرنے نہیں آیا ہوں....."

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" ایما جلدی سے بولی۔ "ایک پیالی چائے پینے کی زحمت کروگے؟"

"نہیں۔" ہیری نے منہ پُھلا کر کہا۔

"بہت بہتر' کیوں کہ اس وقت روم سروس بھی بند ہوچکی ہے۔" ایما دبیز چرمی کرسی میں دھنستی ہوئی بولی۔ "بائی داوے' تمہارے آتے ہی میں نے جس والہانہ پن کا اظہار کیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ میں محض خوشی سے بے قابو ہوگئی تھی۔ میں ہرگز یہ نہیں چاہتی کہ تم میرے بارے میں کوئی غلط رائے قائم کرو۔"

"نہیں کروں گا۔" ہیری نے یقین دہانی کے انداز میں کہا۔ "پرائیویٹ سراغ رساں ایک ڈاکٹر یا پادری جیسا ہی ہوتا ہے۔"

ایما قہقہہ لگا کر بولی۔ "میں تمہیں اس زاویے سے نہیں دیکھتی۔"

"بہرحال مطلب کی بات کرو۔ یہ بتاؤ کہ ہماری ایجنسی سے تمہیں کیا کام لینا ہے؟"

"کیا یہ کوئی بڑی ایجنسی ہے؟"

"صرف میرے والد اور میں۔ بس یہی ہے کُل ایجنسی۔"

"بڑے اکھڑ مزاج ہیں تمہارے والد۔ گو میں نے صرف بذریعہ کیبل ہی ان سے رابطہ قائم کیا لیکن ان کے مزاج کا اندازہ ہوگیا۔"

"تم ان کے بارے میں یہ کہہ سکتی ہو۔ تمہارا مسئلہ کیا ہے؟"

"جتنا کہ میں نے سوچا تھا اس سے کہیں زیادہ سنگین نکلا۔ میں فادر کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آئی۔ اپنے قلمی نام سے کمرا لیا تاکہ اصل نام سے کوئی اسکینڈل نہ کھڑا ہوجائے۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ بات اتنی سی نہیں جسے ایک بوڑھے آدمی کی لغزش یا حماقت سمجھا جائے۔"

"پھر کیا ہے' کس قسم کی ہے؟"

ایما آواز کو دبا کر بولی۔ "مجھے خدشہ ہے کہ معاملہ انٹرنیشنل سازش اور جاسوسی کا ہے..... اگر میں تمہیں صرف ہیری کہوں تو تمہیں اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

"نہیں ایما۔" ہیری نے بھی نام کے تکلف کو بالائے طاق رکھ دیا۔

"جس طرح تم نے میرے نام کا تلفظ ادا کیا ہے' اس سے مجھے بہت لطف آرہا ہے۔ اس انداز میں مردانگی ہے' امریکی اندازِ تکلم کی جھلک ہے..... اُف! میں پھر بھٹک گئی۔" ایما نے ٹھنڈی سانس لی۔ "تم فادر کا کام جانتے ہو؟"

یہاں آنے سے پہلے ہیری نے قاہرہ میں آرتھر کنگس مل کے

بارے میں معلومات حاصل کی تھیں۔ وہ کہنے لگا۔ "وہ ایک بہت کامیاب موجد ہیں۔ گزشتہ برسوں میں انہوں نے چند قابل ذکر چیزیں متعارف کرائی ہیں' مثلاً کنگس مل ریپڈ فائر مشین گن' کنگس مل پوائزن گیس بم اور......"

"ہاں' ہاں' تم میرے فادر کو اچھی طرح جانتے ہو۔" ایما نے جھرجھری لے کر کہا۔ "تم یقیناً کسی کا بھی نام تباہ کن اور جان لیوا چیزوں سے وابستہ ہونے کو اچھا نہیں سمجھو گے۔"

"کیا ان کی کسی نئی ایجاد کے سلسلے میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے؟" ہیری نے تجاہل سے پوچھا۔

ایما نے اپنا خوبصورت سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے خدشہ ہے کہ یہی بات ہے' انہوں نے حال ہی میں کنگس مل فلائنگ تارپیڈو مکمل کیا ہے۔ یہ اتنا خطرناک ہتھیار ہے کہ انگلینڈ میں بڑے بڑے فوجی دماغ چکرا گئے ہیں۔ تین ہفتے پہلے.... افسوس صد افسوس' فادر اپنی لیبارٹری کو چھوڑ چھاڑ کر ایک.... ایک عورت کے پیچھے نکل گئے۔ وہ اوپیرا سنگر یا ایسی ہی کوئی شے ہے۔ خاصی خوب صورت اور گداز بدن ہے....."

"لی ہوپ تو نہیں؟" ہیری بول پڑا۔

"ہاں۔" ایما اچھل پڑی۔ "لیکن تم نے کیسے جانا؟ یا پھر یہ کہ فادر کی احمقانہ حرکتوں کی خبر چہار دانگ پھیل چکی ہے' اور قاہرہ میں تم تک بھی پہنچ گئی؟"

"اسٹیشن سے یہاں تک آتے ہوئے میں نے راستے میں لی ہوپ کے بے شمار پوسٹر دیکھے تھے۔" ہیری نے سرسری انداز میں کہا۔ "مجھے خیال گزرا کہ یہاں اس کے گانے کے پروگرام ہو رہے ہیں۔"

"تم اس عورت کو ذاتی طور پر جانتے ہو؟"

"الجزائر میں اس سے ایک بار ملاقات ہوئی تھی۔"

"میرے خیال میں اس کی عمر اچھی خاصی ہے۔"

"میری ہم عمر ہو گی۔ تیس سال کی۔"

"اچھا! پھر تو...."

"وہ تمہارے والد کے اس اُڑنے والے تارپیڈو کے بارے میں نقشے' خاکے وغیرہ۔" ہیری نے اس کے پھر بھٹکتے ہوئے ذہن کو روک لیا۔ "اس وقت وہ سب کہاں ہیں؟"

"تم نے مسئلے کا بالکل صحیح اندازہ لگایا ہے۔" ایما سسکیاں لینے والے انداز میں بولی۔ "فادر نقشوں کا واحد سیٹ اور تارپیڈو کا ماڈل اپنے ساتھ یہاں لے آئے تھے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ انہوں نے حفاظت کے لیے ایسا کیا تھا لیکن اب میرا خیال بدل رہا ہے۔"

"یہاں آنے کے بعد تم اپنے والد سے ملیں؟"

"نہیں' میں ان کے سامنے نہیں آئی لیکن ان کی نگرانی کر رہی ہوں۔ چہرے پر بھاری نقاب ڈالے ان کے ہوٹل "پرنس اوٹوپالازو" کے سامنے کھڑی رہی ہوں۔ ان کا پیچھا کیا ہے۔ ان کی بیشتر شامیں جھیل ناچن کے مقابل رائل کیسینو میں گزرتی ہیں۔ وہ عورت مستقل ان کے ساتھ رہتی ہے۔ وہ بہت زیادہ شیمپئن پیتے ہیں اور جُوا کھیلتے ہیں۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ نقشے اور ماڈل کو خطرہ لاحق ہے؟"

ایما نے آنکھیں جھکا کر کہا۔ "مجھے اعتراف کرنا ہے ہیری' کہ میں ہوٹل میں فادر کے کمرے میں چوروں کی طرح داخل ہوئی تھی۔ وہاں نقشوں اور ماڈل کا نام و نشان نہیں تھا۔"

"ہو سکتا ہے انہوں نے ان چیزوں کو کہیں چھپا دیا ہو یا ہوٹل کے سیف میں رکھوا دیا ہو۔"

"یہ ممکن ہے' لیکن دو روز ہوئے رولینڈ فلیٹ وے کے یہاں آنے سے مجھے شبہ گزرا کہ دال میں کالا ہے۔"

"ہاں' وہ برٹش سیکرٹ سروس کا بڑا گھاگ ایجنٹ ہے۔"

"اسے حلیہ بدلنے میں بھی کمال حاصل ہے۔ وہ بے چارے فادر پر نظر رکھنے کے لیے ہر شام کسی بہروپ میں کیسینو آتا ہے...."

"اور تم اسے پہچان لیتی ہو۔ وہ کیسے؟"

"اپنی آنکھوں' ذہن اور اندازے کی مدد سے۔" ایما نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "میں اسے نظروں میں تولتی رہتی ہوں' اس کی حرکات و سکنات پر توجہ دیتی ہوں اور پھر.... میں رائٹر ہوں۔"

"بہت خوب!" ہیری کھڑا ہو گیا۔ "میں بھی دیکھتا ہوں کہ وہ کیا کرتا ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے۔"

"کیا تم فادر کو ان کی حماقت کے نتائج سے بچا سکتے ہو؟" ایما کے لہجے میں التجا تھی۔ "تمہیں نہ صرف انہیں اس عورت کے چنگل سے نکالنا ہے بلکہ ان کے نقشے اور ماڈل کا بھی تحفظ کرنا ہے۔"

"یقیناً میں یہ دونوں کام کر سکتا ہوں۔" ہیری نے جواب دیا۔ "معاوضے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

"نہیں ہو گا' لیکن ایجنسی کو رقم کی ضرورت ہے۔"

☆ ــــ ○ ــــ ☆

"رائل کیسینو" کی پُرشکوہ عمارت ناچن جھیل کے ساتھ پانی کی سطح سے دو سو فٹ بلندی پر بنی ہوئی تھی۔ بارش اس کی سرخ ٹائل کی چھت پر طبلہ بجا رہی تھی۔ ہیری اس کے سامنے ٹیکسی سے اترا اور کرایہ ادا کر کے دوڑ کر ماربل کے ٹیرس پر پہنچ گیا۔ کشادہ دروازہ کھلا تھا اور نصف رات گزرنے کے باوجود اندر جگمگاتی روشنیوں نے دن کا سماں باندھ رکھا تھا۔ شوخ نقش و نگار سے مزین دیواروں اور خوش نما قالینوں سے آراستہ وسیع ہال میں سو کے لگ بھگ افراد تھے۔ عورتیں اور مرد سب ہی تعیش پسندی اور خود نمائی کے نمونے تھے۔ چار رولیٹ مشینوں پر ہار جیت کا کھیل جاری تھا۔ ہیری نے دروازے میں رک کر سگریٹ سلگائی اور گہری نظریں حاضرین پر دوڑانے لگا۔ جلد ہی اس کی مشاق نگاہوں نے رولینڈ فلیٹ وے کو جا لیا۔ وہ گرگ باراں دیدہ برطانوی

سیکرٹ ایجنٹ ہندوستانی مہاراجہ کے روپ میں ایک چمکتے ہوئے صوفے پر براجمان تھا اور قریب ترین رولیٹ مشین کی طرف بظاہر لاتعلقی سے دیکھ رہا تھا۔

ہیری کو اس مشین کے گرد ہجوم میں سرخ بالوں والی للی ہوپ نظر آگئی۔ اس نے سفید سلک کا جدید لباس پہن رکھا تھا۔ بالوں کا جوڑا سا بنا رکھا تھا اور ان میں ہیرے دمک رہے تھے۔ ہیری جانتا تھا کہ وہ نقلی ہیں۔ اس کا وزن پہلے سے بڑھا ہوا لگتا تھا لیکن اس کی رعنائی میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ اس کے ساتھ کھڑا شخص ملتجی انداز میں اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ کمزور بدن کا، دراز قد اور ساٹھ کے پیٹے میں تھا۔ تیز روشنی میں اس کے چہرے پر ہلکی سی زردی نظر آرہی تھی۔ جھکی ہوئی مونچھوں نے اس کے چہرے کو بے کسی کی تصویر بنا رکھا تھا۔ للی بیزاری سے اس کی سرگوشی سنتی رہی، پھر سرہلا کر جانے لگی۔ اس شخص نے ساتھ جانا چاہا لیکن للی نے کچھ کہا اور وہ رک گیا۔ ہیری جان گیا کہ وہ آرتھر کنگس مل تھا، ہرچند کہ اس نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ للی ہجوم میں راستہ بناتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ہیری نے سگریٹ کا گہرا کش لیا اور اسے پھینک کر للی کے پیچھے ہولیا۔

ٹیرس پر للی اپنے تقریباً ہم عمر شخص کے ساتھ کھڑی گڑگڑا کر کہہ رہی تھی۔ ”نہیں فلپ..... پلیز ایسا مت کرو۔“

اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ ”مجھے مت روکو للی۔ میں زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ اپنی ساری پونجی ہار چکا ہوں۔“ اس نے پستول کی نال کنپٹی سے لگالی۔

”لیکن میں بہ آسانی تمہیں قرض دے سکتی ہوں۔“ للی نے اس کا اوپر اٹھا ہوا ہاتھ پکڑلیا۔

”نہیں، میں عورت سے پیسے نہیں لوں گا۔“ فلپ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ پستول بدستور اس کی کنپٹی پر تھا۔

”ٹھہرو!“ ہیری دہاڑا اور لپک کر ان دونوں کے قریب گیا۔ ”یہاں خودکشی نہیں ہوگی۔“

للی اس کی طرف گھوم کر التجا سے بولی۔ ”پلیز میری مدد کرو، تم جو کوئی بھی ہو۔“

ہیری نے فلپ کی کلائی مضبوطی سے پکڑلی اور کہا۔ ”رقم کی خاطر اپنی جان نہیں دینا چاہیے۔ یہ کوئی.....“

الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔ اس کے کان کے قریب ایک سخت ضرب لگی اور اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ وہ تیورا کر گرا اور اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆ ..... ○ ..... ☆

ہیری ہوش میں آیا تو تاہن جھیل میں تھا۔ کم از کم اس کا یہی خیال تھا کہ وہ وہاں ہے۔ وہ کینوس کی بوری میں بند تھا اور آہستہ آہستہ پانی کی تہ میں بیٹھتا جارہا تھا۔ زنجیر کی جھنکار سنائی دے رہی تھی جس سے غالباً بوری کا منہ بند کیا گیا تھا۔

”بے وقوف!“ اس نے خود کو مخاطب کیا۔ ”کتنی آسانی سے للی کے جال میں آگیا۔“ اس نے جیکٹ کی جیب سے قلم تراش نکالا جسے وہ ہر وقت اپنے پاس رکھتا تھا اور اس کی نوک سے بوری کو پھاڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہورہا تھا اور سرد لہریں بھی بوری سے گزر کر جسم کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں۔ پورے بدن میں اینٹھن ہورہی تھی اور تنگ جگہ ہونے کی وجہ سے قلم تراش بھی تیزی سے کام نہیں کررہا تھا۔ بالآخر وہ بوری میں اتنا شگاف پیدا کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ باہر نکل سکے۔ یخ پانی اس کا خون منجمد کیے دے رہا تھا، تاہم اس نے اوپر اٹھ کر سرپانی سے نکالا تو جھلملاتی روشنی کی فٹ بال جیسی کسی شے پر نظر پڑی۔ اسے خیال آیا کہ وہ چاند نہیں ہوسکتا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور چاند اتنا قریب بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ بہرحال ہوا میں سانس لے کر اس کے حواس قدرے بحال ہوئے۔

”آب دوز نہیں تاہم اچھی چیز نظر آرہی ہے۔“ آواز آئی۔

”لورینزو!“ ہیری نے تیزی سے پلکیں جھپکائیں۔

”صورت حال کو دیکھتے ہوئے میں پورے بل کا تقاضا نہیں کروں گا۔“ کوئی دو گز کے فاصلے پر کشتی میں بیٹھے ہوئے شعبدہ گر لورینزو نے کہا۔ وہ شعبدہ دکھانے والوں کے مخصوص سیاہ لمبے کوٹ میں ملبوس تھا اور اسی طرز کا ہیٹ لگائے ہوئے تھا۔ اس نے ہاتھ میں لالٹین اٹھا رکھی تھی جس کی گول چمنی ہیری کو چاند جیسی شے نظر آئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”کیا تمہیں مجھے اس وقت یہاں دیکھ کر ذرا بھی حیرت نہیں ہورہی؟“

”مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم شہر میں آچکے ہو۔“ ہیری کشتی کی سمت تیرتے ہوئے بولا۔ کشتی میں بیٹھ کر اس نے کہا۔ ”میں نے ایک دیوار پر پوسٹر دیکھا تھا۔ تم میجسٹک تھیٹر میں شو کر رہے ہو۔ للی ہوپ بھی یہیں جلوے دکھانے آئی ہوئی ہے۔“

”ہاں۔ وہ رائل تھیٹر میں لوگوں کی جیبیں ہلکی کرے گی۔“ لورینزو نے ہاتھ نیچے لے جاکر برانڈی کی بوتل اور دو گلاس اٹھائے اور ایک گلاس بھر کر ہیری کو دیا۔

ہیری نے گلاس سے چسکی لے کر کہا۔ ”یقیناً اسی نے مجھے بوری میں بند کرا کے پانی میں پھنکوایا یا خود پھینک دیا۔ یہ تاہن جھیل ہی ہے نا؟“

”یہی ہوا ہے پیارے۔“ لورینزو نے کہا۔ ”ان دونوں نے مل کر تمہیں ٹیرس سے پانی میں اچھال دیا۔ اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ تاہن جھیل ہی ہے۔“

”اور تم عین وقت پر یہاں کیسے پہنچ گئے؟“ ہیری نے گلاس سے گھونٹ بھرا۔

”اپنی باطنی طاقت سے میں نے تصور میں دیکھا کہ تم ایک صندوق میں بند ہو اور وہ اس جھیل میں غرق ہونے کو ہے۔ چنانچہ

میں کشتی میں یہاں پہنچ گیا۔" لورینزو نے لہک کر کہا۔
"مذاق مت کرو۔ میں بہت سنجیدہ ہوں۔" ہیری نے منہ بنایا۔
"تم نے انہیں، مجھے بوری میں بند کرتے دیکھا تھا؟ اگر دیکھا تھا تو شور کیوں نہیں مچایا؟"
"میں اس وقت ایسا نہیں کر سکتا تھا۔" لورینزو نے سنجیدگی اختیار کرلی۔ "اس میں کچھ مصلحت تھی جو میں تمہیں بتانا نہیں چاہتا۔ یہ کشتی میں نے بڑی مشکلوں سے کرائے پر لی ہے۔"
"میں تمہارا بے حد احسان مند ہوں لورینزو۔ تم نے میری جان بچائی ہے۔ میرے گیارہ سالہ کیریئر میں یہ پہلا موقع ہے کہ ان جانے میں میری جان کے لالے پڑ گئے تھے۔" ہیری نے گہری آواز میں کہا۔

☆ ...... ○ ...... ☆

تیسرے روز دوپہر تک سورج پوری توانائی سے چمکنے لگا تھا۔ بادلوں کا نام و نشان نہیں تھا۔ بارش زدہ سڑکیں خشک ہو کر حدت دے رہی تھیں۔ ہوا البتہ خوشگوار تھی۔ لبِ سڑک فیشن ایبل کیفے ناش کی ایک میز پر لورینزو سیاہ پہاڑوں کی طرف رخ کیے کافی کے گھونٹ کے ساتھ کش لگا رہا تھا۔ ہیری آکر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ "میں نے تھوڑا بہت معلوم کرلیا ہے۔"
"تم نے معلوم کرلیا ہے کہ وہ خوب صورت قطالا کہاں ٹھہری ہوئی ہے؟" لورینزو نے دور دکھائی دینے والے پہاڑوں پر نگاہیں جمائے کہا۔
ہیری اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "ان پہاڑوں میں کوئی رہائشی جگہ ہوگی؟"
"بالکل ہے۔" لورینزو نے پہاڑوں پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے کہا۔ "وہاں مسطح جگہ پر بیرن واگن ہیم نے ولا بنا رکھا ہے۔ یہاں سب اسے بدطینت بڈھا کہتے ہیں۔ وہ چھیاسی سال کا ہے لیکن افواہ ہے کہ قرب و جوار کی شاید ہی کوئی جوان لڑکی اس کی ہوس پرستی سے بچی ہو۔ تمہاری دشمنِ جاں اسی کے پاس ٹھہری ہوئی ہے۔"
"اسے دیکھ رہے ہو؟" اچانک ہیری نے سڑک کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ خانہ بدوشوں کے حلیے میں ایک شخص بڑا سا اکارڈین بجاتا ہوا جا رہا تھا۔ اس پر کپڑے کا بنا ہوا بندر تھا۔ ہیری نے بتایا کہ وہ برطانوی سیکرٹ سروس کا ایجنٹ رولینڈ فلیٹ وے ہے۔
"یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟" لورینزو نے پوچھا۔
"یہ پہلے کسی اور غرض سے یہاں وارد ہوا تھا مگر اب میرا پیچھا کرتا پھر رہا ہے۔" ہیری نے کہا اور پھر لورینزو کو ہیری نے تفصیل بتائی۔
"اگر یہ تمہارا پیچھا کر رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اسے نقشے اور ماڈل کا پتا نہیں چل سکا ہے کہ وہ کہاں ہیں۔" لورینزو نے کہا۔
"میں نے اسے پہاڑوں کی طرف جاتے دیکھا ہے۔" ہیری نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "اگر للی بیرن کے ولا میں ٹھہری ہوئی ہے تو اس نے نقشے اور ماڈل وہیں چھپا رکھے ہیں۔"
"ولا ایک طرح سے خطرناک مجرموں کی خفیہ پناہ گاہ ہے۔" لورینزو بولا۔ "اس میں پُرپیچ راہداریاں اور تہ خانے ہیں، کوٹھریاں ہیں، قدیم اور جدید اسلحے کا ذخیرہ اور دنیا بھر کی چیزیں ہیں۔ ماڈل اور نقشے کیسے ہاتھ لگ سکتے ہیں؟ اور پھر تم وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ للی کے قبضے میں ہیں؟ آرتھر نے وہ اسے کیوں دے دیے ہوں گے؟ وہ اس کے پاس کیوں نہیں ہو سکتے؟"
"یہ میرا قیاس ہے اور اس قیاس کی معقول وجہ ہے۔" ہیری نے کہا۔ "میری اطلاع کے مطابق جرمنی کی سیکرٹ سروس کا اسمارٹ ایجنٹ فرزلیوزر یہاں آرہا ہے یا پہنچ چکا ہوگا۔ للی، جرمنوں کے لیے کام کر رہی ہے۔ وہ نقشے اور ماڈل فرز کو فروخت کردے گی۔ اس نے وہ آرتھر سے چرا لیے ہوں گے یا جھپٹ لیے ہوں گے... میں کسی طرح اس بڈھے بیرن کے ولا میں جانا چاہتا ہوں۔ اس کا کوئی طریقہ سوچو۔"
"سوچنا کیا ہے۔ دی گریٹ لورینزو، میجک شینن آف دی ورلڈ کے ذہن سے کیا چیز بعید ہے۔" لورینزو نے آگے پیچھے جھولتے ہوئے کہا۔ "ذرا انتظار کرو، ولا میں کاسٹیوم شو ہونے والا ہے۔ میں تمہیں اس کا دعوت نامہ اور رابن ہڈ کا سٹیوم لادوں گا۔ مزے سے ولا میں چلے جانا۔"
"دعوت نامہ کیسے لوگے؟" ہیری نے اپنی مسرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔
"یہ تمہارے سوچنے کی بات نہیں ہے۔ آخر میں یہاں اپنے فن کے جوہر دکھا رہا ہوں۔ ایسے پروگرام کے لیے دو چار دعوت نامے لے لینا کیا بڑی بات ہے؟"

☆ ...... ○ ...... ☆

ہال میں مختلف حُلیوں میں دو سو سے کم مہمان نہیں تھے۔ رابن ہُڈ بنے ہوئے ہیری نے دروازے میں کھڑے بٹلر کو دعوت نامہ دکھاتے ہوئے ہال پر طائرانہ نظر دوڑائی۔ بحری قزاق اور بادشاہ تھے، ملکائیں اور شہزادیاں تھیں، تین قلوپطرائیں، پانچ جادوگرنیاں تھیں۔ پانچ شیطان بھی تھے۔ جون آف آرک، حوّا اور ملکہ سبا تھی۔ للی، سلوی کے کاسٹیوم میں ایک طرف کھڑی "وائسرائے ولنگٹن" سے ہنس ہنس کر باتیں کررہی تھی۔ ہیری اسے پہچان گیا۔ وہی فلپ تھا جس نے خودکشی کا ڈراما رچایا تھا۔ ہیری خاموشی سے ان کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔
"ایسا ناممکن مت سمجھو جیسا کہ نظر آتا ہے۔" فلپ کہہ رہا تھا۔ "میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ یہاں دو مرتبہ آچکا ہے۔ نقشے اور ماڈل اس کے ہتھے چڑھ جائیں گے۔"

"کیا تم سمجھتے ہو ایک سیکرٹ ایجنٹ ہمارے لیے اتنا ہی خطرناک ہے؟" اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

"ہاں۔ لیوزر کے آنے سے پہلے اگر وہ چیزیں اس کے قبضے میں چلی گئیں تب کیا ہوگا؟" وائسرائے ولنگٹن نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"ہاہاہاہا۔" للی نے زوردار قہقہہ لگایا۔ "رولینڈ کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ بڈھا گدھا بیرن ان چیزوں کی نگرانی کر رہا ہے۔"

"چلو یہ تو ہوا لیکن ہم ہنری سے کیسے پیچھا چھڑا سکیں گے؟ وہ تو زندہ پھر رہا ہے۔" فلپ نے بے چینی سے کہا۔

"ہنری نہیں ہیری۔" للی نے تصحیح کی اور نہ جانے کس خیال میں گم ہو گئی، پھر "رابن ہڈ" کو دیکھ کر قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ "آہا! کیا ہی کہنے! اس کاسٹیوم میں کیسے جچ رہے ہو ہیری ڈیئر!"

"تم سے دوبارہ مل کر بڑی خوشی ہوئی للی ڈیئر۔" ہیری نے ترکی بہ ترکی کہا۔

"ہاں، ہماری ملاقاتیں ہمیشہ خوشی کا باعث ہوتی ہیں..... معاف کرنا فلپ ڈارلنگ۔" للی نے کہتے ہوئے ہیری کا بازو تھاما اور بغلی دروازے کی طرف بڑھی۔ "تم نے شاید فلپ کو یہ کہتے ہوئے سن لیا ہوگا کہ تمہیں ڈبونے سے پہلے ہم نے تمہارے ہاتھ پیر کیوں نہیں باندھ دیے۔ شاید وہ سچ کہہ رہا تھا۔ میں اس وقت بے وقوف اور جذباتی عورت بن گئی تھی۔ دراصل میں تیونس کی ان حسین راتوں کو نہیں بھولی تھی۔" وہ ٹیرس پر جا کھڑے ہوئے۔

"الجزائر میں تم نے مجھے اذیت دے کر مار ڈالنے کی کوشش کی تھی۔"

"واقعی؟ لیکن اب تو تم زندہ ہو۔ میں اپنی قسمت کو کوستی ہوں ہیری کہ ہم دونوں مخالف کیمپوں میں ہیں۔ کیا تمہارے خیال میں یہ ہمیشہ ایسا ہی رہے گا؟"

"تمہارے چالبازیاں کرتے رہنے تک ایسا ہی رہے گا۔"

"یہ تم نے بڑی سخت بات کہہ دی ہے۔"

"نرم الفاظ میں بھی کہی جا سکتی ہے۔"

"میں جانتی ہوں تمہارے لیے یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ مجھ جیسی خداداد آواز رکھنے والی، سازشوں کی دنیا میں کیسے آ گئی۔ میں بتا نہیں سکتی کہ ایسا کیوں ہے۔"

"مت بتاؤ۔"

ہیری نے اس کے دوسرے بازو کی کلائی پر کھڑا ہاتھ مارا اور چھوٹا سا پستول فرش پر گر گیا۔ ہیری نے کلائی موڑ دی۔

"ہیری..... اُف..... چھوڑو....." وہ کراہی۔

ہیری نے کلائی چھوڑ دی۔ للی بڑبڑاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے کلائی کو سہلانے لگی۔ اچانک وہ ہاتھ اسکرٹ کے اندر لے گئی اور فولادی پنجہ نکال لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے ہیری کے منہ پر جماتی، اس نے اس کی خوب صورت ٹھوڑی پر زوردار گھونسا رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر چاروں شانے چت گر گئی۔ اس کے حرکت میں آنے سے پہلے ہیری ہال میں چلا گیا۔

☆ ...... ○ ...... ☆

ٹرین روانہ ہونے میں چند منٹ رہ گئے تھے۔ ہیری کمپارٹمنٹ کے دروازے میں کھڑا تھا اور لورنیزو پلیٹ فارم پر تھا۔ لورنیزو کہہ رہا تھا۔ "تم نے یہ نہیں بتایا کہ تمہیں ماڈل اور نقشے کیسے مل گئے۔"

"تمہاری مدد سے۔" ہیری نے ہنس کر کہا۔ "تم نے اس بوالہوس بڈھے بیرن کے کرتوتوں کے بارے میں بتایا تھا نا۔ وہ اپنا بیشتر وقت کہاں گزارتا ہوگا؟"

"اپنے بیڈ پر اور کہاں۔" لورنیزو نے بھی قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"للی نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ چیزیں اس کی نگرانی میں تھیں۔ اس نے نقشے اور ماڈل بیرن کے بیڈ کے نیچے چھپا رکھے تھے۔ میں کھڑکی کے راستے بیڈروم میں داخل ہوا تو حسب توقع بڈھا داد عیش دے رہا تھا۔ میں نے لڑکی کو جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دے کر ایک طرف کھڑا کر دیا اور بیڈ کے نیچے سے مطلوبہ چیزیں نکال لیں۔ بڈھا اتنا خوف زدہ تھا کہ کچھ نہ کر سکا۔" ہیری نے مزے لے کر بتایا۔

"اب آرتھر اپنی چیزیں لے کر انگلینڈ جا چکا ہے تو کیا وہ اپنی ایجاد کا باقاعدہ اعلان کرے گا؟" لورنیزو نے پوچھا۔

"مجھے اس سے غرض نہیں کہ وہ کیا کرتا ہے اور گورنمنٹ کیا قدم اٹھاتی ہے۔ مجھے اپنی ایجنسی کے مفاد سے واسطہ ہے یعنی اپنی مؤکلہ ایمایا اس کے باپ سے ملنے والی فیس سے۔" ہیری نے کہا۔ "دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کیس میں میرا واسطہ اپنی اس حریف عورت سے پڑا جسے میں پہلے بھی شکست دے چکا تھا۔"

"ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔" لورنیزو ٹھوڑی کھجاتا ہوا بولا۔ "رولینڈ کا مشن کیا تھا؟ وہ یہاں انگلینڈ سے کیوں آیا تھا؟"

"غالباً اس لیے کہ برٹش حکومت آرتھر کی ایجاد کا تحفظ چاہتی تھی۔ وہ اپنی چیزیں یہاں لے آیا تو لازمی طور پر ان کے ہتھیائے جانے کا خدشہ تھا۔" ہیری نے کہا۔

"اب تم واپس جا کر اپنی مؤکلہ سے فیس وصول کرو گے؟ یہاں تم نے اسے کیوں نہیں پکڑا؟"

"وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ بہرحال....."

گاڑی کی وسل میں اس کی آواز دب گئی۔ پہیوں نے جنبش کی اور معاً ساتھ کے کمپارٹمنٹ کے دروازے میں ایما نمودار ہوئی۔ وہ لورنیزو اور ہیری دونوں کی طرف مسکرا کر دیکھتی ہوئی ہاتھ ہلانے لگی۔

THE SECRET OF THE BLACK CHATEAU
RON GOULART

سالٹ لیک سٹی سے سیاٹل کی طرف پرواز کرتے ہوئے نک ویلوٹ کو اپنا وہ نیا ہمسفر بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ سالٹ لیک سٹی سے یونائیٹڈ ائرلائن کے اس عمر رسیدہ طیارے نے ٹیک آف کیا تھا تو اس وقت نک ویلوٹ کی ہم سفر ایک نو عمر حسینہ تھی جس کا تعلق غالباً مشرقِ بعید کے ملک سے تھا۔ اپنے ساتھ والی سیٹ پر اس حسینہ کو دیکھ کر نک دل ہی دل میں مسکرا دیا تھا کہ سفر خوشگوار گزرے گا لیکن ڈیڑھ گھنٹے کی پرواز کے بعد طیارے نے بوئس ائرپورٹ پر لینڈ کیا تو چپٹی ناک والی وہ حسینہ ہونٹوں پر دلکش

اس بار نک ویلوٹ "سگریٹ رولر کی چوری" کے ساتھ حاضر ہے۔ سگریٹ رولر کی چوری پہلی چوریوں کی نسبت زیادہ مشکل ہے کیوں کہ نک کو یہ کام کرنے کے لیے شیر کے جبڑے میں ہاتھ ڈالنا تھا۔ شیر خوابیدہ ہو یا جاگ رہا ہو، ہوتا بہرحال شیر ہی ہے جس کی ہیبت بہرصورت قائم رہتی ہے۔ اس کارِ محال کے لیے نک کو کیا جتن کرنا پڑے یہ تو آپ کہانی پڑھ کر ہی جان سکیں گے۔

سگریٹ رولر کی چوری

مہتاب جلیل
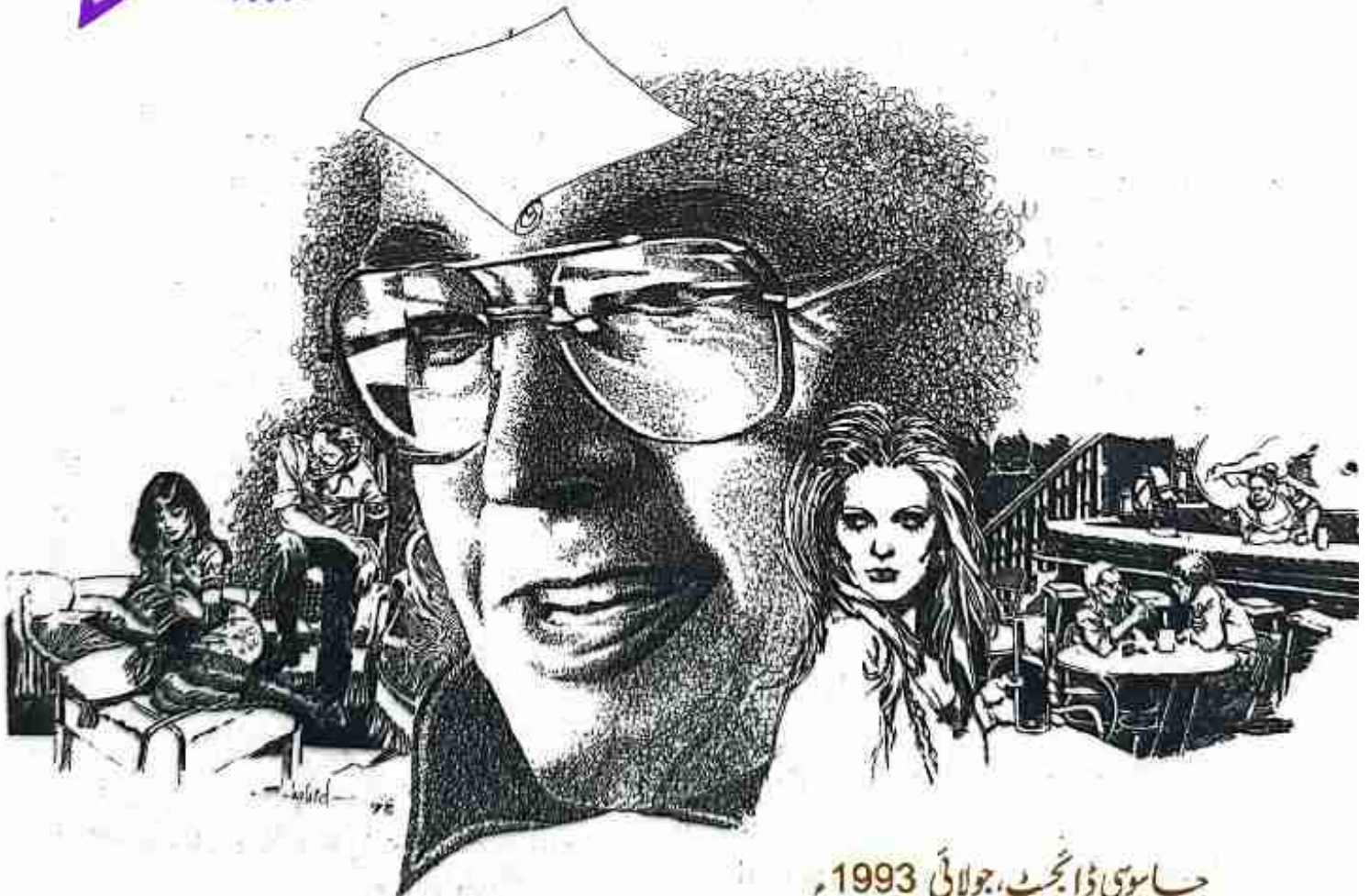
مسکراہٹ سجائے ہاتھ ہلاتی ہوئی رخصت ہوگئی۔ بوسٹن سے جو نیا مسافر ٹک ویلوٹ کے ساتھ والی سیٹ پر آیا تھا' اس کی شکل کسی ریڈ انڈین سے ملتی جلتی تھی۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد' تانبے جیسی رنگت' گہری سبز آنکھیں اور لمبے سنہری بال جو چُٹیا میں بندھے ہوئے تھے۔ نیلے رنگ کا تھری پیس اس پر کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ یہ سوٹ یا تو اس نے سیکنڈ ہینڈ خریدا تھا یا کسی دوست سے مانگ کر پہنا تھا۔ خاصا استعمال شدہ ہونے کے علاوہ یہ سوٹ بہت ٹائٹ سا لگتا تھا' جیسے وہ ریڈ انڈین اس میں پھنسا ہوا ہو۔ اس کے چہرے پر بے پناہ کرختگی تھی۔ چہرے کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے اس کے دل میں کہیں بھی کوئی نرم گوشہ نہ ہو اور چہرے کی اس کرختگی ہی کی وجہ سے وہ شخص ٹک کو پسند نہیں آیا تھا۔

تیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتا ہوا جہاز اس طرح لڑکھڑا رہا تھا جیسے کسی بھی لمحے ڈھیر ہو جائے گا۔ یہ طیارہ اپنی طبعی عمر پوری کر چکا تھا۔ اصولی طور پر اسے اب کسی کباڑیے کی دکان پر ہونا چاہیے تھا لیکن جہاز راں کمپنیاں ایسے طیاروں کا اس وقت تک پیچھا نہیں چھوڑتیں جب تک وہ خود ہی کسی حادثے کا شکار ہو کر ختم نہ ہو جائیں۔ اس قسم کے طیارے اپنے آخری سفر پر روانہ ہوتے ہوئے بہت سے مسافروں کو بھی ساتھ لے ڈوبتے ہیں۔ یہ طیارہ سالٹ لیک سٹی اور سیاٹل کے درمیان شٹل سروس کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ ٹک ویلوٹ کے خیال میں اس طیارے کی مثال اس کھٹارہ کار سے دی جا سکتی تھی جس کے ہارن کے سوا ہر چیز بولتی تھی۔

ٹک نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ نیچے تاحدِ نگاہ ماؤنٹ اسٹیٹر کا سلسلۂ کوہ پھیلا ہوا تھا۔ جہاز اس سلسلۂ کوہ کی چار ہزار چار سو میٹر بلند چوٹی عبور کر چکا تھا۔ یہ بلند پہاڑی سلسلہ گنجان جنگلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ٹک ویلوٹ سوچ رہا تھا کہ اگر یہ طیارہ دھماکے سے پھٹ جائے تو اس کے ٹکڑوں کے ساتھ مسافروں کے جسمانی اعضا بھی میلوں دور تک پھیلے ہوئے جنگل میں بکھر جائیں گے اور وسیع و عریض جنگل میں بکھرے ہوئے ان انسانی اعضا میں ٹک ویلوٹ کے جسم کے ٹکڑے بھی ہوں گے۔ یہ خیال آتے ہی ٹک نے کھڑکی سے ہٹ کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے زندگی میں سیکڑوں بار ہوائی سفر کیا تھا لیکن ایسا خیال اس کے ذہن میں کبھی نہیں آیا تھا۔

طیارہ بخیر و عافیت سیاٹل کے انٹرنیشنل ائرپورٹ پر اتر گیا۔ سفر کے بخیر اختتام پر ٹک نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور ٹرمینل سے نکل کر متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پھر کار پارکنگ کی طرف سے ایک آدمی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ ادھیڑ عمر کا وہ شخص ضرورت سے کچھ زیادہ ہی موٹا تھا۔ اس کی لمبائی چوڑائی کا اندازہ لگانا دشوار تھا' لگتا تھا جیسے کوئی ڈرم لڑھکتا ہوا آ رہا ہو۔ اس نے غالباً دو تین روز سے شیو بھی نہیں کیا تھا۔ وہ نارمن تھا۔ ٹک ویلوٹ کا ایک بہت پرانا دوست۔ نیویارک سے روانہ ہونے سے دو دن پہلے ٹک نے اسے ٹیلی فون پر اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔ نیویارک سے وہ ڈلاس آیا تھا۔ ایک رات وہاں گزارنے کے بعد وہ سالٹ لیک سٹی پہنچا اور یہاں بھی کسی وجہ سے اسے ایک رات گزارنا پڑی تھی۔ گزشتہ رات جہاز کی سیٹ بک کروانے کے بعد اس نے نارمن کو ایک بار پھر فون کیا تھا کہ وہ کس پرواز سے آ رہا ہے اور اب نارمن اس کے استقبال کو موجود تھا۔ نارمن سے ٹک ویلوٹ کو سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ اسے آزادانہ طور پر رہائش کی سہولت حاصل ہو جاتی۔ جبکہ ہوٹل میں ایک طرح کی پابندی ہوتی اور جس کام کے لیے وہ یہاں آیا تھا اس کے لیے آزادانہ طور پر نقل و حرکت کی ضرورت تھی۔ اسی لیے اس نے اپنے دوست کو اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی اور اس وقت نارمن نے بڑے پُرجوش انداز میں اس کا استقبال کیا تھا۔

یہ چار دن پہلے کی بات ہے۔ ٹک ویلوٹ' گلوریا کے ساتھ رات کا کھانا کھانے کے بعد واپس آیا تھا۔ اس وقت ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ وہ جیسے ہی بلڈنگ کے مین گیٹ میں داخل ہوا' عمارت کے نگران نے آگے بڑھ کر کاغذ کی ایک چٹ اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

"مسٹر ویلوٹ! ایک صاحب آپ سے ملنے آئے تھے۔ وہ کافی دیر تک یہاں بیٹھے انتظار کرتے رہے پھر یہ نمبر دے گئے.... کہ آپ جس وقت بھی آئیں' ان سے بات کر لیں۔"

ٹک ویلوٹ نے چٹ دیکھی۔ اس پر فون نمبر کے ساتھ بلیک ہارن لکھا ہوا تھا۔ عمارت کے نگران نے اس شخص کا جو حلیہ بتایا تھا وہ ٹک کے لیے قطعی اجنبی تھا۔ وہ کاغذ کی سلپ ہاتھ میں دبائے گلوریا کے ساتھ فلیٹ میں آگیا۔ فلیٹ میں داخل ہو کر گلوریا تو بیڈ روم میں چلی گئی اور ٹک ڈرائنگ روم میں آگیا جہاں ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ ٹک فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ملاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ بلیک ہارن تو ایک ریسٹورنٹ کا نام تھا۔ وہ لائن ملنے پر کیا پوچھے گا کہ اسے کس سے بات کرنی ہے۔

"یس! بلیک ہارن ریسٹورنٹ!" ریسیور پر ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ وہ یقیناً آپریٹر تھی۔

"مجھے کچھ دیر پہلے ایک چٹ ملی ہے جس پر فون نمبر کے ساتھ صرف بلیک ہارن لکھا ہوا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرے فلیٹ پر وہ چٹ کون دے کر گیا ہے اور مجھے کس سے بات کرنی ہے۔" ٹک نے کہا۔

"آپ مسٹر ٹک ویلوٹ بول رہے ہیں؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"ہاں' میرا یہی نام ہے۔" ٹک نے جواب دیا۔

"ایک منٹ ہولڈ کیجئے مسٹر ویلوٹ۔" دوسری طرف سے کہا

گیا اور پھر ٹھیک ایک منٹ بعد ریسیور پر ایک اور نسوانی آواز سنائی دی "ہیلو مسٹر ویلوٹ! میرا نام بلیک کیٹ ہے۔ کیا تم اس وقت مجھ سے مل سکتے ہو؟ فائدے میں رہو گے۔"

"لیکن وہ چٹ تو شاید کوئی آدمی دے کر گیا تھا۔" نک بولا۔

"اس آدمی کو میں نے ہی بھیجا تھا۔ اگر میں خود آتی تو شاید تمہاری دوست گلوریا تمہیں اتنی آسانی سے فون پر بات بھی نہ کرنے دیتی۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"اوہ! اس کا مطلب ہے کہ تم میرے بارے میں بہت کچھ جانتی ہو۔" نک چونک گیا۔

"ہاں۔ بہت کچھ" دوسری طرف سے کہا گیا "بہرحال' اگر تم اس وقت آجاؤ تو میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ بلیک ہارن کے استقبالیہ کاؤنٹر پر اپنا نام بتا دینا' تمہیں میرے پاس پہنچا دیا جائے گا۔"

نک نے کچھ کہنا چاہا مگر دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔ نک نے ریسیور رکھ دیا۔ وہ کافی دیر تک بلیک کیٹ کے بارے میں سوچتا رہا۔ آواز بے حد سُریلی تھی۔ آواز سے نک نے اندازہ لگایا کہ اس کی عمر پچیس چھبیس سال رہی ہوگی اور وہ خاصی حسین بھی ہوگی۔ نک کئی روز سے خشک زندگی گزار رہا تھا گلوریا کے سوا کوئی اور لڑکی اس کے قریب نہیں آئی تھی۔ لہٰذا اس نے بلیک کیٹ سے ملاقات کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے بیڈروم میں جا کر گلوریا کو بتایا کہ وہ اس شخص سے ملنے کے لیے جا رہا ہے اور جواب کا انتظار کیے بغیر کمرے سے نکل گیا۔

بلیک کیٹ ایک بے حد حسین لڑکی کا نام تھا اور نک ویلوٹ کو حیرت تھی کہ وہ اپنے آپ کو بلیک کیٹ کہلوانا کیوں پسند کرتی تھی۔ اس کا نام تو اس کی طرح حسین ہونا چاہیے تھا۔ نام پر اعتراض ہونے کے علاوہ نک ویلوٹ کو اس بات کا بھی افسوس ہوا تھا کہ اس کا لہجہ سو فیصد کاروباری اور خشک تھا۔ ذرا بھی چاشنی نہیں تھی اس کے اندازِ گفتگو میں۔

"مسٹر ویلوٹ! میں تمہارا زیادہ وقت ضائع نہیں کروں گی۔ یہ تمہاری فیس اور اس لفافے میں اضافی اخراجات بھی شامل ہیں۔ ہمارے کام کے سلسلے میں تمہیں سیاٹل جانا ہوگا۔" بلیک کیٹ نے براؤن کاغذ کا ایک پھولا ہوا لفافہ اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

اس کے بارے میں نک کا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ اس کی عمر پچیس سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ بے حد حسین تھی۔ سیاہ لباس میں اس کا حسن کچھ اور بھی نکھر آیا تھا لیکن نک کو اس لحاظ سے بے حد مایوسی ہوئی کہ اس کے چہرے اور ہاتھوں کے سوا جسم کا کوئی حصہ برہنہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"کیا یہ رقم مجھے سیاٹل میں پک نک منانے کے لیے دی جا رہی ہے؟" نک ویلوٹ نے کہا۔ اس نے میز پر رکھے ہوئے لفافے کی طرف ابھی تک ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔

"نہیں" بلیک کیٹ کے ہونٹوں پر پہلی مرتبہ خفیف سی مسکراہٹ آگئی "تمہیں یہ رقم ایک سگریٹ رولر چوری کرنے کے لیے دی جا رہی ہے۔"

"روڈ رولر تو سنا ہے' یہ سگریٹ رولر کیا ہوتا ہے؟" نک نے احمقانہ لہجے میں کہا۔

"سگریٹ بنانے کی چھوٹی سی دستی مشین ہے جسے عام طور پر سگریٹ رولر کہا جاتا ہے۔ تم نے اکثر لوگوں کو یہ سگریٹ رولر استعمال کرتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ بالکل سادہ سا ہوتا ہے۔ بازار میں ایک دو ڈالر میں مل جاتا ہے۔"

"تو پھر بازار سے ہی کیوں نہیں خرید لیتیں؟" نک نے کہا۔

"ہمیں وہی سگریٹ رولر چاہیے جس کے لیے تمہیں اتنی بڑی رقم دی جا رہی ہے۔" بلیک کیٹ نے میز پر رکھے ہوئے لفافے کی طرف اشارہ کیا "اس میں تیس ہزار ڈالر ہیں۔ پچیس ہزار تمہاری فیس اور پانچ ہزار اضافی اخراجات کے لیے۔"

"اس سگریٹ رولر کی کوئی خاص نشانی اور یہ کہ اسے کہاں تلاش کیا جا سکتا ہے؟" نک نے پوچھا۔

"یہ سگریٹ رولر سیاٹل کی ایک نواحی بستی بارڈن میں رہائش پذیر البرٹا نامی ایک شخص کے قبضے میں ہے۔ اس سگریٹ رولر کی نشانی یہ ہے کہ اس میں جہاں سے سگریٹ کا کاغذ داخل کیا جاتا ہے وہاں ریل کے بائیں طرف باہر کی سائیڈ پر انگریزی کا حرف A لکھا ہوا ہے۔"

"یہ شاید کمپنی کے نام کا ابتدائی حرف ہے؟" نک نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں' کمپنی کا نام دوسری طرف لکھا ہوا ہے۔ جس اے کی میں بات کر رہی ہوں وہ تمہیں کسی اور سگریٹ رولر پر نظر نہیں آئے گا۔" بلیک کیٹ نے کہا۔

"مسٹر البرٹا کا کوئی ایڈریس وغیرہ؟"

"بارڈن میں کسی سے بھی پوچھ لینا' تمہیں اس کا پتا معلوم ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ سگریٹ رولر کب تک چاہیے؟"

"جتنی جلد ممکن ہو۔" بلیک کیٹ نے جواب دیا "یہ سگریٹ

رولز حاصل کرنے کے بعد تم سیاٹل میں اس نمبر پر فون کر کے صرف اپنا نام بتاؤ گے۔ ہمارا آدمی خود ہی تم سے رابطہ قائم کرلے گا۔ سگریٹ رولز اس کے حوالے کر دینا۔ اس آدمی کی شناخت کے لیے بلیک کیٹ کا لفظ استعمال ہوگا۔"

"ٹھیک ہے" نک ویلوٹ نے میز پر سے لفافہ اٹھاتے ہوئے کہا "میں ایک دو دن میں سیاٹل کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔"

دو دن تک ویلوٹ نیویارک ہی میں رہا۔ کچھ ذاتی مصروفیات تھیں۔ اس نے گلوریا کو بتادیا تھا کہ وہ سیاٹل جانے والا ہے۔ گلوریا بھی جانا چاہتی تھی مگر اسے دفتر سے چھٹی نہیں مل سکی تھی۔

نارمن کا مکان سیاٹل کے ساحلی علاقے میں تھا۔ پچھلی مرتبہ جب...... ویلوٹ یہاں آیا تھا تو نارمن اکیلا ہی تھا۔ کئی سال پہلے ایک حادثے میں اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا اور اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ ایک جوان بیٹی تھی جو شادی کے بعد کینیڈا چلی گئی تھی لیکن اب چپٹی ناک والی ایک حسینہ کو دیکھ کر نک ویلوٹ حیران ہوئے بغیر نہیں رہا تھا۔ اس کا تعلق ویتنام سے تھا اور نک کے خیال میں اس کی عمر بیس بائیس سال رہی ہوگی وہ بے حد حسین تھی۔ نارمن نے جب اپنی بیوی کی حیثیت سے اس کا تعارف کرایا تو نک ویلوٹ اچھل پڑا۔

"تم نے راستے میں تو کچھ نہیں بتایا تھا!" نک نے اسے گھورا۔

"تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔" نارمن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "یہ ٹی نانگ ہے۔ ہم نے صرف تین مہینے پہلے شادی کی ہے۔"

"یہ میرے لیے واقعی سرپرائز ہے۔" نک ویلوٹ نے کہا "بہرحال مجھے خوشی ہوئی کہ تمہیں بڑھاپے میں ایک بار پھر گھر بسانے کا خیال آ ہی گیا۔"

"بڑھاپا!" نارمن نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "میں تو ابھی جوان ہوں مسٹر ویلوٹ۔ اگر یقین نہ آئے تو ٹی نانگ سے پوچھ لو۔"

ٹی نانگ اسے گھور کر رہ گئی۔ چند لمحوں بعد وہ بولی۔

"کھانا تیار ہے۔ میں تم دونوں کو ٹھیک پانچ منٹ بعد ڈائننگ ٹیبل پر دیکھنا چاہتی ہوں۔" وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔

کھانے کے دوران نارمن نک ویلوٹ کو ٹی نانگ کے بارے میں بتاتا رہا۔ ٹی نانگ کے بارے میں نک ویلوٹ کا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ کئی سال پہلے کمبوڈیا، ویتنام اور لاؤس کے ہزاروں باشندے اپنے حکمرانوں کے ظلم و تشدد سے تنگ آکر چوری چھپے دوسرے ممالک کو ہجرت کر گئے تھے۔ ان مہاجرین کی اکثریت نے امریکا کا رخ کیا تھا۔ ٹی نانگ بھی اپنے والدین کے ساتھ مہاجرین کے اس گروہ میں شامل تھی جو تین کشتیوں کے ذریعے سائی گون کے ویران ساحل سے امریکا کے لیے روانہ ہوا تھا۔ ٹی نانگ اس وقت دس سال کی تھی۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ ایک کشتی میں تھی جبکہ اس کا باپ دوسری کشتی میں تھا۔ ان معمولی کشتیوں پر ہزاروں میل کا سفر طے کرنا آسان نہیں تھا۔

یہ لوگ جنوبی چین کے سمندر میں فلپائنی جزائر کے ساتھ ساتھ ہوتے ہوئے جنوبی بحرالکاہل میں پہنچ گئے۔ سمندر پرسکون تھا۔ دس دن تک کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا لیکن گیارھویں دن اچانک ہی سمندر بپھرنے لگا۔ یہ لوگ کسی ساحل کے قریب پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔ سورج غروب ہونے سے دو گھنٹے پہلے انہیں ایک جزیرے کا ساحل نظر آگیا۔ دو کشتیاں تو جزیرے تک پہنچ گئیں لیکن تیسری کشتی ساحل سے چند میل دور ایک چٹان سے ٹکرا کر الٹ گئی۔ اس کشتی پر چالیس افراد سوار تھے۔ ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچ سکا۔ ٹی نانگ کا باپ بھی اس کشتی میں تھا۔ دوسرے مسافروں کی طرح وہ بھی سمندر کی تہ میں غرق ہو گیا۔

وہ لوگ تین دن تک اس ویران جزیرے پر پڑے رہے اور آخرکار کئی روز بعد مڈوے آئی لینڈ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ مڈوے، جزائر ہوائی میں شامل تھا اور ہوائی کو ۲۱ اگست ۱۹۵۹ء سے امریکا کی ایک ریاست کی حیثیت حاصل تھی۔ کئی روز تک یہ لوگ مڈوے آئی لینڈ پر پڑے رہے پھر مختلف ذرائع سے دو دو چار چار کی ٹولیوں میں امریکی ساحل کا رخ کرنے لگے۔ ٹی نانگ اور اس کی ماں جس پارٹی میں شامل تھیں وہ کسی طرح سیاٹل پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ یہاں ان لوگوں کو کچھ قانونی دشواریوں کا بھی سامنا کرنا پڑا لیکن آخرکار انہیں امریکی شہری تسلیم کرلیا گیا۔

ٹی نانگ سے نارمن کی ملاقات صرف دو مہینے پہلے ہوئی تھی۔ نارمن ایک کاروباری آدمی تھا۔ اس نے اخبار میں سیکریٹری کی ضرورت کا اشتہار دیا تھا اور ٹی نانگ بھی انٹرویو کے لیے آنے والی امیدواروں میں شامل تھی۔ ٹی نانگ کی عمر بائیس سال تھی۔ حسین ہونے کے ساتھ ساتھ وہ خاصی ذہین بھی تھی۔ نارمن نے اسے اپنی سیکریٹری کی حیثیت سے منتخب کرلیا تھا اور ملازمت شروع کرنے کے صرف تین ماہ بعد وہ میاں بیوی بن گئے تھے۔

"مجھے تمہاری گاڑی چاہیے نارمن۔" نک نے کھانے کے بعد نارمن سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"سوری بھئی!" نارمن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "مجھے تو تھوڑی دیر بعد ایک کاروباری سلسلے میں ٹاکوما جانا ہے۔ تم ٹی نانگ کی گاڑی لے جانا۔ اگر چاہو تو ٹی نانگ کو بھی ساتھ لے جانا۔ تمہیں گھما پھرا لائے گی۔ ویسے تمہیں جانا کہاں ہے؟"

"بارڈن" نک نے جواب دیا "مجھے بھی کاروباری سلسلے میں ایک آدمی کو تلاش کرنا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹی نانگ کو ساتھ لے جانا۔ یہ سیاٹل اور اس کے گردونواح کے بارے میں سب کچھ جانتی ہے۔ تمہیں راستہ بتاتی رہے گی۔" نارمن نے کہا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد نارمن چلا گیا اور اس کے آدھے گھنٹے بعد نی ناتگ اور نک ویلوٹ گھر سے نکل آئے۔ نی ناتگ کے پاس پیکارڈ کار تھی۔ اسٹیئرنگ اس نے خود ہی سنبھال لیا تھا۔ سیاٹل کی شہری حدود سے نکل کر اس نے کار کا رخ بارڈن کی طرف جانے والی سڑک پر موڑ دیا۔ بارڈن وہاں سے تقریباً بیس میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ پہاڑی راستہ تھا لیکن سبزہ اس قدر تھا کہ پہاڑوں کے پتھر دکھائی تک نہیں دیتے تھے۔ بہت ہی گنجان جنگل تھا۔ درختوں اور سبزے سے ڈھکی ہوئی چٹانوں میں بل کھاتی ہوئی سڑک بہت اچھی لگ رہی تھی۔

نک ویلوٹ نے پہلے ہی نی ناتگ کو بتا دیا تھا کہ اسے کوئی عجلت نہیں تھی۔ اس لیے وہ اطمینان سے ڈرائیو کرتی رہی۔ نک اس کے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھا تھا۔ وہ کن انکھیوں سے بار بار نی ناتگ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے حسن سے نک بے حد متاثر ہوا تھا۔ اگر وہ نارمن کی بیوی نہ ہوتی تو اب تک ڈورے ڈالنے کا عمل شروع ہو چکا ہوتا مگر حسن پرست ہونے کے باوجود اسے دوستی کا بھی احساس تھا۔ وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے دوستی پر حرف آنے کا اندیشہ ہو۔

وہ ایک گھنٹے میں بارڈن پہنچ گئے۔ پچیس تیس ہزار کی آبادی پر مشتمل یہ خوب صورت قصبہ وسیع و عریض علاقے میں پھیلا ہوا تھا۔ کاٹیج نما خوب صورت مکانات زیادہ تر پہاڑیوں پر بنے ہوئے تھے۔ یہ قصبہ دراصل ایک پیالے کی طرح تھا۔ چاروں طرف سرسبز پہاڑیاں اور درمیان میں آبادی تھی۔ تین چار خوب صورت شاپنگ سینٹرز تھے۔ ایک حیرت انگیز بات یہ تھی کہ یہاں کوئی بھی عمارت دو منزلوں سے زیادہ نہیں تھی۔ اس سے اونچی عمارتیں بنانے کی شاید ضرورت ہی نہیں تھی۔ کثیر المنزلہ عمارتیں تو وہاں بنتی ہیں جہاں رہائش کا مسئلہ ہو جبکہ بارڈن میں ایسا کوئی مسئلہ درپیش نہیں تھا۔ نئے آباد ہونے کے خواہش مند لوگوں کو کاٹیج بنانے کے لیے نہایت آسان شرائط پر زمین دے دی جاتی تھی۔ البتہ قصبے کے وسط میں مرکزی چوراہے پر ایک خوب صورت گھنٹا گھر بنا ہوا تھا۔ اس کی اونچائی بھی کسی چار منزلہ عمارت سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

"ہاں اب بتاؤ کہاں جانا ہے' کہاں رہتا ہے تمہارا دوست؟" نی ناتگ نے ایک جگہ گاڑی روک کر سوالیہ نگاہوں سے نک کی طرف دیکھا۔

"اس کا پتا تو میں نہیں جانتا۔ کسی سے پوچھنا پڑے گا۔" نک نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا پھر ایک طرف اشارہ کیا "وہ اس طرف پارکنگ پلاٹ پر گاڑی روک لو۔ اس کے سامنے ریسٹورنٹ ہے۔ ہم وہاں کسی سے پوچھ لیں گے۔"

"جب ایڈریس ہی معلوم نہیں تو پوچھو گے کیا؟" نی ناتگ نے کہتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔

پارکنگ پلاٹ پر گاڑی روک کر وہ نیچے اتر آئے۔ سامنے ہی ایک خوب صورت ریسٹورنٹ تھا۔ وہ ریسٹورنٹ میں ایک ایسی میز پر بیٹھ گئے جو دروازے کے قریب ہی تھی اور شیشے سے باہر کا منظر بھی دکھائی دے رہا تھا۔ میز پر بیٹھنے کے بعد نک نے ویٹریس کو کافی لانے کے لیے کہہ دیا۔

"ایک منٹ" نک ویلوٹ نے ویٹریس کو روک لیا "مجھے اپنے ایک دوست کی تلاش ہے۔ اگر تم اس کے بارے میں کچھ بتا سکو تو یہ نوٹ تمہارا ہو سکتا ہے۔" اس نے بیس ڈالر کا ایک نوٹ میز پر رکھ دیا۔

"وہ کون ہے؟" ویٹریس نے چمکتی ہوئی نگاہوں سے پہلے نوٹ کی طرف دیکھا پھر نک کی طرف دیکھنے لگی۔ اس ویٹریس کی عمر زیادہ سے زیادہ سترہ برس رہی ہوگی۔ وہ کالج کی ایک اسٹوڈنٹ تھی اور چھٹیوں میں اس ریسٹورنٹ میں کام کر رہی تھی۔

"اس کا نام البرٹا ہے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔" نک نے جواب دیا۔

"سوری مسٹر! میں اس نام کے شخص کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔" ویٹریس بیس ڈالر کے نوٹ کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی رخصت ہو گئی۔

"پچیس تیس ہزار کی آبادی میں صرف نام سے کسی شخص کو تلاش نہیں کیا جا سکتا۔" نی ناتگ نے ویٹریس کے جانے کے بعد اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن البرٹا کو تلاش کرنا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوگا۔ یہ ویٹریس شاید اس علاقے کی رہنے والی نہیں ہے۔ تم کافی پیو' معلوم کر لیں گے۔" نک نے جواب دیا۔

کافی پینے کے بعد نک نے ویٹریس کو بلا کر بل ادا کیا اور نی ناتگ کو کار میں انتظار کرنے کا کہہ کر خود کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ کیش رجسٹر کے سامنے ایک ادھیڑ عمر عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ہونٹوں پر کاروباری مسکراہٹ سجاتے ہوئے نک کی طرف دیکھا۔

"کیا تم بتا سکتی ہو کہ مسٹر البرٹا کو کہاں تلاش کیا جا سکتا ہے؟" نک نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"البرٹا!" عورت نے چونک کر اس کی طرف دیکھا "بارڈن میں صرف ایک ہی البرٹا ہے۔ اگر تمہیں اسی البرٹا کی تلاش ہے تو روٹ نمبر نائن پر چلے جاؤ۔ اس کے کاٹیج کا نمبر تین سو گیارہ ہے۔ تین دن پہلے وہ بوسٹن گیا تھا۔ اب پتا نہیں واپس آگیا ہے یا نہیں۔ تم جا کر معلوم کر لو۔"

نک ویلوٹ ریسٹورنٹ سے نکل کر پارکنگ کی طرف آگیا۔ نی ناتگ گاڑی میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے نک کو دیکھتے ہی انجن اسٹارٹ کر دیا۔

"کچھ پتا چلا؟" نی ناتگ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔ روٹ نمبر نائن اور کاٹیج نمبر تین سو گیارہ۔" تک نے سیٹ پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

فی تانگ نے گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ ایک دو سڑکوں پر گھومنے کے بعد وہ کار کو ایک ایسی سڑک پر لے آئی جو ایک پہاڑی پر بل کھاتی ہوئی چلی گئی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف گنجان درخت تھے اور تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر بنگلوں کے گیٹ تھے۔ بعض بنگلے تو سڑک کے قریب ہی تھے اور بعض سڑک سے خاصے ہٹ کر واقع تھے۔ ہر گیٹ کے ستون پر نمبر لکھا ہوا تھا۔ تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد فی تانگ نے کار روک لی۔ بائیں طرف ایک گیٹ کے ستون پر تین سو گیارہ نمبر لکھا ہوا تھا۔ جبکہ دوسرے ستون پر پی البرٹا لکھا ہوا تھا۔ کسی وقت یہاں گیٹ ضرور رہا ہوگا لیکن اب صرف ستون ہی رہ گئے تھے۔ بجری کی ایک تنگ سی سڑک اس گیٹ کے اندر دور تک چلی گئی تھی۔ آگے جاکر یہ سڑک دائیں طرف مڑ گئی تھی اور گنجان درختوں کے جھنڈ میں ایک مکان کا ہیولا سا نظر آرہا تھا۔ درخت اس قدر گنجان تھے کہ مکان واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"نمبر تو یہی ہے۔ ایسا کرو' ذرا آگے جاکر یوٹرن لے لو۔" تک نے کہا۔

"کیا اپنے دوست سے ملو گے نہیں؟" فی تانگ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ریسٹورنٹ کے مالک نے بتایا تھا کہ وہ دو دن پہلے بوٹس گیا تھا اور شاید ابھی تک واپس نہیں آیا۔" تک نے جواب دیا۔

فی تانگ نے گاڑی آگے بڑھا دی اور تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے گاڑی کو واپس موڑ لیا۔ کاٹیج نمبر تین سو گیارہ کے سامنے سے گزرنے کے تھوڑی ہی دیر بعد سامنے سے سرخ رنگ کی ایک اسپورٹس کار آتے دیکھ کر فی تانگ نے اپنی کار سائیڈ میں لے لی۔ سرخ اسپورٹس کار جیسے ہی ان کے قریب سے گزری' تک چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ اسٹیئرنگ کے سامنے وہی شخص بیٹھا ہوا تھا جس نے بوٹس سے سیاٹل تک جہاز میں اس کے ساتھ سفر کیا تھا۔ ریڈ انڈین جیسی شکل اور تانبے کی رنگت والا دراز قامت آدمی جس کے لمبے' سنہری بال چٹیا کی صورت میں بندھے ہوئے تھے۔ تک ویلوٹ سامنے لگے ہوئے عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے میں دیکھتا رہا اور اس وقت تو اسے مزید حیرت ہوئی جب سرخ رنگ کی وہ اسپورٹس کار کاٹیج نمبر تین سو گیارہ کے گیٹ میں داخل ہوگئی۔ وہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ کیا یہی البرٹا ہے۔

گاڑی قصبے کے مرکزی شاپنگ سینٹر والی سڑک پر پہنچ چکی تھی۔ تک ویلوٹ سوچ میں غرق تھا کہ گاڑی کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور اس کا سر ونڈ اسکرین سے ٹکرا گیا۔ جب وہ سنبھلا تو گاڑی رک چکی تھی۔

"تک... کیا ہوا؟" تک نے بدحواس سا ہوکر فی تانگ کی طرف دیکھا۔

"وہ... وہ بچہ۔ گاڑی کے نیچے آگیا ہے۔" فی تانگ ہکلائی۔ اس کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا تھا۔

تک ویلوٹ جیسے ہوش میں آگیا۔ وہ دروازہ کھول کر نیچے کود گیا اور جب سامنے آیا تو گاڑی کے سامنے ایک بچے کو پڑے دیکھ کر اس کے دیوتا کوچ کر گئے لیکن پھر یہ جان کر اطمینان کا سانس لیا کہ اس بچے کے جسم پر یا آس پاس خون کا کوئی دھبا نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ بچہ غالباً رکتی ہوئی گاڑی سے ٹکرا کر گر گیا تھا۔ وہ سڑک پر اوندھا پڑا تھا۔ تک نے جھک کر اسے سیدھا کیا تو بچے نے مسکراتے ہوئے اسے آنکھ ماردی۔ تک ویلوٹ کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ بچہ نہیں بلکہ بونا تھا جس کی عمر تک کے اندازے کے مطابق بیس سال سے کم نہیں رہی ہوگی لیکن قد اور جسامت میں وہ کسی آٹھ سالہ بچے کے برابر تھا۔ قد کسی طرح بھی تین فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ جسم بھی بہت دبلا پتلا سا تھا۔ تک ویلوٹ نے اسے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ اسی دوران ایک کانسٹیبل بھی وہاں پہنچ گیا۔

"تم خوش قسمت ہو لیڈی" کانسٹیبل نے فی تانگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اگر یہ بچہ مرجاتا یا زخمی ہوجاتا تو شاید تمہاری نجات بھی مشکل ہوجاتی۔ ویسے کیا میں تمہارا لائسنس دیکھ سکتا ہوں؟"

فی تانگ نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے ہینڈ بیگ میں سے لائسنس نکال کر کانسٹیبل کی طرف بڑھا دیا۔

"میں بچہ نہیں' جوان مرد ہوں مسٹر کانسٹیبل۔" بونے نے کہا "اس لیڈی کی کوئی غلطی نہیں' غلطی تو میری ہے۔ میں نے عجلت میں سڑک پار کرنے کی کوشش کی تھی۔"

کانسٹیبل نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا کہ جسے وہ بچہ سمجھ رہا تھا' وہ واقعی جوان مرد تھا۔

"کیا نام ہے تمہارا مسٹر جوان مرد؟" کانسٹیبل نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"لانگ فیلو" بونے نے جواب دیا "یہ نام میرے ماں باپ نے رکھا تھا۔ وہ مجھے خوب لمبا تڑنگا آدمی دیکھنا چاہتے تھے لیکن بدقسمتی سے میرا قد چھوٹا رہ گیا۔"

"تم جاسکتی ہو لیڈی" کانسٹیبل نے لائسنس واپس کرتے ہوئے کہا "لیکن گاڑی ذرا احتیاط سے چلایا کرو۔"

"ہماری وجہ سے تمہیں تکلیف پہنچی مسٹر لانگ فیلو۔ ایک کپ کافی کے بارے میں کیا خیال ہے؟" تک ویلوٹ نے کہا۔

"خیال برا نہیں ہے۔" بونے نے جواب دیا۔

وہ ایک قریبی ریسٹورنٹ میں آگئے۔ کافی پینے کے دوران انکشاف ہوا کہ بونا لانگ فیلو آج صبح ہی پورٹ لینڈ سے آیا تھا۔ وہ کالج کا اسٹوڈنٹ تھا۔ اس کی چھوٹی بہن بھی کالج میں پڑھتی تھی جو صرف تین دن پہلے کام کی تلاش میں یہاں آئی تھی۔ گزشتہ شام

اس نے لانگ فیلو کو ٹیلی فون پر بتایا تھا کہ اسے یہاں آتے ہی ایک ریسٹورنٹ میں کام مل گیا ہے۔ اگر وہ بھی آجائے تو اسے بھی کام مل جائے گا۔ چنانچہ وہ آج صبح یہاں پہنچ گیا تھا۔ اس کی بہن سٹڈنی دن کے بارہ بجے سے شام چھ بجے تک ڈیوٹی پر تھی۔ وہ سارا دن کمرے میں پڑے پڑے بور ہو گیا تھا اور اس وقت یہ سوچ کر نکلا تھا کہ ٹہلتا ہوا ریسٹورنٹ چلا جائے گا اور چھ بجے سٹڈنی کو لے کر واپس آجائے گا لیکن راستے میں یہ حادثہ پیش آگیا۔

نک ویلوٹ نے گھڑی دیکھی۔ اس وقت ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ وہ جب ریسٹورنٹ سے نکلے تو چھ بجنے میں چند منٹ تھے۔ نک نے لانگ فیلو کو پیشکش کی کہ وہ اسے سٹڈنی کے ریسٹورنٹ تک پہنچا دیں گے اور جب وہ اس ریسٹورنٹ پہنچے تو پتا چلا کہ سٹڈنی چند منٹ پہلے چھٹی کرکے جا چکی ہے۔ اس مرتبہ نک نے لانگ فیلو کو اس کے گھر پہنچانے کی پیشکش کر دی جسے اس نے بخوشی قبول کر لیا۔ جب وہ اس مکان پر پہنچے تو نک ویلوٹ، لانگ فیلو کی بہن سٹڈنی کو دیکھ کر چونکے بغیر نہیں رہا تھا۔ یہ اس ریسٹورنٹ کی وہی خوب صورت ویٹرس تھی جس سے نک نے البرٹا کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ یہ دو منزلہ کاٹیج دراصل ایک رومنگ ہاؤس تھا جہاں کمرے کرائے پر ملتے تھے اور اس کی مالک بھی ایک عورت ہی تھی۔

"اب کیا ارادہ ہے؟" ٹی نانگ نے کار میں بیٹھتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے نک کی طرف دیکھا۔

"سیاٹل واپس چلو، مجھے کل صبح یہاں آنا پڑے گا۔" نک نے جواب دیا۔

ٹی نانگ نے انجن اسٹارٹ کرکے گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ کچھ ہی دیر بعد گاڑی قصبے کی حدود سے نکل کر سیاٹل کی طرف جانے والی سڑک پر دوڑنے لگی۔

○☆○

صبح دس بجے نک ویلوٹ ایک بار پھر بارڈن پہنچ گیا۔ اس مرتبہ وہ نارمن کی گاڑی لے کر آیا تھا اور اکیلا ہی تھا۔ گزشتہ روز جب نارمن نے ٹی نانگ کو ساتھ لے جانے کی پیشکش کی تھی تو نک نے یہ سوچ کر ٹی نانگ کو ساتھ لے لیا تھا کہ ممکن ہے کسی موقع پر اس کی ضرورت پڑ جائے لیکن اب بوڑھے لانگ فیلو اور اس کی بہن سٹڈنی سے ملاقات کے بعد نک نے ان دونوں سے کام لینے کا فیصلہ کیا تھا اسی لیے آج وہ ٹی نانگ کو ساتھ لے کر نہیں آیا تھا۔

سٹڈنی بے حد حسین تھی۔ عمر بھی سترہ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ نک نے جو پروگرام بنایا تھا، اسے اس کے مطابق کسی ایسی ہی نوخیز کلی کی ضرورت تھی اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ سٹڈنی ضرورت مند تھی۔ اگر معقول معاوضے کی پیشکش ہو تو وہ انکار نہیں کر سکتی تھی۔

نک ویلوٹ جب رومنگ ہاؤس والے کاٹیج پہنچا تو اس وقت ایک ادھیڑ عمر مرد اور ایک جوان عورت اپنا سامان گاڑی میں رکھ رہے تھے، یہ ایک سوٹ کیس اور ایک سفری بیگ تھا۔ نک کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کوئی کمرا خالی ہوا ہے۔ اس نے فوراً ہی کاٹیج کی مالکہ سے رابطہ قائم کیا اور ایک ہفتے کے لیے وہ کمرا کرائے پر حاصل کر لیا۔ کرایہ بھی ایڈوانس دے دیا۔ اتفاق سے یہ کمرا گراؤنڈ فلور پر سٹڈنی اور لانگ فیلو کے کمرے کے ساتھ تھا۔ کمرا حاصل کرتے وقت نک نے رومنگ ہاؤس کی مالکہ کو بتایا تھا کہ وہ نیویارک سے آیا ہے اور سیاٹل کے ایک ہوٹل میں مقیم ہے۔ سیر کے لیے بارڈن آیا تھا یہ جگہ اسے اس قدر پسند آئی کہ اس نے چند روز یہاں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ ضرورت پڑی تو وہ سیاٹل سے اپنا سامان بھی منگوا لے گا۔

کمرا حاصل کرنے کے چند منٹ بعد نک ویلوٹ، لانگ فیلو کے کمرے کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ دروازہ کھلنے میں دیر نہیں لگی۔ وہ سٹڈنی تھی۔ نک دروازہ کھلتے ہی اندر آگیا۔

"لانگ فیلو کہاں ہے؟"

"وہ تو باہر گیا ہے۔ کوئی کام؟" سٹڈنی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کام تو مجھے دراصل تم سے ہے۔" نک نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "تم کالج کی طالبہ ہو، چھٹیوں میں کام کرکے کچھ رقم کمانا چاہتی ہو، بڑی اچھی بات ہے۔ میں ایسے لوگوں کو پسند کرتا ہوں جو محنت کرنا جانتے ہیں، اگر تم تھوڑی سی محنت کرکے مزید رقم کمانا چاہو تو..."

"مجھے کام کیا کرنا ہوگا؟" سٹڈنی نے پوچھا۔

"کام زیادہ مشکل نہیں ہے۔ تمہیں ایک آدمی کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا ہیں۔"

"میرا خیال ہے وہی آدمی جس کے بارے میں کل تم پوچھ رہے تھے۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"البرٹا" نک نے کہا۔

"ہاں، مسٹر البرٹا" سٹڈنی نے سر ہلایا "کیا معلوم کرنا چاہتے ہو اس کے بارے میں؟"

وہ کون ہے، کیا کرتا ہے، اس کے تعلقات کس قسم کے لوگوں سے ہیں اور یہاں کب سے ہے۔"

"کیا مجھے جاسوسی کرنا پڑے گی۔ بڑا سنسنی خیز اور مشکل کام ہے۔ اگر اسے پتا چل گیا تو؟"

"اگر تم ذہانت سے کام لوگی تو اسے بالکل پتا نہیں چلے گا۔" نک نے کہا۔

"لیکن تم اس کے بارے میں یہ سب کچھ کیوں معلوم کرنا چاہتے ہو؟" سٹڈنی نے پوچھا۔

"میرا تعلق نیویارک کی ایک پرائیویٹ سراغرساں ایجنسی سے ہے۔ کوئی عورت اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ممکن ہے وہ اس کی بیوی ہو۔ کوئی اور معاملہ بھی ہو سکتا

ہے۔"
"کام خاصا مشکل اور خطرناک ہے۔ لوگ اپنے بارے میں جاسوسی پسند نہیں کرتے۔ اگر اسے پتا چل گیا تو شاید وہ مجھے زندہ نہ چھوڑے لیکن بہرحال، میں یہ کام کروں گی۔ مجھے کیا ملے گا؟" سڈنی نے کہا۔
"دو سو ڈالر کے بارے میں کیا خیال ہے؟" نک بولا۔
"دو سو ڈالر!" سڈنی کے لہجے میں حیرت تھی۔
"پچاس ڈالر مزید اضافہ ہو سکتا ہے۔" نک نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔
"ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔" سڈنی نے جواب دیا۔ اس کے خیال میں یہ زیادہ سے زیادہ دو دن کا کام تھا اور اس معمولی سے کام کے لیے ڈھائی سو ڈالر اچھی خاصی رقم تھی۔
"کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس کے لیے مجھے کیا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا؟" سڈنی نے پوچھا۔
"بہترین طریقہ یہ ہے کہ تم البرٹا کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ تم جیسی حسین لڑکیوں میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کو فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں۔ تم ذہین لڑکی ہو، مجھے یقین ہے کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور ویسے بھی تم مجھے اپنے سے زیادہ دور نہیں پاؤ گی۔"
"ٹھیک ہے" سڈنی نے کہا "آج میں چھٹی کر کے البرٹا کے پیچھے لگ جاتی ہوں۔"
"چھٹی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارے ریسٹورنٹ میں آتا ہے۔ سروس کے دوران ہی اسے متوجہ کرنے کی کوشش کرنا۔" نک نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے البرٹا کے بارے میں مزید ہدایات دینے لگا۔
اس دوران لانگ فیلو بھی آگیا۔ نک ویلوٹ کو دیکھ کر اس نے خوشی کا اظہار کیا۔ نک نے جب انہیں یہ بتایا کہ وہ اسی رومنگ ہاؤس میں ان کے ساتھ والا کمرا کرائے پر حاصل کر چکا ہے تو وہ بے حد خوش ہوا۔ سڈنی کی ڈیوٹی بارہ بجے شروع ہوتی تھی۔ ریسٹورنٹ زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ تیار ہو کر پونے بارہ بجے کمرے سے نکل گئی۔ نک ویلوٹ، لانگ فیلو کو اپنے کمرے میں لے آیا اور دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔
"چلو، کسی ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے ہیں۔ کھانے کی یہ دعوت میری طرف سے ہے۔" نک نے کہا اور وہ دونوں اٹھ کر رومنگ ہاؤس سے باہر آگئے۔

○☆○

اس وقت ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ نک ویلوٹ تقریباً ایک گھنٹے سے درخت کے نیچے سیمنٹ کی بینچ پر بیٹھا ایک پیپر بیک جاسوسی ناول پڑھ رہا تھا۔ یہ ناول اس نے اس طرف آتے ہوئے ایک نیوز اسٹینڈ سے خریدا تھا۔ سڑک کے ساتھ ساتھ تقریباً پچاس فٹ چوڑی سبزے کی پٹی تھی۔ یہاں درختوں کی بھی بہتات تھی اور درختوں کے نیچے جگہ جگہ بینچیں بچھی ہوئی تھیں۔ کچھ بچے گھاس پر کھیل رہے تھے۔ چند عورتیں اور دو تین ادھیڑ عمر آدمی بھی مختلف بینچوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔
نک ویلوٹ جس جگہ بیٹھا ہوا تھا، وہاں سے سڑک کی دوسری طرف ایسا ہی لان تھا اور اس سے پرے وہ ریسٹورنٹ تھا جہاں سڈنی کام کرتی تھی۔ ریسٹورنٹ کا دروازہ وہاں سے صاف نظر آرہا تھا۔ نک بظاہر ناول پڑھ رہا تھا مگر اس کی نظریں بار بار ریسٹورنٹ کے دروازے کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ پھر اچانک سرخ رنگ کی اسپورٹس کار ریسٹورنٹ کے قریبی پارکنگ پلاٹ پر رکتے دیکھ کر وہ چونک گیا۔ ریڈ انڈین جیسا وہی دراز قامت شخص کار سے اتر کر ریسٹورنٹ میں داخل ہوگیا۔
نک ویلوٹ کے لیے اب ایک لفظ پڑھنا بھی محال ہو رہا تھا۔ کتاب اس کے سامنے کھلی پڑی تھی اور اس کی نظریں ریسٹورنٹ کے دروازے پر مرکوز تھیں۔ ٹھیک سوا چھ بجے وہ دراز قامت شخص ریسٹورنٹ سے باہر نکلا۔ اس کے فوراً ہی بعد سڈنی بھی دروازے سے باہر آگئی۔ وہ دونوں سرخ اسپورٹس کار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ نک کو اب سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہی البرٹا تھا اور سڈنی کو اسے پھانسنے میں غالباً زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی اور اب وہ شاید اس کے ساتھ جا رہی تھی۔
وہ دونوں سرخ اسپورٹس کار میں بیٹھ کر ایک طرف رخصت ہوگئے۔ اس کے فوراً ہی بعد نک بھی بنچ سے اٹھ کر اپنی کار کی طرف لپکا اور اس طرح تعاقب شروع ہوگیا۔ اسپورٹس کار تقریباً دو سو گز آگے تھی اور نک کو یقین تھا کہ البرٹا کو تعاقب کا شبہ نہیں ہو سکتا۔ سرخ اسپورٹس کار قصبے سے نکل کر شمال کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ گئی۔ اس سڑک پر اچھا خاصا ٹریفک تھا۔ پہاڑیوں میں تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک آبشار کے قریب پہنچ گئے۔ بڑی خوب صورت جگہ تھی۔ یہاں لوگوں کا اچھا خاصا رش تھا۔ نک نے اپنی گاڑی سرخ اسپورٹس کار سے خاصی دور روکی تھی۔
البرٹا، سڈنی کا ہاتھ تھامے ٹہلتا ہوا اس طرف نکل گیا جہاں آبشار کا پانی گر رہا تھا۔ وہاں اور بھی بہت سے لوگ تھے، نک بھی اس جگہ پہنچ گیا۔ پانی کی سفید چادر تھی جو اوپر سے گر رہی تھی۔ اُڑتی ہوئی پھوار بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ نک ویلوٹ ان لوگوں سے دور ہی دور ٹہلتا رہا۔
شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ لوگ واپس جانا شروع ہوگئے۔ البرٹا بھی سڈنی کو لے کر اپنی سرخ اسپورٹس کار کی طرف بڑھ گیا۔ ان کی کار جیسے ہی حرکت میں آئی، نک ویلوٹ اپنی گاڑی کی طرف دوڑا۔
واپسی کے لیے البرٹا نے دوسرا راستہ اختیار کیا تھا۔ اس

طرف سے چند اور گاڑیاں بھی جا رہی تھیں، نک کی گاڑی اور سرخ اسپورٹس کار کے درمیان دو گاڑیاں تھیں اس لیے نک کو یقین تھا کہ البرٹا کو اپنے تعاقب کا شبہ نہیں ہو سکے گا۔

سرسبز پہاڑیوں میں بل کھاتی ہوئی یہ سڑک آخر کار روٹ نمبر نائن سے آملی۔ یہ وہی سڑک تھی جس پر البرٹا کا کاٹیج تھا۔ اب سڑک کے دونوں طرف کاٹیج نظر آرہے تھے۔ البرٹا کی سرخ اسپورٹس کار کی رفتار کم ہوگئی اور اس کا بائیں طرف کا انڈیکیٹر جلنے بجھنے لگا جس کا مطلب تھا کہ اسے بائیں طرف مڑنا ہے اور آخر کار وہ کار کاٹیج نمبر تین سو گیارہ کے گیٹ میں داخل ہوگئی۔ نک ویلوٹ نے اپنی کار کی رفتار کم کردی تھی۔ اس سے آگے والی دونوں کاریں غالباً قصبے میں پہنچ چکی تھیں۔ نک ویلوٹ کار کی رفتار مزید ہلکی کرکے اسے سڑک سے اتار کر درختوں میں لیتا چلا گیا اور آخر کار اس نے گاڑی روک لی۔ گنجان درختوں میں کھڑی ہوئی کار کو سڑک پر سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

نک کار سے اتر کر سڑک کے ساتھ ساتھ درختوں کی آڑ میں اوپر کی طرف دوڑنے لگا۔ آخر کار وہ کاٹیج نمبر تین سو گیارہ کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ گیٹ والے راستے سے اندر جانے کے بجائے گنجان درختوں کی آڑ لے کر آگے بڑھنے لگا۔ مکمل طور پر اندھیرا چھا چکا تھا۔ یہاں تو درختوں کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی تاریکی تھی۔ وہ ایک جگہ رک کر سامنے دیکھنے لگا۔ ایک مکان کی کھڑکی سے مدھم سی روشنی نظر آرہی تھی۔ نک ویلوٹ روشنی کی طرف بڑھتا رہا۔

کاٹیج کی ایک . . . . کھڑکی کے سامنے پہنچ کر وہ رک گیا۔ کھڑکی بولٹ تھی اور اندر پردہ گرا ہوا تھا جس کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نک دبے قدموں چلتا ہوا برآمدے سے نکل کر دائیں طرف آگیا۔ اس طرف بھی ایک کھڑکی میں روشنی نظر آرہی تھی لیکن یہاں بھی اندر کی طرف دبیز پردہ تھا جس کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ البتہ کھسر پھسر کی کچھ آوازیں سنائی دے رہی تھیں مگر سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ نک نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اندر جھانکنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے اوپر دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ اوپر ایک روشندان تھا اور ایک درخت کی موٹی سی شاخ اس روشندان کے قریب سے چھت پر چلی گئی تھی۔

نک ویلوٹ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر دبے قدموں چلتا ہوا درخت کے قریب آگیا۔ خاصا تناور درخت تھا۔ نک کسی بندر کی طرح بڑی پھرتی سے درخت پر چڑھ گیا۔ مکان کے روشن دان کی طرف جانے والی شاخ بھی خاصی موٹی تھی اور اس کے ٹوٹنے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ نک شاخ پر اس طرح بیٹھا تھا کہ اس کے دونوں پیر نیچے لٹکے ہوئے تھے اور وہ دونوں ہاتھ اپنے آگے شاخ پر جمائے آہستہ آہستہ آگے سرک رہا تھا۔ روشندان کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔

روشندان اس شاخ سے تقریباً ایک فٹ کے فاصلے پر تھا۔ نک ویلوٹ جھک کر روشندان سے جھانکنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے اسے یوں لگا جیسے اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا ہو۔ البرٹا، سنڈی کو آغوش میں لیے بیٹھا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ سنڈی کے لباس پر بڑی تیزی سے چل رہا تھا اور سنڈی اس طرح مدہوش سی تھی جیسے اپنے حواس میں نہ ہو۔ قریب ہی میز پر شراب کے دو گلاس پڑے ہوئے تھے۔ ایک میں نصف کے قریب شراب موجود تھی اور دوسرا تقریباً خالی تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر نک ویلوٹ کا خون کھول اٹھا۔ اس کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ سنڈی، البرٹا کی ہوس کا شکار ہونے والی ہے لیکن نک نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ ایسا نہیں ہونے دے گا خواہ اس کے لیے اسے اپنے مشن میں ناکامی کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے لیکن ٹھیک اسی لمحے کمرے میں رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ البرٹا بھی ٹیلی فون کی آواز سن کر چونک گیا تھا۔ اس نے سنڈی کو صوفے پر ڈال دیا اور اٹھ کر فون کا ریسیور اٹھالیا۔ وہ چند لمحے فون پر باتیں کرتا رہا پھر ریسیور رکھ کر سنڈی کی طرف آگیا۔ اس نے سنڈی کو بازو سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے اٹھایا اور تقریباً گھسیٹتا ہوا کمرے سے باہر لے گیا۔ نک ویلوٹ بھی آہستہ آہستہ درخت سے اترنے لگا۔ اس دوران کار کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ نک تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا برآمدے کے قریب پہنچ گیا اور آڑ سے جھانکنے لگا۔ کار حرکت میں آکر سڑک کی طرف جارہی تھی۔ اسٹیئرنگ کے سامنے البرٹا تھا اور ساتھ والی سیٹ پر سنڈی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا سر ایک طرف جھکا ہوا تھا۔

نک ویلوٹ کے لیے مکان کی تلاشی لینے کا یہ ایک بہترین موقع تھا لیکن سگریٹ رولر کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے پورے مکان میں آسانی سے تلاش کیا جا سکتا اور اس وقت تو اسے سب سے زیادہ فکر سنڈی کی تھی۔ اسے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ فون کال کس کی تھی اور البرٹا، سنڈی کو لے کر اتنی عجلت میں وہاں سے کیوں نکلا تھا۔ نک درختوں کی آڑ میں تیزی سے سڑک کی طرف دوڑنے لگا۔ جب وہ سڑک پر پہنچا تو البرٹا کی اسپورٹس کار بہت دور نکل چکی تھی۔ نک اپنی کار کی طرف دوڑا اور جب وہ کار کو درختوں کے جھنڈ سے نکال کر سڑک پر لایا تو البرٹا کی کار نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ نک نے اپنی کار تیزی سے قصبے کی طرف دوڑادی۔

○☆○

اندر داخل ہونے کے بعد نک ویلوٹ نے دروازہ بند کرلیا اور متجسس نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کمرا خالی تھا۔ البتہ باتھ روم سے شاور کی آواز سنائی دے رہی تھی اور ایک کرسی کی پشت پر سنڈی کے کپڑے پڑے ہوئے تھے جس کا مطلب تھا کہ سنڈی باتھ روم میں نہا رہی تھی۔ لانگ فیلو نجانے کہاں غائب تھا۔ تھا۔

نک ویلوٹ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد باتھ روم سے پانی

گرنے کی آواز بند ہوگئی۔ اس کے صرف ایک منٹ بعد دروازہ کھلا اور سڈنی جسم پر تولیہ لپیٹے کمرے سے باہر نکلی۔ تولیہ پوری طرح نہیں لپٹا تھا۔ گلابی جسم پر پانی کے چمکتے ہوئے قطرے نک ویلوٹ پر قیامت ڈھا دینے کے لیے کافی تھے۔ اسے سینے میں اپنا سانس رکتا محسوس ہونے لگا۔ اس کی نظریں پانی کے قطروں کی طرح سڈنی کے ملائم جسم پر پھسل رہی تھیں۔

سڈنی نے نک ویلوٹ کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ کرسی پر سے کپڑے اٹھانے کے لیے آگے بڑھی۔ اس نے کرسی کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس کی نظریں نک کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کے منہ سے بے اختیار ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ دوڑ کر دوبارہ باتھ روم میں گھس گئی اور دروازہ دھڑ سے بند کرلیا' چند سیکنڈ بعد دروازہ چند انچ کے قریب کھلا' سڈنی کا ہاتھ باہر نکلا اور اس کی آواز سنائی دی۔

"کرسی پر سے میرے کپڑے دے دینا پلیز!"

نک ویلوٹ نے کرسی کی پشت پر سے کپڑے اٹھا کر سڈنی کے ہاتھ میں تھمادیے۔ دروازہ ایک بار پھر بند ہوگیا۔ کئی منٹ بعد سڈنی لباس پہنے باتھ روم سے برآمد ہوئی۔ اس کے چہرے پر ندامت کے آثار نمایاں تھے۔

"مجھے افسوس ہے کہ....."

"معذرت تو مجھے کرنی چاہیے کہ دروازہ کھٹکھٹائے بغیر اندر چلا آیا۔" نک ویلوٹ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

"غلطی میری ہی تھی۔ مجھے باہر کا دروازہ بند کرلینا چاہیے تھا۔" سڈنی نے کہا۔

"بہرحال آج کی کیا پروگریس رہی؟" نک نے پوچھا۔

"اس نے کوشش تو بہت کی تھی لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکا۔" سڈنی نے جواب دیا۔

"میں اپنے کام کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔" نک نے کہا۔

سڈنی آج دوسرے دن بھی البرٹا کے ساتھ اس کے کاٹیج گئی تھی۔

"وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ ایف بی آئی میں رہ چکا ہے۔ ابھی چند ماہ پہلے ہی ریٹائر ہوا ہے۔ ایف بی آئی سے اس کے اب بھی قریبی مراسم ہیں۔ اس کے ساتھ کسی قسم کا دھوکا کرنا اپنے آپ کو موت کے منہ میں دینے کے مترادف ہے۔" سڈنی نے جواب دیا۔

ایف بی آئی کے نام پر نک ویلوٹ چونکے بغیر نہیں رہا تھا۔ وہ تو شکل ہی سے خطرناک لگتا تھا۔ ایف بی آئی کے کسی آدمی کے گھر سے کوئی چیز چرالینا ایسا ہی تھا جیسے شیر کے منہ سے اس کا نوالہ چھیننے کی کوشش کی جائے مگر نک ویلوٹ بزدل نہیں تھا۔ وہ ایک موقع پر مافیا کے ایک ڈان کو غچّہ دے چکا تھا۔ ایف بی آئی کا ایجنٹ اس کے سامنے کیا حیثیت رکھتا تھا۔

"دیکھو سڈنی!" نک اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا

"معاملہ ایک عورت کی زندگی کا ہے۔ یہ تو البرٹا بھی تمہیں بتاچکا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو چھوڑ چکا ہے مگر ان میں ابھی باقاعدہ طلاق نہیں ہوئی۔ ان میاں بیوی میں جھگڑا ایک عورت کی وجہ سے ہوا تھا۔ البرٹا کی بیوی نے نیویارک کی ایک عدالت میں اپنے شوہر کے خلاف مقدمہ دائر کر رکھا ہے اور وہ اس سگریٹ رولر کو اپنے شوہر کے خلاف عدالت میں ایک ثبوت کے طور پر پیش کرنا چاہتی ہے۔ اگر البرٹا کی بیوی اس سگریٹ رولر کو عدالت میں پیش کردے تو سارا جھگڑا ہی ختم ہوجائے گا اور وہ دونوں پھر میاں بیوی کی طرح خوشگوار زندگی گزار سکیں گے۔"

"اس قسم کے کسی مقدمے میں سگریٹ رولر کی کیا شہادت ہوسکتی ہے؟" سڈنی کے لہجے میں حیرت تھی "اور اگر اس سگریٹ رولر سے سارا جھگڑا ختم ہوسکتا ہے تو البرٹا خود ہی اسے عدالت میں پیش کیوں نہیں کردیتا؟ بقول البرٹا کے' وہ خود بھی اپنی بیوی سے ملاپ چاہتا ہے۔"

نک ویلوٹ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اس نے البرٹا کی بیوی کے بارے میں ایک فرضی کہانی سنائی تھی اور اتفاق سے البرٹا اسی قسم کے حالات سے دوچار تھا۔

"کیا کوئی مدعا علیہ اپنے خلاف عدالت میں کوئی ثبوت پیش کرسکتا ہے؟" اس نے کہا۔

"بہرحال' تمہیں یہ معلوم کرنا ہے کہ اس نے وہ سگریٹ رولر کہاں رکھا ہوا ہے؟"

"یہ میں کل ہی معلوم کرلوں گی۔" سڈنی نے جواب دیا۔ اس دوران لانگ فیلو بھی آگیا اور وہ تینوں رات کا کھانا کھانے کے لیے چلے گئے۔ نک ویلوٹ نے خیرسگالی کے طور پر ان کے کھانے وغیرہ کی ذمے داری اپنے سر لے رکھی تھی۔

اگلے روز سڈنی نے نک ویلوٹ کو وہ خبر بھی سنادی جس کا وہ منتظر تھا۔ سڈنی نے سگریٹ رولر کا پتا چلالیا تھا جسے البرٹا نے ایک سیف میں رکھا ہوا تھا۔ سیف میں اس کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی تھیں جو اس کے خیال میں بہت قیمتی تھیں۔ سڈنی کوشش کے باوجود البرٹا سے اس سیف کا میکنیزم یا کومبی نیشن دریافت نہیں کرسکی تھی۔ البتہ البرٹا نے اس سگریٹ رولر کے بارے میں ایک نئی کہانی سنائی تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق یہ سگریٹ رولر ایک ایسا شخص اسے دے گیا تھا جو اسے جانتا تک نہیں تھا جبکہ البرٹا اس شخص کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ بہت بڑا آدمی تھا اور البرٹا جیسے لوگ تو اس کے قریب پھٹکنے کا بھی تصور نہیں کرسکتے تھے۔ البرٹا نے بعد میں اس شخص سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔

"یہ تمہیں اس نے ایک فرضی کہانی سنائی ہے۔ بعض لوگوں کے شوق بھی عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ البرٹا..... کسی بہت بڑے آدمی کے ساتھ اپنا تعلق ظاہر کرکے تم پر یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ

وہ خود بھی بہت بڑا آدمی ہے۔ بہرحال، یہ سگریٹ رولر ہمیں ہر قیمت پر حاصل کرنا ہے۔ اگر تم ایک آخری کام کر دو تو تمہارا معاوضہ دُگنا ہو سکتا ہے۔" نک نے کہا۔

"کیا واقعی؟" سڈنی کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔

"ہاں" نک نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "یہ کام ذرا خطرناک ہے۔ تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنا ہوگا۔ یہ نہایت حساس کیمرا ہے۔ تمہیں سیف کے تالے کی مختلف زاویوں سے تصویریں کھینچنی ہیں۔ اس کے بعد تمہارا کام ختم ہوجائے گا۔" نک نے ماچس کی ڈبیا کے برابر ایک کیمرا جیب سے نکالا اور سڈنی کو اس کے استعمال کا طریقہ سمجھانے لگا۔

○☆○

نک ویلوٹ کا یہ لیزر کیمرا ایسے ہی موقعوں پر کام آتا تھا۔ اس کیمرے کی خصوصیت یہ تھی کہ اگر ایک مخصوص ناب دبانے کے بعد تصویر کھینچی جائے تو یہ چیز کے اندر تک کی تصویر لے لیتا تھا۔ گویا اس کیمرے سے کھینچی جانے والی تصویریں ایکسرے کا کام بھی دیتی تھیں۔ کچھ کمال اس کیمرے کو آپریٹ کرنے والے کا بھی ہوتا تھا اور سڈنی نے تصویریں کھینچنے میں واقعی بڑی مہارت کا ثبوت دیا تھا۔ بعض تصویریں تو ایسی تھیں جن میں سیف کے تالے کا اندرونی میکنیزم تک واضح تھا۔

نک ویلوٹ اس وقت سیاٹل میں نارمن کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور یہ تصویریں اس کے سامنے میز پر پھیلی ہوئی تھیں۔ ایک تصویر نارمن کے ہاتھ میں تھی جسے وہ بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں اس میں یہ باریک سا تار نظر آرہا ہے؟" اس نے تصویر نک ویلوٹ کو دکھاتے ہوئے کہا "اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس تالے کا میکنیزم الیکٹرانک نظام کے تحت الارم سسٹم سے وابستہ ہے۔ کومبی نیشن معلوم ہونے کے بعد بھی اسے کھولنے میں بڑی احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ کرسٹوفر آنے ہی والا ہوگا۔ وہ ان تالوں کا ماہر ہے۔ تمہیں سب کچھ بتادے گا۔"

کرسٹوفر، نارمن کا دوست تھا جو سیف اور تجوریوں وغیرہ کا کاروبار کرتا تھا۔ تجوریوں کے تالوں کے بارے میں اس کی معلومات خاصی وسیع تھیں۔ اس نے تصویروں کا بغور جائزہ لینے کے بعد انہیں لفافے میں ڈال لیا۔

"یہ تالا جدید اور خاصا پیچیدہ ہے۔ اس پر کام کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ بہرحال، میں شام کو آؤں گا۔ یہ تصویریں ساتھ لے جارہا ہوں۔" کرسٹوفر تصویروں والا لفافہ اٹھا کر کھڑا ہوگیا۔

"ایک بات کا خیال رہے کرسٹوفر" نارمن نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "یہ تصویریں کسی اور کی نظروں میں نہیں آنی چاہئیں۔ تمہیں یہ کام بڑی رازداری سے کرنا ہوگا۔"

"مطمئن رہو کسی کو پتا نہیں چلے گا۔" کرسٹوفر کہتے ہوئے رخصت ہوگیا۔

کرسٹوفر کے جانے کے بعد نک اور نارمن تالوں کے موضوع پر گفتگو کرنے لگے۔ نارمن، نک ویلوٹ کے کاروبار کے بارے میں بخوبی واقف تھا۔ کئی سال پہلے اس نے بھی نک ویلوٹ سے ایک کام لیا تھا۔ اس کے باپ کی کروڑوں کی جائیداد ایک اور آدمی ہضم کیے بیٹھا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ نارمن کے باپ نے اس کے بعض احسانات کا بدلہ چکانے کے لیے یہ جائیداد وصیت نامے کے ذریعے اس کے نام منتقل کردی تھی۔ اس نے وصیت نامہ بھی پیش کیا تھا لیکن نارمن جانتا تھا کہ یہ وصیت نامہ جعلی تھا۔ اس کے باپ کا اصلی وصیت نامہ اس شخص نے چھپا دیا تھا۔ عدالت نے فیصلہ اس شخص کے حق میں دیا تھا اس دوران نارمن کو نک کے بارے میں معلوم ہوا۔ اس نے نک ویلوٹ سے ملاقات کرکے اسے ساری صورت حال سے آگاہ کیا اور اس سے مدد کی درخواست کی۔ نک ویلوٹ نے صرف پندرہ دن میں نارمن کے باپ کا اصلی وصیت نامہ دریافت کرلیا۔ کیس ایک بار پھر عدالت میں پیش ہوا اور اس طرح وہ جائیداد نارمن کو مل گئی۔ نارمن، نک ویلوٹ کا بے حد احسان مند تھا کیونکہ آج وہ جو کچھ بھی تھا، نک ویلوٹ ہی کی وجہ سے تھا۔

شام آٹھ بجے کرسٹوفر آگیا۔ اس نے تصویروں کے ساتھ ایک کاغذ بھی نک کے سامنے میز پر رکھ دیا جس پر کچھ ہندسے لکھے ہوئے تھے۔ وہ ان ہندسوں کی مدد سے نک کو کومبی نیشن سمجھانے لگا۔

"میرا خیال ہے، اب کوئی اناڑی آدمی بھی اس تالے کو کھول سکتا ہے البتہ الیکٹرانک الارم کے مسئلے میں کچھ احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ الارم سسٹم کو ناکارہ بنانے کے لیے پہلے یہ کومبی نیشن استعمال کیا جائے۔" اس نے تین ہندسوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔" نک نے کاغذ اور تصویریں سمیٹتے ہوئے کہا۔

نک ویلوٹ نے وہ رات نارمن کے گھر پر ہی گزاری۔ دوسرے دن بھی وہ سیاٹل ہی میں رہا۔ اس کا یہ دن بے حد مصروف گزرا تھا اور جب شام پانچ بجے کے لگ بھگ وہ بارڈن کے لیے روانہ ہوا تو اس کی گاڑی میں کچھ سامان بھی لدا ہوا تھا۔

○☆○

وہ رات بڑی ہنگامہ خیز تھی۔

نک ویلوٹ جب بارڈن میں رونگ ہاؤس پہنچا تو شام کے سات بجنے والے تھے۔ سیاٹل سے بارڈن تک کا فاصلہ اگرچہ زیادہ سے زیادہ چالیس پینتالیس منٹ میں طے ہوسکتا تھا لیکن نک راستے میں ایک موٹیل میں رک گیا تھا۔ بات دراصل یہ ہوئی تھی کہ موٹیل کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہاں پر کھڑی ایک کار میں ایک جانا پہچانا نسوانی چہرہ دیکھ کر نک نے اپنی کار روک لی اور اتر کر

کار کے قریب پہنچ گیا۔ وہ گلوریا کی ایک دوست البرتھا تھی۔ کئی سال پہلے البرتھا سے بھی نک کا معاشقہ چلا تھا لیکن ایک روز گلوریا نے ان دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ گلوریا' نک کو تو کیا کہتی البتہ اس نے البرتھا کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ اس نے البرتھا کو اس قدر ذلیل کیا تھا کہ اس کے بعد ان میں دوستی کے تمام رشتے ناتے ختم ہو گئے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی شکل تک دیکھنے کی روا دار نہیں رہی تھیں۔ اس دوران نک ویلوٹ نے البرتھا کو صرف ایک دو مرتبہ دیکھا تھا اور اس کے بعد وہ نیویارک سے اس طرح غائب ہوئی تھی جیسے اس کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ آج البرتھا کئی سال بعد نظر آئی تھی اور نک کے خیال میں اس میں کوئی معمولی سی تبدیلی بھی نہیں آئی تھی۔

"ارے تم!" البرتھا اسے دیکھ کر چونک اٹھی۔ لیکن پھر یکایک اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی "تمہارے ساتھ وہ چڑیل بھی ضرور ہو گی۔ کہاں ہے وہ.....؟"

"میرے ساتھ وہ چڑیل نہیں ہے۔" نک نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "اگر وہ ہوتی تو میں اس وقت تم سے بات نہ کر رہا ہوتا۔ آؤ اندر بیٹھ کر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔"

نک ویلوٹ اسے موٹیل کے ہال میں لے آیا۔ کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے البرتھا نے بتایا کہ وہ سیاٹل کے ساحل پر ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ چلا رہی ہے۔ اپنی ایک دوست کو بارڈن چھوڑنے آئی تھی' اب واپس جا رہی ہے۔ نک ویلوٹ نے البرتھا سے سیاٹل کا ایڈریس لے لیا اور دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے وہ ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

روسنگ ہاؤس پہنچ کر نک ویلوٹ نے سامان گاڑی سے اتار کر کمرے میں رکھا۔ اس سامان میں سیاہ رنگ کا ایک لمبا سا صندوق بھی تھا۔ اس کی لمبائی تین فٹ' چوڑائی ڈیڑھ فٹ اور اونچائی بھی تقریباً اتنی ہی تھی۔ سامان اپنے کمرے میں رکھنے کے بعد وہ لانگ فیلو والے کمرے میں آ گیا لیکن کمرے میں صرف لانگ فیلو تھا۔ سڈنی ضرورت کی کچھ چیزیں خریدنے کے لیے شاپنگ سینٹر گئی ہوئی تھی۔ نک ویلوٹ نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لانگ فیلو سے گفتگو شروع کر دی۔ اپنے منصوبے کو آخری مرحلے پر اسے لانگ فیلو کی ضرورت تھی اور اب وہ لانگ فیلو کو ڈھب پر لا رہا تھا۔

"اس میں خطرہ تو نہیں؟" لانگ فیلو نے پوچھا۔

"خطرہ تو بہرحال ہے لیکن اگر احتیاط سے کام لو گے تو خطرے کی کوئی بات نہیں ہو گی۔" نک نے کہا اور پھر لانگ فیلو کو سمجھانے لگا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

"بہت مشکل ہے۔" لانگ فیلو نے کہا۔

"اگر پانچ سو ڈالر تمہاری جیب میں آ جائیں تو میرے خیال میں کوئی مشکل' مشکل نہیں رہے گی۔" نک ویلوٹ نے کہتے ہوئے جیب سے پانچ سو ڈالر کے نوٹ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیے۔

لانگ فیلو چند لمحے للچائی ہوئی نظروں سے نوٹوں کو دیکھتا رہا پھر اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے نوٹ اٹھا کر جیب میں ڈال لیے۔

"ٹھیک ہے' میں تیار ہوں۔"

"میرے کمرے میں آؤ۔ میں تمہیں سب کچھ سمجھا دیتا ہوں۔ احتیاط سے کام لو گے تو تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔" نک ویلوٹ کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ چند منٹ بعد وہ اپنے کمرے میں بیٹھا لانگ فیلو کو سمجھا رہا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

O☆O

رات کے دس بجنے والے تھے۔ البرٹا کے مکان پر ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔ آج اس کا ایک بہت پرانا دوست آیا تھا اور البرٹا نے اس کے اعزاز میں اپنے کاٹیج پر ایک بہت بڑی دعوت کا اہتمام کیا تھا جس میں قصبے کے معززین شریک تھے۔ مہمانوں کی تعداد چالیس کے لگ بھگ تھی' ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ البرٹا بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس محفل میں اور تو سب لوگ موجود تھے لیکن سڈنی نہیں تھی۔ حالانکہ سڈنی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ساڑھے نو بجے تک پہنچ جائے گی لیکن اس وقت دس بجنے والے تھے اور سڈنی نہیں آئی تھی — پھر ٹھیک دس بجے البرٹا نہایت خاموشی سے کاٹیج سے باہر آ گیا۔ اپنی سرخ اسپورٹس کار میں بیٹھ کر اس کا انجن اسٹارٹ کیا اور اسے گیٹ کی طرف موڑ دیا۔ سڑک پر آ کر اس نے ایک دم گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ اس کا رخ قصبے کے مرکزی علاقے کی طرف تھا اور پھر دس منٹ بعد گاڑی بریکوں کی تیز چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ روسنگ ہاؤس کے سامنے رک گئی۔ البرٹا اچھل کر گاڑی سے نکلا اور تقریباً دوڑتا ہوا سڈنی کے کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور سڈنی صوفے پر افسردہ سی بیٹھی تھی۔

"ارے! تم ابھی تک یہیں بیٹھی ہو؟" البرٹا کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا "سب مہمان جمع ہیں۔ جلدی کرو' میں تمہیں لینے آیا ہوں۔"

"ایک مشکل آن پڑی ہے مسٹر البرٹا۔" سڈنی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا مسئلہ ہے؟ کیسی مشکل آن پڑی ہے؟" البرٹا نے اسے گھورا۔

"یہ صندوق دیکھ رہے ہو؟" سڈنی نے سیاہ رنگ کے ایک لمبے سے صندوق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ صندوق میری والدہ نے پورٹ لینڈ سے بھیجا ہے' ابھی کچھ دیر پہلے ہی ایک آدمی دے کر گیا ہے۔ میری والدہ میکسیکو چلی گئی ہے۔ اس میں کچھ خاندانی یادگاریں ہیں جو ہمارے لیے بہت قیمتی ہیں لیکن روسنگ ہاؤس کی مالکہ کا کہنا ہے کہ وہ کسی قسم کا کاٹھ کباڑ یہاں رکھنے کی اجازت نہیں دے گی۔ میں پریشان ہوں کہ یہ صندوق کہاں لے جاؤں؟"

"اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔" البرٹا نے کہا "اسے ساتھ لے چلتے ہیں۔ میرے گھر میں رکھا رہے گا۔ جب تمہیں ضرورت ہوگی لے جانا۔"

"اس میں کچھ قدیم خاندانی زیورات....."

"اس میں خواہ کچھ بھی ہو' میرے کاٹیج میں یہ بالکل محفوظ رہے گا۔" البرٹا نے کہتے ہوئے جھک کر صندوق اٹھالیا جو خاصا وزنی تھا۔

تقریباً بیس منٹ بعد سیاہ رنگ کا وہ صندوق البرٹا کے کاٹیج کے ایک کمرے میں رکھا ہوا تھا۔ رات دو بجے تک پارٹی کا ہنگامہ جاری رہا اور پھر مہمان ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے۔ آخر میں البرٹا کا ... دوست جس کے اعزاز میں یہ پارٹی تھی' وہ اور سنڈی رہ گئے۔ سنڈی نے جب جانے کے لیے کہا تو البرٹا اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔

"تم اس وقت کہاں جاؤ گی' رات یہیں رہ جاؤ۔ صبح چلی جانا۔"

"میں بھی اسی طرف جارہا ہوں۔ اسے راستے میں ڈراپ کردوں گا۔" البرٹا کے دوست فریڈرک نے کہا۔

"ہاں' بالکل ٹھیک ہے۔ میں مسٹر فریڈرک کے ساتھ ہی چلی جاتی ہوں۔" سنڈی جلدی سے بولی۔

فریڈرک داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے البرٹا کی طرف دیکھنے لگا جس کا منہ لٹک گیا تھا۔

سنڈی اور فریڈرک گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اسٹیئرنگ کے سامنے فریڈرک ہی تھا۔ پختہ سڑک پر آنے کے کچھ ہی دیر بعد فریڈرک نے گاڑی روک لی اور نیچے اترتے ہوئے بولا۔

"تم گاڑی لے جاؤ سنڈی' میں صبح چار بجے تک پہنچ جاؤں گا۔"

وہ نک ویلوٹ تھا۔ البرٹا کے دوست فریڈرک کے بارے میں تمام معلومات سنڈی ہی نے حاصل کی تھیں۔ البرٹا کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے دوست فریڈرک کو بے حد چاہتا ہے لیکن کئی برسوں سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ البرٹا کی فوٹو البم سے فریڈرک کی تصویر بھی سنڈی ہی نے نکالی تھی اور پھر فریڈرک کا حلیہ اپنانے میں نک کو زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ اس کا چہرہ فریڈرک کی تصویر کے عین مطابق تھا اور سرخ بالوں والی داڑھی تو نک کے چہرے پر خوب جچ رہی تھی۔

سنڈی کو رخصت کرنے کے بعد نک ویلوٹ تاریکی میں درختوں کی آڑ لیتا ہوا ایک بار پھر البرٹا کے کاٹیج کے پچھلی طرف پہنچ گیا۔ کاٹیج کے ایک دو کمروں میں ابھی روشنی ہو رہی تھی۔ نک درختوں میں چھپا کھڑا رہا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد کاٹیج کی تمام بتیاں بجھ گئیں اور مکمل طور پر خاموشی چھاگئی۔ نک کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ البرٹا اپنے بیڈ روم میں جاکر لیٹ گیا ہوگا۔ ممکن ہے تھکن کی وجہ سے سو بھی چکا ہو۔ اس نے الیکٹرانک واچ کا روشنی والا بٹن دبا کر

وقت دیکھا' تین بجنے میں دس منٹ تھے۔ وہ ایک درخت سے ٹیک لگائے وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔

کاٹیج کے اندر وہ کمرا تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ جس میں سڈنی کا لایا ہوا سیاہ صندوق رکھا گیا تھا۔ ٹھیک ساڑھے تین بجے صندوق کے اندر کھٹکے کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دینے لگیں پھر کلک کی ایک آواز ابھری اور صندوق کا ڈھکنا اسپرنگ کی طرح اوپر کی طرف کھل گیا۔ صندوق میں سڈنی کا دُبلا پتلا بونا بھائی لانگ فیلو لیٹا ہوا تھا۔ اس کے منہ پر آکسیجن ماسک لگا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا سلنڈر بھی تھا۔ یہ سلنڈر چھ گھنٹے تک کام دے سکتا تھا۔

لانگ فیلو نے گیس ماسک چہرے سے اتار دیا اور صندوق سے نکل کر ایک بھرپور انگڑائی لی۔ بانہوں اور ٹانگوں کو جھٹک کر سلز درست کیے اور جیب سے پنسل ٹارچ نکال کر اس کی محدود روشنی میں کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ وہ سیف اسی کمرے میں تھا۔ لانگ فیلو ٹارچ کی روشنی میں کچھ دیر تک سیف کے تالے کا جائزہ لیتا رہا پھر بڑی احتیاط سے ڈائلز کے نمبر گھمانے لگا۔ تین ڈائل تھے۔ لانگ فیلو نے پہلے وہ نمبر گھمائے جن سے الیکٹرانک الارم سسٹم منقطع ہوتا تھا پھر بڑے اطمینان سے وہ کومبی نیشن کے دوسرے نمبر ملاتا چلا گیا۔ آخر میں کلک کی ہلکی سی آواز سن کر اس نے ہینڈل دبا دیا۔ سیف کا بھاری دروازہ کھل گیا۔

ٹارچ کی روشنی میں سیف کے اندر کا منظر دیکھ کر لانگ فیلو کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ایک خانے میں نوٹوں کی گڈیاں اور ایک جیولری بکس رکھا ہوا تھا۔ اس نے جیولری بکس کھول کر دیکھا اس میں کئی ہیرے رکھے ہوئے تھے جو ٹارچ کی روشنی میں جگمگا اٹھے۔

لانگ فیلو نے جیولری بکس وہیں رکھ دیا اور نوٹوں کے دو بنڈل اٹھا کر جیبوں میں ٹھونس لیے۔ دوسرے خانے میں چند فائلوں کے ساتھ ایک سگریٹ رولر بھی رکھا ہوا تھا۔ اس نے سگریٹ رولر اٹھا کر جیب میں ٹھونسا اور سیف کا دروازہ بند کر دیا۔ وہ ٹارچ کی روشنی میں اس کمرے کی طرف بڑھنے لگا جس کے روشن دان کے قریب چھت پر نک ویلوٹ اس کا منتظر تھا۔ روشندان کے نیچے دیوار کے ساتھ ایک الماری استادہ تھی۔ لانگ فیلو بڑی مشکل سے اس الماری پر چڑھنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ الماری پر چڑھنے کے بعد بھی روشندان اس سے تقریباً دو فٹ اونچا تھا۔

"کیا تم یہاں موجود ہو مسٹر نک؟" اس نے روشندان کی طرف منہ اٹھا کر سرگوشی کی۔

"ہاں تم آگئے۔" روشندان سے نک کی آواز سنائی دی۔

"روشندان اونچا ہے' مجھے کسی طرح سہارا دے کر باہر نکالو مسٹر نک۔" لانگ فیلو نے کہا۔

نک ویلوٹ درخت کی شاخ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے خطرناک حد تک جھک کر ہاتھ روشندان کے اندر ڈال دیا۔ اس نے لانگ فیلو کا ہاتھ پکڑا ہی تھا کہ کاٹیج کی فضا الارم کی آواز سے گونج اٹھی۔

نک ویلوٹ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ لانگ فیلو کو اوپر کھینچنے لگا۔

کاٹیج کے اندر کسی جگہ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ البرٹا الارم کی آواز سن کر جاگ گیا تھا۔ نک ویلوٹ لانگ فیلو کو کھینچ رہا تھا۔ لانگ فیلو کا آدھا جسم روشندان کے باہر تھا اور آدھا اندر کہ کاٹیج کے کسی کمرے میں فائر کی آواز سنائی دی۔ البرٹا نے غالباً ہوائی فائر کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یوں لگا جیسے شیشے کے لاتعداد برتن لڑھک اور ٹوٹ رہے ہوں۔ البرٹا شاید کسی میز سے ٹکرا گیا تھا جس پر رات والی پارٹی کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ میز الٹ گئی تھی اور برتن لڑھک رہے تھے۔

نک ویلوٹ نے لانگ فیلو کو روشندان سے باہر کھینچ لیا لیکن اس کے ساتھ ہی شاخ پر اس کا اپنا توازن بھی بگڑ گیا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ اسی لمحے اندر سے روشن دان پر ایک فائر ہوا۔ نک ویلوٹ' لانگ فیلو کے ساتھ پکے ہوئے پھل کی طرح شاخ سے گرا۔ وہ تقریباً پندرہ فٹ کی بلندی سے گرے تھے۔ یہ غنیمت تھا کہ نیچے دبیز گھاس تھی اور انہیں کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔ وہ اٹھ کر ایک طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

البرٹا بھی کاٹیج سے باہر آگیا تھا۔ وہ فائرنگ کرتا ہوا ان کے پیچھے دوڑ رہا تھا لیکن وہ دونوں بہت آگے تھے۔ نک ویلوٹ کو لانگ فیلو کی وجہ سے دوڑنے میں کچھ دشواری پیش آرہی تھی۔ آخرکار اس نے جھک کر لانگ فیلو کو اٹھا کر بغل میں دبا لیا اور تاریک جنگل میں تیزی سے دوڑنے لگا۔

○☆○

نک ویلوٹ دو دن سے نارمن کے مکان میں صرف ایک کمرے تک محدود تھا۔ اس دوران وہ سیکڑوں مرتبہ سگریٹ رولر کا جائزہ لے چکا تھا۔ دو سادہ سی ریلیں تھیں جن پر ایک مخصوص ٹیکنیک کے تحت ربگزین کی طرح کا کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ اس کپڑے پر تمباکو رکھ کر دوسری طرف ریلوں میں سگریٹ پیپر ڈال دیا جاتا۔ ان ریلوں کو رول کرنے سے دوسری طرف سے سگریٹ بن کر نکل آتی۔ نک اب تک اس رولر پر بیسوں سگریٹ بنا چکا تھا لیکن کوئی خاص بات سامنے نہیں آئی تھی۔ البتہ یہ بات اس نے ضرور نوٹ کی تھی کہ اس سگریٹ رولر میں لگا ہوا کپڑا کالے رنگ کا تھا جو اندر کی طرف سے قدرے چکنا تھا جبکہ عام سگریٹ رولرز میں سفید یا خاکی سے رنگ کا کپڑا لگا ہوا ہوتا ہے۔ وہ ایک سگریٹ رولر بازار سے بھی خرید کر لایا تھا۔ ان دونوں میں بظاہر کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا لیکن نک کو یقین تھا کہ اس کالے کپڑے والے رولر میں کوئی خاص بات ضرور تھی جس کے لیے ہزاروں ڈالر خرچ کیے گئے تھے۔ دونوں رولروں کے دائیں طرف باہر کی سائیڈ پر کمپنی کا نام تھا۔ دونوں رولر ایک ہی کمپنی کے بنے ہوئے تھے۔ البتہ چوری شدہ رولر پر بائیں طرف باہر کی سائیڈ پر انگریزی کا حرف A لکھا ہوا تھا۔

ٹک ویلوٹ کا دماغ بری طرح چکرا گیا تھا۔ وہ آخری مرتبہ سگریٹ رولر کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس مرتبہ اس کی توجہ کا مرکز انگریزی کا حرف 8 تھا۔ اس حرف کے اندر کی سمت بننے والے تکون میں ایک بہت باریک نقطہ نظر آرہا تھا۔ لگتا تھا جیسے سوئی کی نوک کے برابر گڑھا سا بن گیا ہو۔ ٹک ویلوٹ نے میز پر پڑی ہوئی کامن پن اٹھا کر اس کی نوک اس ننھے سے گڑھے پر رکھی اور پن کو آہستہ سے اندر کی طرف دبایا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ وہ ننھا سا گڑھا کسی حد تک اندر کی طرف دب گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک ریل کے اندر سے گرر گرر کی بہت ہلکی سی آواز سنائی دی۔ صرف تین سیکنڈ بعد وہ آواز بند ہوگئی۔

ٹک ویلوٹ نے ایک بار پھر سگریٹ بنانے کے لیے سگریٹ رولر پر تمباکو رکھا' سگریٹ کا کاغذ ریل میں پھنسایا اور اسے رول کرنے لگا۔ اس مرتبہ دوسری طرف سے سگریٹ نہیں نکلی بلکہ وہ کاغذ ہی باہر آگیا تھا اسے دیکھ کر ٹک ویلوٹ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

○☆○

اس سے اگلے ہی روز ٹک ویلوٹ نے بلیک کیٹ کے دیے ہوئے نمبر پر فون کردیا۔ دوسری طرف سے کال ایک لڑکی نے ریسیو کی تھی۔ ٹک ویلوٹ نے اپنا نام بتایا تو لڑکی نے اسے ہولڈ کرنے کو کہا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ایک بھاری' مردانہ آواز سنائی دی۔

"شام کو آٹھ بجے کہاں مل سکتے ہو مسٹر ویلوٹ؟"

"تم کون ہو؟" ٹک نے پوچھا۔

"کیا شناخت کے لیے بلیک کیٹ کافی نہیں ہوگا؟" ریسیور پر آواز ابھری۔

"ٹھیک ہے۔" ٹک نے کہا اور پھر اسے الزبتھ کے ریسٹورنٹ کا پتا بتادیا۔

اس روز شام سے پہلے ٹک ویلوٹ' الزبتھ کے ریسٹورنٹ پہنچ گیا۔ درختوں میں گھری ہوئی ایک ساحلی چٹان پر واقع یہ ریسٹورنٹ خاصا مہنگا تھا۔ سی فوڈ سے تیار ہونے والی بعض ڈشوں کے لیے اسے بڑی شہرت حاصل تھی۔ ان ڈشوں کے لیے لوگ دور دور سے یہاں آتے تھے۔ الزبتھ کی رہائش بھی ریسٹورنٹ سے ملحق ایک چھوٹے سے خوب صورت کاٹیج میں تھی۔ اس نے بڑی گرمجوشی سے ٹک کا استقبال کیا اور اسے لے کر کاٹیج میں آگئی۔

آٹھ بجنے سے چند منٹ پہلے ٹک ویلوٹ ریسٹورنٹ میں آگیا۔ اس وقت یہاں اچھا خاصا رش تھا لیکن الزبتھ نے اس کے لیے ایک الگ میز ڈلوا دی تھی جس کے گرد صرف دو کرسیاں رکھی گئی تھیں' ٹک ایک کرسی پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ ٹھیک آٹھ بجے ایک بھاری بھرکم آدمی ریسٹورنٹ میں داخل ہوا۔ اس کا سر انڈے کے چھلکے کی طرح صاف اور چہرے بلڈاگ سے ملتا جلتا تھا۔ ہونٹوں میں ایک موٹا سا سگار دبا ہوا تھا۔ وہ دروازے کے قریب کھڑا چند لمحے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر سیدھا ٹک کی طرف آگیا۔

"مسٹر ویلوٹ! ٹک ویلوٹ؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے ٹک کی طرف دیکھا۔

"ہاں" ٹک نے اثبات میں گردن ہلادی۔

"بلیک کیٹ" وہ شخص کہتا ہوا ٹک کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

چند لمحوں کی رسمی گفتگو کے بعد ٹک ویلوٹ نے جیب سے سگریٹ رولر نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس شخص نے سگریٹ رولر کو الٹ پلٹ کر دیکھا پھر اسے جیب میں رکھ لیا اور ٹک کا شکریہ ادا کرکے اٹھ گیا۔

ٹک کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ گزشتہ دو تین دنوں میں اس نے اس سگریٹ رولر کا پس منظر معلوم کرلیا تھا۔ بہت عرصہ پہلے C-5 گلیکسی نام کا ایک ہوائی جہاز بنایا گیا تھا جو اپنے وقت کا دنیا کا سب سے بڑا ہوائی جہاز تھا۔ اس کے جواب میں سوویت یونین نے بھی ایک ہوائی جہاز بنانا شروع کردیا جو نہ صرف C-5 گلیکسی سے بہت بڑا تھا بلکہ فضا کے علاوہ وہ سمندر کی سطح پر بھی ایک ہزار کلومیٹر کی رفتار سے سفر کرسکتا تھا۔ افغانستان میں شکست کے بعد روس اپنے اس جہاز کا منصوبہ جاری نہ رکھ سکا۔ البتہ اس کا فارمولا امریکا کے ہاتھ لگ گیا اور سیاٹل میں ہوائی جہاز بنانے والی کمپنی لاک ہیڈ نے خفیہ طور پر اس جہاز کی تیاری شروع کردی۔ اس کے بنیادی فارمولے میں کچھ تبدیلیاں کی گئی تھیں اور اسے اب فوجی مقاصد کے پیش نظر تیار کیا جارہا تھا۔

اسرائیل کو اگرچہ امریکا سے ہر قسم کی امداد ملتی تھی۔ اس کے پاس امریکا کے جدید ترین اسلحے کے انبار لگے ہوئے تھے لیکن

اس کی ہوس میں کمی نہیں آئی تھی۔ اسرائیل کو کسی طرح اس جہاز کی خفیہ تیاری کا پتا چل گیا تھا اور وہ اس کا فارمولا حاصل کرکے یہ جہاز خود بنانا چاہتا تھا۔ طیارہ ساز فیکٹری کا ایک بہت بڑا یہودی آفیسر انہیں قسطوں میں یہ راز فراہم کررہا تھا۔ اس کے لیے اس نے بڑا دلچسپ طریقہ ایجاد کیا تھا۔ اس نے ایک بہت چھوٹا سا پرنٹنگ پروسیس تیار کیا۔ وہ ایک انجینئر تھا اور اس کے لیے اس قسم کی چیزیں تیار کرنا مشکل نہیں تھا۔ وہ سگریٹ رولر کی ریل میں یہ پروسیس فٹ کردیتا۔ وہ طیارے کے راز کا جو حصہ اپنے آقاؤں کو بھیجنا چاہتا اس کی منی اسکرین تیار کرکے اس سگریٹ رولر میں فٹ کردیتا اور سگریٹ رولر کسی ایجنٹ کے حوالے کردیا جاتا۔ ایک پرنٹ نکالنے کے بعد رولر میں لگی ہوئی یہ پرنٹنگ اسکرین صاف ہوجاتی، خالی سگریٹ رولر دوبارہ بھیج دیا جاتا۔

اس مرتبہ طیارہ ساز فیکٹری کا وہ یہودی آفیسر سگریٹ رولر غلطی سے البرٹا کو دے گیا تھا۔ البرٹا کو حیرت تھی کہ طیارہ ساز کمپنی کے اتنے بڑے آفیسر نے اسے یہ تحفہ کیوں دیا تھا۔ بعد میں البرٹا نے اس یہودی آفیسر سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکا اور آخر کار البرٹا نے وہ سگریٹ رولر بہت قیمتی تحفہ سمجھ کر حفاظت سے رکھ لیا۔

اسرائیلیوں کو جب اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انہوں نے یہ سگریٹ رولر حاصل کرنے کے لیے نک ویلوٹ کی خدمات حاصل کیں۔ اگر وہ سیدھے سادے طریقے سے سگریٹ رولر البرٹا سے واپس مانگتے تو البرٹا کو کسی قسم کا شبہ ہوسکتا تھا۔ آخر وہ ایف بی آئی میں آفیسر رہ چکا تھا۔

نک ویلوٹ نے وہ سگریٹ رولر تو انہیں دے دیا تھا۔ وہ رولر اگرچہ بیکار ہوچکا تھا لیکن نک کے خیال میں یہ سلسلہ ختم نہیں ہوگیا تھا۔ اس کے خیال میں راز کی اس مسلسل چوری کو روکنے کے لیے کچھ کرنے کی ضرورت تھی اور اس نے بہت جلد کچھ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا لیکن اس سے پہلے وہ کچھ وقت الزبتھ کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ وہ بہت عرصہ بعد ملی تھی اور یہاں گلوریا کا بھی خوف نہیں تھا۔ خوب صورت سنڈی اور اس کا بونا بھائی لانگ فیلو پورٹ لینڈ واپس جاچکے تھے۔ ان دونوں بہن بھائیوں نے دو تین دن میں نک ویلوٹ سے ایک ہزار ڈالر کمالیے تھے اور سنڈی کو ریسٹورنٹ میں مزید ملازمت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

الزبتھ کے ساتھ رہتے ہوئے تین دن ہوچکے تھے۔ نک کے خیال میں راوی اس کے لیے عیش ہی عیش لکھتا تھا اور وہ الزبتھ کے ساتھ عیش کررہا تھا۔ چوتھے روز صبح سویرے وہ الزبتھ کے ساتھ بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ ان دونوں نے اپنے اوپر کمبل تان رکھا تھا۔ دونوں جاگ گئے تھے مگر اٹھنے کی ہمت کسی میں نہیں ہورہی تھی۔ تقریباً آدھا گھنٹا پہلے الزبتھ نے اٹھ کر بیرونی دروازہ کھول دیا تھا تاکہ ملازمہ بیڈ ٹی لے کر آئے تو اسے دوبارہ نہ اٹھنا پڑے۔

دستک کی آواز سن کر نک نے الزبتھ کی طرف دیکھا۔ الزبتھ نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے اونچی آواز میں کہا "آجاؤ دروازہ کھلا ہے" ان کا خیال تھا کہ ملازمہ بیڈ ٹی لے کر آئی ہوگی۔

بیرونی دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی پھر قدموں کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ کسی عورت کے قدموں کی آواز تھی۔ پھر بیڈ روم کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور کمرے میں جو عورت داخل ہوئی اسے دیکھ کر نک ویلوٹ کے دیوتا کوچ کرگئے۔

وہ گلوریا تھی۔

"مجھے معلوم تھا' مجھے معلوم تھا کہ یہ حرافہ تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔" گلوریا چیخی۔

"چیخنے کی ضرورت نہیں گلوریا۔ یہ میرا گھر ہے۔" الزبتھ کے لہجے میں بھی غراہٹ تھی "میں اسے بلانے نہیں گئی تھی' یہ خود آیا تھا میرے پاس۔ لے جاؤ اپنے اس سگے کو۔ اب مجھے اس کی ضرورت نہیں رہی۔"

"اپنے اس سگے کا تو میں وہ حشر کروں گی کہ یہ زندگی بھریاد کرے گا۔ چلو اٹھو۔" گلوریا نے آخری الفاظ نک سے مخاطب ہوکر کہے تھے "اگر پرسوں نارمن مجھے فون کرکے یہ نہ بتاتا کہ تم اس حرافہ کے ساتھ چلے گئے ہو تو میں تو یہی سمجھتی کہ تم کسی کیس کے سلسلے میں سیاٹل میں رکے ہوئے ہو۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ یہ کمینی بھی یہاں موجود ہے تو میں تمہیں کبھی یہاں نہ آنے دیتی۔"

"زبان سنبھال کربات کرو گلوریا۔" الزبتھ چیخی "میں تمہیں دھکے دے کر یہاں سے نکلوا دوں گی۔"

"تم مجھے دھکے دے کر نکلواؤ گی!" گلوریا چیختی ہوئی الزبتھ پر جھپٹی۔

"الزبتھ' گلوریا سے لپٹ گئی۔ نک ویلوٹ بھی اٹھ کر بھاگتا ہوا باتھ روم میں گھس گیا اور جب وہ اپنا حلیہ درست کرکے باہر نکلا تو میدانِ کارزار گرم تھا۔ گلوریا کا لباس تار تار ہوچکا تھا۔ دونوں کے چہروں اور گردنوں پر ناخنوں کی خراشوں سے خون برس رہا تھا اور دونوں کے بال چڑیوں کے اُجڑے ہوئے گھونسلوں کا منظر پیش کررہے تھے۔

نک ویلوٹ نے بڑی مشکل سے انہیں چھڑایا اور گلوریا کو گھسیٹتا ہوا کاٹیج سے باہر لے گیا۔ کچھ دیر بعد ایک ٹیکسی پر نارمن کے مکان کی طرف جاتے ہوئے نک ویلوٹ دل ہی دل میں "آئی بلا کو ٹال تو" کا ورد کررہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ گلوریا اسے اس مرتبہ معاف نہیں کرے گی۔

گلوریا کے نتھنوں سے پھنکار سی خارج ہورہی تھی' آنکھوں میں خون تیر رہا تھا۔ وہ اس وقت خاموش تھی لیکن نک جانتا تھا کہ نارمن کے گھر میں قدم رکھتے ہی وہ غبارے کی طرح پھٹ پڑے گی۔

بولتا خون

شائستہ نعیم

علم کو ہنر پر فوقیت رہی ہے لیکن ہٹ دھرم اور جاہل افراد اس بات کو واضح ثبوت کے باوجود تسلیم نہیں کرتے۔ جہاں، جب، جس جگہ موقع ملتا ہے اہلِ علم کو نیچا دکھانے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے ایک نصیحت آمیز تحریر جس میں ایک قتل حادثے کی صورت اختیار کر گیا تھا۔

اپنا خون دوسروں کو دینے سے خوف زدہ شخص کی لرزہ خیز داستان

"یہاں ایسے پولیس والے بھی ہیں، جن کی کھال اتنی موٹی ہے کہ چار آئینی ترامیم بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ بال بھی بیکا نہیں کر سکتیں" پروفیسر لیلی نے کہا۔ وہ تاریخ اور فلسفۂ سائنس کا پروفیسر تھا۔ کبھی کبھی وہ کرمنالوجی کے مشیر کی حیثیت سے بھی کام کرتا تھا۔

اس وقت وہ سارجنٹ بلیک کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ "پانچویں ترمیم کے ذریعے ایک زبردست تصور کو آئینی جامہ پہنایا گیا ہے۔" اس نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ "یہ تشدد کے ذریعے، دھونس دھڑنے سے شہادتیں جمع کرنے کے مذموم عمل کی روک تھام کے لیے بنائی گئی ہے۔ اس پر منفی استعمال کا الزام اسی حد تک آئے گا، جتنا مارفین پر آتا ہے، جو کینسر کے مریضوں کو مدد دینے کے بجائے منشیات کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔ میں تو بس اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔" سارجنٹ بلیک نے کہا۔ "پانچویں ترمیم کتنی ہی شریفانہ سہی

لیکن جب میں اس کی وجہ سے کسی قاتل کو صاف بچ نکلتے دیکھتا ہوں تو میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ اور پھر ہم پولیس والے یہ بھی اندازہ نہیں لگا سکتے کہ وکیل حضرات کس قانون کی تشریح کب، کس انداز میں کریں گے؟"

مڈلبی اپنی آرام کرسی میں نیم دراز ہو گیا۔ اس کی نظریں نوجوان پولیس آفیسر پر جمی ہوئی تھیں۔ "میں وکیل نہیں ہوں۔" اس نے کہا۔ "لہٰذا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم میرے پاس کیا توقع لے کر آئے ہو۔ جرم اور سراغ رسی کے سلسلے میں کوئی خالص سائنسی معاملہ ہوتا تو میں پہلے کی طرح تمہاری مدد کر سکتا تھا لیکن اگر تم پانچویں آئینی ترمیم میں سقم تلاش کر رہے ہو تو میں اس سلسلے میں خود کو تمہیں مشورہ دینے کا اہل نہیں سمجھتا۔"

"آپ نے درست فرمایا۔" بلیک نے کہا۔ "لیکن ہمارے لیے تو آپ مشکل کشا ہی ثابت ہوتے ہیں۔ بعض اوقات قانونی معاملات میں بھی ایسا ہوتا ہے کہ مجھے سامنے کی ایک بات نہیں سوجھتی۔ بہرکیف، میں موجودہ صورت حال پر آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ ٹھیک ہے؟"

"میں حاضر ہوں۔ عام طور پر تم جو کیس میرے پاس لاتے ہو، وہ بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے، غیر دلچسپ کیس تم میرے پاس لاتے ہی نہیں ہو۔"

"جی، یہی بات ہے۔ میں آپ کے پاس اسی وقت آتا ہوں، جب معاملہ اتنا الجھ جائے کہ میری سمجھ سے باہر ہو جائے۔ اور یہ بات طے ہے کہ میں بہت اچھا سراغ رساں ہوں۔" اس کا لہجہ جھوٹے انکسار سے پاک تھا۔ "لیکن پروفیسر، منطقی نتائج اخذ کرنے میں آپ کا کوئی ثانی نہیں۔ آپ جو کچھ پڑھاتے ہیں، اس کے سلسلے میں آپ کا تجربہ پچاس سال کا ہے۔ اگرچہ کرمنالوجی آپ کی فیلڈ نہیں پھر بھی ہمارے ساتھ آپ کا ریکارڈ بہت غیر معمولی ہے۔"

"شکریہ۔" مڈلبی نے خشک لہجے میں کہا۔ "لیکن مجھے اور زیادہ مکھن نہ لگاؤ ورنہ مجھے اپنا کولسٹرول چیک کرانا پڑے گا۔" اتنا کہہ کر وہ مسکرایا۔ اس مسکراہٹ نے پچھلے جملے کے نشتر کو ذرا سا کند کر دیا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم نے جو میری تعریف کی، وہ کم از کم تمہاری حد تک سچی اور مخلصانہ تھی لیکن مجھ سے تعریف ہضم ہی نہیں ہوتی۔ خیر، اب کیس کے ... بلکہ پانچویں آئینی ترمیم کے متعلق شروع ہو جاؤ۔"

"بنیادی طور پر تو کیس سیدھا سادا ہے۔" سارجنٹ بلیک نے بتایا۔ "ایک نہایت کمینہ شخص ہے، جس کا نام ہے کارلٹن ڈیل۔ یا یوں کہیے کہ اس کا موجودہ نام کارلٹن ڈیل ہے۔ اب تک وہ دولت اور بیمے کی رقم کے حصول کے لیے اپنی تین بیویوں کو ٹھکانے لگا چکا ہے۔ وہ تینوں مختلف ریاستوں میں قتل کی گئی تھیں۔ اب اس نے چوتھی بیوی کو یہاں شکار کیا ہے۔ ہماری خوش قسمتی یہ ہے کہ اس بار اس سے کچھ بے پروائی بھی سرزد ہو گئی۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ بیوی نمبر چار کو مرتے مرتے اس کی ناک پر ہاتھ گھمانے کا موقع مل گیا۔ ویسے وہ ناک اتنی عظیم الشان ہے کہ اس پر وار ضائع ہو ہی نہیں سکتا، چنانچہ جائے واردات پر اس کا اپنا خون خاصی مقدار میں موجود ملا۔ اس کا پروگرام تھا کہ قتل حادثہ نظر آئے لیکن ناک کی چوٹ نے معاملہ گڑبڑ کر دیا۔ وہ قتل کی واردات بن گئی۔"

مڈلبی نے پوچھا۔ "اس میں پانچویں ترمیم کہاں سے آ گئی؟ یہ تو سیدھا سادا قتل عمد کا کیس معلوم ہوتا ہے۔"

"بظاہر تو ایسا ہی ہے لیکن قسمت اس ملعون کا ساتھ دے گئی۔ کارلٹن کو معلوم بھی نہیں تھا کہ اس کیس میں کئی مشکوک افراد اور بھی ہیں۔ ہم نے تفتیش شروع کی اور خود ہی انہیں سامنے لے آئے۔ اس لیے نہیں کہ ہم کارلٹن کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ بس معمول کے مطابق تفتیش ہمیں ان تک لے گئی۔ کارلٹن کے ماضی کے کارناموں کا علم ہمیں بعد میں ہوا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ ہمارا اس کے خلاف کیس کچھ مضبوط نہیں۔ اس کا وکیل نہایت قابل آدمی ہے۔ امکان یہی ہے کہ موجودہ شکل میں ہمارا کیس عدالت میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکے گا۔ سبب ہے پانچویں ترمیم۔ اس کی رو سے ہم کارلٹن ڈیل کو بلڈ ٹیسٹ پر مجبور نہیں کر سکتے۔ میرا مطلب ہے، ہم اس کی مرضی کے بغیر اس سے خون کا نمونہ نہیں لے سکتے۔ اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ لاش کے پاس جو خون کا تالاب تھا، وہ اس کے اپنے خون کا تھا، اس کے خون کا نمونہ ضروری ہے۔ ہم کو یہ چیز مل جائے تو ہم ثابت کر سکتے ہیں کہ وہ خون اسی کی ناک سے نکلا تھا۔ اگلے روز اس کی ناک پر چوٹ کا نشان موجود تھا۔ پولیس لیبارٹری والوں کا کہنا ہے کہ وہ خون کمیاب ترین قسم کا ہے۔ ہمیں بس عدالت میں یہ ثابت کرنا ہے کہ جو خون لاش کے پاس ملا ہے، وہ کارلٹن ڈیل کے خون سے میچ کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ نہیں بچ سکے گا، اس لیے کہ دوسرے تمام مشکوک افراد کا خون مختلف گروپس کا ہے۔"

"میرے خیال میں اگر باقی تمام مشکوک افراد کا بلڈ گروپ لاش کے پاس سے ملنے والے خون سے مختلف ہے، تو کارلٹن خود بخود مجرم ثابت ہو جاتا ہے۔" مڈلبی نے کہا۔

"نہیں۔ کارلٹن کا وکیل بہت تیز آدمی ہے۔ وہ عدالت کے سامنے خوامخواہ ایک شخص کو مشکوک بنا کر پیش کر سکتا ہے۔ اور وہ شخص بھی اس کی ہدایت پر خون کا نمونہ دینے سے انکاری ہو تو معاملہ تو الجھ گیا نا۔ پھر مقتولہ بھی عجیب و غریب کردار کی عورت تھی۔ اس کے دوستوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ان میں سے کوئی بھی قاتل ہو سکتا ہے۔"

"تو کیا پتا، ہوا بھی یہی ہو۔"

"مجھے اس کے ریکارڈ کی وجہ سے یقین ہے کہ قاتل کارلٹن ہی ہے۔ لیکن مقدمے کے دوران یہ دلیل نہیں دی جا سکتی۔ اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ خون دینے کے معاملے میں مر جانے کی

حد تک خوف زدہ ہے۔ اس نے اس سلسلے میں مذہبی بنیادوں تک پر اعتراضات اٹھائے ہیں۔ حالانکہ مذہب سے اس کا اتنا ہی تعلق ہے، جتنا روس کے آں جہانی اسٹالن کا تھا۔ پانچویں ترمیم نے تو خیر اسے اس سلسلے میں تحفظ دے ہی دیا ہے۔ عدالت نے ہمیں وارننگ دی ہے کہ ہم اس کی مقدس نسوں میں سوئی چبھونا تو درکنار، انگلی بھی نہیں لگا سکتے۔"

مڈلبی کی آنکھوں میں شیطانی چمک ابھری۔ "تو ایسا کرو نا ... کسی شخص کو اس کی ناک پر گھونسا مارنے پر مامور کردو۔"

"میں نے بھی سوچا تھا۔" سارجنٹ بلیک نے سوگوار لہجے میں کہا۔ "لیکن اس طرح تو وہ مردود عدالت کی نظروں میں شہید کا رُتبہ پا جائے گا اور ہم ملعون قرار پائیں گے۔ ان دنوں ویسے ہی پولیس پر بڑی شدومد سے تشدد ور غیر قانونی طریقوں کے استعمال کا الزام عائد کیا جارہا ہے، یہ کسی حد تک درست بھی ہے۔" اس نے جلدی سے اضافہ کیا۔ "لیکن پولیس والے بھی انسان ہوتے ہیں۔ دوسروں کی طرح انہیں بھی شارٹ کٹ اچھے لگتے ہیں اور جب ہم کسی خبیث آدمی کو قانون کا مذاق اُڑاتے دیکھتے ہیں تو ایسے میں شخصی آزادی کے تصور کو یاد رکھنا ناممکن ہوجاتا ہے۔ یہ میں کوئی عذر پیش نہیں کررہا ہوں، محض ایک وضاحت ہے یہ۔"

"سارجنٹ... اس کارلٹن ڈیل کا آرمی ریکارڈ بھی تو ہوگا۔ وہاں سے اس کا بلڈ گروپ کنفرم ہوسکتا ہے۔"

"وہ بھی نہیں ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس خبیث نے لازمی بھرتی کے قانون سے بھی کسی طرح جان بچالی ہوگی۔ میکسیکو بھاگ گیا ہوگا... یا کسی اسپتال میں بیمار بن کر جالیٹا ہوگا۔"

"اسپتال کا کوئی ریکارڈ؟"

"وہ کبھی کسی ایسی بیماری میں مبتلا نہیں ہوا کہ خون ٹیسٹ کرنے کی نوبت آتی۔ اب آپ میری پوزیشن سمجھ رہے ہیں نا؟ خون کا نمونہ نہیں ملے گا تو ہمارا کیس نہایت کمزور ہوگا۔ اب یا تو میں اسے خود ہی چھوڑ دوں یا پھر عدالت میں کیس ہارنے کا خطرہ مول لوں، اس لیے کہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ لاش کے پاس جمع خون اسی کی ناک سے نکلا تھا۔"

مڈلبی چند لمحے خاموش رہا۔ اس کی آنکھیں بے تاثر تھیں۔ پھر اس نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے، اگر تمہیں کسی طرح... اور اگر کا مطلب یہ ہے کہ فی الوقت یہ ایک مفروضہ ہے... بغیر کسی تشدد کے اس کا تھوڑا سا خون مل جائے... خواہ کسی فراڈ کے ذریعے ملے تو تم کارلٹن ڈیل پر قتل کا جرم ثابت کرسکتے ہو۔"

"جی ہاں۔ بشرطیکہ ہم عدالت میں یہ ثابت کرسکیں کہ نمونے کا خون واقعی کارلٹن ڈیل ہی کا ہے۔ اس کے لیے کسی اچھے، معتبر اور نیک نام ڈاکٹر کی شہادت ضروری ہے۔" سارجنٹ بلیک نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "لیکن پروفیسر، یہ ایک لاینحل مسئلہ ہے۔ بغیر تشدد کے خون کا حصول، اور کارلٹن ڈیل اس سلسلے میں بہت زیادہ محتاط ہے۔ رضاکارانہ طور پر تو اس سے خون کا ایک قطرہ بھی نہیں لیا جاسکتا۔ اور یہ طے ہے کہ عدالت کے حکم کی رو سے ہم اس کے ساتھ زبردستی نہیں کرسکتے اور اس کا مطلب ہے کہ میں بلاوجہ آپ کے کان کھا رہا ہوں۔ اس مسئلے کا کوئی حل ہے ہی نہیں۔"

"فی الوقت تو میں تم سے متفق ہوں۔" مڈلبی نے کہا۔ "لیکن مجھے سوچنے کا موقع دو کیونکہ ہوتا یہ ہے کہ لاینحل مسئلوں کا ایک یقینی حل ضرور ہوتا ہے۔"

بلیک نے اسے تعجب سے دیکھا۔ "آپ کا مطلب ہے کہ امکان موجود ہے؟" اس نے کئی بار سر کو جھٹکا۔ "یعنی آپ ہتھیار ڈالنے کے قائل ہی نہیں ہیں۔ میں آپ سے شرط لگانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا لیکن اس مسئلے کا کوئی حل ہے ہی نہیں، اتنا مجھے یقین ہے۔" وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ "مجھے امید ہے کہ کل آپ کی طرف سے میں کال ریسیو کروں گا۔"

"یہ خون بھی بڑی عجیب چیز ہے۔" مڈلبی نے غائب دماغی سے کہا۔ "یہی وجہ ہے کہ بیشتر لوگوں کے لیے ذرا سا خون ضائع کرنا بھی قابلِ قبول نہیں ہوتا۔ میرا اشارہ کارلٹن جیسے مجرموں کی طرف نہیں ہے۔" اچانک اس کے لہجے میں یقین آگیا۔ "تم فکر نہ کرو سارجنٹ، ہم اس قاتل کو محض ناک پر ایک گھونسے کے عوض

آزاد نہیں ہونے دیں گے۔"

"اگر آپ نے کوئی ترکیب نہ نکالی تو وہ آزاد ہو کر رہے گا۔" سارجنٹ بلیک نے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔

اس کے جانے کے بعد پروفیسر نے اپنے پسندیدہ مشروب کا ایک جام تیار کیا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے وہ خون کے موضوع پر ایک طویل مضمون پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ اس مضمون سے اسے خون کے متعلق اہم معلومات حاصل ہوئیں لیکن سارجنٹ بلیک کے مسئلے کا کوئی حل نہیں سوجھا۔ پھر اچانک اس نے طفیلی مچھروں کے بارے میں پڑھا....

***

اگلے روز رات گئے پروفیسر مڈلبی اور سارجنٹ بلیک ایک پستہ قامت اور بہت موٹے شخص کے ساتھ تھے' جسے استوائی دواؤں پر اتھارٹی تسلیم کیا جاتا تھا۔ وہ تینوں ایک موٹیل کے ایک اپارٹمنٹ کی کھڑکی کے پاس سازشیوں کے سے انداز میں کھڑے تھے۔

"یہی ہے اس کا کمرا۔" سارجنٹ بلیک نے سرگوشی میں کہا۔

"تمہیں یقین ہے نا؟" پروفیسر مڈلبی نے پوچھا۔

"بالکل۔ اس وقت کارلٹن ڈیل اس کمرے میں سو رہا ہے.... ڈاکٹر فورسٹ' آپ تیار ہیں؟"

پستہ قامت آدمی کی آواز مینڈک کی ٹراہٹ سے مشابہ تھی۔ "میں بالکل تیار ہوں لیکن مڈلبی کے علاوہ کسی اور نے مجھ سے اس تجربے کی فرمائش کی ہوتی تو میں کبھی تیار نہ ہوتا۔ اور خاص طور پر آدھی رات کو۔" اس کی آواز بڑبڑاہٹ میں تبدیل ہو گئی۔

بلیک نے بڑی مہارت سے شیشے میں سوراخ کیا۔ رات گرم تھی۔ مڈلبی نے ڈاکٹر فورسٹ سے کچھ کہا۔ فورسٹ نے کھڑکی سے کوئی چیز لگا دی۔ چند لمحے بعد اس نے وہ چیز ہٹا دی۔ سارجنٹ نے سوراخ کو روئی سے بند کر دیا۔ پھر وہ تینوں پیچھے ہٹ آئے۔

"دو سراغ رساں صبح تک نگرانی کرتے رہیں گے۔" بلیک نے کار کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "جیسے ہی صبح ہو گی' میں کارلٹن کو گرفتار کر لوں گا لیکن مجھے آپ کی ضرورت پڑے گی۔ میرے آدمی ثابت کر سکتے ہیں کہ کمرے میں کوئی اور نہیں گیا۔ باقی کام آپ کی شہادت کرے گی۔ مجھے یقین ہے کہ ہمیں کامیابی ہو گی۔" اس کے لہجے میں چکار تھی۔

***

ریاست بمقابلہ کارلٹن ڈیل

مقدمے کی کارروائی کے ریکارڈ سے ایک شہادت

وکیلِ استغاثہ: "پروفیسر مڈلبی' آپ عدالت کو اپنے لفظوں میں بتائیں کہ ۱۸ جون کی رات کیا کچھ ہوا؟"

مڈلبی: "ڈاکٹر فورسٹ' سارجنٹ بلیک اور میں سی نوم موٹیل گئے۔ وہاں ہم نے ملزم کے اپارٹمنٹ کے عقبی حصے میں کھڑکی میں ایک سوراخ کیا۔ اس کے ذریعے ڈاکٹر فورسٹ نے پچاس عام قسم کے مچھر کمرے میں داخل کیے۔ تمام مچھروں کے پیٹ خالی تھے۔ اور ان تمام مچھروں کو کیمیائی عمل کے ذریعے چمک دار زرد رنگ کا بنا دیا گیا تھا۔"

وکیلِ استغاثہ: "ذرا یہ خالی پیٹ اور زرد رنگ کی وضاحت کیجیے۔"

مڈلبی: "جی ہاں۔ وہ مادہ مچھر.... واضح رہے کہ صرف مادہ مچھر ہی کاٹتے ہیں.... ڈاکٹر فورسٹ کی لیبارٹری کے مچھر تھے۔ ڈاکٹر فورسٹ استوائی دواؤں کے سلسلے میں تجربات کر رہے ہیں۔ موٹیل کے کمرے میں صرف مسٹر کارلٹن ڈیل تھے اور مچھروں کے پیٹ خالی تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ صبح کے وقت مچھروں کے معدوں میں جو خون ملا' وہ مسٹر کارلٹن ڈیل کا ہی تھا۔ جہاں تک زرد رنگ کا تعلق ہے' تو وہ ہمارے چھوڑے ہوئے مچھروں کی پہچان یقینی بنانے کے لیے کیا گیا تھا۔ اگر اتفاق سے کوئی اور مچھر پکڑ لیا جائے' جو ملزم کے علاوہ کسی اور کا بھی خون پی کر آیا ہو' تو زرد رنگ کی وجہ سے ہمیں اسے علیحدہ کرنے میں آسانی ہو گی۔"

وکیلِ استغاثہ: "تو صبح آپ نے ان رنگ دار مچھروں میں سے کچھ کو دوبارہ پکڑ لیا ہو گا؟"

مڈلبی: "جی ہاں... موٹیل کے کمرے کی دیوار پر سے۔ اور ان مچھروں کے معدوں سے جو خون نکلا' اس کو پولیس لیبارٹری میں بھی ٹیسٹ کیا گیا اور ڈاکٹر فورسٹ نے بھی اس کی گروپنگ کی۔"

وکیلِ استغاثہ: "اور جناب عالی' بعد کی شہادتوں سے ثابت ہو گا کہ مچھروں کے معدوں سے نکلنے والا وہ خون اسی بے حد کمیاب گروپ کا تھا' جس کا قاتل کا خون تھا' جو جائے قتل پر بکھرا ہوا ملا...."

***

"میں نے کبھی کسی انسان کو اتنا حیرت زدہ نہیں دیکھا' جتنا اس وقت کارلٹن ڈیل کو دیکھا۔" سارجنٹ بلیک نے کہا۔ "حال تو جیوری کے اراکین کا بھی یہی تھا لیکن کارلٹن ڈیل کی حیرت کی تو کوئی حد ہی نہیں تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ جیوری' ڈاکٹر فورسٹ اور پروفیسر مڈلبی جیسے لوگوں کی بات کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ ان مچھروں کی وجہ سے ہم پر زبردستی اور تشدد کا الزام بھی عائد نہیں کیا جا سکتا تھا۔"

"اس میں ایک انوکھے انصاف کا پہلو بھی نکلتا ہے' جسے تم نظر انداز کر رہے ہو۔" پروفیسر مڈلبی نے کہا۔ "اس چھوٹے سے کمرے میں پچاس بھوکے مچھروں کی موجودگی کی وجہ سے کارلٹن ڈیل نے بے حد عذاب ناک رات گزاری۔ اس کے علاوہ اس پر قتل کا جرم بھی ثابت ہوا اور وہ مچھر جنھوں نے اسے اس حال کو پہنچایا' مقتولہ ہی کی صنف سے تعلق رکھتے تھے.... یعنی مادہ تھے...."

BLOOD WILL TELL
DAVID ROME

ایک بِلا اُس کی جان کا عذاب بن گیا تھا لیکن اُس کی بیوی کے لیے اُس بِلّے سے زیادہ اہم شے دُنیا میں اور کوئی تھی ہی نہیں۔ وہ دن رات اُس کی نگہداشت اور خبرگیری میں ہمہ تن مصروف رہتی۔ آخر کار اس بِلّے سے جان چھڑانے کا ایک نسخہ اس کے ہاتھ لگ ہی گیا مگر جب نتیجہ اُس کے سامنے آیا تو اس کی چیخ نکل پڑی۔

انسان اور جانور کے درمیان ہونے والی دلچسپ اور عبرتناک کشمکش

پاکیزہ خان

آخری کوشش

ہر صبح کی طرح اس صبح بھی چارلی وین چھینکتا ہوا نیند سے بیدار ہوا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور بدن ٹوٹ رہا تھا۔ ناشتے کی میز پر اس کے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ کیا کھا رہا تھا۔

ناشتے ہی کے دوران اس کی بیوی گرٹا نے تحکمانہ سے لہجے میں کہا۔ "بھول مت جانا' آج جمعرات ہے۔ آج کے دن سلائی بوٹ کا ہفتہ وار میڈیکل چیک اپ ہوتا ہے۔ تمہیں سلائی بوٹ کو لے کر ڈاکٹر نمر کے پاس جانا ہے۔"

سلائی بوٹ گرٹا کے چہیتے پالتو بِلّے کا نام تھا جو اس وقت بھی ناشتے کی میز پر موجود تھا۔ گرٹا نے جھک کر اسے پیار کیا پھر اس کے بھورے بالوں سے لپ اسٹک کا نشان صاف کرتے ہوئے والہانہ لہجے میں بولی۔ "کیوں سلائی بوٹ... آج ڈاکٹر نمر کے پاس چیک اپ کرانے جاؤ گے نا؟" سلائی بوٹ نے صرف ہلکی سی "میاؤں" پر اکتفا کیا۔

گرٹا اٹھاون سال کی ایک بھاری بھرکم عورت تھی۔ اس وقت وہ نیلے لباس میں تھی جو اوپر سے تنگ اور باقی ہر جگہ سے ڈھیلا تھا۔
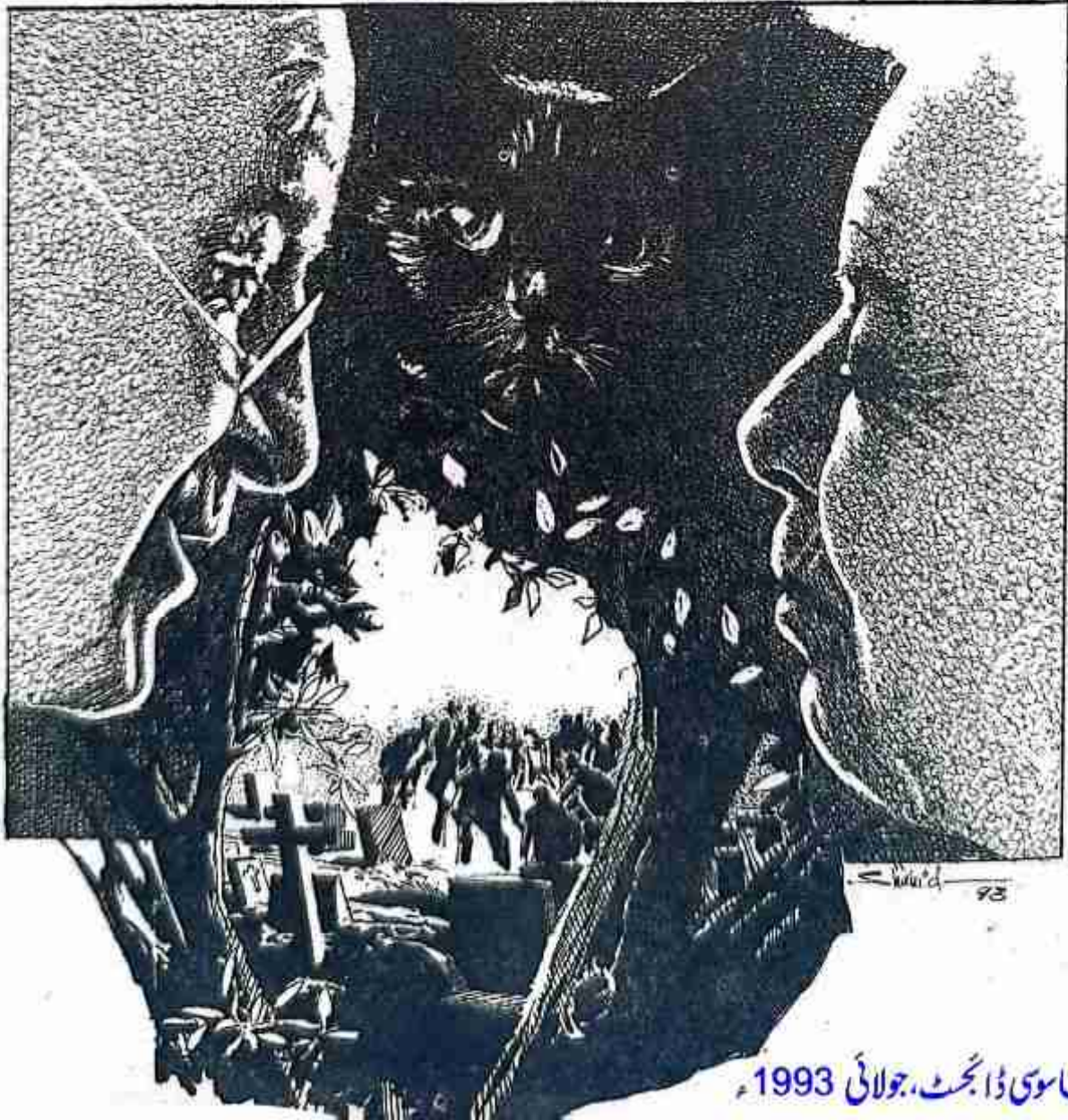
وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "ڈاکٹر ٹمر سے ایک بجے کا وقت طے ہے' بھولنا مت۔ میں ڈاکٹر کو فون کر کے تصدیق کروں گی کہ تم اس کے ہاں گئے تھے یا نہیں۔"

"میں چلا جاؤں گا ڈیئر...!" چارلی سعادت مندانہ انداز میں منمنایا اور اسی لمحے اسے زوردار چھینک آ گئی۔ اس کے منہ میں بھرا ہوا دلیا اور دودھ فوارے کی صورت میں اس کے منہ سے نکلا اور میز پر بکھر گیا۔

گرٹا نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا اور کمرے سے نکل گئی۔ دروازہ اس نے زوردار آواز کے ساتھ بند کیا۔ چند لمحے بعد چارلی نے اس کی کار کے روانہ ہونے کی آواز سنی۔ گرٹا کا ہر دن بڑی مصروفیات میں گزرتا تھا۔ کبھی چرچ کی کوئی تقریب' کبھی اپنے برج کلب میں پارٹی' کبھی کوئی اور مقامی تقریب۔ چنانچہ سلائی بوٹ سے متعلق زیادہ تر ذمے داریاں چارلی کے سر پڑتی تھیں۔

جونہی گرٹا کی کار کی آواز معدوم ہوئی' چارلی نے اپنا چمچ بلے پر کھینچ مارا جو اس وقت دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ چارلی کا نشانہ بہت خراب تھا۔ بلا بچ گیا اور چمچ فریج سے جا ٹکرایا۔ بلا عقلمند تھا۔ اس نے اندیشہ محسوس کیا کہ چارلی اس پر کچھ اور نہ کھینچ مارے' اس لیے وہ تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ وہ تیزی سے نہ بھی نکلتا تب بھی اسے کوئی خطرہ نہیں تھا کیوں کہ اسی لمحے چارلی کو چھینکوں کا دورہ پڑ گیا تھا۔

چارلی کی عمر پینسٹھ سال تھی اور اسے گزشتہ برسوں میں دو مرتبہ دل کا دورہ پڑ چکا تھا۔ اسپیشلسٹ نے اسے خبردار کیا تھا کہ تیسرے دورے کا بھی امکان موجود تھا جو یقیناً مہلک ثابت ہو سکتا تھا چنانچہ چارلی ہر ممکن احتیاط و پرہیز کر رہا تھا اور دوائیں بھی باقاعدگی سے لے رہا تھا۔

چودہ ماہ پہلے تک بیماریٔ دل کے باوجود چارلی کے لیے حالات خوشگوار ہی تھے اور اس کا خیال تھا کہ وہ اسی طرح پُرسکون انداز میں مزید کافی عرصہ زندہ رہے گا لیکن موسم بہار کی ایک خوشگوار صبح کو خوشیاں اور سکون دبے قدموں اس کی زندگی سے رخصت ہو گیا۔

اس روز گرٹا اس موٹے تازے اور صحت مند بلے کو گھر میں لے آئی تھی جس کا نام اس نے بڑی محبت سے سلائی بوٹ رکھا تھا۔ اس کے خیال میں یہ ایک منفرد نام تھا۔ چارلی نے ابتدا میں بلے کی آمد پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا کیوں کہ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ بلیوں سے الرجک تھا۔ اس لاعلمی کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس نے کبھی بلی پالی ہی نہیں تھی اور نہ ہی اسے کبھی کسی بلی یا بلے کے پاس کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا تھا۔ جب سے سلائی بوٹ نے گھر میں رہنا شروع کیا' اسے ہر وقت چھینکیں آنے لگیں۔

تقریباً دو ہفتے بعد تو یہ عالم ہو گیا کہ وہ خواہ گھر کے کسی بھی کونے میں ہوتا' اسے چھینکیں آتی رہتیں کیوں کہ اس وقت تک گھر کے ہر حصے میں بلے کے بال پھیل چکے تھے۔ اسے ہر وقت زکام اور فلو سا رہنے لگا لیکن گرٹا اس وقت تک بلے سے اتنی مانوس ہو چکی تھی کہ وہ اسے خود سے جدا کرنے پر تیار نہیں تھی۔

چارلی کے ڈاکٹر نے اسے خبردار کیا کہ چھینکیں اس کے دل کے لیے نقصان دہ تھیں۔ اسے خود بھی اس کا احساس ہو چکا تھا۔ جب بھی اسے چھینکوں کا دورہ پڑتا' اس کی دھڑکنیں بے ترتیب اور تکلیف دہ سی ہو جاتیں۔

گرٹا سے اس سلسلے میں بحث و تمحیص بالکل بے کار رہی۔ تمام دلیلیں رائیگاں گئیں۔ وہ یقین کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھی کہ اس کا پیارا 'من موہنا سلائی بوٹ' چارلی کی تکالیف کا ذمے دار ہو سکتا تھا۔ بلے کے علاوہ اس نے ہر چیز کو چارلی کی الرجی کا ذمے دار ٹھہرا دیا۔ گرد' پودوں اور پھولوں کے ہوا میں اڑنے والے ذرات' وہ اسپرے جو چارلی خوشبو کے لیے کمرے میں چھڑکتا تھا' غرضیکہ اس قسم کی تمام چیزیں چارلی کی اس حالت کی ذمے دار ہو سکتی تھیں لیکن سلائی بوٹ نہیں۔ وہ کسی قیمت پر بھی بلے کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

لیکن چارلی نے اپنی حالت اور اپنے دل کی تکلیف کو مدِنظر رکھتے ہوئے فیصلہ کیا کہ اسے اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ ضرور کرنا پڑے گا۔ بلے کو اس گھر سے جانا پڑے گا۔

ایک روز اسی موضوع پر طویل اور بے نتیجہ بحث کے بعد گرٹا گھر سے رخصت ہوئی تو چارلی نے بلے کو گھر سے نکال دیا۔ گرٹا ایک تقریب میں گئی تھی۔ چارلی کو معلوم تھا کہ وہ کئی گھنٹے تک واپس نہیں آئے گی۔ چارلی کو یقین تھا کہ بلا اتنی دیر گھر سے باہر رہے گا تو ضرور اِدھر اُدھر نکل جائے گا' بھٹک جائے گا اور پھر واپس نہیں آسکے گا۔

چارلی اس کے جانے کا انتظار کرتا رہا... کرتا رہا لیکن بلا بھی ایک ہی ستم ظریف تھا۔ وہ پورچ سے ٹل کر نہ دیا۔ چارلی اسے ہشکار کر' بھگا کر آتا اور چند لمحے بعد وہ پھر پورچ میں دروازے کے سامنے آبیٹھتا اور میاؤں میاؤں کر کے گھر کو سر پر اٹھا لیتا۔

یوں چارلی نے عام دنوں سے زیادہ اذیت اٹھائی۔ جونہی اس نے گرٹا کی کار گیٹ میں داخل ہونے کی آواز سنی' جلدی سے دروازہ کھول کر بلے کو اندر آنے کا موقع دے دیا تاکہ گرٹا کو اس کی حرکت کا پتا نہ چل سکے۔

ایک ہفتے بعد پھر ایسی ہی بحث و تمحیص کے بعد گرٹا گھر سے رخصت ہوئی تو چارلی نے بلے کو گاڑی میں ڈالا اور قصبے کے نواح میں کئی میل دور ایک جنگل میں چھوڑ آیا۔ گرٹا گھر آئی تو چارلی نے اسے بتایا کہ وہ گھر سے کوڑا پھینکنے کے لیے نکل رہا تھا کہ بلا بھی اس کی ٹانگوں کے درمیان سے نکل گیا اور باہر بھاگ گیا۔ اس نے مسکین سی صورت بنا کر بتایا کہ اس نے تقریباً تین بلاک کے فاصلے تک بلے کے پیچھے دوڑ لگائی لیکن اسے نہ پکڑ سکا۔ اپنے دل کی

حالت کے پیشِ نظر اس نے اتنا دوڑ کر بھی اپنی جان کے لیے خطرہ مول لیا تھا۔ اس سے زیادہ دوڑنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔
گرٹا اس کی کہانی پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے سلائی بوٹ کی گمشدگی کا ذمّے دار چارلی کو ہی ٹھہرایا۔ چارلی حسبِ توفیق اس کی تردید کرتا رہا۔
اس قصّے کا ایک بے ہودہ موڑ عین آدھی رات کو سامنے آیا جب پچھلے دروازے پر سلائی بوٹ کی بھیانک میاؤں میاؤں سنائی دی۔ قصے کہانیوں کے مثالی اور نہایت وفادار پالتو جانوروں کی طرح سلائی بوٹ نے بھی بالآخر گھر واپسی کا راستہ ڈھونڈ ہی لیا تھا اور اپنی مالکن کی خدمت میں آن پہنچا تھا جس نے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور گندگی میں لتھڑا ہونے کے باوجود اسے سینے سے چمٹا لیا۔
اب بِلّے کے "بھاگ جانے" کا عذر استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا کیوں کہ اس نے بارہ تیرہ گھنٹے کی گمشدگی کے بعد گھر واپس پہنچ کر ثابت کر دیا تھا کہ وہ یہاں سے ہرگز جانا نہیں چاہتا تھا۔ بالآخر چارلی کو دل ہی دل میں اس سنگین اور تلخ حقیقت کا اعتراف کرنا ہی پڑا کہ اگر وہ اپنی زندگی میں توازن واپس لانا چاہتا تھا تو اس کے لیے بِلّے کو قتل کرنا ناگزیر تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اگر اس نے بِلّے کو ہلاک نہ کیا تو بِلّا اسے ہلاک کر دے گا۔
بِلّے کو ہلاک کرنا تو زیادہ مشکل کام نہیں تھا لیکن علی الاعلان یہ کام کرنے پر چارلی کو بڑے سنگین نقصانات سے دوچار ہونا پڑتا۔ ایک تو گرٹا لازماً اس سے طلاق لے لیتی جس کا مطلب بے شمار مالی نقصانات تھا۔ دوسرے، جانوروں کے حقوق کی سوسائٹی لازماً اس کے خلاف قانونی کارروائی شروع کر دیتی۔
چنانچہ اس کے لیے کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا ضروری تھا کہ سلائی بوٹ کی موت قدرتی اور طبعی نظر آئے۔ کوئی یہ نہ جان سکے کہ چارلی کی زندگی کو عذاب کی ذمّے دار وہ بھوری سمور والی مخلوق چارلی ہی کے ہاتھوں انجام کو پہنچی تھی۔ کسی کو اس کی مُڑی تُڑی یا خون آلود لاش نہیں ملنی چاہیے تھی۔ چارلی کو یہ مسئلہ "نہایت احتیاط سے حل کرنا تھا۔
گزشتہ چند مہینوں میں ایسے کئی طریقے اس کے ذہن میں آئے تھے جن پر عمل کر کے وہ خود الزام سے بچ سکتا تھا لیکن زیادہ تفصیل سے غور و خوض کے بعد اسے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی خامی یا سقم محسوس ہوا۔ لیکن آخر کار ایک منصوبے پر آ کر اس کا ذہن جم گیا۔ یہ منصوبہ بے عیب معلوم ہوتا تھا۔ چارلی نے اسے عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور آج کا دن اس کے لیے موزوں ترین تھا کیوں کہ اس منصوبے پر عملدر آمد کے لیے اسے جانوروں کے ڈاکٹر نیمر کی مدد درکار تھی جو سلائی بوٹ کا مستقل معالج تھا۔
ڈاکٹر نیمر سے چارلی اور گرٹا کے تعلقات تھے۔ اس کے آفس میں کتنے بلیوں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ آفس کے عقب میں ان کتوں، بلیوں کے لیے پنجرے بھی بنے ہوئے تھے جنہیں علاج کے لیے کچھ دن وہیں رکھنا ضروری ہوتا تھا۔ ڈاکٹر نیمر تقریباً پچاس کی عمر کا گٹھے ہوئے جسم کا ایک مستعد شخص تھا۔
چارلی جب اس کے ہاں پہنچا تو وہ ایک فائل میں کچھ لکھ رہا تھا۔ بِلّے کا معائنہ کرنے کے بعد وہ بولا۔ "تمہیں یہ سن کر خوشی ہو گی کہ سلائی بوٹ کی جسمانی حالت نہایت شاندار ہے۔ گرٹا سے کہہ دینا کہ اس کو ہفتہ وار چیک اپ کی ضرورت نہیں۔ مہینے دو مہینے میں ایک مرتبہ چیک اپ بھی کافی ہو گا۔"
چارلی اسے بتا نہیں سکا کہ اس خبر پر .... خوشی ہونے کے بجائے اس کا دل کباب ہو گیا تھا۔ وہ بار بار رومال سے ناک صاف کر رہا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، آنکھیں متورم اور سرخ تھیں۔ اگر ڈاکٹر نیمر اس کی طرف ذرا بھی توجہ دیتا تو دیکھ لیتا کہ اس کی حالت قابلِ رحم تھی لیکن ڈاکٹر نیمر جانوروں کا ڈاکٹر تھا۔ انسانوں کی طرف توجہ دینے کی اسے عادت نہیں تھی۔
وہ چارلی کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور چارلی کسمسا کر رہ گیا۔ جو بات وہ ڈاکٹر نیمر سے کہنا چاہتا تھا، اسے زبان پر لانا اب قطعی ناممکن محسوس ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر نیمر کی زندگی جانوروں کی جان بچاتے، ان کا علاج کرتے گزری تھی۔ چارلی اس سے کیسے کہہ سکتا تھا کہ وہ اس موٹے تازے بِلّے کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا تھا؟
اس نے بات کرنے کے لیے منہ کھولا لیکن کوئی آواز برآمد نہ ہوئی۔ پچھلے ہفتے بھی یہی ہوا تھا۔ چارلی بات کرنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا اور اپنے آپ کو کوستا ہوا وہاں سے رخصت ہوا تھا۔
چارلی نے دو تین مرتبہ گہری گہری سانسیں لیں، اپنی جرأت مجتمع کی اور بالآخر پھنسی پھنسی سی آواز میں بولا۔ "میں ایک

مصیبت میں پھنس گیا ہوں نمیر...! اور تمہارے سوا کوئی میری مدد نہیں کر سکتا۔" اس کی نظر پلاسٹک کے اس پنجرے پر جم کر رہ گئی جس میں وہ بلّے کو بند کر کے لایا تھا۔ ڈاکٹر آنکھیں سکیڑے منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

کئی لمحے کی خاموشی کے بعد چارلی نے مٹھیاں بھینچیں اور بالآخر حلق میں پھنسے ہوئے الفاظ کے گولے اگل ڈالے۔ "میں... میں اپنی بیوی کی بلّے کو ہلاک کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا کہا؟" ڈاکٹر نمیر اچھل پڑا۔ چارلی نے انتہائی تکلیف کے سے عالم میں اپنے الفاظ دُہرائے۔

"لیکن کیوں...؟" ڈاکٹر کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ "اتنے پیارے پالتو جانور کو تم کیوں ہلاک کرنا چاہتے ہو؟"

"پیارا... پالتو جانور..." چارلی نے زہریلے انداز میں یہ الفاظ دُہرائے اور بروقت ناک پر رومال رکھ لیا ورنہ چھینک کے ساتھ ایک فوارہ ڈاکٹر کے منہ پر جا پڑتا۔ چھینک کے بعد چھینک آتی چلی گئی۔ اس کا چہرہ پہلے سرخ پھر نیلا ہو گیا۔ حرارت تو وہ صبح سے ہی محسوس کر رہا تھا، اس وقت اس میں اضافہ سا ہوتا محسوس ہوا۔

چھینکوں کا دورہ تھما تو اس نے اٹک اٹک کر اپنی داستانِ غم سنائی۔ ڈاکٹر بالکل خاموش تھا اور چارلی کچھ اس طرح اس کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے وہ ابھی نیند سے بیدار ہوا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں تھا۔

بالآخر ڈاکٹر نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور نہایت تحمل سے بولا۔ "اب تمہاری خاطر میں خواہ مخواہ سلائی بوٹ کا کوئی آپریشن تو تجویز نہیں کر سکتا اور آپریشن کے دوران جان بوجھ کر اس کی کوئی غلط نس تو نہیں کاٹ سکتا۔ ایک غلط آپریشن میری برسوں کی جمی جمائی پریکٹس کو تباہ کر کے رکھ دے گا۔"

"میرا کہنے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ تم اسے ہلاک کرو۔" چارلی جلدی سے بولا۔

"معاف کرنا... میں اسے ہلاک کرنے کے سلسلے میں تمہیں بھی کوئی مشورہ نہیں دے سکتا۔" ڈاکٹر بولا۔

"تم میری آخری امید ہو۔" چارلی رحم طلب انداز میں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا۔ "تم جانوروں کو سُلانے کے لیے بھی انجکشن لگاتے ہو اور جو جانور بہت زیادہ اذیت میں ہوتے ہیں، جن کے بچنے کی بھی امید نہیں ہوتی، انہیں تم انجکشن لگا کر ہمیشہ کی نیند بھی سُلاتے ہو... بس ایسا ہی ایک انجکشن تم مجھے دے دو۔ تمہیں اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔"

"میں کسی بھی طرح اس معاملے میں ملوث نہیں ہونا چاہتا۔" ڈاکٹر فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "خدا حافظ۔"

"میں تمہیں معقول رقم دینے کے لیے تیار ہوں۔" چارلی گڑگڑایا۔

"میں تمہیں خدا حافظ کہہ چکا ہوں، اب جاؤ۔" ڈاکٹر نے یکدم اٹھ کر دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

اچانک آفس کا دروازہ کھلا اور سرخ بالوں والی ایک خوبصورت نرس نے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔ "آپریشن کی تیاریاں مکمل ہیں ڈاکٹر!"

نرس کی طرف دیکھتے ہوئے ڈاکٹر نمیر کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ وہ نہایت شیریں لہجے میں بولا۔ "میں آ رہا ہوں سوزن!"

چارلی نے اس سے پہلے بھی محسوس کیا تھا کہ نرس جب ڈاکٹر کو پکارتی تھی تو اس کے لہجے میں ایک تعلقِ خاص کی جھلک ہوتی تھی اور ڈاکٹر جن نظروں سے اس کی طرف دیکھتا تھا وہ بھی مراسم کے کسی گوشۂ پنہاں کی نشاندہی کرتی تھیں۔ چارلی کو شک تھا کہ دونوں کے درمیان کوئی چکر ضرور چل رہا تھا۔ اسی بنیاد پر اس نے اندھیرے میں تیر چلانے کا فیصلہ کیا۔

جو ترکیب اس کے ذہن میں آئی تھی اس سے اس کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ وہ تو یہی امید لے کر آیا تھا کہ ڈاکٹر نمیر دوست سمجھ کر اس کی مدد کرے گا لیکن اب یہی محسوس ہو رہا تھا کہ اسے مجبور کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے اپنا ٹرمپ کا یہ آخری پتّا استعمال کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

اس نے کھوکھلا سا ایک قہقہہ لگایا۔ ڈاکٹر نمیر چونکا اور خیالوں کی دنیا سے واپس آ گیا۔ چارلی بولا۔ "کیا خیال ہے... اگر تمہاری بیوی کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا جائے کہ آپریشن کے بہانے تم آپریشن روم میں سوزن کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہو، تو کیسا رہے گا؟"

ڈاکٹر نمیر کی رنگت متغیر ہو گئی۔ اس نے انکار کرنے اور غصہ دکھانے کی کوشش کی لیکن چارلی کو یقین ہو گیا کہ ڈاکٹر کی دُکھتی رگ اس کے ہاتھ آ گئی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو وہ شمشیرزن محسوس کیا جس کے حریف کے ہاتھ سے تلوار گر چکی تھی۔ اس کے تھوڑا بہت ڈرانے دھمکانے کے بعد بالآخر ڈاکٹر نے شکست خوردہ لہجے میں پوچھا۔ "تم کیا چاہتے ہو؟"

"وہ تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔" چارلی چھینکتے ہوئے بولا۔ "بلّے کو میٹھی نیند سُلانے کے لیے صرف ایک سرنج چاہیے۔"

"یہ جرم ہے۔" ڈاکٹر دیوار کی طرف منہ پھیرتے ہوئے بولا۔

"ایک بلّے کو ہلاک کرنا جرم کب سے ہو گیا؟" چارلی استہزائیہ لہجے میں بولا۔

ڈاکٹر چند لمحے سوچتا رہا، بالآخر وہ اپنی چابیاں لیے پچھلے کمرے میں چلا گیا۔ چند لمحے بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں شفاف سیّال سے بھری ہوئی ایک سرنج تھی جو حفاظتی خول میں بند تھی۔ وہ گویا چارلی کو سمجھانے کی آخری کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "کیا تمہاری بیوی اس بلّے کے مرنے کے بعد دوسرا بلّا نہیں پال سکتی؟"

چارلی پُراشتیاق نظروں سے سرنج کی طرف دیکھتے ہوئے مرتعش لہجے میں بولا۔ "اس پہلو پر میں نے غور کر لیا ہے۔ میں اسے

ماہرین نفسیات کی اس رائے کا قائل کرلوں گا کہ جس طرح کا جانور ایک بار مرچکا ہو ویسا جانور دوبارہ نہیں پالنا چاہیے۔ اس سے ذہن پر برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ہم طوطا' مینا یا کچھ اور پال لیں گے' بلی نہیں پالیں گے۔"

ڈاکٹر سرنج اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "اگر تم نے کبھی کسی کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ تم نے سرنج مجھ سے حاصل کی تھی تو میں صاف مُکر جاؤں گا اور تم یہ بات ثابت نہیں کر سکو گے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" چارلی بے تابی سے بولا۔

"یہ انجکشن لگانے کی بہترین جگہ جانور کا پیٹ ہے۔" ڈاکٹر نے بتایا۔ "سوئی جتنی گہرائی تک لے جا کر لگایا جائے گا اتنا ہی بہتر ہو گا۔ اگر پوری سوئی پیٹ میں اتار کر دوا داخل کی جائے تو جانور کو ساکت ہونے میں صرف چند سیکنڈ لگیں گے۔ یہ حفاظتی خول عین وقت پر ہی اتارنا۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔" چارلی نے سرنج اس کے ہاتھ سے جھپٹ کر اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا پھر اس نے سلائی بوٹ کا پنجرا اٹھایا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اس رات چارلی گھر پر اپنی پسندیدہ ترین کرسی پر بیٹھا دھیرے دھیرے جھولے لے رہا تھا۔ کرسی چکنے پلاسٹک کی تھی اور چارلی کو صرف اس لیے پسند تھی کہ اس پر بلے کے بال نہیں چپکتے تھے ورنہ اس کے گھر میں شاید ہی کوئی ایسی چیز بچی تھی جس پر سلائی بوٹ کے بال موجود نہیں تھے۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ چارلی کپڑوں کی الماری کھولتا تھا تو بلا اسے اپنے کپڑوں یا تولیوں پر بیٹھا ہوا ملتا تھا۔ اس کے بعد تو چارلی پر چھینکوں اور غصے کا ایسا دورہ پڑتا تھا کہ اپنی دھڑکنیں معمول پر رکھنے کے لیے اسے بڑی جدوجہد کرنا پڑتی تھی۔

گرٹا اس رات خاصی تاخیر سے واپس آئی۔ وہ تھیٹر گئی ہوئی تھی' جاتے وقت لباس اور میک اپ کے سلسلے میں اس نے بڑا اہتمام کیا تھا۔ مصنوعی ہیروں کے زیورات اور لومڑی کی کھال کا کوٹ بھی پہنا تھا۔ اس طرح کے سمور کے کوٹ اب نوادرات میں شمار ہوتے تھے۔ اس میں لومڑی کی کھوپڑی تک موجود ہوتی تھی۔

گرٹا باہر ہی سے بولتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی۔ "خدا کی پناہ! ڈراما کیا تھا ایک مذاق تھا۔ شیکسپیئر کے ڈرامے کا یہ حشر میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اداکاروں کی حالت دیکھ کر مجھے تو ہنسی آرہی تھی۔"

"چلو..... خوشی کی بات یہ ہے کہ تمہارا وقت تو اچھا گزرا۔" چارلی اپنے سامنے سے اخبار ہٹائے بغیر بولا۔

بلا گرٹا کی آواز سنتے ہی مکان کے نہ جانے کس حصے سے فوراً وہاں آن پہنچا اور اس کے ٹخنوں سے جسم رگڑنے لگا۔ اس کے بال گرٹا کے اسٹاکنگ پر لگ گئے۔ چارلی نے کن انکھیوں سے اس کی

طرف دیکھا۔ بلا کھا کھا کر اور گھر میں رہ کر خوب موٹا ہو رہا تھا۔
گرٹا کی آمد سے پہلے ہی اسے ہمیشہ کی نیند سلانے کی خواہش پر چارلی نے بڑی مشکل سے قابو رکھا تھا۔ یہ ایک "ٹیکنیکل" غلطی ہوتی۔ گرٹا اگر باہر سے آتی اور بلا اسے مردہ حالت میں ملتا تو چارلی خواہ معصومیت، لاعلمی اور صدمے کی کتنی ہی اداکاری کر لیتا لیکن وہ اس بات پر یقین کرنے کے لیے کبھی تیار نہ ہوتی کہ بلے کی موت میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔
چنانچہ چارلی نے اپنی قوتِ ارادی کو اس کی آخری حد تک استعمال کیا تھا اور بلے کو ٹھکانے لگانے سے اپنے آپ کو باز رکھا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو سمجھا بجھا لیا تھا کہ اب محض چند گھنٹے ہی کی تو بات تھی۔ اسے بلے کو اس وقت ٹھکانے لگانا تھا جب گرٹا محوِ خواب ہوتی اور چارلی کے بارے میں بھی یہی سمجھا جاتا کہ معمول کے مطابق وہ سویا ہوا تھا۔
گرٹا نے ہیٹ اور پرس کرسی پر پھینکا، جھک کر سلائی بوٹ کو اٹھایا اور اسے پیار کرنے لگی۔ اس نظارے پر چارلی نے دانت بھینچ کر سختی سے آنکھیں بند کر لیں۔ گرٹا والہانہ لہجے میں بولی۔
"کیسے ہو سلائی بوٹ؟ کھانا میرے ساتھ بستر میں بیٹھ کر کھانا۔"
سلائی بوٹ اس کی چربی زدہ ٹھوڑی چاٹنے لگا۔ گرٹا کا سراپا تھل تھل کرنے لگا۔ وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "مت کرو شریر کہیں کے! تمہیں معلوم ہے اس طرح مجھے گدگدی ہوتی ہے۔"
وہ اسے گود میں لیے کچن میں چلی گئی۔ چند لمحے بعد چارلی نے اسے بلے کی خوراک کا ایک سربہ مہر ڈبا ہاتھ میں لیے آتے دیکھا۔ بلا اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔
"آ رہے ہو تم بھی؟" گرٹا نے چارلی کے قریب ایک لمحے کے لیے رکتے ہوئے پوچھا۔
"میں ابھی کچھ دیر اور پڑھوں گا۔" چارلی نے کہا اور ہاتھ بڑھا کر بلے کا سر پیار سے سہلایا۔
"چلو سلائی بوٹ!" گرٹا لاڈ سے بولی۔ "پہلے کھانا کھاؤ، پھر ممی سے لپٹ کر سو جانا۔"
وہ بیڈ روم میں چلی گئی۔ چارلی نے اپنی چھینک بڑی مشکل سے روکی ہوئی تھی۔ گرٹا کی آواز معدوم ہوتے ہی اس نے زور سے چھینک ماری۔ یکے بعد دیگرے کئی چھینکیں آ گئیں۔ ناک بھی بہنے لگی۔ کافی دیر بعد جا کر اس کی دھڑکن معمول پر آئی۔
حالات اسے بالکل موافق نظر آ رہے تھے۔ اس نے بلے سے ذرا بھی نفرت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا بلکہ دل پر جبر کر کے گرٹا کے سامنے اسے پیار بھی کیا تھا۔ اسے امید تھی کہ گرٹا اس بات کو یاد رکھے گی۔ صبح سلائی بوٹ کی اکڑی ہوئی لاش ملنے سے پہلے چارلی اپنی پوزیشن زیادہ سے زیادہ محفوظ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔
آج دن میں ہی اس نے باغبانی کے لیے اور ربڑ، حفاظتی دستانے لا کر اپنی کپڑوں کی الماری میں چھپا دیے تھے۔ اس نے اس امکان کو مدِنظر رکھا تھا کہ بلے کے پیٹ میں سوئی گھونپنے کی کوشش میں اس کے ہاتھوں پر خراشیں آ سکتی تھیں اور صبح انہیں دیکھ کر گرٹا شک میں پڑ سکتی تھی۔ دستانے لا کر چارلی نے بلے کے پنجوں کی خراشوں سے بچنے کا بندوبست کر لیا تھا۔ ویسے اسے امید تھی کہ وہ بلے کو نہایت پھرتی سے قابو میں کرے گا اور اسے پنجے مارنے کا موقع نہیں دے گا۔
تین گھنٹے گزر گئے۔ عام طور پر گرٹا سونے میں بہت وقت لیتی تھی۔ چارلی اپنے آپ کو اخبار میں الجھائے رکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ایک ایک چیز کو کئی کئی بار پڑھنے کے باوجود اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا پڑھ رہا تھا۔
بالآخر رات کے دو بجے وہ کرسی سے اٹھا۔ اس کی دھڑکن یکدم کچھ تیز ہوئی۔ وہ رک گیا اور دس تک گنتی گننے لگا۔ دھڑکن معمول پر آئی تو اس نے دبے قدموں تاریک ہال میں پہنچ کر کپڑوں کی الماری کھولی۔ الماری سے اس نے دستانے نکال کر ہاتھوں پر چڑھائے، سرنج سنبھالی اور بیڈ روم کی طرف چل دیا۔
بیڈ روم کا دروازہ غیر مقفل تھا۔ دبے قدموں وہ اندر پہنچا۔ کمرے میں گہری تاریکی تھی۔ اس نے چند لمحے انتظار کیا کہ آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو جائیں۔ تب اسے احساس ہوا کہ تاریکی اتنی گہری بھی نہیں تھی۔ کھڑکی کے پردوں سے چاندنی معمولی حد تک کمرے میں پہنچ رہی تھی اور اس کی وجہ سے کم از کم چیزوں کے ہیولے تو دیکھے جا سکتے تھے۔
چارلی نے بیڈ کی پائنتی کھڑے ہو کر اپنی بیوی کا جائزہ لیا۔ وہ گٹھڑی سی بنی لیٹی تھی۔ اس کے بازوؤں میں چارلی کو ایک بڑا سا گولا سمٹا نظر آیا۔ کیا وہ بلے کو سینے سے لگائے لیٹی تھی؟ اس صورت میں بھلا وہ بلے کے پیٹ میں انجکشن کیوں کر لگا سکتا تھا؟
لیکن جب چارلی نے کچھ اور قریب ہو کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ بلا نہیں بلکہ ایک تکیہ تھا جسے گرٹا بازوؤں میں دبائے لیٹی تھی۔ چارلی بدستور آنکھیں پھاڑے ادھر ادھر گردن گھما کر بلے کو تلاش کرنے لگا۔ اچانک اس کی نظر بیڈ کے قریب ہی رکھی گدیلی کرسی پر پڑی اور اس کی دھڑکنیں ایک بار پھر تیز ہونے لگیں۔
بلا کرسی پر موجود تھا۔ اپنی مالکن کی طرح وہ بھی گولا سا بنا سو رہا تھا۔ چارلی نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی دھڑکنیں ہموار ہو گئیں تو وہ چاروں ہاتھ پیروں کے بل چوپایوں کی طرح کرسی کی طرف بڑھا۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ اس کے سانس لینے کی بھی آواز پیدا نہ ہو۔
اس کے قریب رک کر اس نے سرنج سے حفاظتی خول اتارا اور اسے دانتوں کے درمیان پکڑ لیا۔ نہایت آہستگی سے وہ اٹھا اور کرسی پر جھکا لیکن دوسرے ہی لمحے اسے یکدم سیدھا ہونا پڑا۔

اسے چھینک آنے لگی تھی۔ اس نے جلدی سے اپنی ناک بند کرلی۔ ربڑ کے موٹے دستانے کا لمس اسے عجیب سا محسوس ہوا تاہم وہ بے آواز طریقے سے چھینکنے میں کامیاب ہوگیا۔

سرنج اس نے جلدی سے دوسرے ہاتھ میں پکڑلی تھی۔ اسے دو چھینکیں آئیں لیکن اس نے کمال یہ کیا کہ ذرا بھی آواز پیدا نہیں ہونے دی۔ ناک صاف کر کے اس نے اپنی بیوی اور بلے دونوں کا جائزہ لیا۔ دونوں اسی طرح ساکت نظر آئے۔ دونوں خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔

بلے نے منہ بازوؤں میں چھپایا ہوا تھا۔ چارلی نے انتہائی پھرتی سے اس کا منہ وہیں دبالیا کہ وہ کوئی آواز نہ نکالنے پائے۔ اپنی پھرتی پر وہ خود بھی حیران رہ گیا۔ اسی بازو کی کہنی اور گھٹنے کی مدد سے اس نے بلے کو پوری طرح دبالیا۔ اس عمر میں اسے اپنے آپ سے اس پھرتی اور طاقت کی توقع نہیں تھی۔ اس نے بلے کو ذرا بھی ہلنے نہیں دیا تھا۔

اپنے... اندازے کے مطابق جہاں بلّے کا پیٹ ہونا چاہیے تھا' وہاں سوئی گھسیڑ کر اس نے سرنج کو دوا سے خالی کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ اس کے جسم میں ارتعاش پیدا ہوچکا تھا لیکن وہ حوصلے سے کام لیتے ہوئے پورے ایک منٹ تک اسی طرح بلے کو دبوچے بیٹھا رہا۔

صرف انجکشن لگاتے وقت اسے شبہ ہوا تھا کہ شاید بلّے نے ٹانگیں چلانے کی کوشش کی تھی لیکن اس بارے میں بھی وہ پُریقین نہیں تھا۔ بالآخر وہ اسے چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ بلّے نے حرکت نہیں کی۔ چارلی کی پیشانی پسینے سے تر تھی۔

وہ اُلٹے قدموں دروازے کی طرف چل دیا لیکن مُڑمُڑ کر دیکھتا جا رہا تھا کہ کہیں کسی چیز سے ٹکرا نہ جائے۔ وہ کسی چیز سے ٹکرائے بغیر دروازے سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ ہال میں پہنچ کر اس نے کانپتے ہاتھ سے سرنج پر دوبارہ حفاظتی خول چڑھا دیا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوچکا تھا۔

دستانے اس نے دوبارہ کپڑوں کی الماری میں چھپادیے تاکہ صبح انہیں ان کی جگہ واپس پہنچا دیا جائے۔ خالی سرنج اس نے دودھ کے ایک خالی پیکٹ میں ڈال کر پیکٹ کو توڑ مروڑ کر کوڑے کے ڈبے میں سب سے نیچے گھسادیا۔ ہر صبح کوڑا ٹھکانے لگا دیا جاتا تھا۔ اس کام سے فارغ ہوکر چارلی نے ہاتھ صابن سے دھو کر خشک کرلیے۔

اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا مگر اب ان دھڑکنوں میں مسرت کا احساس بھی شامل تھا۔ آج اس کے دل نے بے پناہ دباؤ برداشت کیا تھا مگر اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ مزید دوا نہیں کھائے گا۔ معمول کے مطابق وہ دوا کھا چکا تھا۔ دھڑکنیں تیز ہونے کے باوجود وہ اس وقت اپنی حالت جتنی بہتر محسوس کر رہا تھا' اتنی اس نے کافی عرصے سے محسوس نہیں کی تھی۔

اس نے کئی گہری گہری سانسیں لیں' ایک گلاس پانی پیا اور اپنی نشست گاہ میں واپس آگیا۔ اپنی پسندیدہ کرسی پر بیٹھ کر اس نے اخبار میں لطیفے پڑھنے شروع کیے۔ اسے امید تھی کہ اب وہ ان سے لطف اندوز ہوسکے گا۔ کچھ دیر پڑھنے کے بعد اس کا ارادہ سونے کے لیے جانے کا تھا۔

وہ اخبار سیدھا کر کے کارٹون دیکھنے لگا۔ اب وہ واقعی ان سے محظوظ ہو رہا تھا اور حیرت سے سوچ رہا تھا کہ آخر یہ کارٹونسٹ اتنے مزے مزے کے آئیڈیاز کہاں سے لاتے تھے؟ ایک کارٹون دیکھتے ہوئے تو وہ ہلکا سا قہقہہ لگانے پر مجبور ہوگیا۔

دفعتاً اس کے اخبار کا نچلا سرا پھڑپھڑایا اور اس کے نیچے سے بالوں بھرا ایک بڑا سا گولا پُھدک کر اس کی گود میں آپہنچا۔ اس نے ہڑبڑا کر دیکھا۔ وہ بلا تھا۔ وہی سلائی بوٹ...! وہ بیٹھنے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر رہا تھا۔

پورے چار سیکنڈ تک چارلی دہشت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اسے چھینک آنے لگی مگر چھینک کی جگہ اس کے حلق سے چیخ برآمد ہوئی۔ ایک اذیت ناک سی چیخ...!

⊛⊛⊛**⊛⊛⊛

دوسرے روز گرٹا نشست کے کمرے میں' تعزیت کے لیے آنے والی خواتین کے درمیان بیٹھی تھی۔ ایک سوکھی سڑی سی عورت جو اس کے زیادہ قریب بیٹھی تھی' اظہارِ افسوس کر رہی تھی کہ چارلی کی حرکتِ قلب بہت ہی غیر متوقع طور پر بند ہوگئی۔

پھر وہ سوکھی سڑی سی عورت گرٹا کو خراجِ تحسین پیش کرنے لگی کہ تمام تر صدمے اور پریشانی کے باوجود وہ ہمیشہ کی طرح خوبصورت' خوش لباس اور حوصلہ مند نظر آرہی تھی۔

گرٹا حتی الامکان افسردگی سے مسکرائی اور اپنی گود میں بیٹھے ہوئے سلائی بوٹ کو تھپکتے ہوئے بولی۔ "چارلی کی کمی تو یقیناً محسوس ہوگی۔"

تب سوکھی سڑی عورت' گرٹا کے لومڑی کی کھال کے کوٹ کو چُھو کر دیکھتے ہوئے بولی۔ "سُنا ہے' اس قسم کے کوٹوں کا فیشن پھر لوٹ کر آرہا ہے اور یہ خاصے مہنگے مل رہے ہیں؟ بھئی مجھے تو یہ اس لیے عجیب لگتا ہے کہ اس میں کالر کے پیچھے لومڑی کی کھوپڑی صحیح سالم دکھائی دیتی ہے۔"

"دو چار مرتبہ پہننے کے بعد اس کی عادت ہو جاتی ہے۔" گرٹا بے توجہی سے کوٹ کی فر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ "ویسے مجھے اپنا کوٹ آج صفائی کے لیے بھیجنا پڑے گا۔ معلوم نہیں رات اس پر کیا گیلی اور چپ چپی سی کوئی چیز لگ گئی ہے حالانکہ شام میں اسے پہن کر گھر گئی تھی تو بالکل صاف اور خشک تھا...!"

BETWEEN A CAT AND A HARD PLACE
JIMMY VINES

سکندر بخت میرا نام ہے۔ بچپن میں مجھے کبیر خان بھی کہا جاتا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد جب مسلمانوں کا قتل عام ہوا تو میرے والد وزیر خان کے سوا تمام افراد خانہ شہید ہوگئے۔ والد نے لاہور میں معمولی کاروبار سے نئی زندگی کا آغاز کیا پھر ایک حصہ دار میر شرافت علی کے ساتھ وزیر اینڈ کمپنی قائم کی جو زرعی آلات بناتی تھی۔ مجھے اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن بھیجا گیا۔ چار سال بعد مجھے رُسواکن حالات میں برطانیہ سے نکلنا پڑا۔ پاکستان پہنچ کر مجھے والد کی دردناک موت سے منسوب پُراسرار حالات کا علم ہوا۔ وہ بدستور صنعت کار تھے مگر انتہائی مفلسی کا شکار رہے اور انہوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا کہ میرے پیچھے ان پر کیا گزری۔ پھر ان کا پارٹنر میر شرافت علی قتل ہوا اور اس جرم میں مجھے ملوث کرلیا گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ میرے والد کی کمپنی کا تیسرا حصے دار چوہدری دلاور ایک وطن دشمن اسمگلر ہے جو مشرقی پاکستان کے علیحدگی پسندوں کو اسلحہ فراہم کرتا ہے۔ اس غدار کے دوسرے ساتھیوں میں ایک بدمعاش استاد پنڈرو' ایک بدعنوان ایس پی سراج' ایک بدکردار سابق نواب خسرو جمشید اور اس کا منیجر ڈی سلوا تھے۔ میری مدد میرے بچپن کے دوست محسن نے کی۔ پہلے عبدالودود منظر نام کے ایک ایڈووکیٹ نے میرے مقدمے کی پیروی کی لیکن پھر رابعہ قاری ایڈووکیٹ نے قانونی معاملات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ رابعہ سے میرا تعلق ایک عشق بلاخیز میں بدل گیا اور اس نے میرا ساتھ نبھانے کی بھاری قیمت ادا کی۔ ہماری ذاتی دشمنی اب وطن دشمن عناصر کے خلاف ایک جدوجہد بن چکی تھی۔ حالات سخت سے سخت تر ہوتے گئے اور ہمارا ساتھ دینے والوں میں ایک صحافی مرزا غالب' ایک لڑکی شعلہ جو بعد میں محسن کی شریک حیات بنی' فرض شناسی کے جرم میں نکالا جانے والا ایک انسپکٹر اکرام شیخ اور اس کی فتنہ ساماں بہن نازو بھی شامل ہوگئے۔ ہم نے اپنی تنظیم کا نام ایم آر ایس (مائٹ از رائٹ سوسائٹی) رکھا کیونکہ ہمارے نزدیک معاشرے کے ان مجرموں کا علاج قانون کے پاس نہیں تھا۔ وہ خود کو بہت بڑا شکاری سمجھتے تھے لیکن ہم ان کو انہی کے طریقوں سے شکار کرنے لگے تھے۔ اس جنگ میں ہمارا ایک ساتھی نیازی اور دوسرے بہت سے بے گناہ' سچے اور محب وطن لوگ مارے گئے تو ہم نے بھی وطن فروشوں کے بہت سے ٹھکانے تباہ کئے۔ خسرو جمشید اور ڈی سلوا کے علاوہ بھی ہم نے بہت سے غداروں اور غیر ملکی ایجنٹوں کو ٹھکانے لگایا۔ اب ہماری زندگی کا مقصد ان معاشرے کے ناسوروں سے برسرپیکار رہنا ٹھہرا خواہ اس راستے میں ہماری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

جاسوسی ڈائجسٹ، جولائی 1993ء
SCANNED BY:
ATA-UL-MUSTAFA

آنے والے دو چوکیدار تھے جو میری گاڑی کی ٹیل لائٹ جلتی دیکھ کر اطلاع دینے آئے تھے۔ صبح سویرے آصف علی نے آکر ہمیں جگایا اور اپنے ساتھ اپنے گھر لے گیا جہاں اس کی انتہائی نحیف و نزار اور نابینا بیوی نے بڑی گرم جوشی اور شفقت کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔ ایک ہال کمرے میں انتہائی خوب صورت، نفیس فرنیچر دیکھ کر میں نے آصف علی سے اس کو بنانے والے کے بارے میں پوچھا۔ اس نے جو کچھ بتایا اسے سن کر میں حیران رہ گیا۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ ایک اکاپرست لیکن اپنے کام کا ماہر بوڑھا شخص تھا جس نے بائیس مہینے میں صرف بائیس کرسیاں تیار کیں۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ ایک امریکا میں تھا۔ دوسرا بہت بڑا اسمگلر تھا، اکبر خان اور تیسرا دلاور خان تھا۔ وہی دلاور خان جو آج میرا سب سے بڑا حریف تھا۔ یہ معلومات میرے لئے بہت کارآمد تھیں۔ آصف علی کی بیٹی قدرت خانم کو جسمانی ساخت اور اعضا کی مناسبت سے انسان ہی سمجھا جاسکتا تھا مگر وہ بدہیئتی اور بدصورتی کی بدترین تصویر تھی۔ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر مجھے ریسٹ ہاؤس سے جا کر اپنا سامان لانا تھا مگر اس سے پہلے ہی کسی نے نامعلوم سے ریسٹ ہاؤس کو تباہ کروایا۔ یہ یقیناً دلاور اینڈ کمپنی کا کام تھا۔ اب ہمارا آصف علی کے گھر ٹھہرنا بھی خطرناک تھا لہٰذا ہم نے علاقہ غیر کی طرف نکل جانے کا فیصلہ کرلیا۔ آصف علی کے کہنے پر رابعہ اور کاجل کو آصف علی کی بیوی کے ہمراہ ان کے کسی جاننے والوں کی زمینوں پر روانہ کر کے ہم بھی کلیم اللہ کو ساتھ لے کر علاقہ غیر روانہ ہوگئے۔ روانگی سے پہلے اطلاع دینے کی خاطر میں نے لاہور وقار یوسف کی بیوی انجم کو فون کر کے سارے واقعات بتادیے۔ اس نے بتایا کہ گولا مُنڈو الا نے خودکشی کرلی تھی جو اصل میں قتل تھا اور دلاور اینڈ کمپنی کے حکم پر ہوا تھا۔ دوسری اہم اور افسوس ناک بات اس نے یہ بتائی کہ گل بانو دوبارہ ڈاکو ناگ منی بن گئی تھی اور یہ خبر اس کی تصویر کے ساتھ اخبار میں بھی چھپی تھی۔ علاقہ غیر میں کلیم اللہ کو اس کے رشتے داروں کے حوالے کر کے دو دن بعد ہم واپس پشاور پہنچے تو ایک بُری خبر ہماری منتظر تھی۔ رابعہ اور کاجل، آصف علی کی بیوی اور بچی سمیت غائب تھیں۔ آصف علی نے ان کا پتا چلانے کی اپنی سی کوشش کی مگر کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ میرا خیال تھا کہ انہیں اغوا کرلیا گیا ہے اور اس میں مجھے آصف علی کے زرخرید داماد حامد کا ہاتھ نظر آتا تھا۔ میں اور آصف علی ابھی اسی پریشانی اور الجھن میں مبتلا تھے کہ ایک اور مصیبت نازل ہوگئی۔ پولیس نے آصف علی کے گھر چھاپا مار کر مجھے آفریدی کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا۔ وہ مجھے ہتھکڑی لگا کر ایک بند وین میں تھانے لے جانے کے بجائے ایک کوٹھی میں لے گئے جہاں پہنچ کے پولیس کا جارحانہ رویّہ عاجزی میں بدل گیا۔ میں اس انہونی پر حیران کھڑا تھا کہ برآمدے میں ایک شخص نمودار ہوا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا اور حیرت سے میرا منہ کھلا رہ گیا۔

اب آپ مزید واقعات کا مطالعہ کیجئے

میرے سامنے میرا پرانا حریف، سب سے خطرناک شکاری اور عیار ترین دشمن چوہدری دلاور موجود تھا۔ اس کی صورت پر وہی دھوکا دینے والی مسکراہٹ تھی جس کا مطلب دوست اور دشمن سب ہی غلط نکالتے تھے۔ جب اس کے دل میں کینہ اور عناد کا زہریلا اژدھا پھنکارتا تھا تو اس کے لبوں پر شہد سے زیادہ میٹھی مسکراہٹ آجاتی تھی۔ اس کے وجود میں نفرت کا جوالا مکھی اُبلتا تھا تو ہونٹوں پر محبت کے پھولوں کی خوشبو میں بسی مسکراہٹ جاگ اٹھتی تھی۔ وہ ایک ایسا جادوگر تھا جو اپنے ظاہر میں باطن کا عکس یوں دکھا دیتا تھا کہ دیکھنے والے کی نظر کو فرق کا احساس ہی نہ ہو۔ اس کے چہرے کا تاثر اور اس کی مسکراہٹ کسی گٹر لائن کے ڈھکنے کی طرح تھی مگر وہ ڈھکنا اٹھا کے کہتا تھا کہ دیکھو اندر کیسے خوش رنگ پھول کھلے ہوئے ہیں اور کیسی دل نواز خوشبو ہے۔ تو یہ بھی سچ لگتا تھا ورنہ کون نہیں جانتا کہ گٹر میں غلاظت اور تعفن کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

اسے اچانک روبرو پا کے میرے ذہن کو جھٹکا لگا تھا مگر یہ جھٹکا ایسا ہی تھا جیسا جنگل میں اپنے سامنے زہریلے ناگ کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے۔ میں حواس کی تمام طاقتوں کے ساتھ مستعد اور محتاط ہوگیا تھا۔

وہ کھیل جس میں اب تک چوہدری دلاور کے شاطر ہاتھوں نے اپنے مُہرے استعمال کیے تھے، ایک ایسے نئے موڑ پر آگیا تھا جہاں اس نے خود سامنے آکے کوئی نئی چال چلنے کا فیصلہ کیا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ آگے آیا "کیا مجھے پہچاننے کی کوشش کررہے ہو؟ میں اتنا تو نہیں بدلا ہوں اپنے سکندرِ اعظم صاحب۔"

میں نے اپنے لہجے میں نفرت اور حقارت بھر کے کہا "تم چاہو تب بھی بدل نہیں سکتے دلاور۔ سانپ صرف کینچلی بدلتا ہے۔ اس کی فطرت بھی وہی رہتی ہے، عادت بھی اور صورت بھی۔"

اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا "چھوڑو جی یہ پُرانیاں گلاں ہوگئیں ہیں جی۔ وقت کو دیکھو، کہاں سے کہاں نکل گیا۔"

"میرا اور تمہارا وقت ابھی ختم نہیں ہوا۔ اور جب تک گزرے ہوئے وقت کا حساب برابر نہیں ہوتا، میں اپنا ہاتھ آگے بڑھاؤں گا تو صرف تم پر وار کرنے کے لیے..."

وہ ہنسا "او یار ڈوار از اوور۔ اب وار کی بات بھول جاؤ۔ بہت وار کرلیے تم نے بھی، ہیں جی۔ اور ہاتھ کیا آیا تمہارے اس وار میں؟ چلو ملاؤ ہاتھ۔ تم نے گزرے ہوئے وقت کے حساب کی بات کی ہے تو کرلیتے ہیں حساب بھی۔"

میں نے اپنا ہاتھ پیچھے کرلیا "تم جس وار کی بات کررہے تھے دلاور! اس میں تم میرا ساتھ دیتے تو شاید ایک ہم وطن ہونے کے ناتے میں بھی سوچتا کہ اپنا معاملہ روزِ محشر کی عدالتِ انصاف کے سپرد کردوں۔ ذاتی انتقام کے جذبات حاوی ہوں تو خود مدعی کیسے منصف ہوسکتا ہے مگر میرے اور تمہارے درمیان اب صرف ذاتی

دشمنی نہیں۔ تم غدار اور وطن دشمن بھی ہو۔ تم نے میرے ملک کو دولخت کرنے والوں کے ہاتھ مضبوط کیے تھے۔ تم ان دشمنوں سے بدتر ہو جو مذہب یا قومیت کی دلیل پر میرے دشمن ہیں۔ مجھے جب بھی موقع ملا میں تمہیں قتل کردوں گا۔ تمہیں بھی اور تمہارے ان حواریوں کو بھی جن کے چہرے بے نقاب ہو چکے ہیں۔"

دلاور کی مسکراہٹ کافور ہو گئی "تم ہٹ دھرم ہو۔ ہیں جی' کیا کہتے ہیں اسے۔ ناعاقبت اندیش؟ اُردو اپنی ایسی ہی ہے عاقبت نااندیش۔ خیر دفع کرو۔ کُتّے کی دُم سے بات سمجھ آجائے تو پھر اتنی فارسی بولنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"اگر تم بڑے دور اندیش ہو تو موقع سے فائدہ اٹھاؤ دلاور اور اپنے ان حکم کے غلاموں سے کہو کہ مجھے زندہ لوٹ کر نہ جانے دیں۔ میں بالکل خالی ہاتھ اور نہتا ہوں' یہ سب مل کر مجھے شوٹ کرسکتے ہیں اور یہیں گاڑ سکتے ہیں۔ میں بالکل تیار ہوں مرنے کے لیے دلاور۔ کم سے کم ایک دشمن تو کم ہوگا تمہارا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سے فرق کوئی نہیں پڑے گا۔ تم جانتے ہو' سکندر ایک نام نہیں ہے۔ یہ ایک جذبہ ہے' ایک طاقت ہے' یقین اور اتحاد کی۔ اور ایک تنظیم ہے۔"

"ایم آر ایس ہ؟" اس نے طنز اور تمسخر کے ساتھ کہا۔

"ہاں' ایک ایم آر ایس تم جیسے لوگوں کی ہے' جو معاشرے میں لاقونیت' بے ضمیری' ناانصافی اور بدباطنی کے فروغ میں وہی کردار ادا کر رہے ہیں جو ابلیس ساری دنیا میں کرتا ہے ...!"

"اور یہ دوسری ایم آر ایس تم جیسے فرشتوں نے بنائی ہے۔" دلاور نے بُرا مانے بغیر طنزیہ انداز میں میری بات کاٹ دی "ہم جیسے لوگوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے۔ ہیں جی۔ یار' یہ نیکی بدی کی جنگ تو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی مگر شیطان کے وجود کو ختم کرنے کے لیے فرشتے کبھی مقابلے پر نہیں آئے۔ خدا نے بھی اسے کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ بندوں کو سمجھانے کے لیے نبی اور ولی ضرور آتے رہے۔ تم کیا حرز ہو آخر اپنے سکندر صاحب! کبھی غور فرمایا آپ نے؟"

میں نے کہا "میں خدائی فوجدار ہوں۔ تم جانتے ہو۔"

وہ خوش دلی سے ہنسا "اچھا جی ہم مان لیتے ہیں۔ اب اندر چلو۔ میں نے تمہیں نیک نیتی کے ساتھ بلایا ہے۔ باتیں کرنے کے لیے اور کچھ سمجھنے سمجھانے کے لیے۔"

میں نے کہا "اپنی نیک نیتی کا ثبوت تم نے پہلے ہی دے دیا ہے۔"

مگر میری بات مکمل ہونے سے قبل ہی وہ پلٹ کے اندر چلا گیا تھا اور شاید جاتے جاتے پولیس کی وردی میں ملبوس افراد کو اشاروں کی زبان میں ان کا فرض یاد دلا گیا تھا۔

انسپکٹر غرایا "اب آپ اپنے پاؤں پر چل کے اندر جاؤ گے یا..."

میں نے مسکرا کے کہا "کیا تم مجھے موقع دو گے؟"

"کس بات کا موقع؟" وہ حیران ہو کے بولا۔

"یہی کہ میں اپنے پیروں پر چل کے اندر جاؤں مگر تمہاری لاش اپنے کندھے پر اٹھا کے لے جاؤں۔ باری باری تم سب کی۔"

وہ مسکرایا "تمہیں شکایت ہے ہم نے تمہیں کوئی موقع فراہم نہیں کیا اپنی بہادری کے جوہر دکھانے کا۔ یہ موقع ضرور ملے گا تمہیں۔"

چھوٹے گول مٹول حوالدار نے دانتوں کی نمائش کی "مجھ سے لڑو گے ٹارزن؟"

"ٹارزن کا کسی جنگلی مینڈک سے کیا مقابلہ؟" انسپکٹر نے اسے بڑا واضح اشارہ کیا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی مناسب جواب دیتا' حوالدار نے مجھ پر بالکل کسی جنگلی مینڈک کی طرح جست لگائی اور اس کے پاؤں میرے سینے پر دھم سے گرز کی طرح لگے۔ اس قد و قامت اور جسامت کے ساتھ ایسی پھرتی کا مظاہرہ میرے لیے بعید از قیاس تھا۔ اس کی قوت میں ایک وحشیانہ شدت تھی جس کا اندازہ حوالدار کے مضحکہ خیز اطوار اور مظلوم و مسکین چہرے سے نہیں ہوتا تھا۔

میں ایک دم لڑکھڑا کے پیچھے گرا۔ میرے اٹھنے سے پہلے ہی حوالدار دوبارہ مجھ پر حملہ آور ہوا مگر اب میں بھی خطرے کو محسوس کرلینے والے حیوان کی فطری جبلت کے ساتھ مقابلے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی ٹانگیں سمیٹ لیں اور عین اس وقت جب وہ میرے اوپر آیا میں نے ٹانگوں کو جھٹکے سے اوپر اٹھایا۔

میرے دونوں پاؤں اس کے پیٹ پر لگتے تو وہ توپ سے نکلے ہوئے گولے کی طرح اُڑتا ہوا جاتا اور دیوار سے ٹکراتا مگر سیکنڈ کے ہزارویں حصے کا فرق بھی بعض اوقات ساری امیدوں کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ شاید اس نے بھی اندازہ کرلیا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔

اس نے ایک دم سر جھکا کے غوطہ مارا اور میں فضا میں ٹانگ چلا کے رہ گیا۔ میرے پاؤں میں جھٹکا آیا مگر اس کے باوجود میں تیزی سے پلٹ گیا اور حوالدار کو میری ٹانگوں میں گھسنے کا موقع نہ ملا۔ وہ منہ کے بل زمین پر گیا۔

کوئی اور ہوتا تو اس صدمے سے فوراً سنبھل نہ پاتا مگر اس نے ریچھ کی طرح غرا کے بلند آواز میں کہا "یا علی مدد" اور ایک سیکنڈ میں پھر کھڑا ہو گیا۔

یہ ایک سیکنڈ کی مہلت بھی میرے لیے بہت تھی۔ میں نے اس کو اپنے مقابل دیکھا تو اس کا چہرہ لہولہان تھا۔ اس کی ناک سے خون کی ایک لکیر سی کے ہونٹوں تک آرہی تھی۔ ہونٹوں کے ایک پھٹے ہوئے کنارے سے خون رِس رہا تھا اور ماتھے کی کھال پھٹ جانے سے پیشانی بھی لہو تر تھی۔

میں نے بائیں پاؤں کی ایڑی پر گھوم کے لات کو ایک دائرے میں حرکت دی۔ یہ ایک انتہائی خطرناک داؤ تھا۔ میری ٹائمنگ بھی غلط نہ تھی اور مجھے یقین تھا کہ جیسے ہی حوالدار کھڑا ہو گا میری ٹانگ اس کے پیٹ پر یوں لگے گی جیسے بجلی کو پوری تیزی سے گردش کرنے والے پنکھے کا ایک بازو کسی سے ٹکرا جائے چنانچہ مجھے اس وقت سخت حیرت کا سامنا کرنا پڑا جب میں اپنے ہی زور میں دوسری بار گھوم گیا۔

ناقابلِ یقین سُرعت کے ساتھ حوالدار نے خود کو میری لات کی سوئپ سے بچالیا تھا۔ کچھ قدرتی فائدہ اسے اپنے قد کی کوتاہی سے بھی حاصل رہا اور وہ مخالف سمت میں نکل گیا۔

میری لات کلاک وائز حرکت میں تھی یعنی میں نے بائیں ایڑی پر دائیں جانب لات گھمائی تھی۔ وہ کلاک وائز آیا یعنی بائیں طرف سے اور دوسرے لمحے اس نے پیشہ ورانہ مشاقی کے ساتھ میری ٹانگ کو نیچے سے پکڑلیا۔ نتیجہ صاف ظاہر تھا۔ میں نے خود کو فضا میں زمین سے چند فٹ اوپر یوں گھومتا پایا جیسے رسّی کے سرے پر بندھا ہوا پتھر۔

میں اتنا ہلکا پھلکا بھی نہیں تھا اور نہ وہ جسمانی اعتبار سے مجھ پر برتری رکھتا تھا مگر یہ مارشل آرٹس کے وہ داؤ پیچ ہیں جن میں جسمانی طاقت سے زیادہ تجربہ، مہارت اور حاضر دماغی کام آتی ہے۔

میرا حریف جسے میں نے صورت شکل، قدوقامت اور اطوار کے باعث جنگلی مینڈک کا خطاب دیا تھا، جو ڈو ہی نہیں، تائی کوانڈو بھی جانتا تھا لیکن وہ مجھے دھوکا دینے میں کامیاب رہا تھا۔ انتہائی احمق اور بے ضرر نظر آنے والا شخص اتنا خطرناک تھا کہ مجھے اپنا انجام صاف نظر آنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مختصر پستہ قامت اور بھاری بدن شخص زیادہ دیر مجھے اوپر اٹھا کے گردش میں نہیں رکھ سکتا۔ اس نے تو میرے وجود کی حرکت پذیری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک جھٹکا دے کر مجھے گھما دیا تھا اور اب یہ بات یقینی تھی کہ توازن بگڑنے سے پہلے وہ مجھے چھوڑ دے گا۔ میں نیوٹن کے دوسرے قانونِ حرکت کے مطابق سیدھا اڑتا ہوا جاؤں گا اور دیوار سے ٹکرا کے وہیں ڈھیر ہو جاؤں گا۔ فنونِ حرب کی کسی کتاب میں اور کسی نصاب میں ایسا کوئی طریقہ درج نہ تھا جسے یاد کر کے میں اپنے حریف کی گرفت سے بحفاظت نکل سکتا یا اسے مجبور کر سکتا کہ وہ میرے پنجے کو نہ چھوڑے۔

میرے بازو خود بخود پھیل گئے تھے اور میں کسی گلائیڈر کی طرح پرواز کر رہا تھا۔ یہ سب ایک دو سیکنڈ کی بات تھی۔ حسبِ توقع اس نے میرے پنجے کو اپنی گرفت سے آزاد کیا تو میں دیوار سے متصادم ہونے کے لیے بڑھا۔ اپنی گردن کو ٹوٹنے سے بچانے کی لاشعوری کوشش میں میرے ہاتھ خود بخود سر کے اوپر آگئے اور میرا سر جھک گیا۔

اسی وقت وہ معجزہ رونما ہوا جس کی امید رکھنے کا خیال بھی مجھے نہیں آسکتا تھا۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے میں کسی تنے ہوئے رسّے سے ٹکرا گیا ہوں۔ میں دیوار سے ٹکراتا تو میری دو چار پسلیاں ضرور ٹوٹ جاتیں مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ انسپکٹر نے ہاتھ بڑھا کے مجھے روک لیا تھا۔

میں ایک جھٹکے سے رُکا اور فرش پر گر گیا۔ یہ دوسرا حیران کُن صدمہ تھا جس سے سنبھلنے میں مجھے کچھ وقت لگا۔ جب مجھے یقین آگیا کہ میں بالکل خیریت سے زندہ سلامت زمین پر اُتر چکا ہوں تو میں نے گردوپیش پر نظر ڈالی۔

مجھے اس صدمے سے دوچار کرنے والا حوالدار کدو کچھ فاصلے پر کھڑا ہاتھ جھاڑ رہا تھا اور اس کے ساتھی ہنس رہے تھے۔

"ارے واہ رے کدو" یہ آواز انسپکٹر کی تھی۔

انسپکٹر مجھ پر پیر رکھے اور اپنے ریوالور کا رخ میری طرف کیے کھڑا تھا۔ ریوالور کی نیلگوں جھلک والی سرد سفاک نالی کے اندر کہیں کوئی گولی بے چینی سے منتظر تھی کہ اسے اشارہ ملے تو میرے دل میں اُتر جائے۔

جب فلیش چمکا تو مجھے یاد آیا کہ ایسی ہی چمک میں نے پہلے بھی دو تین بار ضرور دیکھی تھی۔ پھر دلاور کے دہاڑنے کی آواز آئی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے نصف درجن گالیاں بڑے فراٹے کے ساتھ دیں "کیا کہا تھا تم سے میں نے 'ہیں جی؟'"

انسپکٹر نے اپنا پاؤں ہٹالیا اور اپنا ریوالور بھی جیب میں ڈال لیا "سر جی! اس نے ہمیں مجبور کر دیا۔"

"مجبور کر دیا... اور تم مجبور ہو گئے!" دلاور نے حقارت کے ساتھ اس کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا "بڑے افسوس کی بات ہے انسپکٹر کہ تم اتنی آسانی سے مجبور ہو جاتے ہو۔ بڑے کمزور بندے ہو تم تو یار۔"

"آپ میری بات نہیں سمجھ رہے ہیں..." انسپکٹر مشتعل ہونے لگا۔

"اچھا؟ تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں بے وقوف اور کوڑھ مغز بھی ہوں خیر سے؟" دلاور بولا۔

میں خفت اور شرمساری کے جذبات سے مغلوب کھڑا تھا اور اس حوالدار سے نظریں چرا رہا تھا جس نے میرے غرور کو خود میری نظر میں عبرت آموز شکست سے دوچار کر دیا تھا۔ میں پولیس والوں سے اچھی طرح واقف تھا اور ماسوا چند ایک کے، مجھے اس محکمے میں نیچے سے اوپر تک کاہل، جاہل، حرام خور اور بے ضمیر لوگ ہی ملے تھے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حوالدار کدو جیسا شخص میرے سارے تصورات کو باطل کر دے گا۔ مجھے رستم تو مجھے پہلے بھی ملے تھے مگر اس جنگلی مینڈک جیسے حوالدار کدو کہلانے والے باکمال اور ماہر فن شخص کا پولیس کی وردی میں نظر آنا میرے لیے ایک ناقابل یقین تجربہ تھا۔ اگرچہ وہ میرا دشمن تھا مگر میں اس کا دل سے اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا کہ فنِ حرب میں اس کی واضح برتری کو

تسلیم کروں۔

جب فائر کی آواز آئی اور حوالدار نے اچھل کے سینہ پکڑا اور میں نے اس کی دلخراش چیخ سُنی تو میرا دل ایک لمحے کے لیے دھڑکنا بھول گیا۔ میں نے نیچے گرتے ہوئے حوالدار کی طرف دیکھا اور پھر چوہدری دلاور کی طرف دیکھا جو اپنے ریوالور کی نال کو رومال سے صاف کر رہا تھا۔

"سُور کے بچے؟" میں نے چیخ کے کہا "یہ کیا کردیا تو نے؟"

دلاور کے لبوں پر ایک سفاک مسکراہٹ آگئی "مجھے حکم عدولی پسند نہیں۔ خاص طور پر اس وقت جب میرے زر خرید غلام میرے معزز مہمانوں کے ساتھ غلط سلوک کریں۔"

زر خرید غلام، معزز مہمان، غلط سلوک...... میرا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ میری نظروں کے سامنے دلاور نے ایک سرکاری اہلکار کو قتل کردیا تھا۔ سرکاری اہلکار زر خرید بھی ہوسکتے ہیں مگر ایک ایسی خطا پر جو خطا بھی نہیں تھی، قتل کی یہ سفاکانہ سزا بہت بڑا جرم تھی۔ قانونی طور پر بھی اور اخلاقی اعتبار سے بھی۔ حوالدار نے اگر تھوڑی سی زیادتی کی تھی تو میرے ساتھ اور میری اشتعال انگیزی پر۔ میرے اور اس کے درمیان خالی ہاتھ ایک بے ضرر سا مقابلہ ہوا تھا جس میں اپنی برتری ثابت کرنے کے سوا حوالدار نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔

اب وہ میرے سامنے ایڑیاں رگڑ رہا تھا اور میں بہت دُکھ کے ساتھ اسے مرتا دیکھ رہا تھا۔ پشیمانی کا یہ احساس میرے ضمیر میں کانٹا بن کے اُتر گیا تھا کہ اس خون کے داغ سے میرا دامن بھی داغدار ہے۔

میں نے چلّا کے انسپکٹر کو گالی دی "بے غیرت، ذلیل کُتے! تم یہ سب کچھ سن کے اور دیکھ کے بھی کچھ نہیں کر رہے ہو۔ لعنت تم پر خدا کی! قتل تمہارے سامنے ہوا ہے، قاتل تمہارے سامنے موجود ہے۔ تم نے یہ وردی پہن رکھی ہے جو تمہیں اختیار دیتی ہے کہ اسے پکڑلو۔ ریوالور بھی ہے تمہارے پاس...!"

چوہدری دلاور نے ایک قہقہہ لگایا "اجی چھڈو پراں۔ اپنے سکندرِ اعظم صاحب! یہ ایسی تقریروں کا وقت نہیں ہے۔ اور یہ تقریر کرنے کی جگہ بھی نہیں ہے۔ وہ کیا فرمایا ہے جی اپنے علامہ صاحب نے۔ اللہ نے آج تک اس ملک کی حالت نہیں بدلی جس کو احساس نہ ہو اپنی حالت خود بدلنے کا۔ تو یہ اپنا ملک ایسا ہی ہے۔ تقریروں سے کچھ ہوتا تو کیا بات تھی۔"

میں ہکا بکا اس شخص کی صورت دیکھ رہا تھا جو اس قتل پر ذرا بھی پشیمانی محسوس نہیں کر رہا تھا۔ جسے ذرا بھی خوف نہیں تھا کہ قانون اس کو گرفت میں لے سکتا ہے۔ میں دُکھ کے ساتھ اس قانون کے رکھوالے کو بھی دیکھ رہا تھا جس نے چند سکّوں کے عوض اپنی وفاداری ہی نہیں خودداری بھی بیچ دی تھی۔ وہ سرکاری اہلکار نہیں رہا تھا۔ دلاور کا کتّا ہوگیا تھا۔ اس نے اپنے ایک ماتحت کے

کسی نے پیش گوئی کی تھی کہ ۲۰۰۰ء میں روس کے ہر دوسرے شخص کے پاس اپنا ذاتی جہاز ہوگا تو کسی نے پوچھا۔ "لیکن وہ اس کا کرے گا کیا؟"

منصوبہ بندی کرنے والے نے بتایا۔ "فرض کریں آپ کا ہمسایہ بتاتا ہے کہ لینن گراڈ میں آلو بک رہے ہیں تو آپ کو سب سے پہلے وہاں پہنچنے کے لیے ہوائی جہاز تو چاہیے ہوگا نا؟"

ڈاکٹر محمد یونس بٹ کی کتاب
"افرا تفریح" سے خوشہ چینی

قتل پر زبانی احتجاج تک نہیں کیا تھا۔ وہ خاموش کھڑا تھا اور دلاور کی فضول بکواس سُن رہا تھا۔ اس کی اخلاقی ذلّت پر مجھے اتنا ملال اور اشتعال تھا کہ میرے بس میں ہوتا تو مار مار کے اس کی ہڈیاں توڑ دیتا۔ اسے سرِعام ننگا کرکے ذلیل کرتا اور اس کے گلے میں پٹّا ڈال کے مجبور کرتا کہ کُتّے کی طرح بھونکے اور پھر قانون کے حوالے کردیتا کہ اس کو سزا دے۔

اچانک دلاور کی آواز سن کے میں پھر ہوش میں آگیا۔ اب وہ انسپکٹر سے مخاطب تھا۔

"میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا اپنے تھانیدار صاحب۔ ہیں جی۔ آخر کس..... نے افسر بنادیا تمہیں؟ کنٹرول ذرا بھی نہیں تمہیں کسی ماتحت پر۔ اور اتنے کمزور افسر کا کیا بھروسہ۔ کل کسی کے کہنے پر میرے خلاف کچھ کر بیٹھے۔"

"آپ کیسی بات کرتے ہیں سرجی!"

"سرجی کے بچے! جو میرے مہمانوں کے ساتھ ہوا، کیا میرے ساتھ نہیں ہوسکتا۔ میرے حکم کی اگر اتنی ہی اہمیت ہے تمہارے لیے تو پھر کیا فائدہ میرے بکواس کرنے کا۔ تم میں سے کوئی مجھ پر بھی ریوالور نکال سکتا ہے۔"

انسپکٹر نے کچھ کہنے کے لیے مُنہ کھولا تھا مگر اچانک اس کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ وہ چلّانے لگا "چوہدری صاحب، خدا کے لیے ایسا مت کریں۔ مجھے معاف کردیں۔"

میں نے دلاور کی طرف دیکھا اور پھر انجام کی پروا کیے بغیر میں نے اس پر ایک جست لگائی مگر مجھے بہت دیر ہوگئی۔ اتنی ہی سرد مہری اور بے نیازی کے ساتھ دلاور نے انسپکٹر کو بھی شوٹ کردیا تھا۔ میں خوف سے اپنی جگہ منجمد ہوگیا۔ کسی نادیدہ قوت نے میرے قدم روکے تھے، مجھے خبردار کردیا کہ اس شخص کے ریوالور کا رخ میری جانب ہوگیا تو باقی گولیاں میرے سینے میں اُتر جائیں گی اور اتنی ہی بے بسی کے ساتھ میں بھی مرجاؤں گا جیسے پولیس کا ایک حوالدار اور ایک انسپکٹر مرگئے تھے۔ کسی بھی قانون کی طاقت دلاور کو گزند نہ پہنچاسکے گی۔ اس کی طاقت کے مقابلے میں قانون بے

بس نہ ہوتا تو کیا اتنی آسانی سے اور اتنے سکون کے ساتھ وہ دو قتل کر کے مسکرا سکتا تھا؟ اچانک مجھ پر بزدلی غالب آگئی۔ مجھے خیال آگیا رابعہ کا اور کاجل کا' غالب اور نازو کا۔ ان سب کا جو میرے ساتھی' دوست' عزیز و اقارب اور زندگی کے رفیق و ہم سفر تھے۔ جن کے بغیر میرے لیے اپنی زندگی کا مفہوم کچھ نہ تھا۔ ان سب کا پتا صرف دلاور سے حاصل ہو سکتا تھا۔ میں ان سے پھر مل سکتا تھا مگر اس کے لیے شرطِ اول یہ تھی کہ میں زندہ رہوں۔

وہ میرے لیے عجیب تبدیلی کا لمحہ تھا۔ جب میں نے زندگی کی چاہت کو محسوس کیا اور یہ چاہا کہ میں اپنی جدوجہد کا رخ زندگی کے راستوں کی طرف رکھوں۔ مر کے تو میں سب کچھ گنوا دوں گا۔ وہ خواب جو تشنۂ تعبیر تھے' وہ ارمان جو ادھورے تھے' وہ ارادے جو کل کی اُمید تھے' اچھے دن جو منتظر تھے کہ فرصت کشاکشِ غمِ دوراں سے گر ملے تو وہ حقیقت بن جائیں۔

میری یہ زندگی صرف میری نہیں تھی' اس پر دوسرے بہت سے لوگوں کا حق تھا اور اس زندگی کا ایک مقصد و مصرف بھی تھا۔ یہ کسی شرابی' جواری' ناکارہ و ناکام' غلط رو اور گمراہ شخص کی زندگی نہیں تھی جو معاشرے کے لیے داغِ ندامت ہو۔ جو نہ رہے تو خلق کی جان کا عذاب ختم ہو اور کہنے والے کہیں کہ خس کم جہاں پاک۔ نہیں' مجھے تو اس زندگی سے بہت کچھ حاصل کرنا تھا۔ اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔ جینے کا حق' انصاف' انسانیت کا احترام اور آدمی کی عزت۔ مجھے اس زندگی کے ہر لمحے سے ایک مشن کی تکمیل کی خاطر بھرپور استفادہ کرنا تھا اور یہ مشن تھا دلاور' پیڈرو اور حاجی عبداللہ جیسے لوگوں کے جرائم کی پردہ دری۔ مجھے اپنی بساط کی حد تک انھیں ہر غلط کام سے روکنا تھا اور ہر غلطی کی سزا دلوانی تھی۔ ان سے اپنے اور دوسروں کے غصب شدہ حقوق حاصل کرنے تھے۔ مجھے اپنے والد کے قاتلوں کو تختۂ دار تک پہنچانا تھا اور وزیر خاں ٹرسٹ اسپتال کا کنٹرول حاصل کرنا تھا۔ مجھے اُجڑے گھر بسانے تھے اور بچھڑ جانے والوں کو تلاش کرنا تھا۔

لیکن یہ سب کچھ کرنے کے لیے مجھے طاقت سے زیادہ اپنی عقل پر انحصار کی ضرورت تھی۔ یہ تسلیم کر لینا ضروری تھا کہ بدلے ہوئے حالات میں دلاور کا مقابلہ بندوق کی گولی یا دولت کی طاقت سے نہیں کیا جا سکتا۔ وہ پہلے بھی کمزور حریف نہیں تھا مگر اب تو پہلے سے زیادہ طاقتور ہو گیا تھا۔ اس کے مادی وسائل' اس کا اثر و رسوخ' اس کی قوتِ خرید' اس کی بدمعاشی کا دائرہ' اس کی دولت کی زنجیر سے بندھے ہوئے شکاری کتے' ان سب کا مقابلہ ہم جذبات کے اندھے پن کے ساتھ نہیں کر سکتے تھے۔ اگر میں سینہ تان کے اس کو للکارتا کہ ہمت ہے تو مجھے گولی مار کے دکھا دلاور۔ تو وہ کہتا اچھا جی اپنے سکندرِ اعظم آپ کہتے ہو تو پھر ٹھیک ہے۔ اسے بہادری نہیں کہا جا سکتا۔ ایسی عقل کی جذباتی کمزوری ہی آدمی کو خودکشی پر مجبور کر دیتی ہے۔ بات تو تب ہے کہ آدمی اپنے دشمن کو ذہنی و جذباتی طور پر اتنا زچ کر دے کہ وہ خودکشی کر لے۔

میں کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت میں ایک قدم آگے بڑھاتا تو زندگی کی سرحد عبور کر جاتا۔ کسی تذبذب کے بغیر دلاور مجھے شوٹ کر دیتا اور میرے جسم میں ہونے والے ایک سوراخ سے میرا خون ہی نہیں' میرے مستقبل کے سارے ارادے بھی خاک میں مل جاتے۔ میں کسی گمنام قبر میں جا لیٹتا۔ اپنے والد کی طرح۔ دلاور ایسے ہی اپنی دلاوری کے دعووں کے ساتھ زندہ رہتا اور زمین پر غرور و نخوت سے گردن اکڑا کے چلتا۔ محسن اور غالب دنیا سے پوچھتے پھرتے کہ کوئی تو بتاؤ' سکندر کہاں گیا جو ہمیں تلاش کرنے نکلا تھا۔ رابعہ خاک بسر راہ گزاروں سے سوال کرتی۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

بس وہ ایک راہنما لمحہ تھا جس نے میری زندگی کی راہوں کا از سرِ نو تعین کیا اور میں نے یکلخت اپنے ذہن کو جذبات کے جالوں کی گرفت سے آزاد ہوتا محسوس کیا۔ میں نے ٹھنڈے دل اور دماغ کے ساتھ دلاور سے مذاکرات اور گفت و شنید کی اہمیت کو تسلیم کیا اور یہ طے کیا کہ طاقت کے توازن کو نئی بنیادوں پر استوار ہونا چاہیے۔ اگر دلاور اینڈ کمپنی کے پاس دولت کی طاقت ہے تو دوسری طرف ہم ذہانت کی دولت سے مالا مال ہیں۔ منافقت کا مقابلہ سیاست سے کیا جائے' مصلحت اور مصالحت کے ساتھ حالات کے نشیب و فراز پر نظر رکھی جائے اور اپنی حکمتِ عملی کو دشمن کی فطرت کے کمزور پہلو دیکھ کر مرتب کیا جائے تو بازی پلٹ سکتی ہے۔

حالات بدل چکے تھے۔ وقت کے تقاضے کچھ اور تھے۔ دشمنی کا مفہوم بدل گیا تھا۔ دوستی اور دشمنی کی قدریں بدل رہی تھیں چنانچہ ضروری تھا کہ ہم بھی اپنے لائحۂ عمل پر نظرِ ثانی کریں۔ اگر دلاور نے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے تو اس کی منافقت کو سمجھتے ہوئے بھی میں اس کا ہاتھ نہ جھٹکوں۔ میں سکندر رہتے ہوئے بھی دلاور کا اندازِ نظر اختیار کر لوں۔ دشمن کے قلعے میں داخل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ قلعے کے اندر کا نقشہ معلوم ہو۔ دلاور کیا سوچتا ہے اور کیا کرتا ہے' یہ جاننے کے لیے ضروری ہے کہ میں دلاور کے ذہن تک اسی طرح رسائی حاصل کروں جیسے دشمن کا جاسوس ملک کے اہم رازوں تک رسائی کے لیے ہر ممکن ذہنی و جسمانی صلاحیت کا استعمال کرتا ہے۔

بظاہر میں چار افراد پر مشتمل پولیس پارٹی پر نظر جمائے کھڑا تھا جن میں سے آدھے اپنی وردی کے تمام اختیارات' اپنا ایمان اور ضمیر سب کچھ دلاور کی دولت کے عوض گروی رکھنے کے باوجود جان بھی گنوا بیٹھے تھے۔ جو باقی بچے' وہ ماتحت تھے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے افسران کی لاشوں کو دیکھ رہے تھے۔ یا پھر دلاور کے ہاتھ میں نظر آنے والے اس فولادی کھلونے کو گھور رہے تھے جس سے برآمد ہونے والی دو تولے کی گولی انھیں بھی جیتے جاگتے زندہ انسان

سے ایک لاوارث لاش میں تبدیل کر سکتی تھی۔ قدرتی طور پر ان کے ذہن میں یہ سوال ہوگا کہ کیا اب ان کی باری آنے والی ہے؟ کیا چوہدری دلاور صاحب جو آج تک ایک فیاض اور سخی ان داتا کے روپ میں دکھائی دیتے تھے' اچانک فرشتۂ اجل بن کے ان کی جان لے لیں گے؟ وہ جو ہر خدمت اور ہر سلام پر نوٹ ہی نوٹ پھینکتے تھے' زندگی جیسی انمول نعمت کو بے دام چھین لیں گے۔

اس نئی آبادی میں کوٹھیاں ایک دوسرے سے فاصلے پر تھیں اور یوں بھی کہیں سے سنائی دینے والی فائر کی آواز یہاں کسی کو چونکاتی نہیں تھی۔ یہ روز کا معمول تھا۔ اگر کسی نے اپنے دشمن کو ٹھکانے لگا دیا تو اچھا کیا۔ اگر کسی نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ہوائی فائر کیے تو ٹھیک کیا اور محض نشانے بازی کی یا اپنے اسلحے کی کارکردگی کو چیک کیا تب بھی غلط نہیں کیا۔

"آؤ جی اپنے سکندر صاحب" چوہدری دلاور نے بڑے بے تکلف اور دوستانہ انداز میں خوشدلی سے کہا "مر گئے مردود' ان کی فاتحہ نہ درود۔ ان کا غم مت کرو۔ ہیں جی۔ کام کرنے والے بندے تھے' کام آ گئے۔ جیسے یہ ریوالور کام کی چیز ہے۔ گولیاں تو اس میں خرچ ہوتی ہیں نا جی۔ ایسی کون سی مہنگی چیز ہوتی ہے ان لوگوں کی جان جو خود کو بیچتے پھرتے ہیں اور خرید لیں گے' بہت بکاؤ مال ہے بازار میں۔"

میں نے خود پر قابو پا کے بڑی مشکل سے کہا "مگر چوہدری صاحب..."

میرے لہجے کی تبدیلی کو دلاور نے فوراً نوٹ کر لیا "اپنے سکندر صاحب' یہ دو ٹکے میں بکنے والے لوگ ایسے ہی انجام کے مستحق ہوتے ہیں۔ میں نے انہیں بار بار سمجھایا تھا کہ تم جس بندے کو لینے جا رہے ہو وہ کوئی دس نمبریا نہیں ہے اور معمولی آدمی بھی نہیں ہے۔ عزت دار آدمی ہے اور بڑا آدمی ہے۔"

میں نے کہا "میں سمجھا نہیں دلاور! آخر کیا مجبوری ہے تمہاری کہ تم میرے منہ پر ایسی باتیں کر رہے ہو!"

"سب سمجھ جاؤ گے بادشاہو۔" وہ خوش دلی سے بولا "وقت بڑا ظالم استاد ہے۔ اس نے چوہدری دلاور کو بہت کچھ سمجھا دیا ہے۔ سارے کس بل نکال دیے ہیں۔ ہیں جی۔ شاید تم بھی سمجھ لو گے کہ تم نے دلاور کو سمجھنے میں غلطی کی۔ یا بہت دیر کی۔ ورنہ یہ سب کچھ نہ ہوتا...... جو کل تھا وہ آج نہیں ہے۔"

میں نے کہا "سوائے اس کے کہ ہم کل بھی دشمن تھے' آج بھی ہیں۔ اور کل بھی رہیں گے۔ مگر یہ ٹھیک ہے کہ بڑے آدمی چھوٹی چھوٹی باتوں پر دشمنی کو تماشا نہیں بناتے۔ میں نے تمہیں ہمیشہ ایک بڑا اور بہادر دشمن تسلیم کیا ہے۔ مجھے امید ہے تم نے مجھے دھوکے سے ہلاک کرنے کے لیے اغوا نہیں کیا ہوگا۔ ورنہ تم جانتے ہو' خود تمہارا انجام کیا ہوگا۔"

دلاور میری بات پر خوش ہوا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کو میرے خیالات میں تبدیلی اس حد تک نمایاں نظر آئے کہ وہ شک میں مبتلا ہو جائے یا غلط فہمی میں کہ میں ڈر گیا ہوں۔

"چلو اوئے تم دونوں' ایسے شکلیں بنا کے مت کھڑے رہو۔" چوہدری دلاور نے اپنی جیب سے سو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کے ان کی طرف اچھال دی۔

دس ہزار روپے دو لاشوں کے درمیان گرے۔

"کیا یہ کم ہیں؟ چلو یہ لو۔" اس نے دوسری گڈی بھی پھینک دی "فٹافٹ اپنا کام شروع کر دو۔ کام پتا ہے نا؟ ایک تو اپنا منہ بند رکھنا ہے۔ سمجھے؟ تم نے کچھ نہیں دیکھا اور کچھ نہیں سنا۔ کچھ کہا بھی نہیں۔ رات کو پھر ڈیوٹی پر حاضر ہو جانا۔ کوئی بھی تم سے سوال نہیں کرے گا۔ دوسرا کام ہے ان بندوں کو غائب کرنا۔ ادھر پیچھے کچا کنواں ہے۔ اس میں ڈال کے مٹی بھر دو۔ مٹی بھی ہے اور وہیں سب سامان بھی مل جائے گا۔ زمین برابر کر کے گھر جاؤ یا چاہو تو پہلے نہا دھو لو ادھر ہی۔"

دوسری گڈی حوالدار کی لاش پر گری تھی۔ میں نے ایک سپاہی کو آگے بڑھ کر دس ہزار کے نوٹ اٹھاتے دیکھا مجھے اس کے چہرے پر عجیب سی غیر انسانی خوشی اور کمینگی نظر آئی۔ پھر دوسرا سپاہی آگے بڑھا اور اس نے جھپٹ کے دس ہزار روپے اٹھائے۔ اپنی خوش نصیبی کا یقین ان کے لیے دوہری مسرت کا باعث تھا۔ وہ

زندہ تھے اور انہیں توقع سے کہیں زیادہ مل گیا تھا۔ شاید یہی رقم ان کے افسران تقسیم کرتے تو تین چوتھائی خود رکھتے اور انہیں ایک چوتھائی ملتا۔ وہ ہوس کے مارے ہوئے کمینہ خصلت اور ضمیر فروش لوگ تھے ورنہ دلاور کے زرخرید کیوں ہوتے۔ انہیں کوئی دُکھ نہ تھا کہ دو انسان جو کچھ دیر پہلے ان کے ساتھ تھے اور انہی جیسے تھے اب مُردہ جسم ہیں، جن کا ٹھکانا وہی زمین ہے جو ازل سے اپنی بھوک مٹانے کے لیے لاشوں کو نگلتی جارہی ہے مگر پھر بھی بھوکی ہے۔

عین اس وقت جب میں پلٹ کے دلاور کے ساتھ اندر جانے والا تھا، میری نظر بھٹک گئی۔ میں نے حوالدار کی اور پھر سب انسپکٹر کی لاش کو دیکھا۔ دونوں سپاہی ان کی بغلوں میں ہاتھ دے کر انہیں اٹھا چکے تھے اور گھسیٹ کر لے جانے کی کوشش کررہے تھے۔

چوہدری دلاور نے میرا ہاتھ پکڑلیا ”آؤ اپنے سکندرِ اعظم صاحب! اندر آؤ میرے ساتھ۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے ہوش سے کام لیا۔ جوش میں بندے کی مت ماری جاتی ہے تو بندہ خود بھی مارا جاتا ہے۔“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”سچ فرماتے ہیں آپ۔ مرنا تو ایک بار ہی ہوتا ہے سب کو مگر یہ کیڑے مکوڑوں کی زندگی گزارنے والے تو بار بار مرتے ہیں، مر مر کے جیتے ہیں اور شاید جیتے ہی مرنے کے لیے ہیں۔“

چوہدری دلاور نے سر کھجایا ”اپنے سکندر صاحب! آپ تو پڑھے لکھے بندے ہیں جی۔ ہم ٹھہرے چٹے ان پڑھ۔ اتنا فلسفہ نہیں جانتے۔“

میں نے کہا ”دلاور! اس سے پہلے کہ تم کو غلط فہمی کوئی ایسا قدم اٹھانے پر مجبور کرے جس سے ناقابلِ تلافی نقصان ہوجائے، میں تمہیں بتادوں کہ تمہیں مار کے خود مرجانا ہر وقت میرے اختیار میں ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس وقت بھی جب تم خالی ہاتھ میرے ساتھ چل رہے ہو اور تم نے ریوالور بھی جیب میں ڈال لیا ہے، تمہاری جان کی حفاظت کرنے والے پوری طرح چوکس ہیں، میں انہیں دیکھ نہیں سکتا۔ مگر وہ ہر سمت سے مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہوں گے۔ میں بڑی آسانی سے تمہاری گردن توڑ سکتا ہوں مگر اس کے بعد ہر سمت سے آنے والی گولیاں مجھے بھی چھلنی کردیں گی۔ ابھی میرا موڈ مرنے کا نہیں ہے، اس لیے تم محفوظ ہو۔ مگر مجھے خوف زدہ کرنے کی یا بلیک میل کرنے کی کوشش مت کرنا۔“

وہ خاموشی سے سنتا رہا اور میرے ساتھ چلتے ہوئے زیرِ لب مسکراتا رہا۔ اس کا رویّہ میرے لیے خاصا پُراسرار ہوگیا تھا کہ میری نگاہیں اس عالی شان کوٹھی کی آرائش کو دیکھنے کے بجائے ان لوگوں کو تلاش کررہی تھیں جو چوہدری دلاور کی حفاظت پر مامور تھے مگر سامنے آئے بغیر اپنا فرض ادا کررہے تھے۔

اس سے پہلے میری اور چوہدری دلاور کی ملاقات کئی بار ہوچکی تھی اور ہر بار اس کی فطرت کی سفاکی اور عیّاری کا کوئی نیا پہلو بے نقاب ہوا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ بہت بڑا اداکار ہے اور اس سے بھی بڑا ہدایت کار ہے۔ اس نے متعدد بار ایسے ڈرامے پیش کیے تھے جو حقیقی زندگی کا منظر لگتے تھے اور چوہدری دلاور کی منفی ذہانت کا ثبوت تھے۔ وہ بے مقصد کچھ نہیں کرتا تھا۔ ابھی جو کچھ میں نے دیکھا تھا وہ بھی چوہدری دلاور کی فطرت اور سوچ کی کامیاب عکاسی کرتا تھا۔ ایک جگہ دلاور مجھ سے جُدا ہوگیا اور دو محافظ میرے ساتھ ہوگئے۔ میں خاموشی سے چلتا رہا۔ گزشتہ چند دن کے واقعات کا ہر نقش میرے ذہن میں تازہ تھا۔ ہمارے مشرقی پاکستان سے لوٹ آنے کے بعد بہت کچھ ہوا تھا جو ناقابلِ فہم تھا۔ محسن اور گل کراچی ائرپورٹ پر اُتر کے غائب ہوگئے تھے اور اخبار میں خبریں آئی تھیں کہ گل نے پھر ڈاکوؤں کے اس گروہ میں شمولیت اختیار کرلی ہے جس کا سرغنہ کبھی اس کا بھائی شیش ناگ تھا اور وہ گل بانو سے دوبارہ ناگ منی بن گئی ہے۔ یہ ناقابلِ یقین تھا مگر سچ نظر آتا تھا۔ غالب کو نازو کے ساتھ ہی سی ایم ایچ سے اغوا کرلیا گیا تھا اور ابھی تک ان کا کہیں بھی سراغ نہیں ملا تھا۔ پیڈرو مسلسل ہمارے تعاقب میں تھا اور اس نے ہمیں ہراساں رکھنے کی پالیسی کے تحت پہلے آفریدی کی گاڑی کو بم سے اُڑادیا تھا پھر ریسٹ ہاؤس میں دھماکا کیا تھا۔ بظاہر اس کا مقصد ہمیں ختم کرنا تھا مگر درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ پیڈرو کو واضح ہدایات تھیں کہ ہمیں نقصان نہ پہنچے اور یہ ہدایات دینے والا چوہدری دلاور کے سوا کون ہوسکتا تھا۔ آخری کارروائی رابعہ اور کاجل کا اغوا تھا جن کے ساتھ آصف علی کے بیوی بچے بھی اٹھائے گئے تھے اور یہ اضافی فائدہ دلاور کو ایک کمینہ پرور لالچی اور احسان فراموش شخص کی وجہ سے حاصل ہوا تھا جسے آصف علی نے بیٹا بنا رکھا تھا۔

شاید اب وقت آگیا تھا کہ چوہدری دلاور کسی ماہر پتّے باز کی طرح ٹرمپ کے سب پتّے سمیٹ لینے کے بعد مجھ سے پوچھے کہ اب بولو، بازی جاری رکھو گے یا ہار مان کے پتّے پھینک دو گے۔ اس نے مجھے ہر طرف سے محصور کرلیا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ جب تک میں ہتھیار نہیں ڈالوں گا اس کی زندگی سکون سے نہیں گزرے گی۔ وہ سمجھتا تھا کہ مجھے خریدا نہیں جاسکتا، خوف زدہ نہیں کیا جاسکتا اور کسی طرح بھی اپنے اصولوں سے منحرف نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ایم آر ایس کو نہیں توڑ سکا تھا تو ان رشتوں کو کیسے ختم کرسکتا تھا جو ہم سب کو اپنی جان سے زیادہ عزیز تھے۔ وہ محسن، غالب، رابعہ یا نازو کسی کو بھی بدگمان نہیں کرسکتا تھا اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال نہیں کرسکتا تھا۔ ہمارے یقین اور اعتماد کا رشتہ ایک ایسی دیوار تھا جس پر وہ اپنی تمام قوت کے ساتھ ساری عمر حملے کرتا رہتا تو ایک دن خود ختم ہوجاتا مگر دیوار پر خراش تک نہ آتی۔

اب دیکھنا یہ تھا کہ دلاور کے پاس مجھے حیران کرنے کے لیے کیا ہے۔ وہ بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر کون سی نئی پیشکش کرتا

ہے۔ وہ سودا کرنا چاہتا ہے تو کیوں اور کن بنیادوں پر۔ اور اس نے کھیل ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو کیا سوچ کے ایسا کیا ہے۔ میں اب پہلے کے مقابلے میں زیادہ پُرسکون تھا اور آہستہ آہستہ خود کو آنے والے حالات کے لیے تیار کرچکا تھا۔ مجھے یہ بات بھی بعید از امکان دکھائی نہ دیتی تھی کہ وہ باری باری رابعہ کو' نازو کو' غالب اور کاجل کو' محسن اور گل کو اور ان سب کو میرے سامنے لائے جو میرا ساتھ دینے کی پاداش میں آج تک آلام و مصائب کا شکار رہے تھے۔ ان سب نے بہت دُکھ جھیلے تھے' تشدد برداشت کیا تھا اور وفاداری کے رشتے کی آبرو پر اپنا سب کچھ قربان کردیا تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ وہ ان کو میرے سامنے اذیت دے کر ہلاک کرتا جائے۔ میرا حوصلہ آزمانے کے لیے' میری برداشت کی طاقت کا امتحان لینے کے لیے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ میرے اعصاب نے گردشِ حالات کا اثر کس حد تک قبول کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ لوہا بھٹی میں تپ کے فولاد ہوجاتا ہے مگر گوشت پوست کے انسان کے اعصاب فولادی نہیں ہوتے۔ مسلسل تلخیٔ ایام' تلخیٔ اوقات' پیہم جبر و تشدد' شب و روز کا ذہنی و جسمانی عذاب اور اذیت' انتہائی مضبوط قوتِ ارادی رکھنے والے ناقابلِ شکست انسان کو بھی اندر باہر سے توڑ پھوڑ دیتے ہیں۔ وہ مقابلے کی سکت سے محروم ہوجاتا ہے اور ذہنی ناامیدی سے مغلوب ہوجائے تو آزمائش کے نام سے بھی خوف کھاتا ہے۔

ابھی میں نے حوصلے میں کوئی کمی محسوس نہیں کی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں ایک بار پھر اس اعصاب شکن دورِ استبداد سے گزر سکتا ہوں جو لندن سے میری آمد کے ساتھ شروع ہوا تھا اور میرے مشرقی پاکستان سے لوٹ آنے کے بعد بھی اختتام پذیر نہیں ہوا تھا لیکن مجھے کچھ اندازہ ہونے لگا تھا کہ سب کی کیفیت ایک سی نہیں ہے۔ ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ انسان کسی فیکٹری سے بنی ہوئی مشین نہیں ہوتا کہ ایک ہی ڈیزائن اور ماڈل کے ہزاروں لاکھوں نمونوں کی کارکردگی میں سرِمو فرق نہ ہو۔ رابعہ نے سب سے پہلے حالات کے دباؤ کا اثر قبول کیا تھا اور مکمل نروس بریک ڈاؤن سے پہلے ہی پیچھے ہٹ گئی تھی۔ محسن کا نروس بریک ڈاؤن ہوچکا تھا۔ کاجل کے اعصاب تقریباً منتشر ہوچکے تھے۔ صرف غالب اور نازو نے ابھی تک نفسیاتی دباؤ کو قبول نہیں کیا تھا۔

جب تک جنگ جاری تھی' میں ذہنی طور پر صدمہ جھیلنے کے لیے ہر وقت تیار تھا مگر کیا اب بھی یہ ممکن ہوگا کہ میں وہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں جس کا تصور بھی مجھ پر لرزہ طاری کردیتا تھا؟ کیا میں رابعہ کے ساتھ انسانیت سوز درندگی کے کسی مظاہرے پر خاموش رہ سکوں گا؟ محسن' غالب یا نازو کو تشدد سے ہلاک ہوتا دیکھ کے بھی میرے ارادوں کی استقامت باقی رہے گی؟ اگر اس نے ایک ایک کو میرے سامنے تھوڑا تھوڑا کرکے قتل کیا تب بھی میں اپنے اصولوں پر ڈٹا رہوں گا اور ان سب کو گنوا دینے کے بعد

امریکی مزاح نگار رول راجرز نے کہا ہے کہ صرف ایک چیز فلم انڈسٹری کو مار سکتی ہے اور وہ ہے تعلیم۔ اس لیے ہمیں تسلی ہے کہ پوری دنیا کی فلم انڈسٹری بھی مرگئی تو ہماری پھر بھی زندہ رہے گی۔

ڈاکٹر یونس بٹ کی کتاب "افراتفریح" سے

بھی اپنے نظریات پر قائم رہوں گا؟ نقصان کچھ بھی ہو' میں دلاور سے کوئی سمجھوتہ نہیں کروں گا اور کسی قیمت پر بھی اپنے ضمیر کا سودا نہیں کروں گا؟

ان سب سوالات کا جواب میرے ذہن میں بہت واضح تھا۔ نہیں' میں آخری انتہا سے بہت پہلے ہی ہار مان لوں گا۔ اگر دلاور مجھ سے اور صرف مجھ سے کہے کہ اپنے سکندرِ اعظم' میں تم کو دس سیکنڈ دیتا ہوں' مجھ سے میری شرائط پر صلح کرلو ورنہ مرنے کے لیے تیار ہوجاؤ تو میں بے خوفی سے مسکراتے ہوئے کہہ سکتا ہوں کہ دس سیکنڈ کیوں ضائع کرتے ہو دلاور' پانچ سیکنڈ میں اپنا ریوالور مجھ پر خالی کردو۔ لیکن خود زندہ رہتے ہوئے اپنے سب دوستوں' ساتھیوں کو پُرعذاب موت سے ہمکنار کرنا میرے لیے ناممکن تھا۔ میں جانتا تھا کہ بلند بانگ دعوے کرنا اور بات ہے' عملاً ان پر پورا اترنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ وہ جو کروڑوں میں ایک' صدیوں بعد منصور یا حسینؑ ہوتے ہیں وہ میرے جیسے عام انسان نہیں ہوتے۔ انہیں صبر و رضا کے ساتھ ظلم و استبداد کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت کے علاوہ عفو و درگزر کی الہامی صفات عام انسانوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ میرا شمار ان میں نہ تھا۔

یہی وجہ تھی کہ جب محافظوں کے ساتھ میں اس کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں پہنچا تو میرے ذہن میں کوئی انتشار نہ تھا۔ میں کسی کنفیوژن کا شکار نہ تھا اور میری قوتِ فیصلہ ہر قسم کی صورتِ حالات سے نمٹنے کے لیے تیار تھی۔ اس ملاقات سے مجھے دوسری جنگِ عظیم میں جاپان کی شکست کے بعد شہنشاہ اور امریکی جنرل کی ملاقات یاد آئی جو ایک بحری جہاز پر ہوئی تھی۔ میں نے اس کی فلم دیکھی تھی۔ فاتح جنرل اپنے مصنوعی غرورِ فتح مندی کے باوجود شہنشاہ کے وقار اور حوصلے کو شکست نہ دے سکا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ جاپانیوں نے ثابت کردیا تھا کہ وہ ہار کے بھی ہارے نہیں تھے۔ آج پھر امریکا ہی ان کا دستِ نگر تھا۔

کوٹھی میں مکمل خاموشی تھی۔ یہ آسیب زدہ ویرانی کا تاثر میرے احساس کے سناٹے نے پیدا ہوا تھا یا دلاور نے عمداً خوف کی فضا کو مجھ پر مسلط رکھنے کے لیے اس کا اہتمام کیا تھا؟ یہ طے کرنا مشکل تھا۔ میں نے بے خیالی میں ان سب اشیا کو دیکھا جو سیج ہال میں دنیا بھر سے لا کے اکٹھی کردی گئی تھیں۔ نوادرات' آرائشی

ظروف، مصوری کے نمونے، کرسٹل کے فانوس اور لیمپ، قالین اور صوفے جو ہنرمندوں کی دستکاری کا شہکار تھے۔ معلوم نہیں یہ کوٹھی کس کی تھی اور دلاور کے استعمال میں کیوں تھی۔ جب دولت گھر کی باندی ہو تو ساری دنیا خود اپنی ہو جاتی ہے۔ ہر ملک اور ہر شہر میں ہر کوٹھی، اسباب عیش، سامانِ نشاط، آرٹ اور ثقافت کے نمونے، مونا لیزا کی مسکراہٹ سے خود مونا لیزا تک سب انہی کو ملتا ہے جو قوتِ خرید رکھتے ہیں۔

دلاور اچانک اندر آیا اور میرے سامنے پہنچ کے رک گیا "مجھے کچھ ایسا لگتا ہے کہ تم کچھ سیانے ہو گئے ہو۔"

میں نے کہا "ہاں، جب تم دولت سمیٹنے میں مصروف تھے تو میں تجربہ حاصل کر رہا تھا جو عقل کی کسوٹی ہے۔"

"دولت کیا عقل کے بغیر ہی حاصل ہو جاتی ہے؟" وہ ہنسا "بھئی میں تو پہلی بار دیکھ رہا ہوں کہ تم آتش فشاں نہیں بنے ہوئے ہو اور نہ چارلی چپلن بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ ہیں جی۔ بھول گئے ہو ساری مسخری، ورنہ تم اور وہ تمہارا جوڑی دار، کیا نام تھا اس کا، شیروانی۔ بڑا ہنساتے تھے مل کے۔"

میں نے کہا "ہم نے مل کے رُلایا بھی بہت تھا تم کو۔"

"کچھ پتا ہے اس کا، آج کل کہاں ہے، کیا کر رہا ہے۔ ہم نے تو سنا تھا ڈاکے ڈال رہا ہے کسی نئی لڑکی کے ساتھ مل کے۔ وہ پہلے بھی ڈاکو تھی۔ اپنی لائن پر لگا لیا اس نے تمہارے یار کو۔ پہلی بیوی کے مرنے کے بعد پاگل ہو گیا تھا نا، اس کا اثر ہے شاید۔ وہ بھی کون سی شریف زادی تھی۔ کسی کلب میں ڈانسر تھی شاید۔ اور کرمین تھی، بھائی جواری تھا۔"

میں سمجھ گیا تھا کہ ان باتوں کا مقصد مجھے اشتعال دلانا ہے اور غالباً وہ میرے ظاہری پُرسکون رویے سے کچھ پریشان ہے۔

میں نے کہا "بولتے رہو، میں سن رہا ہوں۔ تمہیں اجازت ہے کہ رابعہ پر تبصرہ کرو یا اس کے کردار پر۔ غالب اور نازو کے بارے میں انکشافات کرو۔ تم جو چاہو کہو۔ یہ تمہارا گھر ہے۔"

اٹھارہ بیس سال کی ایک لڑکی چائے کی ٹرالی کو بڑی نزاکت سے دھکیل کر لائی۔ اس کی صورت، اطوار اور لباس سب اس کے بنگالی ہونے کی چغلی کھاتے تھے۔ اپنے سانولے رنگ کے باوجود وہ بے حد دلکش تھی اور اس کا گدرایا ہوا بدن ہر پہلو سے دعوتِ نظارہ دیتا تھا۔ اس کے کھلے بال کمر سے نیچے تک پہنچتے تھے۔

"جیسے تم کابل کو ترس کھا کے اپنے ساتھ لے آئے ہو۔" دلاور نے طنز سے کہا "ایسے ہی یہ میرے ساتھ آ گئی ہے۔ اچھی چیز ہے نا؟"

میں اس گالی کو پی گیا "بس ایک ہی پیس لائے ہو۔ مال تو بہت تھا وہاں اور تمہارے پاس پیسہ کم نہیں تھا۔"

دلاور کے چہرے پر تاریک سایہ سا آ کے گزر گیا۔ میں نے بات کا جواب بات سے دیا تھا مگر غالباً میری بات میں سچ کی کڑواہٹ شامل ہو گئی تھی۔ دلاور کی بات میں جھوٹ تھا جو مجھے ناگوار نہیں گزرا تھا مگر اچانک اس نے اپنے ردِعمل سے اعتراف کر لیا تھا کہ وہ خانہ جنگی کے حالات سے ایک فائدہ حاصل کرنا نہیں بھولا تھا۔ شاید وہ ایسی بہت سی بھولی بھالی نوجوان لڑکیوں کو تحفظ اور عافیت کا جھانسا دے کر خرید لایا تھا جن کو وہ اپنے ناجائز مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنا سکتا تھا۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ یہاں وہ بے آسرا لڑکیوں کی خانہ آبادی کے کارِ خیر سے شہرت بھی پا سکتا تھا اور انہیں اپنی ضرورت کے لیے سکہ رائج الوقت کے طور پر بھی استعمال کر سکتا تھا۔ اس جیسے ضمیر فروش کاغذ کے نوٹ اور عورت کے جسم کو رشوت میں دیتے یا لیتے وقت کسی خلش سے دوچار نہیں ہوتے۔

ذرا سی دیر کے لیے میرے لہو کی حرارت بڑھی اور میں نے سوچا کہ دلاور کی گردن دبوچ لوں اور اس سے پوچھوں کہ دنیا کے سب شیطانی دھندے کیا کم منافع بخش تھے کہ وہ بردہ فروش بھی بن گیا۔ کیا اسے بالکل خیال نہیں آتا کہ آج نہیں تو کل اس کی بیٹیاں ایسی ہی ہوں گی۔ بے گھر ہونے والی لڑکی کیا بے آبرو ہو جاتی ہے اور وہ بھی اپنے ہم وطن اور ہم مذہب لوگوں کے سامنے جو دولت سے انہیں گھر نہیں دیتے بلکہ بازار بنا دیتے ہیں۔ مگر میں نے خود کو یاد دلایا کہ میرا لائحہ عمل کسی جذباتی ردِعمل کا نتیجہ ہو گا تو میں عقل کے سارے فوائد سے محروم ہو جاؤں گا۔

وہ لڑکی چلی گئی تو میں نے ایک گہری سانس لے کر چائے کا کپ اٹھا لیا "مجھے امید ہے تم نے اس میں زہر نہیں ملایا ہو گا۔"

چوہدری دلاور کے ماتھے کی شکنوں میں کمی آ گئی "اگر تمہیں مارنا ہی میرا مقصد ہوتا اپنے سکندر صاحب، تو اپنے ایمان سے کہو، کیا یہ کوئی مشکل کام تھا؟ ہیں جی۔ ایک بندے کے لیے ایک گولی بہت ہوتی ہے اور گولی چلانے والے تو کرائے پر ملتے ہیں۔ لیکن تم کو میں نے ہمیشہ ایک بچہ سمجھا۔ ایک بگڑا ہوا، روٹھا ہوا، سرکش اور باغی بچہ۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض اوقات مجھے غصے میں خیال نہیں رہتا تھا کہ تمہاری اور میری عمر میں بہت فرق ہے۔ تم وزیر خاں کے بیٹے ہو اور میں وزیر خاں کا ساتھی تھا۔ بے شک میں نے اس کے ساتھ جو بھی کیا، غلط تھا۔ اسے تم میرا گناہ یا میرا جرم جو چاہو سمجھو، تمہیں یہ حق حاصل ہے کہ مجھ سے انتقام لو۔ میں نے تمہارے والد کے ساتھ ظلم کیا، تم مجھ پر ظلم کرو۔"

میں نے محسوس کیا کہ ایسی باتوں سے میری قوتِ برداشت کسی بھی لمحے جواب دے سکتی ہے "کیا تم مطلب کی بات نہیں کر سکتے؟"

"ہاں، مطلب کی بات کے لیے ہی یہ اعتراف کر رہا ہوں میں تمہارے سامنے کہ میں مجرم ہوں تمہارا۔ بہت پہلے بھی میں نے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہا تھا، میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھا، جس سے تمہارے جذبات کی آتش فشانی ختم ہو سکے۔ لیکن تم انتقام کے راستے پر نکل گئے اور معاملات اس حد تک بگڑ گئے کہ

میں اور تم دشمن بن کے ایک دوسرے کے مقابل آ گئے۔ حالانکہ میری اور تمہاری کیا دشمنی۔ میں کچھ ہی کم تھا عمر میں وزیر خاں سے۔ تم سے عمر میں بہت بڑا ہوں۔ میں، میر شرافت علی اور وزیر خاں، ہم ساتھی تھے۔ جیسے تم، محسن اور غالب ساتھی ہو۔"

"بکواس بند کرو اپنی" میں نے چلّا کے کہا "کس منہ سے تم ایسا کہتے ہو دلاور۔ تم قاتل ہو میرے باپ کے۔ میر شرافت علی کے۔ اور تم آج موازنہ کرتے ہو اپنی ذلالت کا۔ ہماری رفاقت سے۔ تمہارے ہاتھ اپنے ساتھیوں کے خون سے داغدار ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے لیے جان کا نذرانہ دینا دوستی کا بہت معمولی حق سمجھتے ہیں۔"

"سنو، تحمل سے میری بات سنو اپنے سکندر اعظم صاحب۔" دلاور نے ماتھے پر ہاتھ پھیر کے ٹہلتے ہوئے کہا "میں کوئی دعوے نہیں کررہا ہوں۔ میں آج ایک سال کے بعد خود کو تمہاری عدالت میں خود پیش کررہا ہوں۔"

"بہت خوب عدالت ہے یہ جہاں مجھے سزائے موت پانے والے مجرم کی طرح لاکے بٹھادیا گیا ہے۔ میرے چاروں طرف تمہارے زرخرید قاتل ہیں جن کی بندوق کی نالیوں کا رخ میرے سینے کی طرف ہے اور یہاں تم کہتے ہو کہ منصف بن کے میں تمہیں سزا دوں۔ اچھا مذاق ہے یہ۔ کیا تم تصور کرسکتے ہو کہ تختۂ دار پر کھڑے ہوئے مجرم سے کوئی جج کہے کہ تم بے گناہ ہو تو یہ پھندا میرے گلے میں ڈال دو۔"

"سکندر! میں تم سے پھر بات کروں گا، جب تم سمجھنے کے قابل ہوجاؤ گے کہ ان حالات میں میرا اعتراف جرم کوئی ڈراما نہیں تھا، ایک حقیقت تھی۔ صورت حال پر غور کرو گے تو خود ہی سمجھ لو گے کہ میں کسی طرح بھی مجبور نہیں، مجبور تم ہو۔ تم اکیلے ہو اور تائید غیبی کے کسی معجزے کی امید بھی تمہارے کام نہیں آسکتی۔ میں اپنے طریقے آزمانا بھی نہیں چاہتا ورنہ آج نہ سہی، ایک ہفتے یا ایک مہینے بعد تم کسی مرنے والے کتے کی طرح اپنے آپ کو گھسیٹ کر میرے قدموں تک لاؤ گے اور میرے جوتوں پر ناک رگڑ کے رحم مانگو گے یا روٹی کا ایک ٹکڑا۔ اور کیا پتا رابعہ بھی کتیا کی طرح میرا دوسرا بوٹ پہلے سے چاٹ رہی ہو۔ اور نہ جانے کتنے کتے اس کے جسم پر......"

میں پھر بھول گیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے پُرسکون رہ کے دلاور سے بات چیت کے ذریعے مسائل کو حل کرنے کا عہد کیا تھا۔ میرے دماغ میں ایک شعلہ سا بھڑکا اور دوسرے لمحے میں نے کسی وحشی درندے کی طرح چلّاتے ہوئے اس پر حملہ کردیا۔ یہ ثبوت تھا اس بات کا کہ میرے اعصاب معمولی سی اشتعال انگیزی کے بھی متحمل نہیں ہوسکتے۔ میرا خود اپنے آپ پر کنٹرول نہیں رہا۔

نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ اس سے پہلے کہ میں دلاور تک پہنچتا، کسی نے پیچھے سے رسّی کا پھندا سا بنا کے پھینکا۔ بالکل اسی طرح جیسے امریکن کاؤبوائے گھوڑے پر بیٹھ کے کسی فرار ہونے والے بچھڑے کو گرفتار کرنے کے لیے پھینکتے ہیں اور رسا کھینچتے ہیں تو سرکش جانور بے قابو ہوکے گر جاتا ہے۔

رسّی نے مجھے ایک جھٹکے سے روک لیا اور حلقہ میری گردن میں تنگ ہوا تو میں واپس صوفے پر گرا اور میری سانس رک گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آگیا لیکن میں نے بے حس ہونے سے پہلے پوری جدوجہد کی اور اپنے ہاتھوں سے رسّی کا پھندا گردن سے نکال دیا۔ سانس آتے ہی میں پھر اٹھا۔ اس بار پیچھے سے میرے سر پر ڈنڈا مارا گیا۔ صوفے کے پیچھے کوئی نہ جانے کب سے موجود تھا لیکن مجھے معلوم نہ تھا۔

دلاور ہاتھ پیچھے باندھے کھڑا رہا تھا، اسے معلوم تھا کہ وہ محفوظ ہے اور اس کے محافظ مستعد ہیں۔ سر کی چوٹ نے مجھے ایک دم ناک آؤٹ کردیا۔ ہوش آنے پر میں نے خود کو دوسرے کمرے میں پایا۔ یہ ایک آرام دہ بیڈ روم تھا جس میں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ سر کی بھاری چٹان کو اوپر اٹھایا اور ہاتھ بڑھا کے بیڈ سائڈ پر رکھے ہوئے جگ سے منہ لگا کے پانی پیا۔ اس سے میری طبیعت بحال ہونے میں مدد ملی۔ جگ رکھتے ہوئے مجھے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر اسپرین کی گولیاں نظر آئیں۔ اس "حسنِ انتظام" پر دل ہی دل میں دلاور کو گالیاں دیتے ہوئے میں نے تین گولیاں نگل لیں اور آدھا جگ خالی کردیا۔ تھوڑا سا پانی میرے کپڑوں پر اور بستر پر بھی گرا تھا۔ قالین کے خراب ہونے کی پروا کیے بغیر میں نے جگ کے باقی پانی سے منہ پر چھپکے مارے اور پھر آنکھیں بند کرکے لیٹ گیا۔

دس منٹ بعد میری طبیعت سردرد میں نمایاں کمی سے مزید بہتر ہوئی تو میں بستر سے اُترا۔ کمرے میں دائیں بائیں دو دروازے تھے مگر وہ مقفل تھے۔ تیسرا دروازہ باتھ روم کا تھا۔ میں نے کھڑکی کے پردے ہٹائے تو باہر کا اُجلا منظر میرے سامنے پھیل گیا۔ میں اس کوٹھی کی اوپر والی منزل پر تھا اور لوہے کی جالی سے ایک سرسبز لان کو دیکھ سکتا تھا۔ لان پر قدرت قلابازیاں کھارہی تھی اور اس سے کچھ فاصلے پر کاجل اداس بیٹھی تھی۔

میں نے چلّا کے کہا "کاجل، قدرت......؟!"

لیکن یہ کھڑکی ایک کاریڈور میں کھلتی تھی۔ جس میں لمبائی کے رُخ چھ سات فٹ چوڑا اور دس فٹ لمبا شیشہ نصب تھا اور میری آواز اس شیشے کی دیوار سے گزر کے لان تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ کاریڈور کی چوڑائی دس فٹ سے زیادہ ہی تھی اور کمرے میں ایسی کوئی چیز نہ تھی جو میں شیشے پر مارتا تو شیشہ ٹوٹ جاتا۔ میں نے گرل کی مضبوطی کا اندازہ کیا۔ اسے اکھاڑنا یا توڑنا ممکن نہیں تھا۔ مجھے خیال آیا کہ میں بیڈ کو توڑ دوں اور اس کی پٹی سے شیشے پر وار کروں مگر ایک تو پٹی صرف چھ فٹ کی تھی اور شیشہ کم سے کم دس فٹ دور تھا۔ پھر گرل کے خانے چھوٹے تھے اور پٹی اس میں سے نہیں گزر

سکتی تھی۔ پیتل کی ایش ٹرے، پیتل کا گلدان بے مصرف تھے۔

میں نے کرسی توڑنے کا فیصلہ کیا اور کسی خاص دشواری کے بغیر اسے دیوار پر مار کے اس کے بازو اور ٹانگیں الگ کر دیے۔ میں کامیاب رہا مگر مجھے اس وقت سخت مایوسی ہوئی جب لکڑی کے یہ ٹکڑے میں نے گرل سے گزار کے شیشے پر مارے تو شیشے کو کچھ بھی نہیں ہوا۔ لکڑی کے ٹکڑے اس سے ٹکرا کے کاریڈور میں گر گئے۔ ظاہر ہے چھ سات فٹ چوڑا اور آٹھ دس فٹ لمبا شیشہ جو دیوار میں نصب تھا کوئی عام شیشہ نہیں تھا۔

میں نے بے بسی سے قدرت کو دیکھا وہ لان پر گول گول گھوم رہی تھی۔ پھر نیچے کسی دروازے سے رابعہ برآمد ہوئی اور اس نے کاجل کو بلا لیا۔ میرا چیخنا چلانا بے کار تھا۔ میری آواز ان کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ میں غور سے ان کی صورتوں کو دیکھتا رہا۔ وہ اُداس اور متفکر ضرور نظر آتی تھیں مگر جسمانی طور پر مستعد اور صحت مند تھیں۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کوٹھی میں وہ آرام سے ہیں اور ان کے ساتھ کسی قسم کا تشدد آمیز سلوک نہیں ہوا۔ تاہم ان کی یہاں موجودگی مجھے خطرات اور تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔ ہم سب ایک دوسرے کی کمزوری تھے اور دلاور کو کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا فن آتا تھا۔

میں کھڑکی سے ہٹنے ہی والا تھا کہ لان پر عامر نمودار ہوا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنی مرضی سے وہاں نہیں آیا ہے۔ وہ چند قدم چل کے رُکا اور پھر پلٹ کے دیکھنے لگا۔ شاید کسی نے اسے اور آگے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ پھر چند قدم چلا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کی صورت پر ناگواری کے ساتھ مجبوری کی تحریر کو میں اتنے فاصلے سے بھی پڑھ سکتا تھا۔

"غور سے دیکھتے رہو اپنے سکندرِ اعظم صاحب۔"

یہ آواز کمرے کے اندر سے سنائی دی تو میں اچھل پڑا مگر میں نے پلٹ کے دیکھا تو بات کرنے والا نظر نہ آیا۔

"یہ بہت سرکش اور باغی لڑکا ہے۔ اور احسان فراموش بھی۔" چوہدری دلاور نہ جانے کہاں تھا مگر اس کی آواز چھت میں نصب اسپیکر سے صاف سنائی دے رہی تھی "اگر یہ تعاون نہ کرتا تو ہم اتنی آسانی سے تمہارے میزبانوں کو یہاں نہیں لا سکتے تھے۔ اسی نے ہمیں بتایا کہ رابعہ اور کاجل کہاں ہیں۔"

میں نے کہا "کیا تم میری آواز سن سکتے ہو؟"

"ہاں۔ میں تمہیں دیکھ بھی رہا ہوں خیر سے۔ اور ابھی جب تم کرسی توڑ رہے تھے تو میرا خیال تھا کہ تمہیں منع کر دوں۔ پھر میں نے سوچا کہ چلو تم بھی تھوڑا سا غصہ نکال لو۔ ایک کرسی کا کیا ہے۔"

میں نے کہا "یہی لڑکا تمہیں ناصر پور لے گیا تھا؟"

"مجھے نہیں، وہ میرے آدمی تھے۔ اس لڑکے نے لالچ میں ان کی مدد کی۔" دلاور بولا "اس نے کہا کہ ایک شرط پر میں رابعہ کو بھی لا سکتا ہوں اور کاجل کو بھی۔ اُلّو کا پٹھا! اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کوئی شرط لگانے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ اسے پیسے کی ضرورت تھی اور میں نے کہا تھا کہ اسے دے دیتا دو چار لاکھ۔ مگر اس کے دماغ میں کچھ اور تھا۔ اس نے کہا کہ مجھے پیسہ نہیں چاہیے۔ اس گھر میں ایک پاگل اور معذور لڑکی رہتی ہے، اس کو ٹھکانے لگا دو۔"

میرے منہ سے بے اختیار ایک غلیظ گالی نکلی "نمک حرام! وہ

آصف علی کی ساری دولت حاصل کرنے کا خواب دیکھ رہا ہو گا۔ کوئی ذمے داری قبول کیے بغیر۔"

"ہاں جی۔ اس نے کہا تھا کہ بعد میں آصف علی اور اس کی بڑھیا سے وہ خود نمٹ لے گا۔"

"میں خود نمٹ لوں گا اس حرام زادے سے۔"

"کیا تم چاہتے ہو اسے سزا دی جائے؟" دلاور بولا۔

"میں چاہتا ہوں اسے عبرت ناک سزا دی جائے۔" میں نے کہا۔

"اچھا جی پھر دیکھو تماشا' اپنے سکندرِ اعظم صاحب۔"

میں نے پلٹ کے کھڑکی سے جھانکا۔ عامر اب بھی وہیں کھڑا ہوا تھا اور سخت برہم نظر آتا تھا۔ وہ نہ جانے کس سے ہاتھ ہلا کے مخاطب تھا' اچانک وہ واپس ہوا اور لان عبور کر کے اسی سمت میں آیا جدھر شاید دروازہ تھا۔ کاجل اور رابعہ بھی ادھر ہی سے آئی تھیں مگر میں عین نیچے کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ دس فٹ کے کاریڈور کی چوڑائی درمیان میں حائل تھی اور میری نظر شیشے سے دکھائی دینے والے منظر تک محدود ہو کے رہ گئی تھی۔

مجھے عامر سے سخت نفرت تھی اور میں واقعی چاہتا تھا کہ اس محسن کش' ننگِ انسانیت شخص کو سزا دے کر درسِ عبرت بنا دوں مگر دلاور کی بات نے مجھے پریشان کر دیا۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ آخر دلاور کو مجھ سے یہ سوال کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں اپنا کام خود بھی کر سکتا تھا۔

اس کا جواب مجھے فوراً ہی مل گیا۔ عامر آگے بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ پھر وہ خوف زدہ ہو کے پلٹا اور چند قدم دوڑا۔ لان کے تین طرف قدِ آدم جھاڑیاں کسی سرسبز دیوار کی طرح استادہ تھیں۔ اینٹوں کی دیوار ان کے پیچھے مکمل طور پر چھپ گئی تھی۔ چوتھی سمت میں شاید وہ راستہ تھا جس سے کوٹھی کے رہنے والے لان پر آتے جاتے ہوں گے۔ اس راستے سے ایک بھیانک شکل کا بُل ڈاگ نمودار ہوا۔ وہ بڑی تیزی سے عامر کی طرف لپکا۔

عامر خود کو بچانے کے لیے بھاگا مگر کتا اس سے زیادہ تیز دوڑ رہا تھا۔ ایک دیوار کے قریب پہنچ کے عامر نے جھاڑیوں پر چڑھنے کی اور دیوار عبور کرنے کی کوشش کی مگر کتے نے ایک جست لگائی اور اسے ٹانگ سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ عامر کی پنڈلی پر کتے نے دانت جما دیے تھے اور عامر یقیناً تکلیف میں تھا۔ دہشت زدہ ہونے کے باوجود اس نے کتے کا مقابلہ کیا۔ نیچے گرتے ہی اس نے تو تھنی پکڑ کے کتے کو جھٹکا دیا اور لات مار کے اس کے خونی دانتوں سے اپنی ٹانگ چھڑا لی۔ وہ اٹھ کے پھر بھاگا مگر کتا اس کے تعاقب میں رہا۔ زخم کے باعث عامر تیز دوڑ ہی نہیں سکتا تھا۔ کتے نے اسے دوبارہ گرا لیا اور اب ان کے درمیان براہِ راست جسمانی برتری کا مقابلہ شروع ہوا۔

میں سانس روک کے اس مقابلے کو دیکھتا رہا جس میں ایک فریق انسان تھا اور دوسرا حیوان مگر وہ بقا کی جنگ میں درندے بن گئے تھے۔ عامر نوجوان آدمی تھا لیکن ایک شکاری بُلڈاگ کے مقابلے میں تو کسی شہ زور کا بس نہیں چلتا۔ کتا اپنے پنجوں کے ساتھ دانت بھی استعمال کر رہا تھا اور عامر صرف ہاتھ۔ کتے کے پنجے بھی گوشت کو اُدھیڑنے اور ٹکڑے کر کے چیرنے پھاڑنے میں تیز تھے۔ نتیجہ یہ کہ عامر لہولہان ہو گیا تھا اور بلا کی طرح چمٹ جانے والے کتے کے مقابلے میں آہستہ آہستہ اس کی مزاحمت کم ہوتی جا رہی تھی۔

میں دیکھ رہا تھا کہ عامر دہشت زدہ ہونے کے باوجود زندگی کے لیے لڑ رہا ہے' مدد کے لیے چیخ رہا ہے مگر اس کی سُننے والے کان بہرے ہو گئے تھے اور جو اس کو بچا سکتے تھے وہ اس خونی تماشے کو بے بسی کے ساتھ دیکھنے پر مجبور تھے۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ عبرتناک سزا سے دلاور کی مُراد کیا ہے ورنہ میں اس سے کچھ بھی نہ کہتا۔ ویسے بھی میں نے جو کہا تھا غصے میں کہا تھا۔ میرے ذہن میں سخت ترین سزا جو عامر کو دی جا سکتی تھی' یہ تھی کہ اس کی کھال میں بُھس بھر دیا جائے۔ محاورے کے مطابق اور اسے پولیس اسٹائل کی مار لگا کے رخصت کر دیا جائے۔ آصف علی اس سے لاتعلق ہو جائے۔

پشیمانی اور احساسِ جُرم میرا عذاب بن گئے تھے۔ دلاور نے وہی کیا تھا جو وہ کرنا چاہتا تھا مگر اس کا سارا الزام مجھ پر آگیا تھا۔ زندہ انسان کو بھوکے کتوں کے سامنے ڈلوانے کی بہیمانہ سزا نہ میں نے سُنی تھی اور نہ بیسویں صدی کے مہذب معاشرے میں ممکن تھی۔ آج کل تو سزائے موت کے لیے پھانسی کا طریقہ بھی ظالمانہ سمجھا جاتا ہے اور الیکٹرک چیئر' گیس چیمبر اور انجکشن سے موت کی نیند سُلانے کا مقصد یہی ہے کہ کم سے کم اذیت کے ساتھ سزائے موت کے فیصلے پر عمل درآمد ہو لیکن یہاں میری نظروں کے سامنے ایک جیتے جاگتے انسان کو ایک کتا اسی طرح شکار کر رہا تھا جیسے جنگل میں بھیڑیا کر سکتا ہے۔

اچانک میں نے عامر کو کتے کے چنگل سے نکلتے دیکھا۔ نہ جانے کیسے اس نے کتے کی گردن توڑ دی تھی۔ دُم توڑنے والا کتا پھڑک رہا تھا اور لہولہان زخموں سے چُور عامر اپنے تار تار لباس اور دریدہ بدن کے ساتھ بھاگ رہا تھا۔ یہ بڑا بھیانک نظارہ تھا۔ میں نے دلاور کی ہدایت کاری میں تیار ہونے والی ایک اور دہشت ناک (HORROR) فلم کے رونگٹے کھڑے کرنے والا حقیقی سین دیکھا تھا جس نے میرے رگوں میں خون کو منجمد کر دیا تھا۔ یہ ایک خاموش فلم تھی۔ میں نے کتے کے غرانے اور عامر کی چلانے کی کوئی آواز نہیں سُنی تھی مگر میرے ذہن میں ان آوازوں کی خیالی بازگشت موجود تھی۔

عامر کو جان بچا کے فرار ہوتا دیکھ کے مجھے دلی طمانیت حاصل ہوئی۔ میں زمانۂ قبل از مسیح کا رومن نہیں تھا جو تربیت یافتہ غلاموں (GLADIATORS) کو شیروں سے لڑاتے تھے اور اگر کبھی سیکڑوں میں سے ایک غلام شیر کو ہلاک کر کے آزادی حاصل

کر لیتا تھا تو وہ مایوس ہو جاتے کہ کھیل میں مزہ نہیں آیا اور شیر جب غلام کو چیر پھاڑ کے رکھ دیتا تھا تو وہ خوشی کے نعرے بلند کرتے تھے۔ یہی تماشا وہ دو غلاموں کو لڑا کر بھی دیکھتے تھے۔ ایک مارا جاتا تھا' دوسرا قتل کر کے آزادی کا انعام پاتا تھا۔ عامر کی جگہ۔ میرا بدترین دشمن خود دلاور یا میرے باپ کا قاتل پیڈرو ہوتا تو زیادہ سے زیادہ میں انہیں اپنے ہاتھ سے گولی مار سکتا تھا۔ اس سے بڑھ کے سفاکی اور بربریت کا مظاہرہ میرے لیے ممکن ہی نہ ہوتا۔

لیکن میرے سامنے جو کچھ ہوا' ایک ایسے شکاری کا کھیل تھا جس کے انسانی وجود میں بیک وقت شیطان کی اور خونی درندے کی روح حلول کر گئی تھی۔ عین اس وقت جب عامر زندگی کی امید میں لان کو عبور کر چکا تھا' ایک اور کتا نمودار ہوا۔ یہ پہلے والے کتے کی نسل کا تھا مگر زیادہ توانا اور خونخوار نظر آتا تھا۔ مایوسی کی جو کیفیت میں نے عامر کے چہرے پر دیکھی' وہ یاد کر کے آج بھی میرا دل کانپ جاتا ہے۔ جب کتے نے اس پر جست لگائی تو عامر کو اپنی بھیانک موت کا یقین آ چکا تھا۔ اس نے مقابلہ کیا مگر اب معاملہ یک طرفہ تھا۔ عامر کا اتنا خون بہہ چکا تھا کہ اس میں کھڑے رہنے کی توانائی بھی قوتِ ارادی کی محتاج تھی۔ تازہ دم کتے نے اسے ذرا سی دیر میں چیر پھاڑ کے رکھ دیا۔

میں نے عامر کی موت کا آخری منظر نہیں دیکھا۔ میں کھڑکی سے ہٹ کے پیچھے آ گیا اور اپنا سر ہاتھوں میں تھام کے بیٹھ گیا۔ دلاور نے یہ سب کچھ مجھے دہشت زدہ کرنے کے لیے کیا تھا۔ اس نے مجھ پر واضح کر دیا تھا کہ زبانی طور پر ہی نہیں' وہ عملاً کسی کو بھی کتوں کے آگے ڈال سکتا ہے۔ وہ شکاری کتے اسی مقصد کے لیے پالے گئے تھے۔ شاید انہیں پہلے سے بھوکا رکھا جاتا تھا۔

ایک خوف ناک سناٹے میں دلاور کی آواز گونجی "خیر سے تم ٹھیک تو ہو نا اپنے سکندرِ اعظم صاحب! بندے کا دل ذرا مضبوط ہونا چاہیے ورنہ اسے عبرتناک سزا دینے کی بات نہیں کرنی چاہیے۔"

میں نے کراہ کے کہا "میں سمجھ گیا تمہاری بات دلاور۔ تم جو کہنا چاہتے تھے...!"

"میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ تم نے ہی خواہش ظاہر کی تھی کہ اس لڑکے کو سزا دی جائے۔ ہیں جی۔"

"میں وہ بات بھی سمجھ گیا جو تم نے نہیں کہی۔ تم یہی سلوک میرے ساتھ بھی کر سکتے ہو۔ رابعہ اور کاجل بھی تمہاری قید میں ہیں۔"

وہ ہنسا "ابھی تو سکندر کا پیٹ بھر گیا ہے۔ دو دن کے لیے بہت ہے اس کے کھانے کو۔ افسوس ہے مجھے رابعہ کا۔ لو جی یہ تو میں نے تمہیں بتایا ہی نہیں اپنے سکندرِ اعظم صاحب کہ رابعہ اور سکندر کی جوڑی میں نے کہاں سے حاصل کی تھی۔ یہ جرمن شیپرڈ اور وولف ہیریئر کی مخلوط نسل ہے۔ انتہائی خونی اور وحشی۔ آدم خور تو میں نے

قحط النساء

اورینٹل کالج لاہور میں ایک پارٹی تھی جس میں عورتوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ منظر دیکھ کر ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم سے رہا نہ گیا اور فرمانے لگے۔ "بھئی قحط الرجال تو سننے میں آیا تھا' آج قحط النساء بھی دیکھ لیا۔

بنایا ہے۔ ان کے نام میں نے تمہارے نام پر رکھے تھے۔ اب سکندر کے لیے مجھے دوسری رابعہ کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ تمہارا کیا خیال ہے' تم ایک رابعہ کی جگہ دوسری کو قبول کر لو گے؟"

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ جتنی ذہنی اذیت میں جھیل چکا تھا' اس کے بعد دلاور کی بکواس کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اس کی آواز ضرور سن رہا تھا اور اس کی بات بھی سمجھ رہا تھا مگر سوچ کچھ اور رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میری ایک ایک نقل و حرکت' میری صورت کے تاثرات اور میری ذہنی کیفیت کا ردِ عمل دیکھ رہا ہے۔ اب میری کوشش تھی کہ میں جلد از جلد ذہنی صدمے کی کیفیت پر قابو پا لوں۔ صورت حال کا تقاضا بھی یہی تھا اور مجھے سوچنے سمجھنے کے لیے پُرسکون ذہن کی ضرورت تھی۔

میں نے جگ سے گلاس بھر کے پانی پیا تو میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ کیا میرے اعصاب بالکل جواب دے چکے ہیں؟ یا میں اتنا بزدل اور کم ہمت ہوں؟ چوہدری دلاور جیسے شکاری سے مقابلہ ہو تو کیا مجھے بدترین عذاب کے لیے تیار نہیں رہنا چاہیے؟ میں نے سوچا اور اگر میں چوہدری دلاور کا مقابلہ اسی کی حیوانی سطح پر آ کے نہیں کر سکتا تو پھر مجھے مقابلہ کرنا بھی نہیں چاہیے۔ آدمی کا مقابلہ کتے سے ہو تو یوں نہیں ہوتا جیسے عامر نے کیا۔ ایک زہر آلود بوٹی کتے کا کام تمام کر سکتی ہے۔ بندوق کی ایک گولی شیر کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ طاقت میں آدمی کا مقابلہ آدمی سے تو ممکن ہے' اس دلاور سے نہیں جو چیتے سے زیادہ مکار' بھیڑیے سے زیادہ خونی' سانپ بچھو سے زیادہ زہریلا اور تمام ارواحِ خبیثہ سے بڑھ کر خبیث ہو۔

"کس سوچ میں پڑ گئے ہو اپنے سکندرِ اعظم صاحب! برا مان گئے ہو شاید کہ میں نے کتوں کے نام تمہارے نام پر کیوں رکھے تھے۔ تو بات دراصل یہ ہے...!"

میں نے پُرسکون لہجے میں کہا کہ "نہ تمہیں اپنی ماں کا نام معلوم' نہ باپ کا۔ ورنہ ان کی یاد میں تم انہی کا نام رکھتے۔ خیر چھوڑو' نام میں کیا رکھا ہے۔ اگر میں خود کو دلاور کہنے لگوں یا تم سکندر بن جاؤ تو اس سے کیا فرق پڑے گا۔"

چوہدری دلاور کی آواز آئی "فرق پڑ بھی سکتا ہے۔ اگر تم نے عامر کی جگہ قدرت کو دیکھا ہوتا۔ تمہارے لیے تو دو نام ہیں' عامر اور

قدرت۔ عامر چاہتا تھا کہ قدرت کا وجود حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔ تم ایسے ہی جذبات عامر کے لیے رکھتے تھے۔ تمہاری خواہش میں نے پوری کردی۔"

"تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تم نے وہی کیا جو تم کرنا چاہتے تھے۔" میں نے کہا "اور اس کے بعد بھی تم مجھ سے پوچھ کے کچھ نہیں کرو گے۔ تم مجھے دھمکی دے رہے ہو تاکہ اگلی باری قدرت کی بھی ہوسکتی ہے۔ تم ایسا کیوں کررہے ہو دلاور؟"

"میں چاہتا ہوں کہ بات اب ختم ہو جائے۔ تم حالات کو سمجھتے ہوئے کوئی سمجھوتہ کرلو۔ میں نے تم سے معافی مانگی، تمہیں سارے نقصانات کا ہرجانہ ادا کرنے کا وعدہ کیا، تمہاری ہر شکایت دور کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔ اور بھی کوئی شرط ہے تو مجھے بتاؤ لیکن اس کے بعد کھیل ختم۔"

میں کچھ دیر سوچنے کی اداکاری کرتا رہا "اچھا تم کہتے ہو تو میں بات کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ابھی تک تمہیں اندازہ نہیں کہ میری شرائط کیا ہوں گی اس لیے تم بہت بڑھ بڑھ کے بول رہے ہو۔ میرا حوصلہ تم نے بہت آزمالیا، اب تمہاری باری ہے۔"

"اچھا جی اپنے سکندر اعظم صاحب! میں بھی آپ کو یہ موقع دے کر دیکھتا ہوں۔ کسی کو آزمانا بھی مشکل کام ہے' ہیں جی۔ خیر ابھی حاضر ہوتا ہوں میں۔" دلاور نے کہا۔

لیکن خود آنے کے بجائے اس نے مجھے طلب کرلیا۔ دو افراد نے باہر سے قفل کھولا اور کہا "باہر آجاؤ"

وہ اندر آکے کسی غیر متوقع حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ میرے لیے باہر جاکے بھی انہیں زیر کرنا اور ان کا اسلحہ چھین لینا مشکل نہ تھا مگر میں کوئی رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔ میرا اوّلین مقصد اپنی اور ان سب کی رہائی تھا جو دلاور کی قید میں تھے۔ طاقت کے بل پر یہ کام ناممکن تھا چنانچہ میں نے سیاست سے کام لینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

دلاور اسی کمرے میں تھا اور اس کے لبوں پر وہی پُرفریب مسکراہٹ تھی جو اس کے خیالات اور جذبات کو بڑی خوبی سے چھپا لیتی تھی۔ اگرچہ درمیانی وقفے میں شام بھی ڈھلنے لگی تھی مگر وہاں ہر چیز بالکل ویسی ہی تھی جیسی میں نے آخری بار دیکھی تھی۔ چائے کی ٹرالی بھی موجود تھی اور ایک کپ میں وہ چائے بھی جو میں نے پی نہیں تھی۔ یہ چائے گرم تھی۔ چودھری دلاور نے جادو کی چھڑی ہلا کے وقت کے ایک لمحے کو وہیں روک دیا تھا جہاں سے گفتگو کا سلسلہ ٹوٹا تھا۔

جب میں بیٹھ گیا اور میرے ساتھ آنے والے خاموشی سے باہر چلے گئے تو دلاور نے اٹھ کر ٹہلتے ہوئے کہا "عرض میں یہ کررہا تھا اپنے سکندر اعظم صاحب کہ ایک سال بعد پھر میں تمہارے سامنے ہوں۔ تمہارے مجرم کی حیثیت سے۔ تم بتاؤ کہ میرے خلاف کیا الزامات ہیں — جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا، اب کیا ہوسکتا ہے۔ اس کا فیصلہ بھی تم خود ہی کرو۔"

"میں کیسے یقین کرلوں کہ تمہاری یہ باتیں نیک نیتی پر مبنی ہیں۔" میں نے کہا۔

"بندے کو آزمانا تو چاہیے۔"

"میں جانتا ہوں دلاور کہ تم نہ احمق ہو نہ کوتاہ اندیش۔ تم تو ایک چال چلنے سے پہلے آگے کی دس جوابی چالوں کا حساب کرلیتے ہو اور ذہین دشمن ہی سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ جس کی سادگی میں بھی پُرکاری ہوتی ہے اور سادہ لوحی میں عیاری۔ مگر تم کہتے ہو تو میں مان لیتا ہوں کہ تم واقعی ماضی کی ہر غلطی کا کفارہ ادا کرکے مستقبل کے لیے پُرامن بقائے باہمی کا سمجھوتہ چاہتے ہو۔" میں نے کہا۔

"کیا یہ ہم سب کے حق میں بہتر نہیں ہوگا کہ ہم سمجھوتہ کرلیں اور اپنی توانائی کا بہتر استعمال کریں۔ خواہ وہ کسی بھی سمت میں ہو۔" دلاور بولا۔

"کسی بھی صحیح سمت میں........" میں نے کہا "ماضی کے کھاتے بند کرکے تم آئندہ کے لیے اس سمجھوتے کو غلط کاری کا لائسنس سمجھو گے تو بات نہیں بنے گی۔"

"دیکھو، ہم اپنی اپنی زندگی گزارنے کے لیے کسی دوسرے شخص کے این او سی کے محتاج نہیں ہیں۔" دلاور نے ناگواری سے کہا "نہ میں تمہارے قول و فعل اور اخلاق و کردار کا ذمے دار ہوں اور نہ تم میرے مائے لگتے ہو کہ میرے پیچھے لگے رہو۔ میں غلطی کروں گا تو خود نقصان اُٹھاؤں گا، جرم کروں گا تو پکڑا جاؤں گا۔ گناہ کروں گا تو اللہ میاں کو جواب دوں گا، تم اپنے مستقبل کی فکر کرو۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ بات ان معاملات پر ہوگی جو آج تک اختلاف کا سبب بنے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر وزیر خاں کا معاملہ سب سے پہلے۔"

میں نے کہا "چلو ٹھیک ہے۔ میرا پہلا مطالبہ یہ ہے کہ تم وزیر خاں کے قتل کا اعتراف کرلو اور خود کو قانون کے حوالے کردو۔"

"میں پہلے بھی بتاچکا ہوں کہ اسے میں نے قتل نہیں کیا تھا۔ اس کی موت طبعی تھی۔"

"جھوٹ مت بولو۔ تم نے اس کے حالات کو جینے کے لیے ناقابل بنادیا تھا۔ اسے ہر طرف سے محصور کرلیا تھا اور اس انتہا کو پہنچا دیا تھا جہاں موت کے سوا نجات کی صورت باقی نہیں رہی تھی اور وہ جو تمہارا پارٹنر تھا' لاکھوں کا مالک تھا' وہ مفلسی اور کسمپرسی کے عالم میں بیمار پڑا تو اس کے پاس علاج کے لیے پیسہ تک نہ تھا۔ وہ ایک گھریلو ملازم کی حیثیت سے کام کررہا تھا۔ کون تھا آخر اس کا ذمے دار؟" میں چلانے لگا۔

"میر شرافت علی!" دلاور نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اس کا نام تم اس لیے لے رہے ہو کہ وہ تردید کرنے کے لیے واپس اس دنیا میں نہیں آسکتا۔" میں نے کہا "تم نے اسے بھی قتل

کرادیا تھا۔ اس ڈر سے کہ کہیں وہ تمہارے خلاف گواہ نہ بن جائے۔ تمہارا پول نہ کھول دے۔"

"یہ غلط ہے۔ اسے قتل کرنے والا پیڈرو تھا۔"

"پیڈرو کس کے حکم کا غلام تھا؟"

"میں نے اسے کبھی نہیں کہا تھا کہ میر شرافت علی کو راستے سے ہٹادو۔ یہ کام اس نے خود کیا۔"

"اس کی میر شرافت علی سے کیا دشمنی تھی؟"

"کچھ نہیں۔ اسے موقعہ ملا تھا کہ قتل کے جرم میں تم کو پھنسا دے اور اس نے موقعے سے فائدہ اُٹھالیا۔"

"پھر تم نے اس کی پیٹھ ٹھونکی کہ شاباش' ایک تیر سے دو شکار کرلیے۔ سکندر کو قتل کے کیس میں تختۂ دار کی جانب روانہ کردیا اور میر شرافت علی کو عالم بالا کی طرف۔ نہ وزیر خاں کا وارث رہا نہ تمہارا کوئی پارٹنر۔ تم بلا شرکت غیرے کاروبار پر قابض ہوگئے۔"

"مگر یہ ٹھیک ہے کہ میں نے خود کچھ نہیں کیا تھا۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وزیر خاں کو راستے سے ہٹادوں۔ یہ خیال تھا خود میر شرافت علی کا۔ بس میں نے اس کی مخالفت نہیں کی تھی۔ پھر وہ جو کچھ کرتا رہا تم مجھے اس کی تائید کا قصوروار سمجھ سکتے ہو لیکن اصل مجرم وہی تھا۔"

"کتنی ڈھٹائی سے تم خود کو بے قصور ثابت کررہے ہو۔ کیا ایک جرم میں شریک تمام افراد مجرم نہیں ہوتے۔ قتل کا ارادہ کرنے والا' منصوبے بنانے والا' قتل میں شریک' قتل کے جرم میں معاون اور قتل کو چھپانے والا ایک سے مجرم ہوتے ہیں۔ اگر کوئی قتل ہوتے دیکھتا ہے اور خاموش رہتا ہے تو وہ بھی مجرم ہے۔"

"تم قانونی موشگافی کے چکر میں پڑجاؤ گے تو بات آگے نہیں بڑھے گی۔" دلاور نے برہمی سے کہا "تم کبھی ثابت نہ کرسکو گے کہ قتل کا الزام مجھ پر آتا ہے۔ قانون کی نظر میں تو مجرم تم ہو مگر میں بات کررہا ہوں ان معاملات کی جو قانون کی آنکھ سے اوجھل ہیں۔ میر شرافت علی اصل مجرم ہے جس کے ذہن میں وزیر خاں کو الگ کردینے کا خیال آیا تھا اور جب وزیر خاں شرافت سے اپنا حصہ لے کر الگ ہونے پر رضامند نہیں ہوا تو میر شرافت علی نے ہی کہا تھا کہ ہمارے پاس دوسرے طریقے بھی ہیں۔ خود اس نے مجھے اُکسایا تھا اور دوسرے طریقے بتائے تھے۔"

"اور تم نے کہا تھا ٹھیک ہے' ایسا ہی کرو۔"

"نہیں۔ میں نے کہا تھا کہ میں کچھ نہیں کروں گا۔ تم خود جو چاہو کرو۔" دلاور بولا "اس نے پیڈرو کی خدمات مانگی تھیں اور میں نے پیڈرو کو میر شرافت علی کے حوالے کردیا تھا۔"

"اچھا اگر سب کچھ میر شرافت علی اور استاد پیڈرو نے ہی کیا تھا تو پیڈرو کو میرے حوالے کردو۔ میں خود اس سے حقیقت اُگلوالوں گا۔"

"پیڈرو سے اب میرا کوئی تعلق نہیں۔ مجھے نہیں معلوم وہ

کہاں ہوگا۔" دلاور نے کہا "میں اسے بہت پہلے نکال چکا ہوں۔"

"جھوٹ بکتے ہو تم۔ وہ مسلسل ہمارا تعاقب کررہا ہے اس نے دوبار ہماری جان لینے کی کوشش کی تھی۔ ایک بار آفریدی مارا گیا' دوسری بار ریسٹ ہاؤس کا چوکیدار۔ کس کے حکم پر کررہا تھا وہ یہ کارروائی؟"

"یقین کرو میرا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔"

"تم سے کیسے بات ہوسکتی ہے دلاور۔ تم تو اس سے بھی انکار کروگے کہ رابعہ اور کاجل کے ساتھ آصف علی کے گھر والوں کو اغوا کرانے والے تم نہیں تھے۔" میں نے کہا۔

"نہیں' یہ کام میرا تھا۔ وہ میرے ہی آدمی تھے جو تم سب کو یہاں لائے تھے۔ میں تم سے لاہور میں بات کرلیتا لیکن تم تو لاہور میں ٹھہرے ہی نہیں۔"

"تم چاہتے ہو میں اس بات پر یقین کرلوں کہ پیڈرو تمہاری مرضی کے بغیر ہمارے پیچھے لگا ہوا تھا اور اس نے ہماری جان لینے کی جو ناکام کوشش کی اس کا تمہیں کوئی علم نہیں۔"

"علم تو ہے مگر مجھے نہیں معلوم کہ پیڈرو نے ایسا کیوں کیا۔" دلاور بولا "تم میری قسم پر بھی اعتبار کرنے والے نہیں ہو ورنہ میں حلف اُٹھا سکتا تھا اس بات پر کہ پیڈرو خود میرا ساتھ چھوڑ گیا تھا اور میں نے اسے واپس نہیں بُلایا۔ اسے اندازہ ہوچکا تھا کہ میں بہت جلد اس سے پیچھا چھڑالوں گا۔ ہوسکتا ہے وہ تم سے خطرہ محسوس کرتا ہو کیونکہ تم بھی اسے ہی اپنے والد کا اور میر شرافت علی کا اصل قاتل سمجھتے تھے۔ جب تک اسے میری پشت پناہی حاصل رہی وہ بے خوفی سے سب کچھ کرتا رہا اب اس نے ہمیشہ کے لیے تمہارے خطرے کو ختم کرکے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کا سوچا ہوگا۔"

میں اسے بے یقینی سے دیکھتا رہا "تم واقعی نہیں جانتے کہ پیڈرو کہاں ہے؟"

"وہ... ہے تو پشاور میں۔ شاید واپس چلا گیا ہو لیکن نہ اسے میں نے بھیجا تھا اور نہ اس نے میری مرضی سے کچھ کیا۔ مجھ سے الگ ہونے کے بعد سے وہ روپوش ہے۔ اسے ڈر ہے کہ میں اس کا

قصہ ہی پاک نہ کردوں۔"

"یہ اچانک تمہارے اور پیڈرو کے درمیان اختلافات اتنے سنگین کیوں ہوگئے؟"

"دیکھو سکندر، میرے اور تمہارے درمیان بہت سے اصولی اور نظریاتی اختلافات ہیں۔ تم خود کو شریف زادہ کہتے ہو، میں خود ایسا دعویٰ نہیں کرتا۔ میرے کاروبار کو بھی تم غیر قانونی سمجھتے تھے۔ میرے نزدیک کاروبار صرف کاروبار ہے۔ مجھے اپنی بات ختم کرلینے دو۔ تم مجھے غدار قرار دیتے ہو کیونکہ میں نے وطن دشمنوں کو اسلحہ فراہم کیا لیکن تم سطحی حقیقت کو دیکھ رہے ہو۔ کیا تم جانتے ہو کہ میرے اس کاروبار کو اعلیٰ سرکاری حکام کی سرپرستی حاصل تھی؟ میں ان کا نام نہیں لے سکتا مگر مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا صرف دلاور کی وجہ سے نہیں ہوا۔ یہاں بڑے بڑے ائرکنڈیشنڈ دفتروں میں بیٹھے ہوئے بیوروکریسی کے نمائندوں نے، منافق ملاؤں اور خود غرض سیاست دانوں نے دلاور سے کہیں بڑھ کے اس سازش میں حصہ لیا۔ سازشی عناصر کی حوصلہ افزائی کی۔ انہیں وسائل فراہم کیے اور تحفظ کی پوری ضمانت دی۔ تم ایک چوہدری دلاور کی کیا بات کرتے ہو، یہاں جو ملک کے دو حصوں کے درمیان خلیج کو بڑھا رہے تھے اور انتشار پھیلا رہے تھے۔ خانہ جنگی کے اسباب پیدا کررہے تھے۔ بین الاقوامی سپرپاور کے آلۂ کار بنے ہوئے تھے اور ان سے بھاری رقوم وصول کررہے تھے۔ ان سب کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ ٹھیک ہے، میں نے پیسہ کمایا اور غلط طریقے سے کمایا مگر اس کی راہ مجھے کس نے دکھائی اور کیا تمہیں معلوم ہے اس میں سے کتنا پیسہ انہوں نے وصول کیا۔ جو اصل غدار اور مجرم ہیں مگر ان کے معصوم چہرے پبلک نے نہیں دیکھے۔ کیا یہاں پہلے سے وطن دشمن نہیں تھے جو ہر سال کروڑوں اربوں کا غبن کرتے تھے۔ ٹھیکوں میں اور بوگس بلوں میں۔ کاغذی منصوبوں میں اور ناقص پلاننگ میں۔ ان کو ہدایات باہر سے ملتی تھیں وہ غلط بجٹ بناتے تھے جو غلط اعداد و شمار اور غلط گوشواروں کا گورکھ دھندا ہوتا تھا۔ غیر ملکی آقاؤں کے یہ زرخرید ایجنٹ کون ہیں، کیا تم جانتے ہو انہیں جو اس ملک کی تاریخ میں نفاق اور انتشار کے ذمے دار ہیں جنہوں نے کبھی اس ملک میں سیاسی اور معاشی استحکام نہیں آنے دیا۔ جو وزارتوں اور اسمبلیوں کو توڑتے رہے، کبھی مارشل لا کے نام پر فوج کو استعمال کرتے رہے تو کبھی سیاست کے لیے مذہب کو۔ انہوں نے ملک کو پیچھے دھکیلنے والے ہاتھ مضبوط کیے اور اس کو ترقی کی راہ پر کبھی گامزن ہی نہ ہونے دیا تاکہ ہم مقروض رہیں، محتاج رہیں اور خود کفالت کی منزل کبھی نہ پاسکیں۔ تم دلاور کو مار سکتے ہو مگر ان کو جو ملک کے اصل دشمن ہیں تم پہچانتے ہی نہیں۔ ان کا کچھ بگاڑ سکتے ہو تم؟ میں تمہیں بتاتا ہوں سکندر کہ جس دن تم نے ایک بھی چہرہ شناخت کرنے کی غلطی کی اور اسے بے نقاب کرنا چاہا اسی دن تم غائب ہوجاؤ گے۔ چیونٹی کی طرح مارے جاؤ گے کیونکہ وہ ہاتھی ہیں۔ وہ محاورہ مت دُہرانا کہ چیونٹی ہی ہاتھی کی موت کا سبب بنتی ہے۔ یہ خلائی دور ہے جس میں ہاتھی کے پاس جدید ترین آلات سراغرسانی ہوتے ہیں اور چیونٹی حرکت بھی کرے تو اسے معلوم ہوجاتا ہے۔"

وہ بول رہا تھا اور میں اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ یہ دلاور نہیں کوئی اور تھا۔ اس کا لب و لہجہ اندازِ گفتگو اور خیالات سب مختلف تھے۔ وہ ایک پڑھے لکھے آدمی کی طرح روانی سے بول رہا تھا۔ آج تک وہ جاہلوں کی زبان بولتا رہا تھا اور وہ بھی ایک مخصوص اسٹائل میں۔ میرے لیے یہ فرض کرنا مشکل تھا کہ اتنا عرصہ وہ میرے سامنے اداکاری کرتا رہا اور مصنوعی لہجے میں بات کرتا رہا۔ شاید یہ اس کا نیا بہروپ تھا۔ اس نے اپنی شخصیت کو نئے سانچے میں ڈھالا تھا۔ وہ ایک سیاست دان کی طرح مجھ سے مخاطب تھا اور میں آہستہ آہستہ اس تبدیلی کے اسباب کو سمجھنے لگا تھا۔ عملی سیاست میں قدم رکھنے کے بعد چوہدری دلاور کو اپنے ماضی کے کردار کو یکسر بدل دینا ضروری تھا۔ اس نے پیڈرو سے پیچھا چھڑالیا تھا اور اب وہ مجھ سے تمام معاملات پر مصالحت اور مفاہمت کے لیے تیار تھا۔

موقع پاتے ہی میں نے کہا "چوہدری دلاور۔ میں نے سُنا ہے کہ تم نے سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"تم نے ٹھیک سُنا ہے۔ اس ملک کو نئی قیادت کی ضرورت ہے۔" چوہدری دلاور بولا۔

"اور نئی قیادت فراہم کریں گے تم جیسے لوگ جو کل تک اسمگلر تھے، مجرم اور غدار تھے۔ جرائم کی دنیا سے سیاست کی دنیا میں آکے تو تم بڑے شکاری بن جاؤ گے۔ یہی بات ہے نا؟" میں نے تلخی سے کہا۔

چوہدری دلاور کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے فق ہوا "تم اپنی رائے قائم کرنے کے لیے آزاد ہو۔ مگر کیا میں نے غلط کہا ہے۔ میں نے اپنے ماضی کی کتاب کو بند کردیا ہے اب نہ میرا کسی استاد پیڈرو سے کوئی تعلق ہے نہ کسی حاجی عبداللہ سے۔"

"اس لیے کہ تم ان کے محتاج نہیں رہے۔ تم نے اتنا کالا دھن اکٹھا کرلیا ہے کہ سیاست کے بازار میں اپنی دُکان کھول سکتے ہو۔ اس بزنس میں لاکھوں کی سرمایہ کاری کروڑوں کی ضامن ہوتی ہے۔ کل کو تم اسمبلی کے ممبر یا وزیر بن کے زیادہ اثر و رسوخ کے مالک ہوجاؤ گے۔ قانون سے بالاتر ہوجاؤ گے۔ میرے جیسے لوگ تمہیں سلام کریں گے۔ تمہاری سفارش تلاش کریں گے۔ روٹ پرمٹ کے لیے، امپورٹ لائسنس کے لیے۔ نوکری کے لیے۔"

چوہدری دلاور نے کہا "ہم موضوع سے ہٹ گئے ہیں۔ تم اپنے والد کے قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچانا چاہتے تھے۔ میں استاد پیڈرو کی گرفتاری میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔ اسے تمہارے حوالے بھی کیا جاسکتا ہے۔"

"لیکن تمہیں تو معلوم ہی نہیں کہ وہ کہاں ہے؟"
"وہ کہیں بھی روپوش ہو جائے۔ چوہدری دلاور کی نظر اسے تلاش کر لے گی۔"
"ٹھیک ہے' استاد پیڈرو کو میرے حوالے کرنا تمہاری ذمّے داری ہے۔ اس کے بعد ہی فیصلہ ہوگا کہ میرے والد کے قتل کی ذمّے داری کس کس پر عائد کی جاسکتی ہے۔"
"دوسرا معاملہ ہے اس جائداد کا جس کے تم وارث تھے۔ تو میری آفر اوپن ہے۔" دلاور نے کہا "وہ زمین تمہاری تھی جس پر میروزیر اینڈ کمپنی قائم تھی۔ وہ کمپنی اب نہیں رہی مگر وہاں جو اسپتال تمہارے والد کے نام پر بنا ہے وہ تمہارا ہے۔ میں بورڈ آف ڈائریکٹرز کا ایک رُکن ہوں۔ اس حیثیت سے میرا نام باقی رہے گا۔ چیئرمین تم ہو جاؤ۔"
"میں یہ شرط نامنظور کرتا ہوں۔ تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔"
"ایک دن آئے گا جب تم اس فیصلے پر افسوس کرو گے۔ میری ذات سے تمہیں بہت سے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں مسٹر سکندر بخت۔"
"میں ان سب فوائد پر لعنت بھیجتا ہوں جو مجھے تمہاری ذات سے حاصل ہوں۔ اپنے چوہدری دلاور صاحب۔"
"تمہارے والد کا گھر اپنی جگہ موجود ہے۔ مجھے معلوم ہے اس میں کتنا عرصہ رابعہ تنہا رہی۔ واقعات کی گواہی کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ اس تمام عرصے میں کسی نے رابعہ کی طرف بُری نظر سے بھی نہیں دیکھا۔ تم مانو یا نہ مانو۔ میں خود اس کی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں تھا۔"
میں نے تلخی سے کہا "گویا آج تم میرے محسن بھی ہو گئے؟"
"یہ احسان کی بات نہیں۔ خدانخواستہ رابعہ کو کچھ ہو جاتا تو تمہارا شک خود بخود میری طرف انگشت نمائی کرتا۔"
"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کب رعایت دی تھی تم نے رابعہ کو یا نازو کو۔ شہلا کے ساتھ جو کچھ تم نے کیا۔"
"غلط۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ نہ وہ میرے کہنے پر ہوا۔ وہ تمہارے جانے کے بعد کتنا عرصہ یہاں رہی۔ مسٹر اور مسز ضامن رضوی کے ساتھ۔ کسی نے انہیں کچھ کہا؟"
"یہ الزام دوسروں کو مت دو۔ یہ ثابت مت کرو کہ تم کو کچھ معلوم نہیں تھا اور تم بالکل بے گناہ ہو۔" میں نے چلا کے کہا "وہ تمہارے ہی کرگے تھے' تمہارے احکامات کے تابع تھے اور تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں کرتے تھے۔ تم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ تم اور حاجی عبداللہ' ایس پی سراج اور ڈی سوزا۔"
"اچھا اچھا' چلاؤ مت۔ جو بھی ہوا اس کی ذمّے داری اگر میں قبول کرلوں تو تم کیا کرو گے۔ زیادہ سے زیادہ تم مجھے قتل کرسکتے ہو۔" دلاور نے میز کو لات ماری "یہ لو شوٹ کرو مجھے۔"

معاملہ

ایک سردار جی شدید زخمی حالت میں گھر پہنچے اور اپنی حالت کی توجیہہ کچھ یوں بیان کی۔ "میں ایک جگہ سے گزر رہا تھا کہ لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ میں نے دل میں کہا۔ سردارے' چلو پتا تو کریں کیا معاملہ ہے۔ ابھی میں بھیڑ میں داخل ہوا ہی تھا کہ ایک آدمی نے دھکا دے کر مجھے زمین پر گرا دیا اور مُکّے مارنا شروع کر دیے۔ میں نے سوچا' سردارا' یہ تو کوئی گڑ بڑ معاملہ ہے۔ اتنے میں ایک آدمی نے اینٹ اٹھائی اور میرے سر پر مار دی' دوسرے نے مجھ پر لاٹھیاں برسانا شروع کر دیں۔ میں نے کہا۔ سردارا' بھاگ یہاں سے۔ یہاں تو لڑائی ہو رہی ہے۔"

اس نے اپنی جیب سے ریوالور نکال کر میرے سامنے پھینک دیا۔ ریوالور صوفے پر میرے قریب گرا۔
"اٹھاؤ ریوالور' خالی کردو مجھ پر۔ اگر اس سے تمہارا ہر مسئلہ حل ہو جاتا ہے تو ہمت کرو۔ یہ خالی نہیں ہے۔"
میں نے ریوالور اُٹھالیا "تمہیں شوٹ کرنا واقعی بہت ہی آسان ہوتا۔ اگر میں تمہاری قید میں نہ ہوتا۔ میرے سامنے ڈرامہ مت کرو دلاور۔ صرف حملہ کرنے کی نیت کی تھی میں نے تو تمہارے محافظوں نے میرے گلے میں پھندا ڈال دیا تھا۔ ایک طرف تم اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہو۔ یہ بتانے کے لیے کہ اس بدبخت عامر کی طرح تم کسی کو بھی شکاری کتوں کے سامنے ڈال سکتے ہو۔ ہم سب تمہاری قید میں ہیں۔ تمہیں مار کے کون اپنی جان سلامت لے جاسکتا ہے۔ ہاں میں تمہاری مصالحت کی پیشکش پر اس وقت غور کرسکتا ہوں جب تم اپنی نیک نیتی کا عملی ثبوت دو۔"
"اور کیسے ثبوت دوں آخر؟"
میں نے ریوالور اس کی طرف بڑھایا "سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کہ یہاں میرے علاوہ کس کس کو قید کر رکھا ہے تم نے؟"
"یہ قید خانہ نہیں ہے۔ جب تم ان سے ملو تو پوچھ لینا کہ کیا انہیں یہاں کسی قسم کی تکلیف تھی۔ رابعہ اور کاجل کو شاید یہ بھی احساس نہیں ہوگا کہ وہ قید میں ہیں۔ ابھی تک ان کا اور میرا آمنا سامنا نہیں ہوا۔" چوہدری دلاور بولا۔
"وہ اتنی بے وقوف بھی نہیں ہیں کہ اپنے اغوا کو اور اس اسیری کو مذاق سمجھتی ہوں اور یہ فرض کیے بیٹھی ہوں کہ وہ سرکاری مہمان ہیں۔" میں نے کہا "استاد پیڈرو مسلسل ہمارا پیچھا کررہا تھا

اور ہماری جان کا دشمن ہو رہا تھا۔ وہ تمہارا ساتھی ہے۔ ان کے علم میں ہوگا کہ کس طرح عامر نے ان سب سے دغا کی اور انہیں دھوکے سے پیڈرو کے حوالے کر دیا۔ تمہاری چنڈال چوکڑی کے سوا یہ حرکت کون کر سکتا تھا دلاور۔ رابعہ کو اچھی طرح معلوم ہوگا کہ اس واردات میں تمہارا ہاتھ ہے اور ایسا صرف تمک حرا . . . وجہ سے ممکن ہوا۔"

"عامر کو اس کے کیے کی سزا مل چکی ہے۔"

"کیا یہ سب رابعہ نے نہیں دیکھا ہوگا۔ جو میں نے دیکھا تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ تم درندگی کی کس انتہا تک جا سکتے ہو دلاور۔"

"کیا تمہارے خیال میں عامر کے ساتھ زیادتی کی میں نے؟ وہ اچھا آدمی تھا؟" دلاور نے بگڑ کے کہا "سوچو ذرا اس نے کس کی زندگی کو فروخت کیا تھا۔ اس معذور اور بے بس لڑکی کو وہ صرف دولت کی خاطر قتل کرنا چاہتا تھا۔ وہ دولت جس پر اس کا کوئی حق تھا تو اسی معذور لڑکی قدرت کی وجہ سے۔ جس شخص نے اس لاوارث . . . . کو باپ کی محبت اور شفقت دی۔ اپنا وارث بنایا۔ وہ اسی کے خون کا سودا کر رہا تھا۔ جب مجھے ساری بات معلوم ہوئی تو میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اسے کتے کی موت ماروں گا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ میرے اندر بھی ایک حیوان چھپا ہوا ہے۔ کبھی کبھی وہ مجھ پر غالب آجاتا ہے۔ اگر میں عامر کو بخش دیتا تو کل کسی اور بہانے وہ قدرت کی جان لیتا۔ کسی نہ کسی طرح وہ قدرت کو قتل کر دیتا۔ یا کرا دیتا۔"

"مجھے اس پر اعتراض نہیں کہ تم نے اسے مار دیا۔ مگر تم نے جو طریقہ اختیار کیا..." میں نے نفی میں سر ہلایا "تم صرف مجھے دہشت زدہ کر کے مجھ سے اپنی بات منوانا چاہتے تھے۔ تم نے دھمکی بھی دی تھی کہ رابعہ یا قدرت کا یہی انجام ہو سکتا ہے۔"

"اسے نظرانداز کر دو۔ وہ محض دھمکی تھی اور اس کا نتیجہ ہے کہ تم میری بات سُن رہے ہو اور سمجھ بھی رہے ہو۔ آج نہ سہی اگلی بار جب ہماری ملاقات ہوگی تو بہت سی غلط فہمیاں دور ہو چکی ہوں گی۔ رابعہ کے گھر کی تباہی کا ذمّے دار میں تھا تو میں نے اس سے بہتر ایک عالی شان محل بنا دیا ہے وہاں۔"

"کس کے لیے؟ ایک طوائف زادی چاندنی کے لیے اور ایک بدمعاش گولا ٹنڈو والا کے لیے؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔" دلاور نے کہا "ایک خاص مقصد کے تحت میں نے انہیں اس خوش فہمی میں رکھا کہ وہ اس محل کے مالک ہیں۔ حالانکہ قانونی طور پر یہ ناممکن تھا۔ تمہیں اور رابعہ کو کسی کے خلاف حقِ ملکیت کا دعویٰ دائر کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم جب چاہو اس کا قبضہ لے سکتے ہو۔"

"تمہاری یہ فیاضی مجھے رشوت کی طرح لگتی ہے۔ تم مجھے خریدنا چاہتے ہو دلاور۔ لیکن ایسا ممکن نہیں ہے۔ رابعہ اس زمین پر ایسا گھر خود اپنے پیسے سے بھی بنا سکتی تھی۔ اگر تم کچھ کرنا ہی چاہتے ہو تو بس اتنا کرو کہ اس کی ماں اسے واپس لا دو جس کو تم نے اسپتال میں قتل کرایا تھا۔" میرا خون کھولنے لگا "مجھے بکاؤ مال مت سمجھو دلاور' میں وہ سب نہیں بھول سکتا جو تم نے میرے ساتھ کیا تھا۔ جو انسانیت سوز تشدد میں نے اور رابعہ نے جھیلا۔ تمہارے اشارے پر پولیس نے میرے ساتھ کیا کیا تھا؟"

"وہ سب باتیں پُرانی ہو گئیں۔"

میں نے چیخ کر کہا "تم کہتے ہو میں ان سب باتوں کو بھلا دوں؟ یہ بھی بھول جاؤں کہ تم ہی استاد نیڈی کے قاتل بھی ہو۔ تمہارا دامن ان گنت انسانوں کے خون سے داغدار ہے۔ آج تم اپنے ماضی کا ہر سیاہ نقش مٹانے کے لیے مجھے قائل کرنا چاہتے ہو کہ جو کچھ بھی ہوا تھا اس کے ذمّے دار تم نہیں تھے۔ دوسرے تھے یا تیسرے تھے۔ تم یقین دلانا چاہتے ہو کہ راتوں رات تم بدل گئے ہو۔ انسانی زندگی' انسان کی عزت اور انسانیت کی آبرو کی تجارت کرتے کرتے تم اس ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بننا چاہتے ہو۔ سیاست کے میدان میں اُترے ہو تو تمہاری کتاب زندگی کا ہر ورق کیسے سادہ نظر آئے گا جبکہ اس میں تمہارے کالے کرتوتوں کی سیاہی اور بے گناہوں کے خون کی سُرخی کے سوا کچھ نہیں۔"

"اس وقت تم ذہنی طور پر حالات کی تبدیلی کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہو۔" دلاور نے اُٹھتے ہوئے کہا "فی الحال اتنا ثبوت دے سکتا ہوں میں اپنی نیک نیتی کا جو تمہیں قائل کرے کہ وقت کے ساتھ انسان بدل بھی سکتے ہیں۔ نیچے گاڑی تیار ہے تم لوگ میرے مہمان تھے' قیدی نہیں۔ گاڑی میں چابیاں موجود ہیں۔ تم اس میں کہیں بھی جا سکتے ہو۔"

"مثلاً جیل۔ آدھے راستے میں پولیس ہمیں چوری کی کار چلاتے ہوئے پکڑ لے گی۔"

"مجھے اندازہ تھا کہ تم شک کرو گے۔" وہ بولا "اس لیے گاڑی آج ہی رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ لاہور کے نام ٹرانسفر کر دی گئی ہے۔ تمام قانونی دستاویزات گاڑی میں ہیں۔ اگلی ملاقات میں شاید ہمارے درمیان غلط فہمیاں کم ہوں گی اور ہم بہتر ماحول میں گفتگو کریں گے۔ خدا حافظ۔"

اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ میں اس سے ہاتھ نہیں ملاؤں گا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ دلاور کے ہر عذر بے گناہی کو میں نے مسترد کر دیا تھا۔ کل کا شیطان آج فرشتہ ہونے کا دعویٰ کیسے کر سکتا تھا۔ وہ مجبور ہو گیا تھا کہ ہم سے اپنے گناہ بخشوائے ورنہ ہم اس کے سیاسی مستقبل کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہوں گے۔ اس کا دستِ تعاون بڑھانا پہلی سیاسی چال تھی جس کا مقصد اپنے سب سے خطرناک دشمنوں سے ہر قیمت پر صلح کرنا تھا خواہ اس کے لیے اسے اپنی انا کو بھی قربان کرنا پڑے۔

اس کے جانے کے بعد میں جھنجلاہٹ' کنفیوژن اور غصے میں

Adarts- HRA- 5/92

اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔ مجھے ایک فیصد شبہ نہیں تھا کہ میں نے دلاور کو سمجھنے میں غلطی کی ہوگی۔ یہ سب جھوٹ اور مکروفریب کا وہ ڈرامہ تھا جس پر دلاور نے بہت محنت کی تھی۔ صرف ہمیں قائل کرنے کے لیے کہ کل اور آج کے دلاور میں بہت فرق ہے۔ کل وہ ہمارا دشمن تھا مگر آج دوست ہے۔ وہ اپنی غلطی "گناہ" جرم سب کا کفّارہ ادا کرنے کو تیار ہے اور ہر قیمت پر ہم سے معافی کا خواستگار ہے۔ بھیڑیے نے اب بھیڑ کی کھال اوڑھنے کا فیصلہ کیا تھا تو وہ چاہتا تھا کہ جو لوگ اس کی حقیقت سے آشنا ہیں وہ اس کے ہمنوا نہ ہوں تو خاموش رہ کے تماشا دیکھنے پر تیار ہو جائیں۔ دل ہی دل میں اسے ہزاروں گالیاں دیتے ہوئے میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اس کے اور میرے درمیان دشمنی کا رشتہ باقی رہے گا۔ ایک ذاتی وجہ کو میں نے آج تک نظرانداز کیا تھا کیونکہ میں وسیع تر بنیادوں پر اس کے خلاف محاذ بنا چکا تھا۔ اب میں نے محسوس کیا کہ ایک جنگ ختم ہو جانے سے صورتِ حال نہیں بدلی۔ اب ہم دوسری جنگ میں ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ کل وہ غدار تھا اور آج محبِّ وطن ہونے کی سند حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس ملک کی جڑیں کھوکھلی کر کے اسے دولخت کرنے والا ٹولہ اس ملک کے عوام کی تقدیر کا مالک بننا چاہتا تھا۔ وطن کے دشمن وطن کے رہنما بننے کی سازش کر رہے تھے۔ ہمیں اس سازش کو ناکام بنانا تھا۔

فوری فیصلے سے کسی مثبت نتیجے کی اُمید نہیں کی جا سکتی تھی۔ میں نے اس معاملے کو مشورے کی مہلت تک ملتوی کردیا۔ وقت خود بتادے گا کہ دلاور کے عزائم کیا ہیں اور اس کے جھوٹ سچ کا پردہ چاک ہو جائے گا۔

کمرے میں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ میں نے صوفے کے پیچھے جھانک کر دیکھا اور پردے ہٹا کے دیکھا مگر دلاور کے محافظ بھی پُراسرار طور پر غائب ہو چکے تھے۔

میں ایک دروازے سے باہر آیا تو میرے کانوں نے کاجل کی آواز سُنی۔ وہ رابعہ کو پکار رہی تھی۔

میں نے چلا کے کہا "کاجل، کدھر ہو تم۔"

ایک سیکنڈ کی خاموشی کے بعد دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز آئی اور کاجل نے کہا "بھائی سکندر۔"

دوسرے لمحے وہ باہر کھلنے والے دروازے سے میرے سامنے آگئی۔ اس کے پیچھے رابعہ آئی اور وہ بھی مجھے دیکھ کر اتنی ہی حیران ہوئی۔

کاجل نے کہا "آپ یہاں۔۔۔ میرا مطلب ہے کب آئے؟"

میں نے کہا "اصولاً سوال کرنے کا حق مجھے حاصل ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ہم نے آپ کو ناصر پور بھیجا تھا۔"

رابعہ نے کہا "اور ہم نے آپ کو بھیجا تھا کلیم اللہ کے ساتھ۔ اسے چھوڑ کے واپس آنے میں دو دن لگ گئے۔ آج تیسرا دن ہے۔"

کاجل بولی "تم آصف علی کے ساتھ گئے تھے تو کل تمہیں اس کے ساتھ واپس آنا چاہیے تھا۔"

"انھیں روک لیا ہوگا کسی نے۔ زور کس پر ہوا۔ کسی پر۔"

رابعہ بولی "کوئی بہت ضروری کام پڑگیا ہوگا۔"

میں نے عاجزی سے سر جھکا کے کہا "شادی سے زیادہ ضروری کام کیا ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد ولیمہ بھی ضروری تھا۔ میں کیا کرتا۔"

کاجل ہنسنے لگی "پہلے لوگ ولایت جاتے تھے تو شادی کے بغیر نہیں آتے تھے۔ اب غیر علاقے میں جاتے ہیں شادی کرنے کے لیے۔"

میں نے کہا "یقین کرو اس میں میری مرضی کو قطعی دخل نہیں تھا۔ میں نے آخر وقت تک مزاحمت کی۔ کسی نے میری ایک نہیں سُنی۔ زبردستی شادی کردی۔"

کاجل کی مسکراہٹ پھیکی پڑگئی "مذاق چھوڑیے۔"

میں نے مظلوم اور دُکھی لہجے میں کہا "خدا کی قسم یہ مذاق نہیں ہے کاجل۔ بس سب کچھ اچانک ہو گیا۔ کسی پروگرام کے بغیر۔"

اب رابعہ نے میری طرف یوں دیکھا جیسے پولیس آوارہ گردی میں پکڑے جانے والوں کو دیکھتی ہے کہ کہیں وہ نشے میں تو نہیں۔ اسے معلوم تھا کہ میں قسم کھانے کا عادی نہیں "جھوٹی قسم مذاق میں بھی نہیں کھانی چاہیے۔"

"آخر میں کیسے یقین دلاؤں تمہیں رابعہ۔ مجھے معاف کردو۔ میں مجبور تھا۔" میں نے کہا "نہ میری مرضی تھی اور نہ کسی نے مجھ سے پوچھا۔ وہ تو سب اچانک ہی ہوگیا۔ وہاں ہر فیصلہ جرگہ کرتا ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ اختلاف کرے۔"

"سکندر، یہ کیا فضول باتیں کر رہے ہو۔" رابعہ کا رنگ اُڑ گیا تھا۔

میں نے مزید مظلومیت کا مظاہرہ کیا "دیکھو رابعہ۔ تم شاید یقین نہیں کر رہی ہو مگر یہ حقیقت ہے۔"

کاجل نے کہا "آپ کے دماغ پر اثر معلوم ہوتا ہے۔ خواہ مخواہ پریشان کیوں کر رہے ہیں ہمیں۔"

"کاجل مجھے اندازہ تھا کہ تمہیں دکھ ہوگا۔ پریشانی تو بہت معمولی لفظ ہے لیکن تقدیر کے لکھے کو بدلا نہیں جا سکتا۔ تم خود جانتی ہو یہاں سے میں شادی میں شرکت کے لیے نہیں گیا تھا۔ خود آصف علی کے خواب و خیال میں یہ بات نہیں تھی۔" میں نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی "کلیم اللہ بہت خوش اور مطمئن تھا۔ سچ ہے نا۔"

رابعہ نے ایک دم میرے سامنے آ کے کہا "سکندر، میں تھپڑ ماردوں گی۔ ایسا بے ہودہ مذاق مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔"

"رابعہ۔ تمہاری قسم یہ مذاق نہیں ہے۔ تم سے زیادہ بھلا کون عزیز ہے مجھے اس دنیا میں پھر بھی یقین نہیں آتا تو آصف علی سے

پوچھ لینا۔ یہ مجھے معلوم ہوتا پہلے سے تو میں اُدھر جاتا ہی کیوں۔ مگر قبائل کی رسم و روایت کی بات تھی۔ وہاں فیصلے ہوتے ہیں گن پوائنٹ پر۔ انکار کرے کوئی تو کشت و خون ہوتا ہے۔ میں بھی ایک حد تک مخالفت کر سکتا تھا۔"

رابعہ کی حالت کا تغیّر مجھے مجبور کر رہا تھا کہ میں اس سنگدلانہ مذاق کو ختم کردوں مگر ابھی کلا ئمکس نہیں آیا تھا۔

کاجل نے دل آزار اور مشتعل لہجے میں کہا "یہ تم نے کیا کیا؟ مجھے یقین نہیں آتا کہ تم ایسا کر سکتے ہو۔ آخر کون ہے وہ؟"

جذباتی اداکاری کا بہترین مظاہرہ کرتے ہوئے میں نے کہا "مجھے نہیں معلوم۔ میں تو اس وقت گم صم بیٹھا رابعہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

رابعہ کا نروس بریک ڈاؤن ایک دم ہوگیا "بکتے ہو تم۔ جھوٹ بولتے ہو۔ میں جان سے ماردوں گی تمہیں۔"

"لیکن میرا قصور؟" میں نے سہم کے کہا "میں بتا چکا ہوں کہ یہ شادی میری مرضی سے نہیں ہوئی۔ سب اوپر ہی اوپر مجھ سے پوچھے بغیر طے کرلیا گیا۔ میری سننے والا کوئی نہیں تھا۔ میں مجبور کردیا گیا۔"

رابعہ کانپنے لگی "سکندر کمینے، دھوکے باز۔ کتنی بے غیرتی سے مجبوری کی بات کر رہے ہو۔ کوئی اور بات ہے" "تم جھوٹ بول رہے ہو کہ تم انکار کرتے تو وہ تمہیں گولی ماردیتے۔ مرنے سے ڈرتے تھے تم۔ مجھے دھوکا دینے سے بہتر تھا تم مرجاتے۔ اتنی آسانی سے تم میرے منہ پر مجبوری کی بات کر رہے ہو۔ کتنے ذلیل ہو تم۔"

کاجل نے کہا "رابعہ باجی۔ مرد کی ذات ہی بے وفا ہے۔"

میں نے کہا "تم تو سمجھنے کی کوشش کرو کاجل۔"

"میں سمجھاؤں گی تمہیں اس مجبوری کا مطلب۔" رابعہ نے چیخ کے کہا "تم کیا سمجھتے ہو میں معاف کردوں گی تمہیں۔ میں تمہیں بھی جان سے ماردوں گی اور خود بھی مرجاؤں گی۔ میرے جیتے جی تم کسی اور کے نہیں ہوسکتے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔"

"بھائی سکندر۔ آپ کو ایک لمحے کے لیے خیال نہیں آیا کہ آپ کے لیے رابعہ نے اپنی ساری زندگی داؤ پر لگا رکھی ہے۔"

میں نے احمقوں کی طرح کہا "اچھا؟ خیر ایسا ہے تو میں کرلوں گا ان سے شادی۔ انہوں نے کبھی صاف کہا نہیں۔"

"لعنت بھیجتی ہوں تم پر؟" رابعہ نے ایک دم چہرہ ہاتھوں میں چھپالیا اور بھاگنے کے لیے پلٹی "جاؤ اسی کے ساتھ خوش رہو۔ جس سے نکاح کرنا ایسی مجبوری بن گیا تھا۔"

میں نے ایک دم اس کا ہاتھ پکڑلیا "میرا نکاح۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو رابعہ؟"

کاجل نے آگ بگولہ ہوکے کہا "تمہارا کیا خیال ہے کہ ایک کے بعد دوسری شادی کروگے رابعہ سے۔"

> پتا نہیں کیسے گفتگو ان مخلوقات کے ذکر تک پہنچی جنہیں چینی بڑی رغبت سے کھا جاتے ہیں۔
>
> "اجمل خٹک نے کہا۔ "چینیوں کے بارے میں مشہور ہے کہ انہیں جو چیز بھی زمین پر چلتی نظر آئے، کھا جاتے ہیں۔"
>
> ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے کہا۔ "شاید اسی لیے یہاں درختوں کے پتے بھی نہیں ہل رہے۔"
>
> امجد اسلام امجد کے سفرنامۂ چین "ریشم ریشم" سے ایک اقتباس۔

"لاحول ولا قوۃ۔ ایسی گھٹیا باتیں کرتے تمہیں شرم نہیں آتی کاجل۔ کیا میں اتنا ذلیل ہوں کہ محبت کسی سے کروں اور شادی کسی سے۔"

"تم پاگل تو نہیں ہوگئے ہو۔ ابھی کیا کہہ رہے تھے شادی کرکے آیا ہوں۔ ولیمے میں شریک ہونا پڑا۔"

"پاگل تم ہو۔ کیا میں اپنی شادی کی بات کر رہا تھا۔ یہ میں نے کب کہا تھا کہ وہ میری شادی تھی۔"

رابعہ نے بھیگی آنکھوں سے مجھے دیکھا "تم نے نہیں کہا تھا کہ تم مجبور ہوگئے تھے۔ تمہاری کسی نے نہیں سُنی۔"

مجھے ایک دم ہنسی آئی "یہ تو خیر کہا تھا مگر اس سے تم نے یہ نتیجہ کیوں اخذ کیا کہ فیصلہ میری شادی کا تھا۔ اور میں نے اپنی شادی کی مخالفت کی تھی۔"

کاجل نے جل کے کہا "اور کیا آصف علی کی شادی تھی۔"

"شادی کلیم کی تھی" میں نے کہا "اب تم پھر کہو گی میں مذاق کر رہا ہوں یا جھوٹ بول رہا ہوں۔ لیکن میں پہلے بھی سچ بول رہا تھا اور اب بھی سچ عرض کر رہا ہوں لیڈیز۔ اگر کلیم تمہارا بیٹا تھا تو اب تم ساس کے عہدے پر فائز ہوچکی ہو کاجل اور تمہاری بہو وہی ہے جو شاید کلیم کی ماں ہوتی مگر اب اس کی بیوی ہے۔ عمر میں تم سے دُگنی ہے وہ۔"

"تم ہمیں پاگل کردوگے۔" کاجل نے سر پکڑلیا۔

"انشاء اللہ؟" میں نے کہا "ویسے کیا ہمیں یقین ہے کہ تم پاگل نہیں ہو؟ یہ بات پہلے کسی نے نہیں کہی؟"

رابعہ نے اپنا ہاتھ چھڑالیا "سیدھی طرح بات کرو ورنہ؟"

"ورنہ کیا؟ دھمکی مت دو مجھے۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ تم میں کتنا حوصلہ ہے۔" میں نے کہا "کتنا اعتماد ہے مجھ پر۔ تم نے مجھے نہیں میری محبت کو ذلیل کیا ہے اور احتجاجاً مجھے کم سے کم ایک بار تو شرم سے ڈوب مرنا چاہیے۔ یہاں کوئی انڈر گراؤنڈ ٹینک ہے؟"

"سکندر! تمہیں کسی نے دھوکے سے تو کچھ نہیں پلا دیا ہے؟" رابعہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ہاں، تم نے۔" میں نے چلاّ کے کہا "بقول فلمی شاعر ظالم تری آنکھوں نے کیا چیز پلا دی ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیسے آگئیں؟"

رابعہ اب خفت کا شکار تھی اور آنسو صاف کرتے ہوئے اس میں مجھ سے نظر ملانے کی ہمت نہیں تھی۔ مگر وہ مسکرا رہی تھی۔ اسے خوشی تھی کہ یہ سب مذاق تھا "تم بہت بدمعاش ہو سکندر۔ یہ بھی ہم سے پوچھ رہے ہو۔ تمہیں معلوم نہیں تھا کہ ہم یہاں ہوں گے؟"

"بی بی! خدا کا نام لو۔ مجھے کیا عالم غیب سمجھ رکھا ہے تم نے۔"

"ہاں، وہ تو آپ ایسے ہی گزر رہے تھے ادھر سے کہ ہم سے ملاقات ہوگئی۔" کاجل نے تمسخر اڑایا "آپ کا کیسے تشریف لانا ہوا آخر؟"

میں نے سوچ کے کہا "میں سمجھ گیا، تم کو عامر نے کوئی پیغام دیا ہوگا ہماری طرف سے کہ آپ لوگ یہاں آجائیں۔ وہ خود کہاں ہے؟"

"وہ گیا ہے آصف علی کی بیوی کو گھر چھوڑنے۔" کاجل نے کہا۔

"تم نے۔۔۔ دیکھا تھا اس کو جاتے ہوئے۔"

"دیکھا تو نہیں تھا لیکن وہ کہہ کے گیا تھا کہ میں اماّں کے ساتھ جا رہا ہوں۔ آپ لوگ یہاں ٹھہریں، سکندر اور آصف صاحب یہاں پہنچ جائیں گے شام تک۔"

"وہ ناصر پور آیا تھا؟ کیا کہا تھا اس نے؟ اور کون تھا اس کے ساتھ؟"

"آصف علی کے کوئی دوست تھے جو دوسری گاڑی میں ساتھ آئے تھے۔" کاجل نے کہا "عامر نے بتایا کہ یہاں کچھ خطرہ ہے اور آصف علی نے پیغام بھیجا ہے کہ ہم دوسری جگہ شفٹ ہو جائیں پھر ہم اس کے ساتھ آگئے۔ کل کے بعد آج دوبارہ اس وقت نظر آیا تھا وہ جب آصف علی کی بیوی اور بیٹی کو گھر چھوڑنے جا رہا تھا۔"

"تم نے پوچھا نہیں کہ ہمیں ساتھ لے جانے میں کیا حرج ہے۔ صاحبِ خانہ سے تمہاری ملاقات ہوئی؟"

کاجل نے نفی میں سر ہلایا "سوائے نوکروں کے یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ خاطر مدارات میں کوئی کمی نہیں مگر ملنے کوئی نہیں آیا۔ نہ صاحبِ خانہ، نہ گھر کی کوئی عورت۔ عامر نے کہا تھا کہ سکندر یہیں آئے گا۔ تم کو اس کے ساتھ واپس جانا ہے۔"

میں کچھ دیر سوچتا رہا "اچھا! کیا تم نے کسی نوکر سے پوچھا کہ یہ کوٹھی کس کی ہے؟ کون رہتا ہے یہاں؟"

"رابعہ باجی نے پوچھا تھا۔ انہوں نے کہا کہ آفریدی صاحب کی کوٹھی ہے۔ وہ آج کل فیملی کے ساتھ لندن میں ہیں۔ معلوم نہیں کیا چکر ہے۔ تم بتاؤ ابھی کیا بے سروپا باتیں کر رہے تھے؟"

میں نے کہا "میری باتوں کا سر پیر سب ہے۔ چلو میں راستے میں بتاؤں گا۔ ہم فوراً واپس جا رہے ہیں۔ تم لوگ چل کے گاڑی میں بیٹھو۔"

"کون سی گاڑی میں؟"

"گاڑی باہر موجود ہے۔ رابعہ کی گاڑی۔" میں نے کہا "جاؤ بابا، ہر بات مذاق نہیں ہوتی۔ دیکھ لینا گاڑی میں جو کاغذات رکھے ہیں ان میں کس کا نام لکھا ہوا ہے۔ میں آتا ہوں۔"

ان کی حالت عجیب تھی۔ میری ہر بات ان کے لیے معمّا بن گئی تھی۔ خود میں بہت سی باتیں سمجھنے سے قاصر تھا۔ اگر میں رابعہ اور کاجل کو دلاور سے ملاقات کا حال بتا دیتا تو دہشت سے ان کی جان نکل جاتی۔ صاف ظاہر تھا کہ نہ انہوں نے دلاور کو دیکھا، نہ انہیں شک ہوا کہ کل سے وہ دلاور کی نگرانی میں اور اس کی قید میں ہیں۔ دلاور ان کے سامنے آیا ہی نہیں تھا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ انہیں عامر کے انجام کی خبر بھی نہ تھی جسے میں نے خود اپنی آنکھوں سے بھوکے شکاری کتوں سے لڑتے اور ایک پُرعذاب موت مرتے دیکھا تھا۔ چند منٹ پہلے کاجل اور قدرت اسی لان پر موجود تھیں جہاں شکاری کتوں نے عامر کو چیرا پھاڑا تھا۔ کیا انہوں نے کوئی شور نہیں سُنا تھا؟ عامر کی چیخ پکار اور کتوں کے غرانے دھاڑنے کی آوازیں ان کے کانوں تک بھی نہیں پہنچی تھیں؟

یہ ناممکن نہیں تھا۔ شاید وہ کسی ائرکنڈیشنڈ کمرے میں ہوں گی جو کوٹھی کے آخری حصے میں لان سے بہت دور ہوگا۔ دلاور وہ منظر صرف مجھے دکھانا چاہتا تھا۔

میں نے کوٹھی کا ایک چکر لگایا۔ اس کے اوپر نیچے کے تمام کمروں میں جا کے دیکھا مگر دلاور کہیں بھی نہیں تھا۔ مجھے اس کے محافظ اور ملازم بھی دکھائی نہ دیے۔ گھر کے دیگر ملازم عام قسم کے نوکر تھے جو مجھے اس کے سوا کچھ بتانے کو تیار نہ تھے کہ کوٹھی آفریدی صاحب کی تھی اور آفریدی صاحب قالینوں کے بیوپاری تھے جو لندن آتے جاتے رہتے تھے۔ وہ کسی چوہدری دلاور کو نہیں جانتے تھے۔ گھر میں کچھ مہمان ضرور ٹھہرے ہوئے تھے مگر مہمانوں سے کچھ پوچھنا ان کے فرض میں شامل نہیں تھا۔

شک تو مجھے پہلے ہی تھا کہ حقائق کو عمداً چھپایا جا رہا ہے اور یہ چوہدری دلاور کے ڈرامے کے کردار ہیں جو اپنا اپنا رول اس کی ہدایات کے مطابق نبھا رہے ہیں۔ میں نے کچن میں دو نوکروں کو سامنے کھڑا کر کے غور سے دیکھا تو میرے شبہات کی تصدیق ہوگئی۔ وہ میری جرح سے کچھ پریشان نظر آ رہے تھے۔

باہر نکل کے میں نے عقبی حصے کے لان کا معائنہ کرتے ہوئے پولیس کی دو وردیاں دیکھیں جو دھونے کے بعد خشک ہونے کے لیے ڈال دی گئی تھیں۔ میں نے قریب جا کے ان کا معائنہ کیا۔ ان پر اب بھی کہیں کہیں سرخی موجود تھی۔ دونوں وردیاں ساتھ لے کر

عمر کے کتنے خوبصورت پہلو

New Ammonia Free
Samsol®
HAIR COLOUR
with
LANOLIN CREAM
45 BLACK

39 LIGHT BROWN
41 MEDIUM BROWN
43 DARK BROWN
71 MAHOGANY
77 AUBURN
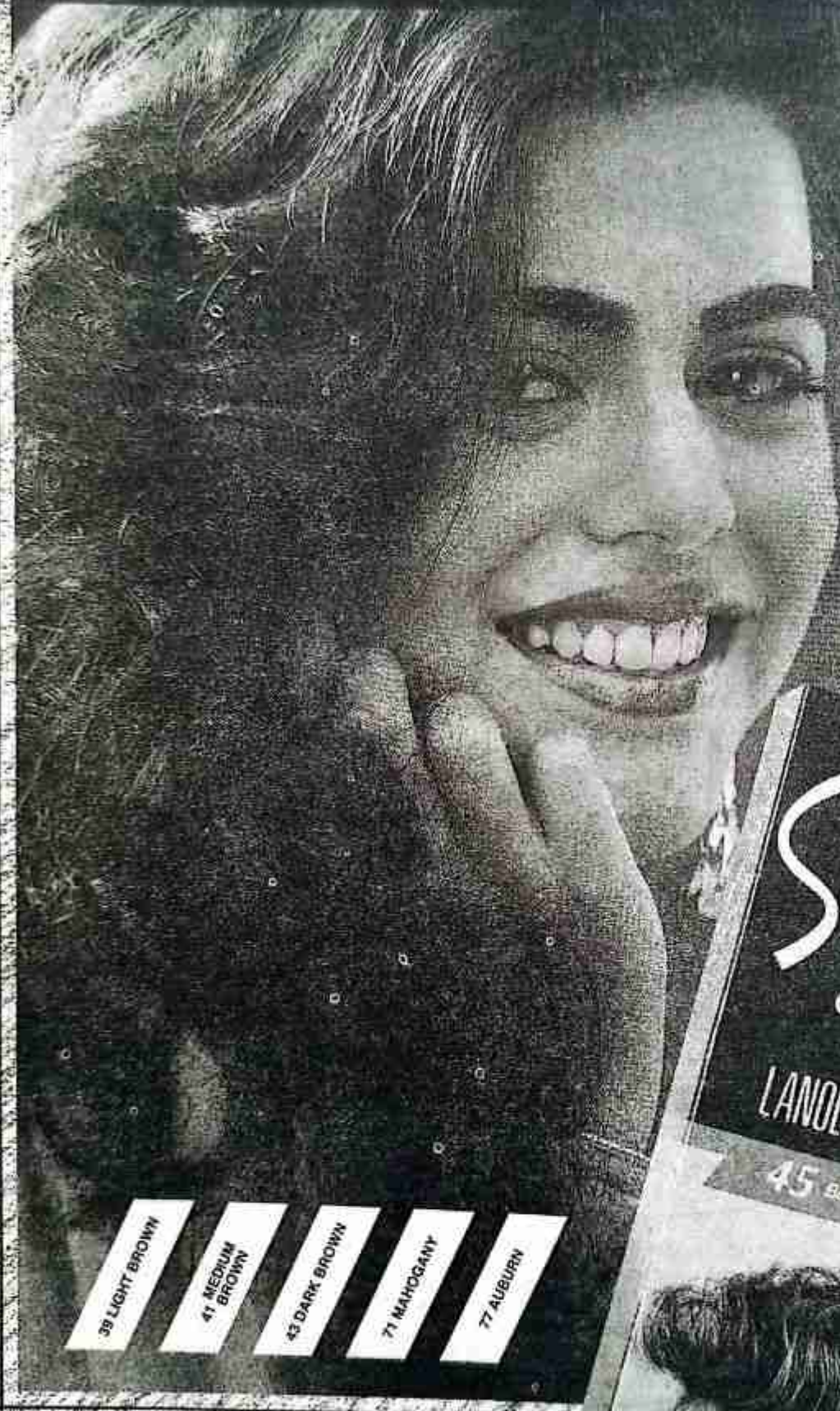
چھ مختلف رنگوں میں

میں پھر اندر گیا۔
"مسٹر خانساماں!" میں نے چھوٹے قد کے گول مٹول شخص کو مخاطب کر کے کہا "کبھی حوالدار کدو سے ملے ہو تم۔ بالکل جنگلی مینڈک کا خیال آتا ہے اسے دیکھ کر؟"
اس کے ہونٹ کانپنے لگے "جی' جی نہیں۔"
"جی اور جی نہیں۔ تم کیا سمجھتے ہو میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔ تم دونوں وہی ہو جو کل میرے سامنے مقتول ہو گئے تھے۔"
"آپ کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی جناب۔" دوسرا بولا۔
"آنی بھی نہیں چاہیے۔" میں نے کہا "تم صرف چوہدری دلاور کی بات سمجھ سکتے ہو۔ بہت اچھا ڈرامہ پیش کیا تھا تم سب نے مل کے۔ پہلے تو میں بھی دھوکا کھا گیا تھا کہ اس نے تمہیں گولی مار دی ہے اور تم واقعی فوت ہو گئے ہو مگر اس وقت جب تمہارے ماتحت لاشیں گھسیٹ کر لے جا رہے تھے میں نے دیکھ لیا تھا انسپکٹر صاحب کہ تم نے اس سے زیرِ لب کچھ کہا تھا اور پھر آنکھیں بند کرلی تھیں۔ یہ وہی وردیاں ہیں جو کل تم نے زیب تن فرمائی تھیں۔ میک اپ سے تمہارا ناک نقشہ بھی بہت بدل دیا گیا تھا اور آج اس گھر میں تمہیں نوکر کی حیثیت سے کام کرتا دیکھ کے کون کہہ سکتا ہے کہ تم دوسری دنیا سے دوسرا جنم لے کر دوسرا رول کرنے کے لیے واپس آ گئے ہو۔ اس وقت جب دلاور نے تم پر گولی چلائی تھی تو میرا ذہن ماؤف تھا ورنہ میں دیکھ لیتا کہ گولی لگنے کے بعد تم خاصے تڑپے تھے مگر خون کا ایک قطرہ نہیں نکلا تھا۔ مگر میں نے بعد میں دیکھ لیا تھا۔ اس وقت جب تمہاری لاشیں چوہدری دلاور کے حکم پر کنوئیں میں ڈال کے مٹی برابر کرنے کے لیے لے جائی جا رہی تھیں۔"
"یہ سب تم ہمیں کیوں بتا رہے ہو؟" حوالدار نے جارحانہ لہجے میں کہا "دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔"
مجھے اس کے ردِعمل کا اندازہ تھا "میں جا رہا ہوں لیکن تم میری بات چوہدری دلاور کو ضرور بتا دینا۔ ایسے ڈرامے وہ کرتا رہتا ہے۔ یہ ہم جانتے ہیں۔ تم شاید ایک بات نہیں جانتے کہ ہر بار اس کے ریوالور میں نقلی گولیاں نہیں ہوتیں۔ اگلی مرتبہ ہوشیار رہنا۔"
انسپکٹر نے ایک دم مجھ پر گالی دے کر حملہ کیا مگر میں اس کے لیے تیار تھا۔ وہ میری طرف آیا تو میں نے ایک دم دروازہ اپنی طرف کھینچ لیا جس پر میں ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ وہ لمبائی کے رخ پٹ کی ڈیڑھ انچ موٹی پٹی سے ٹکرایا اور یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ بے اختیار اس کی حلق سے ایک چیخ نکلی۔ وہ لڑکھڑایا تو میں نے اس کی گدی پر ہاتھ مارا اور اس کی گردن کی ہڈی سوکھی ٹہنی کی طرح چٹخ کے ٹوٹ گئی۔
اصل خطرہ موٹے حوالدار کی طرف سے تھا جو پیشہ ورانہ تجربے کار فائٹر تھا لیکن میں نے اسے مقابلے کا موقع ہی نہیں دیا اور دروازے کو پورا کھینچ کے باہر سے کنڈی لگا دی۔
وہ مجھے گالیاں دینے لگا اور دروازے کو ٹکریں مارنے لگا لیکن میں نے بھاگ جانے میں عافیت جانی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ دروازہ توڑ دے گا اور زخمی شیر کی طرح نکلے گا تو اس پر خون سوار ہو گا۔ وہ مجھ پر پیچھے سے فائر بھی کر سکتا تھا۔
میں دوڑتا ہوا باہر آیا اور کار میں بیٹھ گیا۔
"کہاں چلے گئے تھے؟" رابعہ نے شکایتی لہجے میں کہا۔
"میں ذرا عالمِ ارواح تک گیا تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ دو مقتولوں کی روحیں وہاں پہنچ گئی ہیں یا نہیں۔" میں نے کار کو اسٹارٹ کرنے کے لیے چابی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور روک لیا۔
رابعہ بولی "کسی بات کا ڈھنگ سے بھی جواب دے دیا کرو۔"
"خاتونِ محترم' بندہ بالکل صحیح عرض کر رہا ہے۔ وہاں ایک مقتول کی روح تھی۔ دوسرا مردہ بڑا دھوکے باز نکلا۔ جنگلی مینڈک کی اولاد۔ ابھی تک اسی دنیا میں پھر رہا ہے۔"
"اچھا اب چلئے بھی' انتظار کس کا ہے؟" کاجل نے کہا۔
"میں سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ ہم ایک دوسرے کا کہا سنا معاف کر دیں۔" میں نے کہا "آخری بار ایک دوسرے کو دیکھ لیں کیا پتا چابی گھماتے ہی پتا چلے کہ ہم تو دوسرے جہاں میں ہیں۔"
"تمہارا مطلب ہے' گاڑی میں بم نصب ہو سکتا ہے۔"
"یہ سائنسی ترقی کا دور ہے خاتون۔ بم گاڑی میں' جھاڑی میں' داڑھی میں' ساڑھی میں' کہیں بھی نصب ہو سکتا ہے۔" میں نے بونٹ کھول کے کہا "رابعہ ذرا خیال رکھنا گھر کے اندر سے جو چیز بھی برآمد ہو اسے گولی مار دینا۔"
"خالی ہاتھوں سے گولی مار دوں؟"
"اچھا تیر نظر سے مار دینا۔" میں نے بونٹ میں جھانک کے تاروں کا بغور جائزہ لیا مگر مجھے کوئی مشکوک کنکشن نظر نہیں آیا۔
میں واپس گاڑی میں بیٹھا ہی تھا کہ حوالدار برآمد ہوا۔ حسبِ توقع اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر کار کو اسٹارٹ کیا اور کلچ چھوڑ کر ایکسیلیٹر دبا دیا۔ کار کسی پنجرے سے رہائی پانے والے وحشی درندے کی طرح بھاگی۔ میں نے اپنے عقب میں فائر کی آواز سنی۔ گولی شاید کار کی باڈی سے ٹکرائی تھی۔
"اپنا سر نیچے کرلو۔" میں نے چلّا کے کہا مگر میرے احکامات موصول کرنے سے پہلے ہی رابعہ اور کاجل کو خطرے کے احساس نے سرنگوں کر دیا تھا اور وہ پچھلی سیٹ پر تقریباً سجدے میں پڑی تھیں۔ دوسرا فائر ہوا تو میں گیٹ پر تھا لیکن گیٹ بند تھا اور اسے کھولنے کے لیے اترنا اپنے قاتل کو آسان ہدف فراہم کرنے کے مترادف ہوتا۔
لوہے کا گیٹ خاصا بڑا اور مضبوط تھا مگر مجھے یقین تھا کہ ایک نئی کار کی بھرپور قوت کے سامنے نہ ٹھہر سکے گا۔ اس سے کار کے اگلے حصے کا بیڑا غرق ہونا تو لازمی تھا۔ امکان یہ بھی تھا کہ گیٹ پلٹ

کے گاڑی پر گرے تو پہلے چھت کو اور پھر چھت کے نیچے ہمارے سروں کو چپٹا کردے مگر یہ رسک لیے بنا چارہ نہ تھا۔

گاڑی ایک دھماکے سے گیٹ کو گرا کے گزری تو میں نے اس کی ہیڈلائٹس کے بکھرنے کا چھناکا بھی سنا۔ یہ بات یقینی تھی کہ سامنے سے بمپر اور جالی بھی سخت مجروح ہوئے ہوں گے مگر ایک مفت میں ملنے والی قیمتی گاڑی کو تباہ کرنے کا یہ پہلا تجربہ خاصا سنسنی خیز ثابت ہو رہا تھا۔

سڑک پر آکے میں نے بڑی مشکل سے ایک تانگے کو بچایا اور کار گھوڑے کی ناک کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ غالباً گھوڑے کے لیے بھی یہ ایک سنسنی خیز تجربہ تھا مگر تانگے والے کے اعصاب زیادہ کمزور ثابت ہوئے۔ جب وہ ہمیں پشتو میں گالیاں دے کر دل کی بھڑاس نکال سکتا تھا اس وقت وہ سکتے کی کیفیت میں بیٹھا رہا۔

کچھ دور آنے کے بعد شوں شوں کی آواز کے ساتھ میں نے ونڈ اسکرین کے سامنے بادل سے اڑتے دیکھے تو میری نظر ڈائل پر گئی۔ ٹمپریچر میٹر کا کانٹا لال نشان سے بھی آگے پہنچ گیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ گیٹ سے گزرتے ہوئے ریڈی ایٹر شہید ہو گیا تھا اور اس کا پانی جو انجن کے رگ و پے میں حرکت سے پیدا ہونے والی حرارت کو جذب کرلیتا تھا بہہ چکا تھا۔

میں نے گاڑی کو فوراً روک دیا ورنہ وہ خود رک جاتی۔ سڑک پر آگے پیچھے مکان ضرور نظر آرہے تھے مگر آبادی کی علامات مفقود تھیں۔

"نیچے تشریف لے آئیے آنرایبل لیڈیز۔" میں نے کہا۔

رابعہ نے سر نکال کے کہا "کیا ہوا؟"

"میرے سلوک سے کار کا دل ٹوٹ گیا۔" میں نے کہا "جیسے دل پورے جسم میں خون پہنچاتا ہے ایسے ہی ریڈی ایٹر پانی..."

"یہ اچانک مار دھاڑ اور ایکشن سے بھرپور فلم کیسے شروع ہوگئی۔" کاجل نے نیچے اتر کے کہا "اندر کیا ہوا تھا؟"

"اندر مجھے حکم ہوا تھا کہ میں کچھ کروں۔ کسی سے پنگا لوں۔ کچھ سکوت اور سکون محسوس ہو رہا تھا زندگی میں۔" میں نے کہا۔

"پھر اب کیا ہوگا۔ ایک تانگہ تک نظر نہیں آرہا ہے۔"

"ہم دو ٹانگوں پر جائیں گے۔" میں نے خوش دلی سے کہا "میں خود کو ایک درویش کی طرح محسوس کر رہا ہوں۔ نہ جیب میں مال نہ اہل و عیال۔ نہ ہم سواری پر نہ کوئی ہم پر سوار۔ نہ مال و زر نہ گولی کا ڈر۔ یوں ہی چلتے رہے تو بشرطِ زندگی اپنے ڈیرے پر بھی پہنچ جائیں گے۔"

رابعہ نے کہا "سکندر یہ کس کا گھر تھا؟"

میں نے کہا "یہ ظالم اور بے مروت شخص جو ہم پر دن دن گولیاں برسا رہا تھا غالباً چوہدری دلاور کا سالا تھا۔ ممکن ہے دلاور اس کا سالا ہو۔ کل میری اس سے ملاقات بڑی پُرلطف رہی۔"

"دلاور ملا تھا تمہیں کہاں؟"

"اسی گھر میں جہاں آپ مہمان تھیں۔" میں نے کہا "سفر لمبا ہے اس لیے لمبی بات کرتا ہوں۔ شروع کرتا ہوں وہاں سے جب ہم بچھڑے تھے۔ مس کاجل' یہ داستانِ ہوش رُبا آپ کی خصوصی توجہ کی طالب ہے کیونکہ اس کا سب سے دلچسپ حصہ آپ کے منہ بولے بیٹے کی شادی خانہ آبادی کا حصہ ہے۔"

"جلدی سے بتاؤ۔ یہ کلیم کی شادی کا کیا چکر ہے؟"

"بے چارہ کلیم" میں نے آہ بھر کے کہا "ابھی عمر ہی کیا تھی اس کی لیکن باپ کے اعمال کی سزا اولاد کو ملتی ہے اگر اس کا باپ شادی کرلیتا تو اس پر یہ ظلم کا پہاڑ کیوں ٹوٹتا۔ چونکہ معاملہ ایک خاتون کا ہے اس کو تم ظلم کی پہاڑی کہہ سکتی ہو۔ سنا ہے خاصی بھاری بھرکم ہے۔"

کاجل نے کہا "بھائی سکندر سیدھی طرح بتائیں۔"

میں نے کہا "تم کو خدا عقل دے۔ میں سیدھی بات کر رہا ہوں۔ کلیم کی شادی اسی خاتون سے ہوئی ہے جس سے اس کے باپ کی نسبت طے پائی تھی مگر وہ بزدل تھا یا بہت عقلمند کہ بھاگ گیا۔ پکڑا گیا اس کا بیٹا آخر کار۔ وہی لڑکی اب اس سے باندھ دی گئی جو اس کی ماں کے برابر ہوگی۔"

اس نئی مضافاتی بستی کی سڑکیں رات کو زیادہ ویران نظر آرہی تھیں۔ ابھی یہاں اسٹریٹ لائٹ نصب نہیں ہوئی تھی۔ سڑکوں پر اندھیرا تھا اور خود سڑکوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اس میں گڑھے تھے اور پختہ سڑک بنانے کے لیے جو پتھر بچھائے گئے تھے ان پر پیدل چلنا آسان کام نہ تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد ایک نیم پختہ سڑک شروع ہوئی تو مجھ سے زیادہ رابعہ اور کاجل نے سکون کا سانس لیا اور خدا کا شکریہ ادا کیا کہ اس راستے پر انہوں نے اونچی ایڑی کے ساتھ چلنے کا امتحان پاس کرلیا' نہ ایڑی جوتے سے الگ ہوئی اور نہ ان کے پاؤں میں موچ آئی۔

میں نے ایک مختصر مگر جامع بیان جاری کیا جس سے کلیم کی شادی کے واقعات اور اس کا معاشرتی پس منظر واضح ہوگیا۔ کاجل کو سخت ملال تھا کہ کلیم پر ظلم ہوا اور کسی حد تک رابعہ بھی اس کی ہم خیال تھی کہ یہ کیا جاہلانہ رسم و رواج ہیں۔ میں نے ان کو یقین دلانے کی پوری کوشش کی کہ خود کلیم نے اس شادی کے خلاف کوئی جذباتی مظاہرہ نہیں کیا تھا بلکہ وہ بے حد مطمئن اور خوش تھا کہ آخر کار اس نے وہ قرض ادا کردیا جو باپ پر واجب الادا تھا اور سارے جھگڑے خوش اسلوبی سے طے ہوگئے۔

"کمال ہے۔ وہ مطمئن کیسے ہو سکتا ہے ایک ایسی عورت کو بیوی بنا کے جو عمر میں اس سے اٹھارہ سال بڑی ہے۔"

"بیشتر شوہر صبر و قناعت کے پتلے ہوتے ہیں۔" میں نے کہا "جیسی اللہ نے ان کے مقدر میں لکھ دی اس پر خوش رہتے ہیں۔ یا کم سے کم ایسا ظاہر ضرور کرتے ہیں۔ عورتوں کی طرح ساری عمر روتے پیٹتے نہیں۔"

"عورتیں منافقت نہیں کرتیں نا۔" رابعہ نے کہا۔

"میں نے آج تک وہ عورت نہیں دیکھی جو کہے کہ میں حالات سے بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ بے حد خوش قسمت سمجھتی ہوں خود کو کہ میری شادی اس شخص سے ہوئی اور اب مجھے کسی چیز کی خواہش نہیں۔" میں نے کہا "اماں حوّا جنت میں خوش نہیں تھیں۔"

"یہ ایک متعصبانہ بیان ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"میری بڑی خواہش تھی کہ میں کلیم کی بیوی کو دیکھ سکتی۔" کاجل نے چلتے چلتے کہا "آخر کلیم نے کیا دیکھا اس میں؟"

"یہ سوال تو کسی بھی مجنوں سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے لیلیٰ میں کیا دیکھا تھا آخر کہ اس کی خاطر صحرا میں بھٹکتا پھرا۔"

"کلیم اس کو جانتا تک نہیں تھا۔" کاجل بولی۔

"اور تم نہیں جانتیں کہ وہ کتنا مجبور تھا۔ اس معاشرے کی روایات کے خلاف آواز اٹھانا کلیم کے لیے ناممکن تھا۔ اسے وہاں رہنا تھا اور زندہ رہنا تھا۔ بہتر ہے کہ اب اسے بھول جاؤ۔ اس کی زندگی پر تمہیں جو تھوڑا بہت اختیار حاصل تھا وہ اب نہیں رہا۔" میں نے کہا۔

میرے الفاظ میں حقیقت کی بے رحمی تھی جس سے مفر نہیں تھا اور میں چاہتا تھا کہ کاجل اسے تسلیم کرلے۔ یہ بھی ایک معمولی سا جذباتی حادثہ تھا۔ جسے ضرورت سے زیادہ اہمیت دینا لاحاصل تھا۔

رابعہ نے فوراً موضوع بدل دیا "اب ہم کہاں جائیں گے؟"

میں نے کہا "آسان جواب یہ ہے کہ جہاں تقدیر لے جائے۔"

"میرا مطلب تھا کہ ہم آصف علی کے گھر جا سکتے ہیں۔ وہ بہت پریشان ہوگا۔" رابعہ بولی۔

"وہاں جا کے ہم اس کی پریشانی کم نہیں کرسکتے۔ ہوسکتا ہے کہ خود مزید پریشانی میں مبتلا ہوجائیں۔" میں نے کہا "میں دلاور پر بھروسہ نہیں کرسکتا۔ وہ ایک جھوٹا اور فریبی شخص ہے۔ اس نے بیک وقت اپنی طاقت سے مجھ پر دہشت بٹھانے کی کوشش کی اور میری طرف دوستی کا ہاتھ بھی بڑھایا۔ بظاہر وہ جیو اور جینے دو کی پالیسی کا پرچار کررہا تھا مگر ساتھ ہی مجھے دھمکی بھی دے رہا تھا کہ میں تم سب کے ٹکڑے کرکے کتوں کے سامنے ڈال سکتا ہوں۔ اس کے بے قابو ہونے والے کتوں نے مجھے قتل کرنے میں کون سی کسر چھوڑی تھی۔"

رابعہ نے کہا "ہوسکتا ہے حوالدار کدّو بھی تمہیں خوف زدہ ہی کررہا ہو اس کا ارادہ تمہیں شوٹ کرنے کا نہ ہو۔"

"کس کا ارادہ کیا ہے یہ وقت بتائے گا۔ ابھی تو میرا ارادہ ہے کہ آصف علی کو خطرات سے خبردار کردوں۔ یہ بتادوں کہ عامر بھی دلاور اینڈ کمپنی میں شامل ہوچکا ہے۔ وہ کچھ بھی کرسکتا ہے اس کو فوری طور پر قدرت کی حفاظت کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔"

"وہ کیا کرسکتا ہے؟"

"وہ اپنی بیوی کو اور قدرت کو ہمارے پاس لاہور بھیج سکتا ہے اور اپنا نقد سرمایہ اور کاروبار سمیٹ کر خود بھی لاہور آسکتا ہے۔ یہاں تو ہم اس کی مدد نہیں کرسکتے۔"

"وہ ہماری مدد قبول بھی نہیں کرے گا۔" رابعہ بولی "اسے فکر ہے تو صرف قدرت کی زندگی کی۔ اسے ہمارے حوالے کرنے کے بعد خود بھی بزدلوں کی طرح فرار ہونا شاید پسند نہ کرے۔"

"خیر یہ اس کی مرضی۔ ہم اسے مجبور تو نہیں کرسکتے۔ پیشکش ضرور کرسکتے ہیں اپنے تعاون کی۔" میں نے کہا "باقی سب کا رکھوالا تو وہی ایک اللہ ہے جو ہماری حفاظت کررہا ہے ورنہ ہم کیا اور ہماری اوقات کیا۔"

مجھے پشاور شہر میں چھوڑ دیا جاتا تو شاید میں آصف علی کے گھر کا پتا پوچھے بغیر نہ پہنچ پاتا۔ یہ تو کوئی نواحی بستی تھی اور میرے لیے رات کے وقت سمت کا تعین بھی مشکل ہورہا تھا۔ تین چار میل پیدل چلنے کے بعد آخر کار ہمیں ایک گاڑی کی ہیڈلائٹس نظر آئیں اور اس شریف آدمی نے ہاتھ کا اشارہ دیکھنے سے پہلے ہی گاڑی روک لی۔ دو عورتوں کے ساتھ اس وقت کسی مرد کا سڑک پر نظر آنا

مصر کے فرعونوں کی طرح چینی بادشاہوں کو بھی یقین تھا کہ ایک دن وہ دوبارہ زندہ ہوسکیں گے چنانچہ انہوں نے بھی اپنے مقبروں میں بہت سا ساز و سامان اور مال و دولت اپنے ساتھ دفن کروالیا تھا اور اسے دست بُردِ زمانہ سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنی قبروں کو زمیں دوز سنگی حصار میں تعمیر کروایا تھا۔ مقبرے کا سیلن زدہ راستہ طے کرتے ہوئے میر بہت یاد آئے۔

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

وہ ذی حشم لوگ جن کی جنبشِ ابرو سے لوگوں کی زندگیوں کے فیصلے ہوا کرتے تھے، جب قبر کے گڑھے میں اُترتے ہیں تو کتنے بے حقیقت ہوجاتے ہیں۔ انسانوں کو کیڑے مکوڑوں سے زیادہ بے وقعت جاننے والی آنکھیں سچ مچ کے کیڑے مکوڑوں کا رزق بن جاتی ہیں۔ چھوٹی، چند فٹ جگہ کے درمیاں کیسے کیسے منہ زور طوفان بند ہو جاتے ہیں اور کتاب میں صرف اتنا لکھا جاتا ہے۔ "فلاں ابن فلاں" (پیدائش ۱۹۰۱ وفات ۱۹۷۰) لیجیے قصہ ختم۔"

امجد اسلام امجد کے سفرنامے "ریشم ریشم" سے

یہاں غیر معمولی بات تھی جب سڑکوں پر چور کتے یا پولیس والے ہی پھرتے ہیں جو سب شریف آدمی کے دشمن ہوتے ہیں۔

میں نے اسے گاڑی کے حادثے کی جھوٹی کہانی سنائی اور اپنی مجبوری بیان کرتے ہوئے درخواست کی کہ وہ ہمیں یونیورسٹی ٹاؤن پہنچا دے۔

وہ کچھ پریشان ہوا "خوچہ یونیورسٹی ٹاؤن۔ وہ تو بہت دور ہے۔"

میں نے کہا "ہاں قریب ہوتا تو ہم پیدل ہی چلے جاتے۔"

"اچھا بیٹھو۔ اللہ مالک ہے۔" اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کے کہا "تم شریف آدمی نظر آتا ہے۔"

راستے میں اس نے بتایا کہ اس علاقے میں ہر طرح کے لوگ مل جاتے ہیں۔ بے پردہ عورتوں کے ساتھ رات کو نکلنے والا عام طور پر قابلِ اعتبار اور شریف آدمی نہیں سمجھا جا سکتا۔ ایسے لوگ لفٹ لینے کے بہانے لوٹ بھی لیتے ہیں۔ اس نے صاف تو نہیں کہا مگر اشاروں میں واضح کر دیا کہ ایسی خواتین کا کردار بھی مشکوک ہوتا ہے۔

آصف علی کے گھر کے دروازے پر میں نے اپنے محسن کا شکریہ ادا کیا "یہ میرا ہی گھر ہے۔ کبھی آدھی رات کو تمہیں مدد کی ضرورت پڑے خدانخواستہ تو اس گھر کے دروازے تمہارے لیے کھلے ہوں گے۔"

"آپ کا بڑا مہربانی" اس نے ہاتھ ہلا کے کہا۔

آصف علی ہمیں دیکھ کے پہلے حیران اور پھر بے حد خوش ہوا "میری تو زندگی عذاب ہو گئی تھی۔ پولیس کو رپورٹ کی۔ نیچے سے اوپر تک سب کی سفارش تھی۔ دباؤ تھا مگر تمہارا پتا ہی نہیں چل رہا تھا۔ تم نے بھی حد کر دی کہیں سے فون کر دیتے۔ اطلاع دے دیتے۔"

میں نے کہا "چلیے غلطی معاف کیجیے۔ یہ بتائیے قدرت تو خیریت کے ساتھ گھر پہنچ گئی اور آپ کی وائف؟"

"ہاں وہ تو عامر کو گالیاں دے رہی تھی کہ جھوٹ بول کے ہمیں نہ جانے کہاں لے گیا تھا اور پھر خود غائب ہو گیا۔"

میں نے کہا "خدا کا شکر ادا کیجیے جس نے بروقت عامر کی اصلیت کو عیاں کر دیا۔ آپ ایک سانپ کو پال رہے تھے۔"

"میں اس کا سر بھی کچل سکتا ہوں۔" آصف علی نے مشتعل ہو کے کہا اور رابعہ سے مخاطب ہو گیا "جاؤ تم لوگ آرام کرو۔"

"شاید اب اس کی ضرورت نہ پڑے۔" میں نے کہا "وہ ادھر کا رُخ ہی نہیں کرے گا۔"

"کیوں کہاں ہے؟"

"ابھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس دنیا میں بھی ہے یا نہیں۔" میں نے رابعہ اور کاجل کے جانے کے بعد کہا۔

"کیا مطلب؟"

میں نے اسے مختصراً ساری بات بتائی "دلاور نے پہلے میرے ساتھ ایک ڈرامہ کیا تھا۔ مجھے گرفتار کر کے لے جانے والے پولیس مین نہیں تھے۔ پولیس کی وردی میں اس کے بدمعاش تھے۔ اس نے انہیں شوٹ کر دینے کا ڈرامہ کیا۔ ان کی طرف نوٹوں کی گڈیاں پھینک کے مجھ پر ظاہر کیا کہ وہ پولیس کو خرید سکتا ہے اور جسے چاہے قتل کر سکتا ہے۔ قانون اس کے سامنے بے بس ہے۔ بعد میں اس نے مجھے مصالحت کی پیشکش کی جو سب فریب تھا۔ جو قتل ہو گئے تھے انہیں میں نے نوکروں کے روپ میں زندہ دیکھا اور انہوں نے بھی مجھے قتل کرنے کی کوشش کی۔ آپ ابھی دلاور کو نہیں جانتے۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ اپنی حفاظت کا بندوبست کریں۔ خصوصاً قدرت کا۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں قسمت کے لکھے کو تو نہیں مٹا سکتا۔ تم پر بھروسہ کر کے قدرت کو تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔"

میں نے کہا "آپ کو وہ اخبار ملا؟"

"اخبار تو نہیں ملا۔ مگر ایک فون آیا تھا تمہارے لیے۔ فون کرنے والے نے کہا کہ وہ غالب ہے۔"

میں اُچھل پڑا "غالب؟ کہاں سے بات کر رہا تھا وہ؟"

"معلوم نہیں اس نے تمہارے بارے میں پوچھا۔ رابعہ اور کاجل کے متعلق معلوم کیا اور پھر کہا کہ جب وہ واپس آئیں تو منظر کے گھر فون کر لیں۔"

"آپ کو یقین ہے کہ وہ غالب تھا؟"

"بھئی اس نے کہا۔ میں نے مان لیا۔ میں اسے جانتا نہیں اور نہ اس کی آواز پہچانتا ہوں۔"

"اچھا صرف غالب نے بات کی تھی یا نازو نے بھی؟"

"نازو نے تو بات نہیں کی تھی۔" آصف علی نے کہا۔

اچانک باہر سے ایک فائر ہوا۔ غالباً چوکیدار نے اس کا جواب دیا۔ پھر مسلسل فائرنگ شروع ہو گئی۔

آصف علی نے گھبرا کے کہا "یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔"

اس نے اپنی رائفل اُٹھائی اور باہر لپکا۔ ابھی وہ دروازے میں ہی تھا کہ کسی نے اسے دھکا دیا وہ واپس کمرے میں آ گرا۔

"خبردار!" کسی عورت نے زنانہ آواز میں مصنوعی مردانہ بھاری پن پیدا کر کے کہا "ایک ایک کو گولی مار دوں گی میں، جانتے ہو میں کون ہوں؟"

اسے بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ یقیناً ناگ منی تھی۔

شکار گاہوں کے اسرار۔ شکنجے۔ شکاری۔ شکار
باقی واقعات آئندہ ماہ جاسوسی ڈائجسٹ میں پڑھیے

جب کانسٹیبل اینڈریو جیسا جوان آدمی سراغ رساں بننے کی خواہش ظاہر کرے تو یہ طے ہے کہ افسر سمجھیں گے کہ وہ کام چوری کی وجہ سے یہ خواہش کررہا ہے اور ساتھی کانسٹیبل کہیں گے کہ اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے، کمال سے باہر ہورہا ہے لیکن اینڈریو کو دونوں باتوں کی پروا نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے اور کس طرف جارہا ہے۔

ایسے معاملات میں حتمی فیصلہ پڑیلا کے اختیار میں نہیں تھا۔ وہ گبریل اسٹریٹ کے اسٹیشن پر ڈی ٹیکٹو انسپکٹر تھا لیکن بہرحال اس کی سفارش وزن رکھتی تھی۔ "وہ بہت کم عمر ہے" پڑیلا نے کہا۔ "اس میں خود اعتمادی بلا کی ہے۔ ہر کام تنہا کرنا چاہتا ہے۔ کسی کا مشورہ آسانی سے قبول نہیں کرتا۔ اس کے باوجود......"

"اس کے باوجود......" سپرنٹنڈنٹ ٹمکن نے جو ایکس ڈویژن

ایک شخص کی پراسرار داستان جو سڑک پر چلتے چلتے اچانک غائب ہو گیا تھا

جس طرح نقل کرنے کے لیے عقل کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح جوش سے کام لینے کے لیے ہوش کی اشد ضرورت ہوتی ہے لیکن اس کہانی کا اہم کردار نقل کو عقل سے، جوش کو ہوش سے لاتعلق سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جب سب کچھ کرنے کا مصمم ارادہ کرلو تو پھر جذبات اور احساسات کو پس پُشت ڈال دو۔ خود کو بے لگام موجوں کے حوالے کردو اور نتائج اللہ پر چھوڑ دو۔

جوش بےہوش

شائستہ نعیم

جاسوسی ڈائجسٹ، جولائی 1993ء
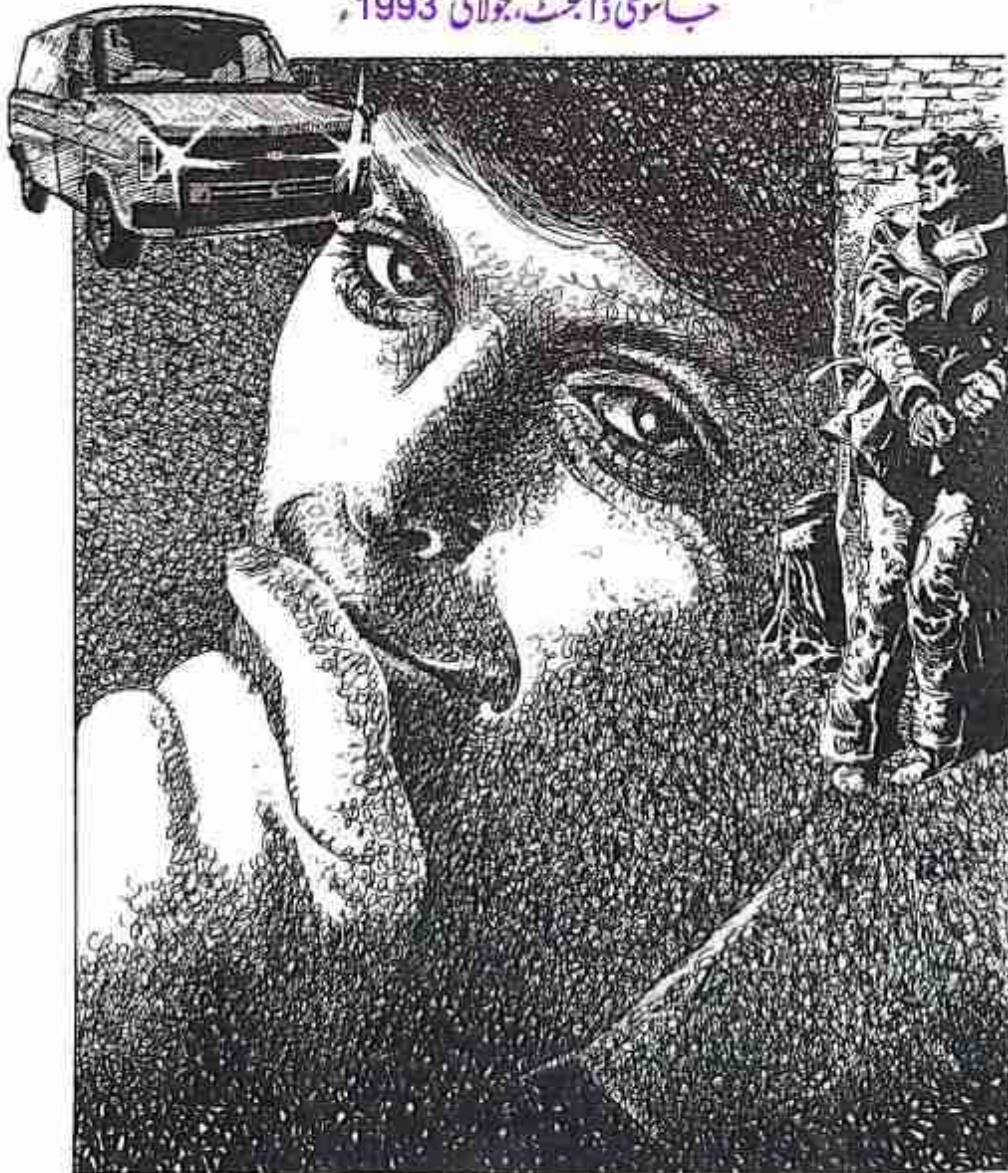
کی سی آئی ڈی سرگرمیوں کو کنٹرول کرتا تھا' کہا۔ "تم سمجھتے ہو کہ وہ اچھا سراغرساں ثابت ہوگا۔"

"جی ہاں' میرا یہی خیال ہے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ ہم اس کا نام آگے بڑھا دیں گے۔" ہیمن نے کہا۔ وہ بڑا معاملہ فہم آدمی تھا۔ اس نے یہ بتانا مناسب نہ سمجھا کہ یہ لفظ بہ لفظ وہی رپورٹ ہے' جو پڑیلا کے بارے میں سپرنٹنڈنٹ ہیکنس نے اسے دی تھی۔

"میں اسے سارجنٹ کرافٹ کے ساتھ لگا دوں گا۔" پڑیلا نے کہا۔ "جلد ہی اسے اندازہ ہو جائے گا کہ سراغرساں کا کام کوئی تفریح نہیں۔"

سارجنٹ کرافٹ شادی شدہ آدمی تھا۔ سی آئی ڈی کے دوسرے افسروں کی طرح اس کی عمر بھی کافی ہو چکی تھی۔ اتنی کہ اب مزید پروموشن کی خود فریبی بھی اس کے لئے ممکن نہیں تھی۔ دو مہینے میں اس نے اینڈریو کی بھی تقریباً ہر خود فریبی ختم کر دی۔

"یہ تو لگتا ہے کہ صرف فارم بھرنے کا کام ہے۔" اینڈریو نے کہا۔ "یہاں کبھی ایکشن کا موقع بھی ملتا ہے؟"

"ایکشن؟" سارجنٹ کرافٹ نے حیرت سے کہا۔ "ایکشن کی خواہش کیوں ہے تمہیں؟ تم نوجوانوں کے ساتھ خرابی ہی یہی ہے۔ چلو..... اب چھٹی کریں۔"

وہ ایک ساتھ گھر کی طرف چل دیے۔ آدھی رات ہو چکی تھی لیکن ایکس ڈویژن والے وقت کی قید سے آزاد تھے۔

"میں تو بور ہو گیا ہوں۔" اینڈریو نے کہا۔ "تمہیں کبھی ایکسائٹ منٹ سے واسطہ نہیں پڑتا؟"

"یہ میری پیشانی پر گھاؤ کا نشان دیکھ رہے ہو؟ یہ تحفہ مجھے اس وقت ملا' جب میں نوجوان اور بے وقوف تھا۔ میں ایک مسلح شخص کو گرفتار کر رہا تھا۔"

"تو اس نے تم پر گولی چلا دی؟"

"ہوا یہ کہ اس نے مجھ پر ریوالور تانا تو میں نے کہا' اسے جھکالو۔ مجھ پر گولی چلا کر تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس نے کہا..... اچھا! تو یہ لو۔ یہ کہتے ہوئے اس نے ٹریگر دبا دیا۔ میری خوش قسمتی کہ وہ ریوالور کو لوڈ کرنا بھول گیا تھا۔"

"لیکن یہ گھاؤ.....؟"

"سنو تو۔ اس نے ریوالور مجھ پر کھینچ مارا۔ اچھا..... اب مجھے یہاں سے مڑنا ہے۔ گڈ نائٹ۔"

"گڈ نائٹ۔" اینڈریو نے خشک لہجے میں کہا۔

اینڈریو فوراً ہی اپنی اقامت گاہ کی طرف نہیں چل دیا تھا۔ وہاں اس کے لئے کوئی کشش تھی بھی نہیں۔ وہ وہیں ساؤتھ بورڈ پرائمری اسکول کی کھیل کے میدان کی نیچی دیوار پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور اپنے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا۔ خیالات اس کے نوجوان ذہن پر یلغار کر رہے تھے۔

وہ سارجنٹ کرافٹ کے بارے میں سوچنے لگا۔ سارجنٹ خطاؤں کا پتلا تھا لیکن اس میں ایک بہت بڑی خوبی تھی۔ وہ راشی نہیں تھا' بکاؤ نہیں تھا اور اینڈریو نے اپنی مختصر زندگی میں راشی بہت دیکھے تھے۔ خود اینڈریو قدامت پرست تھا۔ لہٰذا وہ بکنے والوں کو ناپسند کرتا تھا۔ اس نے سوچا' عنقریب میں سارجنٹ کرافٹ کی جگہ لے لوں گا۔ پڑیلا کی طرح ڈی ٹیکیٹو انسپکٹر..... بلکہ شاید ہیمن کی طرح سپرنٹنڈنٹ بن جاؤں گا مگر مجھے کوئی چانس تو ملے.....

دور سے ایک کار آ رہی تھی..... بہت تیز رفتاری سے!

اینڈریو دیوار پر ایڑی مارتے ہوئے سوچتا رہا۔ اس سسٹم میں خرابی ہے' مسئلہ یہ ہے کہ اس سسٹم کے تحت تمام کریڈٹ.....

ارے..... ارے..... کار اسی کی طرف چلی آ رہی تھی۔

کار پہاڑی پر آ گئی۔ اس کی ہیڈ لائٹس روشن نہیں تھیں۔

اینڈریو نے جھپٹ کر اپنی ٹارچ جیب سے نکالی' اچھل کر دیوار سے اُترا' بیچ سڑک پر آیا اور کار کو رکنے کا اشارہ کیا۔ کار تقریباً اس کے سر پر پہنچ چکی تھی۔ "یہ تو رکنے والی نہیں لگتی۔" اینڈریو کے ذہن میں چھٹی حس کا یہ پیغام گونجا۔ اس کے ساتھ ہی اینڈریو نے سائیڈ میں چھلانگ لگائی۔

کار راکٹ کی سی رفتار سے اس کے پاس سے گزر گئی۔ ہلکا سا دھماکا ہوا۔ کچھ نکیلی چیزیں اُڑ کر اینڈریو کے چہرے سے ٹکرائیں۔

کار کے بریک چرچرائے۔ وہ گھومتی ہوئی بائیں جانب مڑی..... اس طرف جہاں سارجنٹ کرافٹ گیا تھا۔ انجن کی دہاڑ کم ہوتی گئی۔

اینڈریو نے ہاتھ پھیر کر دیکھا' اس کے چہرے پر خون تھا۔ اس کا ہاتھ لرزنے لگا۔ اس نے اپنی ٹارچ روشن کر کے فٹ پاتھ کا جائزہ لیا۔ کار لیمپ پوسٹ کے پاس سے گزری تھی اور اس کا سائیڈ مرر لیمپ پوسٹ سے ٹکرایا تھا۔ اس مرر کے ٹکڑے تھے' جو اس کے چہرے سے ٹکرائے تھے۔

اس نے خود کو سنبھالا اور اس طرف دوڑنا شروع کیا' جدھر کار گئی تھی لیکن یہ لاحاصل تھا۔ کیونکہ کار اس وقت تک سو گز دور جا چکی تھی۔ آگے اس نے ایک اور ٹارچ چمکتی دیکھی' کسی کو چلاتے سنا پھر ایسی آواز آئی' جیسے کار کسی سے ٹکرائی ہو۔ انجن کی آواز ایک لمحے کو رکی..... اور پھر کار کی رفتار بڑھتی گئی۔

اینڈریو بھاگتا رہا۔ اسے اپنی طبیعت بگڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ سڑک پر اسے سارجنٹ کرافٹ پڑا نظر آیا۔ وہ تقریباً اپنے گھر کے دروازے پر تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں ایک نظر ڈالنا ہی کافی تھا۔ کار سارجنٹ کے اوپر سے گزر گئی تھی!

اینڈریو گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور خود پر جبر کر کے ٹارچ کی روشنی میں معائنہ کرتا رہا۔ کار کے گزر جانے کے بعد گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ سارجنٹ کرافٹ دم توڑتی آواز میں کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اینڈریو نے کان اس کے ہونٹوں سے لگا دیے۔

چند لمحے بعد اسے احساس ہوا کہ سارجنٹ کرافٹ مسلسل اپنی بیوی کا نام دُہرا رہا ہے۔
چند سیکنڈ کے بعد وہ آواز رک گئی۔

○☆○

تین دن ہو گئے تھے۔ اس عرصے میں نیلے رنگ کے آسمان کے نیچے لندن تپتا رہا تھا۔ تھرما میٹرز میں پارہ بلندیوں کو چھو رہا تھا۔ اس دوران سارجنٹ کرافٹ کے اپنے اسٹیشن کے علاوہ 'ایکس ڈویژن اور میٹرو پولیٹن پولیس کے دیگر حلقے ان تھک کام کرتے رہے تھے لیکن پٹریلا کا خیال تھا کہ وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پائے ہیں۔ پرانے فیشن کی ایک بڑی کار نے ایک پولیس افسر کو کچل دیا تھا' جس نے اس کار کو روکنے کی کوشش کی تھی اور وہ کار بہت تیز رفتار تھی اور اس کی ہیڈ لائٹس بھی روشن نہیں تھیں۔ لہٰذا یہ اندازہ لگانا فطری تھا کہ وہ کار مجرموں کے استعمال میں تھی اور جرم یا تو کیا جا چکا تھا یا اسی وقت کیا جانے والا تھا۔ اس کے علاوہ اب تک اس کیس میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔
تیسری شام سپرنٹنڈنٹ تھمن نے بریک پر پاؤں رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے پٹریلا سے کہا۔ "میں تمہارے محسوسات سے واقف ہوں' مجھے ہمدردی ہے لیکن جتنی رفتار تم دکھا رہے ہو اور جتنی بھاگ دوڑ ہو رہی ہے' اس سے تم اسے حل نہیں کر سکو گے۔ اس مشین کو اپنے طور پر چلنے کے لئے آزاد چھوڑ دو۔ مجرم چین سے کبھی نہیں بیٹھتے۔ جلد ہی وہ خود تمہیں سراغ فراہم کریں گے۔"
پٹریلا ہچکچانے کے باوجود مان گیا۔ وہ گھر چلا گیا اور بارہ گھنٹے تک سوتا رہا۔
اگلی صبح اس نے معمول کے مسائل کی طرف توجہ کی جن کا گزشتہ تین دن میں ڈھیر لگ گیا تھا۔ کیونکہ اس عرصے میں کرافٹ کے قاتل کی ناکام تلاش کے سوا کچھ نہیں کیا گیا تھا۔ دُکانوں میں چوری کی کئی وارداتیں ہوئی تھیں۔ لوور کٹ کے ایک میلے میں غنڈہ گردی ہوئی تھی اور ایٹن روڈ پر ڈکیتی کی ایک واردات.....
"نمبر 7, ایٹن روڈ" سارجنٹ بلنگ نے بتایا۔ "یہ دُکان ہے' جس کے اوپر مکان ہے' مالک چھٹی منانے گیا ہوا ہے۔ اس کا منیجر ہفتے میں دو بار دیکھ بھال کے لئے آتا ہے۔ اس نے کچھ ہی دیر پہلے رپورٹ کی ہے۔"
"پچھلی بار وہ دُکان میں کب آیا تھا؟" پٹریلا نے پوچھا۔
"چار دن پہلے۔"
"چرایا کیا گیا ہے؟"
"وہ لوگ تجوری ہی اٹھا کر لے گئے۔ منیجر کا کہنا ہے کہ اس میں تین مہینے کی آمدنی تھی۔ حتمی فگرز تو مالک ہی آ کر بتائے گا۔ ڈاکوؤں نے پہلے تو تجوری کھولنے کی کوشش کی' نہیں کھلی تو وہ تجوری ہی لے بھاگے' اور ہاں..... چوری کی کار کی ایک اور رپورٹ درج کرائی گئی ہے۔ یہ کار چوری کا تین دن میں تیسرا کیس ہے۔

> بعض سیاست داں بڑے شقی القلب ہوتے ہیں۔ سُنا ہے بھارتی وزیرِ اعظم نرسمہا راؤ سے کسی نجومی نے کہا۔ "جس دن پوجا کے لیے جایا کرو اس دن کسی ظالم کا چہرہ نہ دیکھا کرو۔" تو نرسمہا راؤ نے کہا۔ "سوامی جی! آپ سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے کہ اس دن آئینے کے سامنے نہ جایا کرو۔"
>
> ڈاکٹر یونس کی کتاب "افرا تفریح" سے۔

ایک چوری کی کار کامن کی جنوبی سائیڈ میں ایک اندھیری گلی میں کھڑی ملی ہے۔ وہ دو ہفتے پہلے جیرارڈ اسٹریٹ سے چرائی گئی تھی۔"
پٹریلا نے کہا۔ "اینڈریو کو اس کار کو چیک کرنے کے لئے بھیجیں گے۔ اس جوان آدمی کو جتنا کام دیا جائے' اس کے لئے بہتر ہے۔" اس نے سوچا' اینڈریو ایک اور مسئلہ ہے۔ سارجنٹ کرافٹ کے قتل کی رات سے وہ کچھ عجیب سا ہو رہا تھا۔ یہ نہیں کہ وہ اداس ہو یا کام کرتے ہوئے ہچکچا رہا ہو۔ بس وہ خاموش اور چڑچڑا ہو رہا تھا۔ لگتا تھا' اپنے ہی کسی مسئلے میں الجھا ہوا ہے۔
"اس نے اس واقعے کو مسئلہ بنا لیا ہے۔" سارجنٹ بلنگ نے کہا۔ "حالانکہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا اور وہ کار اگر اکیلے کرافٹ کو کچلنے کے بجائے اینڈریو کو بھی کچل دیتی تو صورتِ حال کچھ بہتر تو نہیں ہو جاتی۔"
"بالکل نہیں۔ تم ایسا کرو' اسے اس کار کی چیکنگ کے لئے بھیج دو۔ ہم جا کر ایٹن روڈ والے کیس کو چیک کرتے ہیں۔ وہ پروفیشنلز کا کام معلوم ہوتا ہے۔"

○☆○

اینڈریو نے بازیاب شدہ کار کا جائزہ لیا۔ وہ بیس سال پرانی بنٹلے تھی۔ پرانی ہونے کے باوجود وہ بہت اچھی حالت میں تھی۔ سیٹ کوَر بہت صفائی سے چڑھائے گئے تھے۔ پٹرول کانسٹیبل نے اگر اس کا نمبر چیک نہ کر لیا ہوتا تو وہ بلاشبہ مہینوں اس اندھی گلی میں کھڑی رہتی۔ لندن کے لوگ ایسے ہی ہیں..... دوسروں کے معاملات میں تجسس نہ کرنے والے۔
اینڈریو نے کار کے سیٹ کوَرز ہٹائے پھر اس نے سیٹوں کی اور نیچے فرش کی اچھی طرح سے تلاشی لی۔ اس نے اپنی ٹارچ روشن کر لی تھی۔ ٹول کٹ میں اسے انسپکشن لیمپ نظر آیا۔ اس نے اسے لگا کر دیکھا۔ کار کی بیٹری فل پاور میں تھی۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ کار کو اس گلی میں کھڑے زیادہ دن نہیں ہوئے ہیں۔
لیمپ کی روشنی میں اسے دو ایک چیزیں ایسی نظر آئیں'

جنہوں نے اسے الجھن میں ڈال دیا۔ عقبی سیٹ پر اور کار کے پچھلے فرش پر باریک بُرادے کی خاصی مقدار موجود تھی۔ وہ بہت باریک اور خشک بُرادہ تھا۔ اس نے سوچا' کسی سخت لکڑی.... مثلاً مہاگنی یا ٹیک کا بُرادہ لگتا ہے۔ کار کے دروازے پر خاصا گہرا کھرونچا تھا.... اچھا خاصا ڈینٹ کہہ لیں اور اس کے اندر گلوس پینٹ کے کچھ ذرّے موجود تھے۔ ایسا پینٹ عام طور پر الماریاں بنانے والے استعمال کرتے ہیں۔ اس نے شفاف لفافوں میں بُرادے اور پینٹ کے نمونے رکھ لیے۔

اس کے بعد اس نے ٹائروں کا معائنہ کیا۔ وہاں اسے ایک ایسی چیز نظر آئی جو واضح طور پر سمجھ میں آنے والی تھی۔ ٹائر کے ڈیزائن کی درزوں میں باریک' زرد بجریلے کنکر اندر تک اترے ہوئے تھے۔ ڈرائیو وے میں جو بجریلے کنکر بچھائے جاتے ہیں' وہ ویسے ہی تھے۔ اینڈریو نے ان کا بھی نمونہ رکھ لیا۔

"یہ کار کسی ایسے ڈرائیو وے میں کھڑی رہی ہے جہاں حال ہی میں بجریلے کنکر بچھائے گئے ہیں۔" اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "اور یہ کار اس ڈرائیو وے میں ایک سے زائد مرتبہ لائی اور لے جائی گئی ہے۔"

وہ سیدھا کھڑا ہو رہا تھا کہ اسے ایک اور چیز نظر آئی۔ کار کا سائیڈ مرر ندارد تھا۔ اس نے قریب جا کر معائنہ کیا۔ جہاں ایک ہاتھ سا آئینے کو پکڑے ہوتا ہے' آئینہ وہیں سے ٹوٹا ہوا تھا۔

یہاں تک اینڈریو کا رویّہ ایک اچھے پولیس افسر کا رویّہ تھا۔ وہ وقتی ہیجان اور ذہنی انتشار میں اس مرر کی کرچیوں کا تذکرہ کرنا بھول گیا تھا' جس نے اس کے رخسار پر خراشیں ڈالی تھیں تو اس میں شکایت کی کوئی بات نہیں تھی مگر اب وہ جو کچھ کہہ رہا تھا' اس کے لئے اس کے پاس کوئی عذرِ لنگ بھی نہیں تھا۔

سراغرسانی سے متعلق کسی بھی فورس کے لئے پہلا...... اور کبھی کبھی آخری اصول یہ ہوتا ہے کہ معلومات آپس میں بانٹی جاتی ہیں۔ اینڈریو نے اس اصول کو نظر انداز کر دیا۔ جن وجوہات کے تحت انہوں نے ایسا کیا' ان کی لفظوں میں وضاحت بہت دشوار ہے۔ اب اینڈریو کسی کو کیسے بتاتا کہ اس نے خود پر اپنے ضمیر کی عدالت میں مقدمہ چلایا.... اور خود کو مجرم پایا۔ اس نے جان لیا کہ سارجنٹ کرافٹ کو نہیں' مرنا اسے چاہئے تھا۔ بینائی چھین لینے والے اس لمحے میں اگر اس نے اپنی مردانگی نہ کھوئی ہوتی تو کرافٹ کے بجائے وہ مرتا۔ اب اس مردانگی کو واپس لانے کی ایک ہی صورت تھی۔ کرافٹ کے قاتلوں کی گرفتاری! اور عام گرفتاری نہیں..... انہیں صرف اس کے ہاتھوں گرفتار ہونا تھا۔

اس اندھی گلی کے سناٹے میں کار کے پاس کھڑا اینڈریو دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر اس نے اسکاٹ لینڈ یارڈ کا رخ کیا۔ وہاں وہ اپنے دوست سراغ رساں بیسٹ سے ملا۔ دونوں ایک ساتھ بھرتی ہوئے تھے۔ اب بیسٹ لیبارٹری میں تھا۔ اینڈریو نے اسے تین شفاف لفافے دیئے۔ "تم انہیں جلدی سے چیک کر دو۔" اس نے بیسٹ سے کہا۔ "ان میں ایک تو میرے خیال میں بُرادہ ہے لیکن میں یقینی طور پر جاننا چاہتا ہوں۔ دوسرا پینٹ ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ پینٹ کس قسم کا ہے۔ تیسرے لفافے میں باریک کنکر ہیں۔ ان میں الجھن والی کوئی بات بظاہر نہیں ہے۔"

"کہاں سے اٹھالائے ہو یہ کباڑ؟" بیسٹ نے بے تکلفی سے پوچھا۔

"ایک مسروقہ کار میں سے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں چیک کرلوں گا۔ رزلٹ کہاں بھجواؤں؟"

"اگر کوئی کام کی بات ہو تو مجھے فون کر لینا یا گیبرل اسٹریٹ اسٹیشن پر چند سطری پیغام بھجوا دینا۔"

"یہ گیبرل اسٹریٹ کہاں ہے؟" بیسٹ نے پوچھا۔ اس کے خیال میں لندن ٹیمز سے شروع ہو کر ٹیمز پر ختم ہو جاتا تھا۔

اینڈریو نے اسے گیبرل اسٹریٹ کا محل وقوع سمجھایا اور رخصت ہو گیا۔ وہ اب تک لنچ بھی نہیں کر سکا تھا اور ابھی کام بہت پڑا تھا.... اور کام بھی ٹانگوں کی ورزش والا۔ سب سے پہلے وہ ایک تعمیراتی کمپنی کے دفتر گیا جو ٹون برج اسٹریٹ میں تھا۔

"باریک بجری؟" معمار نے کہا۔ "وہ اس علاقے میں زیادہ استعمال نہیں ہوتی۔"

"مگر مجھے چاہیے۔ میں کس سے ملوں اس سلسلے میں؟"

معمار نے کچھ دیر سوچنے کے بعد اسے ایک فرم کا نام بتایا۔ اینڈریو وہاں چلا گیا۔ انہوں نے اسے ایک اور فرم کی طرف دھکیل دیا۔ وہاں سے اسے تیسری فرم کا پتا دیا گیا۔ اس وقت تک ساڑھے تین بج چکے تھے اور گرمی نے اینڈریو کو بے حال کر دیا تھا۔

تیسری فرم سے اینڈریو کو ایک لیڈ ملی۔ انہیں یاد تھا کہ کوئی دو ماہ پہلے انہوں نے آرڈر پر زرد باریک بجری فراہم کی ہے۔ کسے؟ ایک کنٹریکٹر کو' جو کامن کے جنوبی سرے پر فلیٹس کا ایک بلاک تعمیر کر رہا تھا۔

یہ رکلیو اینڈریو کی سوچ سے مطابقت رکھتا تھا۔ مجرموں نے تجوری وہاں پہنچائی ہوگی' جہاں وہ اس پر سکون سے کام کر سکیں پھر انہوں نے کار سے پیچھا چھڑایا ہوگا اور اندھی گلی میں کار چھوڑنے والے کو واپسی کا سفر پیدل کرنا پڑا ہوگا۔ اینڈریو جانتا تھا کہ تمام مجرم کاہل ہوتے ہیں۔ بہت زیادہ پیدل نہیں چلنا چاہتے۔ اندھی گلی سے کامن کے اس مقام کا فاصلہ بمشکل آدھا میل ہوگا۔ یعنی بات بن رہی تھی۔

اینڈریو نے مذکورہ فلیٹس کا رخ کیا۔ وہاں پہنچ کر اس کا دل بلّیوں اچھلنے لگا۔ بجری بالکل ویسی ہی تھی۔ ایسے چمکیلے زرد رنگ کی بجری کوئی عام چیز نہیں۔ ہر جگہ نظر نہیں آتی۔ دھوکے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ فلیٹس کے عقب میں گیراج بنے تھے۔

اینڈریو نے پورٹر کو تلاش کیا اور اسے اپنا کارڈ دکھایا۔

یہاں پہنچ کر گاڑی رک گئی۔ پورٹر کو پورا پورا یقین تھا کہ اس طرح کی بنٹلے گزشتہ دو مہینوں میں فلیٹ کے کسی گیراج میں بھی نہیں دیکھی گئی ہے۔ پورٹر اس اعتبار سے مستند آدمی تھا کہ کسی زمانے میں ایک مکینک کے ساتھ کام کرچکا تھا اور گاڑیوں کی سمجھ بوجھ رکھتا تھا۔

"بنٹلے دیکھی ہوتی تو میں بھول ہی نہیں سکتا تھا۔" پورٹر نے کہا۔ "یہاں تو بیشتر فیملی کاریں ہیں۔ چھوٹی چھوٹی اور نازک ایسی کہ ٹک کر کھڑے ہو جاؤ تو ڈینٹ پڑ جائے۔ جنگ سے پہلے کی کاروں کی کیا بات ہے۔ اس میں تو اسٹیل استعمال ہوتا تھا.... اسٹیل اور انجن بے مثال......"

اینڈریو کی بے اطمینانی دیکھ کر اس نے چابیاں نکالیں اور ایک ایک گیراج کھول کر دکھایا۔ اس نے درست کہا تھا۔ ہر گیراج میں چمچاتی، چھوٹی جدید کار کھڑی تھی۔

"میں یہ نہیں کہتا کہ ان میں سے کسی کے پاس دوسری کار نہیں ہوگی" پورٹر نے کہا۔ "لیکن وہ رکھی کہاں جائے گی۔ کھلے میں رکھی جاتی تو مجھے ضرور نظر آتی۔"

اینڈریو کو اس سے متفق ہونا پڑا پھر اسے یہ احساس بھی ہوا کہ وہ فلیٹ مجرموں کے ایسے گینگ کے لئے ہرگز مناسب نہیں، جو کوئی تجوری لا کر وہاں سکون سے توڑنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اب جو صورتِ حال ہے، اس میں اسے کسی نہ کسی پر اعتماد کرنا ہوگا۔ اس نے پورٹر کو کسی حد تک صورتِ حال بتا دی۔

"یہ آپ مجھے پہلے بتا دیتے تو اتنا وقت ضائع نہ ہوتا۔" پورٹر نے کہا۔ "وہ اُدھر ایک مکان ہے...." اس نے ایک سمت اشارہ کیا۔ وہاں درختوں کے درمیان چمنیاں نظر آ رہی تھیں۔ "پرانے طرز کا اکیلا مکان، انہوں نے بھی ہمارے ساتھ ہی اپنا ڈرائیو وے بنوایا تھا۔ بجری بھی اسی فرم سے لی تھی، جس سے ہم نے لی ہے۔ اب سوچتا ہوں تو یاد آتا ہے۔ میں نے دیکھی تو نہیں لیکن بہت رات گئے ایک کار کی آواز سنتا رہا ہوں۔ وہ آپ کی مطلوبہ بنٹلے ہو سکتی ہے اور وہیں آپ کے مطلوبہ لوگ ہوں گے۔"

"بہت بہت شکریہ۔" اینڈریو نے کہا۔

○☆○

انسپکٹر پٹریلا نے بھی مصروف دن گزارا تھا۔ صبح کا ابتدائی وقت اس نے نمبر 7 رامٹن روڈ میں گزارا۔ مکان کے مالک سے اب تک رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ خیال کیا جا رہا تھا کہ وہ چینل آئی لینڈز میں ہوگا۔

"میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ معقول لوگوں کی طرح وہ اپنی رقم بینک میں کیوں نہیں رکھ سکتا۔" پٹریلا نے کہا۔

"آج کل بینک بھی تو اتنے اچھے نہیں رہے۔" سارجنٹ بلنگ بولا۔

"لیکن اس سے تو بہتر ہیں۔" پٹریلا نے دیوار کے سوراخ کی

طرف اشارہ کیا' جہاں نقب لگائی گئی تھی' اس سوراخ کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا تھا کہ تجوری تین فٹ چوڑی اور دو فٹ اونچی رہی ہوگی۔

"خوب کام دکھایا ہے بدبختوں نے۔" سارجنٹ بلنگ نے کہا۔

ایک گھنٹے بعد کرمنل ریکارڈز آفس والے بھی یہی بات کہہ رہے تھے..... لیکن مختلف انداز میں۔ "ایسے گروہ کم ہی ہیں جو تجوری بھی لے بھاگیں۔" ریکارڈ آفس کا سارجنٹ فلپس کہہ رہا تھا۔ "اس کے لئے منظم ہونا ضروری ہے۔ ٹرالیاں' جیک اور جانے کیا کیا۔ اگر وہ تجوری کو کاٹنا چاہتے ہیں تو ان کے لئے ضروری سازو سامان تجوری تک لے جانا آسان ہوگا۔ نہ کہ تجوری کو سامان تک لے جانا۔ سمجھ رہے ہونا؟"

"ہاں' سمجھ رہا ہوں۔" پٹریلا نے کہا۔ "لیکن یہ واردات میرے لئے ایک نیا تجربہ ہے۔"

"ایک شخص ہے....." سارجنٹ فلپس نے اپنے ریکارڈز کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔ "کیا نام ہے اس کا..... امریکی پولش ہے وہ..... ہاں ڈوبروسکی۔" اس نے ایک کارڈ باہر کھینچ لیا۔ "خیال کیا جاتا ہے کہ جنوبی لندن اس کا میدان ہے۔ زیادہ تر دکانیں اس کا ہدف بنتی ہیں۔"

پٹریلا نے کارڈ لے کر پڑھا۔ "ہرمن ڈوبروسکی۔ فوج سے بھاگا۔ چھ ماہ کی سزا ہوئی۔ تین ماہ معاف کردیے گئے۔ پولیس مین پر حملہ... چھ ماہ کی سزا....." وہ کارکردگی اور نتائج کی ایک طویل فہرست تھی۔ کار چرانا..... ڈکیتی..... مارپیٹ..... تشدد.....

تین یا چار افراد کا گروہ بناتا ہے۔ تجوریوں کو اٹھا کرلے جانا اس کی اسپیشلٹی ہے۔ عمومی طریق کار یہ ہے کہ ایک بڑی' کھلی کار چرائی جاتی ہے اور کسی واردات تک اسے چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ واردات کرتے ہی کار سے پیچھا چھڑا لیا جاتا ہے....." ساتھ ہی سرخ روشنائی سے لکھا تھا۔ "ہمیشہ مسلح رہتا ہے۔"

"یہ تو تمام کڑیاں مل رہی ہیں۔" پٹریلا نے کہا۔ "کامن کے علاقے میں ایک کار ملی ہے۔ لگتا ہے' وہ اس واردات میں استعمال کی گئی ہوگی۔ بہت بہت شکریہ سارجنٹ۔"

"ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں جناب۔" سارجنٹ فلپس نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

پٹریلا ڈوبروسکی کے لئے ہر طرح کے جال بچھانے میں مصروف ہوگیا۔ ایک ٹیلی ٹائپ پیغام کمپوز کیا جارہا تھا۔ رابطے کیے جانے تھے......

دوپہر کے وقت وہ رقعہ آیا۔ اس پر ڈی ٹیکٹو اینڈریو کا نام تھا لیکن رقعہ سرکاری لفافے میں تھا۔ اس پر پرائیویٹ بھی نہیں لکھا تھا۔ چنانچہ سارجنٹ بلنگ نے اسے کھول لیا۔ رقعہ پڑھتے ہی وہ اسے لے کر انسپکٹر پٹریلا کی طرف لپکا۔ "میرا خیال ہے' اسے ایک نظر دیکھ لیں۔ یہ کچھ چیزوں کے بارے میں رپورٹ ہے' جو اینڈریو نے صبح اسکاٹ لینڈ یارڈ بھجوائی تھیں۔"

پٹریلا نے رقعہ پڑھا۔ "تمہیں اس بارے میں معلوم تھا؟" اس نے پوچھا۔

"بالکل بھی نہیں۔" سارجنٹ بلنگ نے کہا۔

"اینڈریو کہاں ہے؟"

"صبح وہ اس کار کا معائنہ کرنے کے لئے گیا تھا۔ تب سے اسے نہیں دیکھا ہے۔"

پٹریلا پھر رپورٹ پڑھنے لگا۔ بجری والا معاملہ تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ البتہ پینٹ کے ذروں نے اسے چونکا دیا۔ "ڈارک گرین...... ایسا پینٹ' جو دھاتی سطح پر کیا گیا تھا! اور یہ کیا..... برادہ؟ سخت لکڑی' ممکنہ طور پر ٹیک کا برادہ' جس میں خاصی مقدار..... کس چیز کی ملائی گئی ہے؟"

"میں نے برادے میں پھٹکری کی قلموں کی آمیزش کے بارے میں پڑھا تو مجھے خیال آیا کہ یہ آپ کو دکھائی چاہئے۔" سارجنٹ بلنگ نے کہا۔

"اگر یہ رپورٹ ان چیزوں کے متعلق ہے' جو اینڈریو کو مسروقہ کار میں ملی تھیں' اور اگر اینڈریو اپنے طور پر اس کیس کے پیچھے پڑ گیا ہے تو بہتر یہی ہے کہ جلد از جلد اینڈریو کو تلاش کرلیا جائے۔ جلدی کرو بلنگ۔"

پٹریلا نے وال کلاک کو دیکھا۔ ساڑھے تین بجے تھے۔ اینڈریو پانچ گھنٹے سے غائب تھا اور وہ کہیں بھی ہوسکتا تھا..... اپنے ڈسٹرکٹ میں یا ڈسٹرکٹ سے باہر۔

"میں ایک کار عملے سمیت لے کر جارہا ہوں۔" اس نے بلنگ کو بتایا۔ "کاز وے سے کچھ اور عملہ پکڑو اور انہیں اسٹینڈ بائی رہنے کی ہدایت کرو۔ یہ بھی کہنا کہ وہ وائرلیس پر رابطہ رکھیں۔ تم یہاں کے پیغامات سنبھالتے رہو۔ تمام پولیس باکسز اور اسٹیشنوں سے رابطہ رکھنا اور پیغامات نوٹ کرنا۔"

○☆○

ایک مایوس کن گھنٹا گزر گیا!

وہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک رینگتے رہے۔ ڈیوٹی آف کرنے والے ایک پولیس مین نے اینڈریو کو تین بجے دیکھا تھا۔ ایک اور پولیس مین نے چار بجے سے کچھ پہلے اس کے ساتھ وقت گزارا تھا۔ اس کے آگے اینڈریو کا کوئی سراغ نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ سڑکوں پر چلتے چلتے اچانک غائب ہوگیا تھا۔

دوسری کار وقفے وقفے سے وائرلیس پر رابطہ کرتی رہی لیکن پٹریلا کے پاس کوئی اطلاع ہی نہیں تھی کہ وہ انہیں کسی ایکشن کی ہدایت دیتا۔ سوا چار بجے اس نے اپنے ڈرائیور کو گیبرل اسٹریٹ واپس چلنے کی ہدایت دی۔

سارجنٹ بلنگ کے پاس ٹیلی فون پر موصول ہونے والے

پیغامات کا انبار لگا تھا لیکن اس میں کام کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔
"لگتا ہے کہ اینڈریو پیدل چلنے کا عالمی ریکارڈ قائم کرنے کے چکر میں ہے۔" بلنگ نے پڑیلا کو بتایا۔ "لیکن یہ تمام اطلاعات تین بجے سے پہلے کی ہیں اور اب تو اندھیرا ہو رہا ہے۔"
"طوفان کی آمد آمد ہے۔" پڑیلا نے کہا۔
ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ٹیلی فون کے سب سے قریب پڑیلا ہی تھا۔ اس نے ریسیور اٹھالیا۔
"میں کامن سے گرووز بول رہا ہوں، مجھے پتا چلا ہے کہ تم نوجوان اینڈریو کو تلاش کر رہے ہو؟"
"ہاں۔ تمہیں وہ ملا تھا کہیں؟"
"نہیں لیکن ہمارے ایک آدمی کی جنوبی علاقے میں جو نئے فلیٹ بنے ہیں، اس کے پورٹر سے بات ہوئی ہے...."
سارجنٹ بلنگ ٹیلی فون کی کھرکھراہٹ سنتے ہوئے سوچتا رہا کہ دوسری طرف سے کیا کہا جارہا ہوگا پھر اس نے اچانک پڑیلا کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھا۔
"شکریہ۔" پڑیلا نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ "ان نئے فلیٹس کے پیچھے ایک پرانے طرز کا بڑا مکان۔ ہم ابھی دیکھتے ہیں۔"
اگلے ہی لمحے بلنگ تنہا تھا۔ باہر سے اسے ایک دروازہ بند ہونے کی.... اور پھر دو گاڑیوں کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔

○☆○

اینڈریو نے اس مکان کے دروازے پر چند لمحے توقف کیا۔ وہ مکان کیا، اچھی خاصی حویلی تھی۔ کسی زمانے میں عظیم الشان کہلاتا ہوگا لیکن اب وہ رنگ و روغن سے محروم تھا۔ مرمت کی ضرورت بھی ظاہر ہو رہی تھی۔
مکان کا باغیچہ حیرت انگیز طور اچھے حال میں تھا۔ ڈرائیو وے حال ہی میں بنایا گیا تھا لہٰذا چمک رہا تھا۔ وہاں زرد چمکیلی بجری استعمال کی گئی تھی۔ اینڈریو کو ڈرائیو وے میں ٹائروں کے نشانات نظر آئے تھے۔ کوئی بھاری گاڑی حال ہی میں اندر بھی آئی تھی اور باہر بھی گئی تھی۔
اندھیرا ہو گیا تھا۔ اینڈریو نے حیرت سے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا۔ ابھی صرف ساڑھے چار بجے تھے لیکن آسمان پر اندھیرا چھا رہا تھا۔ سناٹا اس قدر گہرا تھا کہ سو گز دور فلیٹس میں چلنے والی لفٹس کی گھرگھراہٹ اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ سڑک پر ایک سائیکل سوار کھنکارا تھا۔
اینڈریو نے اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔
دروازہ ایک موٹے آدمی نے کھولا، جو اوور آل پہنے ہوئے تھا۔ اس نے دروازہ کھولنے میں ایسی پھرتی دکھائی تھی کہ لگتا تھا، وہ ایک ہاتھ کنڈی پر رکھے کسی کی آمد کا منتظر رہا ہوگا۔
اینڈریو نے اپنا تعارف کرایا۔
"آیئے.... تشریف لایئے۔" موٹے نے اندر ہال کے اس طرف ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا پھر خود اس کی طرف بڑھ گیا اور اسے آدھا کھول دیا۔
اینڈریو وہاں پہنچا تو عقب سے کسی نے اس کے کندھوں کے درمیان وار کیا۔ اینڈریو آگے کی طرف گرا اور دروازے کے کنارے سے ٹکرایا۔ جھٹکے سے دروازہ کھل گیا۔ اینڈریو اندر گرا۔ وہ ایک کمرا تھا۔
وہاں دو آدمی موجود تھے، جو اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ "تم ہمیشہ سر کی ٹکر سے دروازہ کھولتے ہو؟" ان میں جو بھاری بھرکم تھا، اس نے پوچھا۔
"یہ کچھ سروالا لونڈا ذہنی ٹیکیٹو ہے۔" دوسرا بولا۔ اس کے سر کے بال سفید اور رخسار گلابی تھے۔
اینڈریو نے کچھ نہیں کہا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اب ستارے ناچ رہے تھے۔
"اب سُنا ڈالو جلدی سے۔" بھاری بھرکم آدمی نے کہا۔ اس کا چہرہ جھریوں سے بھرا تھا۔ لہجہ امریکیوں کا سا تھا۔
اینڈریو اب جھٹکے سے سنبھل رہا تھا۔ کمرے کے اُفتادہ گوشے میں اسے ایک تجوری رکھی نظر آئی۔ تجوری دیوار سے لگی رکھی تھی۔ اس کا پٹ اُکھاڑ دیا گیا تھا۔ "مجھے تم سے کچھ سوالات پوچھنے ہیں۔" اینڈریو نے پُروقار لہجے میں کہا۔
"اور اگر میں تمہارے موزے اُتار کر تمہارے مُنہ میں ٹھونس دوں تو کیا ہوگا؟"
"میرے سوالوں کا جواب نہیں دو گے تو پھر تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے اینڈریو نے ایک قدم آگے بڑھایا۔
"ایسی کوشش نہ کرنا۔ ہاں، اپنے لئے ایک اور پیٹ بنوانا چاہتے ہو تو کرلو۔" بھاری بھرکم آدمی کا داہنا ہاتھ تیزی سے اپنے کوٹ کی جیب میں گیا۔ باہر آیا تو اس میں ریوالور موجود تھا۔
اینڈریو اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔
"ہاں.... یہ ٹھیک ہے۔"
کچھ دیر خاموشی رہی پھر اوور آل والے موٹے نے کہا۔
"اب اس کا کیا کریں گے ہم؟"
اینڈریو کو احساس ہوا کہ وہ نقل مکانی میں مخل ہوا ہے۔ وہاں شیلف اور الماریاں خالی تھیں۔ دروازے کے پاس تین بڑے سوٹ کیس رکھے تھے۔
"ایک پیکنگ کیس اوپر بھی ہے۔ اسے نیچے لے آؤ۔" بھاری بھرکم آدمی نے کہا۔
"اور ایک ہتھوڑا؟"
"اور چار انچ کی کیلیں۔ ہم اس لڑکے کو باندھیں گے، پیک کریں گے اور مال گاڑی کے ذریعے اسکاٹ لینڈ یارڈ بھجوا دیں گے۔ انہیں یقیناً خوشگوار حیرت ہوگی۔"

اینڈریو اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کا سراغرسانی کا کیریر' جو کچھ دیر پہلے بہت تابناک نظر آرہا تھا' اب قریب الختم ہے۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اگر اس بار بھی خود کو صورتِ حال کے سپرد کردیا تو آئندہ کبھی اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوسکے گا اور اگر.......

ریوالور بردار شخص دو گز دور کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس پر چھلانگ لگانے میں بچت کا کوئی امکان نہیں تھا۔

لیکن اینڈریو نے اس پر چھلانگ لگا دی!

O☆O

ریوالور والا ہاتھ اٹھا۔ دو دھماکوں کی بازگشت آپس میں گھل مل گئی۔ ایک دھماکا کمرے کے اندر ہوا تھا مگر اس کی آواز کو باہر کے دھماکے نے نگل لیا تھا اور باہر کا دھماکا طوفان کا تھا۔ طوفان اچانک یوں پھٹ پڑا تھا' جیسے آسمان نیچے گر پڑا ہو۔ بارش کی بوچھاڑ ایسی تھی کہ الاماں...

یا تو طوفان کی دہاڑ نے اس کے نشانے کو اپ سیٹ کردیا تھا۔ یا پھر اینڈریو کے احمقانہ اور ناقابلِ یقین اقدام نے اسے حیران کردیا تھا۔ بہر حال اہمیت اس بات کی تھی کہ نشانہ خطا ہوگیا تھا۔ نیچا اور سیدھا نشانہ لینے کے بجائے ڈوبروسکی نے اونچا اور بائیں جانب شوٹ کیا تھا۔

تاہم اس نے اینڈریو کو مس نہیں کیا۔ اتنے سے فاصلے سے مس کرنے کی گنجائش ہی نہیں تھی لیکن گولی پیٹ میں یا سینے میں لگنے کے بجائے اینڈریو کی ہنسلی کی ہڈی کے نیچے لگی اور کندھے سے باہر نکل گئی۔ اس سے اینڈریو کا داہنا ہاتھ بے کار ہوگیا لیکن وہ گولی مارنا تو کجا' اینڈریو کو روک بھی نہ سکی۔ اینڈریو نے اپنے بائیں ہاتھ سے اپنے دشمن کی گردن میں لاک لگایا۔ پھر وہ گرتا چلا گیا۔ ڈوبروسکی کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ بھی اس کے ساتھ سعادت مندی سے گرے ورنہ اس کی گردن ٹوٹ جاتی۔

سفید بالوں والے آدمی کے پاس بھی ریوالور تھا۔ اس نے ریوالور نکالا بھی.... لیکن پھر اسے ریوالور ہٹانا پڑا۔ اینڈریو' ڈوبروسکی کے نیچے تھا..... اور وہ دونوں ایک ہی کانٹے میں پھنسی دو مچھلیوں کی طرح فرش پر لڑھک رہے تھے۔ ایسے میں گولی چلانا بے سود ہی ہوتا۔

پھر سفید بالوں والے نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اب یہ ضروری نہیں ہے۔ اس نے میز پر سے بوتل اٹھائی اور اینڈریو کے سر پر وار کرنے کے لئے بڑھا......

O☆O

پٹریلا کی پارٹی ڈرائیو وے میں پہنچی تھی کہ طوفان نازل ہوگیا۔ گاڑیوں کی کھڑکیاں بند کرنے کا موقع نہیں تھا۔ آگے والی کار پوری رفتار سے ڈرائیو کی جاتی رہی۔ اسے عین دروازے کے سامنے روکا گیا۔ پٹریلا اچھل کر کار سے اُترا۔ اس نے دروازے سے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کی لیکن طوفانی بارش کے شور نے ہر آواز کو نگل لیا تھا۔ "دروازہ توڑ دو۔" اس نے کہا۔

اس کے ایک ماتحت نے کار سے چودہ پونڈ کا ہتھوڑا نکالا اور بڑی مہارت سے دروازے پر لاک کے عین نیچے مارا۔ دروازہ کھل گیا۔

سفید اوور آل پہنے ہوئے موٹے آدمی کی قسمت ہی خراب تھی کہ وہ دروازے پر ہی کھڑا ہوا تھا۔ اندر داخل ہونے والے پہلے شخص نے اسے گرایا اور بعد والے اسے روندتے چلے گئے۔

سفید بالوں والے نے کھڑکی کے راستے بچ نکلنے کی کوشش کی اور اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھا۔

جہاں تک ڈوبروسکی کا تعلق ہے' جب پٹریلا نے اسے اینڈریو کی گردن توڑ آہنی گرفت سے نجات دلائی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔

O☆O

'میں آپ کی توجہ......' پٹریلا بیٹھا ڈسٹرکٹ کے لئے سرکاری رپورٹ لکھ رہا تھا۔ 'عبوری ڈی ٹیکٹو اینڈریو کی بے مثال جرأت اور مستقل مزاجی کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ محض تجربے کی کمی کی وجہ سے وہ یہ نہیں سمجھ سکا کہ بُرادے میں ملی چٹکری کی قلمیں پرانے طرز کی تجوریوں کو ایسے کھولنے میں استعمال ہوتی ہیں کہ آگ بھی نہ لگے اور پینٹ کے ذرّے ڈارک گرین دھاتی سطح سے اکھڑے تھے۔ یوں یہ بات صاف ہوجاتی تھی کہ اس مسروقہ کار کا تعلق ایشٹن روڈ کی ڈکیتی سے ہے۔

اگر ڈی ٹیکٹو اینڈریو تجربہ کار ہوتا اور یہ بات سمجھ لیتا تو مجھے یقین ہے کہ اس نے اپنے طور پر پورے معاملے کو نمٹانے کی ہرگز کوشش نہ کی ہوتی۔' پٹریلا لکھتے لکھتے رکا اور پین کا پچھلا حصہ چبانے لگا۔ باہر بارش کے بعد ہر چیز دُھلی دُھلی اور تروتازہ لگ رہی تھی۔

پٹریلا کو رپورٹیں لکھنا بہت برا لگتا تھا۔

در حقیقت جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا' وہ یہ تھا کہ پولیس کے کام میں جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت پڑتی ہے' وہ جرأت اور حوصلہ ہی ہوتا ہے' اور وہ کہنا چاہتا تھا کہ اس کے خیال میں اینڈریو نے بہت اچھی کارکردگی دکھائی ہے لیکن یہ تاثر منتقل کرنے کے لئے اسے دفتری خط و کتابت کے مروّجہ ذخیرۂ الفاظ میں لفظ نہیں مل رہے تھے۔

KENDREW'S PRIVATE WAR
MICHAEL.GILBERT

جاسوسی ڈائجسٹ، جولائی 1993ء

دُھن کا دھوکا

یاسر محمد

چونکا دینے والے انجام کی قاتل کہانی

ایک بے ربط نغمے کی دُھن اُس کے ذہن سے چمٹ گئی تھی۔ اُسے یاد نہیں آرہا تھا کہ اُس نے وہ دُھن کہاں سے سُنی تھی لیکن جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ شہر میں مصروف ایک قاتل اسی دُھن پر لڑکیوں کو قتل کر رہا ہے تو اس کی پریشانی میں اضافہ ہوگیا

میک اس روز بیدار ہوا تو وہ دُھن اس کے ذہن میں پہلے سے موجود تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کس نغمے کی دُھن تھی، اس کے ذہن میں کیوں کر آئی تھی اور وہیں کیوں اٹک گئی تھی؟ اس نے اس دُھن کو ذہن سے جھٹکنے کی بہت کوشش کی مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔

وہ قطعی غیر ارادی طور پر سیٹی میں وہ دُھن بجانے لگا۔ بظاہر وہ ایک دُھن تھی، اس کے باوجود بے سُری بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے ذہن پر شبِ رفتہ کا خمار اور بوجھل پن موجود تھا۔ رات وہ دیر تک پیتا رہا تھا۔ اس دُھن کی الجھن میں پڑ کر ذہن کا بوجھل پن بڑھ گیا۔

وہ دھیرے سے بستر سے نکل آیا۔ ماریا شاید اسی دوران اس کے ہاں سے رخصت ہو گئی تھی جب وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ گزشتہ شب وہ آٹھ بجے کے قریب وینکوور سے جہاز کے ذریعے واپس آیا تھا اور اس کے تقریباً دو گھنٹے بعد ماریا اس سے ملنے اس کے گھر آ پہنچی تھی۔

اس نے دل ہی دل میں اپنے اس خیال کی تصحیح کی۔ اب وہ صرف اس کا گھر نہیں بلکہ اس کا اور ماریا کا مشترکہ گھر تھا۔ ماریا سے ابھی اس کی صرف منگنی ہوئی تھی لیکن اس نے اپنے بیش قیمت اور پُرتعیش اپارٹمنٹ کی ملکیت، بینک بیلنس اور دیگر تمام معاملات میں ماریا کو برابر کی شریک بنا لیا تھا۔

اس نے تو منگنی کے فوراً بعد ہی ماریا کو اپنے ہاں منتقل ہونے کی بھی دعوت دے دی تھی لیکن ماریا کو یہ مناسب محسوس نہیں ہوا تھا۔ اس نے یہی کہا تھا کہ وہ شادی کے بعد ہی میک کے ساتھ رہنا شروع کرے گی۔ ویسے بہرحال ایک دوسرے کے گھر پر ملاقاتوں اور شب بسری کا سلسلہ جاری تھا۔ گزشتہ رات بھی وینکور سے میک کی واپسی کی خوشی میں انہوں نے کچھ وقت اکٹھے گزارا تھا۔ خوشی کو دوبالا کرنے کے لیے انہوں نے اسکاچ کی بوتل کھول لی تھی اور میک کچھ زیادہ ہی تیزی سے پی گیا تھا۔ اسکاچ اس کے دماغ کو چڑھ گئی تھی اور وہ جلدی سو گیا تھا۔

کچن میں جا کر اس نے اپنے لیے جوس کا ایک گلاس اور کافی کا ایک مگ تیار کیا۔ دونوں چیزیں بیک وقت ہاتھوں میں اٹھائے وہ ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ نشے کا بوجھل پن جوں جوں کم ہو رہا تھا، وہ دُھن اس کے ذہن میں زیادہ واضح ہوتی جا رہی تھی۔ وہ نہانے کے لیے باتھ روم میں گھسا تو اسے اندیشہ محسوس ہونے لگا کہ دُھن اسے دن بھر پریشان کرے گی۔

اس کے بعد وہ اخبار پڑھنے اور لباس تبدیل کرنے کے دوران بھی سیٹی میں وہی دُھن بجاتا رہا۔ اس دُھن پر جو الفاظ اس کے ذہن میں آ رہے تھے، وہ بے ربط اور بے ترتیب تھے۔ ان سے کوئی مفہوم، کوئی مطلب اخذ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کچھ باتیں گویا گڈمڈ ہو کر رہ گئی تھیں۔

کام پر روانہ ہونے سے پہلے اس نے اپنی کیسٹوں وغیرہ کے ذخیرے کا جائزہ لیا کہ شاید اس میں کوئی ایسا نغمہ موجود تھا جو اس کے ذہن میں اٹک گیا تھا لیکن اس کے ذخیرے میں ویسا کوئی نغمہ موجود نہیں تھا۔

گاڑی میں دفتر جاتے وقت وہ بار بار ریڈیو اسٹیشن بدلتا رہا کہ شاید کہیں سے وہ دُھن سنائی دے جائے جو اس کے ذہن میں گھسی ہوئی تھی لیکن کہیں سے بھی وہ دُھن سنائی نہ دی۔ وہ خود اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ وہ آخر کس قسم کی دُھن تھی۔

اس کا آفس ایک اونچی عمارت کی آٹھویں منزل پر واقع تھا۔ وہ اپنے کمرے میں جا کر بیٹھا تب بھی سیٹی میں وہی دُھن بجا رہا تھا۔ ابھی وہ اپنے کاغذات وغیرہ درست کر ہی رہا تھا کہ اس کی سیکریٹری پیٹی نے کمرے میں جھانکا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ "واپسی مبارک ہو۔ کیسا رہا وینکور کا دورہ؟"

"خالص کاروباری۔" میک نے جواب دیا۔

"آپ تو شادی سے پہلے ہی شادی شدہ معلوم ہونے لگے ہیں۔" وہ دھیرے سے ہنسی پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "دس بجے آپ کو میٹنگ میں شرکت کرنی ہے۔ بھولیے گا نہیں۔"

وہ دروازہ بند کر کے جانے لگی تو میک نے اسے آواز دے کر روکا۔ اسے معلوم تھا کہ پیٹی کا بوائے فرینڈ کسی کلب میں موسیقی پیش کرنے والے گروپ میں کوئی الیکٹرونک ساز بجاتا تھا۔ اسے اُمید تھی کہ پیٹی بھی موسیقی کی تھوڑی بہت سمجھ بوجھ رکھتی ہو گی۔

پیٹی اندر آئی تو میک بولا۔ "میں تمہیں سیٹی پر ایک دُھن سناتا ہوں، تم بتانا اس کا کوئی سر پیر تمہاری سمجھ میں آتا ہے....."

اس نے کچھ دیر تک وہ دُھن بجائی۔ پیٹی نے نہایت تحمل سے سُنی پھر نفی میں سر ہلا کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "دس بجے میٹنگ ہے، بھولیے گا نہیں۔" اس نے دُھن کے بارے میں لفظوں میں کوئی جواب دینے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔

میک کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔ گزشتہ ہفتے وہ وینکور میں تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں کافی کام جمع ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد پیٹی نے ایک بار پھر دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور بولی۔ "دس بج کر پانچ منٹ ہو چکے ہیں۔ وہ لوگ بورڈ روم میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ خدا کے لیے میٹنگ کے دوران سیٹی میں یہ دُھن مت بجایئے گا۔ ڈائریکٹروں کو میٹنگ سے دلچسپی ہے، موسیقی سے نہیں۔"

"ایسا لگتا ہے مجھ پر کسی آسیب کا اثر ہو گیا ہے۔" اس نے بے آواز طریقے سے ہنستے ہوئے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا۔ "مجھے کسی ایسے شخص کو تلاش کرنا چاہیے جو آسیب اتارنے میں ماہر ہو۔"

لیکن وہ ایسے شخص کو تلاش کرنے کے بجائے ایک میوزک اسٹور میں جا پہنچا۔ کاؤنٹر پر موجود شخص بڑا مطمئن و مسرور نظر آ رہا تھا۔ میک نے اس سے بھی وہی سوال کیا جو وہ پیٹی سے کر چکا تھا۔ پھر اس نے سیلزمین کو وہی دُھن سیٹی میں سنانا شروع کی۔ کچھ دیر دُھن سنانے کے بعد وہ خاموش ہوا تو اسے احساس ہوا کہ سیلزمین خاموشی سے ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

میک نے اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ اسے دُھن کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ اس کا شکریہ ادا کر کے دروازے کی طرف بڑھا تو سیلزمین نے عقب سے اسے آواز دی۔ "سنو۔ مجھے تو اس دُھن کے بارے میں کچھ معلوم نہیں لیکن شاید کسی اور کو معلوم ہو۔"

وہ کاؤنٹر پر کچھ آگے کو جھک آیا اور نہایت گہری نظروں سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ اپنا نام، ایڈریس اور فون نمبر چھوڑ جاؤ، جونہی مجھے اس دُھن کے بارے میں کچھ معلوم ہوا میں تم سے رابطہ قائم کروں گا۔"

میک کو ایک بے عنوان سے اضطراب کا احساس ہوا۔ اسے سیلزمین کا اس طرح قدرے وحشت زدہ اور گہری نظروں سے اپنی طرف دیکھنا کچھ الجھن میں مبتلا کر رہا تھا۔ کوئی گڑبڑ ضرور تھی۔ میک نے دُکان میں مزید ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور دوبارہ دروازے کی طرف مُڑتے ہوئے بولا۔ "شکریہ۔ یہ کوئی ایسا اہم مسئلہ نہیں ہے۔"

وہ تیزی سے دُکان سے نکل آیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا چل

دیا۔ تقریباً ڈیڑھ بلاک کا فاصلہ طے کر کے وہ دیوار کا سہارا لے کر ستانے کے لیے رکا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور ہاتھ ہولے ہولے کپکپا رہے تھے۔

واپس دفتر پہنچ کر اس نے اپنے آپ کو کام میں اُلجھا کر اس دُھن کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی لیکن تھوڑی دیر بعد وہ غیر ارادی طور پر سیٹی بجانے لگتا۔ پانچ بجے تو خلافِ معمول اس نے اپنے آپ کو بہت خوش محسوس کیا کہ چھٹی کا وقت ہو گیا تھا۔ نیچے جانے کے لیے اس نے لفٹ کے بجائے سیڑھیوں کا انتخاب کیا۔ اس خیال سے اسے کچھ خوف سا محسوس ہوا کہ لفٹ میں دوسرے لوگ بھی موجود ہوں گے اور ان کے درمیان اگر وہ غیر ارادی طور پر وہی دُھن بجانے لگا تو ان کا ردِ عمل نہ جانے کیا ہو۔

کار میں بیٹھ کر وہ اس امید پر ماریا کے اپارٹمنٹ پر جا پہنچا کہ شاید وہ اسے اس دُھن کے بارے میں کچھ بتا سکے۔ ماریا اسی کا انتظار کر رہی تھی اور ڈرنک لیے بیٹھی تھی۔ میک نے اس کی خیر و عافیت پوچھنے سے پہلے اس سے گلاس لے کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

"کیا بات ہے؟" ماریا نے تشویش سے اس کی طرف دیکھا۔

"ایک دُھن نے مجھے صبح سے پریشان کر رکھا ہے۔ ذہن سے چپک کر رہ گئی ہے۔ میں نے ایک میوزک اسٹور والے سے اس کے بارے میں پوچھا تو اس کا رویہ عجیب سا ہو گیا۔"

"مجھے سناؤ' شاید میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔" ماریا بولی۔

میک نے سیٹی میں کچھ دیر وہ بے ربط اور بے مفہوم دُھن ماریا کو سنائی اور دھیرے دھیرے ماریا کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ جونہی میک خاموش ہوا' ماریا نے گھڑی دیکھی اور اچھل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "ارے .... چھ بج کر دس منٹ ہو گئے!" اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر ٹی وی آن کر دیا۔

میک نے کچھ کہنا چاہا لیکن ماریا ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "شش... خبریں سنو۔"

میک کو اسکرین پر ایک نیوز اناؤنسر کا مانوس سا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ معاشیات کے بارے میں کوئی خبر پڑھ رہا تھا لیکن چند لمحے بعد جب اس نے دوسری خبر پڑھنی شروع کی تو میک کے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا... "گزشتہ پانچ ہفتوں کے دوران شہر میں قتل کی جن یکساں وارداتوں نے شہریوں کو دہشت زدہ کر رکھا تھا' گزشتہ رات اسی انداز کی ایک اور واردات سامنے آئی ہے۔ اس مرتبہ مقتولہ سوزن لیری نامی ایک تیئس سالہ طالبہ تھی۔ اس کی لاش آج علی الصباح ایک ویران علاقے میں' جوگنگ کرنے والے کچھ افراد نے پڑی دیکھی۔ پولیس ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی۔ قتل ہونے والی لڑکیوں کی تعداد چار ہو چکی ہے۔ سب کو کسی نہایت تیز دھار آلے سے ذبح کیا گیا ہے۔ پہلی مقتولہ اُنیس سالہ ڈیبی ڈینو تھی جس کی لاش پانچ ہفتے قبل پائی گئی تھی۔

قتل کی ان وارداتوں کے سلسلے میں واحد سراغ سیٹی کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ اس سے پہلے تینوں مرتبہ جہاں جہاں بھی لاش پائی گئی' کچھ لوگوں کا بیان ہے کہ انہوں نے وہاں سیٹی پر کسی کے کوئی دُھن بجانے کی آواز سنی تھی لیکن اس وقت ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ قاتل کی آواز تھی اور اس وقت وہ وہیں کہیں اس ہولناک واردات کے ارتکاب میں مصروف تھا۔ کوئی بھی گواہ یہ نہیں جان سکا کہ وہ کس نغمے کی دُھن تھی۔ وہ بے ربط اور بے مفہوم معلوم ہوتی تھی..."

ماریا نے ٹی وی آف کر دیا تب بھی دیر تک میک اسکرین کی طرف دیکھتا رہا پھر سرسراتی سی آواز میں بولا۔ "خدا کی پناہ... انہیں تم محض میری سیٹی کی دُھن کی وجہ سے مجھے....."

"دیکھو..." ماریا اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ "میں تمہیں ہرگز قاتل نہیں سمجھ رہی۔" لیکن میک نے اس کی آنکھوں میں شبہات کی پرچھائیاں محسوس کیں۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "لیکن آج کل لوگوں کی جو ذہنی کیفیت ہے' اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تمہارا اس طرح سیٹی بجاتے پھرنا اور لوگوں سے اس کے بارے میں سوال کرنا تمہارے لیے پریشانی کا باعث بن سکتا ہے۔"

میک کو عمومی خبروں سے کبھی زیادہ دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اخبار میں بھی وہ صرف کھیلوں اور کاروباری خبروں کا صفحہ پڑھتا تھا۔ ٹی وی پر بھی وہ ایسے ہی پروگرام دیکھتا تھا' خبریں شاذ و نادر ہی سنتا تھا۔ اس لیے اسے نہیں معلوم تھا کہ گزشتہ دنوں خبروں میں کیا کھچڑی پکتی رہی تھی لیکن اب وہ اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔

"تمہارے پاس پچھلے چند ہفتوں کے اخبارات ہیں؟" اس نے ماریا سے پوچھا۔

"ہاں... ہیں تو سہی لیکن بنڈل باندھ کر رکھے ہوئے ہیں کوڑے میں ڈالنے کے لیے۔" ماریا بولی۔ "میں ابھی لاتی ہوں۔"

دو منٹ بعد کمرے کا فرش اخباروں سے بھرا پڑا تھا۔ میک نے صرف وہ اخبارات جمع کیے جن میں ان مخصوص وارداتوں کے بارے میں خبریں تھیں۔ سرخیاں گویا اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔

"شقی القلب قاتل نے چوتھا شکار بھی ذبح کر ڈالا۔"

"سفاک درندہ اپنی کارروائی کے دوران سیٹی بجاتا رہتا ہے۔"

خبریں' تفصیلات اور تبصرے پڑھ کر میک کا دل خراب ہونے لگا۔ چاروں وارداتوں کی جزئیات میں معمولی سا فرق تھا۔ کم عمر ترین مقتولہ اُنیس سال کی تھی اور زیادہ سے زیادہ عمر والی اٹھائیس سال کی تھی۔ چاروں کو ذبح کیا گیا تھا اور چھری کے دیگر وار بھی کیے گئے تھے۔ چاروں وارداتوں میں آلۂ قتل غالباً ایک ہی استعمال کیا گیا تھا۔

چاروں لاشیں قدرے ویران جگہوں پر جھاڑیوں کے قریب

پائی گئی تھیں۔ ان میں سے کسی لڑکی پر نہ تو آبروریزی کی غرض سے حملہ کیا گیا تھا اور نہ ہی انھیں لوٹا گیا تھا۔ پولیس کے بیانات کے مطابق ابھی تک کوئی خاص شہادت سامنے نہیں آئی تھی۔ سوائے سیٹی کی دُھن کے۔ جائے واردات کے آس پاس تقریباً پانچ سو مربع گز کے علاقے میں کسی جگہ سے سیٹی کی وہ آواز سنی گئی تھی۔

میک یہ سب کچھ پڑھنے کے بعد دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ وہ یہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ لاشعوری طور پر یا نیند کے دوران وہ ایسی وارداتیں کرچکا تھا جن کے تصور سے بھی اس کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ اٹھا اور خاموشی سے اپنے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ تین مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ قطعی غیر ارادی طور پر وہ سیٹی میں وہی دُھن بجانے لگا لیکن پھر چونکا اور اپنے آپ کو کوستے ہوئے خاموش ہو گیا۔ معلوم نہیں اسے کب سے اس طرح سیٹی بجانے کی عادت پڑی ہوئی تھی اور احساس شاید آج ہی ہوا تھا۔

ماریا نے اسے شاید سوچ بچار کا موقع دینے کے لیے [illegible] دیا تھا۔ گیارہ بجے میک نے ایک بار پھر ٹی وی آن [illegible] دوبارہ کمرے میں آ گئی اور خاموشی سے اس [illegible] خبروں کے دس منٹ کے بلیٹن میں بیشتر باتیں پچھلے [illegible] والی ہی دُہرائی گئی تھیں۔ صرف ایک نیا ٹکڑا شامل کیا گیا تھا اور وہ یہ تھا کہ ایک مقامی میوزک اسٹور پر ایک نامعلوم شخص نے سیلز مین کو سیٹی میں ایک دُھن سنا کر پوچھا تھا کہ کیا وہ اس کے بارے میں کچھ بتا سکتا ہے۔

اس شخص کا رویّہ اتنا عجیب تھا کہ اس کے جانے کے بعد سیلز مین نے اس واقعے کی اطلاع پولیس کو دینا بہتر سمجھا تھا۔ اس نے یقیناً پولیس کو اس شخص کا تفصیلی حُلیہ اور شکل و صورت کے بارے میں بھی بتا دیا تھا کیوں کہ چند لمحے بعد کمپیوٹر کے ذریعے تیار کیا گیا ایک چہرا اسکرین پر ابھرا جو کافی حد تک میک سے مشابہ تھا۔

اس کے دس منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی۔ ماریا نے میک کی طرف دیکھا اور گویا ڈرتے ڈرتے ریسیور اٹھایا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے سے اعصابی تناؤ دور ہوتا دکھائی دیا۔ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور ریسیور میک کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "پارکر کا فون ہے۔"

میک نے ریسیور کان سے لگایا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ سکتا، پارکر بولا۔ "یعنی ٹی وی پر تمھاری تصویر اصل سے بہتر لگ رہی تھی۔ یہ کیا چکر ہے؟"

میک بتاتے بتاتے رک گیا اور بولا۔ "میں فون پر اس سلسلے میں بات نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے خود نہیں معلوم کہ یہ کیا چکر ہے اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کرنا چاہیے۔"

"تم اطمینان سے بیٹھو۔ فون مت سننا اور نہ ہی دروازے پر جانا، میں آدھے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔" پارکر نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

میک نے اطمینان سے بیٹھنا چاہا لیکن اس سے اطمینان سے تو کیا، کسی بھی طرح بیٹھا نہیں گیا۔ وہ چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتا رہا۔ اس وقت وہ کچن میں تھا اور اپنے لیے ڈرنک تیار کر رہا تھا جب دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ کر گرا اور ٹوٹ گیا۔ اس نے اپنے آپ کو کوسا، ماریا نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ آنے والا پارکر تھا۔

پارکر دراصل میک کے برابر والے آفس میں کام کرتا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے وہ اس آفس میں آیا تھا اور تب سے میک اور ماریا سے اس کی دوستی تھی۔ ان تینوں کے درمیان بے تکلف دوستی کی مثلث قائم تھی۔ وہ میک اور ماریا دونوں ہی کے اپارٹمنٹس پر کھانے کے لیے مدعو رہتا تھا۔

اس نے کچن میں جھانکا تو میک کو گلاس کے ٹکڑے جمع کرتے پایا۔ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "تمھیں تو آجکل کسی تیز دھار چیز کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ملنی چاہیے۔"

"یہ کوئی مذاق کا معاملہ نہیں ہے۔" میک تیزی سے بولا۔

"پریشان مت ہوؤ۔" پارکر نے اسے تسلی دی۔ "ہمیں معلوم ہے، تم قاتل نہیں ہو اور اسے ثابت کرنا بھی زیادہ مشکل نہیں ہے۔ ہم تمھاری گزشتہ پانچ ہفتے کی مصروفیات کا تفصیلی چارٹ بنائیں گے۔"

اس نے فریج کھول کر اپنے اور میک کے لیے ڈرنک تیار کی پھر سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ "تمھیں اپنی گزشتہ پانچ ہفتے کی مصروفیات میں سے جو جو بھی یاد آتی جائیں، مجھے بتاتے جانا۔ اگر ہمیں یہ شہادت دینے والا کوئی ایک شخص بھی مل جاتا ہے کہ قتل کی ان وارداتوں میں سے ایک کے وقت بھی تم کہیں اور موجود تھے تو تمھاری بے گناہی ثابت ہو جائے گی۔"

"لیکن میں نے واقعی ان میں سے کسی لڑکی کو قتل نہیں کیا۔" میک وحشت زدہ لہجے میں بولا۔

"ہم تینوں کو تو اس بات کا یقین ہے لیکن ضروری نہیں کہ پولیس بھی یقین کر لے۔" پارکر خالص سراغرسانوں والے لہجے میں بولا۔ "تمھارے لیے اصل پریشانی کل صبح سے شروع ہوگی جب کمپیوٹر کی تیار کردہ وہ تصویر اخبارات میں آ جائے گی۔ خیر۔ ہم اس کا بھی حل نکال لیں گے۔ ہم تمھیں ہیٹ اور سیاہ چشمہ وغیرہ پہنا دیں گے پھر پولیس والے بھی تمھیں نہیں پہچانیں گے۔ اب ہم تمھاری گزشتہ پانچ ہفتے کی مصروفیات کا جائزہ لیتے ہیں۔"

وہ ٹانگیں پھیلا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ ماریا سے اس نے کاغذ اور پنسل منگوائی، گلاس میں مزید بیئر ڈالی پھر میک سے پوچھ پوچھ کر پہلے قتل کے دن سے لے کر گزشتہ رات تک کی اس کی ہر مصروفیت لکھنا شروع کی۔ بہت سی باتیں میک کو یاد نہیں رہی تھیں، بعض مصروفیات کے بارے میں وہ زیادہ پُریقین نہیں تھا۔

تاہم پارکر کو چند ایک لوگوں کے بارے میں امید تھی کہ شاید انہوں نے کچھ مخصوص اوقات میں کچھ مخصوص جگہوں پر میک کی موجودگی کو یاد رکھا ہو گا۔ لکھتے لکھتے پارکر نے چار صفحات بھر ڈالے۔ اس کی تحریر بہت گندی تھی۔ وہ اپنے لکھے کو ذرا صاف کرنے بیٹھ گیا۔

اس دوران میک نے ایک اخبار سامنے رکھ لیا جس میں قتل کی ان چاروں وارداتوں کے بارے میں ایک مضمون چھپا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ چاروں مقتول لڑکیوں کی ایک ہی سائز کی تصویریں بھی چھپی تھیں۔ میک کو بیک وقت ان چاروں چہروں کا جائزہ لینے کا موقع ملا تو اس پر ایک لرزہ خیز انکشاف ہوا۔ چاروں ہی لڑکیوں میں ماریا کی بڑی مشابہت موجود تھی۔

اس کے ہاتھ سے اخبار چھوٹ گیا۔ پارکر چونک کر اس کی صورت دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا ہوا؟ ایسا لگ رہا ہے جیسے تم نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہے؟"

"ایک نہیں' شاید چار بھوت دیکھے ہیں۔" میک بولا اور کانپتے ہاتھوں سے اپنے لیے ایک اور ڈرنک بنانے لگا۔ پارکر اور ماریا نے اخبار اٹھا کر دیکھا پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ شاید انہوں نے بھی وہ بات محسوس کر لی تھی جو میک نے محسوس کی تھی۔

تاہم پارکر گویا اصل کام شروع کرتے ہوئے کاغذات کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "ہم تازہ ترین قتل کی واردات سے دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ گزشتہ رات جو لڑکی قتل ہوئی ہے اس کی لاش دس بج کر بیس منٹ پر پائی گئی تھی جب کہ تمہیں ساڑھے دس والی فلائٹ سے یہاں پہنچنا تھا۔ اس کا مطلب ہے تم اس کے قاتل نہیں ہو سکتے۔"

میک گویا کراہ کر بولا۔ "میں نے اپنے طے شدہ شیڈول سے ہٹ کر اس سے پہلے کی فلائٹ پکڑی تھی۔ میں ساڑھے سات بجے وینکور سے یہاں پہنچ گیا تھا۔ یعنی میرے پاس کافی وقت تھا۔ میں شہر میں کہیں بھی پہنچ سکتا تھا' کچھ بھی کر سکتا تھا۔"

"چلو... خیر... اس سے پچھلے قتل کو لیتے ہیں۔" پارکر مایوس ہوئے بغیر بولا۔ "وہ لڑکی کس وقت قتل ہوئی تھی؟"

ماریا اخبار دیکھتے ہوئے بولی۔ "اٹھارہ تاریخ کی شام کو سوا چھ بجے اسے آخری بار زندہ دیکھا گیا تھا پھر سات بج کر پچاس منٹ پر اس کی لاش پائی گئی۔ ظاہر ہے اسی وقفے کے دوران کسی وقت اسے قتل کیا گیا تھا۔"

پارکر' میک کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کچھ یاد ہے' اٹھارہ تاریخ کو... منگل کے روز سوا چھ سے سات پچاس کے دوران تم کہاں تھے؟"

میک پیشانی مسلتے ہوئے ذہن پر زور دینے لگا پھر وہ چونکتے ہوئے بولا۔ "ارے ہاں... یاد آیا۔ اس روز تم اور ماریا بھی تو میرے ساتھ تھے۔ میری تنخواہ بڑھنے کی خوشی میں ہم نے آدھے دن کی چھٹی کی تھی پھر ہمارے درمیان ایک میچ کے بارے میں احمقانہ سی بحث شروع ہو گئی تھی اور ہم ریکارڈ دیکھنے لائبریری گئے تھے۔"

"بالکل ٹھیک۔" پارکر چٹکی بجاتے ہوئے بولا۔ "لائبریری میں یقیناً کسی کو ہماری موجودگی یاد ہو گی۔ اب تو دیر ہو گئی ہے' میں ذرا جا کر کچھ دیر سوتا ہوں۔ تم بھی سو جاؤ۔ صبح میں جلدی آ جاؤں گا اور ہم اس سلسلے میں کچھ کریں گے۔"

دوسرے روز وہ نو بجے آیا۔ میک نے رات کا بیشتر حصہ جاگتے ہوئے گزارا تھا۔ پارکر کے ایک ہاتھ میں اخبار اور دوسرے میں شاپنگ بیگ تھا۔ اخبار اس نے ماریا کی طرف بڑھایا اور شاپنگ بیگ میک کی گود میں پھینکتے ہوئے بولا۔ "اس میں کچھ چیزیں ہیں' ان کی مدد سے تھوڑا سا بہروپ بھر لو۔ ہم لائبریری چلیں گے۔ اگر تم یونہی گھر میں بیٹھے رہے تو تمہیں اپنا دفاع کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔"

میک نے بادل ناخواستہ بیگ سے چیزیں نکالیں۔ ایک لمبا سا کوٹ تھا' ایک ہیٹ اور ایک سیاہ چشمہ۔ کوٹ پہن کر ہیٹ اس نے پیشانی پر جھکا لیا اور چشمہ لگانے ہی والا تھا کہ ماریا اخبار دیکھتے ہوئے خوفزدہ سی آواز میں بولی۔ "اوہ... خدایا!"

میک نے اس کے ہاتھ سے اخبار لے لیا۔ صفحۂ اول پر ماریا سے مشابہ ایک اور لڑکی کی تصویر نظر آ رہی تھی۔ نیچے چیختی ہوئی سرخی تھی:

چار لڑکیوں کا قاتل وینکور بھی پہنچ گیا۔
ایک اور لاش کی دریافت۔

میک ایک ٹک اخبار دیکھتا رہ گیا۔ پارکر اس کے کندھے پر سے خبر پڑھتے ہوئے بولا۔ "لاش گزشتہ رات ہی ملی ہے لیکن لڑکی تین دن سے لاپتا تھی... اور یہ بھی لکھا ہے کہ چاقو کے زخم ویسے ہی ہیں جیسے یہاں پائی جانے والی لاشوں کے تھے۔"

میک ہلکی مگر دیوانگی آمیز ہنسی کے ساتھ بولا۔ "اب اس کی وضاحت میں کیسے کروں گا؟ کس طرح اپنی صفائی پیش کروں گا؟ تین روز پہلے... بلکہ کل شام تک میں وینکور میں موجود تھا۔ میرا خیال ہے تم پولیس کو بلا ہی لو۔ کیا پتا یہ قتل واقعی میں نے ہی کیے ہوں۔"

"بکواس مت... اگر تم نے اس طرح سوچنا شروع کر دیا تو پھر اپنا کام تمام ہی سمجھو۔" پارکر نے اسے ڈانٹا۔ "چلو لائبریری چلتے ہیں۔"

لائبریری کی عمارت ایک پارک کے عقب میں واقع تھی۔ اس پارک کا آدھا حصہ کھیل کے میدان کا کام دیتا تھا اور باقی آدھے حصے پر ایک مختصر جنگل سا پھیلا ہوا تھا۔ وہ تینوں پارکر کی کار میں وہاں پہنچے۔ میک پچھلی سیٹ پر نیم دراز تھا۔ اس کا چہرہ ہیٹ اور تاریک چشمے کی آڑ میں تقریباً چھپا ہوا تھا۔

اچانک اسے جیسے کچھ یاد آیا اور وہ چونکتے ہوئے بولا۔ "ایک لاش تو کسی پارک میں بھی ملی تھی۔"

"یہی پارک تھا وہ؟" ماریا نے سرگوشی میں بتایا۔

"اوہ... میرے خدا...!" میک بڑبڑا کر رہ گیا۔

اندر پہنچ کر پارکر نے آگے بڑھ کر لائبریرین کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر عورت تھی اور دوسروں کی مدد کرنے کے معاملے میں فراخدل معلوم ہوتی تھی۔ پارکر بولا۔ "میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ اٹھارہ تاریخ کو... منگل کے دن کیا آپ ہی یہاں ڈیوٹی پر تھیں؟"

"تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ تمہارا تعلق پولیس سے ہے کیا؟"

"مجھے امید ہے کہ ابھی آپ نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی ہو گی کہ پولیس کو یہاں آنا پڑے۔" پارکر گرمجوشی سے مسکرایا۔ "پولیس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ دراصل اس شام میرا دوست یہاں آیا تھا اور شاید یہ کوئی چیز یہاں بھول گیا تھا۔"

"اس نے اپنے پیچھے کھڑے میک کی طرف اشارہ کیا اور میک کا دل چاہا کہ اُلٹے قدموں وہاں سے بھاگ جائے۔ وہ اس وقت متضاد کیفیات کا شکار تھا۔ ہیٹ اور چشمے کی وجہ سے اسے کچھ تحفظ کا بھی احساس تھا لیکن ساتھ ہی وہ اپنے آپ کو چور چور سا بھی محسوس کر رہا تھا۔

"کیا چیز بھول گیا تھا یہ یہاں؟" لائبریرین نے دریافت کیا۔ وہ گویا میک کو دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔

"کچھ کاغذات تھے۔ اس نے اپنے ریسرچ کے کام کے سلسلے میں نوٹس لیے تھے۔ معلوم نہیں آپ کو یاد بھی ہے یا نہیں کہ یہ اس روز یہاں آیا تھا؟" پارکر بولا۔

"چہروں کے معاملے میں میری یادداشت بہت اچھی ہے لیکن جب تک یہ چشمہ اور ہیٹ نہ اتارے تب تک میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔" لائبریرین بولی۔

ماریا نے میک کو کہنی ماری۔ میک نے بادلِ ناخواستہ ہیٹ اور چشمہ اتارا۔ یہ دونوں چیزیں اتارتے ہوئے وہ ایک عجیب سی خجالت محسوس کر رہا تھا۔ لائبریرین آنکھیں سکیڑے دیر تک اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر دھیمے لہجے میں بولی۔ "ہاں... منگل کی شام یہ یہاں موجود تھا۔ مجھے اس لیے بھی یاد ہے کہ مجھے... اس کو خاموش رہنے کی ہدایت کرنا پڑی تھی۔ یہ ذرا نشے میں تھا۔"

"اس میں کوئی شک نہیں۔" پارکر نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اصل میں یہ اپنی کامیابی کا جشن منا رہا تھا۔ اس نے گویا ایک شکار مارا تھا۔ بہرحال آپ کو اچھی طرح یاد ہے کہ بروز منگل اٹھارہ تاریخ کی شام یہ یہاں موجود تھا؟"

"ہاں..... مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" لائبریرین ذرا چڑ کر بولی "اس لیے یاد ہے کہ یہ سیٹی بجائے جا رہا تھا اور میں نے اسے چپ کرایا تھا۔ ہم پوری کوشش کرتے ہیں کہ یہاں کسی کے مطالعے میں ذرا سا بھی خلل نہ پڑے....."

سیٹی کا ذکر سنتے ہی میک کا دم گھٹنے لگا۔ اچانک لائبریرین ماریا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم بھی تو اس کے ساتھ تھیں۔" "پھر اس نے پارکر کی طرف بغور دیکھا۔ "اور تم بھی۔ تم تینوں اکٹھے ہی تو آئے تھے۔ لیکن لائبریری بند ہونے کے وقت یہ ہمیں مطالعے کے ایک کیبن میں میز پر سر رکھے تنہا سوتا ہوا ملا تھا اور ہم نے بڑی مشکل سے اسے جگایا تھا۔"

"یہ کس وقت کی بات ہے؟" پارکر نے پوچھا۔

"ساڑھے آٹھ بجے کی۔ یہ لائبریری بند ہونے کا وقت ہے۔"

پارکر نے لائبریرین کا شکریہ ادا کیا اور وہ باہر نکل کر کار میں آ بیٹھے۔ پارکر بولا۔ "کم از کم ایک قتل کے معاملے میں تو جائے واردات سے تمہاری عدم موجودگی کا ثبوت مل گیا اور پولیس کے خیال میں چونکہ سارے قتل ایک ہی شخص نے کیے ہیں اس لیے اگر تم ایک قتل سے بری الذمہ قرار پاتے ہو تو ساری ہی وارداتوں سے تمہاری لاتعلقی ثابت ہو جاتی ہے۔"

"اس خوشی میں تو کوئی جشن ہونا چاہیے۔" ماریا مسکرائی۔

انہوں نے راستے میں کھانے پکانے کے لیے کچھ چیزیں خریدیں۔ طے یہ پایا تھا کہ پارکر کے اپارٹمنٹ پر خود پُرتکلف کھانا تیار کر کے کھایا جائے۔ پارکر کے گھر جانے کا یہ بھی فائدہ تھا کہ پولیس کو میک تک پہنچنے میں مزید تاخیر ہو سکتی تھی حالانکہ میک کو اب اس کی پروا نہیں رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اسے اپنی بے گناہی کا ایک کمزور سا ثبوت مل گیا تھا بلکہ ویسے ہی وہ اپنے آپ کو شکست خوردہ سا محسوس کر رہا تھا اور اس شکست خوردگی نے اسے بے پروا بنا دیا تھا۔

پارکر اپنے کچن میں مرغ وغیرہ روسٹ کرنے لگا۔ ماریا نے میز پر برتن خوبصورتی سے سجائے اور دیگر تیاریاں مکمل کیں۔ میک اس دوران صوفے پر بیٹھا ایک ڈرنک کی چسکیاں لیتا رہا۔ ماریا اپنا کام ختم کر کے بولی۔ "میں بازار سے اخبار لے کر آتی ہوں۔"

وہ جا چکی تو میک نے محسوس کیا کہ دروازہ صحیح طور پر بند نہیں ہوا تھا۔ میک نے اٹھ کر دروازہ بند کیا۔ دروازہ بند کر کے واپس آتے وقت وہ کچن کے سامنے سے گزرا تو اس نے پارکر کو سیٹی بجاتے سُنا۔ تب پہلی بار میک کو احساس ہوا کہ وہ جب بھی انہماک سے کھانا پکا رہا ہوتا تھا تو سیٹی ضرور بجاتا تھا۔

پارکر بیک وقت کئی نغموں کی دُھن الاپ رہا تھا۔ سیٹی کبھی وہ ایک نغمے کی طرز پر بجاتا، کبھی دوسرے نغمے کی طرز پر۔ اس نے جس تیسرے نغمے کی طرز شروع کی وہ ایک طویل عرصے تک ماریا کو بہت پسند رہا تھا۔ میک نے تصدیق کی خاطر پوچھا۔ "یہ کون سے نغمے کی دُھن ہے؟" اس نے اپنا لہجہ سرسری رکھا تھا۔

"میک! میرے دوست! مجھے چھری دینا۔" پارکر نے نغمے کا بول بتایا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ "بول بالکل حسب حال ہے۔ تم ذرا میز پر سے مجھے گوشت کاٹنے والی چھری پکڑا ہی دو۔"

میک نے میز پر سے چھری اٹھائی۔ وہ اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے شبہات غلط تھے۔ وہ چھری کا جائزہ

معیاری نفسیاتی اور علمی کتابیں
ٹیلی پیتھی و مستقبل بینی
اپنا پیغام دوسروں تک پہنچانے اور ان کے دلوں کا حال جاننے کا سائنسی طریقہ
ٹیلی پیتھی کی جدید تحقیقات
ٹیلی پیتھی کی جدید ترین کتاب نئے طریقے، نئی مشقیں، سوال جواب
امتحان میں کامیابی
مطالعہ کرنے، امتحان دینے اور یادداشت بڑھانے کے نفسیاتی طریقے
خوابوں کے اسرار
خوابوں کی حقیقت اور ان کی تعبیر معلوم کرنے کے طریقے
ہپناٹزم کو سیکھنے کے آسان طریقے اور مشقیں
ہپناٹزم کے عملی طریقے
ہپناٹزم کی تاریخ، اس کی حقیقت اور اس کو سیکھنے کے طریقے
ہپناٹزم
ہپناٹزم کی جدید تحقیقات
اپنے آپ کو ہپناٹائز کر کے اپنی کمزوریاں اور خرابیاں دور کریں
ذاتی ہپناٹزم
مقناطیسیت
موٹاپا اور اس کا سدباب
دست شناسی سیکھنے
نظر کی کمزوری اور اس کا سدباب
تحریر اور شخصیت
عورتوں کی نفسیات
ازدواجی نفسیات
مسائل اور حل
باخبری
چھ حیرت انگیز علوم
احساس کمتری
کامیابی
کسی خاص وقت آپ کا مزاج کیا ہے اور آپ کو کیا کرنا چاہیے ہر وقت کام آنے والی کتاب
احساس کمتری کے موضوع پر ایک مستند اور مکمل کتاب، اسباب، تدارک، علاج
مارشل آرٹ گھر بیٹھے سیکھیے بے شمار تصاویر سے مزین
کراٹے
سگریٹ اور دوسری بری عادتوں سے چھٹکارا حاصل کیجیے
سگریٹ پینا چھوڑیے
خوف و شرم کو دور بھگایئے اور نئی زندگی شروع کیجیے
خوف و شرم اور اس کا سدباب
اندرون ملک ڈاک خرچ
کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر ارسال کریں یا خط لکھ کر بذریعہ وی پی طلب کریں۔
بیرون ملک وی پی روانہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے قیمت و ڈاک خرچ بذریعہ بینک ڈرافٹ ارسال کریں۔
مکتبۂ نفسیات، پوسٹ بکس نمبر ۹۴۳، مسعید مینشن طبریا اسٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی 74200

لیتے ہوئے بظاہر سرسری سی لہجے میں بولا۔ "یہ نئی ہے؟ میں نے اس سے پہلے یہ تمہارے کچن میں نہیں دیکھی۔"

"ہاں' نئی ہی ہے۔ صرف چند بار استعمال ہوئی ہے۔ ذرا اس کی دھار دیکھو۔ دستہ بھی بڑی عمدگی سے گرفت میں آتا ہے۔" پارکر کو گویا اس چھری پر بڑا فخر تھا۔

میک نے اسے مضبوطی سے پکڑا اور ذرا سا ناخن چھیل کر دیکھا۔ "یہ تو بہت تیز ہے۔"

"ہاں۔ اسی لیے تو مجھے پسند ہے۔" پارکر اطمینان سے بولا۔

میک چھری مضبوطی سے تھامے کچن کے دروازے پر کھڑا تھا۔ پارکر ایک بار پھر سیٹی بجانے لگا۔ میک کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ پھر یکدم ہی جیسے سب کچھ اس کی سمجھ میں آگیا۔

پارکر سیٹی بجاتے بجاتے رک کر بولا۔ "میک! لاؤ چھری مجھے دے دو۔"

میک چھری لیے کچن میں داخل ہوتے ہوئے گہری سانس لے کر بولا۔ "تمہارا خیال تھا کہ پانچ قتل تم میرے کھاتے میں ڈال کر مجھے راستے سے ہٹا دو گے اور ماریا تمہاری جھولی میں آگرے گی؟"

"کیا...؟" پارکر نے اس کی بات توجہ سے نہیں سُنی تھی۔ وہ اوون میں روسٹ ہوتے ہوئے مرغ کی طرف متوجہ تھا۔

میک بولا۔ "تم ہمیشہ ماریا کے قریب رہے ہو۔ شاید میرے اندازوں سے زیادہ قریب۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ وہ میرے اپارٹمنٹ کی ملکیت' میرے بینک بیلنس' غرضیکہ ہر چیز میں شریک ہو چکی ہے۔ تم نے سوچا ہو گا کہ اگر میں ہمیشہ کے لیے جیل چلا جاؤں تو اس کی محبتوں کا رخ تمہاری طرف ہو جائے گا۔ ماریا میری تمام چیزوں سمیت تمہاری ہو جائے گی۔" میک کا لہجہ سپاٹ اور پُرسکون تھا لیکن اس کی آنکھوں میں دُھندلاہٹ سی تھی۔

پارکر نے ایک ٹک اس کی طرف دیکھا پھر اس کی باتوں کا کوئی جواب دیے بغیر ہاتھ بڑھا کر ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "لاؤ.... چھری مجھے دے دو۔"

تب میک کو احساس ہوا کہ پارکر سوچے سمجھے منصوبے کے تحت دستانے پہنے ہوئے تھا جب کہ وہ احمقوں کی طرح اپنی انگلیوں کے نشانات اچھی طرح چھری پر ثبت کر چکا تھا۔ اس چھری پر' جس سے غالباً صرف چند گلے ہی کاٹے گئے تھے۔ اس پر اپنی انگلیوں کے نشانات ثبت کر کے اس نے گویا اپنا اعتراف جرم تحریر کر دیا تھا۔

میک چھری لیے اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "تمہیں یہ سب کچھ کرتے ہوئے دوستی کا ذرا بھی خیال نہیں آیا؟"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا تم کیا بکواس کر رہے ہو۔" پارکر پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ "لاؤ' یہ چھری مجھے دے دو۔" وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

"تاکہ تم اسے مجھ پر استعمال کر سکو؟" میک نے مزید ایک قدم بڑھایا۔ "تم مجھے کتنا بے وقوف سمجھتے ہو؟"

پارکر پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار سے جا لگا تھا۔ اب اس کے پاس مزید پیچھے ہٹنے کے لیے جگہ نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔

میک بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "تم میرے معمولات سے بہت اچھی طرح واقف رہتے تھے۔ تم نے ان تمام لڑکیوں کو ایسی جگہ قتل کیا جس کے آس پاس میں موجود رہا تھا اور مجھے دیکھا جا چکا تھا۔ سیٹی کی وہ دُھن بھی تم ہی میرے پاس بجاتے رہے ہو گے۔ تمہیں معلوم تھا کہ غیر شعوری انداز میں وہ میرے ذہن میں بیٹھ جائے گی اور میں بھی اسے بجانے لگوں گا۔ تم میری گردن کے گرد پھندا صحیح طور پر فٹ کرنے کے لیے دینکور بھی ہو آئے اور وہاں بھی ایک قتل کر آئے تاکہ بات پکی ہو جائے اور میں کسی طرح بھی اپنے آپ کو بے گناہ ثابت نہ کر سکوں لیکن اب میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ میں قربانی کا بکرا نہیں بنوں گا۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔" پارکر بولا لیکن پھر شاید اسے اندازہ ہو گیا کہ دلیل اور بحث بیکار رہے گی۔ وہ یکدم بائیں طرف جھپٹا۔ اس طرف ایک دراز کھلی تھی اور اس میں چھریاں کانٹے وغیرہ رکھے تھے۔ اس نے کوئی چھری اٹھانے کی کوشش کی لیکن دستانے کی وجہ سے اس کی گرفت صحیح نہیں پڑ سکی۔ اسے چھری اٹھانے میں ایک لمحے کی تاخیر ہو گئی۔ اس ایک لمحے ہی میں میک نے چھری اس کی پسلیوں میں اتار دی۔ اس نے ایک نہیں' تین وار کیے اور بالآخر پارکر فرش پر گر پڑا۔

اس وقت وہ چھری لیے پارکر پر جھکا ہوا تھا جب اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور ماریا اندر آگئی۔

"اوہ... میرے خدا...!" کچن کا منظر دیکھ کر وہ منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"ان تمام لڑکیوں کو اس نے قتل کیا تھا۔" میک تیزی سے بولا۔ "اس الزام میں یہ مجھے پھانسنا چاہتا تھا تاکہ میرا اپارٹمنٹ' بینک بیلنس تم سمیت حاصل کر سکے..." وہ سسکیاں لینے لگا۔

"میرا خیال ہے میں پولیس کو بلالوں تو بہتر ہو گا۔" ماریا بولی۔

فون کے پاس بیٹھ کر ماریا نے نمبر ڈائل کیا اور لائن ملنے کا انتظار کرنے لگی۔ وہ بالکل پُرسکون تھی۔ اچانک میک کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اس نے سُنا... ماریا نہایت سکون سے لائن ملنے کا انتظار کرتے ہوئے سیٹی بجا رہی تھی۔ وہی بے ربط اور بے مفہوم دُھن جس نے میک کو پریشان کیے رکھا تھا... اور تب اچانک ہی اس کے ذہن میں بجلی کا کوندا سا لپکا۔ اب اسے صحیح اندازہ ہوا کہ وہ دُھن درحقیقت کہاں سے اس کے ذہن میں گھسی تھی۔

مگر اس وقت تک ماریا کو لائن مل چکی تھی اور وہ پولیس آفیسر کو ساری بات سمجھا رہی تھی...

WHISTLING PAST THE GRAVEYARD
PETER SELLERS

نسیم جاوید سید

زندگی میں شک اور بے اعتمادی کا بیج پڑ جائے تو پھر وہ بڑھ کر تناور درخت بن جاتا ہے۔ ایسا درخت جس کی شاخیں زہریلی اور سایہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والی دو بہنوں کے درمیان جب شک کے اس سانپ نے سر ابھارا تو دل کے شفاف آئینے میں ہر عکس دھندلا ہوتا چلا گیا اور بالآخر آئینہ ٹوٹ گیا۔

چند خطوط کے پس منظر میں جنم لینے والی سبق آموز تحریر

جاسوسی ڈائجسٹ، جولائی 1993ء

گرٹا اور ارما دونوں بہنیں تھیں اور دونوں عمر رسیدہ تھیں۔ اس وقت وہ اپنے کشادہ آبائی مکان کے روشن اور ہوادار کچن میں میز پر بیٹھی تھیں۔ دونوں بہنوں نے اپنی ممی اور پاپا کے زیر سایہ اسی مکان میں پرورش پائی تھی اور اب بڑھاپے کو پہنچنے کے بعد بھی یہیں رہ رہی تھیں۔ کارٹر کے زمانۂ صدارت میں ان کے ممی پاپا کا انتقال ہو گیا تھا۔ تب سے مکان میں صرف دونوں بہنیں ہی رہ گئی تھیں۔

"عجیب بات ہے۔۔۔" گرٹا بولی۔ "اس مہینے میرا سوشل سیکیورٹی کا چیک ابھی تک نہیں آیا۔" اس نے فریج سے نکالی ہوئی آئس کریم سے ایک بڑا سا چمچ بھر کر منہ میں ڈالا۔

"اس مرتبہ تو بہت تاخیر ہو گئی۔" ارما تعجب سے بولی۔ "آج تو آٹھ تاریخ ہے۔"

"نہیں۔ تاریخ تو سات ہے۔" گرٹا نے تصحیح کی۔ "لیکن بہرحال۔۔۔ تاخیر کافی ہو چکی ہے۔ چیک تو ہمیشہ دو تاریخ تک آجاتا تھا۔"

ارما کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس روز آٹھ تاریخ تھی اور دیوار پر آویزاں کیلنڈر بھی اس کی تصدیق کر رہا تھا لیکن اس نے گرٹا کی تردید نہیں کی۔ وہ گرٹا کی چھوٹی بہن تھی اور ساٹھ سال کی رفاقت نے اسے یہی سکھایا تھا کہ گرٹا جیسی بڑی بہن سے کبھی بحث یا اس کی بات کی تردید نہیں کرنی چاہیے۔ خواہ وہ غلط ہی کہہ

رہی ہو۔

"تم نے پوسٹ مین سے دریافت کیا تھا؟" ارما نے جاننا چاہا۔

"نہیں۔" گریٹا نے جواب دیا۔ "اگر ہم پوسٹ آفس والوں کے بارے میں شک یا بداعتمادی محسوس کرنے لگیں تو پاپا کی روح پر کیا گزرے گی؟"

ان کے پاپا پوسٹ مین تھے اور اپنی اس حیثیت پر انہیں ہمیشہ بہت فخر رہا تھا۔ ڈاک کے نظام پر ان کا اعتماد غیر متزلزل تھا اور یہی اعتماد ان کا خاندانی سرمایہ تھا۔ انہیں کامل یقین تھا کہ ڈاک کے نظام میں بدعنوانی ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ ہمیشہ اس بات پر اصرار کیا کرتے تھے کہ لوگوں کی اکثریت کا یہ خیال غلط تھا کہ ڈاک میں بہت سی چیزیں گم ہوجاتی ہیں۔ ڈاک کی تعداد کی مناسبت سے گم ہونے والی چیزوں کی تعداد بہت کم تھی۔

ان کا کہنا تھا کہ اگر ایڈریس صحیح لکھا ہو تو کسی چیز کے گم ہونے کا امکان ایک فیصد سے بھی کم تھا بلکہ بہت سی چیزیں اور خطوط تو ایڈریس غلط ہونے کے باوجود صحیح جگہ پر پہنچا دیے جاتے تھے۔ اس کے بعد وہ اپنی آرام دہ کرسی پر ٹیک لگاتے ہوئے پائپ کے کش لے لے کر ڈاک کے نظام کی خوبیاں گنوانے لگتے تھے۔

"تم نے سوشل سیکیورٹی آفس والوں سے معلوم کیا؟ انہیں فون کیا؟" ارما نے دریافت کیا۔

"ہاں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان کا کہنا ہے چیک ارسال کیا جاچکا ہے اور کیش بھی کرایا جاچکا ہے۔" گریٹا نے جواب دیا پھر دھندلائی ہوئی نم آلود آنکھوں سے ارما کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ "تم اس سلسلے میں کیا کہو گی؟"

"غالباً کہیں کمپیوٹر سے کوئی غلطی ہوئی ہوگی۔" ارما اپنی کافی میں چینی حل کرتے ہوئے بولی۔ "آجکل اگر کوئی کام غلط ہوتا ہے تو اس کے پیچھے عموماً کمپیوٹر کی غلطی کام کر رہی ہوتی ہے۔"

"تمہیں یقین ہے کہ تم میرے چیک کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں؟" گریٹا کی نظروں میں اب شک نمایاں ہوگیا۔ اسے معلوم تھا کہ خاندان سے باہر کے لوگوں کے لیے ان دونوں بہنوں کی مشابہت ابھی تک پریشان کن تھی۔ لوگ ان میں امتیاز نہیں کر پاتے تھے کہ کون سی گریٹا تھی اور کون سی ارما۔ دونوں بہنیں حیرت انگیز حد تک ہم شکل تھیں۔ ارما کے لیے گریٹا کا چیک مقامی بینک میں لے جاکر کیش کرانا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" ارما کی آواز بلند ہوگئی۔ اس کے لہجے میں احتجاج تھا۔ "مجھے بھلا تمہارے چیک کا کیا پتا۔" اس نے اپنی گردن متانت سے اونچی کی اور اپنے سلیقے سے سنورے ہوئے بالوں کو مزید سنوارنے لگی۔

گریٹا اس کے لہجے اور اس کے انکار سے کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوئی۔ اس انداز میں وہ اس سے پہلے بھی ارما کی زبان سے کئی تردیدیں سن چکی تھی جن میں سب سے قابل ذکر تردید ۴۴ء میں سننے میں آئی تھی جب گریٹا کے نئے ریشمی موزے گم ہوگئے تھے۔ اس نے ارما سے دریافت کیا تو اس نے بالکل اسی طرح لاعلمی ظاہر کی تھی لیکن دو تین روز بعد وہ موزے مسلے اور پھٹے ہوئے دھلائی کے کپڑوں کی باسکٹ میں پڑے ملے تھے۔

گریٹا کو اس وقت بھی ارما کی تردید پر یقین نہیں آیا تھا اور آج اسے اس کی لاعلمی مصنوعی مصنوعی سی لگ رہی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ پچھلی مرتبہ جرابوں کا بیڑا غرق کرکے تو ارما بچ گئی تھی لیکن اس بار گریٹا کا اسے معاف کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

بعد میں اس روز ڈاک آئی تو گریٹا گھر سے باہر تھی۔ ہر منگل کو وہ باقاعدگی سے اپنی کسی دوست کے گھر برج کھیلنے جاتی تھی۔ اس میں ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ اس روز بھی منگل تھا۔ دوپہر کو دروازے پر ہلکی سی کٹ پھٹ سے ارما کو اندازہ ہوا کہ پوسٹ مین ان کے دروازے پر لگے ہوئے باکس میں ڈاک ڈال رہا تھا۔

وہ لپک کر دروازے پر پہنچی۔ دروازے کے عقب میں نصب جالی دار میل باکس میں تین لفافے موجود تھے۔ ایک بجلی کا بل تھا اور دوسرا ان کی کزن لنڈا کا خط۔ یہ دونوں چیزیں ارما نے گریٹا کے لیے ہال کی میز پر رکھ دیں۔ تیسرا لفافہ اسی کے نام تھا۔ یہ اس کے بینک کے شعبۂ ادائیگی کی طرف سے ایک اسٹیٹ منٹ تھی۔ اس میں ارما کی طرف تین سو ڈالر نکل رہے تھے۔

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے تو بہت دن سے اپنا چارج کارڈ دکھا کر کسی دکان سے کوئی خاص خریداری نہیں کی تھی۔ اس کے حساب سے تو اس کے اس مخصوص کھاتے میں خاصی رقم ہونی چاہیے تھی۔ اس نے اسٹیٹ منٹ پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ اس کے چارج کارڈ پر لیورائے جیولری اسٹور سے کوئی اچھا خاصا مہنگا زیور خریدا گیا تھا۔

ارما کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے تو لیورائے کے جیولری اسٹور سے کوئی چیز خریدی ہی نہیں تھی بلکہ وہ تو پچھلے ایک سال سے اس دکان میں گئی بھی نہیں تھی۔ ویسے بھی وہ زیادہ تر چیزیں نقد ادائیگی کرکے خریدتی تھی۔ چارج کارڈ تو وہ صرف کسی ہنگامی ضرورت کے لیے اپنے پرس میں رکھتی تھی۔

"کہیں اس کا چارج کارڈ چوری تو نہیں ہوگیا تھا؟" یہ سوچ کر وہ گھبرا کر الماری کی طرف لپکی جس میں اس کا پرس رکھا تھا۔ اس نے پرس نکال کر جائزہ لیا۔ اس کے ایک خانے میں کارڈ محفوظ تھا۔

ارما کے خیال میں صرف گریٹا ہی ایک ایسی ہستی تھی جو اس کے پرس سے کارڈ نکال بھی سکتی تھی اور استعمال کے بعد اسے وہیں واپس رکھ بھی سکتی تھی۔ آج صبح ہی گریٹا یہ بھی بتا رہی تھی کہ اس کا سوشل سیکیورٹی چیک اس ماہ موصول نہیں ہوا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ رقم کی طرف سے اس کا ہاتھ تنگ ہوگا۔

ارما کو چکر سا آگیا اور وہ ہال میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اسے معلوم تھا گریٹا یہی سمجھتی تھی کہ وہ حساب کتاب میں زیادہ اچھی نہیں تھی۔ ارما کو خود بھی اپنی اس خامی کا احساس تھا۔ اس کی زندگی میں زیادہ نظم و ضبط نہیں تھا۔ وہ حساب کتاب اچھی طرح یاد نہیں رکھ سکتی تھی شاید اسی لیے گریٹا نے سوچا تھا کہ ارما کوئی خاص توجہ دیے بغیر اپنے چارج کارڈ کے بقایا جات کی ادائیگی کردے گی۔

ویسے بھی گریٹا کو جب اور جہاں موقع ملتا تھا' وہ مالی فائدہ اٹھانے سے چوکتی نہیں تھی۔ انہوں نے روز مرہ گھریلو خرچ چلانے کے لیے کچن میں ایک ڈبا رکھا ہوا تھا جس میں وہ مشترکہ طور پر مہینے کے شروع میں کچھ رقم ڈال دیتی تھیں لیکن بعد میں ارما اکثر دیکھتی تھی کہ گریٹا اس میں سے پانچ سات ڈالر یہ کہہ کر نکال لیتی تھی۔

"ادھار لے رہی ہوں۔ تنخواہ ملتے ہی ڈال دوں گی۔"

لیکن ارما نے کبھی گریٹا کو اس ڈبے میں رقم واپس ڈالتے نہیں دیکھا تھا۔ گریٹا کو مالی تنگی ہونی نہیں چاہیے تھی۔ وہ کچھ ایسی تہی دست نہیں تھی اور سوشل سیکیورٹی سے اسے پنشن بھی ملتی تھی لیکن وہ غیر ضروری چیزوں پر بہت خرچ کرتی تھی۔ میک اپ کا نت نیا اور منگا سامان بہت خریدتی تھی اور اسے جیولری کا بھی بہت شوق تھا۔ خصوصاً نت نئی انگوٹھیاں خریدنا تو اس کا مشغلہ تھا۔ دونوں ہی شوق مہنگے تھے۔ اسی لیے اسے پاپا ہی کے زمانے سے کچن کے ڈبے سے چھوٹی موٹی رقمیں "ادھار" کہہ کر نکالنے کی عادت تھی۔ ارما نے کبھی حساب رکھنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ کب کتنی رقم نکالتی تھی۔

ارما نے دوبارہ اسٹیٹ منٹ چیک کی تو معلوم ہوا کہ زیور گزشتہ منگل کو ہی خریدا گیا تھا۔ اسے یقین ہوگیا کہ گریٹا گزشتہ منگل کو برج کھیلنے جاتے وقت جیولری کی دکان کے سامنے سے گزری ہوگی اور شوکیس میں کوئی نئی چیز دیکھ کر رہ نہیں سکی ہوگی۔ خصوصاً نئی انگوٹھی پہن کر برج کھیلنے جانا تو اس کی کمزوری تھی۔ اس بار وہ خریدنے کے قابل نہیں ہوگی تو اس نے بہن کے کارڈ سے کام چلا لیا ہوگا۔

ارما کے دانت بھنچ گئے اور پرس پر اس کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ اس نے تہیہ کرلیا کہ اس بار گریٹا کی چالاکی نہیں چلنے دے گی۔

اس رات کھانے کی میز پر بار بار دونوں بہنیں شک بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔ بالآخر گریٹا نے ارما کے لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہارا ڈریس نیا ہے نا؟"

جس انگلی سے اس نے اشارہ کیا تھا' ارما نے دیکھا اس میں نئی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ ارما نے اس سے پہلے وہ انگوٹھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ اپنا کالر درست کرتے ہوئے ذرا محجوب سے انداز میں بولی۔ "ہاں... یہ ڈریس ہے تو نیا... کلیئرنس سیل میں بہت سستا مل رہا تھا اس لیے لے لیا۔" پھر ایک توقف سے اس نے پوچھا۔ "یہ تمہاری انگوٹھی نئی ہے نا؟"

"ہاں۔ کسی مداح نے تحفتاً دی ہے۔" گریٹا انگلی لہراتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

بدھ کے روز گھر میں ہلکی پھلکی صفائی کرنے کی باری ارما کی ہوا کرتی تھی۔ اس بدھ کو اس نے صفائی اور جھاڑ پونچھ شروع کی تو گریٹا کے بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر اس نے کئی چھوٹی چھوٹی شیشیاں دیکھیں اور ناک بھوں چڑھا کر رہ گئی۔ گریٹا کو گویا دوائیں کھانے کا شوق تھا۔ بات بات پر وہ کسی نہ کسی دوا کی گولی کھاتی تھی۔ بے خوابی' دست' الٹی' قبض' سینے کی جلن' دل کی تکلیف' زکام' نزلہ' جوڑوں کا درد' گھبراہٹ و بے چینی' غرضیکہ اس کے ذخیرے میں ہر تکلیف' ہر شکایت کے لیے گولی موجود تھی۔ جب کہ ارما کا یہ حال تھا کہ وہ سردرد کے لیے اسپرین بھی شاذ و نادر ہی لیتی تھی۔

ارما نے قریب سے ان شیشیوں کا جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ کئی امراض کی گولیاں بالکل ایک جیسی تھیں۔ ڈاکٹر کے لکھے ہوئے نسخے بھی قریب ہی رکھے تھے۔ اچانک ایک عجیب سا خیال ارما کے ذہن میں آیا۔ اگر وہ چھوٹی چھوٹی سفید گولیاں جو گریٹا کو تینوں وقت کھانے سے پہلے لینی ہوتی تھیں' اس شیشی میں ڈال دی جائیں جس میں سے صرف گھبراہٹ اور بے چینی کے وقت ایک گولی لینی ہوتی تھی تو کیا ہو؟ یہ جاننا کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اس نے ایک جیسی گولیوں والی شیشیوں کے ڈھکن کھولے اور ایک کی گولیاں دوسری میں منتقل کرنا شروع کردیں۔ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سازشی سی مسکراہٹ تھی۔

بدھ کو ارما اپنے بال ٹھیک کرانے ہیئر ڈریسر کے ہاں جاتی تھی اور آج اسے بہ مشکل دس بجے کا وقت ملا تھا جو نکلا جارہا تھا۔ گریٹا اس وقت باتھ روم میں تھی۔ ارما اپنی شرارت سے فارغ ہو کر جلدی جلدی تیار ہوئی اور بہ آوازِ بلند گریٹا کو خدا حافظ کہہ کر گھر سے نکل لی۔

گریٹا اس وقت تہ خانے میں تھی اور میلے کپڑے دھونے کے لیے مشین میں ڈال رہی تھی۔ جب سے وہ سیونگ بینک کی ملازمت سے ریٹائر ہوئی تھی' دونوں بہنوں نے کام بانٹ لیے تھے۔ ارما صفائی اور کھانا پکانے کی ذمے دار تھی جب کہ گریٹا نے دھلائی اور باغیچے وغیرہ کی دیکھ بھال اپنے ذمے لی ہوئی تھی۔

دھلائی کے لیے کپڑے چھانٹتے وقت ارما کا نیا ڈریس اس کے ہاتھ میں آیا تو اس نے لیبل پر دھلائی کے لیے ہدایات پڑھیں۔ ان میں لکھا تھا کہ اسے صرف ٹھنڈے پانی میں ہاتھ سے دھوئیں۔ استری بھی نہایت ہلکی گرم کریں۔ گریٹا نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ اس کے ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے نہایت اطمینان سے ڈریس کھولتے ہوئے پانی میں مشین میں ڈال دیا۔

اسے یقین تھا کہ ارما نے وہ لباس اس کے چرائے ہوئے سوشل سیکیورٹی کے چیک سے خریدا تھا اس لیے درحقیقت وہ لباس اسکی ملکیت تھا چنانچہ اسے حق حاصل تھا کہ وہ اس کا جو چاہتی 'حشر' کرتی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ ارما اگر اپنے لباس کے بارے میں شکایت کرے گی تو وہ کہہ دے گی کہ اس نے غلطی سے مشین میں اور گرم پانی میں ڈال دیا تھا۔ غلطی آخر کس سے نہیں ہوتی؟ انسان خطا کا پتلا ہے!

سیڑھیاں چڑھ کر واپس گھر میں آتے وقت گریٹا نے دروازے کے عقب میں لگے ہوئے جالی دار لیٹر باکس کا جائزہ لیا۔ اس میں کوئی خط نہیں تھا۔ یہ بڑی عجیب سی بات تھی۔ روزانہ کچھ نہ کچھ ڈاک تو آتی تھی اور کچھ نہیں تو اشتہارات یا چندے کی اپیلیں ہی آ جاتی تھیں۔

اس کا مطلب تھا کہ کوئی نہ کوئی ڈاک میں گڑبڑ کر رہا تھا۔ ڈاک کے نظام پر اعتماد تو اسے ورثے میں ملا تھا۔ اپنے آنجہانی باپ کی طرح اسے بھی یقین تھا کہ ڈاک میں تو گڑبڑ ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر کوئی گڑبڑ کر بھی رہا تھا تو وہ اس کے اپنے گھر کا فرد تھا لیکن ارما کس طرح یہ کام کر رہی تھی' یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں آئی تو اس کے اعصاب کچھ مرتعش سے تھے۔ اس نے اعصابی سکون کے لیے جلدی سے ایک سفید گولی کھائی اور اس کے اثر کا انتظار کرنے لگی۔ انتظار کے لمحات گزارنے کے لیے وہ تاش نکال کر بیٹھ گئی اور تنہا کھیلے جانے والا ایک کھیل کھیلنے لگی۔ آج اس نے ارما کے نئے ڈریس کا جو حشر کیا تھا اس کے بارے میں سوچ کر اس کے دل میں گدگدی سی ہو رہی تھی۔ وہ اب بے چینی سے اپنی بہن کا ردعمل دیکھنے کی منتظر تھی۔

بالآخر ارما لوٹ آئی۔ اس نے ہال میں لگے ہوئے آئینے میں اپنے بالوں کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیا پھر ڈاک دیکھنے میز تک گئی۔ میز بالکل خالی تھی۔

"کیا آج کوئی ڈاک نہیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں۔" گریٹا نے مضطربانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"حیرت کی بات ہے!" ارما نے گریٹا کی آنکھوں میں جھانکا۔ "اگر مجھے ڈاک کے نظام پر اعتماد نہ ہوتا تو میں یہی سمجھتی کہ کوئی ہمارے خط چُرا رہا ہے۔"

اس رات کھانے کی میز پر بھی خاصی بدمزگی رہی۔ ارما اپنا نیا تباہ شدہ ڈریس دیکھ چکی تھی اور گریٹا پر خوب برہم ہوئی تھی۔ اس نے غصے میں کھانا تیار کیا اور سویٹ ڈش کے طور پر گریٹا کے لیے چاکلیٹ کیک کا ایک ٹکڑا نکالنے لگی تو انتقام لینے کا ایک طریقہ اچانک ہی اس کے ذہن میں آیا۔ اس نے دست آور دوا کی ایک بڑی ٹکیا نکالی اور اسے پیس کر کیک پر چھڑک دیا۔ وہ کچھ ایسے رنگ کی دوا تھی کہ چاکلیٹ کیک میں مدغم ہو کر رہ گئی۔

"اس عورت کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔" وہ کچن میں کام کرتے ہوئے زیر لب بڑبڑائی۔ دوائی کی ٹکیا کا ریپر اس نے اپنی جیب میں چھپا لیا۔

ادھر گریٹا اپنے آپ کو نہایت مضطرب و بے چین محسوس کر رہی تھی۔ وہ بے چینی اور اضطراب دور کرنے کی غرض سے سکون آور دوا کی ایک کے بجائے تین گولیاں کھا چکی تھی لیکن انہوں نے گویا کوئی اثر ہی نہیں کیا تھا۔ اس کا اضطراب اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ وہ اپنے آپ کو ارما کے سامنے میز پر بیٹھ کر کھانا کھانے کے قابل نہیں پا رہی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنا کھانا ٹرے میں رکھ کر کمرے میں لے جا کر کھایا۔

چاکلیٹ کیک اس کی پسندیدہ ترین سویٹ ڈش تھی لیکن سویٹ ڈش ختم کرتے ہی اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے۔ چند لمحے بعد وہ اٹھی اور باتھ کی طرف بھاگی۔

تھوڑی ہی دیر میں تین بار باتھ روم جانے کے بعد وہ لڑکھڑاتے قدموں سے کچن میں پہنچی اور اپنے لیے ہاضمے کا مکسچر تیار کرنے لگی۔ ارما نہایت اطمینان سے کچن میں ٹیبل پر بیٹھی معما حل کر رہی تھی۔ اسے ہاضمے کا مکسچر تیار کرتے دیکھ کر گویا مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے بولی۔ "ہاضمہ خراب ہو گیا ہے یا کپڑے دھونے کی وجہ سے پیٹ میں درد ہو گیا ہے؟"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" گریٹا نے مکسچر کا ایک گھونٹ لے کر تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" ارما نے گویا بات ختم کرنے کی کوشش کی اور جیب سے ٹشو پیپر نکالنے لگی۔ ٹشو پیپر نکالتے ہوئے دست آور ٹکیا کا ریپر بھی اس کی جیب سے نکل کر فرش پر گر پڑا جس کا اسے پتا ہی نہ چلا لیکن گریٹا نے وہ ریپر دیکھ لیا اور ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔

ارما اسی روز بیوٹی پارلر سے بال سیٹ کروا کے آئی تھی۔ گریٹا نے آگے بڑھ کر ہاضمے کے مکسچر کا گلاس اس کے سر پر خالی کر دیا پھر پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچی اور خواب آور گولیوں کی دگنی خوراک لے کر سونے کے لیے لیٹ گئی۔

دوسری صبح گریٹا بیدار ہوئی تو اس نے دیکھا' ارما چاروں ہاتھ پیروں کے بل فرش پر جھکی کچھ کر رہی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھی اور تب اسے معلوم ہوا کہ ارما ایک نقرئی سی' چپکیلی ٹیپ لیے نشست کے کمرے میں فرش پر چپکا رہی تھی۔ اس طرح وہ کمرے کو دو حصوں میں تقسیم کر رہی تھی۔

"اس تقسیم سے ہم دونوں کو آرام رہے گا۔" اس نے گریٹا کو مطلع کیا۔ "ڈائننگ روم اور نشست کا کمرا ہم دونوں کے پاس آدھا آدھا رہے گا۔ کچن پورا میرے پاس اور غسل خانہ پورا تمہارے پاس رہے گا۔ اس طرح ہمیں اپنی اپنی سائڈ پر رہتے ہوئی ایک دوسرے

سے بات کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" کرسٹا بے نیازی سے بولی۔ "لیکن مجھے اس وقت ایک کپ چائے چاہیے۔"

"بولنے کی ضرورت نہیں' لکھ کر دو۔" ارما نے اسے کاغذ کا ایک پیڈ اور پنسل تھماتے ہوئے کہا۔

"چائے۔" کرسٹا نے ایک کاغذ پر صرف اتنا لکھا اور ارما کی طرف بڑھا دیا۔ ارما چپل گھسیٹتی کچن کی طرف چلی گئی۔ اس کے بال بُری طرح الجھے اور چپکے ہوئے تھے۔ کرسٹا نے یہ دیکھ کر طمانیت کی سانس لی۔ اس کا آئیڈیا ہو کمپچر خاصا کارآمد رہا تھا۔

اس روز سترہ تاریخ تھی۔ ارما نے ایک جگہ تھوڑی سی سرمایہ کاری کی ہوئی تھی اور آج اسے وہاں سے منافع کے چیک کا انتظار تھا۔ اس لیے وہ ڈاک آنے سے پہلے گھر سے نکلنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ کرسٹا کو ذرا بھی موقع ملا تو وہ فوراً اس کا چیک چُرا لے گی۔

لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اسے لازماً اپنے بالوں کا بھی کچھ کرنا تھا۔ اس نے بیوٹی پارلر فون کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ صرف ساڑھے دس بجے کا وقت دے سکتے تھے۔ ارما نے بادلِ نخواستہ یہ وقت لے لیا۔

اس کا گھر سے نکلنے کا وقت ہو گیا لیکن ڈاک نہیں آئی۔ مجبوراً رخصت ہوتے وقت اس نے بہتر سمجھا' کرسٹا پر واضح کر دیا جائے کہ وہ آج چیک کی منتظر ہے۔ اس نے کاغذ پر لکھا۔ "آج میرا چیک آنا ہے۔ مجھے مل جانا چاہیے۔"

اس نے کاغذ کرسٹا کی طرف بڑھایا تو اس نے محض بھویں اچکانے پر اکتفا کیا۔ ارما دل میں تہیہ کر کے رخصت ہو رہی تھی کہ اگر واپسی پر اسے ڈاک میں اپنا چیک نہ ملا تو وہ کرسٹا کو اچھی طرح سبق سکھائے گی۔

ادھر کرسٹا نے کھڑکی سے جھانک کر اپنی بہن کو فٹ پاتھ پر جاتے دیکھا تو اچانک ہی اس کی سمجھ میں آیا کہ ارما کس طرح ڈاک غائب کرتی تھی۔ خاص موقعوں پر وہ عین اس وقت گھر سے نکلتی تھی جب پوسٹ مین آنے ہی والا ہوتا تھا۔ فٹ پاتھ پر ان کا سامنا ہوتا ہوگا اور ارما سرسری سے لہجے میں اس سے کہتی ہوگی کہ وہ ڈاک اسے ہی دے جائے' وہ خود ہی گھر لے جائے گی۔ اسے یقین تھا کہ آنجہانی پاپا تو اپنی زندگی میں کبھی کسی خاتون کے اس قسم کے چکر میں نہیں آئے ہوں گے اور ڈاک ہر حال میں گھر ہی پہنچاتے ہوں گے لیکن اپنے موجودہ پوسٹ مین کے بارے میں اسے کچھ زیادہ یقین نہیں تھا۔ وہ ایک وجیہہ نوجوان تھا اور اس قسم کے ذمے دارانہ کام کے لیے خاصا ناموزوں اور ناتجربہ کار معلوم ہوتا تھا۔

ارما دوپہر کو گھر واپس آئی تو اس نے بے تابی سے ہال کی میز اور لیٹر بکس کا جائزہ لیا۔ دونوں چیزیں خالی تھیں۔ آج پھر ڈاک موجود نہیں تھی۔ وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔ اب تو انتہا ہی ہو چکی تھی۔ اس نے دل میں سوچا۔ آخر کرسٹا اسے کس حد تک بے وقوف سمجھ رہی تھی؟ پہلے وہ اس کا چارج کارڈ استعمال کر رہی تھی اور اس کی آنکھوں کے سامنے نئی انگوٹھی پہن کر اترا رہی تھی' سمجھ رہی تھی کہ اسے کچھ پتا نہیں چلے گا۔

اب وہ اس کے چیک پر ہاتھ صاف کر گئی تھی حالانکہ ارما اسے بتا کر گئی تھی کہ آج اسے چیک کا انتظار تھا۔ اس کے باوجود کرسٹا نے چیک غائب کر دیا تھا۔ یہ تو ڈھٹائی کی انتہا تھی' دوسرے کو اشتعال دلانے کی کوشش تھی۔ جس طرح کرسٹا نے اس کا نیا لباس تباہ کر کے اور اس کے بالوں پر کمپچر الٹ کر اسے اشتعال دلانے کی کوشش کی تھی۔

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ہال میں تنہا کھڑے کھڑے بچپن کی بہت سی یادیں ارما کے ذہن میں اُچھل مچا گئیں۔ کرسٹا کا بچپن سے یہی رویہ تھا۔ وہ اس زمانے میں بھی اس پر زیادتیاں کرتی تھی پھر اس کے کان مروڑ کر اسے حکم دیتی تھی کہ وہ گھر میں کسی کو ان باتوں کی ہوا بھی نہ لگنے دے۔

اوپر سے کرسٹا اسے اپنے اور اپنی دوستوں کے ساتھ کھیلنے بھی نہیں دیتی تھی۔ کہتی تھی کہ وہ چھوٹی ہے اس لیے بڑوں میں نہیں کھیل سکتی۔ ارما کو کچھ یوں لگتا تھا کہ اس کی پوری زندگی ہی کرسٹا کی خدمت اور اس کے احکامات کی تعمیل میں گزر گئی تھی۔ نوجوانی سے لے کر اب تک گھر پر رہنا' صفائی کرنا' کھانا پکانا اس کی ذمے داری رہی تھی جب کہ کرسٹا آزاد پرندے کی طرح اڑتی پھرتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ تو ایک بار کیلیفورنیا میں تعطیلات بھی گزار چکی تھی۔ اس تمام عرصے میں ارما ماں باپ کی خدمت کرتی رہی تھی' گھر کے کام کرتی رہی تھی۔

لیکن اب بہت ہو چکی تھی۔ تاخیر سے ہی سہی لیکن اب اسے ہوش آ چکا تھا۔ وہ اب کرسٹا کی غلامی کے پھندے سے آزاد ہونا چاہتی تھی۔ یہ بات جتنی جلدی کرسٹا کو معلوم ہو جاتی اتنا ہی بہتر تھا۔ ارما نے ہال کے اسٹینڈ سے چھتری اتاری' گہری سانس لے کر ایک لمحے کے لیے تن کر کھڑی ہوئی۔ اب وہ کرسٹا کو تلاش کر کے اس سے صاف صاف بات کرنے..... بلکہ دو دو ہاتھ کرنے کے لیے بھی تیار تھی۔

کرسٹا اس وقت سیڑھیوں کی بلندی پر' دیوار کی آڑ میں کھڑی ارما کی حرکات و سکنات بغور دیکھ رہی تھی۔ وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ارما اس وقت کیا سوچ رہی تھی؟ ارما بچپن ہی سے چالاک رہی تھی۔ کرسٹا کو یاد تھا کہ وہ بات بات پر ممی پاپا کے پاس شکایت لگانے بھاگی جاتی تھی۔

ممی پاپا کی بھی وہ چہیتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ تو کبھی کوئی غلط کام' کبھی کوئی شرارت کر ہی نہیں سکتی۔ وہ چھوٹی تھی' صاف ستھری اور اسمارٹ بھی نظر آتی تھی۔ بیمار بھی کم ہوتی تھی۔ اس لیے ماں

باپ کو زیادہ پیاری لگتی تھی۔ ماں باپ اسے تو گھر پر اپنی شفقت کے سائے میں رکھتے تھے جب کہ گریٹا کو ملازمت کے لیے اور گھر کی آمدنی میں اضافے کے لیے باہر جانا پڑتا تھا۔

گریٹا کو یہ سب زیادتیاں یاد آرہی تھیں اور ساتھ ہی یہ خیال بھی آرہا تھا کہ ان سب باتوں کا ارما نے کیا صلہ دیا تھا؟ یہی کہ اب وہ اس کا سوشل سیکیورٹی کا چیک بھی چرانے لگی تھی اور اسے دست آور دوا کی زیادہ مقدار دے کر موت کے منہ میں پہنچانے کی کوشش کر چکی تھی۔

اس کے علاوہ گریٹا کو یہ بھی شک تھا کہ ارما نے اس کی دواؤں میں بھی کوئی گڑبڑ کی تھی۔ وہ گولیاں کھاتی کسی مقصد سے تھی اور ان کا اثر کچھ اور ہوتا تھا۔

گریٹا نے دیکھا کہ ارما چھتری ہاتھ میں لیے کسی خاص ارادے سے چپکے چپکے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آرہی تھی۔ چھتری یقیناً اس کا ہتھیار تھی۔ گریٹا سرہلا کر رہ گئی۔ وہ بھی غیر مسلح نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ میں بھی آنجہانی پاپا کی ایک بیلٹ موجود تھی۔ اس نے بیلٹ والا ہاتھ بلند کیا اور دیوار کی آڑ میں سانس روک کر کھڑی ہوگئی۔ وہ سازشی حملہ آور کے استقبال کے لیے تیار تھی۔

ارما چھتری مضبوطی سے ہاتھ میں تھامے گریٹا کی تلاش میں دبے پاؤں سیڑھیوں پر چڑھی آرہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ بچپن میں بھی گریٹا اس پر اچانک حملہ کرنے کے لیے سیڑھیوں کے بالائی سرے پر دیوار کی آڑ میں چھپ کر کھڑی ہوتی تھی۔ اسے قوی امکان نظر آرہا تھا کہ وہ آج بھی وہیں چھپی کھڑی ہوگی لیکن آج ارما اس کے اچانک حملے کے لیے پوری طرح تیار تھی۔

آخری سیڑھی سے ایک سیڑھی پہلے ارما نے رک کر گہری سانس لی۔ وہ اچانک ہی اپنی چھتری کی نوک دیوار کے عقب میں گھسیڑنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہی تھی۔ گریٹا کو اس حملے کی توقع تھی اور وہ اس سے پہلے ہی بھاری بیلٹ گھما کر ارما کے رسید کرنے کے لیے تیار تھی۔

ارما کی چھتری جونہی نیزے کی طرح دیوار کے عقب میں آئی، گریٹا نے اپنے آپ کو اس سے بچاتے ہوئے گھما کر بیلٹ رسید کی۔ حملہ ناکام ہونے پر ارما توازن کھو بیٹھی۔ اس نے اپنے آپ کو گرتے محسوس کیا تو گریٹا کے استخوانی بازو مضبوطی سے پکڑ لیے جس کے نتیجے میں دونوں ہی بہنیں سیڑھیوں پر لڑھکتی نیچے آنے لگیں چند لمحے بعد وہ دونوں نیچے ہال میں مڑی تڑی سی حالت میں ساکت پڑی تھیں۔

چند گھنٹے بعد برائن نے کال بیل بجائی۔ برائن گھروں میں اخبار ڈالنے والا لڑکا تھا۔ آج اس کا بل وصول کرنے کا دن تھا اس لیے وہ اخبار ڈالنے سے پہلے گھنٹی بجا رہا تھا۔ کئی بار گھنٹی بجانے پر بھی جب کوئی جواب نہیں آیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ گھر میں کوئی موجود نہیں تھا۔ اس نے مخصوص درز سے اخبار اندر پھینک دیا اور آگے روانہ ہوگیا۔

اخبار دونوں بہنوں سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر پڑا تھا اور اس کی صفحہ اول کی خبر تھی۔

ڈاک کی چوری کا معما حل ہوگیا۔

مڈل ٹاؤن پولیس نے ایک ماہ کی تفتیش اور سراغرسانی کے بعد گزشتہ روز باون سالہ ارل اسمتھ کو گرفتار کرلیا جو محکمۂ ڈاک کا ملازم نہیں ہے لیکن پولیس اور محکمۂ ڈاک کے حکام اس امر پر متفق ہیں کہ گزشتہ تین ماہ میں ارل اسمتھ کم از کم دو لاکھ خطوط چوری کرچکا ہے۔

دراصل اس کے اپارٹمنٹ کی ایک کھڑکی جنرل پوسٹ آفس کے ڈلیوری روم کے عین سامنے کھلتی تھی اور دونوں کے درمیان فاصلہ بھی بہت کم تھا۔ ارل نے لکڑی کا ایک لمبا سا چمٹا تیار کر رکھا تھا۔ وہ جب بھی مناسب موقع دیکھتا تھا اس چمٹے کے ذریعے ڈلیوری روم میں پڑے ڈاک کے انبار سے بہت سے خطوط اٹھالیتا تھا۔

پولیس چیف چارلس نے بتایا کہ اس کے اپارٹمنٹ سے ہزاروں بغیر کھلے خطوط برآمد ہوئے ہیں۔ وہ لفافوں سے نقدی، چیک، ڈرافٹ اور بذریعہ ڈاک ارسال کیے جانے والے چارج کارڈ چوری کرتا تھا لیکن اس چکر میں بہت سے ایسے خطوط بھی اس کے ہاتھ لگ کر ضائع ہوجاتے تھے جن میں کوئی قیمتی چیز نہیں ہوتی تھی لیکن وہ مکتوب الیہ کے لیے نہایت ضروری ہوتے تھے۔ بہت سی دستاویزات اور اہم کاغذات اس طرح ضائع ہوئے۔ مختلف اسٹورز اور کمپنیوں سے بھیجے جانے والے پارسل بھی ارل اسمتھ اُڑا لیتا تھا۔ ان سے برآمد ہونے والی سیکڑوں مصنوعات اس کے اپارٹمنٹ میں پائی گئی ہیں۔

پولیس چیف نے بتایا کہ یہ کامیابی پوسٹ ماسٹر مسٹر گرینڈ کے تعاون سے ممکن ہوئی۔ مسٹر گرینڈ کے پاس کافی دنوں سے مقامی شہری شکایات لے کر آرہے تھے کہ انہیں ڈاک سے بہت سی ایسی چیزیں موصول نہیں ہو رہی ہیں جو موصول ہونی چاہئیں تھیں۔

پوسٹ ماسٹر نے جنرل پوسٹ آفس میں ہر طرح سے تفتیش اور خفیہ تحقیقات کرکے دیکھیں لیکن کسی ملازم کے ڈاک چوری کرنے کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔ پوسٹ ماسٹر کا کہنا ہے کہ عام تاثر کے برعکس بہت کم ڈاک گم ہوتی ہے۔ انہوں نے شہریوں کا شکریہ ادا کیا کہ اس معاملے میں انہوں نے صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ ارل اسمتھ کی دست برد سے بچے ہوئے خطوط متعلقہ افراد کو ارسال کردیے جائیں گے۔'

خبر کے ساتھ اخبار میں کچھ تصاویر بھی چھپی ہوئی تھیں۔ گریٹا اور ارما اگر چاہتیں تو ہاتھ بڑھا کر اخبار اٹھا سکتی تھیں اور یہ خبر پڑھ سکتی تھیں لیکن اب ایسا ممکن نہیں تھا۔

اگر کوئی ان کے قریب موجود ہوتا تو دیکھ سکتا تھا کہ اب وہ بھی اخبار کی طرف... بلکہ کسی بھی چیز کی طرف ہاتھ نہیں بڑھائیں گی۔ کیوں کہ دونوں کے سر بار بار سیڑھیوں سے ٹکرائے تھے۔ دونوں مرچکی تھیں!

LOST IN THE MAIL
LESLIE MIER

جاسوسی ڈائجسٹ، جولائی 1993ء

شبِ جنوں

اختر بیگ

قتل کرنا اُس کا شوق یا پیشہ نہیں تھا بلکہ اُس نے اسے اپنا مشن بنا لیا تھا۔ وہ معاشرے کی تطہیر کرنا چاہتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ عورت کا وجود معاشرے میں خرابی کا سبب ہے۔

خیر و شر کی دلچسپ آنکھ مچولی کا احوال۔ ایک قاتل کہانی

وہ بڑے اصرار سے پوچھے جا رہی تھی۔ "بتاؤ تو سہی.... کسی کو قتل کرنا کیسا محسوس ہوتا ہے؟"

میں نے سر اٹھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ بار کی دھندلی روشنی میں اس کی ستارہ آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر سرخی یوں چمک رہی تھی جیسے ان پر پینٹ کیا گیا ہو۔ یہ عورتیں اس خیال سے اپنے ہونٹوں پر پینٹ جیسی یہ چمک پیدا کرتی ہیں کہ اس طرح ان کے ہونٹ زیادہ دلکش اور جذبات خیز نظر آئیں گے۔ کتنی ہوس ہوتی ہے انہیں دلکش اور جذبات خیز نظر آنے کی!

میں نے اپنے گلاس سے ایک گھونٹ بھرنے کے بہانے گویا

کچھ مہلت حاصل کی۔ اپنی ڈرنک کا ذائقہ مجھے دوا جیسا محسوس ہو رہا تھا لیکن مجھے کوئی ایسی بیماری نہیں تھی جس کا علاج اس دوا سے ہو سکتا۔

"کسی کو قتل کرتے وقت.... کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا۔" میں نے جواب دیا۔ "حقیقت یہی ہے۔ قطعاً کچھ محسوس نہیں ہوتا۔" حالانکہ یہ جھوٹ تھا مگر وہ عورت اسی قابل تھی کہ اس سے جھوٹ بولا جاتا۔

"تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو۔" وہ بولی۔ "کچھ نہ کچھ تو محسوس ہوتا ہوگا۔ تمہارے پاس اس وقت ریوالور ہے؟"

"ہاں۔ ہر وقت ہوتا ہے۔ میرا دوست' میرا ساتھی' میرا غمگسار' میرا مددگار' میری شریکِ حیات' سب کچھ میرا ریوالور ہے لیکن اس وقت میرا خیال ہے تم میری اس سے زیادہ اچھی دوست ہو۔" میرے خیال میں وہ اسی قسم کے الفاظ کا چارہ پھینکنے سے پھنسنے والی مچھلی تھی۔ جذباتی جملے.... کھوکھلی باتیں.... جھوٹے لفظ۔ بعض عورتیں ان سے بڑی متاثر ہوتی ہیں۔

وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔ "اپنا ریوالور مجھے دکھاؤ۔ میں ایک منٹ کے لیے اسے ہاتھ میں تھام کر دیکھنا چاہتی ہوں۔"

وہ ایک پرانا سا بار تھا۔ بیشتر شراب خانوں کی طرح وہاں بھی روشنی کم تھی۔ ہم ایک بوتھ میں چمڑے کی پوشش والے صوفوں پر بیٹھے تھے۔ اپنے ٹخنوں پر مجھے ائرکنڈیشنر کی خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ ہمارے گلاس نم آلود تھے اور میز کی فارمیکا پر نمی کے دائرے نظر آرہے تھے۔

وہ اس وقت بار میں آئی تھی جب میں دو ڈرنکس ختم کر چکا تھا۔ وہ کاؤنٹر کے قریب بیٹھی بار بار کن انکھیوں سے میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ میں نے ہاتھ ہلا کر اشارے سے اسے اپنی میز پر بلا لیا۔ اس نے آنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس طرح کی عورتیں بھلا ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرنے کی متحمل کہاں ہو سکتی ہیں۔ آوارہ.... بدقماش اور ہرجائی....

وہ میری میز پر آگئی تو میں نے پوچھا۔ "ایک اور ڈرنک لوگی؟"

وہ جن میں اورنج جوس ملا کر پی رہی تھی' اس قسم کی ڈرنک کا شوق کسی ماں کو ہی ہو سکتا تھا۔ کم از کم میری ماں کو تو بہت تھا۔ حتیٰ کہ یہی پیتے پیتے وہ مر گئی۔

وہ میری میز پر آگئی تھی تو ایک دوسرے کا نام جاننا بھی ضروری تھا۔ اس نے اپنا نام رشی بتایا۔ اس کے بال سرخ تھے۔ عین ممکن ہے یہ ان کا اصلی رنگ ہی رہا ہو۔ میں اٹھ کر ڈرنک لینے کاؤنٹر پر چلا گیا۔ وہ ایک "سیلف سروس" قسم کی جگہ تھی۔ وہاں کوئی ویٹرس وغیرہ نہیں تھی۔ گاہک بھی زیادہ نہیں تھے۔ ایک کونے میں ٹی وی ٹرٹرا رہا تھا۔ اس پر بیس بال کا کوئی میچ دکھایا جا رہا تھا۔ وہ اس قسم کا بار تھا جیسے عموماً گلی کوچوں میں ہوتے ہیں لیکن نہ تو وہ گلی کوچہ میرا تھا اور نہ ہی مجھے بیس بال سے کوئی دلچسپی تھی۔ وہ اگست کی

ایک حبس زدہ رات تھی اور میں نے سوچا تھا' خالی گھر میں اندھیرے میں لیٹ کر چھت کو تکنے سے تو گلیوں میں گشت کرنا ہی بہتر تھا۔

بارٹینڈر نے میری مطلوبہ ڈرنکس تیار کر کے میرے سامنے رکھیں اور منتظر نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ وہ قیمت کا منتظر تھا۔ اس دنیا میں ہر کوئی کسی نہ کسی چیز کی قیمت کا منتظر تھا۔ میں نے قیمت ادا کی' اس کے لیے کچھ ٹپ چھوڑی اور اپنی میز پر واپس آگیا۔ میں دل ہی دل میں خود کو سمجھائے جا رہا تھا' یہ افسردگی عارضی ہے۔ جلد ہی ٹل جائے گی۔ کبھی کبھی ہر انسان پر ایک خاص موڈ طاری ہوتا ہے' جلد ہی تم اپنے آپ کو بہت بہتر محسوس کرو گے۔'

"مجھے اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔" میں نے بوتھ میں اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ حالانکہ میں اسے اس کی داستانِ حیات سنا سکتا تھا۔ اس قسم کی بہت سی عورتوں کی داستانِ حیات میں بہت سی باتیں مشترک ہوتی ہیں۔ اگر وہ حقیقتاً میری طرف کچھ توجہ دیتی تو وہ بھی مجھے میری داستانِ حیات سنا سکتی تھی۔ دونوں میں شاید زیادہ فرق نہ ہوتا۔

اپنی داستانِ حیات کا خلاصہ سناتے سناتے وہ جب ناکام شادی والے حصے تک پہنچی اور یہ بتانے لگی کہ اس کا ایک بچہ بھی تھا جو اپنی نانی کے ہاں پرورش پا رہا تھا' تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ اسے ایک اور ڈرنک کی ضرورت تھی۔

"اس بار ڈرنک میں لاؤں گی۔" وہ بولی۔ "اس کے بعد تم مجھے بتانا کہ تم نے پولیس آفیسر بننے کا فیصلہ کیوں کیا۔"

کاؤنٹر پر جانے سے پہلے وہ کچھ دیر کے لیے لیڈیز روم کی طرف چلی گئی۔ اس دوران میں نے کئی بار سوچا کہ وہاں سے کھسک جاؤں۔ اس وقت مجھے یہی کرنا چاہیے تھا۔ یہی میرے حق میں بہتر تھا لیکن میری آنجہانی والدہ کہا کرتی تھیں۔ "یہ جان لینا تو آسان ہے کہ صحیح کام کیا ہے لیکن اسے کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔"

وہ واپس آگئی۔ اونچی ایڑیوں والے سینڈلوں میں چلنا شاید اسے کچھ دشوار محسوس ہو رہا تھا۔ ڈرنکس کے ساتھ وہ چپس کے دو پیکٹ بھی اٹھائے ہوئے تھی۔ "کچھ کھانے کو دل چاہ رہا تھا۔" اس نے وضاحت کی۔ "لیکن میں یہاں کے کچن کی کوئی چیز نہیں کھانا چاہتی تھی۔ میں نے اتفاق سے کچن میں جھانک کر دیکھ لیا تھا۔ اصطبل سے بدتر نظر آرہا تھا۔"

"اصل میں لوگ یہاں کھانے نہیں آتے۔" میں نے کہا۔ میرا خیال تھا کہ بھوک کا ذکر چلا ہے تو وہ مجھے کھانے کے بہانے اپنے گھر چلنے کی دعوت دے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بالآخر میں نے ہی اشارتاً ترغیب دی۔ "کہیں چلتے ہیں۔"

"کچھ دیر بعد شاید چلیں۔" وہ بولی۔ "پہلے تم مجھے بتاؤ کہ تم جیسے شاندار آدمی پولیس میں نوکری کیوں کر لیتے ہیں جہاں تنخواہ اتنی

معمولی ہوتی ہے اور جان کا خطرہ ہر روز رہتا ہے؟" یہ کہہ کر اس نے اپنے گلاس سے چسکی لی۔ وہ سراپا نسوانیت تو تھی، کچھ بجھا بجھا نسوانی وقار بھی اس کی شخصیت سے کبھی کبھی جھلک اٹھتا تھا لیکن اس کی آنکھیں بہکی بہکی تھیں۔

میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ یہ میرا تیسرا تلخ اور استہزائیہ قہقہہ تھا۔ میں اپنے ہاتھ کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس پر ایک چوٹ کا ہلکا سا ابھار موجود تھا۔ یہ چوٹ چند دن قبل آئی تھی جب مجھے کسی کے ساتھ زور آزمائی اور ہاتھا پائی کرنا پڑی تھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے اس کے سوال کا جواب دیا۔ "میرا باپ بھی ایک پولیس والا تھا۔ وہ کوئی اچھا یا مستعد اور اسمارٹ قسم کا پولیس والا تو نہیں تھا.... لیکن بس.... شاید پولیس کی نوکری اب ہماری خاندانی روایات میں شامل ہو گئی ہے۔"

"اچھا.... تو باپ کے نقشِ قدم پر چل رہے ہو۔" اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ "تم اس سے بہتر پولیس والا بن کر دکھانا چاہتے ہو۔"

اپنی دانست میں وہ مجھے سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ بھلا کیا سمجھ سکتی تھی۔ احمق کہیں کی! اس سے پہلے نادیہ.... شیری وغیرہ بھی کچھ نہیں سمجھ سکی تھیں۔ میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا۔ "نکی ڈیئر....! ایک بار پھر تمہیں وہی مرحلہ درپیش ہے!"

میں نے سر اٹھا کر بار کا جائزہ لیا۔ وہ کچھ جانی پہچانی سی جگہ لگ رہی تھی لیکن مجھے یاد نہیں تھا کہ میں وہاں پہلے کبھی آیا تھا۔ شہر میں ایسے ہزاروں شراب خانے پھیلے ہوئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے.... نیم تاریک۔ ان میں تمباکو کے دھوئیں اور شرابوں کی بُو کے ساتھ گویا گناہ اور بُرائی کی بُو بھی پھیلی رہتی تھی۔

ان کی تھوڑی بہت انفرادیت ارد گرد کے علاقے کی وجہ سے نظر آتی تھی۔ مثلاً اگر آس پاس آئرش لوگ زیادہ رہتے تھے تو بار میں بھی آئرش زیادہ نظر آتے تھے۔ اگر ارد گرد اطالوی رہائش پذیر تھے تو بار میں بھی اطالویوں کا جمگھٹا دکھائی دیتا تھا اور اگر وہ کالوں یا ہسپانویوں کا علاقہ تھا تو انہی کے چہرے زیادہ دیکھنے کو ملتے تھے۔ اس کے علاوہ باقی سب کچھ ایک جیسا ہوتا تھا۔ یہ شراب خانے گویا کنکریٹ کے فٹ پاتھوں کو چیر کر ابھرے ہوئے تھے، اُگے ہوئے تھے۔ یہ اپنے گاہکوں کی کبھی نہ بجھنے والی پیاس پر پلتے تھے۔

مجھے اس پیاس سے خبردار رہنا چاہیے تھا۔ میرے باپ کو اس پیاس کی وجہ سے پولیس فورس سے لات مار کر نکال دیا گیا تھا جس کے بعد اس کی پیاس کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ اس کا انتقال ایسے ہی ایک بوتھ میں ہوا تھا جیسے میں اس وقت میں اور رسٹی بیٹھے ہوئے تھے۔ بلکہ کوئی بعید نہیں تھا وہ بھی بوتھ رہا ہو۔

میں اس وقت گھر سے بہت دور تھا۔ میں عظیم امریکا دیکھنے نکلا ہوا تھا۔ میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ اس عظیم امریکا میں میرے لیے کوئی جگہ ہے یا نہیں۔ عظیم امریکا میں یقیناً میرے لیے جگہ موجود تھی۔ میں اس وقت اسی جگہ بیٹھا ہوا تھا!

"تم کافی کم گو معلوم ہوتے ہو۔" وہ چپس چباتے ہوئے بولی۔ وہ مجھے بولنے کے لیے تحریک دے رہی تھی۔

"بولنے اور بتانے کے لیے میرے پاس کچھ زیادہ نہیں ہے۔" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا پھر ایک گہری سانس لی۔ "اُف خدایا.... ! ہمیں یہاں سے کہیں چلنا چاہیے۔ یہاں میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

"میرا بھی۔" وہ اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے بولی۔ وہ کچھ اس قسم کے لباس میں تھی جس کے ہونے نہ ہونے سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا تھا۔ کتیا کہیں کی....! میں اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

باہر آکر فٹ پاتھ پر رک کر اس نے ویران سڑک پر دائیں بائیں دیکھا اور قدرے پریشانی سے بولی۔ "ہمیں فون کر کے ٹیکسی منگوا لینی چاہیے تھی۔ سڑک پر تو لگتا ہے ہرگز نہیں ملے گی۔"

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "میرے پاس کار ہے، سامنے والی گلی میں پارک کر رکھی ہے۔"

سامنے دو صنعتی سی عمارتیں تھیں اور ان کی درمیانی گلی تاریک تھی۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" وہ جھرجھری سی لے کر بولی پھر میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ "معلوم نہیں کیوں میں اتنی بزدل سی ہوں۔ شاید یہ ان عورتوں کے قتل کی خبروں کا اثر ہے جو اخباروں میں پچھلے دنوں چھپتی رہی ہیں۔ کتنی عورتیں اب تک قتل ہو چکی ہیں؟ پانچ؟"

"چھ۔" میں نے جواب دیا۔ میرا جواب تھوڑا سا غلط تھا۔ چھ ابھی ہوئی تو نہیں تھیں لیکن جلد ہی ہونے والی تھیں۔

پھر میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہیں راتوں کو اکیلی باہر نہیں پھرنا چاہیے اور اس طرح اجنبیوں سے باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔"

وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ "مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں ایک پولیس والے کے ساتھ ہوں۔" اس کی چال، اس کا

کندھے اچکانا' اس کا ہونٹوں کو سکیڑنا' سب کچھ جذبات خیز تھا اور یہ بات اسے خود بھی اچھی طرح معلوم تھی۔ اس کی حرکات و سکنات بلا ارادہ نہیں تھیں۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ ذرا دھیمے لہجے میں بولی۔ "تم مجھے راتوں کو گھر سے نہ نکلنے کا مشورہ دے رہے ہو لیکن کبھی تم کئی راتوں تک تنہا گھر پر رہ کر دیکھو۔ جب کوئی تم سے بات کرنے والا' کوئی تمہاری بات سننے والا نہ ہو۔ چند راتوں کے بعد ہی تم اپنے آپ کو پاگل ہوتا محسوس کرو گے۔"

اچھا....! تو اس کا مطلب تھا کہ وہ تنہا رہتی تھی اور تنہا رہنا اسے پسند نہیں تھا۔ اب براہ راست پیش قدمی کا مرحلہ آگیا تھا۔ چنانچہ میں نے کہا۔ "تمہارے گھر پر کچھ کھانے کو نہیں ہوگا؟ تم خود ہی کہہ چکی ہو کہ پولیس والوں کو تنخواہ معمولی ملتی ہے۔ ظاہر ہے میں تمہیں کسی اچھے ریستوران میں لے جانے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ وہ گویا سوچ میں پڑ گئی تھی لیکن مجھے معلوم تھا یہ محض اداکاری تھی۔

"مجھے تم کو اپنے ساتھ گھر لے کر تو نہیں جانا چاہیے۔" بالآخر وہ بولی۔ "فرض کرو تم پولیس والے نہیں بلکہ وہی شخص ہو جو ان عورتوں کو چھری کے نہ جانے کتنے کتنے وار کر کے قتل کر چکا ہے....؟"

میں نے اپنا بیج نکال کر اس کے سامنے لہرایا اور کہا۔ "میں اپنا ریوالور بھی تمہیں دکھا دوں گا..... بلکہ تمہارے ہاتھ میں بھی دے دوں گا لیکن یہاں سڑک پر نہیں۔"

وہ ہنس دی۔ "مجھے تمہاری بات کا یقین ہے۔"

اس نے میرا بازو تھام لیا اور میں سامنے والی گلی کی طرف چل دیا۔ جب ہم اندھیرے میں پہنچے تو خوف سے وہ گویا مجھ پر گرنے لگی۔ وہ مختصر قد کاٹھ کی تھی۔ اس کا سر بہ مشکل میرے کندھوں تک پہنچ رہا تھا۔ وہ خوف سے کانپ رہی تھی۔

"ڈرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اس پر جھکتے ہوئے کہا۔ تب وہ اچھل کر ایک طرف کو ہٹ گئی تاہم میرے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ ہم کار تک پہنچے تو اس نے جلدی سے اندر بیٹھ کر دروازہ مقفل کر لیا۔

میرے ساتھ وہ یقیناً اپنے آپ کو محفوظ محسوس کر رہی تھی' اور کیوں نہ کرتی؟ ایک پولیس والے کے بارے میں تو یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ ان آوارہ' بدقماش اور دوسروں کے جذبات کو ابھارنے والی عورتوں کو ان مصیبتوں سے بھی بچائے گا جنہیں یہ خود اپنی بدفطرتی یا بے وقوفی کی وجہ سے دعوت دیتی ہیں۔ پولیس والوں کے بارے میں ان کے ذہن میں یہ تاثر بھی ہوتا ہے کہ وہ زیادہ قابل رشک مرد ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے زیادہ تر تو پولیس والوں ہی کی تاڑ میں رہتی ہیں۔ اسی وجہ سے میرے لیے ان کے ساتھ ان کے گھر جانا آسان ثابت ہوتا ہے۔

اس کے گھر پہنچ کر میں نے دیکھا' اس کے فریج میں کچھ بچا ہوا چائنیز کھانا اور چند بے چارے "تنہا تنہا" سے انڈے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے ایک عمدہ قسم کے آملیٹ کی تیاری شروع کر دی اور انڈے پھینٹنے لگا۔ اس نے کافی کے لیے پانی ابلنے رکھ دیا۔

میرے آملیٹ کی تیاری دیکھ کر وہ بولی۔ "ایسا آملیٹ تو میں بھی تیار نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے کھانا پکانا کچھ خاص نہیں آتا' زیادہ تر میں اسی ریستوران میں کھانا کھاتی ہوں جہاں میں کام کرتی ہوں لیکن آج میرا چھٹی کا دن تھا۔"

میں آملیٹ تیار کر کے تلنے لگا تو وہ اپنا میک اپ درست کرنے باتھ روم میں چلی گئی۔ اس کی عدم موجودگی میں' میں نے کچن کی درازوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ میں جس عورت کو منتخب کرتا ہوں اسی کے کچن کی چھری استعمال کرنا پسند کرتا ہوں۔ ایک تو اسے کہیں چھپانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ دوسرے اس کی مدد سے میرا سراغ نہیں لگایا جا سکتا۔

ایک دراز میں مجھے صرف ایک چھری نظر آئی۔ بہت عام سی چھری تھی۔ زیادہ تیز بھی نہیں تھی لیکن بہرحال کام دے سکتی تھی۔

آملیٹ تیار ہو چکا تھا اور وہ ابھی تک باتھ روم میں ہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ پہلے اسے پیٹ بھر کر کھانے دوں گا اور اس دوران ایک پولیس والے کی پیشہ ورانہ زندگی کے قصے سناتا رہوں گا اور جب وہ اچھی طرح ہیجان زدہ نظر آنے لگے گی تو.....

میں نے بہ آواز بلند کہا۔ "کھانا تیار ہے۔"

"بس میں ایک سیکنڈ میں آئی۔" اس نے جواب دیا اور واقعی دوسرے ہی لمحے وہ لوٹ آئی۔ وہ ایک خالص طوائفانہ لبادہ پہنے ہوئے تھی جسے اس قسم کی عورتیں ازراہ بدذوقی' شب خوابی کا لباس کہتی ہیں۔ خوشبو اتنی تیز لگا رکھی تھی کہ میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ یہ عورت تو خود ہی یقیناً اپنے لیے مصیبت و اذیت کو دعوت دے رہی تھی اور میں کسی عورت کو مایوس کرنا پسند نہیں کرتا۔

میں نے اس کی توقعات کے عین مطابق آنکھیں پھاڑ کر اس کی طرف دیکھا اور ہلکی سی سیٹی بجائی۔ اپنا مطلوبہ ردِعمل دیکھ کر وہ فوراً اٹھلانے لگی۔ "اچھی لگ رہی ہوں نا؟"

"بہت اچھی۔" میں نے الفاظ پر زور دے کر کہا۔ "میرا خیال ہے فی الحال تو ہمیں آملیٹ کو بھی بھول جانا چاہیے۔"

دل ہی دل میں' میں نے کہا' گھٹیا..... بازاری اور ذلیل عورت.....! زمین کے سینے پر ایک بوجھ.....!"

وہ مزید اٹھلا کر بولی۔ "آملیٹ کو تو فی الحال میں نہیں بھول سکتی۔ میں بھوک سے مری جا رہی ہوں۔ ویسے بھی جب بھوک سے میری آنتیں کلبلا رہی ہوں تو میں ذرا بھی رومینٹک نہیں رہتی۔ اس کے علاوہ کھانے کے دوران مجھے تمہاری مہمات کے بارے میں بھی تو سننا ہے۔"

اس نے صحیح لفظ استعمال کیا تھا۔ مُہمات۔ واقعی وہ مُہمات ہی تو تھیں جو میں نے سر کی تھیں۔ میں اس بازاری عورت کو بتانا چاہتا تھا کہ میں نے اس جیسی دوسری عورتوں کے کس طرح ٹکڑے کیے تھے۔ وہ بہت گڑگڑائی تھیں، رحم کی بھیک مانگی تھی۔ وہ میری ہر خواہش پوری کرنے کے لیے تیار تھیں۔ احمق کہیں کی! ان میں سے ہر ایک نے یہی سمجھا تھا کہ میں اپنی شیطانی خواہشات کی تسکین چاہتا ہوں۔ انہیں آخری دم تک اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ میں تو معاشرے کی تطہیر کے لیے نکلا ہوا تھا۔ میں معاشرے کو اس غلاظت سے پاک کرنا چاہتا تھا جو انسانوں کی صورت میں.... خصوصاً ان گھٹیا عورتوں کی صورت میں گلی کوچوں میں بکھری ہوئی تھی۔ مسئلہ خواہشات کا نہیں، صفائی کا تھا۔

ہم چھوٹی سی میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ میز پر سفید میزپوش پھیلا ہوا تھا اور اس پر سجے ہوئے برتن ایک سیٹ کے نہیں تھے۔ چھری میں نے بظاہر یا سی، اطالوی ڈبل روٹی کاٹنے کے لیے قریب ہی رکھی تھی۔

رشی نے کیسٹ پلیئر میں ایک کیسٹ لگادی تھی۔ موسیقی کے بے ہنگم شور میں کوئی ڈکرا ڈکرا کر اس عورت کے بارے میں بتانے کی کوشش کررہا تھا جس کے وہ خواب دیکھتا رہا تھا۔ رشی کا موسیقی کا ذوق بھی میرے اندازوں کے عین مطابق گھٹیا تھا۔ اس کے بارے میں میرے سبھی اندازے درست معلوم ہوتے تھے۔ وہ مرحلہ وار وہی کچھ کررہی تھی جس کی مجھے توقع تھی۔

مجھے امید تھی کہ وہ بہت آسان شکار ثابت ہوگی۔ مجھے کچھ زیادہ مشقت، زیادہ پریشانی اٹھانی نہیں پڑے گی۔ بلکہ حقیقت تو یہ تھی کہ اس آسانی کا تصور کرکے میرا لطف غارت ہونے لگا تھا۔ جب تک کچھ مزاحمت نہ ہو، کچھ کشمکش، کچھ دشواری نہ ہو تب تک کسی مہم کا کیا لطف۔ اس طرح تسکین نہیں ملتی۔ میں سوچ رہا تھا شاید اب مجھے شکار کے لیے زیادہ وسیع میدان کا انتخاب کرنا ہوگا۔ اب مجھے اونچے طبقے کا رخ کرنا چاہیے تھا۔

وہ کچھ کہہ رہی تھی جو میں سن نہیں سکا تھا۔ میں نے اپنے خیالات سے چونکتے ہوئے کہا۔ "معاف کرنا.... میں نے سنا نہیں۔ دراصل میں اس کیس کے بارے میں سوچنے لگا تھا جس پر آج کل کام کررہا ہوں۔"

میں جھوٹ تو نہیں کہہ رہا تھا۔ میں واقعی اسی "کیس" کے بارے میں سوچ رہا تھا جس پر "کام" کررہا تھا۔ وہ بولی "میں یہ کہہ رہی تھی کہ آملیٹ بہت اچھا بنایا ہے تم نے۔ کیا تم خود نہیں کھاؤ گے؟"

میں دھیرے سے ہنس دیا۔ مرد کے ہاتھ کی پکی ہوئی چیز کھا کر اس قسم کی عورتیں بہت خوش ہوتی ہیں۔ میں نے متانت سے کہا۔ "دو موقعوں پر میں کھانا تک بھول جاتا ہوں۔ ایک تو جب میں کسی کیس میں الجھا ہوتا ہوں۔ دوسرے جب میں عمدہ تفریح میں وقت گزار رہا ہوتا ہوں۔"

"آج کل تم کس کیس پر کام کررہے ہو؟ کوئی راز کی بات تو نہیں ہے؟ راز کی بات تو میں سننا بھی نہیں چاہتی۔" وہ ایک ادا سے بولی۔

"راز کی بات تو میں تمہیں بتاؤں گا بھی نہیں۔ صرف اتنا ہی بتاؤں گا جتنا اخبارات میں چھپ چکا ہے۔ میں ان پانچ عورتوں کے کیس پر کام کررہا ہوں جنہیں پچھلے دنوں قتل کیا گیا ہے۔"

یہ جھوٹ بھی نہیں تھا۔ ظاہر ہے حقیقت میں تو میں ہی وہ شخص تھا جو اس کیس پر کام کررہا تھا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "بلکہ مجھے عورتوں کے بجائے لڑکیاں کہنا چاہیے۔ ان میں سے دو تو بیس سال سے کم عمر کی تھیں۔ بڑے ہی کراہیت انگیز انداز میں انہیں چھری سے کاٹ کر رکھ دیا گیا تھا۔"

"اس طرح کی ڈراؤنی باتیں مت کرو۔" وہ جھرجھری لے کر بولی۔ "مجھے تو پہلے ہی بہت ڈراؤنے خواب آتے ہیں۔"

سراغ

تھانے دار نے رپورٹ لکھوانے والے سے کہا۔ "حیرت ہے کہ چور کو تم نے دیکھ بھی لیا تھا۔ مانا کہ اس کا منہ چھپا ہوا تھا مگر تم اسے پکڑ سکتے تھے۔ اب جب کہ وہ بھاگ چکا ہے تو تم ہی بتاؤ کہ بغیر کسی سراغ کے ہم اسے کیسے پکڑ سکتے ہیں؟"

رپورٹ لکھانے والے نے کہا۔ "جناب، یہ ٹھیک ہے کہ وہ نکل گیا مگر یہ بات درست نہیں کہ اس کا کوئی سراغ ہمارے پاس نہیں ہے۔"

"اچھا۔" تھانے دار نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔ "تو گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تمہارے پاس ایسا کوئی سراغ موجود ہے جس سے ہم بہ آسانی اس کو پکڑ سکتے ہیں؟"

"بالکل جناب" آدمی نے کہا۔ "میں نے پڑھا ہے کہ پولیس مجرم کی انگلیوں کے نشانات کی مدد سے اسے پکڑ سکتی ہے۔ یہ نشانات میں نے محفوظ کر لیے ہیں، آپ انہیں اتروانے کا بندوبست کریں۔"

"کہاں ہیں وہ نشانات؟" تھانے دار نے پوچھا۔

آدمی نے ہاتھ اٹھا کر اپنے چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "جناب، میرے دائیں گال پر۔"

میں نے چھری اٹھا کر ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا کاٹتے ہوئے کہا۔ "قاتل نے ہر بار کچن کی عام سی چھری استعمال کی تھی۔ بالکل اس جیسی۔" میں نے چھری ہاتھ میں بلند کی۔

کھانا کھاتے کھاتے اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی اور وہ جلدی سے نوالا نگل کر بولی۔ "کوئی اور بات کرو۔"

"میں کوئی اور بات کر ہی نہیں سکتا۔" میں نے کہا۔ "آج کل تو چوبیس گھنٹے میرے دماغ میں بس یہی خیال رہتا ہے۔ تمہارے ساتھ میں یہی سوچ کر آیا تھا کہ شاید کچھ دیر کے لیے ادھر سے دھیان ہٹ جائے۔"

وہ چند سیکنڈ غور سے میری طرف دیکھتی رہی پھر میرا چھری والا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے بولی۔ "اپنے ذہن کو بوجھل مت بناؤ۔ ہلکا پھلکا رکھنے کی کوشش کرو۔ ہم یہاں تفریح کے لیے یکجا ہوئے ہیں۔"

پھر اس نے میرا دوسرا ہاتھ تھام کر مجھے کرسی سے اٹھایا اور اپنے قریب کھینچ لیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اب میرے بائیں بازو کے حلقے میں تھی۔ میرے دائیں ہاتھ میں چھری اب بھی موجود تھی اور میں اس کے دستے پر گرفت مضبوط کر رہا تھا۔ اب مجھے صرف یہی فیصلہ کرنا تھا کہ اس کا کام یہیں تمام کیا جائے یا بیڈ روم میں؟

اس نے خود ہی میرا مسئلہ حل کر دیا اور مجھے دھیرے دھیرے بیڈ روم کے کھلے دروازے کی طرف لے چلی۔ میں دل ہی دل میں اس سے مخاطب تھا۔ "او..... رشی! جلد ہی تم اس غلاظت سے نکل آؤ گی اور دوبارہ پاک ہو جاؤ گی۔ تم یقیناً اپنے آپ کو میرا شکر گزار محسوس کرو گی کہ میں نے تمہیں پاکیزگی کی دنیا میں واپس بھیج دیا۔ تمہیں آلودگی سے نجات دلا دی۔"

بیڈ روم میں روشنی کم تھی۔ وسط میں بڑا سا ڈبل بیڈ تھا جس پر سرخ ساٹن کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ سرہانے کی طرف تکیوں کے سہارے بڑا سا ایک ٹیڈی بیئر رکھا تھا۔ وہ بیڈ پر جا گری اور کھلونا ریچھ اٹھا کر اس کے عقب میں منہ چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے منمنائی۔ "یہ مت سمجھنا کہ..... کہ میں ہر ایک پر یونہی مہربان ہو جاتی ہوں اور ہر ایک کو یونہی گھر لے آتی ہوں..... وہ تو بس تم اچھے لگے' اس لیے....."

"ان گھٹیا عورتوں کو اپنے آپ کو عظیم اور پاکباز ظاہر کرنے کا کتنا شوق ہوتا ہے۔" میں نے حیرت سے سوچا اور بیڈ کا جائزہ لیا۔ اس کے سرہانے کے تختے میں پیتل کے موٹے موٹے سروں والی آرائشی کیلیں پیوست تھیں۔ یہ اور بھی اچھی بات تھی۔ اگر سر ٹکرانے کی ضرورت پڑی.....

"مجھے بھی تم بہت اچھی لگی ہو رشی!" میں نے کہا۔ "اتنی اچھی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔"

چھری میں نے اپنے پیچھے چھپائی ہوئی تھی۔ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے میں نے اسے ایک تکیے کے نیچے چھپا دیا۔ پھر میں نے جیب سے ہتھکڑیوں کی جوڑی نکالی۔ دھات کی کھنکھناہٹ سن کر وہ چونکی۔ ہتھکڑیوں پر اس کی نظر پڑی تو حیرت سے بولی۔ "یہ کیوں نکالی ہیں تم نے؟"

"یہ بھی تفریح اور مذاق کا ایک حصہ ہیں۔ تم ذرا پہن کر تو دیکھو' میں تمہیں کچھ ایسے تماشے دکھاؤں گا جو تم نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھے ہوں گے۔" یہ بھی ایک طرح سے سچ ہی تھا۔

میں نہیں چاہتا تھا جب میں چھری سے اس کے قابلِ نفرت وجود پر طبع آزمائی کروں' اس کی ناپاک ہستی کو پاکیزگی کی طرف واپس لے جانے کا آغاز کروں تو اس کے ہاتھ مزاحمت کے لیے آزاد ہوں۔ اس سے پہلے والی عورتوں میں سے بعض تو ہتھکڑیاں لگوانے پر آسانی سے آمادہ ہو گئی تھیں۔ بعض کو کچھ دیر بہلانا پھسلانا پڑا تھا اور کسی کے ہاتھ میں زبردستی ڈالنا پڑی تھیں۔

رشی کچھ ضدی معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہتھکڑیاں پہننے پر تیار نہیں تھی۔ وہ کچھ شک میں بھی مبتلا ہونے لگی تھی۔ بڑے سے ٹیڈی بیئر کو اس نے یوں اپنے سامنے کر لیا تھا گویا وہ اس کا دفاع کرے گا۔ پھر یکدم ہی وہ اکھڑے اکھڑے سے لہجے میں بولی۔ "میرے خیال میں بہتر یہی ہے کہ تم اب چلے جاؤ۔" ریچھ پر اس کی گرفت مضبوط تھی اور وہ دھیرے دھیرے کانپ رہی تھی۔ "میرا خیال ہے تم سرے سے پولیس والے ہی نہیں ہو۔ بلکہ..... تم..... تم..... وہ قاتل ہو جس نے ان پانچ لڑکیوں کو قتل کیا ہے۔"

وہ خوفزدگی کے عالم میں اتنی سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہی تھی کہ مجھے قہقہہ لگانا پڑا۔ "اگر میں تمہیں بتاؤں کہ واقعی میں وہی قاتل ہوں تو تم کیا کرو گی؟"

"کیا تم واقعی وہ ہو؟" اس کی آنکھوں میں خوف بڑھتا جا رہا تھا۔

"ہاں رشی! میں یقیناً وہی قاتل ہوں..... اور چونکہ تم بہت ذہین ہو اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تمہیں جو تجربہ حاصل ہو وہ تمہاری زندگی کا سب سے انوکھا' سب سے منفرد تجربہ ہو لیکن افسوس کہ وہ تمہاری زندگی کا آخری تجربہ ہو گا۔ اس تجربے سے بچنے کے لیے تم کچھ بھی نہیں کر سکتیں۔"

میں نے ہتھکڑی لگانے کے لیے اس کے بازو کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئی۔ اس کا ہاتھ تیزی سے ٹیڈی بیئر کے عقب سے سامنے آیا تو اس میں ریوالور دبا ہوا تھا۔ وہ بدلی بدلی آواز میں بولی۔ "اس تجربے سے بچنے کے لیے میں بہت کچھ کر سکتی ہوں کیونکہ میں ایک پولیس آفیسر ہوں اور میں تمہیں حراست میں لے رہی ہوں۔"

"اچھا..... تو تم چارہ بنی ہوئی تھیں۔ تمہیں شرم آنی چاہیے

کہ تم نے اتنا گھٹیا روپ دھارا ہوا تھا۔" میں نے غصے سے کہا۔
میں اسے ڈانٹنے میں اپنے آپ کو حق بہ جانب محسوس کر رہا تھا۔ اس نے مکمل طور پر طوائفانہ انداز و اطوار اختیار کیے تھے۔ یہ میرا عقیدہ تھا کہ ایک پولیس آفیسر کو عظیم ترین مقاصد کے لیے بھی اتنا گھٹیا روپ نہیں دھارنا چاہیے تھا۔ پولیس آفیسر ہونا تو زبردست عظمت کے درجے پر فائز ہونا تھا۔ میرے ڈیڈی تو کہا کرتے تھے کہ "عورتوں کو تو پولیس میں بھرتی کرنا ہی نہیں چاہیے۔ یہ مخلوق اس قابل ہی نہیں ہوتی۔"

لیکن کیسی ستم ظریفی تھی کہ عورتوں کو تو پولیس فورس میں بھرتی کرلیا جاتا تھا لیکن مجھے نہیں کیا گیا تھا۔ مجھے پولیس میں بھرتی ہونے کا جنون کی حد تک شوق تھا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کردیا تھا کہ میں بھی منشیات استعمال کرتا رہا ہوں اور شاید اسی وجہ سے یا پھر اور سبب سے میرے دماغ میں کچھ خلل آگیا تھا۔

چنانچہ اب مجبوراً مجھے پولیس کا جعلی بیج لے کر پھرنا پڑتا تھا لیکن میرا ریوالور بہرحال اصلی تھا اور اس سے میں رسٹی کی پیشانی کا نشانہ لے چکا تھا۔

"تم مجھ پر گولی چلا سکتی ہو لیکن ساتھ ہی تمہیں بھی گولی لگ چکی ہوگی۔" میں نے خبردار کیا۔ "اس سے بہتر ہے کہ تم ریوالور پھینک دو اور میری بات مان لو۔ شاید میں تمہاری جان بخش ہی دوں۔ ضروری نہیں کہ میں نے ان پانچ عورتوں کو ہلاک کیا تھا تو تمہیں بھی ہلاک ہی کروں۔"

پھر یکدم ہی میں نے چلا کر کہا۔ "ریوالور پھینک دو۔"

اس طرح چلانا میری غلطی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو خود پر قابو نہیں رہا اور سامنے والے کو یہ احساس ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ آپ کو خود پر قابو نہیں رہا۔

"کیا واقعی یہ تم سمجھ رہے ہو کہ میں یہاں اکیلی ہوں؟" وہ بولی۔ "کیا تمہارے خیال میں ہم تمہاری حقیقت سے آگاہ نہیں تھے؟ ہم ہفتوں سے تمہاری نگرانی کر رہے ہیں، تمہارے بارے میں تحقیقات کر رہے ہیں۔ جب سے آخری لڑکی قتل ہوئی ہے تب سے ہم اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم جب اس تک پہنچے تو اس میں کچھ سانسیں باقی تھیں۔ مرنے سے پہلے وہ ہمیں اتنا بتانے میں کامیاب ہوگئی تھی کہ اس کا قاتل کوئی پولیس والا تھا جس کا باپ بھی پولیس میں تھا۔ وہی کہانی جو تم نے مجھے سنائی ہے۔ وہ لڑکی کافی حد تک حلیہ بتانے میں بھی کامیاب ہوگئی تھی۔ اس بے چاری کو معلوم نہیں ہوسکا تھا کہ تم جعلی پولیس آفیسر ہو اور تمہارا دماغی توازن بھی ٹھیک نہیں۔"

"تم بکواس کرتی ہو۔" میں ایک بار پھر چلا اٹھا۔ "میں جب اس لڑکی کے پاس سے رخصت ہوا تو وہ مرچکی تھی۔" دل ہی دل میں، میں نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ "چیخو مت۔ بالکل پُرسکون رہ کر بات کرو۔ صورتِ حال اسی کے ہاتھ میں رہتی ہے جو پُرسکون رہتا ہے۔"

حقیقت یہ تھی کہ میں رسٹی کو گولی مار کر ہلاک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس میں کوئی مزہ نہیں تھا۔ مجھے گولی کھانے کی بھی پروا نہیں تھی اور اس بے خوفی کی وجہ سے مجھے رسٹی پر کچھ برتری حاصل تھی۔ ویسے بھی مجھے اندازہ تھا کہ وہ مجھے گولی مارنے سے حتی الامکان گریز کرے گی۔ مجھ جیسے آدمی کو لاش کی صورت میں پولیس اسٹیشن لے جانے کے بجائے زندہ لے جانے کی تمنا اس کے دل میں زیادہ شدت سے جاگزیں ہوگی۔

میں نے ایک بار پھر اس کا بازو پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن وہ تیزی سے بیڈ کے دوسری طرف پھسل گئی اور بولی۔ "تمہارے بارے میں ہمیں تمہارے باپ کے ایک پرانے دوست نے بتایا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ بچپن میں تم عجیب عجیب حرکتیں کیا کرتے تھے۔ آوارہ بلیوں کو مار ڈالتے تھے۔ کبھی کہیں آگ لگا دیتے تھے۔ تمہاری حرکتوں سے دل برداشتہ ہو کر تمہاری ماں اور باپ دونوں شرابی ہوگئے تھے۔ بالغ ہوتے ہی تم پولیس ہیڈ کوارٹرز کے گرد منڈلانے لگے تھے۔ ہر وقت تمہارا ایک ہی مطالبہ تھا کہ تمہیں پولیس میں بھرتی کرلیا جائے۔ تمہارے باپ کے اس پرانے دوست کا کہنا تھا 'خدا کا شکر ہے اس لڑکے کو پولیس میں بھرتی نہیں کیا گیا۔ اس کا دماغی توازن ٹھیک نہیں تھا۔ معلوم نہیں وہ پولیس میں ہوتا تو کیا قیامت ڈھاتا۔' وہ ٹھیک کہہ رہا تھا نا کہ؟"

"ٹھیک بھی کہہ رہا تھا تو میں کیا کروں؟ تمہارا خیال ہے میں اپنے آپ کو خطاکار محسوس کر کے اپنے آپ پر ترس کھانے لگوں گا؟ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے میں جو کچھ کر رہا ہوں ٹھیک کر رہا ہوں۔ اب تم اپنا ریوالور مجھے دے دو اور جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں وہ مجھے کرنے دو ورنہ مجبوراً مجھے تم کو گولی ہی مارنا پڑے گی۔ تمہارا وقت آچکا ہے رسٹی! اس سے بچنے کا اب کوئی طریقہ نہیں۔"

تب رسٹی بہ آوازِ بلند بولی۔ "بھئی یہ یوں نہیں مانے گا۔ اب تم لوگ باہر آہی جاؤ۔"

اچانک دیوار گیر الماریوں کے دروازے کھلے اور ہاتھوں میں ریوالور، چہروں پر غصہ لیے کئی آدمی یکدم باہر آگئے۔ میں نے اپنے ریوالور کی نال کنپٹی پر رکھ لی لیکن رسٹی نے بھوکی شیرنی کی طرح مجھ پر چھلانگ لگائی اور ریوالور میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ میں نے تکیے کے نیچے سے چھری نکالنا چاہی لیکن رسٹی نے میرے پیٹ میں لات رسید کی اور میں دوہرا ہوگیا۔

ستم ظریفی یہ تھی کہ انہوں نے مجھے میری ہی ہتھکڑیاں لگادی تھیں!

COP GROUPIE
JOYCE HARRINGTON

صحبت صالح ترا

پہلا رنگ

گزشتہ شمارے میں عبدالقیوم شاد نے آپ کو بگڑی ہوئی اولاد کا قصہ سُنایا تھا اس دفعہ وہ آپ کو تصویر کا دوسرا رُخ دکھا رہے ہیں، یعنی بگڑے ہوئے والدین کی کہانی لائے ہیں۔ یہ کہانی ہمیں پاکستان کے مراعات یافتہ اور صاحبِ اختیار طبقے میں عام نظر آتی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ جب ایک ہی طاقت کی چوٹ مختلف چیزوں پر پڑتی ہے تو مختلف اثرات دکھاتی ہے۔ مثلاً... فرض کریں کہ مُکّے کی طاقت پچاس پاؤنڈ ہے۔ یہ مُکّا چوہے کو کُچل دے گا، بوڑھے آدمی کے دانت توڑ دے گا، کمزور کو عالمِ بالا میں پہنچا دے گا۔ گینڈے کو یہ مُکّا فقط تھپکی محسوس ہوگا اور جب یہی مُکّا کسی ٹیڑھی میڑھی چٹان پر پڑے گا تو شاید خود ہی ٹوٹ جائے گا یا کم از کم انگلیاں ضرور زخمی ہو جائیں گی۔ اسی طرح ظلم کی مثال ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اُن پر ظلم ہوتا ہے تو وہ ظلم کی تلخی کا مزہ چکھنے کے بعد خود ظلم کرنے سے توبہ کر لیتے ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ظلم کا مزہ چکھنے کے بعد خود ظالم بننے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں کیوں کہ اُن کو اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے ظالم کے جلو میں ایک شان اور عظمت اور قوت نظر آتی ہے۔

یہ ایک ایسے ہی شخص کی کہانی ہے۔ اُس پر تھوڑا سا ظلم ہوا تو وہ ردِ عمل کے طور پر بڑا ظالم بن کر اُبھرا اور زندگی بھر اپنے ظلم اور ناانصافی کو شان اور عظمت کا مظہر سمجھتا رہا۔ اُس نے اپنی اولاد کو بھی اسی رنگ میں رنگ دیا لیکن اُس کا ایک بچہ جو بچپن میں ہی گم ہو گیا تھا، اس رنگ سے محفوظ رہا۔ اُس کی پرورش ایک صالح شخص کے گھر میں ہوئی اور جب پورے پچیس سال کے بعد یہ بچہ اپنے حقیقی والدین سے ملا تو اُسے اپنے اور والدین کے مزاج میں بُعد المشرقین نظر آیا۔

ظلم اور ناانصافی کو شان سمجھنے والے دولت مند خود سروں کی کہانی

پچیس سال پہلے قصبہ بھٹ کر کے لوگ اس اعتبار سے بہت خوش قسمت تھے کہ وہاں کوئی اخبار نہیں جاتا تھا۔ وہ کھیتی باڑی اور محنت مزدوری کرنے والے لوگ تھے اور اس بات سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے کہ ملک پر حکومت کون کر رہا تھا۔ کوئی فوجی آمر مارشل لاء کا کوڑا چلا رہا تھا یا کوئی شعبدہ باز سیاستداں لوگوں کو روٹی کپڑا اور مکان کے سبز باغ دکھا رہا تھا۔ وہ کچے پکے مکانوں میں رہنے والے سادہ لوگ تھے اور اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ خوش حالی محنت سے آتی ہے۔

بھٹ کر عام گزر گاہوں سے ہٹ کر ایک دور دراز مقام پر واقع ہے۔ اس طرف نہ کوئی پکی سڑک جاتی ہے اور نہ ہی کوئی ریلوے لائن گزرتی ہے۔ قریب ترین پکی سڑک وہاں سے چوبیس میل دور ہے اور قریب ترین ریلوے اسٹیشن تیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

روایات کے مطابق برسوں پہلے ایک قافلہ راستہ بھٹک کر اس طرف جا نکلا تھا اور زرخیز زمین دیکھ کر وہیں آباد ہو گیا تھا۔

وہاں کوئی اخبار نہیں جاتا تھا مگر اخبار کے ٹکڑے کبھی کبھی چلے جاتے تھے۔ یعنی ردی اخبار کے ٹکڑے جو سودا سلف کی پڑیاں بنانے کے کام آتے تھے۔

ایسا ہی ایک ٹکڑا کریم بخش کے ہاتھ لگ گیا۔ کریم بخش ان پڑھ کسان تھا اور قریبی شہر سے کچھ ضروری چیزیں خریدنے گیا تھا۔ واپس روانہ ہونے سے پہلے اس نے ایک پاؤ کھجوریں خریدیں جو چھابڑی والے نے اخبار کے ٹکڑے میں لپیٹ کر اسے تھمادی تھیں۔

تانگا نیم پختہ سڑک پر چلا جا رہا تھا اور کریم بخش کھجوریں کھاتے ہوئے کھیتوں کا نظارہ کر رہا تھا۔

اخبار کے ردی ٹکڑے کے بارے میں اس نے کبھی سوچا تک نہیں تھا۔ وہ لاشعوری طور پر یہ سمجھتا تھا کہ کاغذوں کے وہ ردی ٹکڑے پڑیاں بنانے کے لیے ہی بنائے جاتے تھے۔ اسے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ ان کاغذوں پر اہم خبریں چھپتی تھیں۔ لیکن اس اخبار کے ٹکڑے پر کریم بخش کی دلچسپی کی ایک خبر موجود تھی۔

کھجوریں کھاتے کھاتے کریم بخش نے بے دھیانی میں اخبار کے ٹکڑے کی طرف دیکھا تو بری طرح چونک گیا۔ اس ٹکڑے پر جس بچے کی تصویر چھپی ہوئی تھی' وہ گزشتہ چھ ماہ سے بیٹے کی حیثیت سے اس کے گھر میں پل رہا تھا۔ اس کا نام اس نے امیر بخش رکھا تھا۔ وہ بچہ کس طرح اس کے ہاتھ آیا تھا' یہ ایک الگ کہانی تھی۔

اس نے بچی ہوئی کھجوریں جلدی جلدی منہ میں ٹھونسیں اور آنکھیں پھیلا کر تصویر کو گھورنے لگا۔ عجلت میں وہ ایک آدھ کھجور گٹھلی سمیت نگل گیا تھا۔ وہ ہو بہو امیر بخش کی تصویر تھی۔

تانگے میں تین سواریاں اور بھی تھیں۔ پیچھے جو شخص بیٹھا ہوا تھا اس کا نام رمضان تھا اور وہ کریم بخش کا پڑوسی تھا۔ اس نے کریم بخش کو اخبار کے ٹکڑے کی طرف متوجہ پا کر کہا "کیا پڑھ رہے ہو کریم بخش؟ کچھ ہم کو بھی سناؤ۔"

کریم بخش نے کاغذ کو گول مول کر کے جیب میں ٹھونس لیا اور بولا "کیوں مذاق کرتے ہو رمضان بھائی۔ میں چٹا ان پڑھ ہوں' میں کیا اخبار پڑھوں گا! میرا خیال ہے کہ کھجوروں میں ایک بھڑ بھی تھی۔"

"کھا تو نہیں گئے؟"

"یہی میں بھی سوچ رہا ہوں۔" کریم بخش نے کھجور کی ایک گٹھلی زور سے تھوکی اور برا سا منہ بنایا "منہ کا ذائقہ کچھ خراب ہو گیا ہے۔"

رمضان نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "کھجور اور بھڑ کے ذائقے میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔"

کریم بخش اسے دکھانے کے لیے اوپر سے ہنس دیا مگر اس کا دھیان کہیں اور تھا۔ وہ امیر بخش کی تصویر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ آخر اس ردی کاغذ پر امیر بخش کی تصویر کیسے چھپ گئی تھی! اسے پہلی دفعہ اس بات کا احساس ہوا کہ ان پڑھ ہونے کا کچھ نقصان بھی تھا۔ اگر وہ پڑھا لکھا ہوتا تو کم از کم تصویر کے ساتھ لکھی ہوئی عبارت ضرور پڑھ لیتا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ کس سے کاغذ پر چھپی ہوئی عبارت پڑھوائے۔ اگر وہ کسی واقف کار سے عبارت پڑھواتا تو اس کا پول کھل جاتا۔

تانگا نیم پختہ سڑک پر جھٹکے کھاتا ہوا چل رہا تھا اور کریم بخش الجھے ہوئے ذہن سے صورت حال پر غور کر رہا تھا۔

اس کی شادی کو سات سال ہو چکے تھے اور اس کی صرف دو بیٹیاں تھیں۔ بیٹا کوئی نہیں تھا۔ وہ بھی شادی کے پہلے چار سالوں کے دوران ہوئی تھیں۔ گزشتہ تین سال کے دوران اس کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ یہ تین سال اس نے ایک چھوٹے سے شہر میں گزارے تھے کیونکہ خشک سالی کی وجہ سے فصل اچھی نہیں ہوئی تھی اور وہ مقروض بھی ہو گیا تھا۔

شہر میں تین سال مزدوری کرنے کے بعد اس نے اتنے پیسے جمع کر لیے تھے جن سے وہ اپنا قرضہ اتار کر کھیتی باڑی کر سکتا تھا۔ پس اس نے اپنا مختصر سامان باندھا اور اپنی بیوی رحمت بی بی کے ہمراہ واپس روانہ ہو گیا۔

بھٹ کر تک کا سفر تین مرحلوں میں طے ہوتا تھا۔ پہلا مرحلہ ٹرین کے ذریعے' دوسرا بس کے ذریعے اور تیسرا تانگے کے ذریعے۔

ٹرین رات کے ڈھائی بجے اسٹیشن پر پہنچی۔ وہ ایک چھوٹا سا اسٹیشن تھا اور ٹرین بمشکل دو تین منٹ کے لیے وہاں رکتی تھی۔ کریم بخش نے پہلے بیوی اور بچیوں کو اتارا' پھر سامان اتارنے لگا۔

اس اثنا میں ایک عورت ٹرین سے اتری اور تیز قدم اٹھاتے ہوئے رحمت بی بی کی طرف بڑھی۔ اس نے گود میں بچہ اٹھا رکھا تھا

اور اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ تھا۔

"بی بی، ذرا میرے بچے کو لینا' میں اپنا سامان اتار لوں۔" اس نے رحمت بی بی سے کہا اور سویا ہوا بچہ اور بیگ اسے تھما دیا۔ پھر وہ تیزی سے پلٹی اور دوبارہ ٹرین پر چڑھ گئی۔

رحمت بی بی نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی اور اپنے سامان کی طرف دیکھنے لگی کہ کوئی چیز کم تو نہیں۔ کریم بخش نے اپنی آخری گٹھڑی اتاری اور بیوی سے پوچھنے لگا کہ کوئی چیز رہ تو نہیں گئی۔

اتنے میں وسل کی آواز سنائی دی اور ٹرین آگے روانہ ہو گئی۔ رحمت بی بی نے اِدھر اُدھر دیکھا تو بچے والی عورت کہیں نظر نہیں آئی۔ اس نے گھبرا کر شوہر سے کہا "گاڑی رکواؤ... گاڑی رکواؤ۔ بچے والی عورت گاڑی میں رہ گئی۔ اے بابو، اے بابو! گاڑی رکواؤ۔"

اس وقت رات کے ڈھائی بجے تھے اور تمام مسافر سو رہے تھے۔ اگر کوئی مسافر جاگ بھی رہا ہوتا تو اس شور کی پروا نہ کرتا۔

کریم بخش نے بیوی کا شور سننے کے بعد ہی اس کی گود میں بچہ دیکھا۔ پس وہ بے تحاشا گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگا اور گاڑی رکوانے کے لیے شور مچانے لگا۔ اس وقت گاڑی کی رفتار تیز ہو چکی تھی اور اس کی آواز میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ کریم بخش کچھ دور تک گاڑی کے ساتھ دوڑنے کے بعد واپس آ گیا اور بیوی سے بچے کے بارے میں پوچھنے لگا۔

ٹرین سے بمشکل پانچ چھ مسافر اور اترے تھے جو تھکن اور نیند کے غلبے کے باعث فوراً ہی اپنے اپنے راستے پر ہو لیے تھے۔ پلیٹ فارم اور بکنگ آفس بہت چھوٹا سا تھا۔ اونگھتا ہوا اے ایس ایم لائن کلیئر دینے کے لیے باہر آیا تھا اور ٹرین روانہ ہونے کے بعد دوبارہ اندر جا کر سو گیا تھا۔ کانٹے والا اپنے کوارٹر میں چلا گیا تھا۔

چند منٹوں کے اندر دور ہوتی ہوئی ٹرین کی آواز معدوم ہو گئی اور پلیٹ فارم سنسان ہو گیا۔

کریم بخش نے بچے کو گود میں لے لیا اور اس کا معائنہ کرتے ہوئے بولا "لڑکا ہے اور خوب صورت بھی ہے۔"

"اب کیا ہوگا؟" رحمت بی بی نے فکرمندی سے کہا۔

"دو سال کا لگتا ہے۔" کریم بخش خوش ہو رہا تھا۔

"کوئی رپھڑ ہی نہ پڑ جائے۔" رحمت بی بی نے کہا "پولیس یہ نہ سمجھے کہ ہم کسی کا بچہ اٹھا کر لے آئے ہیں۔"

"ہم تین سال کے بعد واپس آ رہے ہیں۔" کریم بخش نے خود کلامی کے انداز میں کہا "تین سال کی غیر حاضری میں دو سال کا بچہ اپنا بھی ہو سکتا ہے۔"

"پولیس کے پاس نہیں جاتے۔" رحمت بی بی اپنے خیالات کے مطابق بات کر رہی تھی "بچہ اسٹیشن بابو کے حوالے کر دیتے ہیں۔ وہ جانے اس کا کام جانے۔ ہم کیوں پرایا بوجھ اٹھائیں۔"

"میں نے سوچا تھا کہ بیٹا ہوا تو اس کا نام امیر بخش رکھیں گے۔" کریم بخش کہہ رہا تھا "مولا کے رنگ بھی نرالے ہیں، پلا پلایا بیٹا دے دیا۔"

بچے کے مسئلے کی وجہ سے وہ اپنی بیٹیوں کو بھی بھول گئے تھے جو نیند کے غلبے کے باعث اپنے سامان سے ٹیک لگا کر سو گئی تھیں۔ بڑی کا نام فاطمہ اور عمر پانچ سال تھی، چھوٹی کا نام سائرہ اور عمر تین سال چند ماہ تھی۔

بچہ اپنے ماحول سے بے خبر گہری نیند سو رہا تھا۔

دونوں میاں بیوی زمین پر بیٹھ گئے۔

"ہم نے کوئی جرم نہیں کیا۔" کریم بخش نے کہا "بچے کی ماں نے اسے خود تمہارے حوالے کیا تھا۔ اگر وہ واپس آ گئی تو ہم اس کا بچہ اس کے حوالے کر دیں گے۔"

"واپس کیسے آئے گی؟ گاڑی تو خدا جانے کہاں پہنچ چکی ہوگی۔"

"ایک گھنٹے کے بعد ایک گاڑی اُدھر سے آئے گی۔ ہماری گاڑی کا اس گاڑی سے کسی اگلے سٹیشن پر میل ہوگا۔" کریم بخش نے کہا "بچے کی ماں اس گاڑی میں واپس بھی آ سکتی ہے۔"

"اللہ تیرا شکر ہے۔" رحمت بی بی نے کہا "یہ بات ہے تو وہ ضرور واپس آئے گی۔ اِدھر ہی انتظار کرتے ہیں۔"

اس نے بستر کھول کر جنگلے کے پاس بچھا دیا اور بیٹیوں کو اس پر لٹا دیا۔ پھر ایک دری اپنے لیے بچھائی اور سامان اٹھا کر جنگلے کے پاس رکھنے لگی۔

کریم بخش دری پر جا بیٹھا اور بچے کو بیٹیوں کے ساتھ لٹا دیا۔

"تینوں کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔" اس نے کہا۔

رحمت بی بی نے سامان رکھنے کے بعد کہا "بچے کے ساتھ یہ تھیلا بھی ہے۔ پتا نہیں اس میں کیا ہے۔"

"لا اِدھر... کھول کر دیکھ لیتے ہیں۔" کریم بخش نے کہا اور تھیلا کھول کر دیکھنے لگا۔ یہ پلاسٹک کا ایک سادہ سا تھیلا تھا۔ اس میں بچے کے کپڑے اور کچھ کھلونے وغیرہ تھے۔ کپڑوں کے نیچے سے نوٹوں کی ایک گڈی برآمد ہوئی۔ ان کے ساتھ ایک تہ شدہ کاغذ بھی تھا جس پر کچھ لکھا ہوا تھا۔

نوٹوں کی مالیت دو ہزار روپے تھی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ہر شے سستی تھی۔ دو ہزار روپے میں دس تولے سونا خریدا جا سکتا تھا۔

"یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔" کریم بخش نے چاند کی روشنی میں نوٹ گننے کے بعد کہا "اس رقم سے ہمارے دن پھر جائیں گے۔"

تھوڑی سی خوشی رحمت بی بی کو بھی ہوئی لیکن اس کی خوشی مختلف قسم کی تھی۔ اسے امید تھی کہ بچے کی ماں ضرور واپس آئے گی اور ان کی ایمانداری دیکھ کر کچھ نہ کچھ انعام ضرور دے جائے گی۔

"اس کاغذ پر کیا لکھا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"لے... میں کوئی منشی ہوں! مجھے کیا پتا کاغذ میں کیا لکھا ہے۔" کریم بخش نے کہا پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا "میرا خیال ہے کہ بچے کے باپ کا پتا لکھا ہوگا۔ اس وقت کوئی پڑھا لکھا آدمی بھی نہیں ملے گا۔"

"مجھے تو نیند آرہی ہے۔" رحمت بی بی نے کہا اور گٹھڑی سے ٹیک لگا کر سو گئی۔

کریم بخش نے نوٹ تھیلے میں رکھ دیے اور جاگتے میں خواب دیکھنے لگا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد اس کی بھی آنکھ لگ گئی۔

دوسری طرف سے آنے والی ٹرین تقریباً چار بجے اسٹیشن پر پہنچی۔ اس وقت صبح صادق کا اجالا پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔ ٹرین کی آواز سن کر دونوں میاں بیوی بیدار ہوگئے اور آنکھیں ملتے ہوئے ٹرین سے اترنے والے مسافروں کو دیکھنے لگے۔

رحمت بی بی نے عورت کی شکل نہیں دیکھی تھی تاہم اسے اتنا اندازہ ضرور تھا کہ وہ کھاتے پیتے گھرانے کی کوئی فیشن ایبل عورت تھی اور اس نے عمدہ قسم کے ریشمی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

ٹرین سے اترنے والے مسافروں کی تعداد درجن بھر کے قریب تھی۔ ان میں دو تین عورتیں بھی تھیں لیکن ان میں کوئی بھی پریشان حال ماں نہیں لگ رہی تھی۔ رحمت بی بی نے بچے کو اٹھالیا اور اٹھ کر ٹرین کے قریب چلی گئی۔ اس نے سوئے ہوئے بچے کا منہ ٹرین کی طرف کردیا تاکہ اگر بچے کا کوئی وارث ٹرین میں ہو تو اسے دیکھ لے۔

تین منٹ کے بعد ٹرین آگے روانہ ہوگئی۔

"اب کیا کریں؟" رحمت بی بی نے پوچھا۔

"یہ بچہ... لاوارث لگتا ہے۔" کریم بخش نے کہا۔ "لڑکیوں کو جگاؤ، میں کوئی تانگا دیکھتا ہوں۔ اور دیکھو، بچے کے بارے میں کسی سے کوئی بات نہ کرنا۔ ہم نے کوئی غلطی نہیں کی۔ یہ بات یاد رکھنا کہ بچے کی ماں نے خود بچہ تمہارے حوالے کیا تھا۔ آگے جو خدا کی مرضی۔"

وہ تانگے میں بیٹھ کر بسوں کے اڈے پر پہنچ گئے۔ ایک بس ان کی آمد سے تھوڑی دیر پہلے روانہ ہوچکی تھی اور دوسری بس کی روانگی میں ابھی کافی دیر تھی۔ دونوں میاں بیوی بچوں سمیت ایک بنچ پر جا بیٹھے۔ ادھر اُدھر کچھ اور مسافر بھی بنچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔

کچھ دیر کے بعد قریبی مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی اور اِکّا دُکّا نمازی مسجد کی طرف جاتے دکھائی دیے۔

کریم بخش نے تھیلے سے کاغذ نکالا اور بیوی سے کہا "تم ادھر ہی بیٹھو، میں کسی نمازی سے یہ کاغذ پڑھواتا ہوں۔"

رحمت بی بی نے فکرمندی سے کہا "ذرا سوچ سمجھ کر کسی شریف آدمی سے کاغذ پڑھوانا۔ پولیس والے بھی کبھی کبھی نماز پڑھ لیتے ہیں۔"

"میں اتنا بدھو بھی نہیں ہوں۔" کریم بخش نے کہا اور مسجد کی طرف چل پڑا۔

مسجد کی سیڑھیوں کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا اور کسی بوڑھے نمازی کا انتظار کرنے لگا۔ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند منٹوں کے بعد ایک سفید ریش بوڑھا آتا دکھائی دیا۔ کریم بخش اس کے قریب گیا اور کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "چاچا جی! ذرا یہ کاغذ تو پڑھ دیں۔"

بوڑھے نے کاغذ لیتے ہوئے کہا "برخوردار! بات کرنے سے پہلے سلام کرنا چاہیے۔"

"السلام علیکم" کریم بخش نے جلدی سے کہا۔

بوڑھے نے اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد کاغذ پر نظر ڈالی اور قدرے تعجب سے بھویں سکیڑیں "کچھ عجیب سی بات لکھی ہے۔ اللہ اس پریشان حال عورت پر رحم کرے۔ یہ تمہاری کوئی رشتے دار ہے؟"

کریم بخش بوکھلا کر بولا "جج... جی... رشتے دار ہی سمجھیں۔ دراصل یہ میری بیوی کی دور کی رشتے دار ہے۔"

بوڑھے نے سر جھٹکا اور بولا "لکھا ہے بی بی، یہ بچہ میں تمہارے سپرد کررہی ہوں۔ میرے حالات بہت خراب ہیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ پتا نہیں زندہ بھی بچتی ہوں یا نہیں۔ اسے اپنا بچہ سمجھ کر پالنا۔ خرچے کے لیے کچھ پیسے بھی رکھ دیے ہیں۔ تمہاری ایک دکھی بہن..." بوڑھے نے خط پڑھنے کے بعد اسے کریم بخش کی طرف بڑھایا اور بولا "اپنی اس دکھی بہن سے کہنا کہ بندے کے بہت سے دکھ اللہ بچوں کی وجہ سے دور کردیتا ہے۔ بچے کو اپنے آپ سے جدا نہ کرے۔"

"بہت اچھا جی۔" کریم بخش نے رقعہ واپس لیتے ہوئے کہا "میں آپ کا پیغام ضرور پہنچادوں گا۔ شکریہ۔"

پھر وہ تیز قدم اٹھاتا ہوا بیوی کے پاس پہنچا اور اپنے جوش کو دباتے ہوئے بولا "یہ بچہ ہمارا ہوگیا ہے۔ اس کاغذ میں یہی لکھا ہے۔ آج سے یہ ہمارا بیٹا ہے۔ اس کا نام امیر بخش ہے۔ بس فیصلہ ہوگیا۔"

"کیا الٹی سیدھی ہانک رہے ہو۔" رحمت بی بی نے کہا "کیسے ہمارا ہوگیا یہ بچہ! کاغذ میں کیا لکھا ہے؟"

"یہ کاغذ نہیں، خط ہے۔ بچے کی ماں کا خط۔ اور یہ خط تمہارے نام ہے۔"

"میرے نام! مجھے وہ عورت کیسے جانتی ہے؟"

"یہ تو مجھے نہیں پتا پر یہ خط ہے تمہارے نام۔ عورت نے لکھا ہے کہ وہ بہت دکھی ہے اور اس کی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہے اس لیے وہ اپنا بچہ تمہارے سپرد کررہی ہے۔ پیسوں کا بھی لکھا ہے۔ پیسے بھی تمہارے... یعنی ہمارے ہیں۔ بچے کے خرچ کے لیے ہیں۔"

"مجھے تو یقین نہیں آ رہا۔"

"یقین تو مجھے بھی نہیں آ رہا لیکن بچہ بھی ہمارے پاس ہے اور پیسے بھی۔"

"پتا نہیں بے چاری کا کیا حال ہو گا۔ ماں تو ماں ہی ہوتی ہے۔"

"بس..." کریم بخش نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "اس سے زیادہ کچھ نہ کہنا۔ اب یہ ہمارا بچہ ہے۔ تم اس کی ماں ہو اور میں اس کا باپ ہوں۔ اس کا نام امیر بخش ہے۔ کیا نام ہے؟"

"امیر بخش..." رحمت بی بی نے جواب دیا اور بچے کو گود میں لے کر پیار کرنے لگی۔ اس بے وقت کے پیار کی وجہ سے بچے کی نیند میں خلل پیدا ہوا اور اس نے رونا شروع کر دیا۔

○☆○

اس بات کو چھ ماہ ہو چکے تھے اور امیر بخش، کریم بخش کے گھر میں اس کے بیٹے کی حیثیت سے پرورش پا رہا تھا۔

اب چھ مہینے کے بعد ردی اخبار کے ٹکڑے پر امیر بخش کی تصویر دیکھ کر کریم بخش پریشان ہو گیا تھا۔

راستے میں ایک آبادی کے قریب کوچوان نے گھوڑے کو پانی پلانے کے لیے تانگا روک لیا۔ وہاں ایک ٹیوب ویل لگا ہوا تھا جہاں تانگے والے عموماً رک جاتے تھے۔ دو تانگے پہلے سے وہاں کھڑے تھے۔

کریم بخش نے دیکھا کہ دو لڑکے، جن کی عمر بارہ تیرہ سال کے آس پاس معلوم ہوتی تھی، ایک پیڑ کے نیچے کتابیں کھولے بیٹھے تھے۔ واضح طور پر وہ طلبہ تھے اور وہاں بیٹھے پڑھائی کر رہے تھے۔

کریم بخش ان کے قریب جا کر گھاس پر بیٹھ گیا اور سرسری انداز میں پوچھا "تم پڑھے لکھے ہو؟"

"آہو جی" ایک لڑکے نے جواب دیا "ہم پڑھتے بھی ہیں اور لکھتے بھی ہیں۔ یہ دیکھیں ہماری کاپیاں، ہم ساتویں جماعت میں پڑھتے ہیں۔"

دوسرے لڑکے نے کہا "میری لکھائی اس سے اچھی ہے جی۔ یہ دیکھیں، آج مجھے گڈ ملا ہے۔"

"اچھا اچھا! ماسٹر صاحب نے خوش ہو کر تمہیں گُڑ دیا ہو گا۔"

دونوں لڑکوں نے کن انکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر دوسرے لڑکے نے کہا "گڑ نہیں جی گڈ... گڈ۔ یہ انگریزی زبان کا لفظ ہے۔"

"چلو... کچھ نہ کچھ تو ملا ہی۔" کریم بخش، لڑکوں کے علم سے متاثر ہو کر بولا "اچھا ایک بات تو بتاؤ، تم میں سے اخبار کس کو پڑھنا آتا ہے؟"

"تو جی، اخبار پڑھنا بھی کوئی مشکل ہے! ہم دونوں اخبار پڑھ سکتے ہیں۔" پہلے لڑکے نے کہا "لیکن ہمیں اخبار پڑھنے کا شوق نہیں ہے۔"

"تو پھر میں تمہارا امتحان لیتا ہوں۔" کریم بخش نے جیب سے اخبار کا ٹکڑا نکالا اور اسے سیدھا کرتے ہوئے بولا "یہاں سے پڑھ کر دکھاؤ۔" اس نے امیر بخش کی تصویر والے حصے پر انگلی رکھی۔

پہلے لڑکے نے اس کے ہاتھ سے اخبار کا ٹکڑا لیا اور سبق سنانے والے انداز میں اشتہار پڑھنے لگا "تلاش گم... شدہ... پچیس... ہزار روپے... نقد انعام۔ ایک بچہ... جس کی عمر دو سال سات مہینے ہے اور... جس کا نام... اسد علی ہے... سات مارچ سے لاپتا ہے۔ گم... شدگی کے وقت اسد علی نے... سفید نیکر اور گلابی... بُوشرٹ پہنی ہوئی تھی اسد علی کا رنگ گورا اور......"

"سفید نیکر اور گلابی بوشرٹ!" کریم بخش بڑبڑایا۔ کیوں کہ امیر بخش جب ان کے ہاتھوں میں آیا تھا، اس وقت وہ سفید کُرتے پاجامے میں ملبوس تھا۔

"یہاں پر یہی لکھا ہوا ہے جی۔" لڑکے نے ایک جگہ پر انگلی رکھ کر کاغذ کریم بخش کے سامنے کیا۔ پھر دوبارہ سبق سنانا شروع کیا "اسد علی کا رنگ گورا اور بال کالے ہیں۔ اس کی... بائیں پنڈ... پنڈلی پر زخم کا نشان ہے۔ جو شخص اسد علی کا اتا پتا بتائے گا اسے مبلغ پچیس ہزار روپے نقد انعام دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ خرچا بھی دیا جائے گا۔ رابطہ اس پتے پر کیا جائے۔ سکندر علی خان۔"

"شاباش..." کریم بخش نے لڑکے سے اخبار کا ٹکڑا لیتے ہوئے کہا "تم واقعی پڑھے لکھے ہو۔"

"میں بھی پڑھ سکتا ہوں جی۔" دوسرے لڑکے نے کہا۔

"آج اتنا ہی کافی ہے۔" کریم بخش نے اخبار کا ٹکڑا جیب میں رکھا اور واپس چل پڑا۔ اشتہار کے مضمون نے اسے فکرمند کر دیا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ سکندر علی خان، اسد علی عرف امیر بخش کا باپ تھا۔ امیر بخش کی ماں نے لکھا تھا کہ وہ بچے کو سنبھال نہیں سکتی تھی لیکن باپ، بچے کے لیے پریشان تھا۔ پتا نہیں معاملہ کیا تھا۔ شاید میاں بیوی میں جھگڑا ہو گیا تھا۔

بھٹ کر پہنچ کر اس نے اپنی بیوی کو علیحدہ لے جا کر کہا "رحمتے، بڑا غضب ہو گیا!"

"کیا ہوا؟ کیا ہوا؟" رحمت بی بی نے گھبرا کر پوچھا "کہیں تمہارا کیسہ تو نہیں کٹ گیا؟"

کریم بخش نے جیب سے اخبار کا ٹکڑا نکال کر بیوی کو دکھایا "یہ دیکھ..."

رحمت بی بی، امیر بخش کی تصویر دیکھ کر پریشانی سے بولی "ہائے میں مر گئی! یہ تو امیر بخش کی تصویر ہے۔ اس کاغذ پر یہ تصویر کہاں سے آ گئی؟"

"یہ اشتہار ہے۔ کسی سکندر علی خان نے دیا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ جو شخص اسد علی کا اتا پتا بتائے گا اس کو پچیس ہزار روپے انعام دیا جائے گا۔"

"اسد علی کون ہے؟"

"ہمارے امیر بخش کا اصل نام اسد علی ہے۔ اس اشتہار میں یہی لکھا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے سکندر علی اس کے باپ کا نام ہے۔"

"تو پھر وہ عورت کون تھی؟"

"وہ سکندر علی کی بیوی ہوگی۔ میاں بیوی میں جھگڑا ہو گیا ہوگا۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ سکندر علی' بیوی کو طلاق دے کر بچہ اس سے چھیننا چاہتا ہوگا لیکن بیوی' بچے کو لے کر بھاگ گئی۔"

"بات تو تمہاری ٹھیک ہی لگتی ہے۔ پر اس نے بچہ ہمارے حوالے کیوں کردیا؟ مائیں تو بچوں کے لیے جان قربان کردیتی ہیں۔"

کریم بخش نے بیوی کے اس اعتراض پر سنجیدگی سے غور کیا' پھر بولا "میں ساری بات سمجھ گیا ہوں۔"

"کیا سمجھ گئے ہو؟"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ بیوی اپنے خاوند سے چھپ کر نہیں رہ سکتی۔ بیوی کو پتا ہوگا کہ سکندر علی اس کا پیچھا کرے گا اور بچہ چھین کر اسے قتل کردے گا۔ اس چٹھی میں بھی کچھ ایسی ہی بات لکھی ہوئی ہے۔ پتا نہیں میں زندہ بھی بچتی ہوں یا نہیں۔"

"اور دوسری بات کیا ہے؟"

"دوسری بات یہ ہے....." کریم بخش نے سوچتے ہوئے کہا "بیوی کو کسی شریف میاں بیوی کی تلاش ہوگی۔ جب اس نے ہم دونوں کو دیکھا تو وہ سمجھ گئی کہ ہم سے زیادہ شریف میاں بیوی اس کو اور کوئی نہیں ملیں گے۔"

"یہ تو تم کچھ ٹھیک ہی کہتے ہو۔" رحمت بی بی نے شوہر کی آدھی تائید کی "اس عورت کو کسی شریف عورت کی تلاش تھی۔ بچہ تو اس نے میرے ہی حوالے کیا تھا نا اور چٹھی بھی میرے ہی نام لکھی تھی۔"

"پہلے اس نے مجھے دیکھا ہوگا۔" کریم بخش نے اپنی اہمیت کم ہوتے دیکھ کر کہا "لیکن وہ میرے نام چٹھی تو نہیں لکھ سکتی تھی نا۔ عورت کی عزت مرد کی عزت سے ہوتی ہے۔ خیر چھوڑو اس بات کو۔ میرا خیال ہے کہ سکندر علی نے بیوی کا پیچھا کرکے اسے ختم کردیا ہوگا۔ اب وہ بچے کو تلاش کررہا ہے۔ آدمی کوئی بہت پیسے والا لگتا ہے۔ پچیس ہزار سے ہم پانچ چھ ایکڑ زمین خرید سکتے ہیں۔"

"مطلب کیا ہے تمہارا؟" رحمت بی بی نے برہمی سے کہا "میں اپنا بیٹا پچیس لاکھ میں بھی نہیں دوں گی۔"

"میں ایک بات کررہا ہوں۔ تم ایسے ہی غصے میں آجاتی ہو۔ ہاں' ایک بات اور لکھی ہے اس اشتہار میں۔ اس میں لکھا ہے کہ امیر بخش کی بائیں پنڈلی پر زخم کا نشان ہے۔ ذرا اس کو لے کر تو آؤ۔"

امیر بخش' فاطمہ اور سائرہ کے ساتھ کچے صحن میں کھیل رہا تھا۔ شروع کے چند ہفتوں کے دوران اس نے خاصا پریشان کیا تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ اس گھر اور اس ماحول سے مانوس ہوگیا تھا۔ اب وہ رحمت بی بی کو اماں اور کریم بخش کو بابا کہتا تھا۔ فاطمہ اور سائرہ اسے میرو کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔ اس کا حلیہ ویسا ہی تھا جیسا ایک غریب دیہاتی کے بچوں کا ہوتا ہے لیکن اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی چمک پائی جاتی تھی جو دوسرے دیہاتی بچوں کے چہروں پر نظر نہیں آتی تھی۔ دوسری خاص بات یہ تھی کہ وہ بچوں کے ساتھ تحکمانہ لہجے میں بات کرتا تھا اور انہیں گائیڈ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

سمجھدار قسم کے لوگ اسے دیکھ کر کریم بخش سے کہتے "کریم بخش! تمہارا بیٹا بڑا ہوشیار ہے۔ اسے اپنے جیسا جاہل مت رکھنا۔ ذرا بڑا ہوجائے تو مدرسے میں داخل کرادینا۔"

خواہش تو کریم بخش کی بھی یہی تھی لیکن یہ دھڑکا اسے ہر وقت لگا رہتا تھا کہ کہیں بڑا ہوکر امیر بخش اس کے ہاتھ سے نہ نکل جائے۔

رحمت بی بی صحن میں گئی اور امیر بخش کو گود میں اٹھا کر اس کی بائیں ٹانگ کا معائنہ کیا۔ ٹخنے سے ذرا اوپر زخم کا ایک نمایاں نشان موجود تھا۔

"اماں! میرو کہتا ہے کہ ہم بکریاں ہیں۔" فاطمہ نے کہا "اور یہ ہمیں چرانے کے لیے کھیتوں میں لے جائے گا۔"

اس بات پر دونوں بہنیں ہنسنے لگیں۔

رحمت بی بی نے امیر بخش کو سرزنش کرتے ہوئے کہا "نہ پُتر' ایسی بات نہیں کرتے۔ یہ تمہاری بہنیں ہیں۔"

امیر بخش نے بھولپن سے کہا "میں... میں ان کو کھیتوں میں لے جاؤں گا اور... اور پھر پتا ہے کیا ہوگا؟ گھاس چرتے چرتے ان کی دم نکل آئے گی۔"

لڑکیوں نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔ سائرہ اپنی ہنسی روکتے ہوئے بولی "تم بکرا بن جاؤ گے۔ تمہارے سر پر سینگ نکل آئیں گے۔"

امیر بخش اپنا سر ذرا نیچے کرتے ہوئے بولا "میں پھر... میں پھر سب کو ٹکر ماروں گا۔"

رحمت بی بی نے اسے دوبارہ سرزنش کی اور پھر اندر چلی گئی "کریم بخش اب کیا ہوگا؟" اس نے کہا "امیر بخش کی بائیں ٹانگ پر زخم کا نشان موجود ہے۔"

"دیکھا جائے گا۔" اس نے کہا "تم ایسا کرو' یہ کاغذ بھی اس چٹھی کے ساتھ سنبھال کر رکھ دو۔"

وہ چٹھی رحمت بی بی نے اپنے جہیز کے صندوق میں سنبھال کر رکھ دی تھی۔ اس نے اخبار کا وہ ٹکڑا بھی اس چٹھی کے ساتھ رکھ دیا اور دونوں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ اشتہار اب ساری دنیا کی نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا۔

○☆○

کسی کا قول ہے کہ ہر پیدا ہونے والا بچہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ابھی خدا انسان سے مایوس نہیں ہوا۔

یہ قول ہمارے ہاں کے دانشوروں کو اتنا اچھا لگا' اتنا اچھا لگا کہ انہوں نے بکثرت اس کا حوالہ دینا شروع کردیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے زیادہ احمقانہ قول اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ اس کی حماقت لفظ "مایوس" سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ کہنا کہ خدا ابھی مایوس نہیں ہوا' اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ خدا مایوس بھی ہوسکتا ہے۔ اور یہ بات بدیہی طور پر ناممکن ہے۔ خدا کی ذات کے ساتھ مایوسی کو منسوب نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ خدا خالقِ کُل' مالک کُل اور غیب کا جاننے والا ہے۔ ہر شے کی ابتدا اس نے کی ہے اور ہر چیز کی انتہا بھی اسی کو معلوم ہے۔ اور جس ذات کو ہر شے کی انتہا معلوم ہو اس کے لیے لفظ "ابھی مایوس" استعمال نہیں ہوسکتا کیوں کہ اس سے اس کی صفت عالم الغیب ناقص قرار پاتی ہے۔

ہاں انسان بعض اوقات بچے کی پیدائش سے مایوس ہوسکتا ہے۔

سعدیہ بیگم بھی مایوس تھی کیوں کہ چند روز پہلے اس پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ وہ ماں بننے والی تھی۔ وہ مایوس ہی نہیں' خوف زدہ بھی تھی کیوں کہ اسے اس شخص سے کسی بھلائی کی توقع نہیں تھی جو اس کے ہونے والے بچے کا باپ تھا۔

نو سال پہلے جب اس نے گریجویشن کے بعد ملازمت شروع کی تھی تو اس وقت وہ ایک حسین اور پُرکشش دوشیزہ تھی۔ اس زمانے میں وہ دن میں ایک دفعہ ہلکا سا میک اپ کرتی تھی اور دن بھر پھول کی طرح تروتازہ نظر آتی تھی۔ دفتر کا ہر کارکن اس کی نظرِ التفات کا متمنی رہتا تھا لیکن وہ ٹاپ مین کے سوا کسی کو لفٹ نہیں دیتی تھی۔

پھر ایک دن جب ٹاپ مین نے اسے اچانک اپنی شادی کا کارڈ دیا تو اس پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔ وہ شادی کے پیغام کی توقع کررہی تھی لیکن جو ملا وہ شادی میں شرکت کا پیغام تھا۔ وہ باتھ روم میں جاکر بہت روئی۔ رونے کے بعد جب اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں کے پاس چند ایسی لکیریں نظر آئیں جو اس سے پہلے اس کی نظروں سے اوجھل تھیں۔

"لیکن یہ لکیریں اس کے نوجوان باس کے فیصلے میں حائل نہیں ہوئی تھیں۔" اس نے بڑے دکھ سے سوچا۔ بلکہ اس کے فیصلے میں طبقاتی لکیریں حائل ہوئی تھیں جو نظر نہ آنے کے باوجود ہمیشہ موجود رہتی ہیں۔ باس اسے نچلے طبقے کی ایک ایسی خوب صورت لڑکی سمجھتا رہا تھا جو فقط تفریح کے لیے ٹھیک تھی۔

رونے کے بعد جب اس کا دل کچھ ہلکا ہوا تو اس نے منہ دھو کر میک اپ کیا اور اپنی ٹیبل پر جاکر استعفا ٹائپ کرنے لگی۔ اب اس کے چہرے پر دکھ کی جگہ غصہ نظر آرہا تھا۔

استعفا ٹائپ کرنے کے بعد وہ باس کے کمرے میں گئی اور شادی کارڈ کے چار ٹکڑے کرکے اس کے سامنے رکھ دیے۔

"مس سعدیہ' یہ کیا مذاق ہے؟" باس نے پوچھا "کیا تمہیں میری خوشی کی خبر اچھی نہیں لگی؟"

"مسٹر لطیف' خدا کرے آپ کی شادی بھی اسی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے۔" سعدیہ نے کہا۔ اس نے پہلی دفعہ باس کو مسٹر لطیف کہا تھا "آپ انسان نہیں' پتھر ہیں!"

"اوہ... آج بہت غصے میں معلوم ہوتی ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں باس ہوں اور اپنے ماتحتوں کو فضول گوئی کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"اونہہ.. آپ سے اجازت کون مانگ رہا ہے۔ آپ مجھے بے وقوف بناتے رہے ہیں' مجھے دھوکا دیتے رہے ہیں۔ آپ نے مجھے اندھیرے میں رکھا اور چپکے سے شادی بھی طے کرلی۔"

"اپنے دائرے میں رہ کر بات کرو۔ یہ... یہ کوئی تفریح گاہ' نہیں' دفتر ہے۔ شادی ہر انسان کا ذاتی معاملہ ہے۔ میرا بھی ذاتی معاملہ ہے' تمہارا بھی ذاتی معاملہ ہے۔ میں نے کبھی تمہیں بے وقوف نہیں بنایا۔ اگر تم نے خود بہ خود کوئی توقعات وابستہ کرلی تھیں تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔"

"آپ نے کیوں میرے ساتھ تعلقات بڑھائے تھے؟ کیوں مجھے تفریح گاہوں اور ہوٹلوں میں لے جاتے تھے؟"

"مس سعدیہ' تم کوئی دودھ پیتی بچی نہیں ہو۔ تم اپنے برے بھلے کا فیصلہ کرسکتی ہو۔ تم میرے ساتھ تفریح کرنے سے انکار بھی کرسکتی تھیں۔ ہم دوستوں کی طرح تفریح کرتے تھے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ پیسے میرے خرچ ہوتے تھے' تم مفت میں تفریح کرتی تھیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ... آپ شروع سے یہ سب کچھ جانتے تھے۔" سعدیہ نے روہانسی آواز میں کہا "میں ہی بے وقوف تھی جو آپ کی باتوں میں آگئی۔ یہ لیں میرا استعفا۔" اس نے اپنا استعفا میز پر پھینکا "میں اس دفتر میں کام نہیں کرسکتی۔ میرا اسی وقت حساب کردیں۔"

"سوچ لو" باس نے نرمی سے کہا "مجھے زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے میں دوسری لڑکی مل جائے گی مگر تمہیں ایک ہفتے میں دوسری ملازمت نہیں ملے گی۔"

سعدیہ نے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا اور اٹھ کر دفتر سے نکل گئی۔ باس نے اسے لاجواب کردیا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد اسے دوسری جگہ ملازمت مل گئی۔ یہ ملازمت' تنخواہ اور پوزیشن کے اعتبار سے بہتر تھی۔ اس کا تقرر ایم ڈی کی پرسنل اسسٹنٹ کی حیثیت سے کیا گیا تھا۔

ایم ڈی کا نام سکندر علی خان تھا۔ وہ چالیس بیالیس سال کا ایک خوش مزاج اور خوبرو شخص تھا۔

سعدیہ کو اس بات پر کوئی افسوس نہیں ہوا کہ سکندر علی شادی شدہ تھا کیوں کہ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ باس کو صرف باس ہی سمجھے گی' اسے قریب ہونے کا موقع نہیں دے گی۔ اور یہ بہت

مناسب فیصلہ تھا۔ باس کو شوہر بنانے کا خواب دیکھنا حماقت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ شوہر کے لیے وہ اسٹاف میں سے کسی موزوں شخص کا انتخاب کر سکتی تھی۔ اسٹاف کی تعداد خاصی زیادہ تھی اور اس میں اسے کئی اچھے چہرے بھی نظر آئے تھے لیکن پھر پتا نہیں کیا ہوا' ایک دن اس نے خود کو باس کی بانہوں میں مقید پایا۔

"پتا ہے کیا" باس کہہ رہا تھا "میں نے زندگی میں سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ ایک غلط عورت سے شادی کرلی۔ اس غلطی کا خمیازہ میں آج تک بھگت رہا ہوں۔ فرزانہ بیگم نے مجھے ایک دن بھی گھر کا سکون نہیں دیا۔ وہ ایک تیز مزاج اور خود سر عورت ہے۔ زبان کا استعمال زیادہ اور دماغ کا استعمال کم کرتی ہے۔ ہر وقت بے مقصد بولتی رہتی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ بیگم صاحبہ کو بھی آپ سے کچھ شکایتیں ہوں گی۔" سعدیہ نے محتاط لہجے میں کہا "آپ ان کا خیال رکھا کریں۔"

"تمہاری ایک بات ٹھیک ہے اور ایک غلط۔ بیگم کو مجھ سے کچھ شکایتیں نہیں' بے شمار شکایتیں ہیں۔ اور جہاں تک خیال رکھنے کی بات ہے تو میں اس کی ہر فرمائش پوری کرتا ہوں' دنیا کی ہر نعمت اسے میسر ہے۔"

"پیار بھی کیا کریں۔"

"سب کچھ کر کے دیکھ لیا ہے۔ خیر...... چھوڑو ان باتوں کو' رنگ میں بھنگ نہیں ڈالو۔ تمہارا کیا پروگرام ہے؟ تم نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟"

"آپ کیوں یہ بات پوچھ رہے ہیں؟" سعدیہ نے پوچھا۔ اس کے دل کے کسی نہاں خانے میں یہ خواہش پیدا ہونے لگی تھی کہ وہ سکندر علی کی دوسری بیوی بھی بن سکتی تھی۔ سکندر علی دولت مند آدمی تھا' وہ اسے علیحدہ بنگلے میں بھی رکھ سکتا تھا لیکن وہ خود ایسی خواہش کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ یہ تجویز سکندر علی کی طرف سے آنی چاہیے تھی۔

وقت گزرتا رہا اور سعدیہ' سکندر علی کے دل میں جگہ بنانے کی کوشش کرتی رہی۔ اب وہ دن میں کبھی دو دفعہ اور کبھی تین دفعہ میک اپ کرتی تھی لیکن وہ پہلی سی بات نہیں رہی تھی۔ گزرتا ہوا وقت اس کی تازگی اور رعنائی کو دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔

مایوسی بڑھنے لگی تو سعدیہ نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ پھر ایک روز اس پر انکشاف ہوا کہ وہ ماں بننے والی تھی۔ چند روز تک وہ سخت پریشان رہی اور اس مصیبت سے نجات پانے کے مختلف طریقے سوچتی رہی لیکن سب سے بہترین طریقہ ایک ہی تھا۔ اور وہ یہ کہ ہونے والے بچے کا باپ اس سے شادی کرلے۔

پانچ روز کے بعد سکندر علی معمول کے مطابق اسے تفریح کرانے لے گیا۔ پروگرام کے مطابق دونوں ایک اعلیٰ درجے کے ریستوران میں ڈنر کے لیے داخل ہوئے۔

جب ویٹر کھانا لگا کر چلا گیا تو سکندر علی نے کہا "آج میں تمہیں ایک خوش خبری سنانا چاہتا ہوں۔"

سعدیہ بہت سنجیدہ تھی اور اصل بات کرنے کا موقع تلاش کر رہی تھی "ایک خوش خبری میں بھی سنانا چاہتی ہوں۔" اس نے کہا "لیکن پہلے آپ کی خوش خبری سنوں گی۔"

سکندر علی نے بھنویں سکیڑ کر اپنی سیکریٹری کو گھورا پھر پوچھا "تمہارے پاس کس قسم کی خوش خبری ہے؟"

"پہلے میں آپ کی خوش خبری سنوں گی۔" سعدیہ نے کہا "مجھے یقین ہے کہ آپ کی خوش خبری زیادہ اہم ہوگی۔"

"ونڈر فل.. مجھے تمہاری یہی بات پسند ہے۔ تم سے باتیں کر کے میں خود کو بہت اہم محسوس کرنے لگتا ہوں۔ کاش' فرزانہ بیگم میں بھی یہی خوبی ہوتی!" سکندر علی نے گہرا سانس لیا۔ قدرے توقف کے بعد اس نے کہا "خوش خبری یہ ہے کہ آئندہ انتخابات میں' میں نے صوبائی اسمبلی کا امیدوار بننے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے ایک سیاسی پارٹی کا ٹکٹ بھی مل گیا ہے۔"

"آپ تو سیاست کے خلاف تھے!"

"خلاف تو میں اب بھی ہوں لیکن وہ کیا کہتے ہیں کہ جیسا دیس ویسا بھیس۔ تمہیں یاد ہی ہوگا کہ ہمارے علاقے کے ایم پی اے نے میرا گودام مسمار کرا دیا تھا؟"

"ہاں یاد تو ہے لیکن آپ نے خود ہی کہا تھا کہ وہ گودام ایک رفاہی پلاٹ پر بنا ہوا تھا۔"

"اور پتا ہے ایم پی اے نے کیا کیا؟ اس نے میرا گودام اور کچھ غریبوں کی دکانیں وغیرہ مسمار کروا کے وہ پلاٹ اپنے نام الاٹ کروالیا۔ یہ ہے ہمارے ملک کی سیاست۔ یا تو آدمی خاموشی سے ظلم برداشت کرتا رہے اور یا پھر اسی لائن میں لگ جائے جس میں یہ لوگ لگے ہوئے ہیں۔"

"یعنی ایم پی اے بن کر آپ بھی وہی کام کریں گے جو یہ لوگ کر رہے ہیں؟"

"تو تمہارا کیا خیال ہے کہ میں ان کی اصلاح کرنے کے لیے ایم پی اے بننا چاہتا ہوں؟"

"اصلاح نہ سہی' آپ اصلاح کی کوشش تو کر سکتے ہیں۔ آپ کے اس عمل سے دیگر اچھے لوگوں کی حوصلہ افزائی ہوگی۔"

"سعدیہ بیگم' بات یہ ہے کہ اسمبلی ممبر بننے کے لیے لاکھوں روپے اور قیمتی وقت خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اتنی دولت خرچ کرنے کے بعد اگر آدمی اصلاح کے کام میں لگ جائے تو اس کا دُہرا نقصان ہوگا۔ جو پیسہ اس نے ممبر بننے پر خرچ کیا وہ تو گیا۔ اور چونکہ وہ دوسروں کی اصلاح کرنا چاہتا ہے اس لیے اپنی پوزیشن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پیسہ نہیں بنا سکتا ورنہ دوسروں کی اصلاح والی بات محض ریاکاری ہوگی۔ اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ سچ مچ اصلاح کی کوشش کرنے والے ممبر کا دوسرے ممبران ویسے ہی

تیا پانچہ کردیں گے۔ ہم جیسے گناہ گار اصلاح کا کام نہیں کرسکتے۔"

"تو پھر سیاست سے دور ہی رہیں۔ آپ کے پاس کس چیز کی کمی ہے؟ کاروبار ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے اور لاکھوں کی آمدنی ہے۔ کیا آپ ایک گودام کی وجہ سے ایم پی اے بننا چاہتے ہیں؟"

"میں اس طاقت کو توڑنے کے لیے ایم پی اے بننا چاہتا ہوں جس نے مجھے گودام سے محروم کیا ہے۔ اس بے بسی کے باعث میں کئی بار اپنے آپ پر لعنت بھیج چکا ہوں۔ اتنی دولت کے باوجود میرے پاس ذرا بھی اختیار نہیں ہے۔"

"یہ تو کوئی اچھی خواہش نہیں ہے کیوں کہ اختیار ملنے کے بعد آپ بھی وہی غلط کام کریں گے جو دوسرے بااختیار لوگ کررہے ہیں۔ اسی طرح کچھ اور دولت مندوں کے اندر احساس محرومی پیدا ہوگا اور وہ اختیار حاصل کرنے اور کم اختیار والوں کو کچلنے کے لیے میدان میں کود پڑیں گے اور غلط کاموں کا یہ سلسلہ بڑھتا چلا جائے گا۔"

"یہ تو ہوگا۔ یہ جنگ تو ازل سے جاری ہے۔"

"میں نہیں مانتی۔ مُہذّب ملکوں میں اختیارات کے ناجائز استعمال کی جنگ تقریباً ختم ہوچکی ہے۔ وہ لوگ اوّل تو اختیارات کا ناجائز استعمال نہیں کرتے اور اگر کرتے ہیں تو ڈرتے ڈرتے۔ لیکن ہمارے ہاں دھڑلّے سے اختیارات کا ناجائز استعمال کیا جاتا ہے اور اس کی نشان دہی کرنے والوں کو کچلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جب تک سیاست کی یہ گندگی ختم نہیں ہوگی، ہمارا ملک ترقی نہیں کرسکے گا۔"

"سعدیہ بیگم، چھوڑو ان باتوں کو۔ دو چار آدمی سیاست کی اس گندگی کو دور نہیں کرسکتے۔ اس کے لیے آسمانی کڑکے کی ضرورت ہے۔ ایسا کڑکا جو سب کو بھسم کرڈالے۔ تم اپنی والی خوش خبری سناؤ۔"

سعدیہ نے کھانے سے ہاتھ روک لیا اور کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی "پتا نہیں یہ خوش خبری آپ کو پسند بھی آتی ہے یا نہیں۔"

سکندر علی کولڈ ڈرنک کا گھونٹ لینے کے بعد بولا "لگتا ہے کوئی سیریس قسم کی خوش خبری ہے۔"

"ہاں، بہت ہی سیریس قسم کی خوش خبری ہے۔" سعدیہ نے نظریں جھکالیں "میں..... امید سے ہوں۔"

"اوہ۔" سکندر علی نے چونک کر کہا "یہ تو اچھی خبر نہیں ہے۔ تم ایسا کرو کہ کل چھٹی کرو اور کسی لیڈی ڈاکٹر سے ملو۔"

"میں کسی میٹرنٹی ہوم میں نام لکھوانا چاہتی ہوں لیکن وہاں ہونے والے بچے کے باپ کا نام بھی لکھوانا پڑتا ہے۔" سعدیہ کی نظریں بدستور جھکی ہوئی تھیں "یہ۔ ہم دونوں کا مشترکہ مسئلہ ہے۔"

"میٹرنٹی ہوم! مشترکہ مسئلہ! یہ تم کیسی باتیں کررہی ہو، سعدیہ بیگم! اس مصیبت سے جان چھڑانے کی ترکیب سوچو۔"

"سکندر صاحب، آپ اس بچے کو اپنا نام بھی دے سکتے ہیں۔"

"تم شادی کی بات کررہی ہو؟" سکندر علی خان کو غصہ آگیا لیکن اس نے فوراً ہی اپنے غصے پر قابو پالیا اور نرمی سے بولا "یہ تم ناممکن بات کررہی ہو۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ میری پوزیشن .... بہت نازک ہے۔ پھر میں سیاست میں بھی حصہ لے رہا ہوں۔ اس قسم کا اسکینڈل میری سیاسی زندگی کو شروع ہونے سے پہلے ہی ختم کردے گا۔"

یہ باتیں سن کر سعدیہ نے کھانے سے ہاتھ روک لیا۔ نوالہ اس کے حلق میں اٹکنے لگا تھا۔ اس نے دل میں کہا۔ اسکینڈل تو شادی نہ کرنے سے بنتا ہے پھر اونچی آواز میں بولی "مجھے آپ کی پوزیشن کا پورا احساس ہے لیکن ... میرا خیال ہے کہ دوسری شادی کرنے سے کوئی اسکینڈل نہیں بن سکتا۔ میں کئی ایسے سیاست دانوں کو جانتی ہوں جن کی تین تین چار چار بیویاں ہیں۔"

"لیکن اس میں ٹائم فیکٹر کا مسئلہ ہے۔ اگر فرزانہ بیگم کو یہ بات معلوم ہوگئی تو وہ طوفان کھڑا کردے گی۔ فی الحال اس سے بہتر اور کوئی تجویز نہیں ہوسکتی۔ تمہاری تجویز پر بعد میں غور کیا جاسکتا ہے۔"

اگرچہ یہ بات غیر متوقع نہیں تھی لیکن سعدیہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی اور اس نے خاموشی اختیار کرلی۔ حالات اور تجربات نے اسے یہ بات سمجھادی تھی کہ بڑے لوگوں کے سامنے احتجاج کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ یہ لوگ اپنے سوا ہر شخص کو بکاؤ مال سمجھتے ہیں اور نازک انسانی جذبوں کی ان کے سامنے کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ اس نے سوچا کہ جوش و جذبات سے اس کا اپنا ہی نقصان ہوگا۔ پس اس نے انتقام کے مختلف طریقوں پر غور کرنا شروع کردیا۔

وہ تین بہنوں میں سب سے بڑی تھی۔ اس کا ایک بھائی تھا جو شادی شدہ تھا اور بیوی بچوں سمیت ملتان میں رہتا تھا۔

ان کی ماں کرسچن سے مسلمان ہوئی تھی اور ایک پرائیویٹ اسپتال میں بطور نرس کام کرتی تھی۔ لیکن اس کی اپنے شوہر سے ہمیشہ کھٹ پٹ رہتی تھی کیوں کہ وہ آزاد ماحول میں پلی بڑھی تھی جب کہ اس کا شوہر مذہبی آدمی تھا اور اسے پابندیوں میں رکھنا چاہتا تھا۔

پندرہ سال کی ناکام ازدواجی زندگی کے بعد شوہر نے دوسری شادی کرلی اور روپوش ہوگیا۔

بچوں پر ماں کا اثر زیادہ تھا یعنی وہ بھی آزاد خیال تھے۔ باپ کے غائب ہوجانے کے بعد ان کو کچھ مسائل کا سامنا کرنا پڑا تاہم آمدنی کا مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ ماں نرس تھی اور تنخواہ کے علاوہ اس کی پرائیویٹ آمدنی بھی تھی۔ جب سعدیہ نے ملازمت شروع کردی تو آمدنی کا ایک دروازہ اور کھل گیا لیکن دیگر مسائل میں

رہائش کا مسئلہ بھی تھا کیوں کہ ان کے پاس اپنا مکان نہیں تھا۔ انہیں ہر تین چار سال کے بعد کرائے کا مکان بدلنا پڑتا تھا جس کی وجہ سے معاشرے میں ان کی کوئی حیثیت متعین نہیں ہوئی تھی اور لوگ ان کے ساتھ اجنبیوں جیسا سلوک کرتے تھے۔ اس مسافرت کا ایک نقصان یہ بھی ہوا تھا کہ لڑکیوں کے رشتوں کی کہیں باضابطہ بات چیت نہیں ہو سکی تھی۔

یہ وہ حالات تھے جن کی بنا پر سعدیہ اپنے لیے خود ہی رشتہ تلاش کرنے پر مجبور ہوئی تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ ماں کی طرف سے اس معاملے پر کوئی پابندی نہیں تھی لیکن اس نے ناتجربہ کاری کے سبب اپنی حیثیت سے زیادہ اونچا اُڑنے کی کوشش کی اور منزل سے دور ہوتی چلی گئی۔

دو روز کے بعد اس نے دفتر میں سکندر علی کو اپنے مسئلے کے بارے میں یاد دلایا۔ اس وقت لنچ ٹائم تھا اور سکندر علی کھانے سے فارغ ہو کر آرام کر رہا تھا۔

”سعدیہ بیگم! اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے اور وہ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔“ سکندر علی نے برہمی سے کہا ”جہاں تک خرچ کا تعلق ہے‘ اس کی فکر نہیں کرو۔ خرچا میرے ذمے ہے۔“

”سر! اس کا ایک تیسرا حل بھی ہے۔“ سعدیہ نے جذبات میں آئے بغیر کہا ”میں فوری طور پر شادی کر کے اس معاملے پر پردہ ڈال سکتی ہوں۔“

”اگر ایسا ہو سکتا ہے تو دیر مت کرو۔“

”ہو تو سکتا ہے لیکن مجھے اپنی حیثیت سے بہت نیچے جانا پڑے گا۔“

”یہ تمہارا پرابلم ہے۔“ سکندر نے لاتعلقی سے کہا لیکن چند لمحوں کے بعد اس نے بھوئیں سکیڑیں۔ وہ اس معاملے سے اتنا بھی لاتعلق نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کا بچہ ایک معمولی گھرانے میں پرورش پائے گا اور ایک کمتر شخص کو ابا کہہ کر پکارے گا۔ مستقبل میں یہ راز فاش بھی ہو سکتا تھا اور اس سے کئی مسائل پیدا ہو سکتے تھے۔ اور وہ ”ابا“ اس کے بچے کی پٹائی بھی کیا کرے گا۔ سعدیہ اس بچے کے ذریعے اسے بلیک میل بھی کر سکتی تھی۔

”تمہیں اس پر اتنا اصرار کیوں ہے؟“ سکندر علی نے کہا ”خواہ مخواہ کی بدنامی مول لینے کی کیا ضرورت ہے؟“

سعدیہ نے چالاکی سے کہا ”سر‘ ہو سکتا ہے کہ آپ کی نظر میں میری کوئی اہمیت نہ ہو لیکن میرے دل میں آپ کا بہت مقام ہے اور میں آپ کی ”نشانی“ کا گلا نہیں گھونٹ سکتی۔ اگر آپ کے دل میں میری شادی کے بارے میں خدشات ہوں تو بے شک ان کا اظہار کر دیں‘ میں آپ کی خوشنودی کی خاطر ساری زندگی ایسے ہی گزار دوں گی۔ آپ کا... نہیں‘ ہمارا بچہ میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہوگا۔ میں عظیم باپ کے عظیم بیٹے کی پرورش کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دوں گی۔ اگر آپ حکم دیں گے تو کسی دور دراز علاقے میں جا بسوں گی اور ساری زندگی گمنامی میں گزار دوں گی۔“

سکندر علی کے تاثرات بتا رہے تھے کہ سعدیہ اسے اپنی چالاکی سے متاثر کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس نے اتنے جذبے سے وہ باتیں کہی تھیں کہ سکندر علی کو اس کی ایک ایک بات سچی لگی تھی۔

”دیکھو‘ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“ اس نے نرمی سے کہا ”اس معاملے میں کئی مشکلات ہیں۔ پہلے تو یہ کہنا مشکل ہے کہ بیٹا ہوگا یا بیٹی۔ دوسری بات یہ ہے کہ بچے کو باپ کی شفقت نہ سہی‘ باپ کے نام کی ضرورت ضرور ہوگی۔ اس سلسلے میں تم نے کیا سوچا ہے؟“

”سوچنے کی کیا ضرورت ہے! باپ کا نام سکندر علی ہی ہوگا۔ اگر آپ کو اس پر اعتراض ہے تو میں نام کے ساتھ لفظ ”مرحوم“ لگا دوں گی۔“

”لیکن میں زندہ ہوں! کیا تم مجھے مارنا چاہتی ہو؟“

”لفظ ”مرحوم“ احتراماً مردوں کے نام کے ساتھ لگایا جاتا ہے لیکن اس کے معنے مردہ ہرگز نہیں۔ مرحوم کے لغوی معنے ہیں ”رحم کیا گیا“ یعنی ایسا شخص جس پر خدا نے رحم کیا ہو یا اسے بخش دیا ہو۔“

”بچہ بڑا ہو کر بہت کچھ جاننا چاہے گا۔ تم اسے مطمئن نہیں کر سکو گی۔“

”یہ بہت بعد کی بات ہے۔ اس عرصے میں‘ میں بہت کچھ سوچ لوں گی۔ اس سلسلے میں آپ کا ذکر نہیں آئے گا۔“

”جو کچھ تم چاہتی ہو وہ عملی طور پر بہت مشکل ہے۔ تنہا زندگی گزارنا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ اس معاملے کے کچھ تاریک پہلو بھی ہیں‘ ان پر اچھی طرح غور کر لو۔“

سعدیہ نے دل میں کہا۔ سکندر علی خان‘ اب غور کرنے کی تمہاری باری ہے۔ میں تو طوفان میں گھر چکی ہوں۔ تم باہر بیٹھ کر تماشا دیکھ رہے ہو‘ پھر اونچی آواز میں بولی ”مجھ پر صرف ایک مہربانی کریں۔ مجھے... طلاق دے دیں۔“

”طلاق!“ سکندر علی نے حیرانی سے کہا ”معلوم ہوتا ہے کہ تم اپنے حواس میں نہیں ہو۔ طلاق بیوی کو دی جاتی ہے۔“

”میں اپنی عزت رکھنے کے لیے طلاق مانگ رہی ہوں۔ اگر مجھے کسی گمنام علاقے میں جا کر رہنا پڑا تو میں لوگوں کو طلاق نامہ دکھا کر اپنی عزت بچا سکتی ہوں۔ بلکہ اس طرح آپ کے بچے کی عزت بھی محفوظ ہو جائے گی۔“

سکندر علی سوچ میں پڑ گیا۔ یہ بڑی عجیب سی تجویز تھی۔ شادی کے بغیر طلاق بے معنی بات تھی لیکن سعدیہ کی بات بھی ٹھیک تھی۔ وہ طلاق نامے کو اپنی اور بچے کی عزت بچانے کے لیے استعمال کر سکتی تھی۔

"میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔" سکندر علی نے کہا "لیکن میں تمہاری تجویز پر غور کروں گا۔ تم بھی میری تجویز پر غور کرنا۔"
جہاں تک سعدیہ کا تعلق تھا' وہ بہت غور کر چکی تھی۔ اصولی طور پر وہ سکندر علی کی تجویز سے متفق تھی لیکن اس کے سینے میں کھولنے والا انتقامی جذبہ زیادہ طاقتور تھا۔ اس انتقامی جذبے نے اس کے ہوش و حواس پر پردہ ڈال دیا تھا۔

○☆○

محمد اشرف ایک صحت مند اور خوبرو نوجوان تھا۔ وہ سوات کا رہنے والا تھا اور گزشتہ تین سال سے سکندر علی کے پاس ڈرائیور کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ وہ خوش اخلاق اور محنتی نوجوان تھا۔ ڈرائیوری کے علاوہ وہ دفتر کے چھوٹے موٹے کام بھی کر دیتا تھا۔ انکار کرنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ سفید یونیفارم میں وہ بہت شاندار لگتا تھا۔ اس کے مضبوط جسم اور سرخ و سفید رنگت پر یونیفارم بہت بجتی تھی۔
اس کی تعلیم مڈل تک تھی۔ سعدیہ نے اسے کئی دفعہ مزید تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ گریجویشن کرکے وہ اعلیٰ ملازمت حاصل کر سکتا تھا۔ مگر اشرف جواب میں کہتا "مس صاحب' یہ ملازمت بھی میری اوقات سے بہت بڑھ کر ہے۔ اگر میں اپنے ملک میں ہوتا تو بکریاں چرا رہا ہوتا یا کسی چھپر ہوٹل میں بیرا گیری کر رہا ہوتا۔ اللہ نے مجھے بڑی عزت دی ہے۔ میں اس کام سے بہت خوش ہوں۔"
اس کی قناعت پسندی اور شکر گزاری سعدیہ کو بہت متاثر کرتی تھی۔ وہ ہمیشہ آنکھیں نیچی رکھتے ہوئے بڑے ادب سے بات کرتا تھا۔
سات روز کے بعد سکندر علی ایک ضروری کام کے سلسلے میں لاہور چلا گیا۔ اس نے سعدیہ کی تجویز کا جواب نفی میں دیا تھا اور جانے سے پہلے معاملہ نمٹانے کے لیے کچھ رقم اسے دے گیا تھا۔
اگلی صبح سعدیہ نے اشرف کو چائے بنانے کے لیے کہا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے نو بجے تھے اور ابھی چائے کا وقت نہیں ہوا تھا۔ تاہم اشرف چائے بنا کر لے آیا۔
سعدیہ نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "بیٹھو!"
اشرف کے لیے یہ انتہائی خلافِ معمول بات تھی۔ دفتر میں وہ صرف اسٹول پر بیٹھتا تھا۔ اس نے کبھی کسی کلرک کے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھنے کی جرأت بھی نہیں کی تھی اور مس سعدیہ تو ایم ڈی کی سیکریٹری تھی۔ اس کے سامنے تو چھوٹے موٹے اسٹاف ممبرز بھی نہیں بیٹھتے تھے۔
اشرف نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا پھر پوچھا "مس صاحب' آپ نے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا ہے؟"
"ہاں۔" سعدیہ نے اثبات میں سر ہلایا "میں تم سے کچھ ذاتی قسم کی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

سعدیہ کا کمرا الگ تھا اور اس کا دروازہ بند تھا۔
"مس صاحب' میں یہ بے ادبی نہیں کر سکتا۔ آپ بات کریں' میں کھڑا ہو کر آپ کی بات سنوں گا۔ مولا کے کرم سے میں دھوپ میں بھی دو تین گھنٹے کھڑا رہ سکتا ہوں۔"
"اشرف' ایک بات تو بتاؤ۔" سعدیہ نے کہا "فرض کرو' ہم دریا کے کنارے پر کھڑے ہیں اور سکندر صاحب میرے ساتھ دست درازی کرنے لگتے ہیں۔ ہم آپس میں جھگڑا کرتے ہوئے دریا میں گر جاتے ہیں۔ تم ہم دونوں میں سے پہلے کس کو بچاؤ گے؟"
دفتر میں سعدیہ اور باس کے تعلقات کے بارے میں سرگوشیاں ہوتی رہتی تھیں لیکن کوئی شخص اس بارے میں اونچی آواز میں بات نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بات اشرف بھی جانتا تھا۔
"مس صاحب' یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔" اس نے جواب دیا "میں پہلے آپ کو بچاؤں گا۔ اس کے بعد... ہو سکتا ہے کہ میں تیرنا ہی بھول جاؤں۔"
یہ جواب سن کر سعدیہ خوش ہو گئی۔ اس نے کہا "اشرف' یہ بات میں نے اس لیے کی ہے کہ میں ڈوب رہی ہوں اور مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ سکندر صاحب نے مجھے تباہی کے کنارے پر پہنچا دیا ہے۔ اب وہ دور کھڑے تماشا دیکھ رہے ہیں۔"
"میں آپ کی مدد کے لیے حاضر ہوں مس صاحب۔ حکم کریں' آپ کو کس قسم کی مدد کی ضرورت ہے؟"
"اشرف' میں چاہتی ہوں کہ..." سعدیہ نے توقف کرتے ہوئے کہا "کہ تم مجھ سے شادی کر لو۔"
یہ بات اشرف کے لیے انتہائی غیر متوقع تھی۔ وہ چونک کر پیچھے ہو گیا۔ بولا "مس صاحب' آ... آپ مذاق کر رہی ہیں۔ میں تو بہت ہی چھوٹا اور گھٹیا آدمی ہوں۔"
"اشرف' میں مذاق نہیں کر رہی' بالکل سنجیدہ ہوں۔ انسان اپنی غریبی کی وجہ سے نہیں' اپنی حرکتوں کی وجہ سے گھٹیا ہوتا ہے۔ سکندر صاحب شادی کے جھوٹے وعدوں سے مجھے دھوکا دیتے رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے ایسے مقام پر لا کر چھوڑ دیا ہے جہاں مجھے ہر طرف تاریکی نظر آ رہی ہے۔"
"وہ تو ٹھیک ہے لیکن۔"
"میں سکندر صاحب سے انتقام لینا چاہتی ہوں لیکن میں اکیلی کچھ نہیں کر سکتی۔ مجھے مضبوط سہارے کی ضرورت ہے اور وہ سہارا صرف تم دے سکتے ہو۔"
"مم... میں شادی کے بغیر بھی آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔"
سعدیہ سوچ میں پڑ گئی۔ اس کے ذہن میں مختلف خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ ایک مسئلہ ہونے والے بچے کے لیے باپ کا تھا۔ وہ اپنی عزت بچانے کے لیے فوراً شادی کرنا چاہتی تھی۔ دوسرا مسئلہ انتقام کا تھا۔ اس کا تعلق بھی بچے سے تھا۔ اسے اس بات کا بھی بخوبی احساس تھا کہ اشرف اسے معاشرے میں وہ مقام نہیں دے

سکتا تھا جس کی وہ حقدار تھی۔ اس وقت وہ ہنگامی مسئلے کی وجہ سے اس بات کو نظرانداز کر رہی تھی۔ لیکن ... اس نے سوچا۔ وہ اشرف کو فرضی شوہر کے طور پر بھی استعمال کر سکتی تھی لیکن اس کے لیے اسے چند ماہ کسی دوسرے شہر میں رہنا پڑے گا۔

"اشرف' بات یہ ہے کہ شادی کے بعد میاں بیوی کی عزت ایک ہو جاتی ہے۔" اس نے کہا "مجھے پتا ہے کہ تم ایک شریف انسان ہو اور ضرور میری مدد کرو گے لیکن یہ ایک غیر عورت کی مدد ہو گی جس سے تم ہاتھ روک بھی سکتے ہو۔ اور جب تمہیں میری کمزوریوں کا پتا چلے گا تو تمہارے رویے میں فرق آ جائے گا۔"

"مس صاحبہ' میں جاہل اور نکما سا آدمی ہوں' میرے پاس آپ کے جتنا علم نہیں ہے لیکن میں ایک بات جانتا ہوں۔ رویے میں فرق شادی کے بعد بھی آ سکتا ہے۔ آپ فکر نہ کریں' میں زبان کی خاطر جان قربان کر دینے والا شخص ہوں۔ مجھے آزما کر تو دیکھیں۔"

اس کے لہجے میں سچائی اور خلوص پایا جاتا تھا۔ سعدیہ نے اس پر اعتماد کرنے کا فیصلہ کر لیا اور کہا "ٹھیک ہے' باقی تفصیل میں تمہیں شام کے وقت بتاؤں گی۔ ان باتوں کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔"

"آپ فکر نہ کریں جی' آپ کی عزت میری عزت ہے۔"

اس روز سعدیہ نے دفتر کے کام میں بالکل دلچسپی نہیں لی اور سارا وقت انتقام کا منصوبہ بناتی رہی۔

شام کے وقت اس نے اشرف کو تھوڑی سی تفصیل بتائی اور اس کے ساتھ مستقبل کا پروگرام طے کرتی رہی۔

دو روز کے بعد اس نے اپنی ماں کو بھی ساری بات بتا دی۔ اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ماں کے تعاون کے بغیر وہ آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ ماں نے اس بات پر اسے بری طرح ڈانٹا اور وہی مشورہ دیا جو سکندر علی نے دیا تھا لیکن سعدیہ نے اس کا مشورہ ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کے ذہن میں جو منصوبہ جنم لے رہا تھا اس پر عمل درآمد کے لیے بچے کا ہونا بہت ضروری تھا۔

○☆○

کراچی ایک ایسا شہر ہے جس میں انسان برسوں چھپ کر رہ سکتا ہے۔ چند مرکزی علاقوں کے علاوہ بعض علاقے ایسے ہیں جہاں دوسرے علاقوں کے لوگ بھول کر بھی نہیں جاتے۔ کراچی کے بہت سے لوگوں نے لندن' پیرس اور فرینکفرٹ ضرور دیکھا ہو گا لیکن چاکیواڑہ' کھنڈہ مارکیٹ' بھینس کالونی اور خاموش کالونی کبھی نہیں دیکھی ہو گی۔ اور نفسا نفسی کا یہ عالم ہے کہ بہت سے لوگ اپنے پڑوسیوں کے نام تک نہیں جانتے۔

یہی وجہ تھی کہ سعدیہ کو چند ماہ کی روپوشی کے لیے کراچی سے باہر جانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ تین مہینے کے بعد جب آثار کچھ نمایاں ہونے لگے تو اس نے خاموش کالونی میں ایک مکان کرائے پر لے لیا۔ مالک مکان سے ساری بات چیت اشرف نے کی تھی۔ بات چیت کے دوران سعدیہ اور اس کی ماں بھی ساتھ تھی۔

اشرف نے خود کو سعدیہ کا شوہر تو نہیں کہا تھا مگر انداز شوہروں والا تھا۔ مالک مکان نے خود ہی یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ تینوں فیملی ممبر تھے۔ شوہر' بیوی اور ساس۔

مکان کا انتظام کرنے کے بعد سعدیہ نے اپنے فکرمند باس سے کہا "سر' مجھے سات مہینے کی چھٹی چاہیے۔ میں کراچی سے باہر جا رہی ہوں۔"

سکندر علی نے اس بات پر قدرے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن وہ پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی سیکرٹری کیا کھیل کھیل رہی تھی۔

"مس سعدیہ' تم بہت ضدی لڑکی ہو۔" اس نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم.. یہ سب کچھ کیوں کر رہی ہو!"

"سر' میں آپ کی پریشانی کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔" سعدیہ نے چالاکی سے کہا "لیکن میں نے سارا انتظام کر لیا ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"کیا انتظام کر لیا ہے؟" باس نے برہمی سے پوچھا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے آپ سے بات کرنے کے چند روز بعد سول میرج کر لی تھی۔" سعدیہ نے جھوٹ بولا "اور دوسری بات یہ ہے کہ میں جاتے وقت شادی کا شوشہ چھوڑ جاؤں گی۔"

"کیا مطلب؟"

"دبے لفظوں میں شہناز سے کہہ دوں گی کہ میں شادی کے سلسلے میں لاہور جا رہی ہوں۔ یہ بات خود بخود سارے دفتر میں مشہور ہو جائے گی۔"

"یہ بات تم تین مہینے پہلے بھی کر سکتی تھیں۔ چھ مہینے کے بعد تم ماں بن جاؤ گی' اس سلسلے میں کیا وضاحت کرو گی؟"

"اس الجھن سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ میں پورا سال چھٹی کروں یا کسی دوسری جگہ ملازمت کر لوں۔"

"میں تمہیں زیادہ سے زیادہ چھ مہینے کی چھٹی تنخواہ کے ساتھ دے سکتا ہوں' وہ بھی صرف اس لیے کہ...."

"سر' تنخواہ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" سعدیہ نے بظاہر بڑی فرمانبرداری سے کہا "آپ کے مجھ پر ویسے ہی بہت احسانات ہیں۔ آپ بے شک مجھے ایک دن کی تنخواہ بھی نہ دیں۔"

"خیر... میں اتنا بھی سنگدل نہیں ہوں۔ میں تمہیں اپنے پرائیویٹ اکاؤنٹ سے چھ ماہ کی تنخواہ کا چیک دے دوں گا۔ دفتر میں یہی ظاہر کیا جائے گا کہ تم ایک مہینے کی چھٹی لے کر گئی تھیں۔ تمہیں کب سے چھٹی چاہیے؟"

"ہم نے آئندہ اتوار کی سیٹیں بک کروائی ہیں۔ میری ممی بھی ساتھ جا رہی ہیں۔"

"او کے' میں تمہیں کل چیک دے دوں گا۔" سکندر علی نے کہا "اور دیکھو' اب ایک سال کے بعد ہی آنا۔"

سعدیہ نے سر جھکا دیا۔

○☆○

وقت تیزی سے گزر گیا۔

چھ مہینے کے بعد سعدیہ نے ایک صحت مند اور خوب صورت بچی کو جنم دیا۔ اس کا نام اس نے نادیہ رکھا۔ یہ نام اس نے بہت سوچ بچار کے بعد رکھا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ قدرت نے اسے جو کچھ دیا تھا وہ اس کے لیے "نادیا" کے برابر تھا کیوں کہ وہ اس بچی کو رکھ نہیں سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس کی پیدائش پر بہت مایوس تھی۔

میٹرنٹی ہوم کے ریکارڈ میں نادیہ کے باپ کا نام محمد اشرف لکھا گیا تھا۔

اشرف اپنے وعدے کے مطابق سعدیہ کا ساتھ نبھا رہا تھا۔ وہ بظاہر شوہر کی طرح اور حقیقت میں مہمان کی طرح ان کے گھر میں رہ رہا تھا۔

سکندر علی کو اس سازش کا کوئی علم نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ سعدیہ اب واپس نہیں آئے گی۔ اس اثنا میں اسے دو خوشیاں حاصل ہوئی تھیں۔ پہلی خوشی یہ تھی کہ وہ صوبائی اسمبلی کا رکن منتخب ہو گیا تھا اور دوسری خوشی یہ حاصل ہوئی تھی کہ اس کے ہاں تیسرے بیٹے کی ولادت ہوئی تھی۔ بیٹی کوئی نہیں تھی۔ پہلے دو بیٹوں کی عمریں علی الترتیب چھ اور دو سال تھیں۔ بڑے کا نام منور علی اور چھوٹے کا نام اسد علی تھا۔ نومولود کا نام ظفر علی رکھا گیا۔

اسد علی بہت بھولا بھالا اور پورے خاندان کی آنکھ کا تارا تھا۔ ماں باپ کے علاوہ دادا دادی اور نانا نانی بھی اسی کو زیادہ چاہتے تھے۔

جب نادیہ تین مہینے کی ہو گئی تو سعدیہ نے اپنے منصوبے کے دوسرے حصے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک شام اس نے اشرف سے کہا "تم نے میرا بہت ساتھ دیا ہے۔ میں زندگی بھر تمہارا احسان نہیں بھلا سکوں گی۔"

"مس صاحبہ، احسان کس بات کا؟" اشرف نے انکساری سے کہا "میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ احسان تو آپ نے مجھ پر کیا ہے۔ یہاں مجھے گھر کا آرام اور کھانا پینا سب کچھ حاصل ہے۔"

سعدیہ نے اشرف کو یہی بتایا تھا کہ سکندر علی نے اس سے خفیہ شادی کی تھی اور بعد میں طلاق دے دی تھی۔ تاہم اسے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ اشرف اس کی بات پر یقین کرتا ہے یا نہیں۔ وہ انتقام کی آگ میں جل رہی تھی اور سکندر علی سے تا زندگی یاد رہنے والا انتقام لینا چاہتی تھی۔

"اب میں ایک مشکل کام تمہارے سپرد کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے کہا "مجھے امید ہے کہ تم اس کام میں بھی میرے ساتھ تعاون کرو گے۔"

"جی، حکم کریں۔"

"میں... سکندر علی کے منجھلے بیٹے کو... اغوا کرنا چاہتی ہوں۔"

"جی...!" اشرف چونک گیا "یہ تو بہت مشکل کام ہے۔ آج کل صاحب اسمبلی کے ممبر ہیں اور ان کے ساتھ ہر وقت ایک گن مین رہتا ہے۔"

"گن مین صاحب کے ساتھ رہتا ہے، بچوں کے ساتھ تو نہیں رہتا نا۔ بچے سیر تفریح کے لیے باہر بھی جاتے ہوں گے۔ بیگم صاحبہ شاپنگ کے لیے جاتی ہوں گی تو کبھی کبھی بچوں کو بھی ساتھ لے جاتی ہوں گی۔ تم ان کے ڈرائیور رہو، تمہیں ان کے پروگراموں کا سارا علم ہوتا ہوگا۔"

"علم تو ضرور ہوتا ہے لیکن" اشرف نے سوچتے ہوئے کہا "اس معاملے میں، میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اور میں آپ کو بھی یہی مشورہ دوں گا کہ اس معاملے میں نہ پڑیں۔ یہ بہت خطرناک بات ہے۔"

"مجھے مشورے کی ضرورت نہیں ہے اشرف۔ میں نے جو فیصلہ کیا ہے، اس پر میں ہر صورت میں عمل کروں گی۔ اگر میں نے یہ فیصلہ نہ کیا ہوتا تو آج میں زندہ نہ ہوتی، اب تک خودکشی کر چکی ہوتی۔ اب بھی اگر میں ناکام ہو گئی تو خودکشی کر لوں گی۔ تم نے اس معاملے میں عملی طور پر کچھ نہیں کرنا، صرف معلومات فراہم کرنی ہیں۔ اصل کام میں خود کروں گی۔"

"آپ اچھی طرح سوچ لیں۔" اشرف، سعدیہ کی باتیں سن کر پریشان ہو رہا تھا "اتنے بڑے آدمی کے بچے کو اغوا کرنا معمولی بات نہیں ہے۔"

"بڑا آدمی میری جُوتی!" سعدیہ نے پیر فرش پر مارا "اگر دولت کو ایک طرف کر دیا جائے تو سکندر علی تم سے بھی چھوٹا آدمی ہے۔ تمہیں صرف اتنا کرنا ہوگا کہ جب بچے بیگم صاحبہ کے ساتھ یا کسی اور کے ساتھ باہر جائیں تو مجھے فون کر دو۔ باقی کام میں خود کر لوں گی۔"

قدرے تامل کے بعد اشرف اتنا سا تعاون کرنے پر راضی ہو گیا تاہم اس کے دل میں طرح طرح کے خدشات جنم لے رہے تھے۔ اس نے پوچھا "آپ بچے کو اغوا کر کے رکھیں گی کہاں؟"

"بچہ اس گھر میں نہیں رہے گا۔" سعدیہ نے اشرف کے خدشے کو محسوس کرتے ہوئے کہا "کراچی میں بھی نہیں رہے گا۔ بچے کو کوئی نقصان بھی نہیں پہنچے گا لیکن میں تمہیں یہ نہیں بتا سکتی کہ بچہ کہاں رہے گا اور یہ جاننا تمہارے لیے مناسب بھی نہیں ہے۔"

اشرف نے تعاون کا وعدہ تو کر لیا مگر اس کی الجھن دور نہیں ہوئی۔

○☆○

ممبر بننے کے بعد سکندر علی کی مصروفیات بڑھ گئی تھیں اور وہ زیادہ وقت گھر سے باہر رہتا تھا۔ ان دنوں وہ اپنی دولت اور کاروبار

کو وسعت دے رہا تھا۔ ممبر بننے کے بعد اس کے سامنے حصولِ زر کے بے شمار راستے کھل گئے تھے اور وہ اس موقعے سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ اس نے کراچی کے ایک فیشن ایبل علاقے میں دو ہزار گز کے پلاٹ پر بنگلے کی تعمیر بھی شروع کروادی تھی۔ یہ پلاٹ اسے ممبران کے مخصوص کوٹے سے تقریباً مفت ہی مل گیا تھا۔ جو قیمت اس نے ادا کی تھی وہ پلاٹ کے دسویں حصے سے بھی کم تھی۔ ایک پارٹی نے سریے اور سیمنٹ کی فراہمی کا ذمّہ لے لیا تھا تو ایک دوسری پارٹی نے تعمیراتی کام کی ذمّے داری سنبھال لی تھی۔

یہ وہ کام تھا جس کا سکندر علی برسوں سے خواب دیکھ رہا تھا۔ اگرچہ اس کے پاس بنگلا بھی تھا اور بزنس بھی خوب چل رہا تھا مگر وہ اتنے عالی شان بنگلے کی تعمیر کا کام شروع کرتے ہوئے گھبراتا تھا۔ اسے پتا تھا کہ اس کا آدھے سے زیادہ سرمایہ بنگلے کی تعمیر میں گم ہوجائے گا اور اس سے لازماً بزنس اور آمدنی پر اثر پڑے گا لیکن اب سارا کام خود بخود ہو رہا تھا۔ نہ صرف کام ہو رہا تھا بلکہ سرمائے میں اضافہ بھی ہو رہا تھا۔

اس ترقی سے فرزانہ بیگم بھی خوب فائدہ اٹھا رہی تھی۔ وہ ہر تیسرے چوتھے روز شاپنگ کے لیے نکلتی تھی اور ہفتے میں ایک دفعہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کی دعوت کرتی تھی۔ بچوں کی دیکھ بھال ملازموں کے سُپرد تھی۔ بڑا بیٹا اسکول جاتا تھا' چھوٹا بیٹا پنگوڑھے میں پڑا رہتا تھا اور منجھلے کو وہ کبھی کبھی اپنے ساتھ لے جاتی تھی لیکن بچوں کی دیکھ بھال سے اسے بڑی الجھن ہوتی تھی۔ بچوں کے معاملے میں ہروقت نوکروں کی شامت آئی رہتی تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اسے بچوں سے محبت نہیں تھی۔ اس کے دل میں بچوں کی اتنی ہی محبت تھی جتنی کسی ماں کے دل میں ہونی چاہیے لیکن اسے اس محبت کے اظہار کا موقع نہیں ملتا تھا۔ یہ اس کی مجبوری تھی اور اس مجبوری کا نتیجہ یہ تھا کہ بچوں کو اس سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ اس سے زیادہ نوکروں کو پسند کرتے تھے جو ہروقت ان کے آرام اور تفریح کا خیال رکھتے تھے۔

اشرف ڈرائیور' سکندر علی کے قابلِ اعتماد ملازموں میں سے تھا۔ ان دنوں اسے ڈبل ڈیوٹی دینی پڑ رہی تھی۔ وہ صبح صاحب کو دفتر چھوڑنے جاتا اور دس بجے واپس بنگلے پر پہنچ جاتا' جہاں بیگم صاحبہ لمبے چوڑے پروگرام کے ساتھ اس کی منتظر ہوتیں۔ دفتر میں اسٹاف کار کا ڈرائیور ڈیوٹی سنبھال لیتا تھا۔

اشرف نے وعدے کے مطابق سعدیہ کو فون پر فرزانہ بیگم کی سرگرمیوں سے آگاہ کرنا شروع کردیا تھا تاہم وہ بہت محتاط تھا اور صرف ایسے مواقع کی اطلاع دیتا تھا جن میں اس کے ملوث ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ویسے اسے یقین تھا کہ سعدیہ بیگم اپنے منصوبے کو عملی جامہ نہیں پہنا سکے گی۔ ایک اکیلی عورت کے لیے اتنی بڑی شخصیت کے بچے کو اغوا کرنا تقریباً ناممکن تھا۔

تاہم سعدیہ پر جنون طاری تھا۔ وہ ہر صورت میں اپنے منصوبے کو کامیاب دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے سکندر علی کی عنایات کے ذریعے حاصل ہونے والی رقم سے ایک پرانی کار خرید لی تھی اور اشرف کا فون موصول ہوتے ہی موقع پر پہنچ جاتی تھی۔ نادیہ کو وہ اپنی ماں یا چھوٹی بہن کے سُپرد کر جاتی تھی۔ اس نے اسد علی کے ناپ کے کچھ کپڑے بھی خریدے تھے جنہیں وہ ہروقت کار میں رکھتی تھی۔

انتقامی جنون کے باوجود وہ بہت باہوش تھی اور کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتی تھی جس پر اسے بعد میں پچھتانا پڑے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا اور سات مواقع پر صرف جائزہ لے کر واپس چلی گئی تھی۔ اس جائزے سے اسے فرزانہ بیگم کے معمولات کا اندازہ بھی ہوگیا تھا۔ آٹھویں دفعہ اسے موقع مل گیا۔

اس روز فرزانہ بیگم ایک سُپر اسٹور میں شاپنگ کرنے آئی تھی۔ اس کے ساتھ ننھے اسد علی کے علاوہ ایک خادمہ بھی تھی۔ اس نے اسد کو خادمہ کے سپرد کیا اور خود شاپنگ میں مصروف ہوگئی۔ خادمہ نے دو تین دفعہ اسد کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوئی۔ اسد ہر دفعہ اس کا ہاتھ جھٹک دیتا بلکہ ایک دفعہ اس نے زور سے چیخ بھی ماری۔ وہ اسٹور کو تفریح گاہ سمجھ رہا تھا اور وہاں رکھی ہوئی رنگ برنگی چیزیں دیکھنا چاہتا تھا۔

"چھوڑ دو اسے" فرزانہ بیگم نے جھنجلا کر کہا "بہت تنگ کرتا ہے یہ۔ آئندہ میں اسے ساتھ نہیں لاؤں گی۔ دیکھو اسد... اِدھر اُدھر نہیں جانا ورنہ سیلزمین سے کہہ کر شوکیس میں بند کرادوں گی۔"

"پھر کیا ہوگا؟" اسد نے پوچھا۔

"پھر تم... پُتلے بن جاؤ گے۔" فرزانہ نے اسے ڈرایا۔ "وہ اُدھر سامنے دروازے کے پاس' شوکیس میں جو پُتلا رکھا ہے نا' وہ بھی اپنی ممی کو بہت تنگ کیا کرتا تھا۔"

یہ سن کر اسد کے دل میں تجسّس پیدا ہوا اور وہ اس بچّے کے پُتلے کو دیکھنے کے لئے بے چین ہوگیا جو دروازے کے قریب شوکیس میں سجا ہوا تھا۔ پانچ منٹ کے بعد وہ اپنی ممی اور ملازمہ کو خریداری کی طرف متوجہ پاکر دروازے کی طرف چلا گیا اور پُتلے کو گھورنے لگا۔ تب ہی اس کے کانوں میں چڑیا کے بولنے کی آواز آئی۔ یہ آواز اس عورت کے پرس کے اندر سے آئی تھی جو اس کے برابر کھڑی شوکیس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے پھولدار ریشمی چادر اوڑھ رکھی تھی اور بظاہر لاتعلق سی نظر آرہی تھی۔ لیکن درحقیقت وہ سعدیہ بیگم تھی اور موقع کی تلاش میں تھی۔ اس نے اپنے پرس میں کھلونا چڑیا رکھی ہوئی تھی جو وقفے وقفے سے چڑیا کی آواز نکالتی تھی۔

چڑیا کی آواز سُن کر اسد نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آواز کہاں سے آئی تھی۔

لمحہ بھر کے بعد دوبارہ آواز سنائی دی تو سعدیہ نے پرس پر ہلکا سا ہاتھ مارتے ہوئے کہا "چپ! بہت بھوک لگ رہی ہے؟"

یہ دیکھ کر اسد فوراً پرس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"بہت شریر چڑیا ہے۔" سعدیہ نے اسد سے کہا "ہر وقت چیں چیں کرتی رہتی ہے۔"

چڑیا کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔

"اس کے اندر چڑیا ہے؟" اسد نے پوچھا۔

"ہاں' بہت پیاری چڑیا ہے۔" سعدیہ نے کہا "باتیں بھی کرتی ہے۔"

"دکھائیں" اسد نے معصومیت سے کہا۔

"یہاں تو یہ اُڑ جائے گی۔" سعدیہ نے اسٹور کے اندر دیکھتے ہوئے کہا "آؤ" کار میں بیٹھ کر دیکھتے ہیں۔"

اسد متامل نظر آنے لگا' بولا "ممی مجھے شوکیس میں بند کردیں گی۔ پھر میں پُتلا بن جاؤں گا۔"

"ممی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ ویسے مجھے یہ چڑیا پسند نہیں ہے۔ میں اسے کسی اچھے سے بچّے کو دینا چاہتی ہوں۔"

"میں بھی اچھا بچّہ ہوں۔"

"تو پھر جلدی سے آجاؤ۔ میں یہ چڑیا ننھے سے پنجرے میں ڈال کر تمہیں دے دوں گی۔" سعدیہ نے کہا اور اپنی کار کی طرف بڑھی جو چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی۔

اسد چڑیا کے شوق میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ اس وقت شام کے ساڑھے سات بجے تھے اور اسٹریٹ لائٹس روشن ہوچکی تھیں۔ سعدیہ اپنی کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور اپنے پرس سے خوب صورت کھلونا چڑیا نکال کر اسد کو دکھائی جو دروازے میں رک گیا تھا۔ یہ بہت نازک لمحہ تھا۔ اگر فرزانہ بیگم کو بچّے کی گمشدگی کا پتا چل جاتا تو فوراً ایک شور مچ جاتا۔

"آجاؤ..." سعدیہ نے چڑیا اسد کی طرف بڑھائی جو چیں چیں کرتے ہوئے سہلا رہی تھی "یہ بہت اچھی چڑیا ہے۔ بچّوں سے بہت پیار کرتی ہے۔"

اسد جھجکتا ہوا کار کے اندر چلا گیا اور ڈرتے ڈرتے چڑیا ہاتھ میں لے لی۔ سعدیہ نے پرس کے اندر سے ایک سفید رومال نکالا اور اسے اس طرح اسد کے منہ پر رکھ دیا جیسے وہ اس کی ناک صاف کررہی ہو۔ رومال پر بے ہوشی کی دوا چھڑکی ہوئی تھی۔ چند ثانیوں کے اندر اسد کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ سعدیہ نے اسے سیٹ پر لٹا کر اوپر کپڑا ڈال دیا اور بڑے اطمینان سے ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھی۔

دو گھنٹے کے بعد وہ پشاور جانے والی خیبر میل میں سفر کررہی تھی۔ اس نے اپنی کار ریلوے اسٹیشن کے پارکنگ لاٹ میں ایسی جگہ پر کھڑی کردی تھی جہاں وہ دوسری گاڑیوں کے لئے رکاوٹ نہیں بن سکتی تھی۔

راستے میں اس نے اسد کے کپڑے تبدیل کردیے تھے اور اسے دو دفعہ ایسا دودھ پلایا تھا جس میں خواب آور دوا ملی ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بچّہ سارے راستے سوتا رہا تھا۔

قارئین کرام! اس سے آگے کا حال آپ ابتدا میں پڑھ چکے ہیں کہ کس طرح سعدیہ نے بچّے کو رحمت بی بی کے سُپرد کردیا تھا۔ اس نے سفر کے دوران میاں بیوی کی باتوں سے یہ اندازہ ضرور کرلیا تھا کہ مرد کا نام کریم بخش تھا اور وہ بھٹ کرنا ای گاؤں کا رہنے والا تھا۔

اگلے اسٹیشن پر پہنچ کر سعدیہ کو پتا چلا کہ تھوڑی دیر میں کراچی جانے والی گاڑی دوسرے پلیٹ فارم پر پہنچنے والی تھی۔ پس اس نے بکنگ آفس پر جاکر کراچی کا ٹکٹ خریدا اور دوسری گاڑی پر سوار ہوگئی جس نے اسے صبح کے نو بجے کراچی پہنچادیا۔ اس کی کار جوں کی توں پارکنگ لاٹ میں کھڑی تھی۔

راستے میں اس نے صبح کا اخبار خرید لیا جس میں اسد کے اغوا کی خبر صفحۂ اول پر چھپی تھی۔ پولیس کے مطابق بچّے کو تاوان کے لیے اغوا کیا گیا تھا اور واردات میں کسی منظم گروہ کا ہاتھ تھا۔

○☆○

اگرچہ پولیس نے چند گھنٹے کے اندر بچّے کو برآمد کرنے کا دعویٰ کیا تھا مگر دو مہینے گزرنے کے باوجود وہ بچّے کا سراغ لگانے میں ناکام رہے تھے اور چونکہ تاوان کا کوئی مطالبہ سامنے نہیں آیا تھا اس لیے یہ قیاس غلط قرار دے دیا گیا تھا کہ بچّے کو تاوان کے لیے اغوا کیا گیا تھا۔

تیسرے مہینے کے شروع میں سعدیہ نے سروری بیگم نامی ایک شاطر قسم کی عورت سے رابطہ قائم کیا۔ یہ عورت گھر گھر گھوم پھر کر رشتے کراتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں وہ چلتی پھرتی میرج بیورو تھی۔

سعدیہ نے سکینہ کے نام سے اپنا تعارف کرایا' پھر کہا "میں ایک چھوٹا سا کام کرانا چاہتی ہوں۔"

"کام چھوٹا ہو یا بڑا' سروری بیگم نے کبھی کسی کو مایوس نہیں کیا۔" سروری نے کہا "میرے پاس درجنوں لڑکوں کے رشتے موجود ہیں۔ ان میں ڈاکٹر' انجینئر اور سرکاری افسر سب ہی شامل ہیں۔"

"وہ... دراصل بات یہ ہے کہ......"

"ارے بی بی' اس میں شرمانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں لڑکیوں کے مسائل اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ تم خوب صورت ہو اور تمہاری عمر بھی زیادہ نہیں ہے۔ اگر کوئی ناکام شادی کا معاملہ ہے تو بے دھڑک بتادو' آج کل کے زمانے میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میرے پاس ایک بڑے اچھے سرکاری افسر کا رشتہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں پسند......"

"میرا مسئلہ کچھ اور ہے۔" سعدیہ نے اس کی بات کاٹی "میں شادی شدہ ہوں اور ایک سرکاری افسر کی بیوی ہوں۔"

"اچھا! پھر کیا مسئلہ ہے؟"

"مسئلہ یہ ہے کہ چند ماہ پہلے میرے ہاں تیسری بیٹی پیدا ہوئی ہے اور میرے شوہر کو بیٹا چاہیے۔ وہ آج کل ٹریننگ کے سلسلے میں بیرونِ ملک گیا ہوا ہے۔ جانے سے پہلے اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر اس دفعہ بھی بیٹی ہوئی تو وہ مجھے گھر سے نکال دے گا۔"

"اس کا تو اب کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔ جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ تمہاری بیٹی کی عمر کتنی ہے؟"

"چھ ماہ سے کچھ اوپر ہوگی۔"

"تمہارے شوہر نے بیٹی کی پیدائش پر کیا کہا ہے؟"

"اس کو ہم نے بتایا ہی نہیں کہ بیٹی ہوئی ہے۔ ڈر کی وجہ سے یہ اطلاع دی تھی کہ بیٹا ہوا تھا جو پیدائش کے چند گھنٹوں کے بعد فوت ہوگیا۔"

سروری بیگم نے بھویں سکیڑیں "کیا تمہارے سُسرال والوں کو کچھ پتا نہیں ہے؟"

"مم... میرے سُسرال والے اُدھر... پنجاب میں رہتے ہیں۔ منڈی بہاؤالدین میں۔ وہ دیہاتی لوگ ہیں۔ کراچی میں میرا میکہ ہے۔ اب پندرہ بیس روز کے بعد میرا شوہر واپس آرہا ہے۔ میں... اس کے آنے سے پہلے بیٹی کا کچھ انتظام کرنا چاہتی ہوں' اسی لیے آپ کے پاس آئی ہوں۔"

"کیا بیٹی کو یتیم خانے میں داخل کروانا چاہتی ہو؟"

"نہیں نہیں' خدا نہ کرے۔ یہ بات تو میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ دراصل مجھے پتا چلا ہے کہ ایک ایم پی اے صاحب کوئی بیٹی گود لینا چاہتے ہیں۔ ان کا نام سکندر علی خان ہے۔"

"یہ وہی سکندر علی خان تو نہیں' جن کا بیٹا دو ڈھائی مہینے پہلے اغوا ہوگیا تھا؟"

"ہاں' وہی ہیں۔ سنا ہے کہ ان کے تین بیٹے ہیں اور بیٹی کوئی نہیں ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ میری بیٹی کے لیے ان سے بات کریں۔ وہ خود تو شاید نہ ملیں' آپ کو ان کی بیگم سے بات کرنا پڑے گی۔ ان کا نام فرزانہ بیگم ہے۔ بہت بااخلاق اور ہمدرد خاتون ہیں۔ اگر انہوں نے میری بیٹی کو پسند کرلیا تو مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کو خوش کردیں گی۔"

یہ بات سن کر سروری بیگم دل میں خوش ہوگئی۔ اس نے سوچا کہ ایم پی اے کی بیگم سے دس بیس ہزار تو مل ہی جائیں گے۔

"میری خوشی کی بات چھوڑو۔" اس نے اپنی خوشی چھپاتے ہوئے کہا "تمہارا کام ہونا چاہیے۔ ایسا کرو کہ کل اپنی بیٹی کو میرے پاس لے آؤ۔ میں فرزانہ بیگم سے ملاقات کا وقت لینے کی کوشش کرتی ہوں۔ تمہارے پاس ان کا پتا اور فون نمبر ہوگا؟"

سعدیہ نے اپنے پرس سے ایک کاغذ نکال کر سروری بیگم کو دیا' بولی "اس پر فرزانہ بیگم کا پتا اور فون نمبر لکھا ہوا ہے۔"

سروری بیگم نے پتا اور فون نمبر اپنے رجسٹر میں لکھ لیا۔

O☆O

فرزانہ بیگم نے حیرت اور دلچسپی سے سروری کی بات سُنی پھر نادیہ کو گود میں لے کر دیکھا۔ وہ بھولی بھالی اور خوب صورت بچی اسے بہت اچھی لگی۔ ایک حیرت انگیز بات اس نے یہ محسوس کی کہ اس بچی میں اس کے گمشدہ بیٹے اسد کی جھلک پائی جاتی تھی۔ وہ اس مماثلت کو محض اتفاق سمجھ رہی تھی کیوں کہ وہ اس حقیقت سے بے خبر تھی کہ وہ اس کے شوہر کی بیٹی تھی۔

"سروری' یہ تو صحیح ہے کہ ہماری کوئی بیٹی نہیں ہے۔" اس نے کہا "لیکن ہم نے کسی پرائی بچی کو گود لینے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ اس بچی کے ماں باپ کا کیا نام ہے؟"

"بیگم صاحبہ' یہ بات راز میں رہے گی۔" سروری نے کہا "جو فیملی اس بچی کو گود میں لے گی اسے اس کے ماں باپ کے بارے میں نہیں بتایا جائے گا اور بچی کے ماں باپ کو گود لینے والی فیملی کے بارے میں نہیں بتایا جائے گا۔"

فرزانہ بیگم نے مسکرا کر بچی کی طرف دیکھا جو اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کے چہرے کو پکڑنے کی کوشش کررہی تھی۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" اس نے کہا "اس طرح کوئی مسئلہ نہیں پیدا ہوگا۔ نہ اس بچی کے لیے اور نہ دونوں خاندانوں کے لیے۔ اس کا نام کیا بتایا ہے تم نے؟"

"مہرالنساء" سروری نے نادیہ کا نام بھی بدل دیا تھا "ویسے اگر آپ چاہیں تو کوئی اور نام بھی رکھ سکتے ہیں۔"

"تم تو ایسے بات کررہی ہو جیسے میں نے بچی کو گود لینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔" فرزانہ بیگم نے کہا۔ تاہم حقیقت یہ تھی کہ اسے وہ بچی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ بالکل گڑیا سی۔

"ایک بات اور بھی ہے۔" سروری نے کہا "اس بچی کا باپ انصاری خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔"

"اچھا!" فرزانہ بیگم نے دلچسپی سے کہا "انصاری تو ہم بھی ہیں۔"

"بیگم صاحبہ' کئی بے اولاد جوڑے اس بچی کو گود لینے کے لیے تیار ہیں۔" سروری نے چالاکی سے کہا "ایک جوڑے نے بیس ہزار روپے کی آفر بھی دی ہے لیکن بچی کی ماں بھی... اور میں بھی یہ چاہتی ہوں کہ اس کی پرورش کسی اچھے خاندان میں ہو اور اس وقت میری نظر میں آپ سے اچھا خاندان اور کوئی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس بچی کا حسب نسب بھی آپ سے ملتا ہے۔"

یہ دلائل بڑے مؤثر ثابت ہوئے اور فرزانہ بیگم تقریباً راضی ہوگئی "تمہیں دو دن تک انتظار کرنا پڑے گا۔" اس نے کہا۔ "سکندر صاحب اسلام آباد گئے ہوئے ہیں اور دو روز کے بعد واپس آجائیں گے۔"

"بیگم صاحبہ' میں تو دو مہینے بھی انتظار کرسکتی ہوں لیکن اس کی ماں بہت جلدی میں ہے۔ اس کا شوہر کل جرمنی سے واپس آرہا

ہے۔ وہ اس کے آنے سے پہلے پہلے بچّی کا انتظام کرنا چاہتی ہے کیوں کہ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ شوہر کو بچّی کا علم نہیں ہے۔ اسے یہی بتایا گیا تھا کہ بیٹا ہوا تھا جو چند گھنٹوں کے بعد فوت ہوگیا تھا۔"

فرزانہ بیگم نے پہلی بار بچّی کو پیار کیا اور اس کے چہرے پر نظریں جما کر سوچنے لگی۔

"میں ایک کام کر سکتی ہوں۔" سروری نے مزید کہا "اس بچّی کو عارضی طور پر کسی دوسرے جوڑے کے سُپرد کردیتی ہوں۔ تین چار روز کے بعد آپ سے دوبارہ آکر پوچھ لوں گی۔" اس نے بچّی کو لینے کے لیے ہاتھ پھیلائے۔

فرزانہ بیگم کا دل نہیں چاہا کہ بچّی کو واپس کرے۔ اس نے قدرے توقف کے بعد کہا "عارضی طور پر تو میں بھی رکھ سکتی ہوں۔ کیا تمہیں کچھ پیسے بھی دینے پڑیں گے؟"

سروری نے دل میں کہا "آج کل پیسے کے بغیر کوئی شخص ایک تنکا بھی نہیں دیتا۔ اس دنیا کا سارا کاروبار ہی پیسے پر چل رہا ہے" پھر اونچی آواز سے کہا "بیگم صاحبہ' بچّی کی کوئی قیمت نہیں ہے لیکن میری خدمات کے صلے میں آپ جو مناسب سمجھیں دے دیں۔ میرا اصل کام رشتے کرانا ہے۔ کبھی کبھی کوئی ایسا کام بھی آجاتا ہے جس میں چار پیسے زیادہ مل جاتے ہیں۔"

فرزانہ بیگم کو بچّی پسند آگئی تھی اور اس نے اسے رکھنے کا فیصلہ بھی کرلیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ شوہر اس کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔ وہ اندر گئی اور پچیس ہزار روپے لاکر سروری کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ پھر اس نے احتیاطاً سروری کا پتا نوٹ کرلیا اور رسید بھی لکھوالی۔

○☆○

سعدیہ' سروری کے گھر میں انتظار کررہی تھی۔ وہ توقع کررہی تھی کہ فرزانہ بیگم' بچّی کو قبول کرلے گی تاہم اسے پورا یقین نہیں تھا۔ بڑے لوگوں کا کیا بھروسا' ان کی طبیعت چاہے تو سونے کے بھاؤ مٹی خرید لیں اور طبیعت نہ چاہے تو مٹی کے بھاؤ سونا خریدنے سے انکار کردیں۔

اگرچہ سعدیہ نے پیسوں کی کوئی بات نہیں کی تھی تاہم وہ سروری کو ایک ہزار روپے دینے کا ارادہ رکھتی تھی۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد جب سروری خالی ہاتھ گھر میں داخل ہوئی تو سعدیہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ گویا کام ہوگیا تھا۔

"بھئی' بہت محنت کرنا پڑی۔" سروری صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی "ممبر صاحب کی بیگم کسی طرح سے راضی نہیں ہورہی تھی۔ اللہ معافی دے' آج مجھے بہت سارا جھوٹ بولنا پڑا۔"

"اچھا!" سعدیہ نے آنکھیں پھیلائیں۔

"جب وہ کسی طور پر راضی ہوتی دکھائی نہ دی تو میں نے کہہ دیا کہ بچّی انہی کی ذات برادری سے تعلق رکھتی ہے۔ پھر کہا کہ ایک بے اولاد جوڑا بچّی کے لیے بیس ہزار روپے دینے پر تیار ہے اور معاملہ ہر صورت میں آج ہی نمٹانا ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر کیا ہونا تھا' اس نے بچّی کو رکھ لیا۔"

"سروری بیگم' میں نے آپ کے ساتھ کوئی بات طے نہیں کی تھی....." سعدیہ نے پیسے دینے کے ارادے سے تمہید باندھی۔

"فکر نہیں کرو۔" سروری نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اپنا پرس کھولا "میں نے کبھی بے اصولی نہیں کی۔ میں کاروباری عورت ہوں اور لوگ مجھ پر بھروسا کرتے ہیں۔ یہ لو۔" اس نے پانچ ہزار روپے گن کر سعدیہ کو دیے "یہ تمہارا حصہ ہے۔ رکھ لو اور رکھ لو' میں تم پر کوئی احسان نہیں کررہی اور نہ ہی میں نے تمہاری بچی کا سودا کیا ہے۔ میں نے بیگم سکندر کو صاف بتادیا تھا کہ میں اپنے کام کی فیس ضرور لیتی ہوں۔ اس فیس میں سے یہ تمہارا حصہ ہے۔ آئندہ بھی اگر ایسا کوئی مسئلہ ہو تو میرے پاس آجانا۔"

سعدیہ نے پیسے تو لے لیے مگر یہ بات اسے اچھی نہیں لگی۔ وہ یوں محسوس کررہی تھی جیسے اپنی بچی کی قیمت وصول کررہی ہو۔

○☆○

سکندر علی ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد گیا تھا مگر بعض اہم معاملات کی وجہ سے دو ہفتے سے زیادہ لگ گئے۔ جب اس کی کار بنگلے میں داخل ہوئی تو اس نے لان میں دو بچوں کو کھیلتے دیکھا۔ ایک تو اس کا بیٹا ظفر تھا جس نے حال ہی میں پاؤں پاؤں چلنا شروع کیا تھا۔ دوسری ایک خوب صورت بچّی تھی جو ایک چھوٹی سی بے بی ٹرالی میں بیٹھی ہوئی تھی۔

سکندر علی یہ سوچ سکتا تھا کہ وہ کسی مہمان کی بچّی ہوگی لیکن بچّی کی شکل و صورت نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا۔ وہ کار سے اُتر کر لان میں گیا اور آیا سے بچّی کے بارے میں دریافت کیا۔ اسے بچّی کے نقوش میں اپنا عکس نظر آرہا تھا۔

آیا اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے فرزانہ بیگم کی طرف دیکھنے لگی جو برآمدے کی سیڑھیاں اُتر کر لان کی طرف آرہی تھی۔

"بچی پسند آئی؟" اس نے قریب پہنچ کر کہا۔

"بچی!" سکندر علی نے بھویں سکیڑیں "کس کی بچی؟"

"اسے اپنی ہی بچی سمجھو۔ اس کا نام شہزادی مہرالنساء ہے۔" فرزانہ بیگم نے بچّی کو گود میں اٹھالیا "ہے نا خوب صورت؟"

بچّی چند لمحوں تک سکندر علی کی طرف دیکھتی رہی پھر دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف جھکی۔

"لو جی' اس نے تو پہلی ہی نظر میں آپ کو پسند کرلیا ہے۔ کیسی بے چین ہورہی ہے آپ کے پاس آنے کے لیے۔"

"یہ کون ہے؟ کس کی بچی ہے؟"

"یہ ایک بدبخت شخص کی بچی ہے۔ اس سے پہلے اس کی دو

بیٹیاں تھیں۔ اس نے اپنی بیوی کو دھمکی دی تھی کہ اگر تیسری بیٹی ہوئی تو وہ اسے گھر سے نکال دے گا۔ بیوی نے شوہر کی دھمکی کے باعث اپنی بیٹی ہمیں دے دی اور شوہر کو' جو ان دنوں جرمنی میں ہے' یہ اطلاع بھجوادی کہ اس کے ہاں مردہ بیٹا پیدا ہوا تھا۔"

سکندر علی کو اس کہانی پر یقین نہیں آیا۔ اس نے برہمی سے کہا "تمہیں اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔"

"اچھا!" فرزانہ بیگم نے تیوری چڑھائی "اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اس بچی کا گلا گھونٹ دوں یا اسے جمعدار کو دے دوں؟"

"اس کی ماں کا نام کیا ہے؟" سکندر علی نے پوچھا۔ اسے یہ شک ہو گیا تھا کہ مہرالنساء' سعدیہ کی بیٹی تھی۔

"اس بچی کو سروری نامی ایک عورت لائی تھی۔ اس نے اس کے ماں باپ کا نام نہیں بتایا۔ وہ ہمارا نام بھی اس کے ماں باپ کو نہیں بتائے گی۔ اس طرح مستقبل میں بچی کے لیے کوئی نفسیاتی مسئلہ نہیں ہو گا۔"

"یہ بچی اغوا شدہ یا کسی کی... ناجائز اولاد بھی ہو سکتی ہے۔"

"میرے پاس سروری کا پتا موجود ہے۔ وہ شریف عورت ہے اور رشتے ناتے کا کام کرتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اغوا شدہ لڑکیاں شرفا کے گھروں میں نہیں لائی جاتیں۔ ویسے آپ بے شک انکوائری کروالیں' مجھے یقین ہے کہ آپ کا اندیشہ غلط ثابت ہو گا۔"

مہرالنساء نے ایک بار پھر سکندر علی کی طرف ہاتھ پھیلائے۔ خون کا رشتہ جوش مار رہا تھا۔ سکندر علی نے بھی اپنے سینے میں بچی کے لیے تڑپ محسوس کی اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے گود میں لے لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے عجیب سی طمانیت محسوس کی۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ اس کی بیٹی تھی۔ بچی اس کے منہ' آنکھوں اور ناک کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگی۔

"تم نے اس کا نام کیا بتایا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"مہرالنساء"

"پہلے تم نے کچھ اور نام بتایا تھا۔"

"میں اسے پیار سے شہزادی کہتی ہوں۔ شہزادی مہرالنساء۔ کیسا نام ہے؟"

"نام تو برا نہیں لیکن یہ تم نے مسئلہ پال لیا ہے۔ اس وقت یہ معصوم اور بھولی بھالی ہے' اس لیے تمہیں اچھی لگتی ہے۔ جب تمہاری اپنی بیٹی ہو جائے گی تو یہ تمہیں اتنی اچھی نہیں لگے گی پھر تم اس کے ساتھ انصاف نہیں کر سکو گی۔"

فرزانہ بیگم باتوں سے زیادہ شوہر کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے اس کے ردِعمل کا اندازہ کرنے کے لیے کہا "تو ایسا کرتے ہیں کہ اسے ملازمہ کو دے دیتے ہیں۔ اس کی کوئی اولاد نہیں ہے' وہ بہت خوش ہو گی۔"

سکندر علی کو یہ تجویز اچھی نہیں لگی بلکہ بہت بری لگی' بولا "یہ کسی اچھے گھر کی بچی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں کچھ سوچنا پڑے گا۔"

اس نے مہرالنساء کو اپنی بیگم کی گود میں دے دیا اور اپنے گمشدہ بچے کے بارے میں سوچنے لگا جو سیکیورٹی ایجنسیوں کی مشترکہ کوششوں کے باوجود بازیاب نہیں ہو سکا تھا۔

○☆○

اگلے روز دن کے تین بجے سعدیہ' سکندر علی کے دفتر میں داخل ہوئی۔ وہ خوب بن سنور کر آئی تھی اور بڑی پُرکشش لگ رہی تھی۔ اس کی ٹیبل پر ایک نوخیز حسینہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ٹائپ رائٹر سے ہاتھ روک کر سعدیہ کی طرف دیکھا اور اس کی آمد کا مقصد پوچھا۔

"میرا نام سعدیہ عظیم ہے۔" سعدیہ نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا "میں سکندر صاحب سے ملنا چاہتی ہوں۔"

سیکریٹری نے اپنی ڈائری دیکھی اور بولی "صاحب اپائنٹ منٹ کے بغیر کسی سے نہیں ملتے۔"

سعدیہ مسکرا کر بولی "میں بھی یہی کہا کرتی تھی۔"

"جی!" سیکریٹری نے اپنی خوب صورت بھویں پھیلائیں۔

"تم سے پہلے میں اس سیٹ پر کام کرتی تھی۔"

"اوہ۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں صاحب سے پوچھتی ہوں۔"

سیکریٹری نے انٹرکام کا بٹن دبایا اور کہا "سر' مس سعدیہ عظیم آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ اوکے سر۔" اس نے انٹرکام بند کر دیا اور سعدیہ سے کہا "جائیے"

سعدیہ اپنے سابق باس کے شاندار دفتر میں داخل ہوئی اور سلام کرنے کے بعد کہا "سر' ممبر بننا مبارک ہو۔"

"بیٹھو" سکندر علی نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے چہرے پر زبردست سنجیدگی نظر آ رہی تھی۔

سعدیہ کرسی پر بیٹھ گئی اور بولی "آپ میرے آنے سے خوش نہیں ہوئے؟"

"میں تمہاری شادی اور بچے کے بارے میں سننا چاہتا ہوں۔"

سعدیہ کے لیے یہ سوال غیر متوقع نہیں تھا اور اس نے اس کا جواب بھی سوچ رکھا تھا' بولی "مجھے طلاق ہو گئی ہے۔ شوہر کو بچی کے بارے میں شک ہو گیا تھا۔"

"بچی کہاں ہے؟" سکندر علی نے برہمی سے پوچھا۔

"شاید آپ کو میرا آنا اچھا نہیں لگا۔" سعدیہ اٹھنے کا ارادہ کرتے ہوئے بولی "سوری! میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔"

"رکو" سکندر علی کا لہجہ اور زیادہ سخت ہو گیا "میں نے پوچھا ہے کہ بچی کہاں ہے؟"

"سر' میں بڑے ادب سے کہوں گی کہ آپ کو یہ سوال کرنے کا

کوئی حق نہیں ہے۔" سعدیہ کھڑی ہو گئی "کیوں کہ جس بچی کے بارے میں آپ سوال کر رہے ہیں' اسے آپ نے قتل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔"

"اور تم نے میرے مشورے پر عمل کرنے کے بجائے اپنی بچی کو دھوکے سے میری بیگم کے حوالے کر دیا۔ میں پوچھتا ہوں' اس حرکت سے تمہارا مقصد کیا ہے؟"

"سکندر صاحب' میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔ میں نے آپ کے بنگلے میں کبھی قدم نہیں رکھا۔"

"لفظوں کا ہیر پھیر مت کرو۔ تم خود بنگلے پر نہیں گئیں' کسی عورت کے ذریعے بچی کو میری بیگم کے پاس بھیجا تھا۔ میں اندھا نہیں ہوں۔ اس بچی کے نقوش مجھ سے بہت ملتے ہیں۔"

"سر' بات یہ ہے کہ میں نے اپنی بچی ایک بے اولاد عورت کو دے دی تھی۔" سعدیہ نے جھوٹ بولا۔ وہ سکندر علی کی الجھن سے لطف اندوز ہو رہی تھی "کیوں کہ میں بچی کی پرورش نہیں کر سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ اس عورت نے بچی کو آپ کی بیگم صاحبہ کے ہاتھ فروخت کر دیا ہو۔ اگر آپ کو یقین ہے کہ وہ آپ ہی کی بچی ہے تو اب آپ اپنی خواہش کو آسانی سے عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میرا مطلب ہے کہ بچی کا گلا گھونٹ دیجیے۔"

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے! تم مجھے ایک معصوم بچی کے قتل کا مشورہ دے رہی ہو؟"

"میں آپ کو آپ ہی کا مشورہ یاد دلا رہی ہوں۔ اس وقت بچی آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ اس وقت وہ میرے وجود کا حصہ تھی۔"

"سعدیہ' میں اس وقت بہت بااختیار آدمی ہوں۔ میرے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ مجھے دھوکا دینے والا بچ کر نہیں جا سکتا۔"

"سر' میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔" سعدیہ نے اطمینان سے کہا۔ "نہ ہی آپ کو دھوکا دیا ہے۔ لیکن آپ کے سامنے سب راستے کھلے ہیں۔ آپ مجھے قتل کروا سکتے ہیں' جیل میں بند کروا سکتے ہیں' بدمعاشوں کے حوالے کروا سکتے ہیں اور ہر قسم کی اذیت دے سکتے ہیں۔ لیکن ایک مفاہمت کا راستہ بھی ہے۔ آپ مجھے اپنی بیوی بنا کر بھی رکھ سکتے ہیں۔ میں ہر مصیبت برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"ایک راستہ اور بھی ہے۔ بچی کو اپنے پاس رکھو اور ماں بن کر اس کی پرورش کرو۔ مجھے یاد ہے کہ یہاں سے جاتے وقت تم نے بھی یہی کہا تھا۔ میں تمہاری کچھ مدد کر دیا کروں گا۔"

"اس وقت میرا دماغ ٹھکانے پر نہیں تھا۔ جو بچی آپ کے پاس ہے' اگر وہ میری ہی بچی ہے تو اسے بے شک میرے حوالے کر دیں لیکن یہ میرا مسئلہ ہے کہ مجھے اس کے ساتھ کیا کرنا چاہیے۔ میں اسے سمندر میں پھینکوں یا کسی یتیم خانے میں داخل کرا دوں۔"

اگر سکندر علی نے بچی کو نہ دیکھا ہوتا' اسے سینے سے نہ لگایا ہوتا تو شاید وہ یہ کہتا کہ میری طرف سے اسے جہنم میں ڈال دو۔ لیکن اب یہ بات اس کے لیے ممکن نہیں تھی۔ اس نے غصے سے پوچھا۔ "تم چاہتی کیا ہو؟"

"میں آپ کو مبارک باد دینے اور جاب کے بارے میں پوچھنے آئی تھی۔"

"نہیں' میرا خیال ہے کہ تم میرا مذاق اُڑانے آئی تھیں!"

سعدیہ موضوع بدلتے ہوئے بولی "میں نے اخبار میں آپ کے بیٹے کی گمشدگی کے بارے میں پڑھا تھا۔ اس کا کچھ پتا چلا؟"

اسد کے ذکر سے سکندر علی اداس ہو گیا۔ اسد کو وہ اپنے تینوں بیٹوں سے زیادہ چاہتا تھا۔ اس کو یاد کر کے اس کے دل پر چوٹ سی لگتی تھی۔

"اسد کا ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا۔" اس نے جواب دیا "پولیس کا خیال ہے کہ اس کے اغوا میں کسی سیاسی مخالف کا ہاتھ ہے۔ اگر کسی ڈاکو نے یہ واردات کی ہوتی تو وہ تاوان کا مطالبہ ضرور کرتا۔" وہ افسردگی سے مسکرانے لگا "شاید تمہیں ایک بات معلوم نہیں ہوگی۔ مہر النساء کی شکل اسد سے بہت ملتی جلتی ہے۔"

"مہر النساء کون ہے؟" سعدیہ کی حیرت اصلی تھی۔

"کیا تمہاری بچی کا نام مہر النساء نہیں ہے؟"

"میری بچی! کیا وہ آپ کی بچی نہیں ہے؟" سعدیہ نے کہا "اور میں نے اس کا نام نادیہ رکھا تھا۔"

"نام سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ممکن ہے کہ نام اس عورت نے تبدیل کر دیا ہو جو بچی کو لے کر ہمارے بنگلے میں آئی تھی۔ میری بیگم کو یہ نام بہت پسند آیا ہے۔ وہ اسے شہزادی مہر النساء کہتی ہے۔"

سعدیہ یہ بات سن کر خوش ہو گئی۔ اس نے کہا "سر' پھر تو آپ کو بہت خوش ہونا چاہیے۔ بچی کی وجہ سے آپ اسد کی جدائی کا غم بھول جائیں گے۔"

"مجھے آج کی نہیں' مستقبل کی فکر ہے۔ اگر ہماری ایک دو بیٹیاں ہو گئیں تو مہر النساء میری بیگم کی نظروں سے گر جائے گی اور کوئی عجب نہیں کہ وہ اسے نوکر سمجھنے لگ جائے۔"

"سر' میرے مستقبل کا کیا ہوگا؟ ایک مشکوک بچی کی وجہ سے کون میرے ساتھ شادی کرے گا؟"

"کیا تم نے یہ نہیں کہا تھا کہ بچے کی خاطر تم ساری زندگی ایسے ہی گزار دو گی؟"

"کہا تو اور بھی بہت کچھ تھا مگر آپ نے میری کسی بات کو قابلِ توجہ نہیں سمجھا۔" سعدیہ نے کہا۔ وہ ہنوز کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی "مجھے اجازت ہے؟"

"ایسا کرو' پرسوں مجھے دوبارہ ملو۔ اس مسئلے کا کوئی حل سوچنا

پڑے گا۔"

"میں اس مسئلے پر بہت سوچ چکی ہوں۔ اب آپ کے سوچنے کی باری ہے۔" سعدیہ نے کہا اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئی۔

○☆○

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہتا ہے۔ کسی کو اس کی رفتار بہت تیز اور کسی کو بہت سُست محسوس ہوتی ہے لیکن اس میں کبھی وقفہ نہیں آتا' وقت گزرتا ہی چلا جاتا ہے۔

اسد علی کی گمشدگی کا واقعہ پچیس سال پرانا ہو چکا تھا لیکن سکندر علی کے گھر میں اس کا ذکر کبھی موقوف نہیں ہوا تھا۔ اس عرصے میں اس کے ہاں دو بیٹیاں اور ایک بیٹا پیدا ہوا تھا۔ اس طرح مہرالنساء کو ملا کر اس کی تین بیٹیاں اور تین بیٹے ہو گئے تھے۔ ان میں سے چار بچوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور وہ سب بچوں والے ہو گئے تھے۔

سکندر علی نے سیاست اور کاروبار میں بہت ترقی کی تھی۔ اس کے بیٹے اور داماد فیکٹریوں کے مالک تھے۔ وہ اپنے علاقوں سے اسمبلیوں کے ممبر بھی منتخب ہوتے رہتے تھے اور مختلف وزارتوں پر بھی فائز چلے آ رہے تھے۔

سکندر علی خود بھی صوبائی اور وفاقی وزیر رہ چکا تھا۔ ان ساری کامیابیوں کے دوران اسے اسد علی بہت یاد آتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس یقین کا اظہار کرتا رہتا تھا کہ اسد علی زندہ تھا۔ اس کی بیگم کا بھی یہی خیال تھا۔ دونوں کئی دفعہ اسے خواب میں دیکھ چکے تھے۔ پچیس سال گزرنے کے باوجود وہ اس کی تلاش جاری رکھے ہوئے تھے۔ اسد علی کو اس کے وہ بہن بھائی بھی بہت یاد کرتے رہتے تھے جو اس کی گمشدگی کے بعد پیدا ہوئے تھے۔

ڈرائنگ روم میں اسد کی ایک قدِ آدم تصویر آویزاں تھی جو سکندر علی نے کراچی کے بہترین آرٹسٹ سے بنوائی تھی اور ظاہر ہے کہ وہ اسد کے بچپن کی تصویر تھی۔ ایک دو سالہ بھولے بھالے اسد کی تصویر جو خاندان کے ہر فرد کے دل و دماغ پر نقش تھی۔

سکندر علی کے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں اس تصویر کے بارے میں پوچھتے اور جب انہیں بتایا جاتا کہ وہ ان کے چچا اور ماموں کی تصویر تھی تو وہ بہت حیران ہوتے اور زیادہ غور سے تصویر کو دیکھنے لگتے۔

اس تصویر کی وجہ سے ملاقاتی بھی اسد کا ذکر کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے اور جب سکندر علی' اسد کے زندہ ہونے کی بات کرتا تو ملاقاتی چپ سے ہو جاتے۔ وہ اسد علی کے زندہ ہونے کو محض ایک موہوم سی خواہش سمجھتے تھے۔

○☆○

لیکن اسد علی زندہ تھا اور بہت مطمئن زندگی گزار رہا تھا۔ وہ کریم بخش اور رحمت بی بی کو اپنے والدین سمجھتا تھا۔ کریم بخش نے اس کی شادی اپنی بہن کی بیٹی سے کر دی تھی جس کا نام شاداں تھا۔

تاہم اسد علی نے اس کا نام ارشاد بی بی رکھ دیا تھا۔ اس کے دو بچے تھے۔ ایک بیٹی تھی' جس کا نام مریم اور عمر سات سال تھی۔ ایک بیٹا تھا جس کا نام یوسف اور عمر چار سال تھی۔

اسد علی جو بھٹ کر نامی قصبے میں امیر بخش کے نام سے مشہور تھا' اس علاقے میں بہت نمایاں حیثیت کا مالک تھا۔ اس نے انٹر تک تعلیم حاصل کی تھی اور قصبے کے واحد سیکنڈری اسکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ اس نے خود بھی اسی اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ میٹرک اور انٹر کا امتحان اس نے پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے پاس کیا تھا۔

وہ بھٹ کر کا سب سے زیادہ تعلیم یافتہ شخص تھا اور لوگ پیچیدہ معاملات کے سلسلے میں اس کے پاس مشورہ کرنے آتے تھے۔ شام کے وقت وہ اپنے گھر کے سامنے چند چارپائیاں ڈال دیتا اور قصبے کے لوگ اس کی پُرحکمت باتیں سننے کے لیے وہاں جمع ہو جاتے۔ اس عوامی محفل میں ہر شخص شامل ہو سکتا تھا۔ اس محفل میں آپس کے دکھ درد کی باتیں بھی ہوتی تھیں اور ہنسی مذاق بھی ہوتا تھا لیکن کسی کی تضحیک اور چغلی کی اجازت نہیں تھی۔ غرضیکہ اسد علی اس قصبے میں نہایت سادہ اور پُراطمینان زندگی گزار رہا تھا۔

کریم بخش ایک معمولی زمیندار تھا۔ اس کے گھر میں جدید دور کی آسائشیں نہیں تھیں۔ اسد علی کی تنخواہ بہت تھوڑی تھی۔ ایک سیکنڈری اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی تنخواہ کلرک کی تنخواہ سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن ان کے گھر میں قناعت اور اطمینان کی دولت تھی جس کی لذت لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتی۔

لیکن ایک دن اسد علی کی اس پُرسکون زندگی میں ایک چھوٹی سی لہر اٹھی جو رفتہ رفتہ طوفان کی شکل اختیار کرتی چلی گئی۔

وہ موسم بہار کے دن تھے اور بھٹ کر کے قریبی جنگل میں چند شکاریوں نے ڈیرا لگا رکھا تھا۔ اسد علی کو اطلاع ملی کہ وہ لوگ بڑی تعداد میں تلور اور دیگر نایاب پرندوں کا شکار کر رہے ہیں۔ یہ اطلاع ملتے ہی وہ چند معززین کو ساتھ لے کر شکاریوں کے ڈیرے پر پہنچ گیا۔

شکاری تعداد میں کُل پانچ تھے۔ ان کے پاس ایک لینڈ روور اور ایک ڈبل کیبن مزدا پک اپ تھی۔ اس وقت شام ہو رہی تھی اور تمام شکاری ڈیرے پر موجود تھے۔ بھٹ کر کے دو دیہاتی شکار کیے ہوئے جانور صاف کر رہے تھے۔ اسد علی کو دیکھ کر وہ احتراماً کھڑے ہوئے اور جھک کر سلام کیا۔

تین شکاری خیمے سے باہر آ گئے۔ دو نے کندھوں پر شاٹ گنیں لٹکا رکھی تھیں۔ تیسرا جو عمر میں دونوں سے بڑا تھا' خالی ہاتھ تھا۔ اس نے شکاریوں والا خاکی سوٹ پہن رکھا تھا۔ تینوں ناگواری سے اسد علی اور اس کے ساتھیوں کو دیکھنے لگے۔

"میرا نام امیر بخش ہے۔" اسد علی نے اپنا تعارف کرایا۔

"میں بھٹ کرکے سیکنڈری اسکول کا ہیڈ ماسٹر ہوں۔" اس نے سلام کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن شکاریوں نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظرانداز کردیا۔

"کام کی بات کرو۔" بڑے شکاری نے کہا "کیا چاہیے؟"

"آپ اپنا تعارف نہیں کرائیں گے؟"

"مجھے مراد شاہ کہتے ہیں۔" بڑے شکاری نے کہا "تم شاید اپنے اسکول کے لیے کوئی چندہ وغیرہ مانگنے آئے ہو۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔" اسد علی ان کے استہزائیہ رویّے کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا "ہمارا اسکول سرکاری ہے اور ہم اس کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ ہمیں پتا چلا ہے کہ آپ یہاں نایاب جانوروں کو بلا مقصد ضائع کررہے ہیں۔"

"پھر تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں آپ سے یہ گزارش کرنے آیا ہوں کہ آپ ایسا نہیں کریں۔ یہ نایاب پرندے ہمارا قومی سرمایہ ہیں۔ ان کا تحفظ ہم سب کا فرض ہے۔"

"اچھا!" مراد شاہ کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ نمودار ہوگئی "تم بچّوں کے ہیڈ ماسٹر ہو یا جنگلی جانوروں کے؟"

"دیکھیے جناب، میرے پاس کوئی اختیار یا طاقت نہیں ہے۔" اسد علی نے شستہ لہجے میں کہا "میں صرف ایک نیک مشورہ دینے آیا ہوں۔ یہ ملک ہم سب کا مشترکہ گھر ہے۔ اس کی حفاظت ہمارا اجتماعی فرض ہے۔ آپ کو میری بات کا برا نہیں ماننا چاہیے۔"

اسد علی بول رہا تھا اور مراد شاہ بھویں سکیڑ کر اسے گھور رہا تھا۔ اتفاق کی بات یہ تھی کہ مراد شاہ، اسد علی کے بڑے بھائی منور علی کا دوست تھا اور ان کے خاندانی حالات سے اچھی طرح واقف تھا۔ جو بات اسے حیران کررہی تھی وہ یہ تھی کہ بھٹ کرکے اس ہیڈ ماسٹر کی شکل منور علی سے بہت ملتی جلتی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ منور علی کا چھوٹا بھائی بچپن میں گم ہوگیا تھا۔

"ہیڈ ماسٹر صاحب، آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں بھٹ کرکا رہنے والا ہوں۔" اسد علی نے کہا "یہ غریبوں کی ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ اس میں زیادہ تر کسان رہتے ہیں۔ میری درخواست ہے کہ جانے سے پہلے آپ ہمیں مہمان نوازی کا موقع ضرور دیں۔"

"آپ کا لب و لہجہ دیہاتیوں والا نہیں ہے۔"

"میں تھوڑا سا پڑھا لکھا بھی ہوں۔ ویسے میری پیدائش ایک شہر میں ہوئی تھی۔ آپ اتنے حیران کیوں ہورہے ہیں؟"

"آپ کی شکل میرے ایک دوست سے ملتی ہے اور وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ اسمبلی کا ممبر ہے۔"

"یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ہر شخص کا کوئی نہ کوئی ہم شکل ضرور ہوتا ہے لیکن یہ مشابہت صرف سطحی ہوتی ہے، اندر سے ہر آدمی مختلف ہوتا ہے۔"

"تعجب کی بات یہ ہے کہ منور علی کا ایک چھوٹا بھائی بچپن میں گُم ہوگیا تھا۔ یہ پچیس چھبیس سال پرانی بات ہے۔ اس کا نام اسد علی تھا اور اس کی عمر اس وقت دو سال تھی۔"

یہ سن کر اسد علی الجھن کا شکار ہوگیا۔ اگرچہ کریم بخش اور رحمت بی بی نے نہایت محبت اور شفقت سے اس کی پرورش کی تھی لیکن اس بارے میں وہ ہمیشہ شک کا شکار ہی رہا تھا۔ وہ خود کو کسی اور دنیا اور خاندان کا فرد محسوس کرتا تھا لیکن چونکہ وہ اپنے حالات سے بہت مطمئن تھا اس لیے اس نے اس معاملے میں کبھی چھان بین نہیں کی تھی۔

"شاہ صاحب، کہاں اسمبلی ممبر اور کہاں ایک معمولی اسکول کا ہیڈ ماسٹر! میرے والدین زندہ ہیں اور اسی بستی میں رہتے ہیں۔" اس نے کہا "شکل و صورت کی مشابہت اتفاقیہ بات معلوم ہوتی ہے۔"

بیس برس پہلے کی بات ہے، راولپنڈی کی مال پر اتوار کو چھٹی کے روز پُرانی کتابوں والے اپنے عارضی اسٹال لگایا کرتے تھے جہاں ان دنوں آٹھ آنے فی کتاب کے حساب سے بہت اچھی اچھی کتابیں مل جاتی تھیں۔ اُردو کے مشہور مزاح نگار اور میرے محترم بزرگ دوست شفیق الرحمان ان کے مستقل گاہک ہیں، ان کے ساتھ میں اور عطاء الحق قاسمی بھی کتابیں دیکھ رہے تھے۔ اچانک عطا نے مجھے کہنی مارتے ہوئے ایک کتاب کی طرف اشارہ کیا جو اس زمانے میں راتوں کی نیندیں حرام کردینے والا شاہکار سمجھی جاتی تھی۔ میں نے شفیق صاحب کی طرف دیکھا مگر وہ چند قدم آگے کسی اور کتاب کا پوسٹ مارٹم کررہے تھے۔ عطا نے جلدی سے کتاب اٹھاتے ہوئے دُکان دار سے کہا۔

"کتنے پیسے؟"

اُس نے حساب کے ساتھ بننے والی قیمت سے چھ گُنا زیادہ پیسے بتائے۔

عطاء نے کہا "یہ کیوں مہنگی ہے بھئی؟"

اس پر دُکان دار شرارتی نظروں سے عطاء کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ کو نہیں پتا!"

امجد اسلام امجد کے تازہ سفرنامے
"ریشم ریشم" سے ایک کشید

مراد شاہ اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ وہ اگلی صبح اپنے ایک شکاری دوست کے ہمراہ بھٹ کر پہنچا اور لوگوں سے اسد علی کے بارے میں پوچھ گچھ کرتا رہا۔ اس اثنا میں اسے یاد آیا کہ اسد علی کی بائیں پنڈلی پر زخم کا نشان تھا۔ وہ قصبے کے سیکنڈری اسکول پہنچا اور باتوں کے دوران اسد علی کی بائیں پنڈلی دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اسد علی نے قدرے تامل کرتے ہوئے پنڈلی دکھادی۔ وہاں زخم کا نشان موجود تھا۔

مراد شاہ نے اسد علی کی چند تصویریں اتاریں اور اپنی کسی بات کی وضاحت کیے بغیر اسی روز واپس روانہ ہوگیا۔

اسد علی کے زندہ موجود ہونے کی خبر سے سکندر ہاؤس میں کھلبلی مچ گئی۔ سکندر علی اپنے دو بیٹوں اور چند مصاحبوں کے ہمراہ فوراً بھٹ کر روانہ ہوگیا۔

فرزانہ بیگم نے بیٹے کی بازیابی کی خوشی میں شاندار ضیافت کا اہتمام کرنا شروع کردیا۔ سکندر ہاؤس کو دلہن کی طرح سجایا جانے لگا۔ مہمانوں کے لیے خاص قسم کے دعوتی کارڈ ارجنٹ طباعت کے لیے دے دیے گئے۔ ہر شخص ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہا تھا۔ فرزانہ بیگم کی آنکھوں سے بات بات پر خوشی کے آنسو چھلک پڑتے تھے۔

اُدھر اگلی صبح بھٹ کر بیس گاڑیوں کا جلوس پہنچا تو سارا گاؤں اُمڈ آیا۔ اس جلوس میں پریس اور ٹی وی کے نمائندوں کی چند گاڑیاں بھی شامل تھیں۔ ایک گاڑی میں چند پولیس آفیسرز بھی تھے جو سادہ لباس میں تھے۔

یہ جلوس مراد شاہ کی رہنمائی میں کریم بخش کے گھر کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ اسد علی اس وقت اسکول جانے کی تیاری کررہا تھا۔ اس کے بچے مریم اور یوسف بھی اسکول جانے کے لیے تیار ہوچکے تھے۔

شور کی آواز سن کر اسد علی باہر نکلا اور گاڑیوں کا جلوس دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ وہ معمول کے مطابق سادہ سی شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ قمیص کے اوپر اس نے سستے کپڑے کی سیاہ واسکٹ پہن رکھی تھی۔

سب سے قریب ترین پجیرو گاڑی سے تین افراد باہر آئے۔ ان میں دو نوجوان اور ایک معمر شخص تھا جس نے فلیٹ ہیٹ اور سوٹ پہن رکھا تھا۔ اسد علی حیرت سے ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ ان تینوں کے نقوش اس سے بہت ملتے جلتے تھے۔ معمر شخص نہایت جذباتی انداز میں اس کے قریب پہنچا اور "میرا بیٹا" کہہ کر اسے گلے سے لگالیا۔

کریم بخش اور رحمت بی بی یہ سب کچھ دیکھ کر پریشان ہوگئے۔ اسد علی کے بیوی بچے بھی دروازے میں کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ سب کیا ہورہا تھا۔

پریس اور ٹی وی کے نمائندے اس منظر کی تصویریں اتارنے میں مصروف تھے۔

منور علی اور ظفر علی، اسد علی کو گاڑی کے اندر لے گئے اور اسے اس کے بچپن کی تصویریں دکھا کر ساری صورت حال سمجھانے لگے۔

سکندر علی دو سادہ لباس پولیس افسروں کے ہمراہ مکان کے اندر چلا گیا اور بوڑھے کریم بخش سے اسد علی کے بارے میں پوچھا۔

"یہ... یہ میرا بیٹا امیر بخش ہے جی۔" کریم بخش نے اپنے خوف کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا "آپ پورے گاؤں سے پوچھ لیں جی، سب یہی گواہی دیں گے کہ امیر بخش میرا بیٹا ہے۔ یہ امیر بخش کی ماں رحمت بی بی ہے اور یہ اس کے بیوی بچے ہیں۔ امیر بخش کی ساری زندگی اس گاؤں میں گزری ہے۔ ہم نے بڑی محنت سے اس کو لکھایا پڑھایا ہے۔"

سکندر علی کچھ دیر تک آرام سے سوال کرتا رہا پھر اس نے ایک پستول نکال کر کریم بخش کے گلے سے لگادیا اور بولا "بڈھے، شرافت سے ساری کہانی سنادو ورنہ یہ گولی تمہارے گلے کے آرپار ہوجائے گی۔"

پولیس آفیسر نے کہا "صاحب بہت بڑے وزیر ہیں۔ ان کے سامنے جھوٹ نہیں چل سکتا۔ یہ تمہیں قتل بھی کردیں گے تو ان پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔ اور میں پولیس آفیسر ہوں، صاحب کے اشارے پر تمہیں ساری زندگی کے لیے جیل میں بند کردوں گا۔"

کریم بخش بنیادی طور پر سیدھا اور سچا آدمی تھا۔ اس نے اسد علی کو بھی ہمیشہ سچ بولنے کی تلقین کی تھی۔ وہ جھوٹ محض جذباتی جھوٹ تھا۔ اس نے اسد علی کو سگے بیٹوں کی طرح پالا تھا اور اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ اسے خود سے جدا نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے بات بگڑتی دیکھی تو سب کچھ سچ سچ بتادیا۔

"وہ چٹھی کہاں ہے جو تھیلے سے برآمد ہوئی تھی؟" سکندر علی نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔

"میں نے کئی سالوں تک وہ چٹھی سنبھال کر رکھی مگر جب امیر بخش لکھنے پڑھنے کے قابل ہوگیا تو میں نے وہ چٹھی ضائع کردی کیوں کہ مجھے ڈر تھا کہ کسی دن وہ چٹھی اس کے ہاتھ نہ لگ جائے۔"

سکندر علی نے پولیس آفیسر کے کان میں کچھ کہا اور مکان سے باہر نکل گیا۔ دونوں پولیس آفیسر بھی باہر چلے گئے۔

اسد علی کو اس بات کا یقینی ثبوت مل چکا تھا کہ وہ سکندر علی کا بیٹا تھا۔ اس نے باپ کی زبانی وہ کہانی بھی سن لی جو کریم بخش نے سنائی تھی۔

اتنے میں کریم بخش بھی باہر آگیا اور ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا "بیٹے، ہم نے اس لیے تمہیں اصل بات نہیں بتائی تھی کہ تمہیں اپنے ماں باپ کی جدائی کا دکھ ہوگا۔ ہم سے اگر کوئی غلطی ہوگئی ہو

تو..."

اسد علی نے آگے بڑھ کر کریم بخش کو گلے لگایا' بولا "بابا" آپ نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ اس طرح کی باتیں کر کے مجھے گناہ گار نہ کریں۔ آپ نے مجھے جو محبت اور شفقت دی ہے اسے میں کبھی نہیں بھلا سکوں گا اور یہ مت سمجھیں کہ ہم آخری بار مل رہے ہیں۔"

رحمت بی بی بھی باہر آگئی تھی اور بہت مایوس نظر آرہی تھی۔ اسد علی اس سے بھی سر جھکا کر ملا۔

اس کے باپ اور بھائیوں کو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ سخت بے زاری سے کریم بخش اور اس کی بیوی کو گھور رہے تھے اور اسد علی کو جلدی چلنے کے لیے کہہ رہے تھے۔

"سر' آپ کو کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔" اسد علی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ باپ کو کس طرح مخاطب کرے کیوں کہ اس کا ذہن ابھی اسے باپ کی حیثیت سے قبول کرنے پر تیار نہیں ہوا تھا "مجھے اسکول کا انتظام کسی کے سپرد کرنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ میرا سامان اور....."

بھائیوں نے اس کی بات پر قہقہہ لگایا پھر منور علی نے کہا "میرے پیارے بھائی' ڈیڈی کو سر کہہ رہے ہو!"

ظفر علی نے کہا "بھائی جان' سامان اور اسکول کی فکر نہیں کریں' اگر آپ کو پڑھانے کا اتنا ہی شوق ہے تو ہم آپ کو شاندار قسم کا انگریزی اسکول کھلوا دیں گے۔"

"اور سامان کے لیے پورا اسٹور خرید لیں گے۔" بڑے بھائی نے کہا "گھر پہنچ کر آپ یہاں کی ہر چیز بھول جائیں گے۔"

باپ نے کہا "کل تم اپنی پسند کی کار خرید لینا اور جہاں چاہے گھومنا پھرنا۔ پھر دنیا تمہارے پیروں کے نیچے ہوگی۔"

اسد علی کو ان باتوں پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ باپ اور بھائیوں کو بھی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ منور اور ظفر کی رنگت سرخ سفید' چہرے کی جلد نرم مگر تاثرات سخت تھے۔ اس کے برعکس اسد کی رنگت گندمی' چہرے کی جلد سخت مگر تاثرات نرم تھے۔ وہ بھائیوں کے مقابلے میں دُبلا پتلا اور غربت کا مارا ہوا لگتا تھا۔

"چلو بھئی بیٹھو" سکندر علی نے کہا۔ وہ اخباری نمائندوں کے سوالات کے جواب دینے سے فارغ ہوا تھا "واپسی کا سفر شروع کریں۔ اسد بیٹے! تم میرے پاس بیٹھو۔"

اسد کا ذہن بری طرح الجھ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی زندگی کی بہت سی قیمتی چیزیں پیچھے رہتی جارہی تھیں۔ اچانک اس کی نظر دروازے کی طرف اٹھ گئی۔ اس نے دیکھا کہ اس کا بیٹا یوسف اور بیٹی مریم خالی اور ویران نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی ماں جو ارشاد بی بی سے دوبارہ شاداں بن گئی تھی' دونوں بچوں کے درمیان کھڑی اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

قاشیں

بائی دی وے' میرے کوارٹر میں کوئی ڈرائنگ روم نہیں ہے۔ ہمارے حصے میں ایک کمرا آیا ہے جس میں دال نو وال بچے بچھے رہتے ہیں۔

○☆○

دیکھا گیا ہے کہ بزنس میں ایک چوتھائی سرمائے کے ساتھ تین چوتھائی ٹیکس کا انوسٹمنٹ کر دیا جائے تو پھر ملیں اور فیکٹریاں ہر سال بچے دیتی چلی جاتی ہیں۔

○☆○

چھوٹے لوگوں کے تو موسم بھی اپنے نہیں ہوتے

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب "زرگزشت" سے۔

کریم بخش کی دونوں بیٹیاں فاطمہ اور سائرہ بھی وہاں پہنچ گئی تھیں۔ وہ سب سناٹے کے عالم میں دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ سکندر علی کے کرّوفر کے باعث وہ اپنے اندر شکوہ کرنے کی جرأت بھی نہیں پا رہے تھے۔ وہ شخص جو ان کا اپنا اور پیارا تھا' اچانک ایک مکمل اجنبی بن گیا تھا۔

اسد علی سب کو ایک طرف ہٹاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا اور جُھک جُھک کر سب کو سلام کرنے لگا۔ اس نے سائرہ اور فاطمہ کے سامنے سر جھکایا اور کہا "میری پیاری بہنو' میرے سر پر ہاتھ پھیرو اور مجھے دعاؤں کے ساتھ رخصت کرو۔"

دونوں بہنوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دینے کی کوشش کی تو ان کی آواز بھرّا گئی اور آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ فاطمہ کے منہ سے صرف اتنا نکلا "امیر بھائی! ہمیں بھول نہ جانا۔"

اسد علی نے دیگر لوگوں کی طرف دیکھا تو اسے سب کے چہروں پر یہی لکھا دکھائی دیا "امیر بخش' ہمیں بھول نہ جانا... امیر بخش' ہمیں بھول نہ جانا۔ امیر بخش' ہمیں بھول نہ جانا......'

اسد نے ننھے یوسف کو گود میں اٹھالیا' مریم کی انگلی پکڑی اور بیوی سے کہا "ارشاد بی بی' آؤ چلیں۔"

منور علی جلدی سے آگے بڑھا اور پوچھا "اسد بھائی' یہ کون لوگ ہیں؟"

"یہ میرے بیوی بچے ہیں۔" اسد نے جواب دیا۔

منور علی نے حقارت سے اس دیہاتی عورت کی طرف دیکھا جسے اس کا بھائی اپنی بیوی کہہ رہا تھا۔

"یہ لوگ بعد میں آجائیں گے۔" اس نے کہا "میرا خیال ہے کہ گاڑی میں جگہ بھی نہیں ہوگی۔"

"آپ کو شاید میرے بیوی بچے پسند نہیں آئے۔ کوئی بات نہیں' میں بھی بعد میں آجاؤں گا۔"

باپ نے صورت حال بگڑتے دیکھ کر کہا "کوئی بعد میں نہیں آئے گا" گاڑیوں میں بہت جگہ ہے۔"

اسد علی نے بچوں کو پجیرو میں بٹھایا اور بیوی کے ہمراہ اندر سے کچھ ضروری چیزیں اٹھا لایا۔ پندرہ منٹ کے بعد قافلہ واپس روانہ ہوگیا لیکن پولیس کی ایک گاڑی رکی رہی۔ جب قافلہ نظروں سے اوجھل ہوگیا تو پولیس نے کریم بخش اور رحمت بی بی کو اغوا کے الزام میں گرفتار کرلیا۔

○☆○

ضیافتِ شکرانہ میں ایک ہزار سے زیادہ مہمان مدعو تھے۔ ان میں سیاسی قائدین اور معززین شہر کی ایک کثیر تعداد شامل تھی۔ سکندر ہاؤس میں رنگ و نور کا سیلاب آیا ہوا تھا۔

اسد علی مہمانوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ وہ اس سوٹ میں ملبوس تھا جو اس کے لیے ارجنٹ طور پر سلوایا گیا تھا۔ سکندر علی بڑے فخر سے اس کا تعارف کرا رہا تھا لیکن اسد اس ماحول میں خود کو اجنبی محسوس کررہا تھا۔ خصوصاً محفل میں شریک فیشن ایبل لڑکیوں اور عورتوں سے اسے بہت حجاب محسوس ہورہا تھا۔ بھڑکدار ساریوں میں ملبوس ننگے پیٹوں والی عورتیں اسے بہت بُری لگ رہی تھیں۔ بڑی عمر کی فربہ اندام عورتوں کی کمروں پر پڑے ہوئے چربی کے بل اس کی نظر میں انتہائی کراہیت آمیز تھے۔ اس نے اپنی ساری زندگی میں اتنی عریانی نہیں دیکھی تھی جو اس کوٹھی کے لان میں جمع تھی۔

جب عورتیں اس سے ملنے آتیں تو بعض اوقات اس کا سر اتنا جھک جاتا کہ ٹھوڑی سینے کو چھونے لگتی۔ بعض چیزیں اس کے لیے حیرت کا باعث تھیں۔ مثلاً کھانا ضرورت سے زیادہ پکایا گیا تھا۔ ایسا عمدہ اور مرغن کھانا اہل بھٹ کرنے کھانا تو کجا، کبھی دیکھا تک نہیں تھا۔ اور جتنا کھانا ضائع ہوا تھا اس سے ایک چھوٹا سا گاؤں سیر ہوسکتا تھا۔

اسد علی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کی بیوی بچوں کو ایک چھوٹے سے بیڈروم میں مقید کردیا گیا تھا جو بالائی منزل پر واقع تھا۔ بیڈروم کے دروازے پر ایک ملازم کی ڈیوٹی لگادی گئی تھی۔ یہ ملازم بظاہر ارشاد بی بی کی خدمت پر مامور تھا مگر درحقیقت اس کی ڈیوٹی یہ تھی کہ ارشاد بی بی اور اس کے بچے کمرے سے باہر نہ جائیں اور کوئی معزز مہمان کمرے کے اندر نہ جائے۔ انہیں رات کا کھانا کمرے میں ہی دے دیا گیا تھا۔

جب اسد علی مہمانوں کو رخصت کرکے کمرے میں پہنچا تو بچے سوچکے تھے اور ارشاد بی بی بستر کے کنارے پر بیٹھی فضا میں گھور رہی تھی۔ اس کی حالت اس جنگلی ہرنی کی سی ہورہی تھی جسے اچانک سونے کے پنجرے میں بند کردیا گیا ہو۔

"تم ابھی تک سوئی نہیں؟" اسد نے پوچھا۔

"آپ کا انتظار کررہی تھی۔"

اسد نے کوٹ اتار کر ایک طرف پھینکا اور باتھ روم میں جاکر کپڑے بدلنے لگا۔ "مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا۔" اس نے اپنے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں اطمینان کا سانس لیا "آدھی رات تک جاگنے اور مرغن کھانے کھانے والے لوگ کام کس طرح کرتے ہوں گے!"

"امیر لوگوں کو خود کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" ارشاد بی بی نے پتے کی بات بتائی "ان کے سارے کام نوکر کرتے ہیں۔ یہ لوگ صرف تفریح اور آرام کرتے ہیں۔"

اسد علی بستر پر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھیں نیند سے بند ہورہی تھیں۔ ارشاد بی بی نے ڈرتے ڈرتے کہا "ایک بات کہوں، ناراض تو نہیں ہوں گے؟"

"میں پہلے کبھی تمہاری باتوں پر ناراض ہوا ہوں؟" اس نے لیٹے لیٹے کہا "جو کہنا چاہتی ہو، کھل کر کہو۔"

"وہ... میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ... یہاں کی نوکرانیاں بھی مجھ سے اچھی ہیں۔ آ... آپ مجھے طلاق تو نہیں دے دیں گے؟"

"تم میرے بچوں کی ماں ہو اور تم نے میرے ساتھ کوئی زیادتی بھی نہیں کی' میں تمہیں کیوں طلاق دوں گا؟"

ارشاد بی بی نے مضبوطی سے شوہر کا ہاتھ پکڑلیا۔ اسے محسوس ہورہا تھا کہ اسد علی کے باپ کی دولت نے ان کے درمیان پہلے ہی دن دوری پیدا کرنی شروع کردی تھی۔

○☆○

اور اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ اسد علی کے گھر میں کسی نے بھی اسے پسند نہیں کیا تھا۔

چند روز دعوتوں میں گزر گئے۔ ان دعوتوں میں صرف اسد کو مدعو کیا جاتا تھا۔ اس کی بیوی اور بچے نوکروں کی نگرانی میں وقت گزار رہے تھے۔

ایک صبح فرزانہ بیگم نے اسد کو لیونگ روم میں طلب کیا۔ وہاں دو ٹیلر ماسٹر بھی موجود تھے۔ پہلے ٹیلر ماسٹر نے اسد کا ناپ لیا پھر پوچھا "بیگم صاحبہ، کتنے جوڑے تیار کرنے ہیں؟"

"ایسا کرو، پندرہ جوڑے شلوار قمیص اور دس جوڑے کرتے پاجامے کے تیار کردو۔ فی الحال اتنے ہی کافی ہیں، دو تین مہینے کے بعد اور بنوالیں گے۔"

"اماں، اتنے کپڑے میں کیا کروں گا۔" اسد نے کہا "مجھے کوئی دکان تو نہیں کھولنی۔"

"ڈونٹ بی سلی" فرزانہ نے اسے سرزنش کی "کال می ممی۔ ٹھیک ہے؟"

"یس ممی!" اسد نے بڑی مشکل سے کہا۔ اس نے ساری زندگی دیہات میں گزاری تھی اور اس بناوٹی دنیا سے دور رہا تھا۔ وہ کریم بخش کو بابا اور رحمت بی بی کو اماں کہتا تھا اور یہ دو لفظ اسے بہت اچھے لگتے تھے۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنے اصلی ماں باپ

کو بھی انہی الفاظ سے پکارے تاکہ اس کے دل میں ان کے لیے اصلی محبت پیدا ہو لیکن ماں باپ' ممی اور ڈیڈی کہلوانے پر مُصر تھے۔ اسے یقین تھا کہ وہ ساری زندگی ان لفظوں کا عادی نہیں ہو سکے گا۔

جب پہلا ٹیلر ماسٹر فارغ ہو گیا تو دوسرے نے اس کا ناپ لینا شروع کر دیا۔ وہ خاصا خوش پوش اور بارعب شخص تھا اور درزی سے زیادہ سرکاری افسر لگ رہا تھا۔

"اب یہ ناپ کس لیے لیا جا رہا ہے؟" اسد نے پوچھا۔

"یہ ماسٹر سوٹ ایکسپرٹ ہے۔" فرزانہ بیگم نے کہا۔

"سوٹ تو میرا پہلے ہی دن سل گیا تھا۔" اسد نے کہا۔

اس بات پر فرزانہ بیگم فقط مسکرا دی۔

ماسٹر نے ناپ لینے کے بعد کپڑوں کے نمونے' جو کتاب کی شکل میں جلد کیے ہوئے تھے' نکال کر میز پر رکھ دیے اور رنگ پسند کرنے کے لیے کہا۔

فرزانہ بیگم نے پانچ رنگ پسند کیے اور دس سوٹوں کا آرڈر دیا۔

"دس سوٹ!" اسد نے حیرانی سے کہا۔

"فی الحال دس ہی کافی ہیں۔" فرزانہ بیگم نے درزیوں کو سنانے کے لیے کہا "دو چار مہینے کے بعد اور سلوا لیں گے۔"

جب درزی جانے لگے تو اسد کو اپنے بیوی بچوں کا خیال آیا۔ کپڑوں کی اصل ضرورت تو ان کو تھی۔

"وہ... کچھ بچوں کے کپڑے بھی سلوانے ہیں۔" اس نے کہا "میں انھیں بلاتا ہوں۔"

"یہ لوگ بچوں کے کپڑے نہیں سیتے۔" فرزانہ بیگم نے کہا۔ پھر درزیوں کے جانے کے بعد بولی "اسد بیٹے' میں اس سلسلے میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"جی ام... ممی"

"بیٹے' بات یہ ہے کہ شیر اور گیدڑ کا کوئی جوڑ نہیں ہوتا۔ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ایک حادثہ تھا۔ اب ہمیں مل جل کر اس حادثے کے اثرات کو ختم کرنا ہے۔ تمہارے ڈیڈی اور بھائی اسمبلیوں کے ممبر ہیں اور وزیر بھی رہ چکے ہیں۔ انشاءاللہ ایک دن تم بھی وزیر بنو گے۔ ہمارے ملنے والوں میں سب بہت بڑے بڑے لوگ ہیں۔ تمہاری بیوی اتنے اونچے لوگوں میں گھلنے ملنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اور جب لوگوں کو پتا چلے گا کہ ہماری بہو ایک مزدور کی بیٹی ہے تو ہماری کیا عزت رہ جائے گی۔"

اسد علی حیرت اور افسوس کے ساتھ ماں کی باتیں سن رہا تھا۔ اس سوچ اور اس فلسفے کے خلاف وہ ساری زندگی تبلیغ کرتا رہا تھا لیکن آج وہ کچھ نہیں بول سکتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ماں یہ ساری تمہید دوسری شادی کے لیے باندھ رہی تھی۔ وہ چپ چاپ سنتا رہا۔

"تمہارے لیے میرے پاس چار پانچ رشتے ہیں۔" فرزانہ بیگم نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "ایک سے ایک خوب صورت لڑکی ہے۔ دو چار دن میں تم اپنی آنکھوں سے ان لڑکیوں کو دیکھ لو گے۔ سب اونچے گھرانوں کی لڑکیاں ہیں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔"

"کیا یہ...... میری پہلی بیوی کو قبول کرلیں گی؟"

"اسے طلاق دے کر گھر بھیج دو۔"

اس بات سے اسد کو شدید صدمہ پہنچا۔ اس نے پوچھا "کیا میں بچوں کو ماں سے جُدا کردوں؟"

"بچے بھی اس کے ساتھ ہی جائیں گے۔" ماں کا لہجہ فیصلہ کُن تھا "ایک گنوار عورت کے بچوں کو ہم نے رکھ کر کیا کرنا ہے۔"

ماں کا فیصلہ سن کر اسد ششدر رہ گیا لیکن اس نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ اگر بچوں کو جدا کرنا اتنا ہی آسان تھا تو وہ اپنے بیٹے کے لیے پچیس سال تک کیوں تڑپتی رہی تھیں۔

○☆○

چند ہفتوں کے بعد جُدائی اور ملاپ کی کہانی پرانی ہوگئی اور ماں باپ اور بھائی بہنوں کے رویّے میں فرق آنا شروع ہوگیا۔ اسد کے بیوی بچوں کو تو پہلے ہی دن قبول نہیں کیا گیا تھا لیکن اب خود اس کی اپنی حیثیت بھی کمزور ہوتی جارہی تھی۔ اس کے اور دیگر افراد کے نظریات میں بعد المشرقین تھا۔ رفتہ رفتہ یہ نظریاتی اختلاف نمایاں ہونا شروع ہوگیا تھا۔

واضح طور پر ماں باپ اور بھائی بہنوں کو جس بھولے بھالے بچے کی تلاش تھی' وہ ماضی میں کہیں گم ہوچکا تھا اور جو شخص بازیاب ہوا تھا' وہ ایک تلخ قسم کا دیہاتی دانشور تھا' جو اپنے نظریات پر کوئی سمجھوتہ کرنے پر تیار نہیں تھا۔ پانچویں ہفتے ڈرائنگ روم میں لگی ہوئی اس کی پچیس سال پرانی تصویر اتار دی گئی۔

فرزانہ بیگم نے شادی کی امیدوار جن لڑکیوں کا اسد سے تعارف کرایا تھا' ان میں ترنم نامی ایک شوخ لڑکی بھی تھی۔ وہ ایک مغرب پسند خاندان سے تعلق رکھنے والی' کانونیٹ اسکول کی تعلیم یافتہ اور آزاد خیال لڑکی تھی۔ فرزانہ بیگم کی خصوصی ہدایت پر اس نے اسد کو شیشے میں اتارنے کی کوشش شروع کردی۔

لیکن اسد اتنا آزاد خیال نہیں تھا۔ ایک نامحرم لڑکی سے بے تکلف ہونا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ لڑکیوں اور عورتوں سے بات کرتے وقت وہ اپنی آنکھیں نیچی رکھتا تھا۔

ایک دن ترنم نے چڑ کر کہا "آپ اتنے بنتے کیوں ہیں؟ کیا میں اتنی بُری ہوں کہ آپ میرے ساتھ بات بھی نہیں کرسکتے؟"

"ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" اسد نے سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ نامحرم مردوں اور عورتوں کے درمیان اشد ضرورت کے وقت گفتگو ہونی چاہیے اور گفتگو کے دوران حجاب برقرار رہنا چاہیے۔"

"پینڈو!" ترنم نے زیرِ لب کہا پھر اونچی آواز سے بولی "ہر سوسائٹی کے اپنے آداب ہوتے ہیں۔ دیہاتیوں کے اور آداب ہوتے ہیں اور ہائی سوسائٹی کے اور آداب۔ آپ کو یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ اب آپ ہائی سوسائٹی ممبر بن چکے ہیں۔ آپ کو فرسودہ آداب کو طلاق دے دینا چاہیے۔"

"ترنم بی بی' اگر آداب سے مُراد رسم و رواج یا ثقافت ہے تو تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن اگر آداب سے مُراد زندگی کا فلسفہ ہے تو پھر تمہاری بات غلط ہے۔ کامیاب زندگی کا ایک ہی فلسفہ ہے' خواہ معاملہ شہر کا ہو یا دیہات کا۔ میں نے جو اصول بتایا ہے' وہ فلسفے سے تعلق رکھتا ہے اور جہاں تک اونچی سوسائٹی کا تعلق ہے تو میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ یہ سوسائٹی خود نمائی اور تنگ نظری کے خول میں بند ہے۔ اس سوسائٹی میں شامل ہونے کی بنیادی شرط دولت اور بے حیائی ہے۔ جو اس شرط پر پورا نہیں اترتا وہ اس خول میں داخل نہیں ہوسکتا۔"

یہ گفتگو سوئمنگ پول کے قریب لان کے ایک گوشے میں ہورہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد تین نوجوان لڑکیاں جن میں اسد کی چھوٹی بہن عشرت بھی شامل تھی' عمارت سے نکل کر سوئمنگ پول کی طرف بڑھتی دکھائی دیں۔ انہوں نے سوئمنگ کاسٹیوم پہن رکھے تھے جن کے اوپر ڈھیلے ڈھالے گاؤن پہنے ہوئے تھے۔

سوئمنگ پول کے کنارے پر ایک سہ رنگی چھتری استادہ تھی جس کے نیچے ایک میز اور چار کرسیاں رکھی تھیں۔ اس چھتری کے نیچے پہنچ کر تینوں نے اپنے گاؤن اتار کر کرسیوں پر رکھ دیے اور اپنے جسموں پر کوئی لوشن ملنے لگیں۔

اس وقت دن کے بارہ بجے تھے اور چاروں طرف چمکدار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اسد علی نے یہ منظر دیکھا تو اس کے چہرے پر سخت ناگواری نظر آنے لگی۔

ترنم نے اس کے تاثرات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا "اب آپ کہیں گے کہ یہ لڑکیاں بہت بُری حرکت کررہی ہیں' حالانکہ سوئمنگ میں کوئی برائی نہیں ہے اور شلوار قمیص پہن کر سوئمنگ نہیں کی جاسکتی۔ اگر مرد نیکر پہن کر نہاسکتے ہیں تو عورتیں کیوں نہیں نہاسکتیں! کیا مرد اللہ میاں سے خصوصی اجازت لے کر آئے ہیں؟"

اسد نے منہ دوسری طرف پھیرلیا اور اپنے غصے کو دباتے ہوئے بولا "ہاں' یہ برائی ہے۔ عورت اور مرد دونوں کی کچھ حدود ہوتی ہیں' انہیں ان حدود کے اندر رہنا چاہیے۔ جو شخص سوئمنگ پول بنوا سکتا ہے وہ اس کے گرد چار دیواری بھی بنوا سکتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سوئمنگ میں کوئی برائی نہیں ہے' برائی کھلے عام سوئمنگ میں ہے۔ اگر انسان اپنی آزادی کا تعین دوسری مخلوق کے حوالے سے کرنا شروع کردے تو پھر وہ جانوروں جیسی آزادی کی تمنا

بھی کر سکتا ہے۔ جانور نہ لباس پہنتے ہیں اور نہ ہی رسوم و قیود کے پابند ہیں۔"

"بات تو ٹھیک ہے۔" ترنم نے شوخی سے کہا "آخر جانوروں کو اتنی آزادی کیوں ملی ہوئی ہے؟"

اسد کرسی سے اٹھا اور سوئمنگ پول کی مخالف سمت سے واپس چل پڑا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ سوئمنگ کرتی ہوئی لڑکیوں پر اس کی نظر پڑے۔

ترنم بھی اٹھ کر اس کے پیچھے لپکی "وہاٹ اے نان سینس" وہ زیر لب کہہ رہی تھی "بتائے بغیر ہی اٹھ کر چل دیے۔"

بنگلے کے سامنے والے حصے میں سکندر علی اور بیگم سکندر علی چند دوسرے افراد کے ہمراہ ایک نئی ہنڈا اکارڈ کا جائزہ لے رہے تھے۔

"آؤ بیٹا اسد" سکندر علی نے کہا "ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ ان سے ملو۔" اس نے قریب کھڑے ایک ادھیڑ عمر شخص کی طرف اشارہ کیا "یہ شاہین موٹرز لمیٹڈ کے ایم ڈی صفدر شیرازی ہیں۔ اور شیرازی' یہ میرا بیٹا اسد علی ہے۔"

شیرازی نے اسد سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ واپسی مبارک ہو۔"

اسد نے چند رسمی الفاظ کہے۔

سکندر نے بیٹے کی طرف چابیوں کا ایک گچھا بڑھایا' بولا "اسد بیٹے! شیرازی تمہارے لیے نئی کار لائے ہیں۔ یہ کار کھڑی ہے اور یہ اس کی چابیاں ہیں۔"

"شکریہ ... ڈیڈی۔" اسد نے چابیاں لیتے ہوئے کہا "ویسے مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی۔"

"یہ کون سا مشکل کام ہے۔" فرزانہ بیگم نے کہا "گھر میں سب کو ڈرائیونگ آتی ہے' کسی سے بھی سیکھ لو۔ زیادہ سے زیادہ دس بارہ دن میں سیکھ جاؤ گے۔"

"میں آپ کو ڈرائیونگ سکھادوں گی۔" ترنم نے کہا۔

"ہاں' یہ ٹھیک ہے" فرزانہ بیگم نے تائید کی "تم اسے ڈرائیونگ سکھادیا کرو۔ باتوں میں دونوں کا دل بھی لگا رہے گا۔ صبح کا کوئی وقت مقرر کرلو۔"

اسد کو ماں کی بات سن کر دل میں شرم آئی۔ کیا اس کی ماں یہ سمجھتی ہے کہ وہ ترنم سے مل کر دل بہلاتا رہتا ہے؟

سکندر علی نے اس بات پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا اور شیرازی سے باتیں کرتا ہوا ایک طرف نکل گیا۔

ترنم نے اسد کے ہاتھ سے چابیاں لیں اور گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے بولی "آیئے' آج گاڑی کی ٹرائی لیتے ہیں۔"

"اسی وقت!" اسد نے کہا "اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے؟"

"چلے جاؤ" ماں نے کہا "ایک آدھ گھنٹے میں واپس آجانا۔"

ترنم ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اسد پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولنے لگا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ!" ترنم نے ہنستے ہوئے کہا "آپ ملازم تو نہیں ہیں۔ اگلی سیٹ پر بیٹھیں۔"

اسد علی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ترنم نے انجن اسٹارٹ کیا' گیئر لگایا اور ڈرائیو وے میں ٹائروں کے نشان چھوڑتی ہوئی گیٹ سے نکل گئی۔ چند منٹوں کے اندر اس کی کار مین روڈ پر دوڑ رہی تھی۔

"رشوت کی کار مبارک ہو۔" طویل خاموشی کے بعد ترنم نے کہا۔

"رشوت کی کار!" اسد نے حیرانی سے کہا "تم مذاق کر رہی ہو۔ اتنی مہنگی کار کون دیتا ہے رشوت میں؟"

"زیادہ مہنگی نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ چودہ پندرہ لاکھ روپے کی ہوگی۔"

"تمہارے خیال میں چودہ پندرہ لاکھ معمولی رقم ہے؟"

"جہاں کروڑوں کی رشوت چلتی ہو' وہاں چودہ پندرہ لاکھ کی کیا حیثیت! شیرازی نے ایک کار دی ہے' اب یہ تمہارے ڈیڈی سے دس کام نکلوائے گا۔ دو چار ٹینڈر پاس کروالے گا اور چند ٹھیکے حاصل کر کے ایک کی چار کاریں بنالے گا۔"

"میں یہ کار نہیں لوں گا۔" اسد نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میرے بابا نے مجھے ہمیشہ حلال کی روزی کھلائی ہے۔"

ترنم نے قہقہہ لگایا' بولی "چند مہینوں کے اندر تمہاری ایمانداری کے غبارے سے ہوا نکل جائے گی۔ سوال یہ ہے کہ کس کس چیز سے انکار کرو گے؟ تمہارے ڈیڈ کا آدھے سے زیادہ مال رشوت کا ہے۔ سکندر ہاؤس کی بنیادوں اور دیواروں میں رشوت کا سریا اور سیمنٹ بھرا ہوا ہے۔"

اسد نے گہرا سانس لیا اور سڑک پر دوڑتی ہوئی خوب صورت کاروں کو گھورنے لگا۔

ترنم بڑی تیز رفتاری سے کار چلا رہی تھی تاہم وہ بالکل پُرسکون تھی اور بڑے اطمینان سے باتیں کر رہی تھی۔ ایک طویل توقف کے بعد اس نے کہا "آنٹی مجھے اپنی بہو بنانا چاہتی ہیں۔"

"یہ تمہارا اور ان کا مسئلہ ہے۔"

"یہ آپ کا مسئلہ بھی ہے۔ بہو بنانے کے لیے ایک عدد بیٹا قربان کرنا پڑتا ہے۔"

"میں قربان ہو چکا ہوں۔ میری ایک بیوی اور دو بچے موجود ہیں۔ تم کوئی اور دروازہ کھٹکھٹاؤ۔"

"اس بے چاری شاداں پر رحم کریں۔ سارا دن اوپر کی منزل پر لگی رہتی ہے۔ جائے بھی کہاں! نہ کسی سے بات کر سکتی ہے اور نہ کسی کی بات سمجھ سکتی ہے۔ قیدیوں کی طرح ادھر ادھر بھٹکتی رہتی ہے۔ بچے بھی سہمے سہمے نظر آتے ہیں۔ میرا مشورہ مانیں تو شاداں کو آزاد کردیں۔ وہ ہماری سوسائٹی میں شامل نہیں ہو سکتی۔ اس ماحول

میں وہ پاگل ہو جائے گی۔"

یہ بات اسد کو بھی پریشان کر رہی تھی۔ اس کی بیوی بچوں کے ساتھ گھر والوں کا سلوک اچھا نہیں تھا۔ ہر شخص ان کے ساتھ طنزیہ اور معاندانہ لہجے میں بات کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ارشاد بی بی اپنے کمرے سے کم ہی باہر نکلتی تھی لیکن اس گھٹن کے باوجود وہ کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائی تھی۔

"میں اپنی بیوی کو تم سے زیادہ سمجھتا ہوں۔" اسد نے کہا "تمہیں ان کے لیے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"ممی ڈیڈی کو کیا جواب دیں گے؟ وہ بہت جلد آپ کی شادی کا اعلان کرنے والے ہیں۔"

"اگر کوئی لڑکی میرے بیوی بچوں کو قبول کرتے ہوئے شادی کے لیے رضامند ہو گی تو شاید میں اس کے بارے میں کچھ سوچوں۔"

"فرض کیجیے' میں آپ کے بیوی بچوں کو قبول کر لیتی ہوں اور آپ مجھ سے شادی کر لیتے ہیں لیکن اس کے بعد کیا ہو گا! شاداں اور اس کے بچوں کا اس گھر میں کیا مقام ہو گا؟"

"یہ بات تمہیں سوچنی پڑے گی کہ تمہارا میرے گھر میں کیا مقام ہو گا۔ اور میرا گھر وہ ہو گا جہاں میں رہوں گا۔"

"آپ سکندر ہاؤس چھوڑ کر کہاں جائیں گے؟"

"میں کہیں بھی جا سکتا ہوں۔ بھٹ کر بھی جا سکتا ہوں۔ کیا اپنی زندگی کا میں خود ہی مالک نہیں ہوں؟"

"گاؤں میں رہنے کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اچھا ہوا آپ نے یہ ذکر کر دیا۔ میں آنٹی سے کہہ کر یہ شرط پہلے ہی لکھوا لوں گی کہ آپ مجھے کراچی میں رکھیں گے۔"

"مس ترنم' میں دیہاتی ضرور ہوں لیکن احمق نہیں ہوں۔ شرطیں میں لکھواؤں گا۔"

"اوہ خوب! خوب! مثلاً آپ کیا شرطیں لکھوائیں گے؟"

"میری سب سے بڑی شرط یہ ہو گی کہ تم میری اتنی ہی عزت اور وفاداری کرو گی جتنی ارشاد بی بی کرتی ہے۔ مثلاً تم نے خود کہا ہے کہ ارشاد قیدیوں کی سی زندگی گزار رہی ہے مگر اس نے ایک دفعہ بھی شکایت نہیں کی۔"

"اونہہ! بے چاری شکایت کرنے کی ہمت کہاں سے لائے!"

"تم جس کو ہمت سمجھتی ہو' میں اس کو بے وفائی سمجھتا ہوں۔ وفاداری یہ ہے کہ انسان بُرے وقت میں بھی ساتھ دے۔"

ترنم نے کار واپس موڑنے کے لیے انڈی کیٹر دینا شروع کیا' بولی "آپ کو بدلنے میں بہت وقت لگے گا۔"

اسد علی اس کی بات پر فقط مسکرا دیا۔

○☆○

چند روز کے بعد سکندر علی نے اسد کو اپنے پاس بلایا اور ایک شخص سے ملوایا جس کی شکل بدمعاشوں جیسی تھی۔ اس کا نام حیدر بخش تھا اور اس نے بڑی بڑی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔

رسمی بات چیت کے بعد سکندر علی نے کہا "اسد بیٹے' میں نے اپنی پارٹی سے بات کر لی ہے۔ آئندہ انتخابات میں تمہیں صوبائی اسمبلی کا ٹکٹ دیا جائے گا۔ اگر تم کامیاب ہو گئے تو میں تمہیں وزارت دلانے کی کوشش بھی کروں گا۔ ایک گھر کے تین چار ممبر ہوں تو اس سے سودے بازی کی طاقت مضبوط ہو جاتی ہے۔ تم عوام سے رابطہ وغیرہ شروع کر دو اور کچھ اپنے لیے بھی کرو۔"

"عوام سے رابطہ تو میں بڑی خوشی سے کروں گا۔" اسد نے کہا "لیکن اپنے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

سکندر علی نے ایک وزٹنگ کارڈ بیٹے کو دیا اور کہا "کل اس شخص کے پاس چلے جاؤ۔ اس سے میں نے تمہارے لیے پلاٹ کی بات کی ہے' یہ تمہیں چند موزوں پلاٹ کے نقشے دکھائے گا۔ ان میں سے کوئی بڑا پلاٹ اپنے لیے منتخب کر لینا۔ اگر نقشے پر سمجھ نہ آئے تو سائٹ پر جا کر جگہ دیکھ لینا۔ یہ پلاٹ تمہیں اسکول کے لیے ملے گا۔ اس کے لیے ہم تمہاری ہیڈ ماسٹر والی پوزیشن کا سہارا لے سکتے ہیں۔"

"تدریس کا تو مجھے واقعی شوق ہے۔" اسد نے کہا۔

سکندر علی نے قہقہہ لگایا' بولا "ابھی تم سیاست سے بہت دور ہو۔ اسکول وغیرہ بہت چھوٹا بزنس ہے۔ ہم اس پلاٹ کو کمرشلائز کروا کر اس پر پلازہ بنائیں گے۔"

"لیکن ڈیڈی... اسکول کے پلاٹ کو کاروباری مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا اور ویسے بھی یہ مجرمانہ فعل ہو گا۔"

"انسان کے پاس اختیار ہو تو سب کچھ کیا جا سکتا ہے۔ اور تم فکر نہیں کرو' ہم کوئی مجرمانہ فعل نہیں کریں گے۔ ہر کام قانون کے مطابق ہو گا۔ پلاٹ کو پراپر اتھارٹی سے کمرشلائز کروائیں گے۔"

اس نے سائیڈ ٹیبل کی دراز سے ایک پستول اور چند کاغذات نکال کر اسد کی طرف بڑھائے "یہ پستول حفاظت کے لیے اپنے پاس رکھو اور یہ اس کا لائسنس ہے۔ یہ دوسرا ڈرائیونگ لائسنس ہے۔ یہ کاغذات حیدر بخش آج ہی تیار کروا کے لایا ہے۔"

اسد نے تامل کرتے ہوئے وہ چیزیں لے لیں۔

سکندر علی نے حیدر بخش سے کہا "دوسرا کام ایک ہفتے کے اندر ہو جانا چاہیے۔"

"بالکل ہو جائے گا سائیں۔" حیدر بخش نے اسد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "چھوٹے سرکار سے بھی مشورہ کر لیں۔"

"اسد کا فیصلہ بھی وہی ہو گا جو میرا ہے۔" سکندر علی نے کہا "اسد بیٹے' آج کل اغوا برائے تاوان کی سزا موت ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"مجھے قانون کا زیادہ علم نہیں ہے۔ اگر قانون میں اغوا کی یہی سزا ہے تو ٹھیک ہی ہو گی۔"

حیدر بخش نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "بات یہ ہے سرکار' کہ ہم نے آپ کو اغوا کرنے والے کا سراغ لگا لیا ہے لیکن مسئلہ

ہے کہ پچیس سال پرانے کیس کو عدالت میں ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے خان صاحب نے خود ہی سزا سنا دی ہے۔"

اسد کو یہ فیصلہ اچھا نہیں لگا' بولا "میرا خیال ہے کہ کسی کو صفائی کا موقع دیے بغیر سزا نہیں دینی چاہیے۔"

"ملزمہ نے اقرارِ جرم کرلیا ہے۔" حیدر بخش نے کہا۔

سکندر علی نے سخت نظروں سے حیدر بخش کو گھورا۔ واضح طور پر اسے یہ انکشاف پسند نہیں آیا تھا۔

"کیا مجھے کسی عورت نے اغوا کیا تھا؟" اسد نے پوچھا۔ اس کا خیال فوراً رحمت بی بی کی طرف چلا گیا تھا۔

"ہاں' وہ ایک عورت ہی ہے۔" سکندر اٹھتے ہوئے بولا "لیکن تمہیں اس معاملے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ حیدر بخش کے ہمراہ کمرے سے نکل گیا۔

اسد علی ان تمام الجھے ہوئے معاملات پر غور کرتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ لیونگ روم سے دو عورتوں کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ ایک آواز ارشاد بی بی کی تھی' دوسری آواز اسد نہیں پہچان سکا۔ اس نے کمرے میں قدم رکھا تو یہ دیکھ کر اسے خوشگوار تعجب ہوا کہ دوسری عورت اس کی بہن مہرالنساء تھی۔

مہرالنساء کی شادی ہوچکی تھی اور وہ دو بچوں کی ماں تھی۔ اسد نے محسوس کیا تھا کہ مہرالنساء کا رویّہ دیگر افراد سے مختلف تھا۔ وہ اس کے بیوی بچوں سے اخلاق سے پیش آتی تھی اور دوسروں کی طرح ان کو دیکھ کر کبھی تیوری نہیں چڑھاتی تھی۔

"اسد بھائی! میں آپ سے ایک ضروری بات کرنے آئی ہوں۔" اس نے رسمی کلمات کے بعد کہا "آپ مصروف تو نہیں؟"

"بالکل نہیں" اسد نے خوش دلی سے کہا "اگر مصروف بھی ہوتا تو انکار نہ کرتا۔" وہ صوفے پر بیٹھ گیا "فی الحال میں یہاں کے حالات اور مزاج کو سمجھنے کی کوشش کررہا ہوں۔ اور اسے سمجھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ سننا ضروری ہے۔"

مہرالنساء اداسی سے مسکرائی' بولی "آپ پچیس سال میں بھی یہاں کے حالات کو نہیں سمجھ پائیں گے۔" پھر وہ اصل بات کی طرف آتے ہوئے بولی "میں آپ کو اپنے گھر لے جانے کے لیے آئی ہوں۔ امید ہے کہ بھابی کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" اس نے مسکرا کر ارشاد بی بی کی طرف دیکھا۔

"جی' مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

مہرالنساء نے اسد سے کہا "اگر آپ میرے ساتھ جائیں گے تو ممی اعتراض کریں گی اس لیے آپ اشرف ڈرائیور سے کہیں کہ وہ آپ کو ہمارے گھر پہنچادے۔ اشرف بہت پرانا اور وفادار ڈرائیور ہے۔ اس نے مجھے گود میں کھلایا ہوا ہے۔"

اشرف ڈرائیور اگرچہ بوڑھا ہوچکا تھا مگر اس کے بال ہنوز سیاہ تھے۔ وہ اسد کی گاڑی کے پاس ہی موجود تھا۔ اس نے اسد کو

پسندیدہ ترین شہر... لاہور

گیلپ پاکستان کے ایک سروے کے مطابق ملک کا سب سے زیادہ پسندیدہ شہر لاہور ہے۔ سروے دو سو شہری اور دیہی علاقوں میں کروایا گیا تھا۔ جواب دہندگان کی ۲۷ فیصد تعداد نے لاہور کی' ۱۸ فیصد نے کراچی کی اور ۱۳ فیصد نے اسلام آباد کی حمایت کی۔ کوئٹہ' فیصل آباد اور پشاور کے حق میں علی الترتیب پانچ' چار اور تین فیصد ووٹ آئے۔

لاہور سے ایک قاری نے روانہ کیا۔

دیکھ کر مستعدی سے سیٹ کا دروازہ کھولا اور اس کے بیٹھنے کے بعد ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔

"صاحب' میں آپ کا پرانا نمک خوار ہوں۔" وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا "میں آپ دونوں بھائیوں کو کلفٹن اور فیریئر ہال سیر کرانے کے لیے لے جایا کرتا تھا۔"

"شکریہ اشرف بابا' میں بھی سوچ رہا تھا کہ آپ کی شکل کچھ مانوس سی کیوں لگتی ہے۔ آپ نے گاڑی تو اسٹارٹ کردی مگر یہ نہیں پوچھا کہ جانا کہاں ہے۔"

"میں آپ کو بی بی مہرالنساء کے گھر لے جارہا ہوں۔" اشرف ڈرائیور نے کہا اور گاڑی آگے بڑھادی۔

مہرالنساء کے بنگلے میں ایک خوش شکل اور ادھیڑ عمر عورت نے اسد کا استقبال کیا اور اسے آراستہ ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ اسد نے بھی اندازہ لگایا کہ وہ مہرالنساء کی ساس تھی۔

چند منٹوں کے بعد مہرالنساء وہاں پہنچ گئی اور ادھیڑ عمر خاتون کا تعارف کراتے ہوئے کہا "اسد بھائی! یہ میری امی ہیں۔"

"تمہاری امی!" اسد نے حیرانی سے کہا "میں سمجھا نہیں۔"

"میں سمجھاتی ہوں۔" ادھیڑ عمر خاتون نے کہا۔ وہ سعدیہ بیگم تھی "بیٹی' تم بھائی کے لیے چائے بنالاؤ۔"

مہرالنساء کچن کی طرف چلی گئی اور سعدیہ بیگم نے مختصر الفاظ میں پچیس سال پرانا واقعہ بیان کردیا۔ اس نے اشرف ڈرائیور کے کردار کا ذکر نہیں کیا اور خود کو سکندر علی کی بیوی ظاہر کیا۔ اس ضمن میں صرف اتنا کہا کہ اس نے سکندر علی کے اصرار پر خفیہ شادی کرلی تھی لیکن مہرالنساء کی پیدائش کے بعد سکندر علی نے اس سے قطع تعلق کرلیا تھا۔

پھر اس نے اسد کے اغوا اور اسے رحمت بی بی کے سپرد کرنے کا اقرار کرتے ہوئے کہا "اسد بیٹے! میں اس وقت انتہائی مایوس تھی۔ میں نے تمہارے ڈیڈی کو سمجھانے کی پوری کوشش کی مگر وہ مجھے تحفظ دینے پر تیار نہیں ہوئے بلکہ الٹا دھمکیوں پر اتر آئے۔

میرا مستقبل برباد ہو رہا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ اسی مایوسی کے عالم میں میں نے تمہیں اغوا کرلیا لیکن میں تمہارے اغوا سے نہ تو کوئی مالی فائدہ اٹھانا چاہتی تھی اور نہ ہی تمہارے لیے میرے دل میں کوئی برا خیال تھا۔ ٹرین کے سفر کے دوران میں نے کئی عورتوں کا جائزہ لیا۔ کریم بخش کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ بہت نیک آدمی تھا۔ اس کی بیوی بھی سادہ مزاج اور محبت کرنے والی عورت تھی۔ مجھے یقین تھا کہ دونوں بڑے اچھے طریقے سے تمہاری پرورش کریں گے۔ لہٰذا میں نے تمہیں رحمت بی بی کے سپرد کردیا لیکن کچھ عرصے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں نے اچھا نہیں کیا۔"

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ اسد علی کچھ نہیں بولا اس کے دلی جذبات کا اندازہ لگانا بہت مشکل تھا۔

"سات روز پہلے حیدر بخش نامی شخص مجھے اغوا کرکے لے گیا۔" سعدیہ بیگم نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اس نے مجھے تین راتوں تک ایک خالی مکان میں بند رکھا اور اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ مجھ پر تشدد کرتا رہا۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ انہوں نے مجھے کس کس طریقے سے ذلیل کیا لیکن میں کوئی شکوہ نہیں کرسکتی کیوں کہ قصور میرا تھا۔"

مہرالنساء چائے بنا کر لے آئی اور ایک کپ اسد کے سامنے رکھا مگر اسد کے چہرے پر فکرمندی نظر آرہی تھی کیوں کہ اس کا باپ، حیدر بخش کو سعدیہ بیگم کے قتل پر مامور کرچکا تھا۔

"میں چائے نہیں پیوں گا۔" اس نے کہا "کیا ڈیڈی کو پتا ہے کہ آج کل آپ یہاں رہ رہی ہیں؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ہوسکتا ہے کہ فی الحال انہیں یہ بات معلوم نہ ہو لیکن ان سے چھپ کر رہنا بہت مشکل ہے۔ ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔"

اسد اٹھتے ہوئے بولا "میں شام کے وقت دوبارہ آؤں گا۔ آپ ابھی کہیں نہ جائیں۔"

سعدیہ بیگم اسد علی کے ردِعمل سے پریشان ہوگئی۔ وہ یہ اندازہ نہ لگا سکی کہ اس کے اقرارِ جرم کے بارے میں اسد کے کیا تاثرات تھے۔

اسد علی، مہرالنساء کے روکنے کے باوجود گاڑی میں جا بیٹھا اور ڈرائیور کو واپس چلنے کے لیے کہا۔

جب ان کی گاڑی سکندر ہاؤس کے قریب پہنچی تو دو آدمی، جو وضع قطع سے دیہاتی معلوم ہوتے تھے، اچانک کہیں سے نکل کر گاڑی کے سامنے آگئے۔ اگر اشرف بروقت بریک نہ لگاتا تو حادثہ ہوجاتا۔ اس نے گاڑی روکتے ہی دیہاتیوں کو ڈانٹنا شروع کردیا لیکن اسد علی نے دونوں کو پہچان لیا۔ وہ بھٹ کرکے رہنے والے تھے۔ ایک کا نام منظور اور دوسرے کا نام بشیر احمد تھا۔ اسد نے گاڑی سے باہر نکل کر دونوں سے ہاتھ ملایا اور حال احوال پوچھا۔

بشیر احمد نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹتے ہوئے کہا "بابو امیر بخش، آپ تو یہاں کاروں اور بنگلوں میں عیش کررہے ہیں اور اُدھر بھٹ کرمیں کہرام مچا ہوا ہے۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"پولیس نے آپ کے بابا اور ماں کو اسی دن گرفتار کرلیا تھا اور ابھی تک نہیں چھوڑا۔ ان بے چاروں کی حالت بہت خراب ہے۔ پولیس والے ہر دوسرے تیسرے دن گاؤں آتے ہیں اور دو تین شریف آدمیوں کو پکڑ کرلے جاتے ہیں۔ ان پر تشدد کرتے ہیں اور انہیں آپ کے ماں باپ کے خلاف بیان دینے پر مجبور کرتے ہیں۔"

یہ سب کچھ سن کر اسد علی کا خون کھول اٹھا۔ اس نے کہا "تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"ہم تو جی، بیس پچیس دن سے یہاں دھکے کھا رہے ہیں۔ دو دفعہ آپ کے چوکیداروں نے ہمیں مارا اور ایک دفعہ پولیس کے حوالے کردیا۔ انہوں نے سات آٹھ دن تک ہمیں حوالات میں بند رکھا اور مارا بھی۔ ہمیں پتا نہیں تھا کہ اس شہر کے لوگ اتنے ظالم ہیں۔"

"ٹھیک ہے، تم لوگ ادھر ہی بیٹھو۔ میں آدھے پونے گھنٹے تک واپس آتا ہوں۔"

وہ گاڑی میں بیٹھ کر سکندر ہاؤس پہنچا اور بیوی سے کہا "بچوں کو لے کر نیچے آجاؤ۔ ہم واپس بھٹ کر جارہے ہیں۔ اور دیکھو، یہاں کی کوئی چیز ساتھ نہیں لینی۔"

یہ سن کر ارشاد بی بی کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ روزِ اوّل سے واپس جانے کی دعا مانگ رہی تھی۔ اس نے اپنا مختصر سامان جو وہ بھٹ کر سے ساتھ لائی تھی، اکٹھا کیا اور بچوں کے ہمراہ نیچے پہنچ گئی۔ یہ خبر پورے سکندر ہاؤس میں پھیل گئی۔ اس وقت سکندر علی اور اس کے دوسرے بیٹے گھر میں موجود نہیں تھے۔

فرزانہ بیگم تقریباً دوڑتی ہوئی باہر پہنچی اور بیٹے سے پوچھا "اسد بیٹے! کہاں جارہے ہو؟"

"اپنے ماں باپ کے پاس۔"

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے! وہ بھوکے ننگے تمہارے ماں باپ نہیں ہیں۔ ادھر ہی ٹھہرو میں ابھی واپس آتی ہوں۔" فرزانہ بیگم نے کہا اور شوہر کو فون کرنے کے لیے اندر بھاگی۔

اسد نے ڈرائیور سے کہا "مجھے کسی ایسی جگہ لے چلو جہاں سے گاڑی کرائے پر مل سکتی ہو اور راستے سے ان دو آدمیوں کو بھی لے لینا جن کو میں انتظار کرنے کا کہہ کر آیا ہوں۔"

○☆○

تقریباً چھ گھنٹے بعد کرائے کی ٹویوٹا ویگن اس تھانے کے سامنے پہنچ کر رکی جس میں کریم بخش اور رحمت بی بی بند تھے۔ ویگن کی

پچھلی سیٹ پر بشیر احمد اور منظور بیٹھے ہوئے تھے۔ اس سے اگلی سیٹ پر سعدیہ بیگم، ارشاد بی بی اور اس کے بچے بیٹھے ہوئے تھے۔ اسد علی فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ گاڑی سے اتر کر تھانے کے اندر چلا گیا۔

تھانے دار نے اسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا کیوں کہ اس روز وہ بھی سادہ لباس میں سکندر علی کے ہمراہ تھا۔ اس نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر اسد علی کو سلام کیا اور کہا "اسد صاحب، تشریف لائیں۔ کیسے آنا ہوا؟"

"مجھے پتا چلا ہے کہ میرے بابا اور ماں کو آپ نے حوالات میں بند کیا ہوا ہے۔" اسد نے کہا۔

"وہ بڑے صاحب کا حکم تھا۔ ان دونوں پر آپ کے اغوا کا الزام ہے۔ ہم تفتیش کر رہے ہیں۔"

"آپ نے ایف آئی آر تو نہیں کاٹی؟"

"جی نہیں۔ ابھی صرف تفتیش ہو رہی ہے۔"

"ان دونوں کو چھوڑ دیں۔ انہوں نے مجھے پال پوس کر اتنا بڑا کیا ہے، مجھے محبت اور شفقت دی ہے۔ کیا ان کے احسانات کا یہ بدلہ ہے کہ انہیں جیل میں بند کر دیا جائے؟"

تھانیدار نے ایک حوالدار کو بلا کر کہا کہ کریم بخش اور رحمت بی بی کو حوالات سے نکال لائے۔

اسد نے حوالدار سے کہا "دونوں کو باہر ویگن میں بٹھاؤ، میں ابھی آتا ہوں۔" پھر وہ تھانیدار کی طرف متوجہ ہوا۔ "ڈیڈی کو پورے حالات کا علم نہیں ہے۔ میں کسی وقت آپ کو پوری کہانی سناؤں گا۔ مجھے کراچی سے اغوا کیا گیا تھا اور ان دونوں نے اپنی پوری زندگی میں کراچی نہیں دیکھا۔"

"میں تو پہلے دن ہی سمجھ گیا تھا۔" تھانیدار نے کہا "یہ اغوا والی شکلیں ہی نہیں ہیں لیکن ہم۔ حکم کے بندے ہیں۔ اوپر سے آرڈر مل جائے تو کارروائی کرنی ہی پڑتی ہے۔"

دونوں باتیں کرتے ہوئے باہر پہنچ گئے۔ اس وقت کریم بخش اور رحمت بی بی ویگن میں بیٹھ رہے تھے۔ ان کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔

"اماں... بابا، مجھے معاف کر دینا۔" اسد نے ان کے قریب جا کر کہا "مجھے آج ہی اس بات کا علم ہوا ہے۔"

دونوں نے کمزور سی آواز میں اسے دعائیں دیں۔ اسد نے انہیں سہارا دے کر گاڑی میں بٹھایا اور سعدیہ بیگم کا تعارف کرایا۔

اسی لمحے ایک جیپ دھول اڑاتی ہوئی اس طرف آتی دکھائی دی۔ اسد دروازہ بند کرتے کرتے رک گیا اور آنے والی گاڑی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اس کے ڈیڈی کی گاڑی تھی۔ گاڑی قریب پہنچ کر رک گئی۔ اگلی سیٹ پر منور علی بیٹھا ہوا تھا۔ سکندر علی پچھلی سیٹ پر تھا۔ اس کے ساتھ دو محافظ بھی تھے۔

منور علی گن ہاتھ میں لیے ہوئے باہر نکلا اور سعدیہ بیگم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "اس عورت کو باہر نکالو۔"

"کیا بات ہے بھائی جان؟" اسد نے پرسکون لہجے میں کہا "آپ نے جو کچھ کہنا ہے، مجھ سے کہیں۔"

سکندر علی باہر آیا اور اسد سے مخاطب ہو کر بولا "بیٹے، تم نے اچھا نہیں کیا۔ تمہیں مجھ سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔ یہی وہ عورت ہے جس نے تمہیں پچیس سال پہلے اغوا کیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر وہی حرکت کی ہے۔"

"اور اب اس کے لیے معافی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔" منور علی نے کہا۔ وہ پانچ قدم کے فاصلے پر گن تانے کھڑا تھا۔ "عورت، باہر نکلو۔"

"منور بھائی! شاید آپ کو پوری بات معلوم نہیں ہے۔" اسد نے کہا۔

سعدیہ بیگم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے کہا "منور، میں تمہارے باپ کی بیوی اور مہرالنساء کی ماں ہوں۔ میرے ساتھ ادب سے بات کرو۔"

"تم آوارہ عورت ہو۔" منور علی نے کہا اور فائر کرنے کے ارادے سے اپنی پوزیشن بدلی "تم کسی کی بیوی نہیں ہو۔"

سعدیہ کھلے ہوئے دروازے کے سامنے بیٹھی تھی۔

اسد نے بھائی کو فائر کرنے کا ارادہ کرتے دیکھا تو سعدیہ بیگم کے سامنے ہو گیا۔

"ہٹ جاؤ سامنے سے۔" منور علی چیخا "نہیں تو میں تمہیں بھی نہیں بخشوں گا۔" اس کی انگلی ٹریگر پر تھی۔

یہ صورت حال دیکھ کر سکندر علی جلدی سے اسد کے سامنے پہنچ گیا لیکن منور علی ٹریگر دبا چکا تھا۔

گولی سکندر علی کے سینے میں لگی اور وہ آہستہ آہستہ زمین کی طرف جھکتا چلا گیا۔

تھانیدار نے دو سپاہیوں کی مدد سے منور علی کو گرفت میں لے کر اس سے گن چھین لی۔

سکندر علی نے طبی امداد ملنے سے قبل ہی دم توڑ دیا۔

یہ قتل تھانیدار سمیت ایک درجن گواہوں کے سامنے ہوا تھا لیکن ایف آئی آر کے مطابق سکندر علی اپنی گن صاف کرتے ہوئے اچانک گولی چل جانے سے ہلاک ہو گیا تھا۔

اسد علی، سعدیہ بیگم اور اپنے بیوی بچوں سمیت بھٹ کر چلا گیا جہاں اس نے دوبارہ اپنی تدریسی ذمے داریاں سنبھال لیں۔ شام کو جب وہ کھلی ہوا میں چارپائی پر بیٹھ کر بھٹ کے باسیوں سے دکھ درد کی باتیں کرتا تو اسے زندگی بہت حسین محسوس ہوتی۔ یہ وہ جنت تھی جس سے وہ کسی قیمت پر محروم ہونا پسند نہیں کرتا تھا۔

جاسوسی ڈائجسٹ۔ جولائی 1993ء

ماحول اپنا اثر ضرور دکھاتا ہے۔ انسان اپنے اِرد گرد بکھرے ہوئے رنگوں سے دامن نہیں بچا سکتا۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ ہوتا ہے' وہاں کے طور طریقے اُسے اپنانے ہی پڑتے ہیں ورنہ بہت جلد وہ ایسی تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے جو بالآخر اس شعبے میں اس کا مستقبل ہی ختم کر دیتی ہے۔ اپنی پسند کی زندگی گزارنے والا وہ صحافی بھی اپنے ماحول کے رنگوں میں رنگ چکا تھا مگر اُس کی فطرت میں موجود جذبۂ خیر ابھی زندہ تھا۔ ایک معصوم لڑکی نے جب اُسے مدد کے لیے پُکارا تو وہ ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر ان درندوں کے مقابل جم گیا جو قوت و اقتدار کے ہر ہتھیار سے مسلح تھے لیکن اس راستے پر آگے بڑھتے ہوئے اُسے ہر ہر قدم پر حیرت کے ایسے شدید جھٹکے لگے کہ اُسے اپنا وجود ہی بے معنی محسوس ہونے لگا۔

زیبا فاروقی

ایک سرپھرے کرائم رپورٹر کو پیش آنے والے سنسنی خیز واقعات۔ دوسرا رنگ

میرا تعلق ملک کے ایک اہم اور کثیر الاشاعت انگلش روزنامے "ڈیلی نیشنل آبزور" سے ہے۔ میں کرائم رپورٹر ہوں۔ حسبِ معمول فلیش مکمل کر کے رات گئے اپنی کار میں گھر جا رہا تھا۔ باہر شدید سردی تھی لیکن گاڑی کا ہیٹر آن تھا اس لیے گاڑی میں خوش گوار حرارت تھی۔ اس دن میں نے خاصی لمبی بازی جیتی تھی اور بہت مسرور تھا۔

چلتے چلتے میری گاڑی نے دو تین جھٹکے لیے تو میں چونک اُٹھا۔ فیول گیج کی سوئی E کے نشان سے بھی نیچے لرز رہی تھی۔ میں ان دنوں نارتھ ناظم آباد میں رہ رہا تھا۔ وہ علاقہ ابھی پوری طرح آباد نہیں ہوا تھا۔ دور دور اِکّا دُکّا مکان نظر آ رہے تھے اس لیے کسی مدد کا ملنا بھی فضول تھا۔ ان دنوں وہ علاقہ مختلف قسم کی وارداتوں کے سلسلے میں بھی بدنام تھا مگر مجھے اس کی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ میں ہر وقت کولٹ پوائنٹ تھری ایٹ کے ریوالور سے مسلح رہتا تھا۔ مجھے لوٹنا ایسا ہی تھا جیسے کسی ہاتھی کے منہ سے گنا چھیننا۔ پریشانی تو مجھے یہ تھی کہ اس شدید سردی میں گھر تک پیدل ہی جانا پڑے گا اور میرا گھر وہاں سے خاصے فاصلے پر تھا۔ یہاں کہیں سے فون بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میں کسی کو فون کر کے ہی گاڑی منگوا لوں۔

میں ہمت کر کے گاڑی سے اُترا تو یخ ہوا کا ایک جھونکا میرے چہرے کو گویا چھیلتا ہوا گزر گیا۔ میں نے دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈالے اور گنگناتا ہوا گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ اور بات ہے کہ اردو کا وہ مشہور گانا اس وقت انگلش گانے کی طرز اختیار کر گیا تھا جو میں گنگنا رہا تھا۔ سڑک کے دونوں اطراف گھنی جھاڑیاں تھیں اور خالی پلاٹوں میں تو گویا پورے پورے جنگل اُگے ہوئے تھے۔

چلتے چلتے اچانک مجھے ٹھٹک جانا پڑا۔ ایسا لگا تھا جیسے کوئی گھُٹی گھُٹی آواز میں چیخا ہو۔ میں تھوڑی دیر کھڑا اس آواز پر غور کرتا رہا' پھر اسے اپنا وہم سمجھ کر آگے بڑھنا چاہا۔ ابھی چند قدم بڑھائے ہی تھے کہ آواز ایک مرتبہ پھر آئی۔ اس بار وہ آواز بالکل واضح تھی اور کوئی لڑکی دہشت زدہ انداز میں چیخی تھی۔ میں نے پھُرتی سے ریوالور نکالا اور آواز کی سمت جھپٹا۔ وہ آواز دائیں جانب کی جھاڑیوں سے آئی تھی۔ اس طرف کئی خالی پلاٹ تھے جن میں بے تحاشا جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ میں اندازے سے انہی جھاڑیوں کی طرف بڑھا تو آواز اس مرتبہ بالکل صاف اور واضح طور پر سُنائی دی۔ کوئی لڑکی خوشامد بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی "تمہیں اللہ کا واسطہ' مجھے قتل مت کرو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اپنی زبان بالکل بند رکھوں گی۔"

"خبردار!" میں گرج کر بولا "کوئی اپنی جگہ سے ہلنے نہ پائے۔ حوالدار احمد دین تم پیچھے سے جاؤ' کرم علی تم رحمت خان کو لے کر دائیں طرف رہو' میں اور منوّر سامنے سے جائیں گے۔" میں نے دھوکا دینے کو ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ جھاڑیوں میں کتنے آدمی ہیں۔ یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں وہ لڑکی کو نقصان نہ پہنچا دیں۔ اب انہیں یقین ہو گیا تھا کہ انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے اس لیے اب وہ لوگ کم از کم لڑکی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ میں نے ڈپٹ کر کہا "تم لوگ چاروں طرف سے گھیر لیے گئے ہو اس لیے خاموشی سے باہر نکل آؤ مگر پہلے اپنے ہتھیار باہر پھینک دو۔" پھر میں نے فرضی حوالدار کو مخاطب کیا "حوالدار! یہ لوگ اگر کوئی حرکت کرنے کی کوشش کریں تو انہیں بھون کر رکھ دینا۔ ہری اپ' جلدی سے اپنے ہتھیار باہر پھینکو اور اس لڑکی کو بھی بہ خیر و عافیت باہر بھیج دو' جلدی کرو۔"

سب سے پہلے ایک لڑکی کا ہیولا نمودار ہوا۔ چاند کی درمیانی تاریخیں تھیں اس لیے مجھے سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ لڑکی بُری طرح لڑکھڑا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ نشے میں ہو پھر وہ ریوالور میرے پاس آ کر گرے اور دوسرے ہی لمحے جھاڑیوں میں سے ایک عورت اور ایک مرد کا ہیولا برآمد ہوا۔

دوسری عورت کو دیکھ کر میں چونک اُٹھا۔ گو کہ مجھے اس کے خدوخال واضح نظر آ رہے تھے مگر اس کے نظروں کے سامنے آتے

ہی مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے میں نے اسے کہیں دیکھا ہے مگر یہ وقت ان باتوں پر غور کرنے کا نہیں تھا۔ مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ جھاڑیوں میں کوئی اور بھی چھپا ہوا نہ ہو۔ میں نے ایک مرتبہ پھر فرضی حوالدار کو مخاطب کیا "حوالدار! تم ان جھاڑیوں کی تلاشی لو اور جو بھی نظر آئے اسے گرفتار کرلو۔" پھر میں نے گرج کر اس شخص کو مخاطب کیا جو عورت کے ساتھ نمودار ہوا تھا "اپنے ہاتھ سر پر رکھو اور تم بھی!" میں نے عورت سے کہا۔

لڑکی گرتی پڑتی اس دوران میں میرے پاس آگئی تھی اور گھگیا کر مجھ سے کہہ رہی تھی "آفیسر، پلیز مجھے ان لوگوں سے بچالو.....یہ..... مجھے قتل کردیں گے۔"

"فکر مت کریں" میں نے لڑکی کو تسلی دی "اب کوئی آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔" پھر میں عورت سے مخاطب ہوا "تم نے سنا نہیں' میں نے کہا ہے کہ ہاتھ سر پر رکھو اور جھاڑیوں سے باہر نکل آؤ۔"

عورت نے میری بات سنی ان سنی کردی اور تمکنت سے میرے سامنے آٹھہری "تم شاید مجھے پہچانتے نہیں ہو آفیسر" اس نے سخت لہجے میں کہا "ورنہ یوں گفتگو نہ کرتے۔"

"میں جانتا ہوں کہ آپ ملکہ الزبتھ ہیں" میں نے مضحکہ خیز انداز میں کہا "مگر یہ فرمائیں کہ آپ ان جھاڑیوں میں کیا کررہی تھیں۔ کہیں کوئی چلہ یا عمل وغیرہ تو نہیں کررہی تھیں؟"

"تم کس تھانے میں ہو آفیسر؟" اس نے اس مرتبہ رعب ڈالنے کو انگلش میں سوال کیا۔

"سوال کرنے کا حق صرف مجھے ہے میڈم!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "آپ یہاں کیا کر رہی تھیں؟"

"تم شاید اب بھی مجھے نہیں پہچانے؟" عورت تلملا کر بولی۔ وہ نزدیک آئی تو اس کے خدوخال چاند کی روشنی میں واضح ہو گئے۔ اس کے باوجود مجھے یاد نہیں آیا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا ہے۔

"آپ کو اپنی پہچان کرانے کا اتنا ہی شوق ہے تو پھر بتا ہی دیں کہ آپ کون ہیں؟" میں نے کہا۔

"میں سعدیہ اکرام دُرّانی ہوں۔ معروف صنعت کار اکرام دُرّانی کی بیوی اور یہ میری بیٹی مومو ہے۔" اس نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

مجھے ایک دم یاد آگیا کہ میں سعدیہ دُرّانی کو اکثر مختلف تقریبات اور سماجی بہبود کی کانفرنسوں میں دیکھ چکا تھا۔ وہ خاصی بارسوخ عورت تھی۔ کہنے والے تو یہاں تک کہتے تھے کہ اپنے شوہر سے زیادہ اس کی پہنچ تھی بڑے لوگوں تک۔ اس نے خواتین کی بہبود کے لیے ایک انجمن بھی بنا رکھی تھی اور ملک کی اہم ترین شخصیات سے اس کے ذاتی تعلقات تھے۔ میں لمحے بھر کو محتاط ہو گیا مگر احسان صاحب کی تربیت میں رہ کر میں نے کسی سے بھی مرعوب ہونا نہیں سیکھا تھا۔ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "میڈم! میرا خیال ہے کہ آپ کا قیام ڈیفنس کے کسی شاندار بنگلے میں ہے، پھر آپ اس ویرانے میں کیا کر رہی ہیں۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ آپ محض چہل قدمی کرنے ان جھاڑیوں میں تشریف لائی تھیں۔"

اب حیران ہونے کی باری اس کی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت نمایاں ہو گئی تھی۔ وہ مجھے سب انسپکٹر یا انسپکٹر کے رینک کا کوئی پولیس افسر سمجھ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں اسے پہچانتے ہی اس کی خوشامد کروں گا اور ہاتھ جوڑ کر کہوں گا کہ میڈم! مجھ سے بہت بڑی بھول ہو گئی۔ معافی چاہتا ہوں کہ اندھیرے میں آپ کو پہچان نہ سکا۔ اب آپ جا سکتی ہیں مگر میری طرف سے جو ردِعمل ہوا اس پر تو اسے واقعی حیرت ہونا چاہیے تھی۔

"میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے میڈم!" میں نے سخت لہجے میں کہا "آپ اس وقت ان جھاڑیوں میں کیا کر رہی تھیں؟ اگر آپ مجھے مطمئن نہ کر سکیں تو پھر آپ کو میرے ساتھ تھانے چلنا پڑے گا۔"

"تم ہوش میں تو ہو؟" وہ غرا کر بولی "تم.... تم مجھے تھانے لے جاؤ گے، تم دو ٹکے کے پولیس افسر مسز دُرّانی کو تھانے لے جاؤ گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ملازمت کے ساتھ ساتھ تم اپنی زندگی سے بھی بیزار ہو۔"

"بکواس بند کرو اور میری بات کا جواب دو" میں چیخ کر بولا۔ اس کے اندازِ گفتگو پر مجھے ایک دم غصہ آگیا تھا "تم نے اور تمہارے ساتھی نے اس لڑکی کو قتل کرنے کی کوشش کیوں کی؟"

"یو باسٹرڈ!" وہ بھڑک کر بولی "یہ میری سوتیلی بیٹی ماریا ہے۔ اس پر اکثر دیوانگی کے دورے پڑتے ہیں۔ شہر کے کئی دماغی امراض کے ماہر اس بات کی گواہی دیں گے کہ یہ ابنارمل ہے۔ میں اسے کبھی تنہا نہیں چھوڑتی۔ آج اسے موقع مل گیا اور یہ اپنی اسپورٹس کار میں گھر سے نکل بھاگی۔ وہ تو میرے سیکریٹری شہباز نے اسے دیکھ لیا اور ہم دونوں اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آگئے۔ ہم نے بہ مشکل تمام اسے روکا اور جب واپس گھر لے جانا چاہا تو اس پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا۔"

"آپ کی کہانی تو اچھی ہے مگر اس میں کئی جگہ جھول ہے۔ مثلاً آپ نے اسے روکا کیسے؟ ابنارمل آدمی اگر گاڑی کے اسٹیئرنگ پر ہو تو پھر اسے روکنا اتنا آسان نہیں ہوتا، اور روک ہی لیا تھا تو آپ اس وقت اسے زبردستی اپنی گاڑی میں بٹھا سکتی تھیں۔ ان جھاڑیوں تک لانے کی کیا ضرورت تھی۔ سب سے آخری بات یہ ہے کہ میں نے جو آوازیں سُنی تھیں ان سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی اس کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ کوشش کروں گا تو اس کے گلے پر انگلیوں کے نشانات بھی مل جائیں گے۔ میں تھانے تو خیر آپ کو ہر صورت میں لے جاؤں گا چاہے آپ کی حیثیت کچھ بھی ہو۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟" وہ ایسے تحقیر آمیز انداز میں بولی جیسے کسی گھریلو ملازم سے بات کر رہی ہو "اور تم کس تھانے میں ہو۔ ذرا اپنا رینک بھی بتا دو۔ میں ابھی آئی جی سے بات کرتی ہوں۔"

"آپ آئی جی سے بات کریں یا ہوم منسٹر سے، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں اس لیے مجھے کوئی بھاری بھرکم نام لے کر مرعوب کرنے کی کوشش نہ کریں۔ رہا تھانے اور میرے رینک کا سوال تو فار یور کائنڈ انفارمیشن، میرا تعلق کسی تھانے سے نہیں ہے اور ظاہر ہے جب میرا تعلق پولیس سے ہے ہی نہیں تو پھر رینک کیسا! مگر اس کے باوجود تھانے تو میں لے جاؤں گا۔"

"تم ہو کون؟" مسز دُرّانی اس انکشاف پر ایک دم شیر ہو گئی "اس ریوالور کے بل بوتے پر ہمیں لوٹنا چاہتے ہو، مجھے لوٹو گے، مجھے!"

اس دوران میں لمحے بھر کو میرا دھیان اس کے سیکریٹری کی طرف سے ہٹ گیا تھا۔ اس نے اچانک مجھ پر چھلانگ لگائی اور مجھے لیے ہوئے زمین پر گر گیا۔ اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ لڑنے بھڑنے کے فن میں اناڑی نہیں ہے۔ اس کے اچانک حملے سے میرا ریوالور جھٹکے سے دور جا گرا۔ وہ کمبخت کسی گینڈے کی طرح طاقتور تھا۔ ذرا سی دیر میں اس نے مجھے رگید کر رکھ دیا پھر اچانک ہی گویا میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ موقعے سے فائدہ اُٹھا کے مسز دُرّانی نے بڑا سا ایک پتھر میرے سر پر دے مارا تھا۔ یا تو میری کھوپڑی بہت مضبوط تھی یا وار بھرپور نہیں ہوا تھا اس لیے پتھر کی ضرب سے وہ ٹکڑوں میں تبدیل ہونے سے محفوظ رہی، البتہ میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ آخری آوازیں جو میں نے سُنیں وہ کسی کی نسوانی چیخیں تھیں۔ شاید ماریا چیخ رہی تھی، پھر میں نے کار اسٹارٹ ہونے کی آواز سُنی، اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔

ہوش آیا تو کئی لمحے تک مجھے علم نہ ہو سکا کہ میں کہاں ہوں پھر ایک دم مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ میں ابھی تک انہی جھاڑیوں میں پڑا تھا۔ میرا سر پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔ میں نے سر پر ہاتھ پھیرا تو چپچپاہٹ سی محسوس ہوئی۔ پتھر کی ضرب سے میرا سر پھٹ گیا تھا۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ مجھے بے ہوش ہوئے مشکل سے دس منٹ گزرے تھے۔ میں نے اُٹھنا چاہا تو بہت زور کا چکر آیا اور میں گھبرا کر پھر بیٹھ گیا مگر میں ساری رات تو وہاں بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے' ماریا کی بھی فکر تھی کہ وہ بدبخت اسے ہلاک نہ کر دیں۔

میں ہمت کر کے بمشکل تمام اُٹھ کھڑا ہوا۔ چلتے ہوئے سر میں دھمک سی ہو رہی تھی۔ وہ لوگ میرا ریوالور بھی لے گئے تھے' رقم اور دیگر چیزیں البتہ محفوظ تھیں۔

میں روڈ پر پہنچا تو خاصی حد تک خود کو سنبھال چکا تھا۔ سر میں تکلیف تو اب بھی تھی مگر پہلے جیسی شدت نہیں رہی تھی۔ میں جس علاقے میں تھا' وہ ناظم آباد تھانے کی حدود میں شامل تھا کیونکہ نارتھ ناظم آباد میں اس وقت تک کوئی پولیس اسٹیشن قائم نہیں ہوا تھا۔ میرا گھر بھی وہاں سے تقریباً اتنے ہی فاصلے پر تھا جتنے فاصلے پر تھانہ تھا۔ ایک لمحے کو میں نے سوچا کہ میں گھر چلا جاؤں' بعد میں اس معاملے کو دیکھا جائے گا مگر پھر خود ہی میں نے اس خیال کو مسترد کر دیا۔ ایک لڑکی کی زندگی خطرے میں تھی۔ ممکن ہے میری ذرا سی کوتاہی سے اس کی جان چلی جاتی چنانچہ میں نے فوری طور پر تھانے جانے کا فیصلہ کر لیا لیکن اب مجھے رہ رہ کر خود پر غصہ آ رہا تھا کہ آخر چلنے سے پہلے گاڑی کا فیول گیج چیک کیوں نہیں کیا مگر اس وقت تو مجھے کچھ خیال ہی نہیں رہا تھا۔ میں جیت کی دُھن میں مگن تھا۔

اس دن بازی خاصی لمبی ہو چکی تھی۔ میز پر نوٹوں کا ایک ڈھیر تھا اور میں مسلسل چالیں چل رہا تھا۔ میرے مقابل کھیلنے والے ایک ایک کر کے پیک ہو چکے تھے مگر ایک شخص ابھی تک ڈٹا ہوا تھا۔ بالآخر جب میں نے چال دس ہزار سے بڑھا کر بیس ہزار کی تو اس کا حوصلہ بھی جواب دے گیا۔ اب دو صورتیں تھیں یا تو وہ اتنی ہی رقم دے کر میرے پتے شو کرواتا یا پھر خاموشی سے میدان چھوڑ دیتا۔ اس نے دوسرے طریقے پر عمل کرنا مناسب سمجھا' اپنے پتے پھینک دیے اور شکست خوردہ لہجے میں بولا "جیتو۔"

میں نے اپنے پتے گڈی میں ملانا چاہے تو اس نے پتے دیکھنے پر اصرار کیا مگر میں نے انکار کر دیا اور کہا "مال پھینکو اور پتے دیکھ لو" اس کی ناگواری کی پروا کیے بغیر میں نے پتے گڈی میں ملائے اور میز پر پڑی ہوئی رقم اپنی طرف سمیٹ لی۔ نوٹ جلدی جلدی اپنی مختلف جیبوں میں ٹھونسے اور گھڑی دیکھ کر بولا "اوکے ایوری باڈی' میرا وقت ختم ہو چکا ہے بلکہ دس منٹ زیادہ ہی ہو چکے ہیں' اس لیے میں چلا۔"

"وھاٹ ڈو یو مین بائی میں چلا" ایس پی رشید چمک کر بولا۔ وہ ابھی حال ہی میں ہمارے حلقے میں شامل ہوا تھا "کھیل تو تمہیں پورا کھیلنا پڑے گا مسٹر کامران!"

"میرا خیال ہے کہ میں یہ بازی پوری کر کے اُٹھ رہا ہوں مائی ڈیر ایس پی" میں نے کہا۔ "اور میں کھیل شروع ہونے سے پہلے ہی بتا چکا تھا کہ میں ایک بجے اُٹھ جاؤں گا۔"

"تم مجھے کیا بے وقوف سمجھتے ہو؟" رشید جھلا کر بولا۔

"اس میں سمجھنے کی کیا بات ہے؟" میرا لہجہ استہزائیہ تھا "اب میں چلتا ہوں۔"

"ٹھہرو کامران!" رشید سرد لہجے میں بولا "یا تو کھیلو یا پھر جیتی ہوئی رقم واپس کرو۔"

میں نے غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا' پھر سرد لہجے میں بولا "اپنا لہجہ درست کرو ایس پی صاحب! تم اس علاقے میں نئے آئے ہو اس لیے مجھے اچھی طرح جانتے نہیں۔ میں اس لہجے کا عادی نہیں ہوں' سمجھے۔ میں جا رہا ہوں' روک سکتے ہو تو روک لو" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا "یہ کوئی نتھو یا فتو کا اڈا نہیں ہے' یہاں شہر کے "معززین" موجود ہیں۔ تمہیں شاید اس قسم کی کسی محفل میں بیٹھنے کا پہلی دفعہ اتفاق ہوا ہے۔"

"یار کامران' کیوں بات بڑھاتے ہو" عثمان میمن نے کہا۔ وہ کروڑپتی باپ کا بیٹا تھا اور کئی ملوں کا بلا شرکت غیرے مالک بھی تھا "تھوڑی دیر اور بیٹھ جاؤ۔"

"ہرگز نہیں" میں نے سخت لہجے میں کہا "جب میں نے کہہ دیا کہ میں ایک بجے اُٹھ جاؤں گا تو پھر اس میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں ہے۔ تم سب مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔"

وہاں سوائے ایس پی رشید کے ہر شخص میرے مزاج سے واقف تھا۔ وہ سب شہر کے دولت مند ترین طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ عثمان میمن کے علاوہ وہاں چوہدری اصغر تھا جو محض عیاشی کرنے پنجاب سے کراچی آتا تھا' علی نواز تھا جو ایک شوگر مل کا مالک تھا' اسلام الدین تھا جو کراچی کی ایک آئل مل اور فیصل آباد کی دو ٹیکسٹائل ملز کا مالک تھا۔ انکم ٹیکس کا ڈپٹی ڈائریکٹر محمد شفیع تھا' کسٹم کا راجا انور تھا۔ یہ سب لوگ مجھے خوب اچھی طرح جانتے تھے اس لیے عثمان میمن کے بعد کسی نے بھی مجھ سے رُکنے کو نہیں کہا۔

میں دروازے کی طرف بڑھا اور ایس پی رشید نے تپے ہوئے لہجے میں کہا "آج کی بات یاد رکھنا کامران' میں تمہیں دیکھ لوں گا۔"

"چشمہ لگا کر دیکھنا" میں نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا اور فلیٹ سے باہر نکل آیا۔ یہ فلیٹ بھی عثمان میمن کا تھا جو اس نے محض عیاشی کے لیے وقف کر رکھا تھا۔

باہر شدید سردی تھی۔ کراچی میں عموماً اتنی سردی پڑتی نہیں ہے مگر اس سال تو سردی نے اگلے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ دیے

تھے۔ میں نے جیکٹ کی زپ اچھی طرح بند کی بلکہ کالر کا اوپر والا بٹن تک بند کرلیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔

○☆○

میرا تعلق پاکستان کے اس خطے سے ہے جہاں کے متعلق مشہور ہے کہ وہاں کی مائیں فوجی افسروں کو جنم دیتی ہیں۔ جی ہاں' آپ کا اندازہ درست ہے۔ میرا تعلق جہلم سے ہے مگر میں فوجی افسر نہیں ہوں۔ نسل در نسل سے میرے خاندان کا پیشہ سپہ گری ہے۔ میرے والد بھی آرمی کے ایک بڑے افسر ہیں اور تینوں بڑے بھائی بھی فوج میں مختلف عہدوں پر فائز ہیں مگر نہ جانے کیوں میری طبیعت اس طرف مائل نہیں ہوئی۔ شاید یہ میری طبیعت کا لاابالی پن تھا جس نے مجھے فوج میں جانے سے روکا۔ شروع ہی سے میں ڈسپلن اور پابندیوں سے نفرت کرتا تھا۔ بچپن میں تو بلاناغہ مختلف حرکتوں پر میری پٹائی ہوتی تھی۔ میں نے انٹر کیا تو پاپا نے مجھے بھی آرمی میں بھیجنا چاہا مگر میں نے انکار کردیا۔ میرے انکار پر ہفتوں گھر میں بحث ہوتی رہی۔ پاپا کا استدلال تھا کہ تو فوج میں نوکری نہیں کرے گا تو پھر کیا کرے گا؟ انہوں نے مجھے ایک طویل لیکچر دیا۔ اپنے آباواجداد کی خدمات کا حوالہ دیا۔ دادا جان کا وہ وکٹوریہ کراس بھی دکھایا جو انہیں پہلی جنگ عظیم میں ملا تھا۔ اپنے مختلف تمغے دکھائے' بڑے بھائیوں کے حوالے دیے۔ مختلف کزنز' چاچوں اور ماموؤں کے نام لیے مگر میں ٹس سے مس نہ ہوا۔ میری ایک ہی ضد تھی کہ میں فوج میں ملازمت نہیں کروں گا۔

گھر بھر میں کوئی میرا حامی نہیں تھا سوائے میری امی کے۔ پہلے تو انہوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی پھر مجھ سے مایوس ہو کر پاپا سے اُلجھ پڑیں کہ جب وہ فوجی ملازمت نہیں کرنا چاہتا تو آخر آپ کو کیا ضد ہے؟؟

پاپا بھی آخر فوجی تھے پھر وہ میرے ہی تو باپ تھے۔ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر کامران کو میرا فیصلہ منظور نہیں ہے تو اپنا بوریا بستر سمیٹے اور یہاں سے دفع ہو جائے۔ مجھے ایسے نکمے بیٹے کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں جانتا تھا کہ اب یا تو مجھے ان کی بات ماننا پڑے گی یا پھر مجھے گھر چھوڑنا پڑے گا۔ مجھے بھی ضد ہو گئی تھی کہ اپنے مستقبل کا فیصلہ اپنی مرضی سے کروں گا۔ میں نے بھی گھر چھوڑنے کا فیصلہ سُنا دیا۔

جب میں جا رہا تھا تو پاپا نے طنزیہ لہجے میں کہا "جب بھوکوں مرنے لگو تو انا کو بالائے طاق رکھ کر گھر لوٹ آنا۔ اور نہ' چلے ہیں گھر چھوڑ کے" پاپا نے منہ بنایا۔

میں نے ان کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور آگے بڑھ گیا۔ ڈیوڑھی میں امی اور فرحانہ کھڑی تھیں۔ امی بُری طرح سسک رہی تھیں اور فرحانہ بھی زاروقطار رو رہی تھی۔ فرحانہ گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ سب سے چھوٹی بہن تھی اس لیے ہر بھائی اس کا خیال رکھتا تھا مگر وہ مجھ پر جان چھڑکتی تھی۔ میں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور گلوگیر لہجے میں بولا "روتی کیوں ہے پگلی! میں ایک دن کچھ بن کے واپس آؤں گا اور تجھے اور امی کو ساتھ لے جاؤں گا۔"

تینوں بڑے بھائیوں میں سے اس وقت کوئی بھی موجود نہ تھا۔ سب سے بڑے عدنان بھائی میجر تھے اور وہ ان دنوں کھاریاں میں تھے' ان سے چھوٹے عمران کیپٹن تھے اور وہ کوئٹہ میں تھے' ان کے بعد نعمان کا نمبر تھا۔ وہ مجھ سے صرف دو سال بڑا تھا اس لیے میں اس سے زیادہ فری تھا۔ نعمان بھی حال ہی میں کیپٹن ہوا تھا اور اس کی پوسٹنگ سرگودھا میں تھی۔

پہلے میں نے سوچا تھا کہ یہاں سے سیدھا سرگودھا جاؤں گا اور وہیں کچھ دن اطمینان سے رہ کے آئندہ کا لائحہ عمل طے کروں گا مگر پھر میں نے خود ہی اپنے اس ارادے کو مسترد کردیا۔ ظاہر ہے نعمان بھی یہی چاہتا تھا کہ میں آرمی جوائن کروں۔ ممکن ہے اس موضوع پر اس سے میری تلخ کلامی ہو جاتی اس لیے میں نے سرگودھا جانے کا خیال بھی دل سے نکال دیا۔

پاپا کی پوسٹنگ ان دنوں سیالکوٹ میں تھی۔ میں وہاں سے سیدھا اسٹیشن پہنچا اور لاہور جانے والی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ لاہور میں میرے دو تین دوست تھے جو میرے ساتھ لارنس کالج گھوڑا گلی میں پڑھتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ ان کے توسط سے مجھے کہیں ملازمت بھی مل جائے گی اور سر چھپانے کو ٹھکانا بھی۔ میرا ارادہ تھا کہ فوری طور پر جو بھی ملازمت ملی اسے قبول کرلوں گا اور پرائیویٹ طور پر اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھوں گا۔

ارشد میرا گہرا دوست تھا۔ ہم نے ہوسٹل کے ایک کمرے میں چھ سال گزارے تھے۔ اس کے والد لاہور کے خاصے بڑے بزنس مین تھے۔ اسٹیشن سے سیدھا میں اسی کے گھر پہنچا۔ وہ اچانک مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا اور خوشی سے لبریز لہجے میں بولا "ہیلو' پرنس! کیسے بھول پڑا اِدھر!" وہ مجھے ہمیشہ پرنس ہی کہتا تھا۔

"بس یار' حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ مجھے لاہور آنا پڑا" میں نے جواب دیا۔

"اچھا تو نہا دھو کر فریش ہو جا' باقی باتیں بعد میں" اس نے مجھے باتھ روم میں دھکیل دیا۔

شام کی چائے پر ارشد کے علاوہ اس کے ممی ڈیڈی اور دونوں بہنیں نازیہ اور شازیہ بھی موجود تھیں۔ میں کئی دفعہ پہلے بھی لاہور آچکا تھا اس لیے وہ سبھی مجھ سے بے تکلف تھے۔

"ہاں بھئی' اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟" ارشد کے ڈیڈی نے سرسری انداز میں پوچھا۔ "کب جا رہے ہو ملٹری اکیڈمی؟"

"ڈیڈی' وہاں جانے سے پہلے بہت سارے مرحلے ہوتے ہیں" ارشد نے ہنس کر کہا "یہ کیا ڈائریکٹ اکیڈمی جائے گا۔"

"انکل' میں آرمی جوائن نہیں کروں گا" میں نے آہستہ سے کہا "اسی بات پر پاپا نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ ان کی یہی شرط

ہے کہ آرمی جوائن کرو تو ہم سے تعلق رکھو۔"

"اور تم نے گھر چھوڑ دیا؟" آنٹی نے حیرت سے مجھے دیکھا "محض اس لیے کہ تم آرمی جوائن نہیں کرنا چاہتے۔"

"جی ہاں" میں نے جواب دیا پھر ارشد کے ڈیڈی سے مخاطب ہوا "انکل' میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے کوئی جاب دلا دیں۔ میں اس کے ساتھ ساتھ پڑھتا بھی رہوں گا۔"

"کامران بیٹے!" انکل نے سنجیدگی سے کہا "تمہیں اندازہ ہے کہ اس وقت تمہاری تعلیمی قابلیت کیا ہے؟ محض ایف اے اور آج کل تو دفتروں میں چپراسی بھی بی اے پاس ہوتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ تم نے تعلیم مری کے مہنگے ترین کالج میں حاصل کی ہے مگر ڈگری کی ویلیو تو وہی ہے نا! اب اگر میں تمہیں کہیں کلرک لگوا دوں تو کیا یہ مناسب ہو گا؟ اپنے پاپا کی بات مان لو بیٹا۔ آرمی میں کمیشن حاصل کرنے کو تو لوگ ترستے ہیں۔ تم اس باعزت جاب کو ٹھکرا رہے ہو۔ میری مانو تو گھر لوٹ جاؤ۔"

مجھے ایک دم غصہ آ گیا۔ میں نے اپنے غصے پر بہ مشکل تمام قابو پایا اور حتی الامکان نارمل لہجے میں بولا "ٹھیک ہے انکل' اگر آپ کی بھی یہی رائے ہے تو پھر مجھے گھر جانا ہی پڑے گا" میں نے انہیں ٹالنے کو کہا۔ میں اس وقت بحث کرنے کے موڈ میں نہیں تھا کہ مبادا میرے تعلقات ارشد سے بھی خراب ہو جائیں۔

اس واقعے کے بعد میں نے طے کر لیا کہ جو کچھ بھی کروں گا وہ اپنے بل بوتے پر کروں گا' کسی شناسا یا دوست کا سہارا نہیں لوں گا۔ ہر آدمی مجھی کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں تو یہ بھی فیصلہ کر چکا تھا کہ اب لاہور میں بھی نہیں رہوں گا۔ وہاں میرے کئی رشتے دار تھے' کزنز تھے اور ایک ماموں بھی تھے۔ میں ان سب لوگوں سے بچنا چاہتا تھا اس لیے میں نے کراچی جانے کا فیصلہ کر لیا۔

ارشد سے سیالکوٹ جانے کا بہانہ بنا کے میں دوسرے ہی دن تیزگام میں سوار ہو گیا۔ میرے مالی حالات دگرگوں تھے' کل کی کچھ خبر نہیں تھی مگر دماغ میں ابھی افسروں کے بیٹوں والی خو بو باقی تھی اس لیے میں نے ائرکنڈیشنڈ کوچ میں سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔ شاید ایسا غیر ارادی طور پر ہوا تھا کیونکہ اب تک میں اسی کلاس میں سفر کرتا آیا تھا۔ اپنی اس "عیاشی" کا احساس تو مجھے اس وقت ہوا جب میں نے اپنی جمع پونجی کا جائزہ لیا۔ میری جیب میں اس وقت صرف ایک سو ستائیس روپے تھے۔ ممکن ہے اگر گاڑی روانہ نہ ہو چکی ہوتی تو شاید میں ٹکٹ واپس کر کے تھرڈ کلاس میں سفر کر لیتا مگر اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

اس وقت تک بوگی میں میرے علاوہ ایک صاحب اور تھے۔ جب میں اپنی بچی کھچی رقم کا جائزہ لے رہا تھا تو وہ بہ غور میری طرف دیکھ رہے تھے۔ حالانکہ میرا خیال تھا کہ وہ میگزین کے مطالعے میں مصروف ہیں۔ میں شاید کچھ زیادہ ہی پریشان ہو گیا تھا۔ انہوں نے اچانک مجھے مخاطب کیا "بیٹا' تمہاری کوئی چیز کھو تو نہیں گئی؟ میں کافی دیر سے تمہیں پریشان دیکھ رہا ہوں' بار بار جیبیں ٹٹول رہے ہو' پیسے تو نہیں گر گئے؟" میں نے پہلی دفعہ بہ غور ان کا جائزہ لیا۔ ان کی عمر چالیس پینتالیس سال کے درمیان ہوگی مگر صحت قابلِ رشک تھی' بال کن پٹیوں پر سے سفید ہو چلے تھے' رنگت سُرخ و سفید اور جسم کسرتی تھا۔ انہوں نے اتنی اپنائیت سے مجھے مخاطب کیا تھا کہ میرا دل بھر آیا۔ میں نے افسردہ لہجے میں کہا "انکل' میری کوئی چیز نہیں کھوئی ہے مگر میں سب کچھ کھو بیٹھا ہوں۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو بیٹا؟" وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے۔

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں اپنی مرضی سے جینے کا حق بھی کھو بیٹھا ہوں۔ انکل' کیا یہ ضروری ہے کہ کسی بیوروکریٹ کا بیٹا بھی بیوروکریٹ اور پروفیسر کا بیٹا بھی پروفیسر ہی بنے! کیا یہ ضروری ہے کہ باپ سائنس دان ہو تو بیٹے کو بھی سائنس داں بننے پر مجبور کیا جائے؟"

"بالکل ضروری نہیں ہے۔" انہوں نے مسکرا کر کہا "تم بتاؤ' تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟"

میں نے الف سے یے تک انہیں سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔ وہ میری بات سُن کر گہری سوچ میں غرق ہو گئے۔ میں نے کہا "اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں کیا کروں؟"

"تم سب سے پہلے تو یہ کرو کہ اپنی تعلیم مکمل کر لو۔ اس کے بعد ہی کچھ کر سکو گے" انہوں نے کہا پھر مسکرا کر بولے "ویسے تم اپنے حلیے' قد و قامت اور اسٹائل سے لگتے تو فوجی افسر ہی ہو۔ تمہارے پاپا کا خیال غلط نہیں تھا" پھر میرے چہرے پر ناگواری کے تاثرات دیکھ کر جلدی سے بولے "کرنے کے لیے تو بے شمار کام ہیں۔ میں ملک کے ایک کثیرالاشاعت انگلش ڈیلی کا کرائم رپورٹر ہوں۔ اس جاب میں خاصا ایڈونچر بھی ہے۔ کیا تم کرائم رپورٹر بننا پسند کرو گے؟"

یہ احسن صاحب سے میری پہلی ملاقات تھی پھر یہ پہلی ہی ملاقات اتنی دیرپا ثابت ہوئی کہ وہ مجھے اسٹیشن سے اپنے گھر لے آئے۔ ان کے گھر میں کل چار افراد تھے۔ ایک وہ خود' ایک ان کی بیگم اور چھوٹے چھوٹے دو بچے گڈو اور ببلی!

احسن صاحب نے مجھے کرائم رپورٹنگ بلکہ ہر قسم کی رپورٹنگ میں طاق کر دیا۔ میں ان کی ماتحتی میں جاب بھی کرتا رہا اور اپنا تعلیمی سلسلہ بھی جاری رکھا پھر انہیں ایک غیر ملکی ایجنسی سے بہت اچھی ملازمت کی آفر ہوئی تو وہ فیملی سمیت وہاں شفٹ ہو گئے۔ اخبار میں ان کا جانشین میں ہی تھا اس لیے ان کی جگہ مجھے مل گئی۔

اب شہر کا کوئی تھانہ ایسا نہیں تھا جس کا انچارج مجھ سے واقف نہ ہو۔ پولیس کے بڑے بڑے افسر مجھ سے خوف زدہ رہتے تھے۔ میری آمدنی کا بڑا حصہ پولیس افسروں اور مختلف تھانوں کے

انچارجوں سے بٹوری ہوئی رقم پر مشتمل تھا۔ میں خوب دھڑلے سے انہیں بلیک میل کرتا تھا۔ ہر افسر کی کوئی نہ کوئی دکھتی رگ میرے ہاتھ میں تھی۔ پولیس تو پولیس میں تو بہت سے ایم این ایز اور ایم پی ایز کو بھی اپنی مٹھی میں رکھتا تھا۔ احسن صاحب میں اور مجھ میں یہی فرق تھا۔ وہ رشوت کو گناہ سمجھتے تھے اور میں اسے اپنا حق سمجھتا تھا۔

میرا خیال ہے کہ کراچی کا ہر پولیس افسر میرا دشمن تھا مگر وہ بے چارے میرے خلاف کچھ کر بھی تو نہیں سکتے تھے۔

○☆○

سڑک کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس سے روشن ہو گئی تھی۔ میں چونک کر ماضی سے حال میں واپس آگیا۔ میں نے خاصا فاصلہ پیدل طے کرلیا تھا مگر اب بھی تھانے کا فاصلہ وہاں سے تقریباً دو ڈھائی میل تو ہوگا۔

میں سڑک کے کنارے کھڑا ہو گیا اور زور زور سے ہاتھ ہلا کر اسے رُکنے کے اشارے کرنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ ان حالات میں کوئی بھی شخص رُکنے کی حماقت نہیں کرے گا۔ اتنا احمق تو کوئی بھی نہیں ہوتا جو گاڑی روک کر خود ہی لٹ جائے مگر اس کے باوجود میں اسے روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

گاڑی میرے نزدیک پہنچ کر کچھ آہستہ ہوئی پھر زناٹے سے نکل گئی۔ اچانک مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ کار کے ڈرائیور نے اچانک بریک لگائے اور گاڑی کافی دور تک گھسٹتی چلی گئی پھر وہ اسی تیز رفتاری سے ریورس ہوئی اور میرے نزدیک آٹھہری "جی فرمایئے؟" ڈرائیور نے مہذب لہجے میں پوچھا۔

"کیا آپ ناظم آباد تھانے تک مجھے لفٹ دے سکیں گے؟" میں نے اردو کے بجائے انگلش میں کہا تاکہ اسے یقین ہو جائے کہ جسے وہ لفٹ دے رہا ہے۔ وہ کوئی تعلیم یافتہ اور مہذب شخص ہے۔

"آف کورس!" اس نے خوش دلی سے کہا اور گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ گاڑی کا ہیٹر آن تھا اور اندر کا درجۂ حرارت خاصا خوش گوار تھا "میرا خیال ہے کہ آپ کے ساتھ بھی کوئی ٹریجڈی ہو گئی ہے؟" اس نے تشویش سے پوچھا "آپ زخمی بھی ہیں اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں پہلے آپ کو ہاسپٹل لے چلوں۔ میں ڈاکٹر ہوں اور اس وقت ڈیوٹی پر جا رہا ہوں' میرا نام ساجد ہے۔"

"آپ کا بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب!" میں نے ممنونیت سے کہا "معمولی سی چوٹ آئی ہے میرے سر میں مگر فوری طور پر میرا تھانے پہنچنا ضروری ہے۔ ایک زندگی خطرے میں ہے۔"

"آپ کے ساتھ کوئی واردات تو نہیں ہو گئی۔ اس علاقے میں تو آئے دن اس قسم کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔ میں خود کئی دفعہ بچا ہوں" ڈاکٹر مسکرا کر بولا۔

"میرے ساتھ واردات تو ضرور ہوئی ہے مگر اس قسم کی نہیں جیسی آپ سمجھ رہے ہیں۔ مجھے لوٹنا اتنا آسان نہیں ہے ڈاکٹر!"

میں نے ہنس کے کہا اور دل ہی دل میں سوچا کہ میں تو خود پولیس کو لوٹتا ہوں۔ "میں کامران ہوں' ڈیلی نیشنل آبزرور کا کرائم رپورٹر!"

"اوہو' آپ ہیں کامران!" ڈاکٹر نے خوش گوار حیرت سے کہا "نام تو بہت سُنا ہے آپ کا مگر دیکھنے کا اتفاق پہلی دفعہ ہوا ہے۔ آپ تو کسی طرف سے بھی جرنلسٹ نہیں لگتے" وہ ہنس کر بولا "بلکہ آپ تو اپنے حلیے اور قدو قامت سے فوجی افسر لگتے ہیں۔"

"ضروری ہے کہ جرنلسٹ دُبلا پتلا بلکہ نحیف و نزار ہو' اس کے چہرے پر موٹے شیشوں کا چشمہ ہو اور....."

"میرا مقصد یہ نہیں تھا مسٹر کامران!" ڈاکٹر جلدی سے بولا "عمومی تاثر یہی ہے کہ جرنلسٹ عموماً اسی قسم کے ہوتے ہیں۔"

اس کا کہنا بھی درست تھا کیوں کہ نسل در نسل سے ہمارا پیشہ سپاہ گری ہی تو تھا۔ وہی خصوصیات مجھے بھی وراثت میں ملی تھیں۔ بہ قول پاپا کے نہ جانے کامران کو کس کی نظر کھا گئی کہ اس نے رائفل اور ریوالور چھوڑ کر قلم ہاتھ میں لے لیا۔ ڈاکٹر اگر مجھے فوجی سمجھ رہا تھا تو اس میں اس بے چارے کا کیا قصور تھا؟ پھر مجھے مسز درانی کا خیال آیا۔ اس نے اب تک متعلقہ تھانے کو ہدایت کر دی ہوگی کہ اس کے خلاف کسی قسم کی کوئی رپورٹ درج نہ کی جائے۔ میں دل ہی دل میں اس کی خوش گمانی پر ہنسا۔ ابھی تک تو کراچی میں کوئی ایسا تھانہ وجود میں نہیں آیا تھا جس کا انچارج میری بات ماننے سے انکار کرے۔ ایک آدھ سر پھرے نے مجھے تھانیداری دکھانا چاہی تھی تو میں نے اس کا تبادلہ ایسی دور دراز جگہ کروا دیا تھا کہ اس کے ہوش ٹھکانے آگئے تھے۔ ان میں کئی پولیس افسر دیانت دار بھی تھے۔ میں ان کی قدر بھی کرتا تھا اور حتی المقدور ان کی مدد بھی کر دیا کرتا تھا مگر ایسے لوگ آٹے میں نمک کے برابر تھے۔

"ہم لوگ تھانے پہنچ چکے ہیں" ڈاکٹر ساجد نے مجھے چونکا دیا۔

"تھینک یو ویری مچ ڈاکٹر" میں نے کہا اور دروازہ کھول کر نیچے اُتر گیا۔

"میری مدد کی ضرورت ہو تو میں آپ کا انتظار کروں؟" ڈاکٹر نے خلوص سے پوچھا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ ڈاکٹر!" میں نے پُر تشکر لہجے میں کہا "میں یہاں سے فون کر کے کوئی گاڑی منگالوں گا۔ آپ مزید زحمت نہ کریں۔ سی یو" میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

ڈاکٹر نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھاما پھر اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر مجھے دیا اور بولا "کبھی میری ضرورت پڑے تو مجھے یاد کر لیجیے گا مسٹر کامران' خدا حافظ۔"

اپنا حلیہ تو میں کسی حد تک گاڑی ہی میں درست کر چکا تھا۔ ڈاکٹر کو رخصت کرنے کے بعد میں باوقار انداز میں تھانے کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ گیٹ پر کھڑے ہوئے سنتری نے کچھ کہنا چاہا مگر پھر شاید میرے تیور دیکھ کر مرعوب ہو گیا۔ میں سیدھا

انچارج کے کمرے میں پہنچا۔ اس کے کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ برآمدے میں کرخت چہرے والا ایک کانسٹیبل کھڑا تھا۔ اس نے سر سے پیر تک بہ غور میرا جائزہ لیا' پھر اکھڑ لہجے میں بولا "فرماؤ سر' کیسے زحمت کی؟"

"انچارج کہاں ہے تمہارا؟" میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"وہ علاقہ گشت پر نکلے ہیں' حکم؟"

برآمدے میں قدِ آدم آئینہ لگا تھا جس پر سرخ رنگ سے "کیا میں قابلِ عزت ہوں" کے الفاظ جلی حروف میں لکھے ہوئے تھے۔ میں نے اسی آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ لباس پر اب بھی کئی جگہ مٹی لگی تھی' سر کی چوٹ سے خون بہہ کر پیشانی پر جم گیا تھا۔ میں نے رومال نکال کر لباس کی گرد جھاڑی پھر سگریٹ سلگا کر کانسٹیبل سے پوچھا "تھانے میں اس وقت کوئی ذمے دار افسر تو ہوگا۔"

"آپ حکم تو کرو سرکار!" وہ ہنس کر بولا "کوئی رپورٹ درج کرانی ہے؟"

"تم شاید مجھے پہچانتے نہیں ہو" میں نے سخت لہجے میں کہا "ورنہ اتنی بات نہ کرتے۔ میں کرائم رپورٹر کامران ہوں۔ ہیڈ محرر کہاں ہے؟"

میرا نام شیطان کی طرح مشہور تھا۔ نام سنتے ہی اس کا رویّہ یکسر بدل گیا۔ "آپ انچارج صاحب کے کمرے میں تشریف رکھیں۔ وہ ابھی آجائیں گے۔ میں ہیڈ محرر کو بھی یہیں بھیج دیتا ہوں" اس نے جلدی سے کہا اور ایک طرف روانہ ہوگیا۔

میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا اور یہ لوگ وقت ضائع کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ ممکن ہے میرے آنے سے قبل انچارج کو مسز درّانی یا کسی اور بارسوخ شخصیت کا فون موصول ہوچکا ہو اور انچارج جان بوجھ کر علاقے کے گشت پر نکل گیا ہو کہ اسے میرا سامنا نہ کرنا پڑے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ اسی وقت باہر بھاری بوٹوں کی دھمک سنائی دی اور تھانے کا انچارج ایک ایس آئی اور ہیڈ کانسٹیبل سمیت کمرے میں داخل ہوا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمایاں ہوگئے مگر جلد ہی اس نے خود پر قابو پالیا اور چہک کر بولا۔ "اوہو' آج تو بڑے بڑے لوگ تھانے میں موجود ہیں۔ کیسے زحمت کی کامران صاحب؟" پھر وہ خود ہی بولا "کامران صاحب! مجھے اس وقت کوئی ایف آئی آر کاٹنے پر مجبور مت کیجیے گا۔"

"کتنی رقم کی آفر کی ہے مسز درّانی نے؟" میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"کامران صاحب پلیز' میری بات سمجھنے کی کوشش کریں" وہ تھوک نگل کر بولا "وہ دراصل..."

"انسپکٹر صاحب!" میں نے اس کی بات کاٹ دی "جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس پر عمل کریں ورنہ خواہ مخواہ چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس کر رہ جائیں گے۔ میں... اقدامِ قتل کی ایک واردات کا چشم دید گواہ ہوں۔ مسز درّانی کے ساتھی نے مجھ پر بھی قاتلانہ حملہ کیا ہے اگر آپ کو ملازمت پیاری ہے تو ایف آئی آر درج کرلیں۔"

انسپکٹر نے بے بسی سے میری طرف دیکھا پھر وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی' اس نے جلدی سے ریسیور اٹھالیا اور "جی..... بول رہا ہوں۔ جی سر' وہ اس وقت یہیں موجود ہیں..... بہتر ہے جناب!" یہ کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "کامران صاحب! آپ کا فون ہے۔"

میں نے ریسیور اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ دوسری طرف میرے اخبار کے چیف ایڈیٹر اور پبلشر انصاری صاحب تھے۔ انہوں نے سرد لہجے میں کہا "مسٹر کامران! آپ اس معاملے میں ٹانگ مت اڑائیں۔ میں مسز درّانی کی مخالفت مول نہیں لے سکتا۔"

میں نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا "سر' یہ آپ کہہ رہے ہیں۔ آپ نے تو کبھی ایسی...."

"ہاں' میں نے آپ کو اس سے پہلے کبھی کسی بات سے نہیں روکا" انصاری صاحب کا لہجہ انتہائی سرد تھا "مگر حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے۔ اس واقعے کو بھول جایئے۔"

"سوری سر!" میں نے بھی سرد مہری کا مظاہرہ کیا "آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں اپنے مزاج کے خلاف کام نہیں کرتا۔ اب تو یہ میری انا کا مسئلہ بن گیا ہے۔"

"کامران!" انصاری صاحب کا لہجہ سخت ہوگیا "اگر تمہاری ذات کو کوئی نقصان پہنچا ہے تو اس کا ازالہ کردیا جائے گا۔"

"بات ازالے کی نہیں بلکہ انا کی ہے سر!" میں بھنا کر بولا "میں ایف آئی آر تو ہر قیمت پر درج کراؤں گا۔ ان لوگوں نے آخر مجھے سمجھا کیا ہے" میرے اندر کا ضدی کامران بیدار ہوگیا۔

"یہ مت بھولو کامران کہ تمہاری شناخت "نیشنل آبزرور" ہے۔ اس کے بغیر تم کچھ نہیں ہو' انڈراسٹینڈ!" وہ ڈپٹ کر بولے۔ گویا وہ دوسرے لفظوں میں مجھے ملازمت سے سبکدوش کرنے کی دھمکی دے رہے تھے۔

مارے غصے کے میرا جسم تپنے لگا "آل رائٹ سر!" میں نے سخت لہجے میں کہا "میں خود بھی کسی ایسے اخبار میں کام نہیں کرسکتا جہاں اس قسم کی مصلحتیں ہوں مگر یہ مت سمجھئے گا کہ میں اخبار چھوڑ کر بے بس ہوجاؤں گا۔ اس واقعے کی رپورٹ بھی درج ہوگی اور اخبارات میں خبر بھی چھپے گی۔ یہ کہہ کر میں نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا اور انچارج سے مخاطب ہوا "آپ رپورٹ درج کررہے ہیں یا میں ایس ایس پی سے بات کروں؟"

"مجھے رپورٹ لکھنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے مگر بہتر ہے کہ آپ ایس ایس پی صاحب سے بات کرہی لیں" انچارج نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس کے اس جملے سے میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ گویا تھانے کا ایک معمولی ایس ایچ او بھی اب مجھے آنکھیں دکھا رہا تھا۔ شاید وہ انصاری صاحب کی وجہ سے شیر ہو گیا تھا۔ میں نے تلملا کر ٹیلی فون سیٹ اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ میری حالت اس وقت اس جواری کی سی ہو رہی تھی جس کا ہر داؤ نا کام ہو رہا ہو۔ جیب سے ٹیلی فون انڈیکس نکال کر میں نے ایس ایس پی کے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ تین چار دفعہ گھنٹی بجنے کے بعد ریسیور اُٹھا لیا گیا۔ دوسری طرف علاقے کا ایس ایس پی تھا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور اس سے کہا "ایس ایس پی صاحب، اب آپ کے علاقے کے ایس ایچ او صاحب بھی مجھے آنکھیں دکھانے لگے ہیں۔ مجھے ایک ایف آئی آر درج کرانا ہے اور..."

"کامران صاحب، پلیز!" ایس ایس پی نے میری بات کاٹ دی "آپ ہماری مجبوریاں بھی تو دیکھیں۔ پلیز، اس معاملے کو یہیں ختم کر دیں۔"

"مگر کیوں؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہر شخص نے میری مخالفت کی ٹھان لی ہو۔ میری حالت اس شخص کی طرح ہو رہی تھی۔ جس کی حکومت کا تختہ راتوں رات اُلٹ دیا گیا ہو "ایس ایس پی صاحب!" میں نے سخت لہجے میں کہا "مجھے آپ بہت اچھی طرح جانتے ہیں اور یہ بھی مت بھولیے کہ پولیس کے محکمے میں آپ سے بڑے افسر بھی موجود ہیں" یہ جملہ ادا کرتے وقت مجھے اپنے لہجے کا کھوکھلا پن خود بھی محسوس ہوا۔

"ڈونٹ ٹرائی ٹو کراس یور لمٹ مسٹر کامران!" ایس ایس پی غرا کر بولا "اب تک میں محض تمہیں انصاری صاحب کی وجہ سے ڈھیل دیتا رہا۔ میرے بڑے افسروں سے بات کر کے دیکھ لو۔ میں بھی تو دیکھوں تم کتنے پانی میں ہو۔"

"شٹ اپ!" میں نے چیخ کر کہا اور ریسیور زور سے کریڈل پر پٹخ دیا۔

"ہولے سر جی، ہولے" انچارج میری کیفیت سے لطف اندوز ہو کر بولا "یہ ٹیلی فون سیٹ بھی گورنمنٹ پراپرٹی ہے اور..."

"بکواس بند کرو" اس کی مسکراہٹ نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ مار مار کے اس کا مکروہ چہرہ مسخ کر دوں۔

میرے جارحانہ انداز سے وہ سہم کر رہ گیا۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ یہ جنگ کامران اور افسرانِ بالا کی ہے۔ مجھے فریق بننے کی کیا ضرورت ہے اگر ان لوگوں میں دوبارہ مصالحت ہو گئی تو میں پس جاؤں گا۔ اس کا رویّہ یکسر بدل گیا اور وہ لجاجت سے بولا "اپنا غصہ آپ مجھ پر تو نہ اُتاریں جی۔ میں تو افسرانِ بالا کے حکم کا پابند ہوں۔ اس سے پہلے میں نے کبھی آپ کی کوئی بات ٹالی ہے۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ میرا ذہن تیزی سے اس صورتِ حال پر غور کر رہا تھا۔ یہ اب میری انا کا مسئلہ بن گیا تھا۔ مجھے ملازمت کی بھی پروا نہیں تھی۔ مجھے صرف اپنی توہین کا احساس مارے ڈال رہا تھا۔ پہلے میرے ذہن میں ان پولیس افسروں کا نام آیا جو دیانت دار اور اصول پرست ہونے کے ساتھ ساتھ میرے اچھے دوست بھی تھے۔ میں ان میں سے کسی سے بھی کام لے سکتا تھا۔ وہ میری بات ہرگز نہیں ٹالتے کیوں کہ بارہا میں نے ان کی مدد کی تھی۔ آپ میری شخصیت کے اس تضاد پر حیران ہو رہے ہوں گے۔ میں راشی پولیس افسروں سے بھتے کے طور پر بھاری رقوم وصول کیا کرتا تھا مگر ان دیانت دار پولیس افسروں کی بہت قدر کرتا تھا جو واقعی فرض شناس تھے پھر میں نے خود ہی اس خیال کو مسترد کر دیا۔ میں اپنے کسی فرض شناس دوست کو آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ مجھے یہ معاملہ بہت اُلجھا ہوا لگ رہا تھا۔ جس معاملے میں انصاری صاحب جیسا آدمی مصلحت کا شکار ہو جائے۔ وہ کوئی چھوٹا موٹا معاملہ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے اپنے طور پر اس معاملے سے نمٹنے کا فیصلہ کر لیا۔

ایک ذہین اور تیز طرار کرائم رپورٹر دو دھاری تلوار ہوتا ہے۔ جہاں اس کے مراسم قانون کے محافظوں سے ہوتے ہیں، وہیں قانون شکن افراد سے بھی اس کی راہ و رسم ہوتی ہے۔ زیرِ زمین دنیا کے کئی بڑے بڑے بدمعاش میرے احسان مند تھے۔ لالہ رؤف بھی ایک ایسا ہی آدمی تھا۔ وہ نہ صرف کرائم کنگ کہلاتا تھا بلکہ میرا بہت اچھا دوست بھی تھا۔ ایک موقعے پر میں نے خود کو خطرے میں ڈال کر اس کی جان بچائی تھی۔ اس کے بعد سے تو وہ میرا بے دام کا غلام ہو گیا تھا۔

میں نے تھانے میں بیٹھے بیٹھے اس سے مدد لینے کا فیصلہ کیا اور ٹیلی فون انڈیکس میں سے وہ نمبر نکالا جس پر اس سے رابطہ ہو سکتا تھا۔ تھانے کا انچارج بہت غور سے میری شکل دیکھ رہا تھا، شاید وہ بھی میرے اگلے اقدام کا منتظر تھا۔ میں نے ٹیلی فون سیٹ ایک مرتبہ پھر اپنی طرف کھسکایا اور رؤف کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی مگر کسی نے ریسیور نہ اُٹھایا۔ میں مایوس ہو کر ریسیور رکھنے والا تھا کہ فون پر غنودہ سی ایک نسوانی آواز اُبھری "ہیلو، ہو م ڈو یو وانٹ؟"

"آئی وانٹ مسٹر آر" میں نے جان بوجھ کر رؤف کا نام نہیں لیا۔

دوسری طرف سے میرا نام پوچھا گیا، پھر وہ بولی "ہولڈ آن پلیز، رونی نیند میں ہے۔ میں اسے اُٹھاتی ہوں" عرفِ عام میں رؤف رونی کے نام سے مشہور تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ اس کی کرسچن محبوبہ لائیلہ ہوگی جسے رونی لیلیٰ کہتا تھا۔

کچھ انتظار کے بعد فون پر رونی کی بارعب آواز اُبھری "ہاں کامران صاحب، فرمایئے، میں کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی۔ زیادہ ایمرجنسی تو نہیں ہے؟" اس کی آواز میں تشویش تھی۔

"نہیں فی الحال کوئی ایسی ایمرجنسی نہیں ہے" میں نے ہنس کے کہا "تم ایسا کرو، فوری طور پر اپنے ڈرائیور کو ناظم آباد تھانے

بھیج دو۔ میری گاڑی خراب ہو گئی ہے۔"
"میں خود ہی آجاتا ہوں' ڈرائیور کی کیا ضرورت ہے۔" روفی نے کہا۔
"نہیں' خود آنے کی ضرورت نہیں ہے" میں نے زور دے کر کہا' میں نہیں چاہتا تھا کہ پولیس کے علم میں یہ بات آئے "تم اپنے ڈرائیور کو بھیج دو' مجھے گھر ہی تو جانا ہے۔"
"او کے' میں پندرہ منٹ میں گاڑی بھیجتا ہوں" روفی نے جواب دیا۔
میں تھانے کی عمارت سے باہر نکل آیا اور گاڑی کے انتظار میں سگریٹ پھونکتا رہا۔ پندرہ منٹ سے بھی کم وقت میں روفی کی گاڑی پہنچ گئی۔ اس کا ڈرائیور شاید مجھے پہچانتا تھا اس لیے اس نے اُتر کر پھرتی سے گاڑی کا دروازہ کھول دیا اور بولا "کہاں چلوں صاحب؟"
"مجھے روفی کے پاس لے چلو" میں نے جواب دیا۔
ڈرائیور نے کوئی بات کیے بغیر گاڑی کی اسپیڈ بڑھادی اور آندھی طوفان کی طرح روفی کے اس ٹھکانے پر پہنچ گیا جس کا علم صرف خاص لوگوں کو تھا۔
"خیریت تو ہے کامران صاحب؟" روفی نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔
"خیریت ہی تو نہیں ہے" میں نے اس کے ساتھ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھتے ہوئے کہا پھر میں نے مختصراً اسے سب کچھ بتا دیا۔
میری بات سُن کر وہ گہری سوچ میں غرق ہو گیا' پھر پُر خیال انداز میں بولا "کامران صاحب! میرا خیال ہے کہ ان لوگوں نے اب تک اس لڑکی کو قتل کر دیا ہو گا۔"
"اگر قتل بھی کر دیا ہو گا تب بھی میں انہیں چھوڑوں گا نہیں۔ مجھے اتنی ذلت اور بے بسی کا احساس کبھی بھی نہیں ہوا۔ میں ان لوگوں کو پھانسی کے تختے پر پہنچا کر دم لوں گا" میں نے دانت پیس کر کہا "وہ سمجھتے ہیں کہ مجھے ملازمت سے نکلوا کر انہوں نے مجھے بے بس کر دیا!"
"ذرا اس آدمی کا حلیہ تو بتایئے جس نے آپ پر حملہ کیا تھا؟" روفی نے پوچھا۔
"وہ تقریباً چالیس سال کا دراز قد آدمی تھا' جسم گینڈے کی طرح مضبوط تھا۔"
"بائیں رخسار پر کراس کی شکل میں زخم کا نشان تھا؟" روفی نے پوچھا۔
"یار' اندھیرے میں اتنی تفصیل سے کیسے دیکھ سکتا تھا اسے" میں نے جواب دیا۔ "مسز درّانی نے اسے شہباز کہہ کر مخاطب کیا تھا۔"
"شہباز!" روفی چونک کر بولا "آپ کیسے کرائم رپورٹر ہیں' شہباز کو نہیں جانتے؟"
"یار پہیلیاں مت بجھواؤ" میں جھنجلا کر بولا "صاف صاف بات کرو۔"
"آپ کو شاید یاد ہو گا' اب سے تین سال پہلے شہباز اور اس کی ساتھی لڑکی سعدیہ دو پولیس افسروں کے دُہرے قتل کے الزام میں گرفتار ہوئے تھے پھر سیٹھ درّانی نے ان دونوں کی ضمانت کا بندوبست کیا تھا۔"
"ہاں' تم ٹھیک کہتے ہو" میں چونک اُٹھا "میں ان دنوں جرمنی میں تھا۔ ایک سال تک کیس چلتا رہا تھا' پھر عدالت نے ان دونوں کو عدم ثبوت کی بنا پر بری کر دیا تھا اور..... اور بعد میں سیٹھ درّانی نے اسی خوبرو لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ اس پر بھی اخباروں نے چٹخارے دار خبریں شائع کی تھیں... تو یہ.... مسز درّانی وہی سعدیہ ہے اور اس کا ساتھی شہباز اب اس کا سیکریٹری بنا ہوا ہے... ماریا درّانی اس کی سوتیلی بیٹی ہے اور... اور..."
"اور اب تک ان لوگوں نے ماریا کو قتل کر کے کسی گندے نالے یا ویرانے میں پھینک دیا ہو گا" روفی نے کہا "آپ ایسا کریں کامران صاحب' سیٹھ درّانی سے رابطہ کریں اور..."
"سیٹھ درّانی آج کل ملک میں نہیں ہے" میں نے افسردگی سے کہا "وہ گزشتہ ہفتے بیرونی ممالک کے دورے پر گیا ہے۔ جبھی تو ان لوگوں کو موقع مل گیا" میں نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی صبح کے چار بج رہے تھے۔ میں نے سوچا' میرا ملازم اکبر اب تک میرے انتظار میں جاگ رہا ہو گا' کم از کم اسے اپنی خیریت کی اطلاع دے دوں۔ سامنے ہی ٹیبل پر ٹیلی فون سیٹ رکھا تھا۔ میں نے اپنے گھر کے نمبر ڈائل کیے تو پہلی ہی بیل پر اکبر نے ریسیور اُٹھا لیا اور میری آواز پہچانتے ہی بولا "آپ کہاں سے بول رہے ہیں سر' خیریت سے تو ہیں نا؟"
"میں بالکل خیریت سے ہوں اور تمہیں اطلاع دینے کو فون کیا تھا کہ..."
"آج رات آپ نہیں آئیں گے" اس نے میرا جملہ پورا کر دیا "ادھر تو بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ دو گھنٹے پہلے کچھ لوگ زبردستی گھر میں گھس آئے تھے۔ وہ آپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے مگر بھی کیا یاد کریں گے' میں نے بھی ان میں سے ایک کو زخمی کر دیا تو وہ دُم دبا کر بھاگ گئے پھر کئی دفعہ کوئی لڑکی فون پر آپ کو پوچھ چکی ہے۔"
"لڑکی!" میں نے حیرت سے دُہرایا "نام بتایا تھا اس نے اپنا؟"
"جی سر' نام بھی بتایا تھا۔ ماریا درّانی ہے اس کا نام مگر اپنا فون نمبر نہیں بتایا..."
"اب اس لڑکی کا فون آئے تو اسے بتا دینا کہ میں اس نمبر پر موجود ہوں" میں نے اسے روفی کا نمبر بتایا "اور تم بھی بہت محتاط رہنا۔ خدا حافظ" میں نے سلسلہ منقطع کر دیا' پھر روفی سے مخاطب

ہوا "یار' وہ لڑکی ابھی زندہ ہے۔ اس نے کئی دفعہ میرے گھر فون کیا ہے۔ اب میں دیکھوں گا ان لوگوں کو کہ کتنے پانی میں ہیں" میں نے پُرجوش لہجے میں کہا "ان لوگوں نے میرے گھر پر بھی حملہ کیا تھا مگر اکبر نے انہیں بھگا دیا۔ شاید ان کا خیال ہوگا کہ ماریا میرے پاس ہے۔"

"اکبر نے بھگا دیا؟" روفی نے حیرت ظاہر کی۔

"وہ صرف میرا ملازم ہی نہیں بلکہ گارڈ بھی ہے' میرے ہی گاؤں کا ہے۔ بچپن میں ہم دونوں ایک ساتھ کھیلے ہیں۔ وہ فوج کا ریٹائرڈ کمانڈو ہے۔ کسی افسر سے گستاخی کی بنا پر اس کا کورٹ مارشل ہوگیا تھا اور اسے قبل از وقت ریٹائر کردیا گیا۔ میری دوستی میں وہ کراچی آگیا" میں نے روفی کو بتایا پھر ہم دیر تک اکبر کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ روفی نے ریسیور اُٹھایا' دوسری طرف کی بات سنی' پھر ریسیور میری طرف بڑھا دیا "کامران صاحب' آپ کا فون۔"

میں نے ریسیور جھپٹ کے اس سے لیا اور بولا "ہیلو' کامران اسپیکنگ۔"

"کامران صاحب! میں ماریا بول رہی ہوں۔ ماریا درّانی" دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز آئی۔ میں نے بولنے کے انداز سے پہچان لیا کہ وہ واقعی ماریا ہے۔

"آپ اس وقت کہاں سے بول رہی ہیں مس ماریا؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"میں محمد علی سوسائٹی کے ایک بنگلے سے بول رہی ہوں اور آپ سے فوراً ملنا چاہتی ہوں۔ میری جان خطرے میں ہے۔ اس دفعہ وہ لوگ مجھے نہیں چھوڑیں گے۔ میں بڑی مشکل سے فرار ہوکر یہاں تک پہنچی ہوں لیکن یہ جگہ بھی محفوظ نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے' آپ ایڈریس بتائیے' میں پہنچ رہا ہوں۔"

ماریا نے جلدی جلدی ایڈریس بتایا اور بولی "یہ میری سہیلی عارفہ کا بنگلا ہے۔ اس کے شوہر قومی ائرلائن میں پائلٹ ہیں' ان کا نام عدنان ہے' کیپٹن عدنان صدیقی۔ آج کل وہ فلائٹ پر ہیں۔ بنگلے میں سوائے ایک چوکیدار کے کوئی مرد نہیں ہے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ آپ پلیز جلدی آجائیں۔"

"آپ کی اس سہیلی کے بنگلے کا علم آپ کی سوتیلی ماں کو بھی ہے؟"

"میرے خیال میں وہ جانتی ہیں' آپ پلیز جلدی کریں۔"

"میں فوراً پہنچ رہا ہوں" میں سلسلہ منقطع کرکے اُٹھ کھڑا ہوا۔

میرے ساتھ ہی روفی بھی کھڑا ہوگیا "چلیے' میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔" پھر اس نے اپنے ایک ملازم سے کہا "جمی کو بھیجو۔"

مشکل سے دو منٹ بعد ہی ہماری گاڑی طوفانی رفتار سے محمد علی سوسائٹی کی جانب دوڑ رہی تھی۔ اسٹیئرنگ پر روفی تھا' وہ بہت خوف ناک انداز میں ڈرائیونگ کررہا تھا۔ پچھلی سیٹ پر جمی تھا۔ میں اسے نہیں جانتا تھا مگر وہ روفی کا کوئی خاص آدمی ہوگا اسی لیے روفی نے اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہا تھا۔ روفی نے میری فرمائش پر مجھے پوائنٹ تھری ایٹ کا کولٹ ریوالور بھی مہیا کردیا تھا اور خود بھی ہر طرح مسلح تھا۔

ہم لوگ مطلوبہ بنگلے پر پہنچے تو گیٹ کے بالکل ساتھ ایک لینڈ روور جیپ کھڑی تھی اور گیٹ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ گویا دشمن ہم سے پہلے وہاں پہنچ گئے تھے۔ گیٹ کے ساتھ ہی کوئی شخص بے سدھ پڑا تھا۔ وہ یا تو بے ہوش تھا یا پھر مرچکا تھا۔ پورچ میں آگے پیچھے دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان کے ساتھ ہی ایک ٹریل موٹر سائیکل بھی تھی۔ میں نے اس کا سائیلینسر چھو کر دیکھا' وہ بُری طرح تپ رہا تھا۔ گویا جو بھی یہاں آیا تھا اسے آئے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔

"جمی' تم باہر رہ کر بنگلے کی نگرانی کرو۔ کوئی بھی یہاں سے نکلنے نہ پائے" روفی نے اسے حکم دیا "کوئی لڑکی ہو تو اسے نقصان پہنچائے بغیر روکنا ہے۔"

کسی بھی ممکنہ خطرے کے پیش نظر میں نے ریوالور نکال لیا۔ روفی کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا ہیبت ناک جرمن لیوگر تھا۔

ہم دونوں پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھے۔ اندر مکمل سناٹا تھا۔ پورا بنگلا اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ شاید یہ اندھیرا حملہ آوروں ہی نے کیا تھا۔

طویل کوریڈور کے دائیں جانب کے آخری کمرے میں روشنی ہورہی تھی کیونکہ دروازے کی نچلی درز سے بہت خفیف سی روشنی باہر آرہی تھی۔

روفی مجھ سے چند قدم آگے تھا۔ میں پیچھے رہ کر اسے کور دے رہا تھا۔ میرا پورا دھیان روفی ہی کی طرف تھا۔ اچانک میری پشت سے سخت سی کوئی چیز آلگی اور کسی نے سفاک انداز میں سرگوشی کی "آواز نکالنے کی کوشش مت کرنا' ریوالور پھینک کر دونوں ہاتھ اُٹھالو ورنہ ......" اس کے ساتھ ہی میری پشت پر اس سخت چیز کا دباؤ بڑھ گیا۔

میں نے یہ سوچ کر ریوالور نیچے پھینکا کہ اس کی آواز سے روفی ہوشیار ہوجائے گا مگر یہ بھول گیا کہ کوریڈور میں دبیز قالین تھا اس لیے بہت خفیف سی آواز پیدا ہوئی۔ اپنی بے بسی پر ایک مرتبہ پھر مجھے تاؤ آگیا پھر نتائج کی پروا کیے بغیر میں نے ہاتھ اُٹھانے کے بجائے اس کے پیٹ میں پوری قوت سے کہنی ماری اور بجلی کی سی پھرتی سے زمین پر گر گیا۔ مجھے خطرہ تھا کہ حملہ آور فائر نہ کردے مگر وہ میری کہنی کی شدید ضرب سے مارے تکلیف کے دوہرا ہوگیا اور اس کا ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ میں پھرتی

سے اُٹھ کھڑا ہوا اور اس کی کن پٹی پر زوردار گھونسا جڑ دیا۔ حملہ آور کے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ وہ کھڑے کھڑے آگے پیچھے جھولا' تو میں نے پھرتی سے دو گھونسے اور اسی جگہ جمادیے' وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح فرش پر گرنے لگا۔ میں نے اسے گرنے سے روکا تاکہ آواز پیدا نہ ہو اور آہستگی سے اسے فرش پر لٹادیا پھر میں نے اپنے ریوالور کے ساتھ ساتھ اس کا ریوالور بھی اُٹھالیا اور رونی کے پیچھے چل پڑا۔

کوریڈور کے آخری سرے والے کمرے کے پاس پہنچ کر میرے کانوں میں کسی کے بولنے کی آواز آئی۔ رونی بھی اسی آواز پر کان لگائے ہوئے تھا۔ میں نے کی ہول سے اندر جھانکا۔ اندر کا منظر دیکھ کر میں نے سکون کا سانس لیا۔ ماریا ابھی زندہ تھی۔ اس کے سامنے وہی شخص کھڑا تھا جس نے مجھے زخمی کیا تھا۔ اس کے جسم پر گہرے رنگ کا سوٹ تھا' گلے میں لائننگ والی ٹائی تھی اور سر پر فلیٹ ہیٹ بھی تھا۔ سوٹ پہن کر گویا اس نے مہذب بننے کی کوشش کی تھی مگر چہرے کی کرختگی اس کی کوشش کی نفی کررہی تھی۔ اس کے بائیں رخسار پر کراس کی شکل میں زخم کا گہرا نشان تھا۔ اس کے سامنے ماریا سہمی بیٹھی تھی۔ دہشت سے اس کی آنکھیں پھٹ کر رہ گئی تھیں اور ہونٹ دائرے کی شکل میں سُکڑ گئے تھے۔ سوٹ والے نے شاید اس پر تشدّد بھی کیا تھا کیونکہ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے' بالوں کی کچھ لٹیں اس کے ماتھے پر بھی تھیں۔ اس کے ایک کان میں گلابی رنگ کا خوب صورت سا بُندہ تھا' دوسرا کان خالی تھا۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے مسک گیا تھا' بائیں ہاتھ کی چوڑیاں بھی ٹوٹ گئی تھیں۔ دائیں ہاتھ سے وہ اپنے بال سنوارتی ہوئی اس عالم میں بھی بہت حسین لگ رہی تھی۔ اس کی خوب صورت اور سرخ وسفید' نازک سی کلائی میں جدید فیشن کے سُرخ اور نیلے رنگ کے کڑے بہت بھلے لگ رہے تھے۔

شہباز پھر تیز آواز میں بولا "بتا' وہ فائل کہاں ہے؟"

"وہ فائل میرے پاس نہیں ہے" ماریا نے تھوک نگل کر کہا۔

"تو ایسے نہیں بتائے گی" شہباز نے کہا اور پنڈلی سے بندھا ہوا باریک پھل والا خنجر نکال لیا۔ ٹیوب لائٹ کی تیز روشنی میں خنجر کا پھل جھلملا رہا تھا "بتا ورنہ ذبح کرکے یہیں پھینک جاؤں گا" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔

ماریا کے حلق سے دہشت میں ڈوبی ہوئی چیخ برآمد ہوئی۔

میں نے پیچھے ہٹ کے دروازے پر زوردار لات ماری تو دروازہ دھماکے سے کھل گیا۔ میں اور رونی ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔

مجھے دیکھ کر شہباز بُری طرح اُچھل پڑا۔ اس نے پھرتی سے وہی خنجر میری طرف پھینک دیا۔ میں اگر فوراً جھکائی نہ دے جاتا تو اس کا پھینکا ہوا خنجر میرے سینے میں پیوست ہوجاتا۔ خنجر دستے تک لکڑی کے دروازے میں پیوست ہوگیا۔ اس نے پھر جیب میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی مگر اب بہت دیر ہوچکی تھی۔ رونی کا جرمن لیوگر گرجا اور شہباز کا دایاں ہاتھ بُری طرح زخمی ہوگیا۔

"یہ گولی تمہارے سینے میں بھی پیوست ہوسکتی تھی مگر میں بے وجہ خون خرابے کا قائل نہیں ہوں" رونی نے سفاک لہجے میں کہا "پھر آگے بڑھ کے اس کی تلاشی لی۔ اس کی جیب سے ایک ریوالور بھی برآمد ہوا۔ ریوالور اپنے قبضے میں کرنے کے بعد رونی نے اس کے چہرے پر زناٹے دار تھپڑ مارا اور بولا "اب فوراً یہاں سے دفع ہوجاؤ ورنہ میں اپنا فیصلہ بدل بھی سکتا ہوں۔"

وہ خونخوار نظروں سے رونی کو گھورتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا تو میں نے کہا "کوریڈور میں تمہارا آدمی آرام کررہا ہے' اسے بھی لیتے جانا" پھر مجھے جمی کا خیال آیا۔ وہ کسی قیمت پر بھی شہباز کو وہاں سے نہ نکلنے دیتا۔ میں نے رونی سے کہا "یار' وہ جمی....."

"ہاں' یہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ میں خود باہر تک جاتا ہوں۔ میں جان بوجھ کر اسے جانے کا موقع دے رہا ہوں تاکہ اس کے آقاؤں کو علم ہوجائے کہ کامران محض کرائم رپورٹر ہی نہیں ہے' وہ ان سے ٹکرا بھی سکتا ہے۔ تم ماریا کو سنبھالو' میں باہر جاکے اسے نکلنے کا موقع فراہم کرتا ہوں۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں' آپ عارفہ کو دیکھیں" رونی کے جانے کے بعد ماریا نے کہا "ان بدبختوں نے اسے باندھ کر اسی کے بیڈ روم میں ڈال دیا تھا اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا۔ وہ کہیں دم گھٹنے سے مر ہی نہ گئی ہو۔"

میں ماریا کی رہنمائی میں عارفہ کے بیڈ روم تک پہنچا۔ کمرے میں مکمل تاریکی تھی۔ ماریا نے لائٹ آن کردی۔ بیڈ پر خوش شکل سی ایک عورت بندھی پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر باندھنے کے لیے شہباز نے بستر کی چادر کو پھاڑ کے اس سے رسی کا کام لیا تھا۔ ماریا نے پھرتی سے اسے کھولا اور منہ سے کپڑا نکالا تو وہ گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے مجھ سے بولی "تم لوگ پلیز چلے جاؤ' یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو عارفہ" ماریا نے ہنس کر کہا "ارے بھئی' یہ تو کرائم رپورٹر کامران صاحب ہیں۔ میں نے فون کرکے انہی کو تو بلایا تھا۔ وہ لوگ تو چلے گئے۔"

عارفہ نے اطمینان کا گہرا سانس لیا' پھر بولی "میں نے ابھی فائر کی آواز سُنی تھی۔ میں سمجھی ان لوگوں نے تمہیں ماردیا۔ خدا کا شکر ہے کہ تم خیریت سے ہو۔"

"وہ فائر تو کامران صاحب کے ساتھی نے اس گینڈے پر کیا تھا۔"

اچانک عارفہ کو جیسے کچھ یاد آگیا۔ وہ جھٹ کر اُٹھ بیٹھی اور بولی "وہ چوکیدار... شاید اسے بھی ختم کردیا ان لوگوں نے۔"

"نہیں میڈم!" رونی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا "آپ کا چوکیدار صرف معمولی سا زخمی ہوا ہے۔ میرا آدمی اس کی

مرہم پٹی کر رہا ہے" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا "میڈم! میرا مشورہ ہے کہ کچھ دن کے لیے آپ بھی اس بنگلے سے کہیں اور شفٹ ہو جائیں۔"

"میں خود بھی یہی سوچ رہی ہوں۔ وہ لوگ جھنجلا کر مجھے بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"

"کامران صاحب! زیادہ دیر یہاں رکنا مناسب نہیں ہے۔ ممکن ہے اس مرتبہ مسٹر درانی بدمعاشوں کے بجائے پولیس کو بھیج دے اس لیے فوراً یہاں سے روانہ ہو جائیں۔"

عارفہ بھی بہت پھرتی سے تیار ہو گئی۔ اس نے چوکیدار کو بلا کر ہدایت کی کہ اگر اب کوئی یہاں آ کر ماریا بی بی کو پوچھے تو تم اسے ہرگز مت بتانا کہ یہ یہاں آئی تھیں۔ تم یہی بتانا کہ صاحب فلائٹ پر ہیں اور بیگم صاحب اپنے بھائی کے پاس اسلام آباد گئی ہوئی ہیں' سمجھ گئے نا!"

چوکیدار نے جلدی سے جواب دیا "ہم بالکل سمجھ گیا بیگم صاحب جی! آپ تو ایک ہفتے سے اسلام آباد میں ہیں اور ماریا بی بی کو تو ہم نے کئی مہینے سے اِدھر نہیں دیکھا۔"

"گڈ!" میں نے ہنس کر کہا "تم تو بہت سمجھ دار آدمی ہو" پھر میں نے ماریا سے پوچھا "وہ فائل کہاں ہے جس کے لیے یہ لوگ اتنے پاگل ہوئے جا رہے ہیں اور آخر اس فائل میں ہے کیا؟"

"وہ فائل میری گاڑی ہی میں ہے' ڈرائیونگ سیٹ کے پائیدان کے میٹ کے نیچے۔ میں سب کچھ آپ کو تفصیل سے بتادوں گی کیونکہ ان لوگوں سے نمٹنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔"

واپسی میں' میں روفی کے بجائے ماریا کی گاڑی میں تھا۔ عارفہ واقعی اسلام آباد جانا چاہتی تھی۔ فوری طور پہ وہ ہمارے ساتھ جارہی تھی کیونکہ اسلام آباد کے لیے تو اسے صبح ہی فلائٹ مل سکتی تھی۔ روفی کی گاڑی آگے آگے تھی مگر اس مرتبہ وہ اپنے گھر کے بجائے نارتھ ناظم آباد کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہاں اس کا ایک ایسا ٹھکانا ہے جو کسی کے بھی علم میں نہیں ہے' صرف جمی اور چند دوسرے اہم لوگ اس ٹھکانے سے واقف ہیں۔

"ہاں مس ماریا! اب بتائیے اس فائل میں کیا ہے؟" میں نے گاڑی میں اس سے پوچھا۔

"کامران صاحب! کیا آپ یہ "مس" اور "آپ جناب" کے تکلفات چھوڑ نہیں سکتے۔ مجھے اس قسم کے القابات سے اُلجھن ہوتی ہے۔"

"حالانکہ اُلجھن ہونا نہیں چاہیے" میں نے مسکرا کر کہا "تم جس قسم کے ماحول میں رہی ہو' وہاں تو قدم قدم پر میڈم' ماریا بی بی اور مس ماریا جیسے الفاظ ہی سننے کو ملتے ہوں گے۔ تمہیں تو ان کا عادی ہونا چاہیے۔"

"میں ان الفاظ کی عادی ہوں مگر صرف اپنے ملازمین اور اجنبیوں سے سُننا پسند کرتی ہوں اپنوں سے نہیں" ماریا نے روانی میں کہا پھر خود ہی جھینپ گئی۔ گویا وہ مجھے اپنا سمجھنے لگی تھی۔

زندگی میں پہلی مرتبہ میرا دل خوشگوار انداز میں دھڑکا ورنہ اب تک مجھے کوئی لڑکی ایسی نہ ملی تھی جسے دیکھ کر میرا دل اس انداز میں دھڑکتا۔ میں نے ہنس کر کہا "دیکھو' بات کہاں سے کہاں جا پہنچی' میں نے پوچھا تھا کہ اس فائل میں ہے کیا؟"

"اس فائل میں کیا نہیں ہے" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی "یہ سمجھ لیں کہ اس فائل میں موت پوشیدہ ہے سعدیہ کی' ڈیڈی کی اور بہت سے ایسے لوگوں کی جو بہ ظاہر بہت مہذب دکھائی دیتے ہیں مگر اندر سے وہ کسی کوڑھی سے بھی بدتر ہیں۔"

"سوتیلی ماں کی حد تک تو تمہارا جارحانہ رویّہ... سمجھ میں آتا ہے مگر درانی صاحب تو تمہارے باپ ہیں۔ تم ان کے لیے بھی ایسے الفاظ استعمال کر رہی ہو؟"

"کاش' وہ میرے باپ نہ ہوتے" ماریا نے تلخ لہجے میں کہا "مجھے یہ سوچ کر ہی گھن آتی ہے اپنے وجود سے کہ میں درانی ایسے خبیث انسان کی بیٹی ہوں۔ وہ خون کا سوداگر ہے اور میرے ہم وطنوں کی رگوں سے لہو نچوڑ کر اسے مہنگے داموں غیر ممالک کو بیچ رہا ہے۔ وہ میرے وطن کے معصوم لوگوں کے جذبات کو ایکسپلائٹ کر کے ہر مہینے کروڑوں روپے کا خون مفت حاصل کرتا ہے اور اسے مہنگے داموں ایکسپورٹ کرتا ہے" بولتے بولتے وہ جذباتی ہو گئی "کسی بھی قوم کا لہو امانت ہوتا ہے اس کی سرحدوں کی' اس کی بنیادوں کی۔ جب قوم کی رگوں میں لہو ہی نہیں ہو گا تو ہم زندہ کیسے رہیں گے۔"

اس کے انکشافات پر میں سناٹے میں رہ گیا "مگر ماریا! درانی بلڈ فاؤنڈیشن تو خاصے رفاہی کام کرتی ہے۔ اس کے بلڈ بینک سے ہر گروپ کا خون کسی بھی وقت مل سکتا ہے' پھر بہت سے نادار اور مفلس لوگ وہاں سے مفت علاج معالجے کی سہولتیں بھی حاصل کرتے ہیں۔ ملک بھر میں اس فاؤنڈیشن کی نیک نامی پر کوئی انگلی نہیں اُٹھا سکتا۔"

"آپ پہلے اس فائل کا مطالعہ کریں" ماریا کا لہجہ بدستور تلخ تھا "پھر آپ مجھ سے اس موضوع پر بحث نہیں کریں گے۔ اس میں ایسے ایسے بھیانک انکشافات ہیں کہ پڑھ کے آپ حیران رہ جائیں گے۔ میں تو انہیں جاننے کے بعد ہفتوں ڈسٹرب رہی تھی۔ کاش یہ سب کچھ میرے علم میں نہ آیا ہوتا۔ میں تو اپنے باپ کو بہت عظیم انسان اور انسانیت کا سچا ہمدرد سمجھتی تھی اور اس پر فخر کرتی تھی مگر اب ..... اب میری نظروں میں وہ ایسا مردار خور ہے جو اپنے ہی بھائیوں کی لاشیں نوچ کر کھا رہا ہے" یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی "اور یہ سعدیہ" اس نے نفرت سے ہونٹ سکیڑے "یہ مجھے بالکل ویمپائر لگتی ہے' بلکہ ہے۔ یہ انسانی خون پر زندہ ہے۔"

میں نے ماریا سے مزید بحث نہیں کی۔ وہ اس وقت بہت جذباتی

ہو رہی تھی۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی عارفہ کے چہرے پر بھی حیرت تھی۔ ماریا نے شاید یہ سب کچھ اسے بھی نہیں بتایا تھا۔

جب ہم نارتھ ناظم آباد پہنچے تو صبح کا دھندلکا پھیلنے لگا تھا۔ پوری رات میں نے آنکھوں میں کاٹ دی تھی۔ میں تو پھر بھی اس قسم کی بھاگ دوڑ کا عادی تھا۔ ماریا اور عارفہ کی حالت تباہ تھی۔ وہ دونوں بھی رات بھر جاگتی رہی تھیں۔

روفی کا وہ بنگلا ہر لحاظ سے محفوظ تھا۔ مین گیٹ پر پیتل کی چمک دار پلیٹ پر انگلش میں سردار نور احمد خان کا نام لکھا تھا۔ بنگلے کی باؤنڈری وال بھی خاصی بُلند تھی۔ روفی نے بتایا کہ باؤنڈری وال کے اوپر لگے خاردار تاروں میں ہر وقت کرنٹ دوڑتا رہتا ہے۔ بنگلے میں کرخت چہروں والے چار محافظ اور خوف ناک قسم کے کئی گرے ہاؤنڈز تھے۔ وہ بنگلا کیا تھا، چھوٹا موٹا قلعہ تھا۔

روفی نے ماریا اور عارفہ کو ایک بیڈ روم میں پہنچایا اور مجھ سے بھی تھوڑی دیر آرام کرنے کو کہا۔ میں خود بھی یکسوئی سے اس فائل کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا جو ماریا کے قبضے میں تھی۔ میں وہ فائل لے کر ایک بیڈ روم میں بند ہوگیا اور اس کی ورق گردانی شروع کردی۔

اسے پڑھتے ہوئے اتنے ہولناک انکشافات ہوئے کہ شدید سردی کے باوجود مجھے پسینا آگیا۔ درّانی فاؤنڈیشن بہ ظاہر ایک رفاہی ادارہ تھا، غریبوں اور ناداروں کا ہمدرد، مگر اصل میں وہ لوگ خون کے سوداگر تھے۔ وہ اپنے ہم وطنوں کا خون نچوڑ کر پاؤنڈز اور ڈالرز کما رہے تھے۔ انسانی خون میں موجود بارہ فیکٹرز کو وہ لوگ جدید مشینوں کے ذریعے علیحدہ علیحدہ کرلیتے تھے پھر ان سب کو غیر ممالک اسمگل کروا دیتے تھے۔ میرے ملک کے معصوم اور خدا ترس لوگ تو یہ سوچ کر خون کا عطیہ دیتے تھے کہ اس سے کوئی قیمتی انسانی جان بچ جائے گی۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ ان کے عطیات سے چند لوگوں کی تجوریاں بھر رہی ہیں۔ فائل میں بلڈ بینک کو موصول ہونے والے خون کے اعداد و شمار بھی موجود تھے۔ اگر فاؤنڈیشن یہ دعویٰ کررہی تھی کہ اس کا جمع کیا ہوا خون وطن کے لوگوں کے لیے تھا تو اس حساب سے تو خدانخواستہ ملک کی اسّی فی صد آبادی کو خون کے ان مہلک امراض میں مبتلا ہونا چاہیے تھا۔

اس فائل میں ان اہم لوگوں کے نام بھی تھے جو اس مکروہ تجارت میں شریک تھے۔ انہوں نے فاؤنڈیشن سے جو رقوم وصول کی تھیں۔ ان کے دستخط شدہ واؤچر بھی موجود تھے۔ وہ ملک کے ایسے اہم لوگ تھے کہ مجھے داننوں پسینہ آگیا۔ ان میں چوٹی کے کئی سیاست داں، کئی حساس محکموں کے سربراہان اور انتظامیہ کے بہت سے اعلیٰ افسر شامل تھے۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ پولیس نے ایف آئی آر کاٹنے سے انکار کیوں کیا۔ ظاہر ہے، انہیں اوپر سے احکامات ملے ہوں گے۔

وہ خوف ناک بلکہ دھماکا خیز فائل دیکھ کر میری نیند اُڑ گئی ورنہ میرا ارادہ تھا کہ کچھ گھنٹے کی نیند لے لوں گا۔ میں نے خود سے کہا، میاں کامران! اس اسکینڈل میں اتنے بڑے بڑے مگرمچھ ملوث ہیں کہ تم تو ان کے سامنے ننھی منی سی ایک مچھلی ہو، تمہیں تو وہ سیکنڈوں میں ہڑپ کرجائیں گے۔ یہ ہاتھی اور چیونٹی کی جنگ ہے۔ ان کے ساتھ انتظامیہ، سیاست داں اور پیسے کی ناقابلِ تسخیر قوتیں ہیں۔ تم تو اس دیوار سے ٹکرا کر خود ہی پاش پاش ہو جاؤ گے۔ کہاں وہ ارب پتی مافیا اور کہاں ایک معمولی کرائم رپورٹر جو اب بے روزگار بھی ہے۔ بہتر ہے کہ اس معاملے سے دستبردار ہو جاؤ، پھر دوسرے ہی لمحے میرے اندر کا سرکش اور ضدی کامران بیدار ہوگیا۔ میں نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ آخری سانس تک خون کے ان سوداگروں کا مقابلہ کروں گا۔ مرنا تو ایک دن یوں بھی ہے تو پھر کیوں نہ اس بُرائی کے خلاف لڑتے ہوئے اپنی جان دی جائے۔ کم از کم ضمیر کی اس خلش سے تو محفوظ رہوں گا کہ جانتے بوجھتے میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ سب سوچتے سوچتے میرا دماغ شل ہوگیا اور نہ جانے کب مجھے نیند آگئی۔

میری آنکھ کھلی تو میری نظر روفی پر پڑی۔ وہ میرے بیڈ کے نزدیک ہی ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے نہا دھو کر فریش ہونے کا مشورہ دیا۔

میں باتھ روم سے باہر نکلا تو روفی وہ فائل دیکھ رہا تھا جس کی وجہ سے میرا ذہن مفلوج ہوگیا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت، غصے اور صدمے کے ملے جلے تاثرات تھے۔ اس نے فائل سے نظریں اُٹھا کر مجھے دیکھا، پھر بولا "تم جلدی سے ناشتا کرلو، پھر اخبار دیکھنا۔ کئی گرماگرم خبریں تمہاری منتظر ہیں۔"

میں نے اُلٹا سیدھا ناشتا کیا پھر کافی پیتے ہوئے اخبار اُٹھالیا۔ اخبار کے فرنٹ پیج پر میری تصویر موجود تھی۔ اس کے ساتھ ہی دو کالمی ایک سُرخی بھی تھی۔

"معروف پریس رپورٹر کامران خان نے سیٹھ درّانی کی اکلوتی بیٹی ماریا درّانی کو اغوا کرلیا۔ پولیس کامران کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔"

میں نے جلدی جلدی پوری خبر پڑھ ڈالی۔ خبر کے مطابق ماریا درّانی ذہنی طور پر ابنارمل تھی۔ کامران نے اسے بہلا پھسلا کر اغوا کرلیا۔ اس واردات کے عینی شاہدین بھی موجود تھے۔ اس سلسلے میں پولیس کی ایک پارٹی کامران کی تلاش میں اس کے آبائی گاؤں بھی روانہ ہوچکی تھی۔ سیٹھ درّانی کل رات ہی وطن لوٹا تھا۔ اس نے آتے ہی صوبے بھر کی انتظامیہ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے خیال ظاہر کیا تھا کہ کامران اور اس کے ساتھیوں نے میری بیٹی کو بھاری تاوان کی خاطر اغوا کیا تھا۔

خبر پڑھ کے میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ درّانی کی آمد کے بعد کراچی تو کیا، پورے صوبے کی پولیس میری تلاش میں تھی۔

میں جلد از جلد درّانی بلڈ فاؤنڈیشن کو بے نقاب کرنا چاہتا تھا،

لوگوں کو اس کا مکروہ روپ دکھانا چاہتا تھا مگر میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کام میں کیسے کرسکوں گا۔ فائل میں سب کچھ موجود تھا مگر ان ممالک کے نام اور پتے موجود نہیں تھے جو فاؤنڈیشن سے خون خریدتے تھے۔ میرے پاس وہ ایڈریس بھی موجود ہوتے تو میں زیادہ بہتر طریقے سے لوگوں کو اپنی بات سمجھا سکتا تھا۔ ویسے وہ فائل ہر طرح مکمل تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ خون کی اسمگلنگ کا طریقۂ کار کیا تھا۔ المیہ یہ تھا کہ میرے خلاف یہ جھوٹی خبر میرے ہی اخبار نے شائع کی تھی۔ گویا انصاری صاحب بھی ان لوگوں سے خوف زدہ ہوگئے تھے۔

اچانک ماریا کمرے میں داخل ہوئی۔ رات کے مقابلے میں وہ زیادہ نکھری نکھری نظر آرہی تھی۔ اس نے بتایا کہ عارفہ دس بجے والی فلائٹ سے اسلام آباد جاچکی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا "ماریا، تم نے آج کے اخبارات دیکھے؟"

"ہاں دیکھ چکی ہوں" اس کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی "آپ کے اخبار نے تو پھر بھی بہت مہذب اور محتاط زبان استعمال کی ہے، دوسرے اخبارات نے تو اس خبر کو بہت نمک مرچ لگاکر شائع کیا ہے۔"

"اس مسئلے سے تو میں نمٹ لوں گا، تم یہ بتاؤ کہ وہ فائل کہاں سے تمہارے ہاتھ لگی تھی؟"

"دُرّانی فاؤنڈیشن کا ایک دیرینہ ملازم اکرام تھا، پنج وقتہ نمازی اور پرہیزگار! جب اسے یہ معلوم ہوا کہ دُرّانی بلڈ فاؤنڈیشن خون کی تجارت میں ملوث ہے تو اس نے ملازمت چھوڑ دی۔ فاؤنڈیشن کے اکاؤنٹس وہی دیکھتا تھا۔ وہ وہاں سے رخصت ہوتے وقت وہ فائل بھی اُٹھالایا۔ جانتے ہیں، پھر اس کے ساتھ کیا ہوا؟" ماریا تلخی سے بولی "ملازمت چھوڑنے کے دو دن بعد ہی ایک ٹرک نے اسے کچل دیا۔ وہ بے چارہ موقعے پر ہلاک ہوگیا۔ مرنے سے چند ہی دن پہلے اس نے وہ اہم فائل میرے حوالے کردی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ خون کی اس تجارت میں ماریا شریک نہیں ہے۔"

"اس نے وہ فائل تمہارے ہی حوالے کیوں کی؟" میں نے پوچھا۔

"جانتے ہو اس نے کیا کہا تھا؟" ماریا نے میرے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی "جب میں آخری بار اس سے ملی تو وہ بہت خوف زدہ اور سہما سہما سا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا، موموبیٹا! مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میری زندگی کے دن پورے ہوچکے ہیں۔ میرے پاس ایک امانت ہے۔ اسے تم ڈیلی نیشنل آبزرور کے چیف ایڈیٹر انصاری صاحب تک پہنچادینا۔"

اس کی بات سن کر میں بُری طرح اُچھل پڑا "انصاری صاحب کا نام لیا تھا اس نے؟" میں نے حیرت سے پوچھا "وہ تو مسز دُرّانی کے خلاف خبر لگانے ہی پر تیار نہیں تھے۔ وہ بھلا اس کی کیا حفاظت کرتے۔ وہ تو اسے خود ہی تمہارے باپ کی خدمت میں پیش کردیتے۔"

"فائل ان تک پہنچانے کا موقع ہی کہاں ملا مجھے" ماریا نے جواب دیا۔ اکاؤنٹنٹ کی موت کے بعد سعدیہ کو کہیں سے بُھن گُن مل گئی کہ ماریا اس کی موت سے کچھ دن پہلے اس سے ملی تھی اور وہ کوئی فائل لے کر آئی ہے۔ مجھے اس وقت تک اس فائل کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ میں تو کھلے عام وہ فائل لے کر آئی تھی۔ میرے پاس وہ فائل کئی ملازمین نے بھی دیکھی تھی اور ہمارے ڈرائیور نے بھی۔ شاید انہی لوگوں میں سے کسی نے سعدیہ کو بتایا ہوگا۔ میں نے اس فائل کو پڑھا تو مجھے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ اسی دن میں نے وہ فائل اپنی گاڑی میں چھپادی۔ وہ گاڑی میں شاذونادر ہی استعمال کرتی تھی۔"

"پھر وہ لوگ تمہیں قتل کیوں کرنا چاہتے تھے؟" میں نے اُلجھ کر پوچھا۔

"وہ لوگ تو مجھے اغوا کرکے کسی ایسی جگہ لے جانا چاہتے تھے جہاں وہ مجھ پر تشدد کرکے فائل کے متعلق معلوم کرسکیں، گھر میں تو وہ مجھ پر تشدد نہیں کرسکتے تھے نا! وہاں میرے وفادار ملازم بھی تو ہیں۔ انہی میں سے ایک کے ذریعے مجھے ان کے منصوبے کا علم ہوگیا اور میں اپنی گاڑی میں وہاں سے بھاگ نکلی۔ ان لوگوں نے میرا تعاقب کیا اور اس جگہ گھیرلیا جہاں آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔

سعدیہ اور شہباز آپ کی طرف متوجہ تھے اس لیے مجھے وہاں سے بھی بھاگنے کا موقع مل گیا۔ میں بھاگ کے عارفہ کے پاس جاپہنچی۔ مجھے نہ جانے کیوں یقین تھا کہ اس سلسلے میں آپ میری مدد کریں گے۔"

"اب تم بے فکر ہوجاؤ" میں نے کہا "اس معاملے سے اب میں نمٹ لوں گا۔" میں سوچنے لگا کہ ملک میں کون ایسا دَم دار شخص ہے جو خون کے ان سوداگروں سے ٹکرا سکے۔ پھر میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور مجھے رئیس اللہ بخش کا خیال آیا۔ وہ ایک سیاسی پارٹی کے سربراہ تھے اور ہمیشہ اپوزیشن میں رہتے تھے، خاندانی جاگیردار تھے اس لیے دولت ان کا مسئلہ نہیں تھی۔ ان کے دروازے سے کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹتا تھا۔ وہ گزشتہ بیس سال سے ملک کے غریب عوام کے حقوق کے لیے لڑرہے تھے۔ ان کا نام ذہن میں آتے ہی میں نے فیصلہ کرلیا کہ اس سلسلے میں انہی سے مدد لوں گا۔ میں نے ماریا کو بتایا تو وہ بھی اُچھل پڑی اور بولی کہ واقعی وہ ہماری مدد کرسکتے ہیں۔ تم آج ہی ان سے بات کرو۔ وہ اچانک "آپ" سے "تم" پر آگئی تھی۔ مجھے اس کے منہ سے "تم" سُن کر خوش گوار سی حیرت کا احساس ہوا۔

میں اور ماریا اسی وقت روبی کے پاس پہنچے۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں رئیس اللہ بخش سے مدد لینا چاہتا ہوں تو وہ بھی مجھ سے متفق ہوگیا۔ میں نے ٹیلی فون

ڈائریکٹری سے ان کا نمبر نوٹ کیا اور انہیں فون کر دیا۔ میں کئی بار ان سے مل چکا تھا مگر اس کا امکان کم ہی تھا کہ وہ مجھے نام سے پہچان بھی جائیں گے۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ وہ ان دنوں کراچی میں موجود تھے ورنہ اکثر وہ اندرون سندھ اپنے آبائی گاؤں ہی چلے جاتے تھے۔ ان کا وہ نمبر انگیج تھا' میں نے دوسرا نمبر ڈائل کیا۔ وہ بھی انگیج تھا۔ بالآخر تیسرے نمبر پر دوسری طرف سے جواب مل گیا۔ دوسری طرف ان کا سیکریٹری تھا۔ اس نے بتایا کہ رئیس ابھی دوسری لائن پر بات کر رہے ہیں' آپ ہولڈ کریں۔

تھوڑی دیر بعد فون پر ایک بھاری آواز سنائی دی "ہیلو' اللہ بخش بول رہا ہوں۔"

میں نے جلدی سے کہا "سائیں' میں ڈیلی نیشنل آبزرور کا کرائم رپورٹر کامران عرض کر رہا ہوں۔"

"ہاں' بولو بابا!" انہوں نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا "مگر فی الحال کسی انٹرویو کی بات مت کرنا۔"

"سائیں' معاملہ بہت زیادہ اہم ہے۔ میں فوری طور پر آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"تو پھر ایسا کرو بابا" وہ کچھ سوچ کر بولے "تم پرسوں شام کو پانچ بجے آجاؤ۔ میں اپنے سیکریٹری کو نوٹ کرا دیتا ہوں ٹائم!"

"پرسوں تو سائیں بہت دیر ہو جائے گی۔ پولیس میری تلاش میں چھاپے مار رہی ہے اور......"

"ایک منٹ بابا" انہوں نے میری بات کاٹ دی "یہ معاملہ کہیں سیٹھ درّانی کی بیٹی کے اغوا کا تو نہیں ہے؟"

"اغوا کا تو مجھ پر الزام ہے۔ سیٹھ درّانی کی بیٹی اپنی مرضی سے میرے ساتھ ہے۔ اصل میں اس کے پاس بہت اہم نوعیت کی ایک فائل ہے سائیں۔ میں وہ فائل آپ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔"

"اچھا!" ان کے لہجے میں حیرت تھی "تو پھر ابھی وہ فائل لے کر آجاؤ۔ درّانی کی بیٹی کو بھی لے آنا اگر تم بے گناہ ہوئے تو میں آج ہی ایک ہنگامی پریس کانفرنس بلا لوں گا۔"

"بہت شکریہ سائیں!" میں نے ممنونیت سے کہا "میں ابھی حاضر ہوتا ہوں" انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا تو میں نے ماریا سے کہا "چلو ماریا' رئیس اللہ بخش ہماری مدد کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔"

میں نے وہ فائل ایک بریف کیس میں رکھی اور جانے کو تیار ہو گیا۔ میں نے روفی کو بھی ساتھ لے لیا۔ ماریا بھی پھرتی سے تیار ہو کر آگئی تھی۔ مجھے صرف ایک خدشہ تھا کہ ان تک پہنچنے سے پہلے کہیں میں پولیس کے ہتھے نہ چڑھ جاؤں مگر روفی نے اس کا بندوبست بھی کر لیا تھا۔ ہم وہاں سے جس کار میں روانہ ہوئے وہ مرسیڈیز بینز تھی اور اس پر بلوچستان کی نمبر پلیٹ تھی۔ اسے باوردی شوفر ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں اور ماریا پچھلی نشست پر تھے' روفی اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔

رئیس اللہ بخش ڈیفنس سوسائٹی میں رہتے تھے۔ ان کا بنگلہ کم از کم دو ہزار گز پر بنا ہوا تھا۔ بلند و بالا آہنی پھاٹک کے باہر دو مسلح دربان موجود تھے۔ ہماری گاڑی دیکھ کر وہ بھی مرعوب ہو گئے پھر گیٹ کی ذیلی کھڑکی کھلی اور ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا گیا۔

گیٹ کے ساتھ ہی گارڈ روم تھا۔ اس میں بھی چار محافظ موجود تھے۔ ان کے انچارج نے ہمارے نام پوچھے' پھر انٹرکام پر کسی سے بات کرنے کے بعد بولا "رئیس نے صرف مسٹر کامران اور مس ماریا کو اندر آنے کی اجازت دی ہے" وہ روفی سے مخاطب ہوا "آپ یہاں تشریف رکھیں۔"

مجھے روفی کے چہرے پر ناگواری کا تاثر محسوس ہوا' وہ منہ بنا کر بولا "پھر میں باہر گاڑی میں ان لوگوں کا انتظار کروں گا۔"

ایک گارڈ کی رہنمائی میں ہم بجری کی طویل روش طے کر کے برآمدے میں پہنچے پھر اس نے ہمیں ایک اور شخص کے حوالے کر دیا۔ وہ ہمیں لے کر ایک کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ اس کے باہر بھی دو مسلح گارڈ موجود تھے۔ ہمیں وہاں تک لانے والا کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور بولا "سائیں' کامران صاحب اور مس ماریا آگئی ہیں۔"

دوسرے ہی لمحے میں رئیس اللہ بخش کے سامنے تھا۔ اس شخص نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ عوام کے حقوق کی جنگ لڑتے ہوئے گزار دیا تھا۔ وہ پچاس' پچپن کے پیٹے میں تھے۔ چہرے پر ایسا رعب و دبدبہ تھا کہ مجھ سا سرکش آدمی بھی مرعوب ہو گیا۔ میں نے نہایت ادب سے انہیں سلام کیا اور ان کے اشارے پر ان کے مقابل ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ ماریا بھی میرے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

"ہاں بابا' اب بولو' تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" انہوں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

میں نے ہچکچاتے ہوئے ان کے گارڈز کی طرف دیکھا تو وہ میرا مطلب سمجھ گئے اور انہوں نے ان دونوں کو بھی باہر بھیج دیا۔

میں نے مختصراً انہیں تفصیل سے آگاہ کیا تو وہ بے تابی سے بولے "لاؤ وہ فائل میرے حوالے کر دو۔ میں بھی دیکھتا ہوں کہ ان لوگوں میں کتنا دم ہے۔ یہ بدبخت لوگ اتنے بے حس ہیں کہ اپنے ہی ہم وطنوں کا خون چوس رہے ہیں۔"

میں نے بریف کیس ان کے سامنے رکھ دیا اور بولا "اس فائل سے آپ کو سیٹھ درّانی اور اس کے تمام ساتھیوں کے کچا چٹھا معلوم ہو جائے گا۔"

بریف کیس لیتے ہوئے ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ انہوں نے سرسری انداز میں پوچھا "ان کاغذات کی فوٹو کاپی بنوائی ہے تم نے؟"

"سائیں بنوائی ہے اور اسے میں نے بہت احتیاط سے رکھا ہے" میں نے انہیں خوش کرنے کو جھوٹ بولا۔ ان کے کہنے پر مجھے

اپنی جلد بازی اور حماقت کا احساس ہوا تھا۔ کم از کم مجھے ان کاغذات کی فوٹو کاپی ضرور بنوانا چاہیے تھی۔

"وہ فوٹو کاپی بھی لیتے آتے نا بابا!" انھوں نے کہا "انھیں اپنے پاس رکھ کے تم اپنی جان کیوں خطرے میں ڈالتے ہو۔"

میں جھوٹ بول کر پچھتا رہا تھا۔ میں بھلا ان کاغذات کی فوٹو کاپیاں کہاں سے لاتا۔ میں نے تو سرے سے ان کی فوٹو اسٹیٹ کرائی ہی نہیں تھی۔ میں نے جلدی سے کہا "وہ بالکل محفوظ ہیں سائیں۔ میں انھیں اپنے ریکارڈ میں رکھنا چاہتا ہوں۔"

"ریکارڈ کو چھوڑو بابا! تم ابھی وہ فوٹو کاپیاں بھی لے آؤ" ان کا لہجہ سرد تھا۔

مجھے اپنے جھوٹ کا بھرم بھی رکھنا تھا اس لیے میں نے کہا "سائیں، انھیں تو میں اپنے پاس ہی رکھوں گا۔ مجھے بھی کسی خبر کے سلسلے میں ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

"لعنت بھیجو خبر پر" رئیس اللہ بخش جھنجلا گئے "وہ فوٹو کاپیاں لے کر فوراً آؤ۔"

"معاف کیجیے گا سائیں" میں نے کہا "وہ فوٹو کاپیاں میں آپ کو نہیں دوں گا۔"

رئیس اللہ بخش کا چہرہ مسخ ہو گیا۔ وہ بدلے ہوئے لہجے میں بولے "جب تک مجھے ان کاغذات کی فوٹو کاپیاں نہ مل جائیں، اس وقت تک تم یہاں سے جا نہیں سکو گے۔ اس لڑکی کو بھیجو اور اس سے کہو کہ وہ فوٹو کاپیاں لے کر فوراً یہاں آ جائے۔"

"رہنے دیں سائیں" مجھے اچانک غصہ آ گیا "میں کسی اور سے بات کر لوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے بریف کیس اُٹھایا اور ماریا کو چلنے کا اشارہ کیا۔

"آرام سے بابا، آرام سے" رئیس اللہ بخش نے ہنس کر کہا "اتنا غصہ اچھا نہیں ہوتا۔ آرام سے ادھر بیٹھو اور اس لڑکی کو بھیج دو" ان کا لہجہ تحکمانہ تھا۔

دوسرے ہی لمحے کمرے میں بڑی بڑی مونچھوں اور خوفناک چہرے والا ایک آدمی داخل ہوا۔ اس کا قد مجھ سے بھی کچھ زیادہ ہی تھا، جسامت مجھ سے دُگنی تھی اور ہاتھوں کے پنجے کچھ زیادہ ہی بڑے تھے۔ اس کے شانے پہ سیون ایم ایم کی ایک رائفل جھول رہی تھی اور سینے پر گولیوں کی بیلٹ تھی۔

وہ رئیس کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا اور بولا "حکم سائیں؟"

"بابا، ان دونوں کو اندر لے جاؤ۔ یہ ادھر سے نکلنے نہ پائیں" رئیس نے اسے حکم دیا۔

رئیس کے اس جملے نے میری کھوپڑی اُلٹ دی۔ میں نے تپے ہوئے لہجے میں کہا "میں تو آپ کو بہت نیک اور محبِ وطن سمجھتا تھا سائیں مگر آپ کے رویّے سے تو کچھ اور ظاہر ہو رہا ہے" یہ کہہ کر میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہاں اس دیو نما باڈی گارڈ کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ اس سے بھڑ جاؤں مگر اس سے فائدے کے بجائے الٹا نقصان ہی ہوگا۔ میں نے بھی اس سیاست داں کو سیاست ہی سے زیر کرنے کا فیصلہ کیا اور شکست خوردہ لہجے میں ماریا سے کہا "ماریا، میرا خیال ہے کہ تم ان کاغذات کی فوٹو کاپیاں لے ہی آؤ" میں نے رئیس کی نظر بچا کے ماریا کو آنکھ ماری "جب سائیں ہی ہمارا ساتھ دینے کو تیار نہیں تو پھر کون سُنے گا ہماری بات!" میں چاہتا تھا کہ کم از کم ماریا تو یہاں سے نکل جائے، پھر میں بھی نکلنے کی کوشش کروں گا۔"

ماریا نے ایک مرتبہ پھر میری طرف استفہامیہ انداز میں دیکھا۔

میں نے اسے پھر آنکھ سے اشارہ کیا اور کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح افسردہ لہجے میں بولا "باہر میرا ڈرائیور رونی ہوگا۔ اسی کے ساتھ چلی جاؤ۔"

"یہ اکیلی نہیں جائے گی بابا" میرے دو آدمی بھی اس کے ساتھ جائیں گے" رئیس اللہ بخش نے کہا۔ وہ خاصا گھاگ سیاست داں تھا۔ اتنی آسانی سے کیسے بے وقوف بن جاتا "دیکھو بابا، کوئی گڑبڑ مت کرنا" وہ ماریا سے بولا "ورنہ میرے آدمی تمھیں چھوڑیں گے نہیں، پھر میں اس رپورٹر کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔"

رئیس کے حکم پر دو مسلح باڈی گارڈز ماریا کو لے کر چلے گئے۔ مجھے اطمینان تھا کہ رونی ان دونوں سے نمٹ لے گا۔ ماریا کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں آرام سے صوفے میں دھنس گیا اور سگریٹ سُلگالی۔ رئیس اللہ بخش بھی اپنی اس جیت پر بہت خوش تھا۔ اس نے دیو نما باڈی گارڈ سے کہا کہ اب یہ ہمارا مہمان ہے۔ اسے اندر لے جاؤ۔ مجھے ابھی کچھ اور لوگوں سے ملنا ہے۔"

میں بریف کیس لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ رئیس اللہ بخش نے کہا "بابا، اس بریف کیس کو ادھر ہی چھوڑ دو۔ میں بھی دیکھوں، اس میں ہے کیا؟"

بریف کیس اس کے حوالے کرنے کا مطلب یہ تھا کہ میں اپنی موت کے پروانے پر خود ہی دستخط کروں۔ وہ لوگ پھر کسی بھی قیمت پر مجھے اور ماریا کو زندہ نہ چھوڑتے۔ اگر واقعی ان کاغذات کی فوٹو کاپیاں ہوتیں تو میں بلا تامل بریف کیس اس کے حوالے کر دیتا۔

رئیس آرام سے صوفے میں دھنسا بیٹھا تھا۔ دیو نما باڈی گارڈ میرے سامنے کھڑا ہو گیا اور بریف کیس کے لیے اپنا لمبا چوڑا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں نے اچانک پوری قوت سے بریف کیس اس کے کھوپڑی پر دے مارا۔ اس کی آنکھوں میں لمحے بھر کو حیرت سی لہرائی مگر اس کی حیرانی ختم ہونے سے پہلے ہی میں نے آگے بڑھ کر اپنا گھٹنا پوری قوت سے اس کے پیٹ میں مارا۔ میری اس خوف ناک ضرب کے بعد بہت کم لوگ ہوش و حواس قائم رکھتے تھے مگر وہ دیو نما شخص صرف کراہ کر رہ گیا اور اپنے شانے سے رائفل اُتارنے لگا۔ میں نے اُچھل کر پوری قوت سے اس کی ناک

پر ٹکر ماری' اس نے اپنے بڑے بڑے پنجوں میں میری گردن دبوچنے کی کوشش کی مگر میں نے اسے گردن پکڑنے کا موقع نہ دیا اور اتنی قوت سے اس کے زیرِ ناف اپنے گھٹنے سے ضرب لگائی کہ وہ بلبلا اُٹھا اور ڈکراتا ہوا زمیں بوس ہو گیا۔

اپنے خوف ناک باڈی گارڈ کا یہ حشر دیکھ کر رئیس اللہ بخش کی آنکھیں حیرت اور بے یقینی سے گویا پھٹ گئیں۔ اس نے کسی کو پکارنے کے لیے منہ کھولا مگر میں نے اس کا موقع ہی نہ دیا' بجلی کی سی پھرتی سے اس کے سر پر پہنچ گیا اور اپنا بایاں ہاتھ مضبوطی سے اس کے منہ پر جما دیا۔ دائیں ہاتھ سے میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ صرف حکم چلانے کا عادی تھا' ہاتھ پیر ہلانا تو اس کی شان کے خلاف تھا۔ وہ میری گرفت میں پھڑپھڑا کر رہ گیا۔ میں نے سخت لہجے میں سرگوشی کی "سائیں' مجھے حفاظت سے باہر نکالو ورنہ تمہاری یہ بیل جیسی گردن ایک جھٹکے میں توڑ دوں گا' پھر تمہاری سیاست' غریب پروری اور حب الوطنی دھری رہ جائے گی۔"

ہمارے نزدیک ہی کتابوں کا ایک بڑا سا ریک تھا جس کے نچلے حصے میں درازیں تھیں۔ سائیں نے اپنے دائیں ہاتھ سے ایک دراز کھولنے کی کوشش کی۔ دراز کھل تو گئی مگر میں نے اس کی گردن کو جھٹکا دے کر دراز سے دور کر دیا کیونکہ مجھے اس میں ریوالور نظر آ گیا تھا۔ میں نے اس کی گردن چھوڑ دی اور پھرتی سے ریوالور نکال لیا۔ مجھے اس خبیث پر اتنا اعتماد تھا کہ میں اپنا ریوالور روفی کی گاڑی ہی میں چھوڑ آیا تھا۔

ریوالور جیکٹ کی دائیں جیب میں ڈال کر میں نے اس کا رُخ رئیس اللہ بخش کی طرف کر دیا اور سفاک لہجے میں بولا "میرے ساتھ چلو سائیں' ذرا بھی گڑبڑ کی کوشش کی تو میں کم از کم تمہارے مکروہ وجود کو ضرور جہنم رسید کر دوں گا۔ چلو اب جلدی کرو۔ میرے پاس وقت کم ہے۔"

ذرا سی مزاحمت میں وہ بے دم سا ہو گیا تھا۔ وہ خاندانی رئیس تھا۔ وہ تو اُٹھ کر پانی بھی نہ پیتا ہو گا' ایسے رگڑے بھلا اس نے کب لگائے ہوں گے۔

وہ مردہ لہجے میں بولا "آؤ میرے ساتھ!"

میں اس کے ساتھ ساتھ یوں باہر نکلا جیسے وہ مجھ سے بہت بے تکلف ہو۔ مجھے اچانک اس کے دیو نما باڈی گارڈ کا خیال آیا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر دوسرے محافظ شک میں مبتلا ہو سکتے تھے۔ میں نے رئیس سے کہا "سائیں' اندر جو تمہارا پالتو کتا بے ہوش پڑا ہے اس کا بھی کوئی بندوبست کرو ورنہ...... "میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

رئیس نے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا حکم دیا اور ایک محافظ سے بولا "بابا' وہ دھنی بخش اندر چکرا کے گر پڑا ہے گرنے سے اسے شاید چوٹ بھی آئی ہے۔ اسے بھی ڈاکٹر کو دکھا دینا۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

اس دوران میں ڈرائیور گاڑی لے آیا تھا۔ اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر ایک گن مین بھی بیٹھا تھا۔ میں نے سرگوشی میں رئیس سے کہا کہ اپنے اس گن مین کو یہیں چھوڑ دو۔ اس نے بھی سرگوشی ہی میں جواب دیا کہ یہ بہت ضروری ہے ورنہ میرے دوسرے محافظ شک میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس کی بات درست تھی چنانچہ میں خاموشی سے رئیس اللہ بخش کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بریف کیس میں نے اپنے پہلو میں رکھ لیا۔ ڈرائیور نے سوالیہ انداز میں رئیس کو دیکھا۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ میں نے جلدی سے کہا "ملیر کی طرف چلو۔"

گاڑی آہستگی سے آگے بڑھ گئی۔ میرے ریوالور کا رخ رئیس کی طرف تھا اور میں مسلسل اس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ کہیں یہ ڈرائیور کو عقبی شیشے میں کوئی اشارہ نہ کر دے۔ میں نے ملیر کا نام بھی اس لیے لیا تھا کہ وہ بعد میں مجھے انہی اطراف میں تلاش کراتا رہے۔

اب مسئلہ اس کے گن مین کا تھا۔ میں جہاں بھی اُترتا' وہ رئیس کے اشارے پر مجھے بھون کر رکھ دیتا۔ اس کا ایک ہی حل تھا کہ اس کے ڈرائیور اور گن مین سے چھٹکارا حاصل کر لیا جائے۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ گاڑی رکوا کر گن مین کو اُتاروں اور آگے بڑھ جاؤں مگر گن مین پہلی فرصت میں پولیس سے رابطہ قائم کرتا اور پھر پورے شہر کی پولیس میرے پیچھے لگ جاتی پھر مجھے اس باڈی گارڈ کا خیال آیا جو میرے ہاتھوں زخمی ہوا تھا۔ وہ اب تک ہوش میں آ گیا ہو گا اور اس نے دوسرے محافظوں کو سب کچھ بتا دیا ہو گا۔ ممکن ہے اب تک پولیس بھی حرکت میں آ چکی ہو۔ رئیس اللہ بخش کے جھنڈے والی گاڑی یوں بھی نمایاں تھی۔ پولیس چند ہی منٹ میں اسے تلاش کر لیتی۔

اس وقت ہم اسٹار گیٹ کے پاس سے گزر رہے تھے۔ وائر لیس گیٹ پہنچ کر میں نے ڈرائیور کو دائیں طرف مڑنے کا حکم دیا۔ ان دنوں وہ علاقہ بالکل غیر آباد تھا۔ سوائے ہوٹل گرینڈ اور جامعہ ملیہ کالج کے وہاں کوئی آبادی نہ تھی۔ ان دنوں اکثر جھاڑیوں میں سے لوگوں کی لاشیں ملا کرتی تھیں۔ راستہ بھی کچا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ڈرائیور کے چہرے پر بھی اُلجھن ہے اور گن مین بھی بار بار پہلو بدل رہا ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کا مالک اس ویرانے میں کیا کرنے جا رہا ہے۔

ہم مزید آگے بڑھے تو اِکّا دُکّا مکان بھی بہت پیچھے رہ گئے۔ اب ہم ایک ایسے راستے سے گزر رہے تھے۔ جس کے دونوں جانب خودرو جھاڑیوں کے جنگل تھے۔ میں نے ڈرائیور سے گاڑی روکنے کو کہا۔ گاڑی رُکتے ہی میں نے بہت پھرتی سے ریوالور نکال لیا اور اسے نال کی طرف سے پکڑ کے گن مین کے سر پر زوردار ضرب لگائی۔ گن مین وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دوسری ضرب ڈرائیور کے سر پر پڑی۔ اس بے چارے کو تو حیران ہونے کا موقع بھی نہیں ملا۔

رئیس اللہ بخش بُری طرح کانپنے لگا۔ موت سر پر ہو تو بڑے بڑے سورماؤں کا پِتّا پانی ہو جاتا ہے۔ مجھے اس وقت رئیس اللہ بخش سے کراہیت سی محسوس ہوئی۔ وہ جلسوں میں جس گرج دار انداز میں تقریریں کرتا تھا اور اخبارات میں جس قسم کے سخت بیانات داغتا تھا' انہیں دیکھتے ہوئے ہر شخص یہ سمجھتا ہوگا کہ رئیس اللہ بخش بہت نڈر اور قوم کا ہمدرد شخص ہے مگر اس وقت وہ جس انداز میں میرے آگے گھگھیا رہا تھا' شاید کوئی عام آدمی بھی نہ گھگھیاتا۔

میں نے ریوالور اس کی کنپٹی سے لگا دیا اور سخت لہجے میں بولا "بتاؤ خون کی اس تجارت سے تمہارا کیا تعلق ہے؟ جلد بولو میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"میں.... تمہیں سب.... کچھ بتا دوں گا بابا مگر اس ریوالور کو تو ہٹاؤ" وہ مردہ لہجے میں بولا "میں دل کا مریض ہوں اس لیے...."

"مجھے تمہارے مرض سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے جو پوچھا ہے' مجھے اس کا جواب دو۔"

"اس کاروبار کا کرتا دھرتا تو درّانی ہی ہے" وہ گہرا سانس لے کر بولا "میں تو صرف شیئرز ہولڈر ہوں بابا" اس کا انداز رو دینے والا تھا۔

"اس فائل میں بہت سے اہم لوگوں کے نام نہیں ہیں" میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔ "مجھے بتاؤ کہ مکمل معلومات تمہیں کہاں سے حاصل ہو سکتی ہیں؟"

"یہ تو شاید وہ فائل ہے جو درّانی کا اکاؤنٹنٹ لے گیا تھا" وہ جلدی سے بولا "اصلی فائل تو پولیس کے ایک اعلیٰ افسر کے پاس ہے" موت کے خوف نے اسے سچ بولنے پر مجبور کر دیا تھا۔ انسان کے لہجے سے سچ اور جھوٹ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

"سنو رئیس اللہ بخش!" میں نے فوری طور پر ایک فیصلہ کرتے ہوئے کہا "اگر تم اس کیس میں میری مدد کرنے کا وعدہ کرو تو میں کہیں بھی تمہارا نام نہیں آنے دوں گا مگر اس کی بھی ایک شرط ہے۔ اصل فائل کی ایک فوٹو کاپی میرے پاس رہے گی۔ آئندہ تمہاری کوئی ایسی سرگرمی میرے علم میں آئی تو میں وہ فائل حکومت کے حوالے کر دوں گا۔ یہ سودا منظور ہے تو بولو!" میں نے کہا۔

وہ چند لمحوں تک کچھ سوچتا رہا' پھر شکست خوردہ لہجے میں بولا "مجھے منظور ہے۔"

"اب مجھے پولیس کے اس اعلا افسر کا نام بتاؤ جس کے قبضے میں اصل فائل ہے؟" پھر میں درشت لہجے میں بولا "مجھے نقصان پہنچانے کا کبھی تصور بھی مت کرنا۔ وہ فائل میں اپنے وکیل کے پاس رکھوں گا اور اسے ہدایت کر دوں گا کہ اگر میں کسی حادثے میں مارا جاؤں یا مجھے قتل کر دیا جائے تو وہ فائل پہلی فرصت میں حکومت کے حوالے کر دینا۔ اب جلدی سے اس پولیس افسر کا نام بتاؤ۔"

"یہ تو زیادتی ہے بابا" رئیس اللہ بخش مردہ لہجے میں بولا "تم اگر اپنی موت مر گئے تو میں تو خواہ مخواہ تباہ ہو جاؤں گا۔"

"سائیں' یہ رسک تو لینا پڑے گا" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "ویسے ابھی میرا مرنے کا کوئی ارادہ نہیں اور اگر تم واقعی غریبوں کے ہمدرد بن گئے تو ممکن ہے میں اس فائل کو ضائع بھی کر دوں۔"

"ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔" اس نے تھکے تھکے انداز میں کہا "اس پولیس افسر کا نام صدرالدین ہے۔ وہ...."

"صدرالدین خان!" میں بری طرح اُچھل پڑا "وہ تو بہت نیک نام اور.... مگر تم بھی بہت نیک نام اور بااصول مشہور ہو۔ خیر میں اسے بھی دیکھ لوں گا مگر جب تک اصلی فائل میرے قبضے میں نہیں آجاتی' تم میرے مہمان رہو گے۔"

اس کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ شاید وہ سوچ رہا ہو گا کہ یہاں سے جاتے ہی اس پولیس افسر کو اطلاع دوں گا اور پورے صوبے کی پولیس کو اس دو ٹکے کے رپورٹر کے پیچھے لگا دوں گا۔

میں نے گن مین کی رائفل اپنے قبضے میں کی اور اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر پچھلی سیٹ کے پائیدان میں ٹھونس دیا' پھر میں نے ڈرائیور کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ اس مقصد کے لیے گاڑی میں لگے ہوئے ریشمی پردوں کو پھاڑ کے رسی کے طور پر استعمال کیا تھا۔ وہی کپڑا ان دونوں کے منہ میں ٹھونسنے کے کام بھی آیا تھا۔ میں نے ان دونوں کو بے دردی سے تلے اوپر ٹھونس دیا پھر میں نے اسٹیرنگ سنبھالا اور رئیس اللہ بخش کو اپنے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بٹھا لیا اور اسے جتا دیا کہ اگر تم نے شور مچانے کی کوشش کی تو میں گاڑی کسی بھی تیز رفتار بس یا ٹرک سے ٹکرا دوں گا یا کسی دیوار یا الیکٹرک پول سے دے ماروں گا۔

میں برق رفتاری سے مین روڈ پر نکلا اور ورگ روڈ پر جانے کے بجائے میں نے گاڑی ملیر کینٹ کی طرف موڑ دی۔ میں وہاں سے یونیورسٹی روڈ پر نکلنا چاہتا تھا۔ اس راستے میں کم سے کم رسک تھا۔ ان دنوں ملیر کینٹ کے راستے میں آرمی کی ایک چیک پوسٹ تھی۔ اس پہ بھی آج کی طرح چھان بین نہیں ہوتی تھی۔ جھنڈے والی گاڑی دیکھ کر تو چیک پوسٹ کے سنتریوں نے سلوٹ بھی کیا۔ قسمت اس دن میرے ساتھ تھی۔ میں بغیر کسی روک ٹوک اور خطرے کے رونی کے بنگلے تک پہنچ گیا۔

رونی اور ماریا دونوں ہی گھر میں موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ دونوں کھل اُٹھے۔ ماریا تو مارے خوشی کے رونے لگی۔ حیرت کا دوسرا جھٹکا اس وقت لگا جب ان کی نظر رئیس اللہ بخش پر پڑی۔ رونی کے منہ سے بے اختیار نکلا "یار تم تو شیر کی کچھار سے شیر ہی کو پکڑ لائے۔"

"ارے یار' یہ تو گیدڑ ہے' اس نے صرف شیر کی کھال پہن رکھی ہے" پھر مجھے ان آدمیوں کا خیال آیا جنہیں رئیس نے ماریا کے ساتھ بھیجا تھا۔ میں نے رونی سے پوچھا "تمہارے ساتھ بھی تو دو آدمی آئے تھے' وہ کہاں ہیں؟"

"ان کی لاشیں اورنگی ٹاؤن کے ویرانے میں پڑی ہوں گی۔" رونی نے یوں جواب دیا جیسے وہ انسانوں کے بجائے کتوں کی لاشوں کا تذکرہ کررہا ہو۔

رئیس اللہ بخش اور اس کے گن مین اور ڈرائیور کو الگ الگ کمروں میں بند کردیا گیا۔

میں نے صدرالدین خان کے بارے میں رونی کو بتایا اور کہا کہ میں اسے بھی آج ہی گھیرنا چاہتا ہوں۔ وہ جوان آدمی تھا اور پولیس کا ایک اعلا افسر بھی تھا اس لیے اسے اغوا کرنا بہت مشکل تھا مگر میرے ذہن میں ایک منصوبہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ صدرالدین روزانہ جم خانے جاتا ہے اور رات گئے وہاں سے لوٹتا ہے۔ کلب سے واپسی پر اسے اغوا کرنا نسبتاً آسان تھا۔

○☆○

میں اور رونی بہت دیر سے جم خانے کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ پارکنگ میں صدرالدین کی پولیس جیپ موجود تھی۔ اس کے نزدیک ہی اس کا ڈرائیور بھی کھڑا تھا جو اس کا گن مین بھی تھا۔

خدا خدا کرکے صدرالدین باہر نکلا۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ میں اور رونی سیدھے ہوکر بیٹھ گئے۔ اسٹیئرنگ رونی کے ہاتھ میں تھا۔ سڑکیں اس وقت تقریباً خالی تھیں اس لیے ہماری گاڑیاں تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھیں۔ ہوٹل مہران کے سگنل پر جونہی صدرالدین کی جیپ کے ڈرائیور نے رفتار کم کی' رونی نے پلان کے مطابق جیپ کے پچھلے حصے پر ٹکر ماردی۔ ہماری گاڑی کا ایک ہیڈلیمپ ٹوٹ گیا۔ رونی نے فوراً گاڑی روک دی اور بکتا جھکتا نیچے اُترا۔ صدرالدین اپنی افسری کے زُعم میں تھا۔ وہ بھی گالیاں بکتا ہوا جیپ سے اتر آیا۔ رونی گاڑی کے پاس ہی کھڑا گالیاں بک کے اسے طیش دلا رہا تھا۔ صدرالدین بھناتا ہوا ہماری گاڑی کے پاس آگیا اور سخت لہجے میں بولا "غلطی بھی تمہاری ہے اور گالیاں بھی دے رہے ہو' مجھے جانتے نہیں ہو؟"

"ہاں بھائی تو پاکستان کا صدر ہے" رونی نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا "مگر گاڑی کی ٹوٹ پھوٹ کا خرچا تجھی سے لوں گا۔ تیرے ڈرائیور نے اچانک بریک لگایا تھا۔"

"میں خرچہ دوں گا!" وہ طنزیہ انداز میں بولا "ذرا میرے ساتھ تھانے چلو۔"

"جہاں مرضی چلو" رونی نے کہا "بتاؤ' ہمیں تھانے کی دھمکی دے رہا ہے۔ چل بھائی کس تھانے میں چلنا ہے؟" رونی نے پوچھا۔

صدرالدین نے اپنے ڈرائیور سے کہا "میرے پیچھے آؤ" پھر وہ خود ہی ہماری گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میں پہلے ہی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ صدرالدین کے ساتھ رونی بھی بیٹھ گیا۔ میں نے جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھادی۔ وہ اس وقت نشے میں دھت تھا ورنہ یوں آسانی سے قابو میں نہ آتا۔

کچھ ہی دور جانے کے بعد مجھے رونی کی غراہٹ سُنائی دی "صدرالدین صاحب! خاموشی سے بیٹھے رہو ورنہ اس ریوالور کی ساری گولیاں تمہاری کھوپڑی میں اُتار دوں گا۔ میں گاڑی رکوا رہا ہوں۔ اپنے ڈرائیور سے کہو کہ وہ گھر جائے۔ تم خود ہی گھر پہنچ جاؤ گے۔"

صدرالدین خاصا سخت گیر پولیس افسر تھا۔ اس کا سارا نشہ ہرن ہوگیا۔ اس نے رئیس اللہ بخش کی طرح واویلا نہیں کیا' بس ڈرائیور کو گھر جانے کا حکم دیا اور رونی سے پوچھا "مجھے کہاں لے جارہے ہو؟"

"خاموش بیٹھو" رونی نے اسے جھڑک دیا۔

پھر صدرالدین سارے راستے کچھ نہیں بولا۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتا تھا لیکن اس نے میری شکل نہیں دیکھی تھی۔ میں نے بیک ویو مرر میں دیکھا' رونی اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ رہا تھا۔ صدرالدین سخت لہجے میں بولا "تم لوگوں کو یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ...."

"چٹاخ" گاڑی میں تھپڑ کی زوردار آواز گونجی اور رونی غرا کر بولا "میں نے کہا تھا کہ خاموشی سے بیٹھو۔"

○☆○

صدرالدین کو بھی ایک کمرے میں بند کردیا گیا۔ میں نے رونی سے کہا "رئیس اللہ بخش کو صدرالدین کے ساتھ بند کردو۔ وہی صدرالدین سے فائل کے بارے میں پوچھے گا۔"

"ممکن ہو تو ان دونوں کی گفتگو بھی سُننے کی کوشش کرتے ہیں" ماریا نے کہا۔

رونی نے اس مقصد کے لیے ایک اور کمرے کا بندوبست کیا۔ اس کمرے کے اٹیچڈ باتھ روم کا دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا۔ ہم باتھ روم سے ان دونوں کی گفتگو سُن سکتے تھے۔ ان دونوں کو اسی کمرے میں بند کردیا گیا اور ہم لوگ باتھ روم میں چُھپ گئے۔

"سائیں آپ!" صدرالدین کی حیرت بھری آواز سُنائی دی "آپ یہاں کیسے پہنچے؟"

"مجھے یہ بدبخت اغوا کرلائے ہیں" رئیس اللہ بخش نے تلخ لہجے میں کہا پھر ذرا دھیمی آواز میں بولا "وہ فائل کہاں ہے؟"

"وہ فائل میں بینک لاکر سے لے آیا تھا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ دُرّانی کے اکاؤنٹنٹ کے پاس کن لوگوں کے نام تھے۔ وہ معلومات خاصی پُرانی تھیں۔ اس میں بہت سے لوگوں کے نام نہیں تھے۔ اس میں نہ آپ کا تذکرہ تھا' نہ میرا۔"

"اس فائل کے بارے میں انہیں ہرگز مت بتانا جو تمہارے پاس ہے ورنہ ہم دونوں کے ساتھ ساتھ کئی اور لوگ بھی تباہ ہوجائیں گے" رئیس اللہ بخش نے کہا۔

میرا دماغ گھوم گیا۔ وہ سیاست داں ہم سے بھی سیاست کررہا تھا۔ میں ایک دم باتھ روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ وہ دونوں مجھے دیکھ کر اُچھل پڑے۔ میں نے رئیس اللہ بخش کا گریبان

پکڑلیا اور اس کے منہ پر زنانے کا تھپڑ رسید کرتے ہوئے بولا "تو ہمیں بھی ڈبل کراس کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں ابھی تیری ساری سیاست نکالتا ہوں" یہ کہہ کر میں نے اس پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کردی۔ صدرالدین نے اسے بچانے کی کوشش کی مگر رونی نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ رئیس اللہ بخش کی حالت مُردوں سے بدتر ہوگئی۔ اس کی ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا اور وہ فرش پر پڑا گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

میں نے اطمینان سے سگریٹ سُلگایا اور اس کا ایک گہرا کش لے کر صدرالدین کی طرف متوجہ ہوا "صدرالدین خان صاحب!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "اگر ٹوٹ پھوٹ سے بچنا چاہتے ہو تو اس فائل کا پتا بتادو۔"

"میں رئیس اللہ بخش نہیں ہوں" وہ سخت لہجے میں بولا "پولیس کا اعلیٰ افسر ہوں۔ تم کھلواؤ گے میری زبان!" اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر اتنا زوردار گھونسا مارا کہ وہ اُلٹ کر بیڈ پر گرگیا۔ "بتاؤ کہاں ہے وہ فائل؟" اس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔ میں نے اس کے بال پکڑ کے اسے پھر کھڑا کیا اور دوسری مرتبہ پھر زوردار گھونسا مارا۔ وہ پھر اُلٹ کے فرش پر گرا۔ اس کے سامنے کے دو دانت ٹوٹ گئے اور وہ سر جھٹک کر مجھے دیکھنے لگا۔

"تم اسے چھوڑ دو کامران!" رونی نے کہا "اس کی زبان میں کھلواتا ہوں۔" اس نے جیب سے چاقو نکالا اور سفاک لہجے میں صدرالدین سے بولا "بتاتا ہے یا تیرے دونوں کان کاٹ دوں؟" صدرالدین کوشش کرکے اٹھ بیٹھا مگر بولا کچھ نہیں۔

میں اچانک اس کی پُشت پر پہنچا اور اس کے بال پکڑ کے جلتی ہوئی سگریٹ اس کے کان میں مَسل دی۔ اس کے منہ سے اذیت میں ڈوبی ہوئی چیخ بلند ہوئی۔ میں نے درشت لہجے میں کہا "بتاتا ہے یا ...." جملہ ادھورا چھوڑ کر میں نے دوسرا سگریٹ سُلگالیا اور اس مرتبہ اس کا بایاں کان پکڑ کے پوچھا "جلدی بول ورنہ اس مرتبہ سگریٹ اس کان میں بجھے گی۔"

وہ دہشت زدہ انداز میں بولا "بتاتا ہوں.... بتاتا ہوں.... وہ فائل اس وقت میرے بیڈ روم کی کیبنٹ میں موجود ہے۔"

کیبنٹ کی چابی کہاں ہے؟" میں نے اس کے بالوں کو جھٹکا دے کر پوچھا۔

چابی میری بیوی کے پاس ہے مگر تم لوگ میری بیوی کو کوئی نقصان مت پہنچانا۔"

میں نے پھر صدرالدین اور رئیس اللہ بخش کو الگ الگ کمروں میں بند کیا اور اسی وقت صدرالدین کے گھر جانے کا فیصلہ کرلیا۔ ہمیں جو کچھ کرنا تھا، آج ہی کرنا تھا۔ صبح تو پورے ملک میں صدرالدین اور رئیس اللہ بخش کی پُراسرار گمشدگی کا ہوا کھڑا

ہو جاتا۔

میں اور روفی ایک مرتبہ پھر گاڑی میں صدرالدین کے بنگلے کی طرف جا رہے تھے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ رئیس اللہ بخش کی وجہ سے پولیس حرکت میں آچکی ہے۔ ہم نے اس مرتبہ بھی وہی گاڑی استعمال کی تھی جس پر بلوچستان کی نمبر پلیٹ تھی۔ میرے جسم پر ڈرائیور کی یونیفارم تھی اور سر پر.... کیپ بھی تھی تاکہ پولیس سے سامنا ہو جائے تو وہ مجھے پہلی نظر میں پہچان نہ سکے۔

ہم صدرالدین کے بنگلے تک تو پہنچ گئے تھے مگر اندر داخل ہونا بھی ایک مسئلہ تھا۔ وہ پولیس کا اعلیٰ افسر تھا۔ اس کے بنگلے پر باقاعدہ پولیس گارڈ موجود تھی۔

روفی نے ایک جوا کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے گاڑی عین بنگلے کے گیٹ کے سامنے رکوائی اور مجھ سے ہارن بجانے کو کہا۔ فوراً ہی گیٹ کی ذیلی کھڑکی سے ایک کانسٹیبل برآمد ہوا اور بولا "ہاں جی 'فرماؤ' کس سے ملنا ہے؟"

"میں صاحب کا دوست ہوں" روفی نے باوقار انداز میں کہا "آج صبح کی فلائٹ سے امریکا جا رہا ہوں۔ مجھے ان سے بہت ضروری کام ہے۔ میرا نام درّانی ہے۔"

"مگر صاحب تو کہیں باہر گئے ہیں جی" کانسٹیبل ایک دم مرعوب ہو گیا۔

"بیگم صاحبہ تو ہوں گی۔ میں انہی سے مل لوں گا۔ کام تمہارے صاحب ہی کا ہے اگر ان سے یا بیگم صاحبہ سے ملاقات نہ ہوئی تو تمہاری مصیبت آجائے گی۔"

"میں پتا کرتا ہوں جی" وہ جلدی سے مڑا "بیگم صاحب تو سو چکی ہیں" یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر نمودار ہوا اور بولا "آپ چل کر ڈرائنگ روم میں بیٹھو۔ میں نے بیگم صاحبہ کو اطلاع کر دی ہے۔ وہ ابھی آرہی ہیں۔"

روفی نے مجھے باہر ہی ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور خود اس کانسٹیبل کے ساتھ اندر چلا گیا۔

میں اس کے انتظار میں سگریٹ پھونکتا رہا۔ ایک ایک لمحہ مجھے صدیوں پر محیط لگ رہا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ روفی کو اندر گئے بیس منٹ سے زیادہ ہو گئے تھے۔ مجھے اب تشویش ہو رہی تھی۔ اسے اتنی دیر تو نہیں لگنی چاہیے تھی۔

اچانک بنگلے کے اندر سے فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ میں بُری طرح اُچھل پڑا اور اضطراب کے عالم میں گاڑی سے باہر آگیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ روفی کی وہ گاڑی چلتا پھرتا اسلحہ خانہ تھی مگر میں وہ اسلحہ استعمال کیسے کر سکتا تھا۔ مجھے تو اندر کی صورتِ حال کا بالکل علم نہیں تھا۔ ممکن ہے میری فائرنگ کی زد میں روفی ہی آجاتا۔ مجھے یہ بھی خطرہ تھا کہ صدرالدین کے کسی ملازم نے پولیس کو فون نہ کر دیا ہو۔ اس صورت میں پولیس کی موبائل گاڑیاں وہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگاتیں۔

میں ایک مرتبہ پھر گاڑی میں بیٹھا اور اسے اسٹارٹ کر کے ایسے رُخ پر کھڑا کر دیا کہ فوری طور پر فرار ہونے میں آسانی رہے۔ مجھے علم تھا کہ گاڑی میں اسلحہ کس جگہ رکھا ہوا ہے۔ میں نے پچھلی سیٹ اُلٹا کر اس کے نیچے خفیہ خانے میں ہاتھ ڈالا تو میرے ہاتھ میں بھاری کیلیبر کی ایک مشین پسٹل آگئی۔ وہ ٹو اِن ون مشین پسٹل تھی یعنی ایک ایک کر کے فائر بھی کر سکتی تھی اور ایک لیور گھمانے سے ٹریگر دباتے ہی مسلسل فائرنگ بھی کر سکتی تھی۔ میں نے اس میں میگزین فٹ کیا اور دوسرے ہاتھ میں اپنا مخصوص ریوالور پوائنٹ تھری ایٹ کا کولٹ بھی پکڑ لیا۔

فائرنگ کی آوازیں اب گیٹ کے بالکل نزدیک سے آرہی تھیں پھر اچانک گیٹ کی ذیلی کھڑکی کھلی اور روفی لڑکھڑاتا ہوا نمودار ہوا۔ گیٹ کی روشن لیمپ پوسٹ میں مجھے اس کی پینٹ کا ایک پائنچہ خون میں تر دکھائی دیا۔

اس کے پیچھے دو کانسٹیبل نمودار ہوئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور دوسرے نے رائفل اُٹھا رکھی تھی۔ میں نے چیخ کر کہا "لیٹ جاؤ روفی۔" روفی پھرتی سے زمین پر گر گیا۔ میں نے مشین پسٹل کا لاک ہٹایا اور آٹومیٹک ریوالور کا ٹریگر دبا دیا۔ ان میں سے ایک زخمی ہو کر وہیں گر گیا۔ ریوالور والا کانسٹیبل خوف زدہ ہو کر اندر بھاگ گیا۔ "اٹھو روفی" میں نے جلدی سے کہا اور لپک کر اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ وہ میرا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور گاڑی کی طرف دوڑ لگا دی پھر میں نے اس کا دل رکھنے کو کہا "کوئی بات نہیں' ہمیشہ کامیابی ہی نہیں ہوتی۔"

"روفی کوئی کام ادھورا نہیں کرتا" اس نے گاڑی کی سیٹ پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا "یہ رہی وہ فائل" اس نے اپنے کوٹ کے بٹن کھول کر مجھے ایک فائل دکھائی جو اس نے پینٹ کی بیلٹ میں ٹھونس رکھی تھی۔

میں نے گاڑی کا انجن اسٹارٹ کیا اور جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اسی وقت پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سے پورا علاقہ گونج اُٹھا۔ گاڑیاں بہت پلاننگ سے وہاں پہنچی تھیں۔ ان میں سے دو ہمارے پیچھے تھیں اور ایک سامنے سے نمودار ہوئی تھی۔ میں نے سامنے والی گاڑی کی پروا کیے بغیر گاڑی کی رفتار خوف ناک حد تک بڑھا دی۔ وہ لوگ اس وقت گاڑی سڑک پر ترچھی کھڑی کر کے روڈ بلاک کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ روفی نے چیخ کر کہا "مشین پسٹل مجھے دو اور یہاں سے ہر قیمت پر نکلنے کی کوشش کرو۔ چاہے اس کے لیے ہمیں پولیس گاڑی کو ٹکر ہی کیوں نہ مارنا پڑے۔"

اس نے کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر پولیس کی گاڑی پر ایک برسٹ مارا۔ پولیس کی گاڑی ابھی تک روڈ پوری طرح بلاک نہیں کر سکی تھی اس لیے وہاں سے نکلنے کا راستہ تھا۔ اس مرتبہ اس نے

پولیس کی گاڑی کے پچھلے دو ٹائر فائرنگ کر کے برسٹ کر دیے۔

میں نے زناٹے سے گاڑی وہاں سے نکال لی۔ پولیس والوں نے ہم پہ فائرنگ کی کوشش کی مگر ان کی کوئی بھی گولی کارآمد ثابت نہیں ہوئی۔ میں گاڑی دیوانہ وار دوڑاتا ہوا مین روڈ پر نکل آیا۔

پولیس کی ایک وین تو ناکارہ ہو گئی تھی مگر بقیہ دو ہمارے تعاقب میں آ رہی تھیں۔ سڑکیں اس وقت خالی تھیں اس لیے میں گاڑی کو زگ زیگ انداز میں چلا رہا تھا۔ پیچھے سے ہم پر مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ اچانک روفی نے اپنی سیٹ کی پشت کھولی اور پھرتی سے پیچھے چلا گیا پھر اس نے سیٹ اٹھا کر کوئی اور ہتھیار نکالا۔ میری توجہ ڈرائیونگ پر تھی اس لیے مجھے علم نہ ہو سکا پھر میں نے اسے گاڑی کی پچھلی کھڑکی سے ہاتھ باہر نکالتے دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے فضا دھماکے سے لرز اٹھی۔ روفی کے پھینکے ہوئے دستی بم کی زد میں پولیس وین آ گئی تھی پھر میں نے عقبی شیشے میں پولیس وین کو قلابازیاں کھاتے اور جلتے دیکھا۔ دوسری وین لمحے بھر کو رکی' اس میں سے دو آدمی باہر کودے' پھر وہ سائرن بجاتی ہوئی برق رفتاری سے ہمارے تعاقب میں لگ گئی۔

"کامران!" میں انہیں ڈاج دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ اسٹیئرنگ میرے حوالے کرو اور تم یہ فائل لے کر اتر جاؤ بلکہ گاڑی میں ایک بریف کیس بھی موجود ہے۔ میں وہ فائل اسی بریف کیس میں رکھ دیتا ہوں' میری ٹانگ میں گولی لگی ہے ورنہ یہ میں خود کرتا۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ فائل پولیس کے ہاتھ لگ جائے اور ہماری ساری محنت پر پانی پھر جائے۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا "اترنے سے پہلے ڈرائیوروں والی یہ یونیفارم اتار دینا۔"

میں نے بالکل عین وقت پر ڈرائیور کا بہروپ بھرا تھا اس لیے میں نے کوٹ اتار کے صرف ڈرائیور کی بش شرٹ پہنی تھی۔ میں نے بھی روفی کی طرح سیٹ کی پشت پوری طرح کھول دی۔ وہ اچھل کر اگلی سیٹ پر آ گیا اور اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ میں سرکس کے جمناسٹ کی طرح الٹی قلابازی کھا کر پیچھے کی طرف چلا گیا۔ ایکسی لیریٹر سے میرے پاؤں کا دباؤ ہٹتے ہی گاڑی کی رفتار چند لمحوں کو کم ہوئی' پھر گاڑی اس سے بھی زیادہ رفتار سے دوڑنے لگی۔

پولیس کی وین ہمارے تعاقب میں تھی اور مجھے خطرہ تھا کہ سائرن کی آواز سے پولیس کی دوسری موبائل گاڑیاں ہمیں گھیرنے کی کوشش نہ کریں۔ سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی کی طرف مڑتے ہی ہماری گاڑی پولیس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں اس عرصے میں بش شرٹ اتار کے کوٹ پہن چکا تھا۔ روفی نے علامہ آئی آئی قاضی ہال کے سامنے گاڑی روکی اور مجھ سے کہا کہ تم بریف کیس لے کر فوراً اتر جاؤ۔ اب وہ لوگ میری گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے مگر میں رسک لینا نہیں چاہتا۔ تم فائل لے کر گھر پہنچو' میں پولیس کو ڈاج دیتا ہوں۔ ان کی ساری توجہ اس وقت میری گاڑی پر مرکوز ہے۔ وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گے' چلو جلدی کرو۔"

میں نے بریف کیس اٹھایا اور پھرتی سے نیچے آ گیا۔ میرے اترتے ہی روفی نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس تمام کارروائی میں مشکل سے ایک منٹ لگا ہو گا۔ میں بریف کیس لے کر اس سڑک پر بھاگ نکلا جس کے کارنر پہ آج کل مہران کلینک واقع ہے۔ اسی وقت پولیس کی وین سائرن بجاتی ہوئی نمودار ہوئی اور برق رفتاری سے اسی سمت روانہ ہو گئی جدھر روفی کی گاڑی گئی تھی۔

میں وہاں سے سوسائٹی آفس کی طرف نکل گیا۔ سوسائٹی آفس کے پاس مجھے ایک سوزوکی دکھائی دی۔ میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور صوبہ سرحد کا باشندہ تھا۔ میں پشتو بھی اسی روانی سے بول سکتا ہوں جس روانی سے اردو یا اپنی مادری زبان پنجابی!

میں نے اس سے پشتو میں پوچھا کہ تم کہاں جا رہے ہو۔ اس نے بتایا کہ میں سبزی منڈی جا رہا ہوں۔ اس وقت مجھے وہاں سے بھاڑا مل جائے گا۔

"کچھ دشمن میرے تعاقب میں ہیں" میں نے اس سے کہا "کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟"

"میں تمہاری مدد کروں گا' بتاؤ کیا چاہتے ہو؟"

"مجھے اپنی گاڑی میں نارتھ ناظم آباد تک چھوڑ دو مگر پہلے سبزی اٹھا لو۔ خالی گاڑی دیکھ کر وہ شبے میں مبتلا ہو جائیں گے" میں نے جان بوجھ کر پولیس کا نام نہیں لیا کہ کہیں وہ بدک ہی نہ جائے۔

"آؤ بیٹھو" اس نے خلوص سے کہا "یہ بھی کوئی کام ہے؟" پھر

ذرا توقف کے بعد بولا "یارا' تم کس علاقے کے ہو؟"

میں نے اس کی گاڑی پر "پرنس آف بٹ خیلہ" کے الفاظ پڑھ لیے تھے۔ میں جانتا تھا کہ بٹ خیلہ' نوشہرہ چھاؤنی کے پاس ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ میں نے اطمینان سے جواب دیا "یارا' میں نوشہرہ کا رہنے والا ہوں۔"

وہ ایک دم خوش ہوگیا اور بولا "تم تو ہمارے ہی علاقے کے ہو۔ تمہارے لیے تو جان بھی حاضر ہے" پھر وہ سارے راستے نوشہرہ کی باتیں کرتا رہا۔

مجھے ندامت ہو رہی تھی کہ میں نے خواہ مخواہ سادہ لوح اور پُرخلوص انسان سے جھوٹ بولا۔ جلد ہی اسے سبزی منڈی سے نیو کراچی کا ایک گاہک مل گیا۔ اس نے جلدی جلدی سوزوکی میں سبزی لوڈ کی اور تیز رفتاری سے روانہ ہوگیا۔ اپنے گاہک کو اس نے بتادیا تھا کہ پہلے میں اپنے بھائی کو ناظم آباد چھوڑوں گا۔

میں مین روڈ پر اُتر گیا۔ ڈرائیور باقاعدہ مجھ سے گلے ملا اور اپنا پتا بھی بتادیا کہ میں سولجر بازار کے سوزوکی اسٹینڈ پر ہوتا ہوں۔ وہاں کسی سے بھی صوبہ خان کو پوچھ لینا۔ وہ تمہیں مجھ تک پہنچادے گا۔"

میں گھر پہنچا تو روبی گھر میں موجود تھا۔ اس نے گھر ہی پر ڈاکٹر کو بلا کر مرہم پٹی کرالی تھی۔ گولی اس کی دائیں ران میں پیوست ہوگئی تھی مگر ہڈی کو نقصان نہیں پہنچا تھا۔

دوسرے دن کے اخبارات میں رئیس اللہ بخش کے اغوا اور پولیس کے ایک اعلیٰ افسر صدرالدین کی پُراسرار گمشدگی اور اس کے گھر پر نامعلوم افراد کے حملے کی خبریں تین تین اور چار چار کالموں میں فرنٹ پیج پر موجود تھیں۔ پولیس نے پورے شہر کی ناکہ بندی کردی تھی۔ کراچی سے باہر جانے والے تمام راستے بلاک تھے اور پولیس گھر گھر تلاشی کا پروگرام بنارہی تھی۔ اس مقصد کے لیے صوبے کے دوسرے علاقوں سے بھی پولیس کی بھاری جمعیت کراچی پہنچنے والی تھی اور آرمی انٹیلی جنس بھی حرکت میں آگئی تھی۔ رئیس اللہ بخش اتنا ہی بڑا سیاست داں تھا کہ پولیس اس کی تلاش میں کنوؤں میں بانس ڈال سکتی تھی۔ خبریں پڑھ کر ماریا تو سہم کر رہ گئی تھی۔ روبی بھی پریشان تھا۔ مجھے بھی مایوسی ہو رہی تھی۔ پولیس آج نہیں تو کل ہمارا سُراغ لگالیتی' پھر ہماری ساری محنت پر پانی پھرجاتا اور اغوا' قتل' ڈکیتی کے مقدمے الگ بنتے۔ رئیس اللہ بخش کے اغوا میں تو پولیس نے واضح طور پر مجھے اور ماریا کو ملوث کیا تھا کیوں کہ اس کے آخری ملاقاتی ہم ہی تھے اور وہ میرے ہی ساتھ گھر سے نکلا تھا۔

اچانک مجھے اپنے ملازم اکبر کا خیال آیا۔ اسے تو پولیس نے اب تک گرفتار کرلیا ہوگا اور اس پر تشدد کرکے میرے بارے میں پوچھ گچھ ہو رہی ہوگی۔ میں نے اپنے گھر کا نمبر ڈائل کیا تو دوسری طرف سے غیرمانوس اور اکھڑی آواز سنائی دی "ہیلو۔"

وہ اکبر ہرگز نہیں تھا۔ میں نے پشتو میں کہا "اکبر خان سے بات کرنی ہے۔"

"کیا بول رہے ہو یارا' اردو یا پنجابی میں بات کرو۔ مجھے پشتو نہیں آتی۔"

میں نے اپنا سوال پنجابی میں دُہرایا۔

تھوڑی دیر بعد فون پر اکبر کی مانوس آواز اُبھری۔ وہ پنجابی زبان میں بول رہا تھا۔

میں نے بھی پنجابی میں کہا "اکبر خان' کی حال نیں تیرے؟ خیرخیریت تے ہے نا!"

"خیرخیریت نئیں اے یارا! او میرا صاحب پتا نہیں کہاں چلاگیا ہے۔ پولیس نے مجھے بیزار کردیا ہے۔ اب بھی وہ لوگ یہاں بیٹھے ہیں۔ میں نے تو صاحب کے والد صاحب کو بھی فون کردیا تھا اور ساری صورتِ حال سے آگاہ کردیا تھا۔"

اکبر نے میری آواز پہچان کر پہلے تو مجھے یہ بتایا تھا کہ پولیس وہیں موجود ہے۔ وہ لوگ ہماری گفتگو سُن بھی رہے ہوں گے۔ اس نے یہ بھی بتادیا تھا کہ وہ پاپا کو اطلاع دے چکا ہے اور یقیناً یہاں کا فون نمبر بھی۔ میرے ساتھ رہ کر اکبر بھی خاصا ٹرینڈ ہوچکا تھا۔

اب مجھے پاپا کے فون کا انتظار تھا۔

صبح ہو رہی تھی اور اُجالا پھیلتا جارہا تھا۔ گویا میں نے ایک اور رات بھاگ دوڑ میں گزاردی تھی۔ میں روبی کے بیڈ روم میں چلا آیا۔ زخمی ہونے کے باوجود وہ مسکرا رہا تھا۔ میں اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ ہم دونوں موجودہ مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتے رہے۔ چونکے اس وقت جب اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

روبی نے ریسیور اُٹھالیا اور دوسری طرف کی آواز سُن کر بولا "آپ نے کہاں فون کیا ہے؟... جی نمبر تو یہی ہے مگر... کیا نام بتایا... بریگیڈیئر رفیع الدین خان..."

میں اچھل پڑا۔ وہ پاپا کا فون تھا۔ میں نے روبی کے ہاتھ سے ریسیور جھپٹ لیا۔ دوسری طرف پاپا ہی تھے' وہ کہہ رہے تھے کہ ڈرو مت' کامران میرا بیٹا ہے اگر وہ وہاں موجود ہے تو مجھ سے بات کراؤ۔"

"ہیلو پاپا!" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "میں کامران بول رہا ہوں۔"

"مجھے اپنا ایڈریس بتاؤ کامی!" پاپا نے کہا "میں ابھی تھوڑی دیر پہلے کراچی پہنچا ہوں اور اس وقت کور ہیڈکوارٹر سے بول رہا ہوں۔"

"پاپا میں تو بہت مصیبت میں گرفتار ہوں۔ میں...."

"مائنڈ اِٹ مائی سن" پاپا نے مخصوص لہجے میں کہا "اگر تم بے گناہ ہو تو تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا لیکن اگر تمہارا جرم ثابت ہوگیا تو اپنے ہاتھوں سے تمہیں پولیس کے حوالے کردوں گا۔ ناؤ ٹیل می یور ایڈریس' ہری اپ۔"

میں نے انھیں رونی کا ایڈریس لکھایا' اور باتھ روم میں گھس گیا تاکہ نہا دھو کر تازہ دم ہو جاؤں۔

میں تیار ہو کر باہر نکلا تو ماریا نے مجھے رونی کے بیڈ روم میں بُلالیا۔ وہیں ناشتے کی ٹرالی رکھی تھی کیوں کہ رونی زخمی ہونے کی وجہ سے چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھا۔ میں ناشتا شروع ہی کرنے والا تھا کہ کال بیل بج اُٹھی۔ فوراً ہی ایک ملازم نے بتایا کہ باہر کئی فوجی افسر اور جوان موجود ہیں۔

میں لپک کر دروازے پر پہنچا۔ باہر پاپا فوجی وردی میں موجود تھے۔ ان کے ساتھ ایک میجر اور ایک کیپٹن بھی تھا۔ فوجی جیپ کے پیچھے آرمی کا ایک ٹرک بھی تھا جس میں جوان مستعد بیٹھے تھے۔ پاپا نے بڑھ کر مجھے گلے لگالیا۔ میں نے باری باری دوسرے افسروں سے مصافحہ کیا اور ان لوگوں کو ڈرائنگ روم میں لے آیا۔

پھر میں نے شروع سے لے کر آخر تک انھیں پوری کہانی تفصیل سے سُنادی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دونوں فائلیں بھی انھیں دے دیں۔ پاپا ان فائلوں میں اتنے محو ہوئے کہ انھیں کافی پینے کا بھی ہوش نہ رہا۔ وہ لوگ ناشتا کر کے آئے تھے اس لیے میں نے ان کے لیے کافی منگالی تھی۔

جتنی دیر پاپا نے فائلوں کا مطالعہ کیا' میں رونی کے بیڈ روم میں جاکر ناشتا کر آیا۔ اس دن میں نے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا اس لیے بھوک بھی خوب کُھل کے لگی تھی۔

میں ڈرائنگ روم میں پہنچا تو پاپا اس وقت بھی فائل میں منہمک تھے' ان کے چہرے پر شدید غصے کے تاثرات تھے اور آنکھیں گویا شعلے برسارہی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ شدید غصے کے عالم میں ان کی یہی حالت ہوتی تھی۔

"وہ لڑکی کہاں ہے؟" پاپا نے فائلیں احتیاط سے بریف کیس میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ یہیں میرے ساتھ ہے' کیا اسے بھی یہیں بلالوں؟"

"ہاں' اسے بھی بُلالو" پھر وہ چونک کر بولے "اور وہ رئیس اللہ بخش اور پولیس آفیسر صدرالدین کہاں ہے؟"

"وہ بھی یہیں ہیں" میں نے جواب دیا "اور رئیس اللہ بخش بھی!"

"تمھیں شاید علم نہیں کہ یہ لوگ خون کی تجارت کے ساتھ ساتھ ملکی دفاع کے خلاف بھی سرگرم عمل ہیں اس لیے یہ کیس اب آرمی انٹیلی جنس کی ذمے داری ہے۔ اب تم اسے بھول جاؤ اور سکون سے سوجاؤ۔ رات بھر کی بھاگ دوڑ سے تمھاری طبیعت خاصی بوجھل لگ رہی ہے۔"

پاپا وہ فائلیں لے کر چلے گئے تو میں واقعی لمبی تان کر سوگیا اگر ماریا مجھے جھنجوڑ کر نہ اُٹھاتی تو شاید میں مزید کئی گھنٹے سوتا رہتا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو حیرت زدہ رہ گیا۔ اس وقت رات کے نو بج رہے تھے گویا میں بارہ تیرہ گھنٹے تک مسلسل سوتا رہا تھا۔ ماریا مجھے بہت خوش لگ رہی تھی۔

"خیریت تو ہے' یہ تمھارے دانت کیوں نکلے ہوئے ہیں؟"

"خبریں ہی ایسی ہیں" وہ ہنس کر بولی "ابھی ٹی وی سے خبر نشر ہوئی ہے کہ آرمی انٹیلی جنس نے ان تمام لوگوں کو گرفتار کرلیا ہے جن کے خلاف ان فائلوں میں ٹھوس ثبوت تھا" پھر وہ چونک کر بولی "ہاں' وہ تمھارے پاپا کے بھیجے ہوئے آدمی کچھ دیر پہلے صدرالدین اور رئیس اللہ بخش کو بھی لے گئے ہیں۔"

تین دن کے اندر اندر وہ سب لوگ پکڑے گئے مگر اخبارات میں اس اہم معاملے کی وہ تفصیلات نہ آسکیں جو دیگر اہم افراد کے علاوہ میرے علم میں تھیں۔ میں اس کی وجہ سمجھتا ہوں۔ مجھے' ماریا اور رونی کو اس سارے معاملے سے الگ کردیا گیا تھا۔

میں اب اپنے گھر لوٹ آیا تھا۔ اسی وقت انصاری صاحب کا فون آگیا۔ وہ خوش دلی سے بولے "ہاں کامران' ڈیوٹی کب سے جوائن کر رہے ہو؟"

"سوری سر!" میں نے جواب دیا "پہلے درّانی کے خلاف خبر لگے گی پھر کچھ بات ہوگی۔"

"ایڈیٹ!" انھوں نے شفقت سے مجھے جھڑک دیا "تم نے ابھی تک اپنا اخبار نہیں پڑھا!"

میں اپنا اخبار دیکھ چکا تھا اور اس میں شائع ہونے والی درّانی کے خلاف خبر بھی پڑھ چکا تھا لیکن میں نے معذرت کرکے جان چھڑالی۔

پاپا ابھی کراچی ہی میں تھے اور میرے ہی ساتھ مقیم تھے۔ ایک دن وہ مجھ سے کہنے لگے "مجھے تم پر فخر ہے کامی! میرا خیال غلط تھا۔ انسان ملک اور قوم کا ہمدرد ہو تو وہ ہر شعبے میں رہ کر وطن کی حفاظت کرسکتا ہے" پھر وہ مسکرا کر بولے "میں چاہتا ہوں کہ اب تم شادی کرلو۔ میرے خیال میں ماریا اچھی لڑکی ہے۔"

○☆○

ایک ہفتے کے اندر اندر امّی اور میرے دوسرے بھائی کراچی آگئے اور ایک سادہ سی تقریب میں ماریا ہمیشہ کے لیے میری ہوگئی۔ میری شادی میں انصاری صاحب بھی شریک تھے۔ وہ اپنے گزشتہ رویّے پر بہت شرمندہ تھے۔ انھوں نے بتایا کہ مسز درّانی نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر یہ خبر اخبار میں شائع ہوئی تو تمھاری دونوں بیٹیوں کو اغوا کرلیا جائے گا۔ میں جانتا تھا بیٹے کہ وہ ایسا کرسکتے تھے بہرحال اب تم "ڈیلی نیشنل آبزرور" کے چیف رپورٹر ہو۔ میری طرف سے شادی کے گفٹ کے طور پر ایک مہینے کی چھٹی اور سوئٹزرلینڈ کے دو ٹکٹ ہیں' وش یو بیسٹ آف لک!"

آج کے معاشرے کا عکاس ایک لرزہ خیز و چشم کشا المیہ سرورق کا تیسرا رنگ

بڑا سودا

غلام قادر

انسان کی زندگی میں ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب اُس کی مجبوریاں اُسے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دینے کے لیے اُکساتی ہیں۔ وہ اپنی ہر متاعِ عزیز بڑے بھلے داموں بیچنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ ایسے موقع پر خریداروں کی حرص و ہوس دیدنی ہوتی ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے لیے طویل المیعاد سودے بازی کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسی ہی حالات کے شکنجے میں پھنسی ہوئی دوشیزہ کا فسانۂ عبرت ہے جو خریداروں کی ہر شرط ماننے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اُس نے اپنے ماں باپ، بھائی کی مصیبتوں کے بدلے اپنی مصیبتوں کا سودا کر لیا تھا مگر اس کے بعد وہی پتے ہوا دینے لگے جن پر تکیہ تھا۔

جاسوسی ڈائجسٹ، جولائی 1993ء

دولت و اقتدار کے اُن بندوں کا ماجرا جو خیر و شر کی تمیز کھو بیٹھے تھے

چاند آہستہ آہستہ اپنی مسافتوں کا سفر طے کرتا ہوا اپنی منزل کے قریب تر پہنچ چکا تھا مگر نائلہ کے لیے جیسے وقت تھم چکا تھا۔ رات بھر کی تھکن لیے تارے بھی اپنے اپنے مقام پر نیند سے بوجھل آنکھیں جھپکا کر اپنی رخصت کے پل کا انتظار کر رہے تھے مگر اپنے پر تعیش بیڈ روم میں موجود فلموں کی مشہور ہیروئن ابھی تک کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکی تھی۔

"میرے خدا میں کیا کروں؟" اس نے کمرے میں ٹہلنا بند کر کے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کیا تم اس قابل بھی ہو کہ اپنی زبان سے خدا کا نام بھی لے سکو؟" ذہن کے ہی کسی گوشے سے سرگوشی ہوئی۔

"میں اپنے حالات کا شکار ہوئی ہوں۔" اس نے اپنے اندر کی آواز کو دبانے کی کوشش کی مگر آج یہ آواز تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔

"جھوٹ بولتی ہو تم..." وہی آواز پھر ابھری "آسائشوں کے حصول کے لیے تم نے جو شارٹ کٹ اختیار کیا تھا اس کا اختتام ایسی ہی کسی بند گلی میں ہوتا تھا۔"

"مگر میں خود تو اس دلدل میں نہیں کودی تھی۔" اس نے ایک بار پھر کمزور آواز میں کہا۔

"جھوٹ بول کر تم اپنی ذات کے علاوہ کسی کو بھی بے وقوف نہیں بنا سکتیں۔" ضمیر کی آواز نے ایک اور چرکا لگاتے ہوئے کہا۔

"یاد کرو کہ تمہیں کس نے اس گناہ کی سڑک پر سرپٹ دوڑنے کے لیے کہا تھا... کسی نے بھی نہیں... اور آج تم کہتی ہو..." ضمیر کی آواز تیز تر ہو رہی تھی مگر نائلہ آٹھ سال پہلے کی اس رات میں پہنچ چکی تھی جس کے بعد نکلنے والے ہر سورج نے اس کے خوب صورت چہرے پر گناہ کی سیاہی کا ایک نیا دھبّا دیکھا تھا۔

آنکھیں بند کر کے ہمہ وقت خوابوں کے جزیرے پر زندگی بسر کرنے والی نائلہ کے خاندان پر وہ قیامت کی تیسری رات تھی جب رات کے ڈیڑھ بجے اماں گھر میں داخل ہوئی تھیں۔

"کیا ہوا... کوئی بات بنی؟" ابّا نے پوچھا۔

"ہر ثبوت شارق کے خلاف ہے۔ وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔" اماں کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔

"تو پھر؟" ابا نے دوبارہ کہا مگر اس بار اماں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا "تم تو کہتی تھیں کہ امید کی کرن نظر آئی ہے؟" ابا سے برداشت نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ اس تصور سے ہی ہول رہے تھے کہ ان کا اکلوتا بیٹا پھانسی چڑھ جائے گا۔

"لڑکیاں سو گئیں؟" اماں نے ابا کے سوال کا جواب دینے کے بجائے ایک مختلف سوال کیا۔

"ہاں بہت دیر ہوئی۔" ابا نے اماں کو جواب دیا۔ نائلہ نے ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھا، صائمہ اور سلمہ دونوں اپنے بستر پر سو رہی تھیں۔ اماں کے قدموں کی آواز آئی تو نائلہ نے بھی آنکھیں

بند کر کے گہری نیند میں ہونے کی اداکاری شروع کر دی پھر بٹن دبنے کی آواز کے ساتھ ہی نائلہ کو اپنی بند آنکھوں پر روشنی محسوس ہوئی مگر اس کے باوجود وہ اپنی جگہ پر اسی طرح لیٹی رہی۔ اماں کچھ دیر تک ان تینوں کو دیکھتی رہیں اور پھر انہوں نے روشنی بجھا دی اور اس کے ساتھ ہی ان کے قدموں کی دور جاتی ہوئی آواز سنائی دیتی رہی۔

"تم نے بتایا نہیں کہ تم جو کہہ رہی تھیں کہ....."

"تم نے کھانا کھالیا؟" اماں نے ابا کی بات کو درمیان میں سے اچک لیا تھا۔

"نہیں... مگر...."

"اور بچیوں نے؟" اماں نے ایک اور سوال کیا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ دانستہ ابا کے سوال کا جواب دینے سے گریز کر رہی تھیں۔

"انہوں نے کھالیا ہے۔" ابا نے جواب دیا "سامنے والے حمید قریشی صاحب کی بیگم کھانا لے کر آئی تھیں۔" ابا نے اماں کے سوال کا مکمل جواب دیتے ہوئے کہا تھا "تم نے کھالیا کھانا؟" کچھ سوچ کر ابا بولے تھے۔

"ہاں۔" اماں نے جواب میں صرف ایک لفظ کہا اور ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

اپنی جگہ پر لیٹی ہوئی نائلہ اس خاموشی سے اکتانے لگی تھی۔

"آخر اماں، ابا کے سوال کو کیوں ٹال رہی ہیں؟" اس نے سوچا۔

"تم کچھ کہہ رہی تھیں؟" آخر کار اماں کے پیدا کردہ سسپنس سے تنگ آکر ابا بول پڑے تھے۔

"میرے پاس اب کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا شاکر۔" اماں کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی "جو مطالبہ شارق کی رہائی کے لیے ڈی ایس پی نے کیا ہے وہ ہم پورا نہیں کر سکتے اور....."

"کیا کہتا ہے وہ حرام زادہ؟" ابا نے تڑپ کر قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

"جب اپنا سکہ ہی کھوٹا ہو تو کسی کو گالیاں دے کر کیا فرق پڑ سکتا ہے۔" اماں نے رونے والے انداز میں کہا۔

"پھر بھی وہ کمینہ کہتا کیا ہے؟" ابا نے اماں کی بات ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکالتے ہوئے کہا۔ وہ ہمیشہ سے یہی کرتے آئے تھے۔ اماں ان سے لاکھ کچھ کہتی رہتیں مگر انہوں نے آج تک ان کی کسی بات پر کان نہیں دھرے تھے۔ شارق کے معاملے میں بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ اکلوتا ہونے کی وجہ سے ابا اس کے کچھ زیادہ ہی ناز اٹھاتے تھے۔ محلے والے تو ایک طرف، اگر کبھی اماں بھی اس کی شکایت کرتیں تو ابا ہنس کر ٹال دیتے تھے۔

"ابھی بچہ ہے اور شرارتیں بچے نہیں کریں گے تو پھر کون کرے گا۔" ان کا ہر بار ایک ہی جواب ہوتا تھا۔ مگر شارق کی بدتمیزیاں باپ کی شہ پا کر بڑھتی ہی چلی گئیں۔ وہ کالج پہنچا تو وہاں دوست بھی اسے اسی کی طرح ملے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ آج وہ اغوا برائے تاوان اور قتل کے الزام میں تھانے میں بند تھا۔

"ڈی ایس پی ریاض حیدر کا کہنا ہے کہ آپ کا بیٹا ہمیں ڈکیتی کی کئی وارداتوں میں مطلوب تھا اور آٹھ ڈکیتیوں کا اعتراف تو وہ خود کر چکا ہے۔" اماں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

"بکواس ہے یہ سب!" ابا اپنے لاڈلے پر الزامات برداشت نہیں کر سکے تھے۔

"میں صرف وہ بات کر رہی ہوں جو ڈی ایس پی نے کہی ہے۔" اماں نے ایک بار پھر بحث میں الجھنے سے بچنے کی غرض سے کہا اور ابا خاموش ہو گئے تھے "ڈی ایس پی کا یہ بھی کہنا ہے کہ کاشف کے پاس سے تاوان کی رقم برآمد ہوئی ہے۔ وہ رقم کا تھیلا لے کر بھاگ رہا تھا جب پولیس پارٹی نے اسے گرفتار کیا۔ فائرنگ کے اور جوابی فائرنگ کے دوران ایک پولیس والا مارا گیا جبکہ ایک ساتھی ان کا بھی مارا گیا۔" اماں نے ایک بار پھر ابا کو معاملات کی سنجیدگی سے آگاہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ تو ان حالات میں بھی بیٹے کی حمایت پر کمربستہ تھے۔

"مگر کاشف تو کچھ اور کہتا ہے۔" ابا نے ایک بار پھر بیٹے کے جرم کی جانب سے آنکھیں موندنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اتنا سب کچھ ہو جانے کے باوجود تم آج بھی اس بیٹے کی حمایت کر رہے ہو جس نے ہمیں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔" آخر کار ضبط کا دامن اماں کے ہاتھوں سے چھوٹ ہی گیا "کل جب میں کہتی تھی کہ شاکر اس سے پوچھو، اس کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آتے ہیں تو تم ہنس کر ٹال دیتے تھے اور کبھی کوئی سوال کیا بھی تو اس طرح کہ اس کے جھوٹ کو بھی سچ تسلیم کر لیا مگر آج جب حقائق کھل کر سامنے آگئے ہیں تب تو اعتراف کر لو کہ تم غلطی پر تھے۔"

"تو کیا مرجانے دوں اسے؟" ابا، اماں کی تلخ کلامی سے چڑ سے گئے تھے۔ "اپنے ہاتھوں سے جا کر پھانسی کا پھندہ ڈال آؤں اس کے گلے میں کہ بیٹا، تیری ماں چونکہ تجھے قاتل سمجھتی ہے اس لیے پھانسی چڑھ جا۔" مردوں کے صدیوں پرانے آزمودہ نسخے کے مطابق ابا نے آواز بلند کرتے ہوئے اظہار ناراضگی کرتے ہوئے کہا۔

"زور سے بولو گے تو لڑکیاں اٹھ جائیں گی اور پھر ہم کوئی بات نہیں کر سکیں گے۔" اماں نے ابا کو یاد دلاتے ہوئے کہا اور نائلہ سوچنے لگی کہ ایسی کون سی گفتگو ہو سکتی ہے جس کے لیے اماں اتنی پراسراریت پھیلا رہی ہیں۔

"تم بات ہی ایسی کرتی ہو۔" ابا نے کسی قدر نرم پڑتے ہوئے کہا مگر اب بھی اپنی ٹانگ اوپر ہی رکھنی چاہی۔

"تو کیا شارق صرف تمہارا ہی بیٹا ہے' میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں؟" اماں نے تڑپ کر سوال کیا تھا مگر ابا نے کوئی جواب نہیں دیا "میں نہیں چاہتی تھی کہ شارق راہ سے بھٹک جائے مگر تم نے جائز و ناجائز اس طرح اس کی حمایت کی کہ وہ بگڑتا چلا گیا اور نوبت آج یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ بیٹھے ہوئے میرے کانوں میں سیسہ اتارتے رہے اور میں سننے پر مجبور تھی۔" بولتے بولتے اماں کی آواز رندھ گئی تھی۔

"کیا کہتے ہیں؟" کچھ دیر بعد ابا نے سوال کیا۔

"وہ کہتے ہیں کہ اگر اپنے بیٹے کو پھانسی سے بچانا چاہتی ہو تو چار دن کے اندر اندر چار لاکھ کا بندوبست کر دو..... ورنہ....." اماں اپنا فقرہ مکمل کرتے ہوئے خود پر قابو نہ رکھ سکی تھیں اور نائلہ نے آخری حصے میں ہچکی کی آواز صاف سنی تھی۔

اماں تو بڑی حوصلہ مند خاتون ہیں۔ یہ اچانک ان پر آنسو بہانے کا دورہ کیسے پڑ گیا!' نائلہ نے اپنی جگہ لیٹے لیٹے سوچا۔

"چار لاکھ....." ابا کی بوکھلائی ہوئی آواز آئی "چار لاکھ تو بہت بڑی رقم ہے۔" ان کے لہجے میں تشویش تھی۔

"ہمارے اور تمہارے لیے ہے' ان کے لیے نہیں ہے۔" اماں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"اتنی بڑی رقم کا بندوبست ہم کیسے کر سکتے ہیں؟" ابا کی پُرتشویش آواز آئی۔

"ہم تو چار ہزار کا بندوبست نہیں کر سکتے' چار لاکھ کا کیسے کریں گے۔" اماں نے ابا کی تصحیح کرتے ہوئے کہا تھا۔

چار ہزار بھی اماں نے تکلفاً کہہ دیا ورنہ ہمارے پاس تو چار سو روپے بھی نہیں ہیں' نائلہ نے سوچا۔ بچپن سے لے کر اب تک سرمائے کی اسی کمی کی وجہ سے اس نے اپنی دنیا بند آنکھوں کے پیچھے آباد کرلی تھی جہاں وہ دو کمروں کے اس چھوٹے سے گھر کے بجائے ایک وسیع و عریض مکان میں رہتی تھی جہاں ٹھنڈے پانی کے لیے قطرہ قطرہ ٹپکنے والے کولر کی جگہ فریج موجود تھا۔ دبیز صوفے' کلر ٹی وی اور وی سی آر سمیت پُرتعیش زندگی گزارنے کے لیے وہ کون سی آسائش تھی جو خوابوں کے اس جزیرے میں موجود نہیں تھی مگر وہ جب بھی آنکھیں کھولتی' حقیقت کی کڑی دھوپ سے اس کے تمام خواب جل اٹھتے۔ یہاں تک کہ اس کے تصور میں آباد شہزادے کی جگہ اس کے ماموں کا بیٹا اظہر اپنے گہرے سانولے رنگ اور گورنمنٹ آفس میں کلرکی کے ساتھ اس کے منگیتر کے روپ میں موجود ہوتا۔

"شارق کے ساتھ جو لڑکے گرفتار ہوئے ہیں ان کے والدین کیا کہتے ہیں؟" کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد ابا کی آواز آئی۔

"وہ تو بات کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔" اماں نے جواب دیا تھا "اور ان کا تو کہنا یہ ہے کہ تمہارے بیٹے کی وجہ سے ہم پر بھی مصیبت آئی ہے۔"

"اب کیا کریں؟" ابا کی آواز رُندھ چکی تھی۔ انھیں اپنے لاڈلے کے گلے میں پڑا ہوا پھندہ صاف نظر آرہا تھا۔ جواب میں اماں کی کوئی آواز نہیں آئی' شاید وہ بھی کوئی راہ تلاش کر رہی تھیں۔

"ڈی ایس پی نے ایک بہت ہی بے ہودہ بات کہی تھی کہ....." اماں نے سرگوشی کے انداز میں ابا سے بات کی تھی مگر ان کی آواز نائلہ کے کانوں تک پہنچ ہی گئی تھی۔

"اس کی نیت اپنی نائلہ....." اماں اس سے آگے نہ کہہ سکیں۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" ابا تڑپ کر بولے تھے "نائلہ اس کی بیٹیوں سے بھی چھوٹی ہوگی۔"

"تو وہ کون سا شادی کے لیے کہہ رہا ہے۔" اماں نے بڑی مشکلوں سے کہا تھا۔

"میں اس حرام زادے کا خون پی جاؤں گا۔" ابا جوش میں چلائے تھے مگر پھر اپنے الفاظ کے کھوکھلے ہونے کا انھیں خود ہی احساس ہوا تو وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکے۔

"شارق! یہ تو نے ہمیں کن مشکلوں میں ڈال دیا ہے!" بہت دیر بعد ابا کی بھرّائی ہوئی آواز آئی۔

"اس نے دو روز کا وقت دیا ہے۔" اماں نے کچھ دیر بعد کہا۔

"تم خود ہی بتاؤ حمیدہ! یہ کس طرح ممکن ہے؟" ابا کسی بے دست و پا فرد کی طرح سے بول رہے تھے "بیٹے کو بچانے کے لیے بنی سے کہہ دوں کہ..... نہیں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔"

اماں نے ڈی ایس پی کا مطالبہ بتایا تو نائلہ کو پولیس کے چھاپے کے دوران اس کا رویّہ یاد آنے لگا۔ شارق اس روز بھی دوستوں کے ساتھ کامن اسٹڈی کرنے کے بہانے گھر سے غائب تھا اور نائلہ امتحان کی تیاریوں میں مصروف تھی جب اس نے گھر کے باہر گاڑیاں رکنے کی آواز سنی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے گھر میں ہر جانب وردی والے نظر آنے لگے تھے۔

"اوہو..... تم نے تو گُدڑی میں لعل چھپایا ہوا ہے۔" ڈی ایس پی نے نائلہ پر پہلی نظر ڈالتے ہی کہا تھا۔ شارق ان کے پیچھے ہتھکڑیوں میں موجود تھا۔ ان پانچوں کو پولیس والوں نے دالان میں جمع کرلیا تھا اور خود گھر کی ہر چیز کو اوپر نیچے کرنے میں مصروف تھے۔

"کیوں گرفتار کیا ہے آپ نے اسے؟" ابا نے ڈرتے ڈرتے ہمت کی تھی۔

"اغوا' تاوان' قتل اور ڈکیتی کے الزام میں" ڈی ایس پی کے ساتھ آئے ہوئے ایک شخص نے بڑے بڑے جرائم کی فہرست گنوائی۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ شارق ایسا نہیں ہے۔" ابا ملتجیانہ لہجے میں بولے تھے۔

"غلط فہمی!" اس شخص کے کچھ کہنے سے پہلے ڈی ایس پی بول

پڑا تھا۔

"آپ کا بیٹا رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔" اس نے شارق پر حقارت سے ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا تھا "جس وقت پولیس نے اسے گرفتار کیا' اس وقت رقم کا تھیلا اس کے ہاتھ میں تھا اور جس گھر سے یہ بھاگا تھا وہاں اس کی کتابیں بھی موجود تھیں اور یہ وہی مکان تھا جس میں اغوا کیے جانے والے شخص کو رکھا گیا تھا۔"

جس لہجے میں ڈی ایس پی نے گفتگو کی تھی اس سے نائلہ سمیت تمام گھر والوں کے پیروں تلے زمین سرک گئی تھی۔

"یہ میں کیا سن رہی ہوں شارق؟" اماں نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

"اماں! خدا کی قسم میں نے اس سیٹھ کو اغوا نہیں کیا تھا اور نہ ہی میں نے پولیس والوں پر فائرنگ کی تھی۔" سوجے ہوئے چہرے کے ساتھ زرد پڑتے ہوئے شارق نے بمشکل کہا تھا "میں تو وہیں گھر میں موجود تھا جب محمود اور نسیم اندر داخل ہوئے تھے اور انہوں نے بیگ میرے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا تھا کہ فوراً پچھلے دروازے سے بھاگ جاؤ۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا اور میں نکل بھاگا مگر پولیس کی گاڑی وہاں بھی پہنچ چکی تھی اور تھوڑی ہی دور تک انہوں نے میرا پیچھا کر کے مجھے گرفتار کرلیا۔" شارق اتنا کہہ کر رونے لگا تھا۔

پولیس والے اس دوران اس چھوٹے سے مکان کی ایک ایک چیز کو کھنگال چکے تھے مگر انہیں شاید وہ سب کچھ نہیں مل سکا تھا جس کی انہیں تلاش تھی۔

"تم بھی اپنے بھائی کے جرائم میں شریک ہو؟" جاتے جاتے ڈی ایس پی نے نائلہ کے سامنے رک کر کہا تھا۔

"میں.... میں... نہیں تو۔" نائلہ کی سمجھ میں اس کے علاوہ کوئی جواب نہیں آسکا تھا اور وہ حیرت سے اپنے ماں باپ کو دیکھ رہی تھی۔

"ویسے تم ایسی چیز ہو کہ بڑے سے بڑا جرم کرلو تب بھی میں تمہیں صاف بچالوں گا۔" ڈی ایس پی نے آہستگی سے کہا تھا اور نائلہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ قانون کے محافظ کی اس بے ہودگی کا کیا جواب دے۔

نائلہ اپنے ہی خیالوں میں اس طرح کھو گئی تھی کہ اسے ابا اور اماں کی سرگوشیوں پر مزید دھیان دینے کا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ وہ بار بار ایک فیصلے تک پہنچتی مگر پھر خود... اپنے ہی کیے گئے فیصلے کو رد کر دیتی۔ جب وہ ڈی ایس پی کا مطالبہ تسلیم کرلینے کے بارے میں غور کرتی تو یوں محسوس ہونے لگتا کہ وہ پھانسی کا پھندہ اس نے اپنے گلے میں ڈال لیا ہو مگر انکار کی صورت میں یہی پھندہ شارق کے گلے میں ڈلتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اس کے ایک طرف کھڈ اور دوسری جانب کھائی تھی اور ان دونوں میں سے کسی ایک سے مفر نہیں تھا۔ آخر کار وہ ایک فیصلے پر پہنچ ہی گئی۔

"جہاں تاریخ میں لاکھوں بہنوں نے اپنے بھائیوں پر خود کو قربان کر دیا ہے۔" میں نے بھی اگر خود کو اپنے بھائی کے لیے قربان کر دیا تو کون سی بڑی بات ہوگی۔ اس نے اپنی محدود سوچ کے مطابق سوچا تھا "شارق کے رہا ہونے کے بعد میں خودکشی کرلوں گی تاکہ...." اس کے بعد وہ سوچتی چلی گئی تھی۔

یہ اسی فیصلے کو پایۂ تکمیل پہنچانے کا عمل تھا کہ اگلے ہی روز وہ ڈی ایس پی ریاض حیدر کے دفتر میں نظر آرہی تھی۔ لوگوں کی موجودگی میں ریاض حیدر نے اس سے کچھ کہے بغیر صرف بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا مگر نائلہ سے اس کی آنکھوں میں پیدا ہونے والی شیطانی چمک محفوظ نہیں رہ سکی تھی۔

نائلہ اپنے روزانہ کے معمول کے مطابق گھر سے کالج جانے کے لیے نکلی تھی مگر کالج جانے کے بجائے وہ یہاں پہنچ گئی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ریاض حیدر کس وقت آتا ہے اس لیے وہ گھر سے سیدھی یہیں پہنچی تھی مگر جب وہاں موجود چپراسی نے بتایا کہ "صاحب تو دس بجے سے پہلے آج تک نہیں آئے۔" تو اس کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ اب وہ ڈھائی گھنٹے کہاں گزارے۔ واپسی اس لیے ممکن نہیں تھی کہ اماں پہلے ہی کہہ چکی تھیں کہ اگر ضروری نہ ہو تو آج کالج نہ جاؤ۔ مگر وہ ضد کر کے آئی تھی۔ کالج جانا اس لیے ممکن نہیں رہا تھا کہ کالج کے ٹائم ٹیبل کے مطابق وہ پہلے ہی لیٹ تھی۔ وہیں دفتر میں بیٹھ کر انتظار کرنا اسے کچھ اچھا محسوس نہیں ہوا تھا اس لیے وہ وہاں سے اٹھ کر قریبی پارک میں جا بیٹھی تھی۔

پارک میں صبح کے وقت رونق نہیں تھی مگر کالج کے یونیفارم میں ایک تنہا لڑکی کو دیکھ کر آس پاس کچھ بھنورے منڈلانے ہی لگے تھے۔ انہی میں ایک نوجوان کچھ زیادہ باہمت تھا۔ وہ نائلہ کے ساتھ ہی آکر بیٹھ گیا۔

"انتظار کررہی ہو کسی کا؟" اس نے خوف سے زرد ہوتی نائلہ سے سوال کیا۔

"تمہیں اس سے کیا؟" نائلہ نے بڑی ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"اگر وہ نہیں آیا تو کیا ہوا' ہم تو حاضر ہیں۔" نوجوان نے ایک اوباش سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"دیکھو میں پہلے ہی پریشان ہوں' خدا کے لیے مجھے اور پریشان نہ کرو۔" نوجوان کی ڈھٹائی سے نائلہ رونے کے قریب تھی۔

"کیا شادی کا وعدہ کر کے مکر گیا ہے؟" نوجوان نے ایک بار پھر اپنی ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"کون؟" نائلہ کی سمجھ میں اس کا سوال نہیں آسکا تھا۔

"وہی جس کے انتظار میں تم یہاں بیٹھی ہو اور وہ ہے کہ اتنی خوب صورت لونڈیا کو انتظار کرتا ہوا چھوڑ کر ابھی تک نہیں آیا۔" اس سے زیادہ سننے کی ہمت نائلہ میں نہیں تھی' اس لیے بغیر مزید

کچھ کہے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ایسے ہی کہاں چل دیں میری بلبل۔" نائلہ کے خوف زدہ چہرے نے ڈھیٹ نوجوان کے حوصلے مزید بڑھا دیے تھے۔ وہ اس فقرے کے باوجود آگے بڑھنا چاہتی تھی کہ اچانک اس نوجوان نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"بیٹھ کر دو چار باتیں تو کرلو میری جان۔" اس نے کھینچ کر نائلہ کو دوبارہ بٹھاتے ہوئے کہا۔

"میرا ہاتھ چھوڑ دو ورنہ میں ابھی شور مچا دوں گی۔" نائلہ نے ہاتھ چھڑانے کی پہلی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد کہا تھا۔

"مچا کر دیکھ لے شور بھی۔" نوجوان نے سینہ پھلاتے ہوئے کہا "اگر کسی مائی کے لعل میں ہمت ہوگی تو آ کر تیرا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھڑوالے گا۔"

نائلہ کی سمجھ میں اور کچھ نہیں آیا تو دوبارہ وہیں بیٹھ گئی۔

"میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں، مجھے تنگ نہ کرو۔" آنسو امنڈ کر بہنے کے لیے بے تاب تھے مگر اس کے باوجود نائلہ نے بڑی مشکلوں سے خود پر قابو پایا ہوا تھا۔

"چل نہیں کرتے تنگ مگر تو بھی اپنا دل خوش کر دے۔" نوجوان نے نہایت بے ہودگی سے ایک آنکھ دباتے ہوئے کہا۔ نائلہ پارک میں آنے کی اپنی غلطی پر پچھتا رہی تھی مگر اب تو غلطی ہو چکی تھی۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ اس نوجوان سے کس طرح پیچھا چھڑائے کیونکہ اتنا تو وہ دیکھ ہی چکی تھی کہ آس پاس موجود افراد اس نوجوان کی موجودگی میں قریب نہیں آ رہے تھے۔

"کیا سوچ رہی ہے چھمک چھلو!" اس نے ایک بار پھر اپنی حرکت دُہرائی تھی۔ نائلہ ابھی جواب دینے کے بارے میں کچھ سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک وہ نوجوان تڑپ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی خباثت اچانک چھا جانے والی بوکھلاہٹ میں دب گئی تھی اور اس کی زبان سے "استاد" کے علاوہ کچھ نہیں نکل سکا تھا۔

نائلہ نے اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے دیکھا تو بڑی بڑی آنکھوں اور کلین شیو والا ایک شخص پارک میں داخل ہو رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی نوجوان کے چہرے پر وہ تاثرات ابھرے تھے جیسے بلی کو دیکھ کر چوہے کے ہوتے ہیں۔

آنے والا شخص چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا انہی کی جانب آ رہا تھا۔ جیسے جیسے وہ قریب آ رہا تھا، نوجوان کی بوکھلاہٹ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

"کیوں بے حرام زادے!" لمبوترے چہرے والے شخص نے قریب آ کر اس بے ہودہ نوجوان کو گالی دیتے ہوئے کہا "اپنی بہن کا ہاتھ بھی تو ایسے ہی پکڑتا ہے۔" بائیں گال پر پرانے زخم کا نشان سجائے ہوئے شخص کے لہجے میں ایسی کوئی بات ضرور تھی کہ کچھ نہ جاننے کے باوجود نائلہ بھی اپنے وجود سے کانپ کر رہ گئی۔

"اب بولتا کیوں نہیں کتے کے بچے!" اس شخص نے غراتے ہوئے کہا۔

"وہ... استاد... میں..." نوجوان کے اوسان کسی طرح قابو میں نہیں آرہے تھے اس لیے وہ صرف گڑبڑا کر رہ گیا۔

"لڑکی کو اکیلے دیکھا تو لگے مردانگی دکھلانے۔" اس نے درندوں والی غراہٹ کے ساتھ کہا اور اسی کے ساتھ اس کا دایاں ہاتھ نوجوان کے گال پر اتنی زور سے پڑا کہ وہ اچھل کر نیچے آگیا۔

نائلہ نے اس شخص کے ہاتھ کو اپنی جگہ سے حرکت کرتے ہوئے دیکھا تھا مگر فوراً ہی طمانچہ لگنے اور نوجوان کو زمین پر گرتے دیکھ کر اس کی سمجھ میں آیا کہ کیا ہوا۔

"چل اٹھ" درندوں کی آواز والے شخص نے زمین پر خون تھوکتے ہوئے نوجوان کو دیکھ کر کہا "دس سیکنڈ میں گیٹ سے باہر نکل جا ورنہ..." فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی نوجوان نے اٹھ کر گیٹ کی جانب ایسے دوڑ لگائی جیسے موت اس کے تعاقب میں ہو۔ پھر جیسے ہی وہ نظروں سے غائب ہوا، وہ شخص نائلہ کی جانب مڑا۔

"اور تم یہاں... اس وقت کیا کر رہی ہو لڑکی؟" اس نے سوال براہِ راست ہی کیا تھا مگر نائلہ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔

"میں... میں... میں تو۔" اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ اس سوال کا کیا جواب دے۔

"کوئی بھی بات کہنے سے پہلے خیال رکھنا کہ مجھے جھوٹ سے نفرت ہے۔" اس نے ایک بار پھر غراتے ہوئے کہا تھا۔

"میں کسی کے پاس آئی تھی۔ وہ نہیں ملا اس لیے یہاں دو گھنٹے گزارنے چلی آئی کیونکہ وہ دو گھنٹے بعد ملے گا۔" نائلہ نے ایک سانس میں جواب دیا تھا۔ ڈی ایس پی کا نام اس نے دانستہ چھپایا تھا کیونکہ اس کے بعد سوال و جواب کا نیا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

"ہوں" اس نے ایک طویل ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔

"وہ سامنے میرا مکان ہے۔" اس شخص نے کچھ دیر نائلہ کو دیکھتے رہنے کے بعد کہا "تم چاہو تو وہاں بیٹھ کر انتظار کا وقت کاٹ سکتی ہو۔"

نائلہ نے ایک لمحے اس کی آفر پر غور کیا اور پھر کتابیں اٹھا کر اس کے پیچھے چل پڑی۔ اس نے سوچا تھا کہ پارک کی جگہ واقعی خطرناک ہے۔ کم از کم اس شخص کے گھر میں، اس کے بیوی بچوں کے درمیان محفوظ تو رہ سکوں گی۔ مزید کوئی گفتگو کیے بغیر وہ گیٹ سے ہوتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے چلتی ڈرائنگ روم میں آگئی۔

"یہاں بیٹھ کر جتنا وقت گزارنا چاہو گزار سکتی ہو۔" یہ کہتے ہوئے وہ شخص بغیر یہ دیکھے کہ نائلہ بیٹھی بھی ہے یا نہیں، اندر گھر کی جانب چلا گیا۔

"عجیب شخص ہے" نائلہ نے سوچا مگر پھر فوراً ہی بیٹھ گئی۔ اسے کون سی وہاں زندگی بسر کرنی تھی، دو گھنٹے ہی تو گزارنے تھے اور پھر ڈی ایس پی آجاتا تو... نائلہ اس کے آگے سوچ نہیں پا رہی تھی۔

وہ ایک فیصلہ کر کے ڈی ایس پی کے دفتر تک پہنچ گئی تھی مگر تنہائی میں ایک بار پھر جب اسے غور کرنے کا موقع ملا تو اسے خود سے کراہیت سی ہونے لگی۔

"میں خود کو فروخت کرنے آئی ہوں۔" اس نے اپنے وجود کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اسے خود اپنے اندر سے بدبو کے بھبکے اٹھتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

"یہ شخص مجھے کوئی شریف زادی سمجھ کر لے آیا ہے۔ اسے کیا معلوم کہ میں آج گھر سے اپنا سودا کرنے نکلی تھی۔" اس نے سوچا۔

"بی بی جی! آپ ناشتا کرنا پسند کریں گی۔" ملازم اسے خیالات کی دنیا سے واپس لے آیا تھا۔

"نہیں بابا! شکریہ" اس نے بوڑھے ملازم کو نرمی سے جواب دیا تھا اور پھر قبل اس کے کہ ملازم کچھ اور کہتا، اس نے وہ سوال کر دیا جو اسے پریشان کر رہا تھا "یہ کون صاحب ہیں؟" اس نے نوکر سے اس کے مالک کے بارے میں سوال کیا۔

"آپ شیر افضل صاحب کو پوچھ رہی ہیں؟" ملازم نے جواب نما سوال کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو ان کا نام شیر افضل تھا جن کے ساتھ میں گھر میں داخل ہوئی تھی؟" نائلہ نے اپنا سوال تقریباً دہرایا تھا۔

"جی بی بی جی" نوکر اس سے پورے ادب کے ساتھ مخاطب تھا "میں اس وقت صاحب کے کمرے میں ناشتا لے کر داخل ہوا تھا؟ جب صاحب اپنے کمرے کی کھڑکی سے جیرے کمینے کی بدمعاشیاں دیکھ رہے تھے۔" نوکر نے اسے پوری صورتِ حال سمجھادی تھی۔

"تمہارے صاحب اب کیا کر رہے ہیں؟" نائلہ نے ایک اور سوال کیا۔

"ناشتا کر رہے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ آپ سے ناشتے کے لیے پوچھ لوں۔" نائلہ کو شیر افضل کی یہ بات اچھی نہیں لگی تھی کہ گھر آئے مہمان کو اس قابل بھی نہ سمجھا جائے کہ اسے اپنے ساتھ ناشتے میں ہی شریک کرلے مگر زبان سے اس نے کچھ نہیں کہا۔

"چائے تو پئیں گی آپ؟" ملازم نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔

"نہیں بابا۔ بس کچھ دیر یہاں رک کر انتظار کروں گی اور پھر چلی جاؤں گی۔" اس نے چائے کے لیے بھی منع کر دیا تھا مگر نوکر تھوڑی دیر بعد لوازمات سے لدی ہوئی ٹرے لے کر پھر آگیا تھا۔

"صاحب کا حکم تھا کہ آپ کو یوں نہ جانے دیا جائے۔" ملازم نے اپنی جانب سے صفائی پیش کرنے والے انداز میں کہا۔

"عجیب شخص ہے یہ بھی۔" نائلہ نے سوچا "خود پردہ کیے بیٹھا ہے اور ملازم کے ذریعے احکامات صادر کر رہا ہے۔"

"تمہارے صاحب گھر میں اکیلے رہتے ہیں؟" آخر کار اس نے وہ سوال کر ہی ڈالا جو بہت دیر سے زبان پر آنے کے لیے مچل رہا تھا۔

"جی" ملازم نے پہلے تو مختصر جواب دیا اور پھر ادھر اُدھر دیکھنے کے بعد بولا "اب تو صاحب اکیلے ہی رہتے ہیں۔"

"اب تو سے کیا مراد ہے؟" نائلہ کو اس کے سرگوشی کرنے والے انداز سے دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔

"پہلے صاحب کے بیوی بچے بھی ان کے ساتھ رہتے تھے۔" اس نے اپنا چہرہ نائلہ کے قریب لاتے ہوئے بالکل اس انداز میں کہا تھا جیسے اسے اس بات کا خطرہ ہو کہ اس کی گفتگو کوئی اور بھی سن سکتا ہے۔

"تو اب کہاں گئے وہ؟" نائلہ نے مزید دلچسپی لیتے ہوئے کہا تھا۔

"علیحدگی ہوگئی۔" بیگم صاحبہ جاتے ہوئے دونوں بچوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئیں تھیں۔" باتونی ملازم بہت عرصے سے گفتگو کو ترسا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

"تو دو بچے تھے تمہارے صاحب کے؟" نائلہ نے یونہی رواداری میں کہہ دیا تھا۔

"خدا ان دونوں کو سلامت رکھے بی بی جی۔ آپ "تھے" تو نہ کہیں۔" ملازم کو نائلہ کے فقرے میں ماضی کا صیغہ پسند نہیں آیا تھا۔

"میرا مطلب تھا کہ اب تو وہ یہاں نہیں رہتے نا۔" نائلہ نے اپنی بات کی وضاحت پیش کرتے ہوئے کہا جسے بوڑھے ملازم نے فوراً قبول بھی کرلیا۔

"یہ تو آپ ٹھیک ہی کہتی ہیں مگر وہ مثل مشہور ہے نا کہ ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں...." ملازم ابھی یہیں تک پہنچا تھا کہ اچانک بہت تیز ایک گھنٹی بجنے کی آواز آئی اور ملازم کو جیسے اچانک کرنٹ لگ گیا ہو "صاحب بلا رہے ہیں۔" اس نے کہا تھا اور اٹھ کر فوراً ہی اندر کی جانب لپکا تھا۔

گفتگو کے دوران کچھ دیر کے لیے نائلہ اپنا دکھ بھی بھول گئی تھی مگر ملازم کے جاتے ہی وہ ایک بار پھر اپنے خیالوں میں ڈوب گئی "نہ جانے وہ کون سی عورتیں ہوتی ہیں جو ان تمام تعیشات کو ترک کرکے چلی جاتی ہیں۔" نائلہ نے یونہی سرسری انداز میں سوچا مگر یہ سوچ زیادہ آگے نہ بڑھ سکی۔ اس کے اپنے مسائل کیا کم تھے کہ وہ دوسروں کے بارے میں سوچتی اور پھر یہ سلسلہ اس وقت تک دراز رہا جب تک گھڑی کی سوئیوں نے دس بجنے کا اعلان نہیں کردیا۔ نائلہ فوراً ہی روانہ ہوجانا چاہتی تھی مگر جانے سے پہلے وہ ایک بار پھر اس شخص سے مل کر اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی لیکن وہ ملازم ایسا گیا تھا کہ پلٹ کر نہیں آیا تھا۔ بیس منٹ مزید انتظار کرنے کے بعد کہیں اس کی صورت نظر آئی تھی۔

"بابا! میں جانا چاہ رہی تھی۔" اس نے ملازم سے کہا۔

"اچھا" ملازم نے فوری جواب دیا۔

"شیر افضل صاحب کا شکریہ ادا کردینا۔" اس نے دبے لفظوں میں شکریہ کے الفاظ ادا کیے تھے۔ یہ کہنے کی ہمت وہ نہ کرسکی تھی کہ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔

"جی اچھا... آئیں گے تو کہہ دوں گا۔"

"تو کیا وہ چلے گئے؟" ملازم کے جواب نے نائلہ کو حیرت زدہ کردیا تھا۔

"انہیں گئے ہوئے تو آدھے گھنٹے سے زیادہ ہوگیا ہے۔" ملازم نے اسے مزید حیرت زدہ کردیا۔

"تو موصوف نے جاتے ہوئے مجھ سے ملنا بھی گوارا نہیں کیا۔" اس نے سوچا مگر اس کی سوچ ایک بار پھر زبان تک آنے سے رہ گئی اور وہ ملازم کو خدا حافظ کہتے ہوئے باہر آگئی۔

شیر افضل کے مکان سے لے کر ڈی ایس پی کے دفتر تک اس کے ذہن میں انہی دو کرداروں کی جنگ رہی تھی۔ ملازم نے پارک والے نوجوان کو جیرے کے نام سے پکارا تھا۔ کس دیدہ دلیری سے اس نے نائلہ کا ہاتھ پکڑا تھا اور کوئی قریب آنے کی ہمت نہیں کرسکا تھا مگر جب شیر افضل پارک میں داخل ہوا تو اس کی گھگھی بندھ گئی تھی۔ نائلہ سوچ رہی تھی کہ ایک جانب یہ بدمعاش شیر افضل تھا جس کی چھت کے نیچے ڈھائی تین گھنٹے گزار آنے کے بعد بھی وہ ہر طرح سے محفوظ تھی اور ایک طرف وہ ڈی ایس پی ریاض حیدر تھا جس کے شر سے وہ اپنے گھر میں بھی محفوظ نہیں تھی۔

ڈی ایس پی کے دفتر کے باہر اس وقفے میں خاصا رش ہوگیا تھا مگر اسے پرچی بھجوانے کے فوراً بعد ہی بلوالیا گیا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ ڈی ایس پی نے اس سے فوری طور پر گفتگو نہیں کی تھی۔

ایک ایک کرکے جب کمرے میں موجود تمام افراد کو اس نے فارغ کردیا تو پھر نائلہ کی جانب متوجہ ہوا مگر اس سے پہلے وہ فون پر اپنے پی اے کو یہ ہدایت کرنا نہیں بھولا تھا کہ اب کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے۔

"تو تمہیں تمہاری ماں نے بھیجا ہے؟" اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"نہیں میں خود آئی ہوں۔" نائلہ نے جواب دیا۔ کتابیں اس کی گود میں رکھی ہوئی تھیں مگر خود کو حوصلہ دینے کے لیے اس نے اپنے دونوں ہاتھ میز کے نیچے بڑی مضبوطی سے ایک دوسرے میں پھنسائے ہوئے تھے۔

"تو تمہاری اپنی ماں سے کوئی بات نہیں ہوئی؟" ڈی ایس پی کے فاتحانہ لہجے میں مایوسی کی ایک جھلک آگئی تھی۔

"میری براہ راست ان سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی مگر...." نائلہ بولتے بولتے رک گئی تھی "مگر میں نے ان کی وہ گفتگو سن لی تھی جو وہ میرے والد سے کررہی تھیں۔"

نائلہ نے پورے حوصلے سے مگر سر جھکائے ہوئے جواب دیا تھا۔ اپنے ہاتھوں کو سختی سے دبانے کی وجہ سے اس کے ناخن ہاتھوں میں گڑے جا رہے تھے مگر نائلہ کو اس کا ہوش بھی نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں سے ایک بھی آنسو نہیں نکل رہا تھا مگر اس کے باوجود وہ رو رہی تھی۔ کسی اور کے کیے ہوئے گناہوں نے اسے ایک ایسے مقام پر پہنچا دیا تھا جہاں وہ اپنا سودا خود کرنے نکلی تھی۔ وہ اپنے خوب صورت وجود کو بیچ کر اپنے بھائی کی زندگی خریدنے آئی تھی۔

وہ سر جھکائے میز کے دوسری جانب بیٹھی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے کبھی مصر کے بازار میں بکنے والی کنیزیں بیٹھتی ہوں گی۔ اور اس جانب بیٹھا ہوس کا پجاری نظروں ہی نظروں میں اسے تول رہا تھا۔

"تو تم اپنے بھائی کی رہائی کے لیے میری بات ماننے کے لیے تیار ہو؟" ڈی ایس پی کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھنے کے بعد بولا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"یہ بات ہوئی نا۔" ڈی ایس پی اپنے تھل تھل کرتے ہوئے جسم اور بڑی سی توند کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ اس کا مقصد صاف ظاہر تھا۔ نائلہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے کانپ گئی تھی۔

"مگر سب سے پہلے شارق رہا ہو کر گھر آئے گا پھر اس کے بعد..." نائلہ کے فقرے نے اس کی پیش قدمی روک دی تھی۔

"اور اس کے بعد تم انکار کر دو تو...." ڈی ایس پی کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ تھی۔

"کیا محافظوں کے روپ میں ایسے لٹیرے بھی ہو سکتے ہیں۔" نائلہ نے سوچا مگر جب وہ بولی تو اس کی زبان سے ایک مختلف فقرہ ادا ہوا "یہی بات تو میں بھی کہہ سکتی ہوں۔"

"بہت چالاک ہو۔" ڈی ایس پی کے قدم رک چکے تھے۔ جواب میں نائلہ کچھ نہیں بولی تھی۔

"ٹھیک ہے، مجھے تمہاری بات منظور ہے۔" ڈی ایس پی کچھ دیر بعد بولا تھا "مگر تم نے کسی قسم کی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

نائلہ کا جی چاہا کہ کہہ دے، تم سے برا تو اب بھی کوئی نہیں ہے۔ عوام، قانون اور حکومت کو وردی پہن کر دھوکا دینے والے سے بڑا کوئی ہو بھی نہیں سکتا۔ مگر وہ خاموش رہی تھی۔

"جس روز تمہارا بھائی گھر پہنچے گا اس کے اگلے روز تم یہیں آجانا۔" ڈی ایس پی نے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے" نائلہ نے آہستگی سے کہا "مگر وہ کب تک رہا ہو جائے گا؟" اس نے سوال کیا۔

"ایک دو دن تو لگ ہی جائیں گے۔" ڈی ایس پی نے جواب دیا۔

"اس دوران اس کی مزید پٹائی تو نہیں کرو گے؟" نائلہ نے کچھ دیر بعد کہا۔

"اب کون اسے ہاتھ لگائے گا!" ڈی ایس پی نے اپنے چہرے کی مکروہ مسکراہٹ کو مزید گہرا کرتے ہوئے کہا "اب تو وہ ہمارے لیے ساری خدائی کے برابر ہو گیا ہے۔" اور اس کے ساتھ ہی اپنے بے ہودہ مذاق پر اس نے خود ہی قہقہہ لگایا۔ نائلہ کا جی چاہا کہ وہ اس کا منہ نوچ لے مگر وہ ایسا نہیں کر سکی۔

"میں اب چلتی ہوں۔" اس نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ اسے اٹھتا دیکھ کر ڈی ایس پی بھی اپنی جگہ سے اٹھ گیا تھا۔

"سودا طے کیا ہے تو کچھ بیعانہ ہی دیتی جاؤ۔" وہ اپنے اندر کی تمام خباثتوں کو ظاہر کرنے پر تلا ہوا تھا۔

"مجبوریوں کے سودوں میں کوئی پیشگی نہیں ہوتی۔" نائلہ اس بار خود کو کچھ کہنے سے روک نہ سکی اور اپنا فقرہ مکمل کرتے ہی بہت تیزی کے ساتھ وہ باہر نکل آئی اور ڈی ایس پی دیکھتا رہ گیا۔

دفتر سے باہر نکلنے اور کچھ دور تک آنے کے بعد نائلہ کو خود پر یقین نہیں آسکا تھا کہ اس نے یہ کارنامہ انجام دے دیا ہے "شارق تو رہا ہو جائے گا مگر میرا کیا ہوگا؟" اس نے سوچا "خود کو اس بے ہودہ شخص کے حوالے کرنے سے تو بہتر ہے کہ شارق کے گھر واپس آتے ہی میں اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی ختم کر لوں اور مرنے سے پہلے تمام باتیں لکھ جاؤں تاکہ بعد میں اس کمینے کی بھی پکڑ ہو سکے۔"

"اے لڑکی..." مخاطب کیے جانے کی آواز کے ساتھ ہی نائلہ نے پلٹ کر دیکھا تو وہی صبح والا شخص اپنی بڑی سی گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اس سے مخاطب تھا۔

"چلو آؤ بیٹھو گاڑی میں، مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور نائلہ بغیر کچھ کہے دوسری جانب سے گھوم کر آئی اور کار میں بیٹھ گئی۔

"تو تم اس ڈی ایس پی ریاض حیدر کا انتظار کر رہی تھیں؟" کار کو دوبارہ آگے بڑھاتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ اس کے لہجے میں غراہٹ اب بھی موجود تھی مگر صبح سے بہت کم۔

"جی" نائلہ نے مختصر جواب دیا تھا۔

"کب سے جانتی ہو اس ریاض حیدر کو؟" اس شخص نے جس کے ملازم نے اس کا نام شیر افضل بتایا تھا، ایک اور سوال کیا۔

"کب سے بھی نہیں۔" نائلہ بولی۔

"کیا مطلب؟" وہ ایک بار پھر غرّایا۔

"مطلب یہ کہ میں اسے جانتی ہی نہیں ہوں۔" حیرت انگیز طور پر نائلہ کو نہ تو اس کے چہرے سے ڈر محسوس ہو رہا تھا اور نہ ہی اس کی آواز اور لہجے سے اس پر کوئی خوف طاری ہوا تھا بلکہ اس کے برعکس وہ اس کی موجودگی میں خود کو بہت محفوظ سمجھ رہی تھی۔

"تو پھر اس کے دفتر میں کیا کرنے گئی تھیں؟" اس نے اپنے گھر کی جانب کار کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔

"اپنے بھائی کی رہائی کے لیے۔" نائلہ نے جھکے سر کے ساتھ آہستگی سے جواب دیا۔

کون ہے تمہارا بھائی؟" چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے ایک اور سوال کیا۔ کار اس وقت تک اس کے مکان کے گیٹ تک آچکی تھی۔ اس نے ہارن دیا کچھ ہی دیر میں گیٹ کھل گیا اور وہ کار اندر لیتا چلا گیا جہاں پہلے ہی سے وہ کار موجود تھی جو صبح بھی یہاں کھڑی تھی۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔" اس نے اپنا سوال دہرائے بغیر کہا۔

"چار روز قبل پولیس نے اسے اغوا' تاوان اور قتل کے کیس میں گرفتار کیا تھا۔"

"کیا نام ہے اس کا؟" نائلہ کے جواب کے ساتھ ہی اس نے ایک اور سوال کیا۔

"شارق"

"شارق علی ولد شاکر علی!"

اس کی زبان سے اپنے بھائی کا نام سنتے ہی نائلہ کے چہرے پر حیرت دوڑ گئی "آپ جانتے ہیں اسے؟" نائلہ نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نائلہ کی ہمت نہیں ہو سکی کہ دوبارہ اپنا سوال دُہرا سکے۔

وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر بولا "کیا تم اتنی ہی بے وقوف ہو جتنی نظر آتی ہو یا اس سے بھی زیادہ ہو؟" سوال اتنا عجیب تھا کہ نائلہ کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا اس لیے خاموش رہی۔

"قتل اور اغوا برائے تاوان کی ایف آئی آر اس ڈی ایس پی کا باپ بھی ختم نہیں کروا سکتا۔" اس کے لہجے کی غراہٹ اچانک بڑھ گئی تھی۔

"تو پھر کون ختم کروا سکتا ہے؟" نائلہ نے کہا۔

"کوئی بھی نہیں کروا سکتا۔" اس نے نائلہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

نائلہ کی سمجھ سے ہر بات بالاتر تھی "مگر وہ تو کہہ رہا تھا کہ....." نائلہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہ بات کہنی چاہی جو ڈی ایس پی نے کہی تھی۔

"اس کے کہنے پر تم خود کو رشوت کے طور پر پیش کرنے چلی آئیں!" اس نے جھڑکنے والے انداز میں کہا اور نائلہ سوچنے لگی کہ اس کی زبان سے ایسی کون سی بات نکلی ہے جس سے یہ شخص معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔

"خود کو اتنا سستا نہ کرو کہ بلا معاوضہ ہی بک جاؤ۔" شیر افضل کے لہجے کی غراہٹ بڑھتی جارہی تھی۔

"شارق کی رہائی کے ساتھ ہی میں خودکشی کرلوں گی۔" نائلہ نے اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا "اور مرنے سے پہلے اس ڈی ایس پی کا کچا چٹھا ایک خط میں لکھ جاؤں گی۔"

"اور اس خط سے پوری دنیا اپنی جگہ سے ہل جائے گی' زلزلے آئیں گے' آندھیاں اور سیلاب اپنا رخ ہمارے ملک کی جانب موڑ لیں گے۔ کیا ہوگا تمہارے اس بے ہودہ خط سے؟"

نائلہ کے پاس کوئی جواب ہوتا تو کچھ بولتی۔ وہ صرف خاموشی سے دیکھتی رہی۔

"دیکھو لڑکی! میں کوئی اچھا آدمی نہیں ہوں۔" اس شخص نے دوبارہ کہنا شروع کیا "مگر اس کے باوجود میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ برائی کے راستے پر پہلا قدم رکھنا جتنا آسان ہوتا ہے وہاں سے واپسی کا سفر اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ تم اس راستے پر سفر کرنا چاہتی ہو تو شوق سے کرو لیکن دو باتوں کا ہمیشہ خیال رکھنا۔ ایک تو یہ کہ اس اندھیری گلی سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے اور دوسری یہ کہ جرم کی دنیا میں کبھی خود کو اتنا سستا نہ کرنا کہ نہ تمہیں بکنے میں مزہ آئے' نہ تمہارے خریدار کو یہ احساس ہو کہ اس نے کچھ خریدا ہے۔"

"شیر افضل صاحب! ہم بہت چھوٹے لوگ ہیں۔" وہ بولتے بولتے خاموش ہوا تو نائلہ نے کہنا شروع کیا "بکنا یا خریدنا دونوں ہماری بساط سے باہر کی باتیں ہیں۔ میں تو صرف اتنا چاہتی ہوں کہ میرا بھائی واپس گھر آجائے' چاہے اس کے لیے مجھے....."

"تم کیا سمجھتی ہو کہ ریاض تمہارا پیچھا چھوڑ دے گا؟" شیر افضل نے اس کی قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

"جب میں زندہ ہی نہیں رہوں گی تو....."

"اونہہ....." اس نے ایک بار پھر اس کی بات درمیان میں سے اچک لی تھی "لڑکی! بزدل خودکشی نہیں کرسکتے۔" اس نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

"میں بزدل نہیں ہوں۔" نائلہ بولی۔

"پہلے ہی مرحلے پر ہتھیار ڈالنے والے کو اور کیا کہتے ہیں؟" اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ "اچھا یہ بتاؤ کیسے خودکشی کرو گی؟" نائلہ کو خاموش دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا "ریل کے سامنے لیٹ جاؤ گی یا نیند کی گولیاں کھانے کے بعد خون تھوک تھوک کر مرو گی۔"

دونوں صورتیں نائلہ کے تصور سے زیادہ ہولناک تھیں۔ تین حصوں میں کٹی ہوئی لاش کا تصور ہی اسے دہلانے کے لیے کافی تھا۔

"اب میری بات غور سے سنو۔ تم پہلے ہی میرا کافی وقت ضائع کروا چکی ہو۔" مسکراتے مسکراتے اس کے چہرے پر ایک بار پھر خشونت آگئی تھی "ڈی ایس پی ریاض حیدر ایسا شخص نہیں ہے کہ اپنے شکنجے میں آئے ہوئے شکار کو آسانی سے رہا کردے۔ اور تمہارے بھائی کے معاملے میں تو اس نے اپنی عمارت ہی جھوٹ پر قائم کی ہے۔"

"آپ شارق کو جانتے ہیں؟" نائلہ نے وہی سوال کیا جو اس سے پہلے بھی کرچکی تھی۔

"اسے نہیں جانتا لیکن اس پورے کیس سے اچھی طرح واقف ہوں۔" شیر افضل نے جواب دیا۔ "تمہارا بھائی اس حد تک تو مجرم ہے کہ وہ بھی ان افراد کا شریکِ کار تھا جنہوں نے اغوا کیا تھا یا پولیس پارٹی پر فائرنگ کی تھی مگر اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں تھی جو گیراج میں "چھوٹوں" کی ہوتی ہے۔ اس کے ذمے صرف اتنا کام تھا کہ وہ رات میں، جب بڑے باپ کے بیٹوں کا گھر جانا ضروری ہوتا تھا، اغوا کیے جانے والے شخص کی نگرانی کرے اور اسی ڈیوٹی پر وہ اس روز بھی تھا جس روز اس کے دوستوں نے رقم کے تھیلے سمیت اسے وہاں سے روانہ کیا تھا اور یوں اسے فرار ہوتے ہوئے پولیس نے گرفتار کیا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے، شارق صحیح کہہ رہا تھا۔" نائلہ بڑبڑائی تھی۔

"اگر وہ یہ کہہ رہا ہے تو صحیح کہہ رہا ہے۔" شیر افضل نے جواب دیا۔

"مگر اب میں کیا کروں؟" نائلہ بولی "میں تو اس سے وعدہ کرچکی ہوں کہ...." اس کا سر یہ کہتے ہوئے بلند نہیں ہوسکا تھا۔

"دیکھو لڑکی، میں نے تمہارے سامنے تمام صورت حال رکھ دی ہے۔" شیر افضل نے پھر سے بولنا شروع کرتے ہوئے کہا "ریاض حیدر اصل ملزمان سے رشوت لے چکا ہے، ساتھ ہی اس نے تاوان کی رقم والا تھیلا بھی غائب کردیا ہے۔ اسے ان تمام لڑکوں کو رہا تو کرنا ہی ہے، اگر اس کے باوجود تم...."

"آپ میری بات کیوں نہیں سمجھتے...." نائلہ کے دل سے شیر افضل کا تمام خوف دور ہوچکا تھا "ہم اتنے چھوٹے لوگ ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ کچھ بھی کرسکتا ہے۔ ایک کیس میں نہ سہی، وہ دوسرے کیس میں ہم پر الزامات عائد کرسکتا ہے۔"

شیر افضل کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔ "تم ایک وعدہ کرو تو میں اس کا بھی انتظام کروادوں گا کہ آئندہ ریاض حیدر تمہیں یا تمہارے گھر والوں کو تنگ نہ کرے۔" نائلہ صرف اس کے مطالبے کا انتظار کرتی رہی۔ آج یوں بھی وہ گھر سے ہر بات کے لیے تیار ہوکر نکلی تھی۔

"اگرچہ مجھے عورت کی زبان اور اس کے وعدے پر اعتماد نہیں ہے لیکن اس کے باوجود میں یہ بات تمہارے ہی فائدے کے لیے کہہ رہا ہوں۔" شیر افضل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

"تمہیں یہ وعدہ کرنا ہوگا کہ آئندہ کبھی تم برائی کے راستے پر قدم بڑھانا چاہو تو پہلے مجھ سے ضرور ملوگی۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں۔" نائلہ نے فوری طور پر جواب دیا تھا۔

"اتنی جلدی وعدہ نہ کرو لڑکی۔" شیر افضل نے غراتے ہوئے کہا۔ "جلدی کے وعدے صرف توڑ دینے کے لیے کیے جاتے ہیں۔"

"میں پوری طرح سوچ سمجھ کر یہ بات کہہ رہی ہوں۔" نائلہ نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"تم سوچو گی کیا، تم تو یہ بھی نہیں سمجھ پارہی ہو کہ میں کہنا کیا چاہ رہا ہوں۔"

"میں تمہاری بات پوری طرح سمجھ رہی ہوں۔" نائلہ نے برابری کی سطح پر آتے ہوئے کہا "تم یہی کہنا چاہ رہے ہو نا کہ آئندہ اگر کوئی ریاض حیدر آجائے تو میں اس کے پاس جانے کے بجائے تمہارے پاس آجاؤں؟" نائلہ نے اپنے پورے حوصلے کو کام میں لاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" شیر افضل اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا "اچھا آدمی تو میں بھی نہیں ہوں اور خریدنے سے زیادہ چھیننے کا قائل ہوں مگر اس معاملے میں نہیں۔" اس بار اس کا چہرہ نائلہ کی جانب نہیں تھا مگر وہ گفتگو کرتا رہا تھا۔

"کیا اب میں جاؤں؟" اس کے خاموش ہونے کے بعد نائلہ نے سوال کیا۔

"تمہاری مرضی۔" شیر افضل نے کہا اور نائلہ اپنی کتابیں اٹھا کر باہر آگئی۔

○☆○

"کہاں سے آرہی ہو؟" وہ گھر پہنچی تو اماں نے سوال کیا۔ وہ کالج سے واپسی کے وقت سے پہلے ہی گھر لوٹ آئی تھی، اس لیے اماں کے اس سوال سے خاصا تعجب ہوا تھا۔

"کیوں... یہ سوال کس لیے کیا آپ نے؟" اس نے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا ان سے سوال کرلیا تھا۔

"ڈی ایس پی کے دفتر کیوں گئی تھی....؟" نائلہ اس سوال کے لیے تیار نہیں تھی مگر ان کے تیوروں نے اسے یہ بات اچھی طرح سمجھادی تھی کہ اس معاملے میں اس کا کوئی بھی جھوٹ نہیں چل سکے گا۔

"میں نے سوچا تھا، اس سے پہلے کہ آپ مجھ سے جانے کے لیے کہیں، میں خود ہی چلی جاتی ہوں۔ اس طرح آپ کا بھرم بھی قائم رہے گا اور...."

"بکواس کرتی چلی جائے گی!" اماں غم وغصے سے زیادہ اپنی بے بسی پر چلّائی تھیں اور اس کے ساتھ ہی ان کا ہاتھ بھی بلند ہوگیا تھا مگر نائلہ اب وہ نائلہ نہیں رہی تھی جو صبح گھر سے نکلی تھی۔

"مجھے مارنے سے پہلے آپ یہ نہیں معلوم کریں گی کہ میں کیا گل کھلا کر آئی ہوں؟"

اماں پہلی بار اپنا ہاتھ پکڑے جانے پر ششدر اسے دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے شاید اس کا فقرہ سنا ہی نہیں تھا۔ وہ تھوڑی دیر اسے دیکھتی رہیں اور پھر اچانک انہوں نے رونا شروع کردیا۔

○☆○

فون کی تیز گھنٹی اسے ماضی سے کھینچ کر حال میں لے آئی تھی۔

"کتنا فرق آگیا ہے اس دو کمروں کے مکان اور اس شیشے کے آراستہ بیڈ روم میں۔" اس نے اپنے ماضی اور حال کا تقابل کرتے ہوئے سوچا تھا مگر یہ سوچ اس سے آگے نہ بڑھ سکی تھی۔ فون کی گھنٹی ایک بار پھر بجنے لگی تھی۔

"ہیلو" نائلہ نے ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا۔

"نائلہ میں ہوں" دوسری جانب سے سہیل کی جانی پہچانی آواز آئی۔

"تمہارے علاوہ اس وقت مجھے اور کون فون کر سکتا ہے۔" نائلہ نے کہا۔ سہیل اس کی زندگی میں داخل ہونے والا وہ پہلا شخص تھا جس کے لیے نائلہ کا دل دھڑکا تھا ورنہ اب سے پہلے تو جو بھی آیا تھا اس نے نائلہ سے سودا ہی کیا تھا۔

"میں کوئی اور نہیں ہوں نائلہ۔" سہیل نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"تم کوئی اور نہیں ہو اسی لیے تو اس وقت فون بھی کر سکتے ہو۔" نائلہ نے جواب دیا۔

"اگر میں کوئی اور نہیں ہوں تو پھر تم میری بات کیوں نہیں مان لیتیں؟" سہیل نے اپنی وہی بات دُہرائی تھی جو وہ گزشتہ تین ماہ سے کہہ رہا تھا۔ چھ ماہ قبل سہیل سے نائلہ کی ملاقات اس کے ایک پروڈیوسر نے یہ کہہ کر کروائی تھی کہ "یہ میرا بھتیجا ہے... امریکا سے آیا ہے اور آپ کا فین ہے۔" نائلہ اس سے اسی طرح ملی تھی جس طرح وہ اس طرح کے لوگوں سے ملتی تھی۔ ایک مخصوص کاروباری مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے "شکریہ" کہنا اور پھر تھوڑا سا مزید مسکرا دینا۔

"امریکا آپ تعلیم کے سلسلے میں گئے تھے؟" نائلہ نے یہ فقرہ بھی اس لیے ادا کیا تھا کہ اسے ملوانے والا بہرحال ایک بڑا پروڈیوسر تھا جس کی فلموں میں نائلہ کو آئندہ بھی کام کرنا تھا۔

"میری پیدائش ہی امریکا کی ہے۔" اس نے شرمیلے شرمیلے لہجے میں جواب دیا اور نائلہ کو اس کا یہ انداز بہت اچھا لگا تھا۔ گہرے میک اپ اور تیز روشنیوں کی جو دنیا اب نائلہ کا مسکن بن چکی تھی، اس میں اس طرح کے لوگوں کا گزر کچھ کم کم ہی ہوتا تھا ورنہ بیشتر تو وہی تھے جو آنکھوں میں ہوس لیے سودا کرنے آتے تھے۔

"اس کے باوجود آپ کی اردو بہت اچھی ہے۔" نائلہ کہنا تو یہ چاہتی تھی کہ کسی لڑکی سے اس طرح شرما شرما کر گفتگو کرنے سے لگتا تو یوں ہے جیسے امریکا سے نہیں بلکہ بھائی پھیرو سے آرہے ہو مگر پھر کچھ سوچ کر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔

"مس نائلہ!" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ نوجوان دوبارہ بولا اور نائلہ پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہوگئی "اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو کیا آج رات کا کھانا آپ میرے ساتھ کھا سکتی ہیں؟"

اس نے رکے رکے لہجے میں اپنا ما فی الضمیر اس سے بیان کر دیا تھا۔

اس طرح کی دعوتیں نائلہ کو ہر روز ہی ملتی تھیں لیکن ان میں سے بیشتر کو نائلہ خوش اسلوبی سے ٹال جاتی تھی لیکن سہیل کی آفر کو وہ چاہنے کے باوجود مسترد نہ کر سکی۔ اسے یہ دعوت کسی قدر مختلف محسوس ہوئی تھی۔ ایک عرصے بعد ایسا ہوا تھا کہ مدعو کرنے والے کے چہرے پر نہ ہوس کی پرچھائیں تھیں اور نہ ہی اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک تھی۔

"کہاں کھو گئی ہو تم؟" سہیل کی آواز ایک بار پھر ریسیور سے آئی تو وہ پھر سے حقیقت کی دنیا میں لوٹ آئی۔

"سہیل! مجھے ایسے خواب مت دکھاؤ جن کی تعبیر نہ ہو۔" اس نے اپنی وہی بات دُہرائی جو اس سے قبل متعدد بار اس سے کہہ چکی تھی۔

"میں تمہیں خواب نہیں دکھا رہا ہوں نائلہ...." سہیل کی آواز میں کرب تھا۔ "میں تم سے وہ کہہ رہا ہوں جو حقیقت ہے۔"

"حقیقت یہ بھی ہے سہیل کہ میں نہ تو تمہارے قابل ہوں اور نہ ہی یہ سب کچھ چھوڑ کر تمہارے ساتھ جا سکتی ہوں... کیوں؟ یہ بات میں تمہیں پہلے بھی سمجھا چکی ہوں۔" نائلہ نے اپنے وجود میں پھیلتے ہوئے دکھ کو اس ایک فقرے میں سمیٹتے ہوئے کہا۔

"تم شیر افضل کو خدا کیوں سمجھنے لگی ہو؟" سہیل بھی کسی اڑیل بچے کی طرح اپنی ضد پر قائم تھا "زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔"

"میں اسے خدا نہیں سمجھتی مگر...."

"تو پھر تم اس سے اس قدر خائف کیوں ہو؟" سہیل نے اس کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے درمیان سے اچکتے ہوئے کہا۔ ایک بار ہم یہاں سے نکل گئے تو تمہارا یہ شیر افضل ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔" سہیل بول رہا تھا اور نائلہ دل ہی دل میں ہنس رہی تھی "امریکا میں قانون اتنا سخت ہے کہ یہاں تم لوگ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہاں ہم اپنے پالتو جانوروں کو بھی نہیں مار سکتے۔ پھر میں اور تم تو جیتے جاگتے انسان ہیں۔"

"سہیل! میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ شیر افضل حقیقت میں کون ہے اور اس کی رابطے کتنے دراز ہیں۔" نائلہ نے ایک بار پھر ناصحانہ انداز اپناتے ہوئے کہا۔

"مگر اس کی تمام تر طاقت بس یہاں تک محدود ہے۔" سہیل ایک بار پھر بولا تھا۔

"اور یہی تمہاری سب سے بڑی بھول ہے۔" نائلہ نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا۔

"آٹھ سال پہلے جب میں اس دلدل میں پہلی بار اتری تھی، اس وقت یقیناً وہ اتنا طاقتور نہیں تھا مگر آج وہ کتنا طاقتور ہے تم اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔" نائلہ نے یہ جاننے کے باوجود کہ اس

بار بھی اس کے الفاظ رائیگاں جائیں گے" سیل کو سمجھانے کی ایک اور کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اس کی طاقت کی انتہا یہی تو ہوگی نا کہ وہ مجھے جان سے مار دے گا۔ تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔"

ان چند مہینوں میں نائلہ کو اچھی طرح اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ سیل کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو اگر کسی بات پر ڈٹ جائیں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت انہیں ان کے مؤقف سے ہٹا نہیں سکتی "مگر میں تو ایسا بھی نہیں کر سکتی سیل۔" نائلہ اسے ہر ممکنہ طریقے سے باز رکھنے کی کوشش کرتی رہی تھی اور اس وقت بھی اپنی انہی کوششوں میں مصروف تھی۔

دروازے پر دستک سنائی دی تو اس نے سیل کو خدا حافظ کہنا چاہا۔ "دروازے پر کوئی ہے سیل اور اس وقت شیر افضل کے علاوہ مجھے بیدار کرنے کی ہمت کوئی نہیں کر سکتا۔ اس لیے خدا حافظ۔"

"میری بات تو سنو۔۔۔" سیل نے اسے روکنا چاہا مگر اس نے دوبارہ "خدا حافظ" کہتے ہوئے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

دستک ایک بار پھر ہوئی اور اس نے اٹھ کر نائٹ گاؤن پہننا شروع کر دیا۔ ریسیور دوبارہ اٹھا کر اس نے چیک کیا' لائن کٹ چکی تھی۔ نائلہ نے یہ سوچ کر کہ کہیں پاگل سیل دوبارہ نہ ڈائل کر دے' ریسیور کو کریڈل سے ہٹا کر رکھ دیا۔

"کیا بات ہے؟" نائلہ نے اپنے سامنے ملازمہ کو دیکھ کر کہا۔

"نیچے والے فون پر صاحب کی کال ہے۔" ملازمہ نے ادب کے ساتھ جواب دیا مگر یہ بات نائلہ سے چھپی نہ رہ سکی کہ ملازمہ نے اس کی پشت پر سے ریسیور کو کریڈل سے ہٹے دیکھ لیا تھا۔

"اچھا" نائلہ نے جواب دیا۔ اس کے علاوہ وہ کچھ کہنے کی پوزیشن میں تھی بھی نہیں۔ یہ بات اس سے ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ بظاہر جو اس کے ملازم ہیں وہ دراصل اس پر متعین کیے گئے مخبر ہیں۔ شیر افضل نے اسے ہر طرح کی آزادی بھی دی ہوئی تھی مگر اس کے پر بھی کاٹ رکھے تھے۔ وہ ایک مخصوص دائرے کے اندر جتنا چاہے گھوم لیتی لیکن اس سے آگے جانے کی اسے اجازت نہیں تھی۔

"نائلہ بول رہی ہوں۔" اس نے ریسیور اپنے کانوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

"سوری تمہیں ڈسٹرب کیا۔" دوسری جانب سے شیر افضل کی غراتی ہوئی آواز آئی۔ اپنی تمام تر کمینگیوں اور خباثتوں کے باوجود شیر افضل نے آج تک اس کے ساتھ کبھی غیر شریفانہ لہجہ نہیں اپنایا تھا۔

"اب تو کر ہی دیا اس لیے سوری کہنے سے بات ختم نہیں ہو جائے گی۔" نائلہ نے اس طرح کہا جیسے وہ اس کی بات پر ناراض نہ ہو۔

"تمہارے بیڈ روم کا فون مسلسل انگیج تھا' اس لیے یہاں فون کرنا پڑا۔" شیر افضل نے توجیح پیش کی۔

"ظاہر ہے اسی لیے کیا ہوگا ورنہ تمہیں اس فون کا نمبر معلوم ہے۔" نائلہ نے اس بار بھی اپنے لہجے کو شگفتہ رکھنے کی کوشش کی تھی۔

"حالانکہ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ اپنے اس نمبر کو انگیج مت رکھا کرو۔" شیر افضل غرایا تھا مگر اتنی دیر میں نائلہ جواب تیار کر چکی تھی۔

"رات کوئی صاحب بار بار تنگ کرنے کے لیے فون کر رہے تھے' اس لیے میں نے یہ سوچ کر ریسیور الگ رکھ دیا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر بعد دوبارہ رکھ دوں گی مگر پھر شاید مجھے نیند آگئی اور ریسیور یوں ہی رکھا رہا۔" نائلہ بڑی صفائی سے جھوٹ بول رہی تھی۔ اس کے علم میں یہ بات بھی تھی کہ شیر افضل اس کی بات پر مکمل طور پر یقین نہیں کر رہا ہوگا مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اسے بیدار کرنے والی ملازمہ بھی اس کی بات کی تائید کرے گی۔

"آئندہ اس بات کا خیال رکھنا۔" شیر افضل نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

"کیا ایسا ممکن ہے کہ تم کچھ دیر کے لیے گھر آجاؤ؟" نائلہ نے اس کی ہدایات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں" شیر افضل نے فوری جواب دیا "یوں بھی میں لاہور سے نہیں بلکہ کراچی سے بول رہا ہوں۔" کراچی کے نام کے ساتھ ہی نائلہ کے ذہن میں اس کا ماضی ایک بار پھر تازہ ہوگیا۔

"مجھے بہت ضروری بات کرنی ہے۔" نائلہ نے کہا۔

"وہ بات ٹیلی فون پر بھی ہو سکتی ہے۔" شیر افضل بولا۔

"نہیں" نائلہ نے کہا "یہ بات صرف براہ راست ہی ہو سکتی ہے۔"

"پھر تمہیں میرے لاہور آنے کا انتظار کرنا ہوگا۔" شیر افضل کی آواز ریسیور پر گونجی۔

"اب تو آپ سے ملنے کے لیے مجھے بھی وقت لینا پڑتا ہے۔" نائلہ نے طنزیہ لہجے میں کہا مگر شیر افضل نے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا۔

"میں نے تمہیں اس لیے فون کیا تھا کہ تمہاری والدہ کی طبیعت اچانک پھر بگڑ گئی ہے۔"

"اطلاع دینے کا شکریہ مگر یہ بات تو تم بھی جانتے ہو کہ وہ میری شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں ہیں۔" نائلہ کو اپنے اندر کوئی چیز ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی تھی مگر یہ پہلا موقع نہیں تھا۔

"اطلاع دینا میرا فرض تھا اور اس کے بعد کے فیصلے کرنا تمہارا حق ہے۔" شیر افضل نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس نے ریسیور رکھ دیا۔

جب سے شیر افضل نے سیاست میں براہ راست حصہ لینا

شروع کیا تھا' وہ اس سے ملنے سے گریز کرتا تھا۔ اس نے نائلہ کو اپنے چنگل سے آزاد تو نہیں کیا تھا بلکہ اس کی گرفت نائلہ پر کچھ اور بھی سخت ہو گئی تھی مگر ساتھ ہی وہ کسی بھی اسکینڈل کو منظرِ عام پر لانا نہیں چاہتا تھا۔

لائن کٹ جانے کے بعد بھی وہ کچھ دیر تک ریسیور ہاتھ میں لیے کھڑی رہی "میں نے اپنی زندگی میں صرف ایک ہی فیصلہ کیا تھا جس کا آج تک جرمانہ ادا کر رہی ہوں۔ اب کوئی اور فیصلہ کروں گی تو اس کے لیے دوسری زندگی کہاں سے لاؤں گی!" اس نے شیر افضل کے فقرے کو یاد کرتے ہوئے سوچا اور پھر خاموشی سے ریسیور دوبارہ کریڈل پر رکھ کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب جانے لگی۔

"قدسیہ! میرے کمرے میں چائے بھجوا دو اور کوئی بھی آئے تو اسے منع کر دینا کہ میں آج کسی سے نہیں ملوں گی۔" اس نے ملازمہ کو دیکھ کر کہا تھا۔

"اگر سہیل صاحب آئیں تو..." ملازمہ نے سوال کیا اور آگے بڑھتی ہوئی نائلہ پھٹ پڑی۔

"میں نے کہا تھا' کوئی بھی.... سمجھیں!" نائلہ اسے ڈانٹتے ہوئے بولی۔

"اچھا جی.... سمجھ گئی۔" ملازمہ اس کے تیور دیکھ کر بوکھلا گئی تھی۔

"اس طرح ملازموں پر غصہ اتارنے یا ریت میں سر چھپانے سے طوفان گزر تو نہیں جائے گا۔" اس کے اندر سے آواز آئی۔

"اماں کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہوگی تبھی تو شیر افضل نے مجھے اطلاع دی ہے۔" اس نے سوچا "مگر میں کر بھی کیا سکتی ہوں۔ وہ لوگ تو میری شکل دیکھنے کے بھی روادار نہیں ہیں۔ ان کے لیے میں گالی بن گئی ہوں۔"

نائلہ کو یاد تھا کہ پہلی بار جب اسے اماں کی طبیعت کی خرابی کی اطلاع ملی تھی تو وہ خود کو روک نہیں سکی تھی مگر اماں نے بات کرنا تو درکنار' اس کی جانب دیکھنا تک گوارا نہیں کیا تھا۔

"کیوں آئی ہے تو یہاں؟" یہ شارق تھا جسے پھانسی کے تختے سے اتارنے کے لیے بھی اس نے خود کو داؤ پر لگا دیا تھا۔

"آج میں جو کچھ بھی ہوں اس کا ذمے دار کوئی اور نہیں صرف تم ہو۔" اتنا سنتے ہی شارق یہ سوچے بغیر کہ وہ اسپتال میں ہیں' اسے مارنے کو آگے بڑھا تھا مگر صائمہ اور سلمہ درمیان میں آگئیں اور پھر وہی دونوں اسے کھینچتی ہوئی باہر لے آئی تھیں۔

"باجی! ہم تمہاری وجہ سے وہ محلہ چھوڑ آئے ہیں' اب تو ہمارا پیچھا چھوڑ دو۔" یہ سلمہ تھی' اس کی سب سے چھوٹی بہن۔ اور نائلہ بغیر کچھ کہے سنے واپس آگئی تھی۔

"بی بی جی! چائے...." ملازمہ اسے خیالوں کی دنیا سے واپس لے آئی تھی۔

تین لفافے

ایک نوجوان کسی کمپنی کا منیجر بنا تو اس کے پیش رو نے اسے تین لفافے دیے اور نصیحت کی کہ جب اسے مشکلات کا سامنا ہو تو ایک لفافہ کھول کر اس پر درج ہدایات پر عمل کرے۔ ایک روز منیجر کو محسوس ہوا کہ حالات اچھے نہیں جا رہے۔ اس نے پہلا لفافہ کھولا جس پر لکھا تھا۔ "اپنے پیش رو کو الزام دو" اس نے ایسا ہی کیا اور کچھ عرصے کے لیے حالات ٹھیک ہو گئے۔ جب حالات دوبارہ بگڑے تو اس نے لفافہ نمبر ۲ کھولنے کا فیصلہ کیا جس میں لکھا تھا۔ "اپنے اکاؤنٹنٹ کو الزام دو" اس نے ایسا ہی کیا۔ کچھ دن حالات ٹھیک رہے پھر آمدنی مسلسل گرنے لگی۔ کافی پس و پیش کے بعد اس نے تیسرا لفافہ کھولا۔ اس پر لکھا تھا "تین لفافے تیار کر لو"

"اب اس بات کو بھی سات برس سے زیادہ گزر گئے ہیں۔ اب تو ان کی نفرتیں اور زیادہ مستحکم ہو چکی ہوں گی۔" نائلہ نے ملازمہ کو چائے رکھنے کا اشارہ کرتے ہوئے سوچا تھا۔

وہ اس عذاب کو اس وقت سے جھیل رہی تھی جب سے اس نے شیر افضل کے آگے سرِ تسلیم خم کیا تھا۔ شیر افضل سے اس کی دوسری ملاقات شارق کے گھر آنے کے ایک ہفتے بعد ہوئی تھی۔ شارق کو رہا کرنے کے بعد چوتھے روز ڈی ایس پی ریاض حیدر اس کے گھر آیا تھا۔

"شاکر صاحب! میں نے آپ سے بغیر کوئی مول تول کیے آپ کے بیٹے کو رہا کر دیا تھا۔ اگر آپ پہلے ہی بتا دیتے کہ آپ شیر افضل کے آدمی ہیں تو میں کبھی شارق پر ہاتھ نہ... ڈالتا لیکن اب وہ میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ صرف آپ ہی مجھے ان سے نجات دلوا سکتے ہیں۔" ابا سے اس نے فریاد کرنے والے لہجے میں کہا تھا۔ اس روز جس دن نائلہ ڈی ایس پی کے دفتر گئی تھی اور شیر افضل سے ملی تھی' اسی رات اس نے ابا کو پوری تفصیلات بتا دی تھیں۔ یہ بھی کہ رات اس نے ان دونوں کی گفتگو سن لی تھی اور یہ بھی کہ اس کی شیر افضل نامی شخص سے کس طرح ملاقات ہوئی اور اس نے کیا وعدہ کیا۔ اپنے اور شیر افضل کے درمیان ہونے والے وعدے کو البتہ وہ چھپا گئی تھی۔

"مگر شاید تم یہ نہیں جانتی ہو کہ خود شیر افضل کون ہے؟" ابا نے پوری بات سنجیدگی سے سننے کے بعد کہا تھا۔

"میرے نزدیک وہ ڈی ایس پی جیسے معززین سے بہت بہتر

ہے۔" اس نے ابا کی بات ایک کان سے سنتے ہی دوسرے سے نکال دی تھی۔

"نائلہ! اس کا شمار ان چند آدمیوں میں ہوتا ہے جو اس شہر میں ہونے والے گناہ کے تمام بڑے بڑے کاروبار کے ذمے دار ہیں۔" ابا نے اسے خبردار کرتے ہوئے کہا تھا۔

"یہ بات تو اس نے خود بھی کہی تھی کہ وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔" نائلہ نے ابا کی بات پر کان نہ دھرنے کا گویا فیصلہ کرلیا تھا۔

"وہ جوئے اور سٹے کے اڈے چلاتا ہے۔ شہر میں کئی جگہ اس کے نام پر شراب بیچی جاتی ہے۔ بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ معقول رقم کے عوض وہ کسی کا بھی قتل کرسکتا ہے۔"

"میں کب کہہ رہی ہوں کہ ایسا نہیں ہوگا۔" یہ پہلا موقع تھا کہ نائلہ نے اس طرح کھل کر اپنے باپ سے بات کی تھی۔ شاید اسی لیے وہ دیگر تمام باتوں سے زیادہ اس کی بدتمیزی کی حدوں کو چھوتی ہوئی ہمت پر حیران تھے "ہوسکتا ہے بالکل ایسا ہی ہو جیسا کہ آپ کہہ رہے ہیں لیکن یہ بھی تو دیکھیں کہ اس سے ہمیں نقصان کیا ہے؟" ابا کے پاس اس کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اس لیے وہ خاموش رہے تھے اور ان کی اس خاموشی نے نائلہ کا حوصلہ اور بھی بڑھادیا تھا "دو بڑے آدمیوں کی لڑائی میں اگر ہمیں فائدہ ہو رہا ہے تو ہمارا کیا نقصان ہے؟" نائلہ کی بات ابا کی سمجھ میں آرہی تھی مگر ساتھ ہی ان کا تجربہ بڑھتے ہوئے خطرے کی بُو بھی سونگھ رہا تھا مگر رشتوں کے احترام اور بیٹی کے تیوروں نے انہیں بات بڑھانے نہیں دی اور وہ خاموش ہو رہے تھے۔

شارق رہا ہو کر گھر آگیا تو رہی سہی کسر بھی پوری ہوگئی۔ اب ابا سمیت ہر ایک پر نائلہ کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔

شاکر صاحب نے ڈی ایس پی کو تو جیسے تیسے چلتا کردیا مگر اب ان کی پریشانی ایک نیا انداز لیے ہوئے تھی۔

"میں نہ اس ڈی ایس پی ریاض حیدر سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارا شیر افضل سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ شیر افضل سے یہ کہلوا سکتا ہوں کہ وہ اس معاملے میں خاموش ہوجائے۔" ریاض حیدر کے جاتے ہی انہوں نے نائلہ سے صلاح مشورہ شروع کردیا تھا۔

"ہم کہیں بھی کیوں؟... ہماری اس کمینے سے کون سی رشتے داری ہے!" اماں کو اپنی بے عزتی یاد تھی "اچھا ہے، اگر اس موذی کا سر کچلا جائے تو۔" انہوں نے بل کھاتے ہوئے کہا تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر ان کی نہ دوستی اچھی ہوتی ہے نہ دشمنی۔" ابا دودھ کے جلے ہوئے تھے اس لیے چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پی رہے تھے۔

"تمام جھگڑوں کا ایک ہی علاج ہے کہ ہم یہ مکان ہی چھوڑ جائیں۔" نائلہ بولی تھی۔

"مگر مسئلہ تو پھر بھی حل نہیں ہوگا۔" ابا نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے کہا تھا۔ "اگر وہ ہمیں ڈھونڈ نکالنا چاہے گا تو یہ اس کے لیے کتنی دیر کی بات ہوگی۔" اور نائلہ کو بھی ان کی بات میں وزن محسوس ہوا تھا۔

"نہ تو اپنے ان بے ہودہ دوستوں کے چکر میں الجھتا اور نہ ہی ہمیں ان پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا۔" ابا نے شارق کو ایک بار پھر ملامت کرتے ہوئے کہا تھا۔ جب سے وہ آیا تھا اسے اسی طرح کے فقروں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جس کا جواب وہ سر جھکا کر خاموشی سے دیتا تھا۔

رات کو تو اس مسئلے کا حل نہ نکل سکا مگر اگلے روز شارق نے نائلہ کو اکیلے میں گھیر لیا۔

"میری ڈی ایس پی سے ملاقات ہوئی تھی۔" شارق نے سرگوشی والے انداز میں نائلہ سے کہا تو اس کے کان کھڑے ہوگئے۔

"کہاں؟" اس نے سوال کیا۔

"میں منصور کی دکان پر بیٹھا تھا کہ وہ وہاں آگیا۔" منصور اسکول میں شارق کے ساتھ پڑھتا تھا اور اس کے باپ کی محلّے میں راشن کی دُکان تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد اس نے یہ دُکان سنبھال لی تھی اور پرانی دوستی کے حوالے سے شارق کبھی کبھی اس کی دُکان پر جاتا تھا۔ نائلہ کو اس بات کا یقین تھا کہ شارق اس موقعے پر غلط بیانی سے کام لے رہا ہے مگر اس کے باوجود اس نے شارق سے اس بات کا اظہار نہیں کیا۔

"کیا کہہ رہا تھا؟" نائلہ جلد سے جلد شارق کی بلّی کو تھیلے سے باہر نکالنا چاہتی تھی۔

"وہ کہہ رہا تھا کہ اگر شیر افضل اس کا پیچھا چھوڑ دے اور اگر وہ اپنے تعلقات استعمال کرکے اس کے خلاف جو تحقیقات شروع کروائی ہے، وہ رکوا دے تو وہ ہمیں دو لاکھ روپے دینے کے لیے تیار ہے۔" نائلہ پہلے تو کچھ دیر اسے دیکھتی رہی اور پھر بولی۔

"یہ تو تھی کہانی، اب یہ بتاؤ کہ اس کہانی میں سچ کتنا ہے؟" شارق پہلے ہی نائلہ کے گھورے جانے سے بوکھلایا ہوا تھا، اب اچانک نائلہ نے براہِ راست سوال پوچھا تو وہ بالکل ہی بوکھلا کر رہ گیا۔

"کہانی... کیسی کہانی؟" اس نے گڑبڑاتے ہوئے کہا "تم سمجھ نہیں رہی ہو، یہ دو لاکھ روپوں کی بات ہے۔" شارق نے ایک بار پھر لفظ دو لاکھ پر زور دیا تھا۔ اس کے بوکھلانے کی اصل وجہ بھی یہی تھی کہ وہ یہ سوچ کر آیا تھا کہ نائلہ دو لاکھ روپوں کے بارے میں سنتے ہی فوراً تیار ہوجائے گی۔

"پہلے تو یہ بتاؤ کہ ریاض حیدر تمہارے پاس آیا تھا یا تم خود چل کر اس کے پاس گئے تھے؟" نائلہ نے اپنے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔ دو لاکھ روپوں کے بارے میں سننے کے بعد اس کی کیفیت بھی تقریباً ویسی ہی تھی جیسا کہ شارق نے اندازہ لگایا تھا مگر وہ بڑی مشکلوں سے خود پر قابو پائے ہوئے تھی۔

"مجھے کیا ضرورت تھی اس کے پاس جانے کی؟" شارق نے نگاہیں چُراتے ہوئے کہا۔

"تم ایک کام میں سب سے چھپ کر مجھے اپنا شریک بھی بنانا چاہتے ہو اور ساتھ ہی یہ بھی چاہتے ہو کہ میں...." نائلہ نے دوسرا حربہ استعمال کیا اور شارق فوراً ہی ڈھے گیا۔

"اصل بات یہی ہے۔" اس نے آخرکار اعتراف کرتے ہوئے کہا "میں صبح ریاض حیدر کے پاس گیا تھا اور میں نے اس سے بات کی تھی کہ اگر اس کا اس علاقے سے کہیں اور ٹرانسفر ہو گیا تو اس کی اتنی آمدنی نہیں ہوگی بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی نوکری ہی جاتی رہے۔ اس لیے اگر وہ چاہتا ہے کہ یہ سب کچھ نہ ہو تو ہماری بات مان لے۔" شارق سچ اُگلنے پر آیا تو اُگلتا چلا گیا۔

"پھر تم نے کتنے میں سودا کیا؟"

نائلہ کے سوال کا فوری جواب نہیں آیا مگر کچھ دیر سر جھکانے کے بعد وہ بولا "چار لاکھ۔"

"گویا دو لاکھ تم بالا ہی بالا اُڑانے کے موڈ میں تھے۔" نائلہ نے طنز کرتے ہوئے کہا۔ شارق کے پاس اس بات کا جواب دینے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا اس لیے اس نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی تھی۔

"ایسے مواقع زندگی میں بار بار نہیں آتے۔" اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد نائلہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"یہ رقم مجھے مل گئی تو میں کوئی بھی کاروبار کر سکتا ہوں۔ اگر آپ کی جیب میں رقم ہو تو پھر کوئی نہیں پوچھتا کہ رقم آئی کہاں سے ہے۔"

نائلہ کا دل تو پہلے ہی چار لاکھ کا سن کر دھک دھک کر رہا تھا۔

"اور اگر اس نے انکار کر دیا تو" اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوال کیا۔

"کیوں کرے گا وہ انکار؟" شارق کو چار لاکھ کی لالچ کی عینک لگانے کے بعد ہر چیز ہری ہری نظر آ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔" نائلہ نے کہا "مگر رقم آدھی آدھی تقسیم ہوگی۔" سودے بازی کرنے میں اب نائلہ کافی ماہر ہو چکی تھی۔

"تم کیا کرو گی رقم کا؟" شارق نے قدرے حیرانگی سے پوچھا۔

"تمہیں اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے۔" نائلہ نے اس کا سوال رد کرتے ہوئے کہا۔

"میں ان لوگوں کے ساتھ بھی اس لیے شریک ہوا تھا کہ آہستہ آہستہ اتنی رقم جمع کر لوں کہ کاروبار شروع کر سکوں مگر میری بدقسمتی کہ ایسا نہ ہو سکا۔" شارق نے اپنے سابقہ جرم کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

"اگر میری شرط منظور نہیں ہے تو چھوڑو۔" نائلہ نے بات ٹالنے والے انداز میں کہا اور شارق فوراً تیار ہو گیا۔ دوسری صورت میں پوری چھوڑ، آدھی بھی اس کے ہاتھ سے جا رہی تھی۔

"نائلہ ایک بار پھر کالج کا بہانہ کر کے شیر افضل کے گھر گئی تھی مگر اس سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ ملازم نے بتایا تھا کہ "یہ ضروری نہیں کہ صاحب روز اِدھر آ ہی جائیں۔ کبھی کبھی تو صاحب دو دو ہفتے یہاں کا چکر نہیں لگاتے۔" اس نے کہا تھا۔

نائلہ نے اس کے باوجود کافی دیر تک اس کا انتظار کیا پھر واپس آتے ہوئے کہہ آئی کہ "اگر صاحب خود آئیں یا ان کا فون آئے تو کہنا کہ میں کل پھر آؤں گی۔" مگر ایک روز مزید مایوسی کا شکار ہونے کے بعد اس کی تیسرے روز شیر افضل سے ملاقات ہوئی۔

"تم اور تمہارا بھائی کیا یہ سمجھتے ہیں کہ دولت کمانا اتنا ہی آسان ہے!" نائلہ کی پوری بات سننے کے بعد شیر افضل نے غراتے ہوئے کہا تھا "آدمی کو پہلے بہت کچھ کھونا پڑتا ہے پھر کہیں جیب نوٹوں سے بھرتی ہے۔" شیر افضل کے فقرے سے نائلہ کے تمام خواب ایک چھناکے کی آواز کے ساتھ بکھر گئے تھے۔

ان دو تین دنوں میں اس نے نہ جانے کتنی بار خود کو آراستہ گھر سے نکلتے ہوئے بڑی سی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے دیکھا تھا لیکن شیر افضل نے اپنی زبان کے پتھر سے اس کے شیشے جیسے خواب بکھیر کر رکھ دیے تھے۔

"تمہارا بھائی اگر واقعی چاہتا ہے کہ دولت کمائے تو اس کے لیے اسے ہمت سے کام لینا ہوگا۔" شیر افضل نے کچھ دیر رکنے کے بعد کہا "میرے پاس اس کے لیے ایک ایسا کام موجود ہے کہ وہ مہینوں میں نہیں بلکہ ہفتوں میں لکھ پتی بن سکتا ہے۔" نائلہ کے بکھرتے ہوئے خواب ایک بار پھر ایک ہونے لگے اور اس نے پھر سے امید بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"اگر وہ واقعی روپیہ کمانا چاہتا ہے تو اس سے کہو کہ ہمارے لیے کیریئر بن جائے۔ ہم اسے ہر ٹرپ کے اسی ہزار روپے دیں گے۔" شیر افضل نے آفر کی تھی۔

کیریئر کا لفظ نائلہ کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ہیروئن کی کھیپ ایک ملک سے دوسرے ملک لے جانے والے کو "کیریئر" کہتے ہیں۔

"اور اگر وہ گرفتار ہو گیا تو؟" نائلہ نے سوال کیا۔

"اوّل تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن اگر ایسا ہو بھی گیا تب بھی ہم اس کے اکاؤنٹ میں ہر ماہ دس ہزار روپے جمع کرواتے رہیں گے یا وہ جیسے کہے گا پہنچا دیا کریں گے۔" شیر افضل نے مزید وضاحت کی تھی۔

"اور اگر میں یہ کام کرنا چاہوں تو...." نائلہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوال کیا۔

"تب تمہارے لیے بھی یہی آفر ہے۔" شیر افضل نے فوری جواب دیا اور نائلہ کے ذہن میں ایک ساتھ بہت سے دیپ جل اٹھے تھے "مگر تمہیں اتنا رسک لینے کی کیا ضرورت ہے؟" شیر

افضل نے اسے بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا "جو کچھ تم حاصل کرنا چاہتی ہو وہ تمہیں یہیں مل سکتا ہے۔" شیر افضل کی آنکھوں میں ایسی ہی کوئی بات تھی کہ نائلہ کو جو اب تک بڑے سکون سے اس سے گفتگو کر رہی تھی' اپنی نظریں جھکا لینی پڑی تھیں۔

"تم کیا چاہتی ہو۔ دولت؟" شیر افضل نے سوال کیا۔

"صرف دولت ہی نہیں' عزت اور شہرت بھی۔" نائلہ کو پہلی بار کسی کے سامنے اپنے خواب بیان کرنے کا موقع ملا تو وہ بولتی چلی گئی "میں چاہتی ہوں کہ جب میں بازار میں نکلوں تو لوگ میری جانب دیوانہ وار لپکیں اور میں ان سے بچتے بچاتے اپنی بڑی سی گاڑی میں بیٹھ کر' اپنی بڑی سی کوٹھی کی جانب روانہ ہو جاؤں اور پھر جب وہ لوگ اپنے گھروں کو جائیں' اپنے دوستوں کے درمیان بیٹھیں تو کہیں کہ آج ہم نے نائلہ کو دیکھا تھا۔ وہ میری تعریفیں کریں اور....."

"یہ سب کچھ ممکن ہے۔" شیر افضل نے اس کی گفتگو میں دخل دیتے ہوئے کہا اور نائلہ اسے دیکھنے لگی۔

"اپنے جملہ حقوق میرے نام منتقل کر دو..... خود کو میرے حوالے کر دو..... میں تمہارے خواب حقیقت بنا دوں گا۔" شیر افضل نے پرانے اور ماہر سوداگر کے سے انداز میں کہا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ....." نائلہ اس کی بات پوری طرح سمجھ نہیں پائی تھی "کیا تم مجھے پرپوز کر رہے ہو؟" اس نے وضاحت چاہی تھی۔

"نہیں" شیر افضل نے قطعیت والے لہجے میں کہا "میں نے ایک شادی کی اور اس کا نتیجہ بھی بھگت چکا ہوں۔"

"تو پھر؟" نائلہ اب بھی نہیں سمجھ سکی تھی کہ شیر افضل کیا کہہ رہا ہے۔

"تم اتنی ناسمجھ اور نادان تو نہیں ہو کہ اتنی ذرا سی بات نہ سمجھ سکو!" شیر افضل نے تیور بدلتے ہوئے کہا "میں ریاض حیدر نہیں ہوں کہ زبردستی کروں۔" اس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

نائلہ کی سمجھ میں اس کا فقرہ آیا تو اس کے ساتھ ہی اس کی پیشانی پر پانی کے چند قطرے بھی نمودار ہو گئے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ شرم سے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے گڑ جائے مگر ایسا نہیں ہو سکا' ہر چیز اپنی جگہ پر رہی۔

"میں اپنی آفر کر چکا ہوں' اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم اسے مانتی ہو یا پھر زندگی بھر کسی چھوٹے سے گھر میں برتن مانجھتے اور بچے پیدا کرتے ہوئے خود کو ختم کر دیتی ہو۔" شیر افضل اتنا کہہ کر کھڑا ہو گیا۔

"ریاض حیدر والے معاملے کا کیا ہو گا؟" نائلہ نے بھی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ امید کا آخری سرا اپنے ہاتھوں سے نکلنے نہیں دینا چاہتی تھی۔

"وہ میری اور اس کی لڑائی ہے جس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں..... تم تو بس اچانک راستے میں آ گئیں ورنہ میرا اور اس کا پرانا حساب ابھی باقی ہے۔" شیر افضل کی غراہٹ میں نفرت کی آنچ صاف محسوس کی جا سکتی تھی "کل وہ طاقتور تھا تو میرے ساتھ جو کچھ کر سکتا تھا' اس نے کیا..... آج مجھے طاقت حاصل ہو گئی ہے تو میں بھی وہی کچھ کروں گا جو میرے ساتھ کیا گیا تھا۔" شیر افضل کا جواب نائلہ کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

"بی بی جی... آپ کی چائے تو ٹھنڈی ہو گئی ہے۔" ملازمہ کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔

"ہاں" پہلی بار تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ سکا تھا کہ وہ کس ماحول میں ہے مگر فوراً ہی اسے ہر بات یاد آتی چلی گئی "لے جاؤ اسے یہاں سے۔" اس نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے کے بعد کہا تھا۔

"دوسری چائے لے آؤں؟"

"نہیں" نائلہ نے کہا۔ لمحہ لمحہ بڑھتے ہوئے ذہنی دباؤ سے نکلنے کا اس کے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا۔

"اظہر سے بات کروں' شاید وہی کچھ بتا سکے۔" اس کے ذہن میں اپنے سابقہ منگیتر کا نام گونجا تھا۔ ایک عرصے بعد دو ماہ پہلے اس سے ملاقات ہوئی تھی تو نائلہ نے اس کا رویہ اپنے گھر والوں سے بالکل مختلف پایا تھا۔ وہ مری میں آؤٹ ڈور شوٹنگ پر تھی' جب ہوٹل میں اظہر خود اس کے پاس آیا تھا۔

"کیسی ہو نائلہ" اس نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا ورنہ وہ تو اسے دیکھتے ہی اپنے تمام حواس کھو بیٹھی تھی۔

"ٹھیک ہوں" نائلہ نے تھوک نگلتے ہوئے کہا تھا۔ ان آٹھ برسوں میں وہ کافی تبدیل ہو گیا تھا۔ جسم بھاری ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر بھی بُردباری آ گئی تھی۔

"اگر مصروف نہیں ہو تو تھوڑی دیر کو یہاں بیٹھ جاؤں؟" نائلہ اس وقت اکیلی ہی تھی۔ یونٹ کے دیگر افراد دن بھر کی شوٹنگ کے بعد اپنے اپنے کمروں میں آرام کر رہے تھے۔

"ہاں... ہاں... کیوں نہیں؟" نائلہ نے کہا تھا۔ کہنے کو تو اس نے کہہ دیا تھا مگر اس کی نظریں اظہر کے سامنے اٹھ نہیں رہی تھیں۔ کبھی اس نے کہا تھا کہ وہ کلرک اظہر کے ساتھ شادی کر کے اپنی زندگی برباد نہیں کر سکتی۔ وہ روشنی کی تلاش میں گھر سے نکل آئی تھی مگر جب آنکھیں چکا چوند کر دینے والی روشنیوں کی حقیقت کھلی تو اس پر ظاہر ہوا کہ ان روشنیوں کے پیچھے کتنا اندھیرا ہے۔

"صائمہ کیسی ہے؟" اظہر کی خاموشی سے اکتا کر اس نے سوال کر لیا تھا۔

"ٹھیک ہے" اظہر نے مختصر جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔ یہ بات نائلہ کو معلوم تھی کہ نائلہ کے گھر سے نکل آنے کے بعد صائمہ کی شادی اظہر سے ہو گئی تھی۔

"تین بچے ہیں نا؟" نہ جانے کیسے نائلہ کی زبان سے نکل گیا

تھا۔

"چار" اظہر نے اس کی تصحیح کرتے ہوئے کہا تھا "چوتھا ابھی تین مہینے کا ہے۔" اس نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا۔

"مبارک ہو" اس نے کہا اور ایک بار پھر فضا خاموش ہو گئی۔

"نائلہ" اس بار خاموشی کا سلسلہ اظہر نے توڑا تھا "تم واپس کیوں نہیں آ جاتیں؟"

اور نائلہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ تو یہ سمجھ رہی تھی کہ اظہر اس پر طنز کے تیر برسائے گا' اسے طعنہ دے گا کہ "دیکھو' تم جن چیزوں کے حصول کے لیے اپنے تمام رشتوں کو ٹھکرا آئی تھیں' آج انھیں حاصل کرنے کے بعد بھی تم خالی ہاتھ ہو۔" مگر اس نے یہ سب کچھ کہنے کے بجائے وہ بات کہی تھی جس کی توقع نائلہ اس کی زبان سے نہیں کر رہی تھی "اب یہ کیسے ممکن ہے؟" نائلہ نے پورے کرب کے ساتھ کہا۔

"ہر چیز ممکن ہے نائلہ' صرف تم ارادہ تو کرو۔" اظہر نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا تھا۔

"اُس گھر میں میرے لیے اب کوئی گنجائش نہیں ہے۔" نائلہ کو ماضی میں بار بار اپنا دھتکارا جانا یاد تھا "وہ لوگ تو میری شکل دیکھنے کے بھی روادار نہیں ہیں۔"

"یہ تمہارا خیال ہے ورنہ حقیقت یہ نہیں ہے۔" اظہر پورے اعتماد سے گفتگو کر رہا تھا "تم وہاں اس طرح جاتی ہو کہ کچھ دیر رک کر واپس اسی دنیا میں لوٹ آتی ہو اور یہ بات انھیں منظور نہیں ہے۔ ایک بار تم اپنے تمام رابطے ختم کر کے پہنچو اور پھر دیکھو کہ وہ تمہیں دھتکارتے ہیں یا گلے سے لگاتے ہیں۔" اظہر نے اس کی غلطی کی نشاندہی کی تھی۔

"اور اگر اس کے باوجود انھوں نے انکار کر دیا تو؟" نائلہ نے اپنے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"تب میرا گھر حاضر ہے۔" اظہر نے کہا "اس گھر پر تمہارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا میرا یا صائمہ کا ہے۔"

"چائے پیو گے؟" نائلہ نے اس موضوع سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"یہ مان لو نائلہ کہ سب کچھ حاصل کرنے کے بعد بھی اس سودے میں تم نے نقصان ہی اٹھایا ہے۔" اظہر اسے اس حقیقت سے آشنا کرنے کی کوشش کر رہا تھا جس سے وہ خود بھی واقف تھی "تمہارے بچوں کے بارے میں تمہاری معلومات سے یہ بات ظاہر ہے کہ تم اب تک اپنے رابطے توڑ نہیں سکی ہو۔"

نائلہ خاموشی سے اس کی گفتگو سنتی رہی۔ جو کچھ وہ کہنا چاہتی تھی اس کے لیے نہ الفاظ اس کے پاس تھے اور نہ ہی اس کی زبان اس کا ساتھ دے رہی تھی۔

"یہ میرے کالج کا فون نمبر ہے۔" اظہر نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا اور نائلہ نے ہاتھ بڑھا کر اس سے کاغذ لے لیا "زندگی کے کسی موڑ پر اگر تم واپس آنا چاہو تو ہمارے دروازے تمہارے لیے کھلے ہوں گے۔" اس نے جانے سے قبل کہا تھا۔

اظہر آیا اور چلا گیا مگر نائلہ کی زندگی میں ایک نئی ہلچل مچا گیا تھا۔ سہیل کا اصرار بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ نائلہ سب کچھ چھوڑ کر جانے کے لیے تیار تھی مگر شیر افضل کا آکٹوپس اسے اس طرح جکڑے ہوا تھا کہ چاہنے کے باوجود وہ اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتی تھی۔

نائلہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اس نے الماری سے اظہر کا فون نمبر نکالا۔ "جی مجھے اظہر صاحب سے بات کرنی ہے۔ جو آپ کے یہاں لیکچرار ہیں۔" اس نے نمبر ملانے کے بعد کہا تھا۔

"اظہر صاحب تو آج کالج نہیں آئے خاتون!" فون اٹھانے والے شخص نے جواب دیا تھا۔

"دیکھیں... میں لاہور سے بول رہی ہوں اور مجھے ان سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔" اظہر کے کالج نہ آنے سے اس کی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اظہر کے بارے میں یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اپنی گزشتہ ملازمت میں بھی چھٹی بڑی مشکل سے ہی کرتا تھا اور جب سے وہ پرائیویٹ ایم اے کرنے کے بعد کالج کی ملازمت میں آیا تھا تب سے تو اس نے چھٹی کو بالکل ہی حرام سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ "لگتا ہے اماں کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہے۔" اس نے سوچا تھا "دیکھیں... کیا اظہر صاحب سے بات کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔" اس نے ملتجیانہ لہجے میں کہا تھا۔

"ان کے کسی عزیز کی طبیعت ناساز ہے اور انھوں نے اسی لیے چھٹی کی درخواست بھیجی ہے۔" اس جانب سے بولنے والے نے نائلہ کے بدترین خدشات کو صحیح ثابت کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔

"کیا ایسا بھی نہیں ہو سکتا کہ میرا فون نمبر ان تک پہنچا دیا جائے کہ وہ مجھ سے رابطہ کر لیں۔" نائلہ کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راستہ بھی نہیں رہ گیا تھا۔

"اگر آپ دو گھنٹے بعد رنگ کر لیں تو بہت ممکن ہے کہ میں کسی کو بھیج کر انھیں بلوا لوں۔"

"جی شکریہ۔ آپ کی بہت مہربانی ہو گی۔" نائلہ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا تھا۔ کالج کا فون جس کسی نے بھی اٹھایا تھا وہ نائلہ کے اس فریادی لہجے سے خاصا متاثر ہوا تھا۔

"اب اگر وہ نہ بھی رہیں تو تجھے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" فون رکھنے کے بعد اس کے اندر کی آواز نے دوبارہ اسے تنگ کرنا شروع کر دیا تھا "نہیں' میں شیر افضل سے دو ٹوک بات کروں گی۔" اس نے ایک نئے عزم کے ساتھ سوچا تھا۔ اسے میرا پیچھا چھوڑنا ہو گا ورنہ میں....'

"بی بی جی.... سہیل صاحب آئے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" ملازمہ نے ایک بار پھر کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ میں کسی سے بھی نہیں ملوں گی۔" اس نے اپنا غصہ ملازمہ پر اتارتے ہوئے کہا تھا۔

"جی.... میں نے ان سے کہا تھا کہ آپ کی طبیعت خراب ہے اور آپ کسی سے نہیں ملیں گی مگر وہ کہتے ہیں کہ میں کسی نہیں ہوں۔" ملازمہ نے سہیل کا فقرہ دہرایا۔

نائلہ جانتی تھی کہ وہ ایسا ہی ہے۔ ضد کا پکا۔ کسی بات پر اڑ گیا تو اڑ گیا۔

"کہاں ہے وہ؟" نائلہ نے نرم پڑتے ہوئے کہا۔

"نیچے ڈرائنگ روم میں ہیں۔" ملازمہ نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، تم چلو میں آتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"آج میں تمام حساب بے باق کردوں گی۔" اس نے بیڈروم کی دیوار پر پردے گراتے ہوئے سوچا تھا "اس آئینہ خانے کی قید اب میرے لیے ناقابل برداشت ہوچکی ہے۔" اور اس سوچ کے ساتھ ہی اسے یاد آیا کہ کبھی اس نے یہ بیڈ روم شیر افضل سے فرمائش کرکے بنوایا تھا۔ تین جانب شیشوں کی دیوار والے اس طرح کے بیڈروم کا سیٹ اس نے ایک انگریزی فلم میں دیکھا تھا اور پھر اس کی فرمائش شیر افضل سے کردی تھی اور اس نے ہر فرمائش کی طرح یہ فرمائش بھی پوری کردی تھی۔ بیڈ روم میں کچھ اس طرح سے روشنی کا نظام رکھا گیا تھا کہ ایک مخصوص بٹن دباتے ہی چھت پر کچھ اس طرح کا منظر آجاتا جیسے اندھیری رات میں آسمان پر تارے جگمگا رہے ہوں اور جب شیشوں پر سے پردے ہٹادیے جاتے تو پورے بیڈروم میں تارے جگمگانے لگتے۔ کبھی یہ منظر نائلہ کو بڑا سہانا لگتا تھا مگر اب وہ اس کیفیت سے نکل آئی تھی۔ گناہ کے زہر کی ابتدائی مٹھاس ختم ہوچکی تھی اور اب اس زہر کی کڑواہٹ اسے اپنے پورے وجود میں سماتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔

نائلہ ابھی دروازے تک ہی پہنچی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی اور وہ جاتے جاتے پلٹ آئی۔

"اس وقت سہیل گھر میں موجود ہے؟" فون پر شیر افضل چنگھاڑ رہا تھا۔

"ہاں" اس نے مختصر جواب دیا۔

"جب میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ اس سے کہہ دو آئندہ تم سے کوئی رابطہ نہ رکھے تو پھر یہ کیوں آیا ہے؟" شیر افضل کی دہاڑ سنائی دی۔

"میں نے اس سے کہہ دیا تھا مگر...."

"میں کوئی اگر مگر سننے کا عادی نہیں ہوں۔" شیر افضل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "اسے فوراً گھر سے چلتا کردو اور اگر وہ نہیں جاتا تو ملازموں سے دھکے مار کر نکلوا دو اور اگر تم خود یہ کام نہیں کرسکتیں تو میں کراوں گا۔"

فون پر اس کی چنگھاڑتی ہوئی آواز سن کر اندازہ ہورہا تھا کہ وہ بہت زیادہ غصے میں ہے۔

"اور اگر میں یہ کہوں کہ میں ایسا نہیں کرسکتی تو...." نائلہ نے دل کڑا کرکے کہہ دیا۔

شیر افضل کی جانب سے فوری طور پر کوئی جواب نہیں آیا تھا "تمہارے اس انکار نے اب اس کی زندگی کے دن بالکل ختم کردیے ہیں۔" شیر افضل کی آواز میں کسی پھن اٹھائے ہوئے سانپ کی سی پھنکار تھی۔

"تم ایسا نہیں کروگے مسٹر شیر افضل۔" نائلہ نے اسی کے لہجے میں اسے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"کون روکے گا مجھے ایسا کرنے سے؟" شیر افضل غرایا۔

"میں روکوں گی۔" نائلہ نے پورے عزم کے ساتھ کہا۔

"تم روکوگی؟" شیر افضل نے طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا تھا۔ "تجھ میں اتنی ہمت کب سے آگئی؟" شیر افضل کی آواز آئی۔ اس سے پہلے شیر افضل جب بھی اس سے اس لہجے میں بات کرتا تھا تو نائلہ کو اپنی ہڈیوں تک میں سرسراہٹ محسوس ہوتی تھی لیکن آج وہ اپنی جگہ پر کھڑی رہی "میں تم سے آخری بار کہہ رہا ہوں نائلہ کہ تم اس سے نہیں ملوگی۔" شیر افضل اپنی تمام تر درشتوں کو اپنے لہجے میں سموتے ہوئے بولا تھا۔

"تم زیادہ سے زیادہ مجھے مار ڈالوگے نا!" نائلہ نے اس کی کسی بات پر کان نہ دھرنے کی ٹھان لی تھی۔

"میں تمہیں اور تمہارے اس عاشق کو وہ موت دوں گا جس کا تم دونوں نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔" شیر افضل غصے سے پاگل ہورہا تھا۔

"مجھے تمہاری دی ہوئی موت اور موت سے بدتر زندگی دونوں قبول ہیں شیر افضل۔" نائلہ ایک عالم جنون میں بول رہی تھی۔ "مگر اس سے قبل میں سہیل سے ملوں گی ضرور۔" اس کے اس جواب کے ساتھ ہی لائن کٹ گئی۔ وہ کچھ دیر ریسیور ہاتھ میں لیے کھڑی رہی اور پھر اس کے قدم وارڈروب کی جانب اٹھنے لگے "اگر موت کا سامنا کرنا ہی ہے تو پوری شان سے کیوں نہ کیا جائے۔" اس نے سوچا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس نے موت کی آمد کا شایان شان استقبال کرنے کی تیاریاں شروع کردی تھیں۔ اس دوران ملازمہ ایک بار پھر سہیل کا پیغام لے کر آئی تھی۔ اس نے کہلوادیا کہ وہ تیار ہوکر نیچے آرہی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ اس گفتگو کے بعد جو اس نے شیر افضل سے کی تھی' شیر افضل جہاں بھی ہوگا' اس کی جانب روانہ ہوچکا ہوگا۔

پوری طرح تیاری کرنے کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں آئی۔ اسے دیکھتے ہی سہیل کے چہرے پر خوشی کے تمام رنگ بکھر گئے تھے۔

نائلہ نیلے رنگ کے انہی کپڑوں میں تھی جو سہیل نے اس کے لیے ایک ہفتہ پہلے خریدے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں نیلے اور گلابی رنگ کے کڑے اور کانوں میں جُھمکے بھی وہی تھے جو سہیل اس کے لیے لایا تھا۔

"تم نے کہا تھا سہیل کہ اس کھیل میں اگر تمہیں موت کو بھی گلے لگانا پڑا تو تم ہنس کر اسے گلے لگالو گے۔" نائلہ نے اس سے کہا۔

"میں اب بھی اپنی اس بات پر قائم ہوں۔" سہیل نے جواب دیا۔

"موت ہماری جانب لپکنے کے لیے اپنے مقام سے چل پڑی ہوگی۔" نائلہ نے پورے اطمینان کے ساتھ اسے اطلاع دیتے ہوئے کہا "میں نے شیر افضل سے آخری بار دو دو ہاتھ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔" اس نے سہیل کے چہرے پر آئے ہوئے استعجابیہ تاثرات دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں۔" سہیل نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "زندگی کی صورت میں بھی اور موت کی صورت میں بھی۔" سہیل کی آواز میں کوئی ارتعاش نہیں تھا۔ وہ پورے اعتماد کے ساتھ اور اطمینان سے گفتگو کررہا تھا "مگر یہ کیا ضروری ہے کہ ہم اس کا انتظار یہیں بیٹھ کر کریں؟"

"ہمیں یہی کرنا ہوگا سہیل۔" نائلہ نے جواب دیا۔ "شیر افضل کو میں تم سے زیادہ جانتی ہوں۔ وہ اب تک ہمارے گرد ان دیکھی دیواریں کھڑی کرچکا ہوگا اور اگر ہم چاہیں تب بھی اس عمارت سے باہر نہیں نکل سکیں گے۔"

"کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔" نائلہ کو اس کی یہ بات کچھ عجیب سی محسوس ہوئی۔ ایک جانب تو وہ ساتھ جینے اور مرنے کی باتیں کررہا تھا اور دوسری جانب فرار ہونے کے لیے کہہ رہا تھا۔

"میں جانتی ہوں سہیل کہ ہم اس سے بھاگ کر کہیں نہیں جاسکیں گے۔" نائلہ کے لہجے میں قطعیت تھی "اس کے رابطے امریکا میں بھی ہیں۔ وہ مافیا کے ذریعے جسے وہ یہاں سے منشیات سپلائی کرتا ہے، ہمیں ڈھونڈ نکالے گا۔" نائلہ نے اسے سمجھانے والے انداز میں یہ بات کہی تھی۔ یہ بات وہ پہلے بھی کئی بار اس سے کہہ چکی تھی مگر ہر بار سہیل خاموش ہوجاتا تھا مگر اس بار ایسا نہیں ہوا۔

"وہ اگر اتنا ہی طاقتور ہے تو پھر آج تک اپنی بیوی اور بچوں کو کیوں ڈھونڈ نہ سکا جب کہ وہ اس سے زیادہ دور بھی نہیں تھے؟" نائلہ اس کے لہجے میں چھپے ہوئے طنز کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکی۔

"کیا تم اس بارے میں کچھ جانتے ہو؟" سہیل نے ایک ایسا قصہ چھیڑ دیا تھا جسے سن کر نائلہ اپنے مسائل بھی ایک لمحے کے لیے بھول گئی تھی۔ ان آٹھ برسوں میں لاتعداد مواقع ایسے آئے تھے جب شیر افضل نے اس کے سامنے اپنے بچوں کا ذکر کیا تھا۔

"تم یہ معلوم کرکے کیا کرلو گی؟" سہیل نے جواب دیا "یہ سوال تو اسے کرنا چاہیے تھا۔" نائلہ کو اچانک احساس ہونے لگا۔ جیسے یہ سہیل وہ نہ ہو جسے وہ جانتی تھی' جو امریکا سے آیا تھا اور پھر اس کے عشق میں ایسا دیوانہ ہوا کہ یہ کہنے لگا کہ وہ واپس جائے گا تو صرف اس صورت میں جب نائلہ بھی اس کے ساتھ جانے کی ہامی بھرلے۔

"ایک صورت ہوسکتی ہے سہیل!" نائلہ نے سرگوشی والے انداز میں کہا تھا "ہم شیر افضل کو اس کے بیوی بچوں کے بارے میں بتا کر اپنی رہائی کی بات کرسکتے ہیں۔" سہیل کی گفتگو سے نائلہ کو امید کی ایک نئی کرن نظر آئی تھی۔

"زندگی میں کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں نائلہ جن پر سودے بازی نہیں کی جاسکتی۔" سہیل نے پوری سنجیدگی سے انکار کردیا تھا "اور ویسے بھی سودے تمہیں راس نہیں آتے' اس لیے آج جو بھی بات ہوگی' دو ٹوک ہوگی۔ یا اِدھر یا اُدھر۔" سہیل کے اتنے واضح انکار کے بعد نائلہ کو مزید گفتگو کا حوصلہ نہ ہوا۔

"سہیل ایسا تو نہیں تھا۔" اس نے سوچا۔ "یہ تو میری کوئی بات رد ہی نہیں کرتا تھا۔ اب یہ اچانک اسے کیا ہوگیا ہے۔" وہ حیرت سے سہیل کو دیکھتی رہی تھی مگر سہیل اس کی جانب متوجہ ہی نہیں تھا۔

"بی بی جی... صاحب کا فون آیا ہے۔" ملازمہ نے ڈرائنگ روم میں آکر اطلاع دی تھی۔

"ان سے کہو اس فون پر بات کرلیں۔" نائلہ نے جواب دیا۔

"وہ جی.... صاحب آپ دونوں سے بات کرنا چاہتے ہیں اور انہوں نے کہا ہے کہ آپ دونوں ہی اس فون پر آجائیں۔" ملازمہ نے نائلہ کا فقرہ سننے کے باوجود ہدایات کا بقیہ حصہ بتاتے ہوئے کہا۔

"ہم دونوں یہیں بیٹھے ہیں' اس لیے اپنے صاحب سے کہو کہ وہ یہیں بات کرلیں۔" نائلہ نے ملازمہ سے کہا۔

"کیا برائی ہے' اگر ہم وہیں چل کر اس کی گفتگو سن لیں۔" سہیل نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا اور نائلہ یہ کہتے کہتے رک گئی کہ "میں اس پر یہ ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ اب میں اس کی کوئی بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔" سہیل کھڑا انتظار کررہا تھا اس لیے وہ بھی اٹھ گئی۔

وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے بیڈ روم میں آئے مگر وہاں کا منظر نائلہ کی توقعات کے بالکل برعکس تھا۔ شیر افضل دروازے کے عین سامنے بیٹھا ان دونوں کا انتظار کررہا تھا۔ اس نے بیڈ روم کے تمام پردے ہٹا رکھے تھے اور ہر آئینے میں اس کی شبیہہ تھی۔ یوں محسوس ہورہا تھا کہ کمرے میں ہر جانب شیر افضل ہی شیر افضل ہے۔ وہ اپنی جگہ بیٹھا خاموشی سے ان دونوں کو گھور رہا تھا۔

"تم تو کراچی میں تھے.....؟" نائلہ نے ابتدائی صدمے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

"اس کمرے کی طرح میں تمہارے لیے ہر جگہ موجود ہوں۔" شیر افضل بری طرح غرا رہا تھا "تمہارے آگے بھی میں ہوں اور تمہارے پیچھے بھی میں۔ تمہارے دائیں بائیں ہر جانب میں ہی میں ہوں۔" اس کی آواز کسی زخمی جانور سے مشابہ تھی۔

"صرف اس وقت تک شیر افضل جب تک کوئی دوسرا اس منظر میں داخل نہیں ہوگیا۔" نائلہ کے بجائے سہیل نے شیر افضل کو جواب دیا تھا "غور سے دیکھو' اب اس منظر میں تم ہی تم نہیں ہو بلکہ تمہارے علاوہ بھی کوئی موجود ہے اور وہ تم سے زیادہ نائلہ سے قریب بھی ہے۔" سہیل کی بات حقیقت تھی۔ شیر افضل گویا تڑپ کر رہ گیا۔

"تم سے میں بعد میں بات کروں گا' پہلے مجھے اس عورت سے بات کرنے دو جو کبھی اپنا سب کچھ میرے حوالے کرنے آئی تھی' یہ کہتے ہوئے کہ یہ دولت اور شہرت چاہتی ہے۔ آج اسے دولت اور شہرت حاصل ہو گئی تو یہ سمجھ رہی ہے کہ شیر افضل کو بیوقوف بنا کر چلی جائے گی۔"

"میں نے وہ فیصلہ جن حالات میں کیا تھا' تم اس سے اچھی طرح واقف ہو۔" نائلہ بولی "میں اعتراف کرتی ہوں کہ وہ میری سب سے بڑی غلطی تھی مگر خدا کے لیے اب مجھے اس ایک فیصلے کی اتنی بڑی سزا نہ دو۔ آٹھ سال کی قید بہت ہوتی ہے۔ اب مجھے رہا کردو' چاہے مجھ سے وہ سب کچھ واپس لے لو جو تمہاری بدولت مجھے حاصل ہوا تھا۔" نائلہ کی آواز میں ایک درد تھا' ایک کسک تھی مگر شیر افضل پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

"میں نے تم سے کہا تھا نائلہ کہ جرم کی دنیا میں صرف داخلے کا راستہ ہوتا ہے' اس سے باہر جانے کے بارے میں کبھی نہ سوچنا اور تم نے کہا تھا کہ ایسا ہی ہوگا' مگر اب آٹھ سال بعد تم لوٹنا چاہتی ہو تو یہ ناممکن ہے۔"

"غلط کہتے ہو تم۔" نائلہ تڑپ کر بولی "گناہ کے راستے پر توبہ کے دروازے ہمیشہ کھلے ہوتے ہیں اور جن راستوں پر چلنے سے خدا اپنے بندوں کو نہیں روکتا ان پر چلنے سے تم مجھے کیسے روک سکتے ہو؟" اس کے لہجے میں اب بھی التجا ہی تھی۔

"بہتر ہوتا شیر افضل کہ پہلے تم مجھ سے بات کر لیتے کیونکہ....."

"تم سے تو مجھے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔" شیر افضل نے سہیل کی جانب رخ کرتے ہوئے کہا۔ "مگر اس سے پہلے میں یہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ تمہارا جادو نائلہ پر کس حد تک چڑھا ہے۔" شیر افضل کی آنکھوں میں وحشت ناچنے لگی تھی "جس کا نام عورت ہے' اس کا خمیر ہی بے وفائی سے اٹھا ہے مگر میں اس بے وقوف عورت کو جتانا چاہ رہا ہوں کہ یہ جسے اپنا سب کچھ سمجھ رہی ہے' وہ اصل میں وہ نہیں ہے جو یہ سمجھ رہی ہے۔" نائلہ نے سہیل کی جانب دیکھا مگر وہ اطمینان سے اپنی جگہ کھڑا رہا تھا۔

"تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے شیر افضل۔" سہیل نے اپنی جگہ سے ایک قدم آگے اٹھاتے ہوئے کہا "اس لیے بہتر ہے کہ ہتھیار ڈال دو اور اپنی شکست تسلیم کر لو۔" نائلہ کا شک یقین میں بدلتا جا رہا تھا۔

"مگر اس سے پہلے اسے یہ تو بتا دو کہ تم ہو کون.....؟" شیر افضل غرایا۔

"میں اسے نہیں تمہیں یہ بتا سکتا ہوں کہ میں کون ہوں کیونکہ اس کشمکش میں اس سے زیادہ تم گرفتار ہو کہ میں کون ہوں۔" سہیل پورے اعتماد کے ساتھ شیر افضل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو کر رہا تھا۔

"اتنا تو میں جانتا ہوں کہ تم وہ نہیں ہو جو خود کو بتاتے ہو۔" شیر افضل بولا تھا "نہ تمہارا نام سہیل ہے اور نہ ہی تم امریکا سے آئے ہو اور نہ ہی تمہارا اس شخص سے کوئی رشتہ ہے' جس کو بے وقوف بنا کر تم اس کے گھر میں رہ رہے ہو۔" شیر افضل نے اپنا فقرہ مکمل کیا تو سہیل کے چہرے پر اچانک مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

"جب اتنا جانتے ہو تو یہ بھی بتا دو کہ میں کون ہوں۔"

"ایک آدھ دن میں یہ بھی معلوم کر لوں گا۔" شیر افضل بولا۔

"اتنی زحمت نہ کرو' میں خود ہی تمہیں بتا دیتا ہوں۔" نائلہ کو سہیل کی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

"یاد کرو شیر افضل! حمیرا نے تم سے اپنے کسی چچا کا ذکر کیا تھا جو بہت عرصہ قبل سعودی عرب چلے گئے تھے اور پھر ان سے کوئی رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔"

"تم حمیرا کو کیسے جانتے ہو؟" شیر افضل اچانک اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"پہلے میری باتوں کا جواب دو' اپنے سوالوں کے جواب تمہیں خود ہی ملتے چلے جائیں گے۔"

"حمیرا نے بتایا تھا کہ اس کے ایک چچا تھے جو بہت پہلے کسی بات پر ناراض ہو کر گھر سے چلے گئے تھے اور پھر اس کے بعد ان کا کوئی پتا نہیں چلا تھا۔ صرف ایک خط سعودی عرب سے آیا تھا جس سے یہ بات ظاہر ہوئی تھی کہ وہ زندہ ہیں اور سعودی عرب میں ہیں۔" شیر افضل نے کسی بل کھائے ہوئے سانپ کی طرح کلبلاتے ہوئے کہا۔

"میں حمیرا کے اسی چچا کا بیٹا مسعود ہوں۔" نائلہ اس گفتگو سے الگ تھی مگر سہیل کی زبان سے ادا ہونے والے فقرے نے اس کے سامنے اندھیرا سا پھیلا دیا تھا۔ وہ ایک بار پھر دھوکا کھا چکی تھی۔

"حمیرا کہاں ہے؟" شیر افضل دہاڑا۔

"صبر..... بہنوئی صاحب صبر" سہیل جواب اچانک مسعود بن گیا تھا' پورے اعتماد کے ساتھ بولا "اچھے بچے کہانی سنتے ہوئے

Unfortunately, The Last Page is Missing.